



# مشعل راہ

از  
فاضل شہیر موہینا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہا پوری

ملنے کا پتہ

فریدنگ ٹال بازار، لاہور

نام کتاب ————— حشعلِ راہ  
مصنف ————— عبد الحکیم خاں اختر شاہ بہا نپوری مظہری  
کاتب ————— محمد شریعت گل  
ضخامت —————  $\frac{18 \times 23}{8}$  ، ۱۰۰۸ صفحات  
اشاعت ————— بار اول  
مطبع ————— جنرل پرنٹرز لاہور  
ناشر —————

قیمت ————— RS 100.00  
پے ۱۵۰/۰۰

\_\_\_\_\_ ملنے کا پتہ \_\_\_\_\_

فریدی بک سٹال : اردو بازار لاہور

# انتساب

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فخر خاندان و نادر روزگار نے اپنے گھر سے جب اپنے بھتیجے مولوی اسمعیل کے ہاتھوں فتنہ و ابیت کا ظہور دیکھا تو بقول مصنف فریاد المسلمین فرمایا تھا کہ: "میری طرف سے کہو اس لڑکے نامراد کو، کہ جو کتاب مجھنی سے آئی ہے میں نے ہی اس کو دیکھا ہے اس کے عقاید صحیح نہیں، بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں آج کل بیمار ہوں، اگر صحت ہو گئی تو میں اس کی ترویج کھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم ابھی نوجوان پتے ہو، مانتی شور و شر برپا نہ کرو۔"

موضوع کے دوسرے چچا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مولوی اشرف علی تھانوی فرمایا تھا: بابا! ہم تو سمجھتے تھے کہ اسمعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں جانتا۔"

رئیس المبتدعین صاحب کی ابتدائی کارگزاری کے تیور دیکھتے ہی شہنشاہِ اقلیم منطلق حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مرزا حیرت دہلوی فرمایا تھا: "اسمعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔" اس کے بعد علامہ خیر آبادی نے تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ لکھ کر اس فتنے کو پامال کیا اور شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم نے معید الایمان اور الحجۃ العمل فی ابطال الجہل تصنیف کر کے اپنی گھر سے اٹھی ہوئی اس پراسرار شرارت کی بیخ کنی فرمائی۔

احقر مذکورہ حضرات کی ایمانی فراست کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی ناچیز کاوش کو ان پانچوں بزرگوں سے منسوب کرتا ہے۔

اختر شاہ جہا پوری مظہر علی عنہ

# فہرست

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۶۸	اینگلو انڈین علماء کی کمیٹی	۷	مناجات بدرگاہ مجیب الدعوات
۲۷۰	دیوبند مرکز	۹	استغاثہ - بارگاہ رسالت میں
۲۸۵	علی گڑھ مرکز	۱۱	سخن ہائے گفتنی
۲۹۲	ندوہ کا پراسرار مجال		باب اول
۲۹۷	مرزائے قادیان	۲۹	
		۵۲	انگریزوں کا قبضہ اور مظالم
۳۰۳	باب سوم	۷۰	داخلت فی الدین
۳۰۵	فرقہ سازی	۷۹	۱۸۵۷ء کا مگراؤ اور نتائج
۳۰۵	الطہریت فرقہ	۱۲۸	ایک تاریخی معادلے کا مصل
۳۰۶	دیوبندی فرقہ		باب دوم
۳۰۷	۱۲۹		
۳۰۷	نیچری فرقہ		
۳۰۷	مرزائی فرقہ		مسلمانوں کو اسلام سے کیوں بے بہو کرنا پڑا
۳۰۸	صلح کلیت و دہریت	۱۵۶	خارج کی تاریخ
۳۰۹	خاکسار پارٹی	۱۷۸	خارجی سلفی
۳۰۹	جماعت اسلامی	۱۸۰	خارجی حزبان
۳۱۱	۱۸۹		خارجی وہابی
۳۱۱	رئیس البتدین مولوی اسماعیل دہلوی کے کارنامے		خارجی اسماعیلی
	ترک تقلید	۲۰۲	دیوبندیت کی ابتدا
	تزمین الوہیت	۲۶۵	

۵۲۹	۳۲۸	توہینِ شانِ رسالت
۵۳۳	۳۳۸	توہینِ انبیاء کا عالمی ریکارڈ
۵۳۴	۳۴۷	تکفیرِ مسلمین
۵۳۷	۳۵۵	قتل و قتالِ مسلمین
۵۴۱	۳۱۱	خوابِ نبوت
۵۵۹	۳۶۲	مسئلہ غیبیت
۵۶۵	۳۷۶	دشمنِ مصطفیٰ کی نسل منقطع
۵۶۸	۳۷۷	کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مائتت ۷۷
۵۶۹	۳۹۶	فرقہ اہلحدیث کی تخریب کاری
۵۷۴	۳۹۴	جماعت کا اہلحدیث نام؟
۵۸۳	۳۹۷	اتمازی نشانات
۵۸۷	۳۹۹	والہی توحید
۵۹۰	۵۰۰	عقیدہ رسالت
۶۰۳	۵۰۴	انکارِ تعلیہ
۶۰۹	۵۰۳	مجتہدینِ عظام پر طعن
۶۲۲	۵۰۶	غلامت پسندی
۶۲۶	۵۰۶	دہلیہ کی طہارت کا پانی
۶۳۲	۵۰۹	غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزاروں کی
۶۳۵	۵۱۲	غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے
۶۳۸	۵۱۵	والی خورد و نوش
۶۴۲	۵۱۹	غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی
۶۴۳	۵۲۳	غیر مقلدین کی اہام بازی
	۵۲۸	دیوبندی جماعت کی تخریب کاری
	۵۲۸	تخریب کاری

۷۲۵	مولوی نواب صدیق حسن خاں بھوپالی	۷۲۰	مخالفتِ جہاد
۷۲۵	سر سید احمد خاں علی گڑھی	۷۲۳	ظلی بروزی نبوت کا دعویٰ
۷۲۸	علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھی	۷۵۳	حقیقی نبوت کا دعویٰ
۷۵۳	الطاف حسین حالی پانی پتی	۷۵۴	مقدس بارگاہوں میں دریدہ دہنی
۷۵۷	مولوی رشید احمد گنگوہی	۷۶۰	ابن اللہ ہونے کا دعویٰ
۷۵۸	مولوی اشرف علی تھانوی	۷۶۹	دعویٰ الوہیت
۷۵۸	مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی	۷۷۱	اقبال ڈگری
۷۵۹	مولوی محمد ایلیا کسکاندھلوی	۷۷۳	مسلمانوں سے علیحدگی
۷۷۳	مرزا غلام احمد قادیانی		
۷۷۳	شہید حضرات		باب چہارم
۷۸۵	انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبان		
۷۸۷	سید احمد بریلوی	۷۹۶	سید احمد بریلوی
۷۹۷	مولوی محمد اسماعیل دہلوی	۸۱۷	مولوی محمد اسماعیل دہلوی
۸۲۲	مولوی محمد اسحاق دہلوی	۸۲۲	مولوی محمد اسحاق دہلوی
۸۳۵	مولوی محبوب علی	۸۳۵	مولوی محبوب علی
۸۳۹	مولوی کرامت علی بونہرہ	۸۳۹	مولوی کرامت علی بونہرہ
۸۴۱	مولوی ملک علی نانوتوی	۸۴۱	مولوی ملک علی نانوتوی
۸۹۲	مولوی سمیع اللہ دہلوی	۸۹۲	مولوی سمیع اللہ دہلوی
۹۰۳	مولوی ڈپٹی نذیر احمد	۹۰۳	مولوی ڈپٹی نذیر احمد
۹۷۲	مولوی محمد احسن نانوتوی	۹۷۲	مولوی محمد احسن نانوتوی
۹۸۸	مولوی عبدالاحد دہلوی	۹۸۸	مولوی عبدالاحد دہلوی
۹۹۴	میاں نذیر حسین دہلوی	۹۹۴	میاں نذیر حسین دہلوی
۹۹۷	مولوی محمد حسین بٹالوی	۹۹۷	مولوی محمد حسین بٹالوی

# مناجات

الہود اے خدا، سب کے حاجت روا، آج ایمان کی جان خطرے میں ہے  
رہزنِ دین بننے لگے رہنا، حق پرستوں کا ایساں خطرے میں ہے  
یوں تو آزاد ہیں، حکمرانی بھی ہے، یوں تو سکتے کی اپنے روانی بھی ہے  
درحقیقت ہیں محکوم کفار کے، اہل اسلام کی آن خطرے میں ہے  
جن کے زیرِ نگیں ہفت کشور ہوتے، قسمت اقوامِ عالم کی کھتے رہے  
آج ہیں کفر کے زیرِ فرماں وہی، قوم کی شوکت و شان خطرے میں ہے  
تھے جو پیکرِ کبھی عدل و انصاف کے، تھے جو پتلے کبھی حسنِ اخلاق کے  
آج وہ ہو گئے ننگِ انسانیت، اوج کا ساز و سامان خطرے میں ہے  
آج اپنی خلافت بنی خواب ہے، کشتیِ شانِ مسلم ہی غرقاب ہے  
خود ہی آپس میں دست و گریباں ہیں، جس سے ہر مردِ سلطان خطرے میں ہے  
آہ کشمیر، قبرص، فلسطین میں یا اریٹیریا، روس اور چین میں  
حق کی خاطر مسلمان کھولیں زباں، جسم خطرے میں ہے جان خطرے میں ہے  
عبدِ انگریز کی سب سے لعنت بڑی، تھا جو دکھو یہ نے بنایا نبی  
اُس کے اب پیروکار اس قدر ہو گئے، جس سے نظمِ گلستاں خطرے میں ہے  
لیڈروں کے زالے ہی اطوار ہیں، کہتے ہیں قوم کے یار و غمخوار ہیں  
قومیت کو مٹاتے ہیں کچھ اس طرح، دین کا ہر نگہبان خطرے میں ہے  
ناچ گانے غضب آج محبوب ہیں، آہ اُمّ النجاشت کے مشروب ہیں  
ہو رہی ہیں امیروں میں خرمستیاں، دورِ حاضر کا انسان خطرے میں ہے  
دہریوں کا ہوا گرم بازار ہے، رہنماؤں سے اب قوم بیزار ہے  
غیرتِ دین و ایماں کا بیوپار ہے، آج سچا مسلمان خطرے میں ہے



کیسے تفسیر و تفہیم کے نام سے ، کیسے فکر و تدبیر نامہ دام سے  
یوں مطالب بتاتے ہیں آیات کے ، جن سے مفہوم قرآن خطرے میں ہے  
مصطفیٰ کے فرامین و ردِ زباں ، مصطفیٰ کی اُنہیں سے کریں کسرِ شاں  
کس غضب کی ہیں یہ شوخیاں الاماں ، تیرے پیارے کافرمان خطرے میں ہے  
اہلِ اسلام کو منتشر کر دیا ، اب تو ہر فرد ہے ایک فسق و جُدا  
دشمنانِ نبی بن گئے اویا ، آج سچوں کی پہچان خطرے میں ہے  
ہم نے مانا کہ بیشک خطاکار ہیں ، مابکِ دو جہاں ! ہم گنہگار ہیں  
اُمّتی ہیں مگر تیرے محبوب کے ، اُمّتِ شاہِ ذیشانِ خطرے میں ہے  
بہر شاہِ اُمم ہو بنگاہِ کرم ، پھر ترقی کرے قوم یہ دمِ بدم  
شان و شوکت سے اختر بھی چمکے تیرا ، ذوالمنن ! وہ پریشانِ خطرے میں ہے

اختر شاہ جہان پوری منٹھری غفرلہ

لاہور

# استغاثہ

(بعضو سرایا نور، شافع یوم النور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

نگاہِ رحمت ، چشمِ عنایت ، یا رسول اللہ  
 پریشاں حال ہیں ہم اہلسنت ، یا رسول اللہ  
 اٹھا رکھا ہے سر بر سمت پھر تخریب کاروں نے  
 بظاہر بن کے ہمدردانِ ملت ، یا رسول اللہ  
 وہ، جو ہیں صاحبانِ جہ و دستار کھلاتے  
 بہ باطن آپ سے جن کو عداوت ، یا رسول اللہ  
 وہ، چہرہ جن کا مومن کا مگر دل ہے ابو جہلی  
 ہے اُجلا جن کا تن ، گندی ہے تیرا ، یا رسول اللہ  
 زباں پر نعرہ توحیدِ دل ایمان سے جنالی  
 ہے کلمہ لب پہ اور دل میں کدورت ، یا رسول اللہ  
 وہ، جو ہیں آپ کی تعظیم اور تکریم کے منکر  
 وہ گستاخانِ دربارِ رسالت ، یا رسول اللہ  
 یہ رہنما ملامبر بن کر نکل آتے ہیں میدان میں  
 کریں کس طرح ہم اپنی حفاظت ، یا رسول اللہ  
 ہمارے اہل حق باہدگر دست و گریباں ہیں  
 انہیں کب اپنے ہے جھگڑوں سے فرصت یا رسول اللہ  
 مقابل دشمنانِ دین کے جو مرد میدان تھے  
 وہ ہیں شیرِ نیستانِ سیاست یا رسول اللہ

سجا تھا جن کے تن پر جامنہ الْفَقْر ماضی میں  
 ہے اب زر کی تگ و دو اُن کا خلعت یا رسول اللہ  
 کسی کو صرف ہے درگاہ خوشنودی امیروں کی  
 کسی کو صرف کرسی کی ضرورت یا رسول اللہ  
 انہیں میں سے نئے فیشن کے کچھ مفتی معاذ اللہ  
 مسائل میں بھی کر بیٹھے ہیں جدت یا رسول اللہ  
 ہمارے رہبرانِ دین و ملت کی یہ حالت ہے  
 کہیں کس سے ہم اپنے دل کی حالت یا رسول اللہ  
 تیلے ہیں دشمنانِ دین ادھر تخریب کاری پر  
 مکتدر ہے نھاتے دین و سنت یا رسول اللہ  
 دروالا پہ انتر استغاثہ لے کر آیا ہے  
 صلیبِ حق ، شہتاءِ رسالت یا رسول اللہ  
 دینے سے اٹھے پھر ابر رحمت یا رسول اللہ  
 کوم جو پھر بشکلِ اعلم حضرت یا رسول اللہ  
 (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم)

از انتر القامدی الرضوی مدظلہ

حیدرآباد



# سخن ہائے گفتنی

وہ محرکات جو اس کتاب کی تصنیف کا باعث بنے اوکلاً ان کا قارئین کے سامنے اظہار

کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، لیجئے وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ باری تعالیٰ شانہ کے فضل و کرم اور اس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے اس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ سے تعلق خاطر ہے اور رشتہ عقیدت و نیاز مندی حاصل ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ راقم الحروف نے اعلیٰ حضرت بریلوی سے براہ راست فیض حاصل کیا تھا، کیونکہ امام موسوف کا ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں وصال ہو گیا تھا اور احقر کا سن پیدائش ۱۹۳۵ء ہے۔ امام احمد رضا کے ساتھ دوسرا کوئی عام رشتہ بھی نہیں ہے جبکہ آپ مولد بریلوی۔ نسباً پٹھان اور مشرباً قادری تھے اور راقم سطور مولد اُتسا، بھما پور کا نسباً راجپوت اور مشرباً نقشبندی مجددی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگرچہ برائے نام ہی سہی۔ ہاں فاضل بریلوی کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ موسوف کو عرب و عجم کے عمائدین و ملت یعنی اکابر علمائے اہلسنت نے امام تسلیم کیا اور چودھویں صدی کا مجدد بتایا تھا۔ لہذا اس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی سے بھی اسی طرح نیاز مندانہ عقیدت و محبت ہے جس طرح حضرت امام ربانی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ اور دوسرے بزرگان دین سے ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذلک۔ اس تعلق خاطر نے مجبور کیا کہ امام احمد رضا خاں بریلوی کے تجدیدی کارنامے پر جو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھا جاسکے، لکھ کر اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کروں کیونکہ لکھنے والوں نے ابھی تک اس اہم ترین عنوان پر لکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی یہ ہے کہ خطیب مشرق، مصنف "خون کے آنسو"

علامہ مشتاق احمد نظامی مدظلہ العالی پر پاسبان الہ آباد کا یہ بیان پڑھنا نصیب ہوا کہ:

”محترم مفتی ظفر علی صاحب نعمانی پرنسپل دارالعلوم امجدیہ کراچی کا مرسلہ پکیٹ جس وقت مجھے موصول ہوا اور کتاب کے سرورق ”حیاتِ اعلیٰ حضرت“ پر نظر پڑی تو فوراً شوق میں ادراق گردانی کرنے لگا مگر اپنی حراماں نصیبی کہ جس عنوان کا تلاشی تھا وہ مجھے نہ مل سکا، یعنی اعلیٰ حضرت کی شانِ تجدید۔ میرے خیال میں جلد اول کا سب سے اہم اور ضروری باب یہی تھا کہ اعلیٰ حضرت کی مجددیت پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی اس کے بعد زندگی کے دوسرے گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ بعد کے دوسرے نسخوں میں حضرت ملک العلماء محمد ظفر الدین صاحب قبلہ پرنسپل جامعہ لطیفہ کینہار نے اس خصوصی مسئلہ پر گفتگو فرمائی ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو مکتبہ کراچی کو چاہیے کہ وہ موصوف سے اس عنوان پر ایک علمی و تحقیقی مقالے کے رد و سری یا تیسری جلد میں شائع کر دے، ورنہ میری نگاہ میں ”حیاتِ اعلیٰ حضرت“ ایک عالم و فاضل کی تاریخ تو کھی جاتے گی لیکن کسی مجدد کی تاریخ نہ بن سکے گی۔ ضرورت ہے کہ اعلیٰ حضرت کی شانِ تجدید پر محققانہ گفتگو کی جاتے یہ تنقید و تبصرہ نہیں بلکہ ایک ناقص راستے کا اظہار ہے“۔

شاید موصوف کی یہ آواز صدائے صحرا ہو کر ہی رہ گئی تھی کہ اس موضوع پر ابھی تک کوئی کتاب منصفہ شہود پر جلوہ گر نہ ہو سکی۔ راقم الحروف یہی کہہ کھینے کی بفضلہ تعالیٰ جسارت کر چکا تھا کہ ایسے عظیم عنوان اور ایسے جلیل القدر امام و مجدد کے تجدیدی کارنامے پر اس بے ڈھنگی کتاب کو دیکھ کر علمائے اہلسنت ہیں سے کوئی صاحبِ ہنجلا اٹھیں اور اس طرح غصے میں آکر ”اعلیٰ حضرت کا تجدیدی کارنامہ“ شایانِ شان طریقے سے عالمانہ اور محققانہ انداز میں لکھنے کی شاید زحمت گوارا فرمائیں۔

۳۔ تیسری وجہ مذہبِ اہلسنت و جماعت سے بغاوت کرنے والے اینٹکواہڈین علماء اور انصاف دشمن مورخوں کی علمائے اہلسنت اور خصوصاً امام احمد رضا خاں بریلوی کے خلاف

معاندانِ روش ہے۔ یہ حضرات اپنے اکابر کی انگریز دوستی اور بت پرست نوازی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے بے جا الزامات اور وہابی تباہی اعتراضات کا ایک لائقناہی سلسلہ مدتوں سے منظم طور پر جاری کیے ہوتے ہیں۔ جن حضرات کے قدموں پر بھی کبھی انگریز دوستی کی گرد نہ پڑی اور جن کے خلوص و لہبیت، تقویٰ و طہارت اور دیانت و امانت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں، ان علمائے کرام اور ایسائے عظام پر انگریز دوستی کا الزام نہایت بے باکی سے لگا دیتے ہیں اور اپنی اس نازیبا حرکت، اہلبلی شرارت، اکابر ہند و پاک سے عداوت، تاریخ و واقعات میں خیانت کرنے پر ذرا نہیں شرماتے، آنکھیں تک نہیں جھکاتے، مثلاً پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

”دہلی میں دبیر الدولہ نواب فرید الدین (ف ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء)، منشی زین الدین (ف ۱۲۴۳ھ / ۱۸۵۶ء)، مفتی صدر الدین آزدہ (ف ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) مولوی فضل امام خیر آبادی (ف ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء)، مولوی محمد صالح خیر آبادی (برادر فضل امام خیر آبادی)، منشی فضل عظیم خیر آبادی (فرزند اکبر فضل امام خیر آبادی)، مولوی فضل حق خیر آبادی (ف ۱۲۶۶ھ / ۱۸۶۱ء)، بدایوں میں مولوی فضل رسول (ف ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء)، مولوی علی بخش صدر الصدور (ف ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵-۸۶ء)، مراد آباد میں مولوی عبدالقادر چیت رام پوری (ف ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء)، الہ آباد میں مولوی اسد اللہ (ف ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲-۸۳ء) وقاضی عطار رسول چریا کوٹی، کلکتہ میں قاضی نجم الدین خاں کاکوروی (ف ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء) اور ان کے صاحبزادگان، قاضی سعید الدین (ف ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء)، مولوی حکیم الدین (ف ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء) اور قاضی عظیم الدین (ف ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء) وغیرہ۔ مدراکس میں قاضی ارتضاعلی گوپاموی (ف ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳-۵۴ء) اور وناسک میں خان بہادر مولوی عبدالفتاح مفتی وغیرہ برصغیر پاک و ہند کے ۱۵۹ عالم و افاضل ہیں جنہوں نے نسب افتخار، قضا، اور صدر الصدور کے ذریعے سرکار کمپنی کے اقتدار حکومت

کو بحال اور مضبوط کیا، لے

۵۔ گلشن کے اس ایک منظر پر خار کے ہاتھوں

سوچا کہ میں یا دوسرے واماں نظر میں

قادری صاحب کو مذکورہ علمائے کرام کی ملازمت تو نظر آگئی اور صرف ملازمت کے پیش نظر مزے لے لے کر برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ کاشس! موصوف روز قیامت کا منظر اور وہاں کی باز پرس کو یہ نظر رکھتے۔ الزام تراشتے اور بہتان لگانے سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر غور فرمایا جاتا:

- ۱۔ کیا ان علمائے کرام نے کسی خلاف اسلام منصوبے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا؟
- ۲۔ کیا ان اکابر نے کمپنی کے دباؤ یا ترغیب سے اسلامی عقائد و نظریات میں کوئی ترمیم و تسبیح کی تھی؟

- ۳۔ کیا ان بزرگوں نے حکومت کی حمایت کا کوئی ایسا اعلان کیا تھا جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا؟

ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ معاندین اس قسم کا ایک بھی الزام علمائے اہلسنت پر ثابت نہیں کر سکتے۔ یہی بغض و عناد کی بات، تو یہ راستہ ہی دوسرا ہے۔ اس راستے پر گامزن ہو کر، جو کسی کے جی میں آئے کتا پھرنے، کون کسی کا منہ پکڑ سکتا ہے؟ معتدعین زمانہ نے تو بغض و عناد میں شہتہاں درجہاں، سرور کون، سماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیسے کیسے نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں، جنہ کی طے کافروں کو بھی کبھی جرات نہ ہوئی بلکہ اس سے بھی تجاوز کر کے باری تعالیٰ شانہ کے ستوج و قدوس ہونے کو داغدار کرنے کی غرض سے ذات باری تعالیٰ پر امکانِ کذب کا الزام لگانے اور اسے جھوٹا ٹھہرانے کی باتاواہ ہم شروع کر دی تھی۔ یہی حضرات اگر علمائے اہلسنت پر الزام تراشی کرتے ہیں تو کونسی عجیب بات ہے؟ ہاں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے تاریخ دوست حضرات سے ہم اتنی گزارش

۱۔ محمد ایوب قادری، حاشیہ مقدمہ حیات سیدہ امینہ، مطبوعہ کراچی، ص ۱۰

خود کریں گے : ۱۵

ہاں چاہتے ہیں کہنا کچھ اپنی لئے میں ہم بھی  
نہ نواز رکھ دے اب سباز لکن تروائی

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ تحریر ہوا ہے اگر اسے انصاف اور  
دیانت داری کے ساتھ پڑھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ علمائے اہلسنت سے عناد رکھنے والوں کے  
دو صاحبان جیہ دوستار جنہیں برٹش گورنمنٹ نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر آسمانِ علم کے  
شمس و قمر منوانے اور تقویٰ و طہارت میں رشکِ جنید و شبلی باور کرانے کی خاطر اپنے پروپیگنڈے  
کی ساری مشینری کو حرکت دی ہوئی تھی اور تا حال بھی مصروفِ عمل ہے، کچھ اور ہی نظر نہ آنے  
لگیں۔ معلوم نہیں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے حق کے متلاشی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر  
کیوں علمائے اہلسنت کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے؛ ۱۵

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں

دو چار دن مانتا کسی کی نگاہ ہیں

اسی طرح مولوی محمد سلیمان بدایونی نے سہ ماہی ”العلم“ کراچی، بابت مارچ ۱۹۵۸ء

مطابق ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ میں امام احمد رضا خاں بریلوی سے لفظ و عناد کی بنا پر ”حیاتِ اعلیٰ حضرت“  
مصنف علامہ ظفر الدین بھاری علیہ الرحمہ کے مشنڈل پر طویل اور طویل اور حاصل تنقید کی ہے جو بجا خود محتاجِ تنقید ہے۔  
ستمِ بلا سے ستم یہ ہے کہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اسی تنقید کا اپنی کئی تصانیف اور  
تحریروں میں سہارا لیا ہوا ہے۔ گویا جب ان حضرات کے دیباچے تحقیق میں جوش آتا ہے تو  
اتنے باریک بین ہو جاتے ہیں کہ اپنے مخالفین کی آنکھوں میں فرسی تنکے بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن  
جب اپنے ان علماء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنہیں اذیاباً مین دُونِ اللہ بنا کر اپنے دلوں  
اور دماغوں پر سوار کیا ہوا ہے تو آنکھیں اتنی چندھیا جاتی ہیں کہ ان حضرات کی آنکھوں کے  
شہتیر بھی نظر نہیں آتے۔ یہ تحقیق سے یاد دہاندگی؛ یہ انصاف سے یا تاریخ پر ظلم؛ یہ عام  
مسلمانوں کی رہنمائی اور خیر خواہی ہے یا تحقیق کی آڑ میں انہیں غلط راستے پر گامزن کرنا اور خدا  
کے مقبول بندوں کے خلاف سب آراء کرنا اور ہونا؛ حقائق آپ حضرات کے بھی سامنے ہیں؛



انصاف کی ترازو ہاتھ میں ہے، کیوں ڈنڈی مار کر دیانت و امانت کا خون سر بازار کیا جا رہا ہے؟  
کیا قیامت نہیں آتے گی؟ ہم مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی کو مخلصانہ اور خیر خواہانہ مشورہ  
دیتے ہیں کہ:۔

زندِ خواب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو  
تجھ کو پراتی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو

اس سلسلے کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض حضرات بغضِ معاویہ میں اتنے  
دور نکل جاتے ہیں کہ سنگین سے سنگین الزام ڈنکے کی چوٹ لگاتے ہیں لیکن اس الزام کی پشت  
پر کوئی جھوٹ موٹ کی دلیل یا فرضی و جعلی شہادت تک پیش کرنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ ثبوت  
خواہ زندگی بھر میسر نہ آسکے لیکن بہتان تراشی میں کوتاہی کرنا جرم سمجھتے ہیں۔ مثلاً کچھلے دنوں "آئینہ صداقت"  
نامی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب کے مصنف پروفیسر الحاج محمد فیروز الدین روجی ہیں۔  
سرورق پر لکھا ہے کہ "بریلوی اور دیوبندی مسلک کی حقیقت تاریخ کے آئینہ میں"۔ یہ سہانا اعلان  
کتاب کا پیارا پیارا نام پڑھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ مصنف "اشاد اللہ اسلامک سٹڈیز" کے  
پروفیسر ہیں اور ساتھ ہی الحاج بھی "نیزوہ جانیٹ" سے تعلق رکھنے والے تخلص سے بھی مزین ہیں،  
یہ امید ہو چلی تھی کہ موصوف نے ضرورتاً یہ نئی بلعاف سکام یا ہوگا، اختلافات کی تلخی کو کم  
کرنے کی سعی فرمائی ہوگی اور علی انداز میں مثبت کردار ادا کیا ہوگا، لیکن کتاب کا مطالعہ کیا تو  
ساری کتاب رہی ایک طرف، پیلے چند صفحات ہی نے میرے غم میں امید میں ایسی آگ لگائی کہ  
اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ شاید محترم روجی صاحب  
مثبت انداز کے تصور سے بھی نا آشنا ہیں اسی لیے موصوف نے پوری کتاب میں منفی انداز ہی کو  
نبھایا اور بعض مقامات پر تو اس سے بھی نیچے پھسلے اور لڑھکے رہے۔ چونکہ "آئینہ صداقت"  
نامی کتاب کے بارے میں راقم الحروف نے اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا ہے لہذا اس کا  
تعارف کروانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ موصوف رقم طراز ہیں:

"کسی سے مناظرہ مقصود نہیں ہے، نہ کسی کو سب و ستم کرنے کا خیال ہے،  
نہ ہی کسی کی بے جا طرفداری اپنا شعار ہے۔ ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے

موجود ہے۔ ہر شخص خدا کو حاضر و ناظر جان کر، طرف داری اور جانب داری کو چھوڑ کر، اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، انشاء اللہ حقیقت اُس پر واضح ہو جائے گی۔

آیتے رُوحی صاحب کے مذکورہ دعاوی کا جائزہ لیتے ہیں کہ اپنی اس تصنیف میں موصوف نے کہاں تک ان کا پاس لحاظ کیا ہے؟ یا محض قارئین کے دل موہ لینے کی خاطر یہ خوشنما اعلان کیا ہے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

”ان کو کیا معلوم کہ ابن عابدین شامی نے حکومت کے اثر سے ان غریبوں (وہابیوں) کو بدنام کیا اور ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے اپنی دنیا سنبھالی۔ بُرا ہو اس دنیا پرستی اور سنہرے سکوں کا، جس کے عوض شامی نے نجدیوں کو دل کھول کر بدنام کیا۔ شامی نے یہ سب کچھ محمد علی پاشا کے حکم سے اُس کی دولت کے اثر سے لکھا ہے۔“

شاید اس گروہ نے بزرگانِ دین کی امانت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ شانہ اور انبیائے کرام سے لے کر علماء کرام تک جس کو بھی اپنے خلاف دیکھتے ہیں، اُسی کی طرف اپنی توپوں کا رخ پھیر کر دُحوال و حارِ بیماری شروع کر دیتے ہیں۔ رُوحی صاحب سے تو کیا کہا جاتے لیکن ہم انصاف پسند قارئین سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ موصوف نے علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مسلکِ عالمِ دین، اہلسنت کے مایہ ناز فقیہ اور اپنے دور کی یگانہ روزگار ہستی پر جو الزامات مذکورہ عبارت میں عائد کیے ہیں، ان کا ثبوت مُصنّف نے ”آئینہ صداقت“ میں کس جگہ دیا ہے؟ اگر ثبوت ہے تو کس صفحے پر اور اگر پہلے صفحے سے آخری تک ثبوت کے نام کا ایک لفظ بھی نزل سکے تو ”سہراتِ کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے موجود ہے۔“ یہ اعلان حقیقی دعویٰ ہی کہلاتے گا یا فراڈ؟ کیا ایسی کتاب کا نام ”آئینہ صداقت“ ہی رکھا گیا ہے؟ کیا

۱۔ محمد فیروز الدین روتھی: آئینہ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۱۱

۲۔ ایضاً: ص ۵۴

تاریخ کے آئینے میں اسی طرح فیصلہ ہوا کرتا ہے؛ معلوم ہوتا ہے کہ روحی صاحب بھی اپنے قبیلے کے جتید اساطین کی طرح تاریخ سے انتہائی خائف ہیں، ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے دلائل قارئین کی خدمت میں پیش کرتے، ثبوت ٹھوس، واضح اور وزنی ہوتے تاکہ ان کی روشنی میں ہر انصاف پسند یہی راستے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا جس کا اعلان موصوف نے بغیر کسی دلیل کے کیا ہوا ہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ بغیر دلیل کے دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ تاریخ کا، دیانت داری کا، اپنی عنایت کا بلکہ خود اپنی ذات کا مذاق اڑانا نہیں ہے؟

ایسے اقلیت کی عدالت کے بعد آپ کی سپریم کورٹ سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ یہ ہیں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر، یعنی مولوی حسین احمد صاحب ٹانڈوی (اسے گاندھوی نہ پڑھنا) نے موصوف کیا فرماتے ہیں؛

”محمد بن عبد الوہاب نجدی ابتداءً تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہوا اور چونکہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اس نے اہل سنت والجماعت سے قتل و قتال کیا اور ان کو بالآخر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، ان کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا اور ان کے قتل کو باعثِ ثواب و رحمت شمار کرتا رہا اہل عربین کو خصوصاً اور اہل حجاز کو عموماً اس نے تکلیف شاقہ پہنچائی۔ سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے۔ بہت سے لوگوں کو اس کی تکلیف شدیدہ کے بدینہ منورہ اور منکر معطر چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اس کے اور اس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے الحاصل وہ ایک ظالم و باغی اور خونخوار فاسق شخص تھا۔“

ہم روحی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے محبوب نجدیوں کے مظالم اور عقائد فاسدہ بیان کیے تو وہ آپ جناب کے نزدیک دنیا پرست اور

لے ٹانڈوی صاحب کو چاہیے تھا کہ یہاں اہلسنت وجماعت یا اہل سنت والجماعت۔  
لے حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۲

دین فروش ٹھہر گئے لیکن صدر دیوبند مولوی حسین احمد ٹانڈوی کے بارے میں ارشاد فرمایا جائے کہ جناب کے نزدیک یہ بھی دنیا پرست اور دین فروش قرار پائیں گے یا نہیں؟ اب ذرا دوسری بڑی سرکار مولوی خلیل احمد انبٹوی کا فیصلہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے:

”سوال: محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مال و آبرو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا، اُس کے بارے میں تمہاری کیا راستے ہے اور کیا سلف اور اہل قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟“

جواب: ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے اور خوارج ایک جماعت ہے شوکتِ عالی، جنہوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل کے کہ امام کو باطل یعنی کفر یا معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں، آگے فرماتے ہیں، ان کا حکم باغیوں کا ہے.... اور علامہ شامی نے اس کے حاشیہ میں فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے زمانے میں (محمد بن) عبدالوہاب کے تابعین سے سرزد ہوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوئے، اپنے کو حنبلی مذہب بتاتے تھے، لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدے کے خلاف ہو، وہ مشرک ہے اور اسی بنا پر اُنہوں نے اہل سنت اور علمائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا۔ طحطا۔ ۱۷

اس کتاب المہند علی المقند پر اکابر علمائے دیوبند کی تقاریر بھی ہیں، جن میں آپ کے شیخ المند مولوی محمود الحسن، جناب کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی، جمعیتہ العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ دہلوی اور دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز مفتی مولوی عزیز الرحمن بھی

شامل ہیں۔ کیا رُوحی صاحب بتا سکیں گے کہ مولوی حسین احمد ٹانڈوی اور مولوی خلیل احمد انبھڑوی نے کس کی دولت کے اثر سے نجدیوں کو برا بھلا کہا تھا؟ نیز ان حضرات کی تصدیق کرنے والے اتنے سارے علمائے دیوبند کو کہاں سے دولت ملتی تھی؟ نجدیوں کو برا بھلا تو اکثر علمائے دیوبند نے بھی کہا ہے لیکن یہ منطق ہماری سمجھ بوجھ سے بالا ہے کہ علامہ شامی اگر نجدیوں کے عقائد فاسدہ کا ذکر کریں تو دین فروش اور دنیا پرست قرار دے دتے جاتے ہیں لیکن علمائے دیوبند جب نجدیوں کے مظالم اور غلط عقائد و نظریات کی نشان دہی کرتے ہیں تو انہیں علمائے حق کہا جاتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے، اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر عالیجناب الحاج محمد فیروز الدین رُوحی بالقاب نے اپنی ماڈرن صداقت کے آئینے میں قارئین کو تین مزید جملے یوں دکھائے ہیں:

” احمد زینی دحلان کی حقیقت بھی سنئے۔ یہ شخص حکومت کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا اور اس کے حکم و اشارہ پر سب کچھ کرتا تھا۔ چچ مکہ مفتی تھے تھا اس لیے خوب کھل کھینے کے مواقع حاصل تھے۔ تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔“

” مولوی فضل رسول بدایونی انگریز کے ایجنٹ اور تنخواہ دار تھے۔“

” یہاں یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ مولانا امام احمد رضا خاں بریلوی نے جہاد کے معاملہ میں اپنے استا و شیخ احمد بن زینی دحلان کی سفت کو پورا پورا تباہ کر انگریز کا ساتھ دیا ہے جہاد کے سلسلے میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔“

مذکورہ تینوں حضرات پر موصوف نے ازام تو اتنا سنگیں لگا دیا لیکن اس شوخی اور شرارت کی کہاں تک داد دی جائے کہ پوری کتاب میں اس امر کا ثبوت ایک ہی نہیں دیا جاسکا۔ معلوم نہیں یہ کیسی دیانتداری کا ریکارڈ قائم کیا جا رہا ہے؟ بزرگان دین پر الزام تراشی تو

۱۔ محمد فیروز الدین رُوحی: کونہ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵

۲۔ ایضاً، ص ۵

۳۔ ایضاً، ص ۵

ڈنکے کی چوٹ کرتے جلاتے ہیں لیکن ثبوت کے نام سے بھی بدکتے اور بجائے چلے جاتے ہیں ، پکڑے جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو یوں آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے اور اُسے اپنی صداقت کے آئینے کی زینت بناتے ہیں ؛

”تفصیلات کا موقع نہیں“ ۱۷

”یہاں پر صرف اشاروں پر اکتفا کیا جا رہا ہے“ ۱۸

”یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں“ ۱۹

”ہم صرف اشارہ دیں گے“ ۲۰

اس فرضی آئینہ صداقت میں یہ علمی دنیا کا مذاق اڑایا گیا ہے یا نہیں ؟ بسندہ خدا جب آپ کے پاسی ان بزرگوں کو مطعون کرنے اور مورد الزام ٹھہرانے کے لیے ایک دلیل بھی نہیں جسے آپ اپنے نام نہاد ”آئینہ صداقت“ میں پیش کرتے تو الزام تراشی کرنے کی بجائے صاف صاف یوں لکھ دیتے کہ ”علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کے بارے میں ہمیں تو کیا ہمارے بڑے بڑوں کو بھی کوئی ایک ثبوت نہیں مل سکتا تھا، لیکن ہم نے اپنے اکابر کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا ہے ، ان حالات میں اگر علمائے اہلسنت پر گھوننے الزامات نہ لگائیں تو اپنے آڑبازانہ قول ”دون اللہ کی تخریب کاری ، انگریز دوستی اور بت پرست فوآزی پر پردہ کس طرح ڈالیں ؟ لہذا یہ ذلیل راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ راہِ راست ہماری طبیعتوں کے موافق ہے۔ فقط والسلام اگر صاف صاف اس طرح لکھ لیا جاتا تو تاریخین کی نظر میں اُس درجہ قابلِ نفرت تو نہ ٹھہرتے کہ علمی خیانت کرنے اور بزرگانِ دین کے مخالفوں کی فہرست میں شامل ہونے کو اپنا کارنامہ ہی سمجھتے چلے جا رہے ہیں۔ رُوحی صاحب نے یہ زہر کتنے معصومانہ انداز سے اُگلا ہے کہ :

۱۷ محمد فیروز الدین رُوحی ، آئینہ صداقت ، مطبوعہ کراچی ، ص ۵۵ ، ۱۲۵

۱۸ ایضاً ، ص ۱۲۲

۱۹ ایضاً ، ص ۱۲۵

۲۰ ایضاً ، ص ۱۲۵

”جہاد کے سلسلہ میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔“ بھلا اس ستم ظریفی کی داد کہاں تک دی جائے کہ صرف کتاب کا نام لکھ دیا اور جلد، عبارت اور صفحے وغیرہ کا نشان تک نہ بتایا کہ کسی نے نقل کا اصل سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا تو سر بازار اس صداقت کے آئینے کو چکنا چور کر دے گا۔ موصوف نے حوالہ اس طرح دیا ہے گویا یہ دس بیس صفحے کی کتاب ہے لہذا مکمل حوالے کی کیا ضرورت؟ بہر کوئی آسانی سے مطلوبہ بیان کو تلاش کر لے گا، حالانکہ فتاویٰ رضویہ تو دنیا کے اسلام کا وہ عظیم فقہی ذخیرہ ہے جس کی چند سطریں بھی شاید روحی صاحب کسی کے سامنے بیٹھ کر نہ سنا سکیں گے۔ فتاویٰ رشیدیہ اور امداد الفتاویٰ کے سائز میں اگر فتاویٰ رضویہ کو چھپوایا جاتے تو اس کی بارہ جلدوں کے پچیس ہزار سے بھی زائد صفحات بنیں گے۔ اگر روحی صاحب کی نظر میں فتاویٰ رضویہ شریف کی کوئی ایسی عبارت ہے جو ان کے نزدیک قابل اعتراض اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو اسے پیش کر کے، فیصلہ قارئین کے سپرد کر دیتے۔ بغیر حوالہ الازام کیا؟

موصوف کا مندرجہ ذیل بیان اور اس کے ذریعے جو تاثر دیا گیا ہے یہ کہ تمہ ان کی مشاقی پر دلالت ہے۔ روحی صاحب نے یہاں جو چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی دکھائی وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”علمائے اسلام نے دہلی کے آخری بادشاہ ظفر شاہ کی برائے نام حکومت کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی اور اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے شدید مظالم سے مجبور ہو کر دہلی میں جہاد کا فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علمائے دہلی اور علمائے حق پرست کی فہریں ہوئیں۔“  
یہ بالکل درست ہے کہ علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء میں جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ حق پرست علماء نے اس فتوے کی تصدیق و تشہیر فرمائی۔ لیکن روحی صاحب کے کمال کی داد کہاں تک دی جائے کہ ان علمائے کرام کے اسمائے گرامی صیغہ راز میں رکھے۔

لہ محمد فیروز الدین رُوحی، آئینہ صداقت، ص ۹۸، ۹۹

اس طرح شرمانے اور پردہ پوشی کا تکلف فرمانے کی وجہ یہی تو ہے کہ اگر وہ نام ظاہر کر دیتے تو موصوف کے محبوب علماء کسی اور ہی صفت میں نظر آنے لگیں گے۔ لہذا بغیر اظہار کے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ علمائے دیوبند ہی تھے جو انگریزوں کے خلاف جنگ آزما ہوئے تھے اور یہی علمائے حق پرست ہیں۔ فتویٰ مرتب کرنے والے اور تصدیق و تشریح کرنے والوں کے اسمائے گرامی اگر لکھ دیے جاتے تو روحی صاحب کا سارا منصوبہ ہی دہریا بُرد ہو جاتا، اسی لیے راز داری کا دامن پکڑ کر چلتے رہے۔ آگے موصوف نے اپنے محبوب علماء کی لٹیرت اور انگریز دشمنی کی دلیل کیا فرمے اور پیش کی ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں:

”ان مدارس (دیوبند و سہارن پور) نے نہ کبھی سرکاری امداد یعنی گوارا کی اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے یہاں آنے کا موقع دیا، جو انھیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے۔“

جب دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور دونوں ہی دینی درسگاہیں ہیں پھر ان کے متعلق سرکاری امداد اور ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے یا نہ آنے کے ذکر کا یہاں کوئی موقع اور محل ہی نہیں تھا۔ یہ ہر تعلیم یافتہ آدمی جانتا ہے کہ سرکاری امداد کبھی مدارس کو ملتی ہے اور ڈپٹی انسپکٹر کون سے تعلیمی اداروں میں جایا کرتے ہیں۔ چونکہ یہاں چور کی دائرہ میں تھے والا معاملہ تھا، لہذا موصوف کو یہ غیر متعلقہ شے بھی بھاری پڑی۔ قارئین کرام کی تسلی کے لیے ہم وہ تنکا بھی دکھا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس نے روحی صاحب کو یہ البیلا اور لا تعلق بیان داغنے پر مجبور کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی حقیقت اور ان کے بانیوں اور کارکنوں کے مدلل اور تفصیلی خدو خال بعد شوق اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں، یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۹ء) مولوی ملک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۵۱ء) کے شاگرد و عزیز اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ اس مدرسہ کی تاسیس میں جن حضرات کا ہاتھ تھا، ان میں سے

سے محمد فیروز الدین روحی: آئینہ صداقت، ص ۱۲۰



ایک مولوی محمود الحسن دیوبندی (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے والد مولوی ذوالفقار علی دیوبندی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) تھے جو پہلے بریلی کالج کے پروفیسر اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دوسرے مولوی شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے والد مولوی فضل الرحمن (المتوفی ۱۹۴۹ء) تھے جو بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے ملازمت ختم ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلی کے صاحبزادے تھے۔ پہلے یہ اجیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے تھے اس کے بعد بنارس، بریلی اور سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بن کر رہے۔ گویا مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے والے، پڑھانے والے، چلانے والے سب کے سب سرکاری آدمی تھے اور خاص طور پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہی رہے تھے۔ دریں حالات یہاں ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے کی کون سی ضرورت اور گنجائش باقی رہ گئی تھی؟

مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے مدرس اول مولوی محمد منظر نانوتوی تھے۔ موصوف دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلی نانوتوی کے شاگرد اور عزیز تھے۔ تمام عمر سرکاری ملازمت کی اور اگرہ کالج میں تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ریٹائر ہونے پر سہارن پور میں یہ مدرسہ قائم کر لیا۔ ان کے معاون خاص، موصوف کے حقیقی بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی تھے۔ یہ بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ بریلی کالج میں تعلیمی خدمات انجام دینے پر مامور رہے۔ سرکاری ملازمت ختم کرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے سہارن پور میں مدرسہ قائم کر لیا۔ یہ تھے ان مدارس کے کارندے۔ کیا حکومت ان حضرات کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی؟ انگریزوں کو معلوم نہیں زوجی صاحب نے اتنا بے وقوف کیوں سمجھ لیا کہ وہ تحصیل حاصل کی سعی کرتے۔

الحاج فیروز الدین صاحب! ایک روز ہم سب نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ کیا "آئینہ صداقت" جیسی کتاب لکھتے وقت آپ کو اس عظیم بارگاہ کی حاضری اور قیامت جیسے دن کی ہولناکی کا خیال تک نہ آیا، کسی کی خاطر اپنی عاقبت برباد کرنا کس کی

عقلندی ہے؛ جن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں، اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہوں پر آپ نے سنگین بتان لگاتے اور الزام عائد کیے ہیں۔ کیا بروترقیامت یہ بزرگ آپ کو گریبان سے پکڑ کر باری تعالیٰ شانہ کی بارگاہ سے انصاف کے طلب گار نہ ہوں گے؛ کیا اس روز یہ دھاندلی کام آجاتے گی؛

جب سرِ مشرود پوچھے گا بلا کے سامنے

کیا جوابِ جرم دو گئے تم خدا کے سامنے

۴۔ اس کتاب کے لکھنے کی چوتھی وجہ علمائے اہلسنت کی سہل پسندی اور خوش فہمی ہے۔

شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء میں "مرکزی مجلس رضا لاہور" نے راقم الحروف کا مقالہ "اعلمتہ کا فقہی مقام" شائع کیا۔ اس مقالے کے صفحہ ۱۹ پر ایک عبارت یوں ہے: "کسی زندہ قوم میں اس مرتبے کا کوئی عالم پیدا ہو جاتا تو وہ قوم اس کے علوم و فنون سے نہ صرف خود مستفید ہوتی بلکہ تمام دنیا کو اس کے افکار و نظریات پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتی؛"

اس عبارت پر ہمارے ایک محترم مولوی صاحب بڑ بیٹھے اور فرمایا کہ کیا اعلیٰ حضرت قدس سرہ

مردہ قوم میں پیدا ہوئے تھے؛ کیا علمائے اہلسنت نے اعلیٰ حضرت پر آپ کی نظریں کوئی قابلِ قہ کام نہیں کیا؛ فلاں کتاب میں میرا ایک مقالہ، فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک موجود ہے، اسے پڑھ کر اسے قائم کیجیے۔

گویا معاندین و مبتدعین نے جو امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لاکھوں صفحات سیاہ کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے کرم فرما مولوی صاحب نے چند صفحے کا ایک مضمون لکھ کر مخالفین کا سارا قہہ چکا دیا۔ اعلیٰ حضرت اور ان کی تعلیمات کو منظرِ عام پر لے آئے، فاضل بریلوی کو ہر کہ و مر سے امام نانہ منوا دیا۔ اہلسنت و جماعت کے سبب دکھ دور کر دیے۔ بھلا اس خوش فہمی اور صورتِ حالات سے چشم پوشی کی کوئی حد ہے؛

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جانا رہا

۵۔ پانچویں وجہ بعض موجودہ علمائے اہلسنت کی ستم نظریقی اور امام احمد رضا خاں بریلوی کے

ساتھ نادان دوستی تہ۔ ایسے بھی علمائے اہلسنت ہیں جنہوں نے اپنی صلح کلی میں یا ناقص مطالعہ و کوتاہ فہمی سے یا بعد عین زمانہ سے مرعوب ہو کر فاضل بریلوی قدس سرہ کی بعض تحقیقات کو اس رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے جس سے رضویت کا چہرہ تقریباً مسخ ہو رہا جاتا ہے۔ جب جید علمائے اہلسنت سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ایسی باتوں کا سبب اب کریں، ان حضرات کو سمجھاتیں تو کشتی اہلسنت کے یہ ناخدا کسی طرح بھی اپنی مہر سکوت توڑنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ اس افسوسناک صورت حال نے مجبور کیا امام احمد رضا خاں بریلوی کے علمی کارناموں کو کسی حد تک منضبط کرنے کی اپنی بساط بھر کوشش کر دی جائے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ان وجوہات کے تحت راقم الحروف کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک بڑھیا سوت کی اتلی لے کر شامل ہو سکتی ہے تو کیوں نہ حقائق کے پھولوں کا ایک گلہ استہ تیار کر کے مجدد دوران کے عقیدت مندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں۔ شاید یہی کاوش میرے لیے کفارۃ سیئات اور نجاتِ آخروی کا باعث بن جائے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت پیش ہی اُس وقت آتی ہے جب رہنمائی کے پردے میں رہنری اور تخریب کاری کا بازار گرم ہو چکا ہو۔ کسی بھی مجدد کے کارناموں کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے اُس کے گرد ایسے تخریب پسندوں کا جم غفیر نظر آئے گا جو رہنری کے پردے میں رہنری کا کام کرتے ہوں گے اور اصلاح کے نام پر فساد کی جڑیں مضبوط کرنا ان کا مشغولہ رہا ہوگا۔ چونکہ بد قسمتی سے ایسے لصوص دین بھی مسلمانوں کے سامنے قوم کے رہنما، دینی پیشوا اور روحانی مقتدا بن کر ہی آتے ہیں بایں وجہ کہتے ہی مسلمانوں کی قوت فیصلہ ایسے مواقع پر گھٹنے پیکر دیتی ہے اور اہل اسلام سے کتنے ہی بد نصیب ان کے بعض خوشنما کاموں کو دیکھ کر بک جاتے ہیں۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہ کے دور میں بھی دو طبقے تخریب دہی کا کام کرنے میں پیش پیش تھے یعنی حکومت اور نام نہاندہ ہی رہنما۔ بعینہ اسی صورت حال سے امام احمد رضا خاں بریلوی نور اللہ مرقدہ کو دوچار ہونا پڑا۔ وہاں اکبر اور جہانگیر تھے تو یہاں اسلام دشمن انگریز۔ وہ حکومت علی الاعلان اسلام کو بدلتے اور مٹانے پر مہم تھی لیکن انگریزی حکومت نامعلوم اور پراسرار طریقوں سے۔ اُس وقت کے فیض و فضل سے محروم علماء، جو دین محمدی کی جڑیں کھودنے میں مصروف تھے وہ صاف نظر آتے تھے کہ اسلام دشمن حکومت کے اراکین سلطنت میں

لہذا عوام الناس اُنھیں اپنا رہنما تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن برطانوی دور کے علمائے سونے ایسے نامعلوم طریقوں سے برٹش گورنمنٹ کے اسلام دشمنی والے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی محسوس کوشش کی کہ ملتِ اسلامیہ کے کتے ہی بیدار مغز حضرات تک کی قوتِ فیصلہ اُن کے کھوٹ کا سراغ لگانے سے قاصر ہو کر رہ گئی۔ مذکورہ صورتِ حال کے پیش نظر ہمیں اس کتاب کی پہلی جلد کا بیشتر حصہ محض تخریب کاروں کی سراغ رسانی کے لیے وقف کرنا پڑا۔ چاروں جلدوں کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں:

مجدد نامہ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف، انگریزوں کا تسلط، ذہنیت، لوٹ کھسوٹ، جلد اول مظالم، اسلام دشمنی کی صورتیں، برٹش نواز علماء خود اپنی تاریخ کے آئینے میں، اُنھوں نے مقدس شجرِ اسلام میں کسی کسی غیر اسلامی قلمیں لگائیں نیز ہندو کے ہاتھوں بک کر مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں ضم کرنے کی کسی کسی چالیں چلیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بر ملا ایک قوم بتایا، حتیٰ کہ گاندھی جیسے بُت پرست کو اپنا امام بنایا۔ جملہ عنوانات پر دلائل کے انبار۔

امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کا نظم و نشر میں خاکہ، علمائے جلد دوم بتدعین نے کون کون علی محاذ کھولے، سب کے ساتھ مقابلہ، گھمسان کاربن، میدانِ فاضل بریلوی کے ہاتھ، طرزِ استدلال کی جھکیاں، محاسبے کا خداداد سکہ، علمیت کے نمنے، تصانیف کا معیار اور اُن کے اعداد و شمار۔

آپ کا جامع العلوم ہونا گونا گوں تصانیف عالیہ کی روشنی میں، علمائے عرب و عجم جلد سوم کی نظر میں آپ کا مقام، فاضل بریلوی کے درجہ امامت پر سیر حاصل اور ایمان افزو بحث۔ جلد چارم اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا روحانی درجہ، آپ کے ملفوظات و مکتوبات وغیرہ۔

یہ کام یقیناً اتنا عظیم ہے کہ اس کے لیے علمائے کرام کا ایک بورڈ مقرر ہوتا، وہ حضرات متعلقہ مواد کو اکٹھا کر کے اُن سے اس مردِ حق آگاہ کے کارناموں کو ایک لڑی میں پرتے چلے جاتے۔ لیکن افسوس! امام احمد رضا خاں بریلوی جیسے جامع العلوم، مرکزِ دائرہ تحقیق اور فقہِ اعظم پر آج تک علمائے کرام نے جو کتابیں لکھی ہیں اُنھیں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال اُن چھوٹی موٹی کتابوں کا وجود بھی اس بے اعتنائی اور خود فراموشی

کے دور میں غنیمت ہے۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۶ء میں احقر کو بعض نفسِ مضمون سے خاص مناسبت رکھنے والی کتابیں اور بھی دستیاب ہو گئیں تو مجددِ مائتہ حاضرہ قدس سرہ کا تجدیدی کارنامہ اڑھائی تین ہزار صفحات تک پھیلتا چلا گیا اور ہنوز بعض کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کے باعث اس میں کافی کمی محسوس کرتا ہوں۔

بہر حال ہر دست جو کچھ تیار ہوا ہے اُسے غنیمت شمار کر کے چار جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔  
 یوں تو چار کا عدد بھی کئی وجہ سے بہت مبارک ہے لیکن لکھن ہے کہ اشاعت کی جانب سے حوصلہ افزا حالات پیدا ہو جائیں یا اہل علم حضرات کے تعاون سے بعض نایاب کتابوں تک رسائی ہو گئی تو شاید اس مقدس مجموعے کی پانچ جلدیں ہو جائیں۔ باری تعالیٰ شانہ اپنے عاجز بندے کو رات مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، علمائے کرام کو علمی معاونت کا جذبہ بخشنے اور کسی عوش نصیب پلشر کو اسے منظر عام پر لانے کا حوصلہ عطا فرمائے تاکہ معتقدوں کے علاوہ اُن لوگوں کے سامنے بھی امام زمانہ کا تذکرہ ایک شفاف آئینے کی صورت میں آجائے جو آج تک دورِ حاضر کی اس عظیم نظیر علمی مستی کو محض ایک خشک مُلا، بدعتی مولوی، جھگڑالو، پیٹ پرست اور انگریز کا ایجنٹ و نیو سمجھتے رہے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے جن علماء کو اُنھوں نے وارثِ علم پیر سمجھا ہوا تھا وہ علماء نہ تھے لصوصِ دین تھے، اُنھوں نے اپنی اسلام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی خاطر علمائے حق کو بدنام کیا، اُن کے خلاف متعدد حجاز کمرے اور علمائے سنی کی قضیہ خوانی کرتے رہے تاکہ اُنھیں بھی مسلمانوں میں سے ہمنوائی کرنے والے بن جائیں۔ اُن کے قائم کردہ فرقے کے شجرِ خبیثہ کی جڑیں بھی دور تک پھیل کر مضبوط ہو جائیں۔ ایسے معاندین کو خاص طور پر دکھانا ہے کہ بے دھوکا کھانے والو! جس کا فتاویٰ جہازی ساز کے چودہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور تمہیں بہکانے والے علماء جس کی بعض تصانیف کو پڑھ کر سمجھ لینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے، کیا وہ ایک خشک مُلا تھا یا دُنیا نے اسلام کا نقیبہ اعظم اور امام زمانہ، جس نے برٹش گورنمنٹ کے جملہ ایجنٹوں اور گاندھی کی شطرنج کے تمام مہروں کو مات کر دیا، علم و فضل کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود اُنھیں علی محاذ پر شکست فاش ہی نہیں دی بلکہ سب کی ناک خاک میں رگڑی۔ کیا وہ ایک جھگڑالو تھا یا حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ (المتوفی ۱۰۴۲ھ) کی طرح ایک زبردست مجاہد، حقانیت کا

علمبردار اور چودھویں صدی کا مجدد و تھا؛ جس کی کسی ایک تصنیف کا کسی مخالف سے آج تک جواب نہ لکھا جاسکا، بلکہ اُس کی کسی ایک دلیل کو بڑی ہی شرار سے آج تک دعویٰ سے بیگانہ ثابت نہ کر سکے بلکہ اُس کی ایک ہزار تصانیف میں سے کوئی ایک حوالہ بھی ایسا نہ دکھاسکے جو غلط ہو بلکہ اُس کے متعلق کسی سے آج تک یہ دکھایا نہیں جاسکا کہ فلاں مسئلے میں وہ اُمتِ محمدیہ کے اکابر کی تصریحات کے خلاف ہے۔ کیا جو اول سے آخر تک اکابر کے دامن سے وابستہ، اُسی مقدس اسلام کا علمبردار ہو، کسی ایک شتی میں بھی اُن سے سببِ مؤاخذات کرنا روا نہ رکھے، کسی ایک مسئلے میں اُن کی تصریحات سے انحراف نہ کرے وہ بدعتی مولوی ہے اور جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کے وظیفوں کی شراب سے مخمور اور گاندھی وغیرہ عمائدینِ کانگریس کے جال میں پھنس کر بڑا اور ٹانا کی تجویروں کی جھنکار سے مسحور ہو کر نبیِ آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے مقدس اسلام کا اُٹھتے بدلتے، اُس کی سورت کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فرود گزارا نہ کیا، آیا ایسے اسلام دشمن عناصر کو اُن کے خوشناما نعروں، تالیفاتِ قلوب کے سامانوں اور محض جتہ و دستار یا قال اللہ و قال رسول اللہ کی گڑبانوں کے باعث مسلمانوں کے خیر خواہ بلکہ رہنما بلکہ ملتِ اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا تسلیم کر لیا جائے؟

احقر نے مشعلِ راہ کی جلد اول میں یہی کٹھن اور دشوار گزار وادی طے کی ہے۔ ملک و ملت کی خیر خواہی میں وقت کی ضرورت اور صورتِ حالات کے تحت سب سے نازک اور سب سے اہم موضوع پر ظلم اٹھایا ہے۔ انصاف پسند حضرات ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہم نے کسی سے ذاتی عداوت یا دھڑے بندی کے طود پر الزام عائد نہیں کیے، بلکہ جو کچھ کہا ہے انصاف کی ترازو پر تول کر کہا ہے بلکہ وہی کچھ کہا ہے جو انھوں نے اپنی تصانیف کے اندر از خود لکھا ہے۔ ہم نے اُن کے اپنے ہی تیار کردہ آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی ہیں۔ اگر چشمِ بینا کو واقعی وہ چہرے بد صورت نظر آئیں تو اس کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چہرے ہی حقیقت میں بد نما تھے اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جن آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام کے تمام تلف کر دینے کے قابل ہیں۔

مبتدعینِ حضرات اور اسلام دشمن طاقتوں کے پُر اسرار کارندوں کے بارے میں

راقم الحروف کا قلم اٹھانا ان کے معتقدین کی دل آزاری کی خاطر نہیں بلکہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کا نازک فریضہ دو وجہ سے ادا کرنا پڑا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا نض مضمون چودھویں صدی کے مجدد امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرنا ہے اور تجدید اُس وقت تک بیان کی نہیں جاسکتی جب تک اُس دور کی تخریب کاری کا مکمل نقشہ پیش نہ کر دیا جائے۔ دوسری وجہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کی فلاح داریں کا جذبہ ہے۔ یعنی جو مدعیان اسلام گمراہ گروں کے پیچھے لگ کر ان کے معتقد ہو کر گروہوں میں بٹ گئے، مسلمانوں کی چوڑھ سو سالہ جماعت یعنی سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت سے علیحدہ ہو گئے ہیں، انہیں یہ دکھا دیا جائے کہ جن حضرات کو آپ غلط فہمی میں پشورا اور رہنما تسلیم کر چکے ہیں، ان کے اصلی اور حقیقی خدو خال یہ تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ہمیں بتانا پڑا کہ مسلمانوں کی جمعیت اور شیرازہ بندی کو کس نے نقصان پہنچایا؟ یہ فرقے دور حاضر میں کس نے بنوائے؟ کن صاحبانِ مجتہد و دستار سے بنوائے؟ کس مقصد کی خاطر بنوائے؟ یہ بتا کر مدعیان اسلام سے اپیل کروں گا کہ ایسے حضرات کے پیچھے لگ کر دنیا میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا جنازہ نکالنا اور آخرت میں واصلِ جہنم ہونا زیادہ مفید ہے یا اس کے برعکس؟ یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑوں گا۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات ہمارے اس اقدام کو نظرِ استخسان سے نہ دیکھیں بلکہ غیر مسلموں کے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگ جائیں کہ کسی فرقے کے معتقدات یا اس کے اکابر پر تنقید کرنا منافی اندازِ فکر اور فضا کو مگر کرنا ہے۔ ایسے تمام حضرات کی خدمت میں ہم یہ وضاحت پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مقدس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوند کاری کرنے والوں اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے والوں کا تذکرہ کیوں ناگزیر سمجھا گیا؟

۱۔ جن حضرات کے ہم نے اسلام دشمنی کے پراسرار اور حقیقی خدو خال پیش کیے ہیں، ان میں سے اکثر انجمنانی ہو چکے اور ان کا معاملہ چونکہ اب براہِ راست اپنے مالک سے، لہذا ان کے بارے میں ہمیں اب کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، لیکن بد قسمتی سے انہیں کتنے ہی مدعیان اسلام نے اپنا پیر اور پشورا بنا لیا تھا اور ان کی حقیقت کو

نہ سمجھنے کی بدولت کہتے ہی اسلام کا دعویٰ کرنے والے آج بھی بخوشی اسی گمراہی کے گڑھے میں لڑھکتے جا رہے ہیں جس میں اُن کے پیشوا گرے تھے۔ چونکہ اُنھیں وہنا سمجھنے والے اندھا دُھند اسی عقین گڑھے میں گرتے جا رہے۔ جو آنکھ کھلنے پر مکمل تباہی نظر آجائے گی، لہذا کلمہ گوئی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے، اُنھیں اُخروی زیاں سے بچانے اور قعرِ جہنم سے نجات دلانے کی محض یہ ایک مدلل اپیل اور تفصیلی گزارش ہے اور بس۔  
کیا یہ منفی اندازِ فکر ہے؟

۲- قرآنِ کریم ہی کو دیکھ لیجیے کہ اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کا بطلان خوب شرح و بسط کے ساتھ واضح فرمایا اور اُن کے سرغنوں کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذیل و خوار کیا، حتیٰ کہ مسلمانوں کا دم بھرنے والے اُن عناصر کی خلافتِ اسلام سرگرمیوں کے راز کھول کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیے اور اُن کے وجود کو ملتِ اسلامیہ کے لیے ٹھکے کافروں سے زیادہ نقصان دہ قرار دے کر وقت آنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے

اختری نبی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو واشکان لفظوں میں یوں حکم دیا:  
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ  
وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ  
اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن پر سختی فرماؤ۔

اللہ تعالیٰ نے تو اُن مسلمانوں کا دعویٰ کرنے والوں کے خلاف اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جہاد کرنے اور سختی بتنے کا حکم دیا تھا، جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے اور کافروں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں خفیہ طور پر مصروف رہتے تھے۔  
کیا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو منفی اندازِ فکر کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اسلامی تعلیم اور مثبت اندازِ فکر ہی ہے کہ غلط مدعیانِ اسلام کا محاسبہ کرنا نہایت ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔

اب اسی ارشادِ ربانی کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے کہ جن لوگوں نے برٹش گورنمنٹ



کے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر مبنی منصوبے اور انہیں متحدہ ہندوستان میں ایک  
عضو معطل بنا دینے والی سکیم کو مسلمانوں کے رہنما، پیشوا، ناخدا کشتی ملت اور مسیحی قوم  
وغیرہ بن کر کامیاب کیا، یا وہ لوگ جنہوں نے بایں جہود دستار گاندھی جیسے ملت اسلامیہ کے  
دشمن اور ٹھیٹھ بت پرست کی کٹیا پر رات دن ناصیہ فرسائی کی، اسلام اور ہندو مت  
کافرق مٹانے، باپو کی جے مناتے رہے، مسلمانوں کا رنج حرم سے سو منات کی جانب پھرتے  
رہے، کیا ایسے لوگوں کی خلافت اسلام، ظاہر اور پوشیدہ کارگزاریوں کو ظاہر کرنا حکم خداوندی  
کی تعمیل اور قرآن کریم کی تعلیم سے یا معنی انداز فکر؟

۳۔ وقت آنے پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے منافقوں کو نام لے لے کر مسجد نبوی  
سے باہر نکال دیا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے منافقوں کی تعمیر کردہ مسجد ضرار کو مسمار  
کروا دیا۔ ان کی مسجد کو از رو سے شرع مسجد قرار نہیں دیا گیا، ان کی نماز جنازہ پڑھنے اور  
ان کے لیے بخشش کی دعا کرنے سے آپ کو منع فرما دیا گیا۔ معلوم نہیں اسلامی رواداری کے  
نام نہاد علمبردار نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خود اللہ جل شانہ کے ان احکام کے بارے  
میں کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

۴۔ عبد رسالت کے فوراً بعد منکرین زکوٰۃ اور سبیلہ کذاب اور اسود غنسی وغیرہ مدعیان نبوت  
منظر عام پر آئے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی برابر کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وسلم کے برحق خلیفہ اول، امیر المؤمنین سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جملہ  
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے باتفاق اسٹے نہ صرف ان سے جہاد کیا بلکہ  
ان فتنوں کو بیخ دہن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، حالانکہ ملت اسلامیہ ان دنوں انتہائی  
نامساعد حالات سے دوچار تھی۔ یہ ہے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیار کردہ  
عظیم النظیر افراد کا طرز عمل جو مسلمانوں کے لیے قیامت تک روشنی کے مینار کا کام  
دیتا رہے گا۔ صحابہ کرام کے تقویٰ و طہارت اور اصابت اسٹے سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وسلم اس درجہ مطمئن تھے کہ اپنی بارگاہ کے ان تربیت یافتہ افراد کی پیروی کرنے کا  
بعد والوں کو یوں حکم دیا:

اصحابی کالتجویم بایہم اقتدیتم  
میرے تمام صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے  
اقتدیتم۔ لے  
جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی نے نہیں بلکہ خود اللہ جل شانہ نے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار  
دیتے ہوئے اپنے کلام معجز نظام میں واضح طور پر اور واضح کلمات لفظوں میں یہ اعلان فرمایا،  
فان آمنوا ببطل ما امنتم بیه  
چہر اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لائے جیسا تم  
فقد هتدوا وان تولوا فانما  
لائے، جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر نہ پھیرا  
هم فی شقاقٍ ہ لے  
تو وہ زری ضد میں ہیں۔

جملہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اللہ رب العزت نے  
سب کو ایمان کی حقیقی دولت سے مالا مال قرار دیا اور ان کی مغفرت کا عام اعلان فرمایا ہے:  
والذین آمنوا وهاجروا و  
اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی  
جاهدوا فی سبیل اللہ والذین  
راہ میں لڑے اور جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی،  
اودوا وصرود اولئک هم المؤمنون  
وہی پتے ایمان والے ہیں۔ ان کے لیے بخشش  
حقاً لهم مغفرة وای ذوق  
ہے اور عزت کی روزی۔

کریمہ لے

تمام صحابہ کرام کی مغفرت اور ان میں سے بھی جنہیں عظیم الشان اور عظیم النیر و ر بے  
مرحمت ہوئے ان کے بارے میں منعم حقیقی عز شانہ نے فرمایا ہے:

لا یتوی منکم من انفق  
تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے  
من قبل الفتح وقاتل اولئک  
مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ مرتبے میں ان  
اعظم درجة من الذین انفقوا  
سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد فتح کے خرچ اور  
من بعد وقاتلوا وکلاً  
جہاد کیا اور ان سب پہلے خرچ اور جہاد کر لیا

لے مرآة شرح مشکوٰۃ، جلد ہشتم، ص ۲۴۵ لے پ ۱، سورۃ البقرہ، آیت ۱۳۷  
لے پ ۱، سورۃ الانفال، آیت ۴۰

وَعَدَّ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ - ۱۰ اور بعد میں (سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مقدس گروہ ہمیشہ اذیہ جل شانہ، اور اُس کے آخری پیغامبر کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے وضاحت فرمادی ہے کہ وہ حضرات، قدسی صفات اپنی منزل مقصود کو پا چکے تھے، اُن کی قربانیاں بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی تھیں اور اللہ رب العزت نے اُنھیں اپنی رضا مندی کا یوں ثمرہ سُنادیا تھا:

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ  
الْمُهَاجِرِينَ وَالْمَنَاصِرِ الَّذِينَ  
اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَابٍ رَضِيَ اللَّهُ  
عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ  
جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ  
الْعَظِيمُ ۝ ۱۰

اور سب میں پہلے مہاجرین و انصار میں سے اور  
جو بھلائی کے ساتھ اُن کے پیرو ہوئے اللہ  
اُن سب سے راضی ہے اور وہ اللہ سے  
راضی ہیں اور اُن کے لیے باغ تیار کر کے  
یہاں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں  
وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے

مہاجر و انصار کے اولین گروہ اور باقی اُن کا اتباع کرنے والے، جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور دنیا میں ہی جنہیں جنت کا ثمرہ سُنادیا گیا، کیا انبیائے کرام کے بعد نبی نوع انسان کے اس افضل ترین گروہ سے بہتر کوئی اسلامی تعلیمات کو سمجھ سکتا تھا، کیا اس کا سیاق تین جماعت کے طرزِ عمل کو منفی انداز قرار دینے والے اسلامی زاویہ نظر رکھنے والے سمجھ جائیں یا غیر اسلامی نظریات کے حامل اور صحابہ کرام کے اتباع سے عاری، حالانکہ قرآن کریم کی دُوسری ایمان وہی معتبر جو صحابہ کرام کی طرح ہو، اعمال وہی مقبول ہوں گے جو اسی حضرات کے اتباع میں ہوں، اسلامی نظریات و تعلیمات کی وہی تعبیریں معقول اور قابل تسلیم ہیں جو اُن حضرات سے منقول ہیں۔ یہی مقدس گروہ قہرِ اسلام کی بنیاد تھا۔ جو عمارت اِس بنیاد پر تعمیر

ہوگی وہ اسلامی اور ان سے ہٹ کر جو عمارت بھی بنائی جائے گی، خواہ آس کی بنیاد قرآن کریم پر بتائی جائے یا احادیثِ مقدسہ پر، توجید پر مبنی ٹھہرائی جائے یا تصوف پر، سراسر غیر اسلامی اور عند اللہ ناقابل قبول ہوگی کیونکہ صحابہ ہی حقانیت کا مصیار اور کتاب و سنت کے عملی مفہوم و معانی کا وہ زندہ ثبوت ہیں جن کی نظیر چشمِ فلک کُن نے نہ آج تک دیکھی ہے اور نہ دیکھی جاسکتی ہے۔ خود اللہ ربُّ العزت نے اپنے اُن مقبول ترین بندوں اور عظیم الشان گروہ کی ترضیف فرمائی، اُنہیں سندِ قبولیت بخشی، کامیابی و کامرانی اور رحمت و رضوان کا مزہ سُنایا اور اُنہیں ہمیشہ باغ و بہشت اور آرام و راحت میں رکھے گا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَآذَعُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأَعْظَمَ مَرَجَةٍ عِنْدَ اللَّهِ ط وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ يَبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ ۱۰

وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں لڑے، اللہ کے یہاں اُن کا بڑا درجہ ہے اور وہی مراد کو پیچھے۔ اُن کا رب اُنہیں اپنی رحمت اور اپنی رضا کا مزہ سناتا ہے اور ایسے باغوں کا جو دائمی نعمت ہیں، ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے بے شک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

اللہ جل شانہ نے دوسرے مقام پر اسی وعدے کو یوں دہرایا ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِينٌ حَلِيبَةً فِي جَنَّةٍ عِدْنٍ ط وَرِضْوَانٍ

اللہ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے جنتوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کا جو جنتِ عدن میں ہیں اور اللہ کی

ہوگی وہ اسلامی اور ان سے ہٹ کر جو عمارت بھی بنائی جائے گی، خواہ آس کی بنیاد قرآن کریم پر بتائی جائے یا احادیثِ مقدسہ پر، توجید پر مبنی ٹھہرائی جائے یا تصوف پر، سراسر غیر اسلامی اور عند اللہ ناقابل قبول ہوگی کیونکہ صحابہ ہی حقانیت کا مصیار اور کتاب و سنت کے عملی مفہوم و معانی کا وہ زندہ ثبوت ہیں جن کی نظیر چشمِ فلک کُن نے نہ آج تک دیکھی ہے اور نہ دیکھی جاسکتی ہے۔ خود اللہ ربُّ العزت نے اپنے اُن مقبول ترین بندوں اور عظیم الشان گروہ کی ترضیف فرمائی، اُنہیں سندِ قبولیت بخشی، کامیابی و کامرانی اور رحمت و رضوان کا مزہ سُنایا اور اُنہیں ہمیشہ باغ و بہشت اور آرام و راحت میں رکھے گا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاتُوا وَجْهَهُمْ لِلدِّينِ  
وَمَا كَانُوا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ يَرْحَمُهُمُ اللَّهُ  
وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا  
الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ  
غَيْرٍ قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ  
وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ فِيهَا مِنْ شَيْءٍ جَدِيدٍ ۝

وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال و  
جان سے اللہ کی راہ میں لڑے، اللہ کے  
یہاں اُن کا بڑا درجہ ہے اور وہی مراد کو  
پہنچے۔ اُن کا رب اُنہیں اپنی رحمت اور اپنی  
رضا کا مزہ سناتا ہے اور ایسے باغوں کا  
جو دائمی نعمت ہیں، ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے  
بے شک اللہ کے پاس بڑا ثواب  
ہے۔

اَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

اللہ جل شانہ نے دوسرے مقام پر اسی وعدے کو یوں دہرایا ہے:

وَعَدَّ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ  
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
يُغْلَبُونَ فِيهَا وَمَسَاكِينٌ حَلِيبَةً  
فِي جَنَّتِ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٌ

اللہ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے  
جنتوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں  
رواں ہیں، اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ  
مکانوں کا جو جنتِ عدن میں ہیں اور اللہ کی

لے پ ۱۰، سورہ التوبہ، آیت ۲۰

مِنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ذٰلِكَ هُوَ  
 الْقَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ۱۰  
 رضا جو سب سے بڑی (نعمت) ہے۔ یہ ہے  
 سب سے بڑی کامیابی۔

اسی مقام پر چند آیات کے پُروردگارِ عالم نے صحابہ کرام کی قربانیوں کو شرفِ قبولیت بخشے ہوئے  
 انہیں اپنی نوازشات کا ان لفظوں میں بھی مشورہ سنایا ہے:

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا  
 مَعَهٗ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ  
 وَاَوْلِيَّائِكُمْ لَسَلَمُ الْغَيْرَاتُ وَاَوْلِيَّائِكُمْ  
 هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ  
 جَنَّةٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ  
 خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ الْقَوْزُ الْعَظِيْمُ  
 لیکن رسول اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ،  
 انہوں نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد  
 کیا اور انہیں کے لیے سجلیاں ہیں اور یہی  
 مراد کو پیچھے۔ اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھی  
 ہیں ایسی بہشتیں جو کے نیچے نہریں رواں ہیں  
 ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہی بڑی مراد ملنی ہے۔

یہ ہے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مقدس گروہ، جن کے اعمال مقبول، جن کا ایمان  
 باقی امتِ محمدیہ کے لیے نمونہ، جو دنیا میں رضا سے الہی اور وعدہ جنت کی بشارتوں سے نواز گئے  
 ان کا طرزِ عمل اور اللہ ورسول (جل جلالہ) و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کے تحت  
 اندازِ فکر یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے اگر وہ اور  
 اس کے تابعین اس انتہائی تلبیس سے باز نہ آئیں تو صحابہ کرام نے انہیں موت کے گھاٹ  
 اتار دینے کے علاوہ کوئی اور سلوک تجویز ہی نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی جن لوگوں نے اسلامی  
 فرائض میں سے صرف ایک زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے سے جواب دے بیٹھے  
 خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ مقدس میں صحابہ کرام نے با اتفاق مانے  
 ان لوگوں سے بھی جہاد کیا اور ان کے دعویٰ اسلامی کو ایک پرکھ کے برابر حیثیت  
 نہ دی۔

۱۰ پ ۱۰، سورۃ التوبہ، آیت ۲۰

۱۱ پ ۱۰، سورۃ التوبہ، آیت ۸۹

اب کیا فرماتے ہیں آج کے مدعیانِ علم و دانش کہ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو دورِ حاضر کے مجال اور اُس کے پیروکاروں کے ساتھ از روئے شرع کیا سلوک ہوتا، صحابہ کرام نے تو ایک ہی فرض کے انکار کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن جو آج اکثر فراتھن کے منکر ہیں اور جن کے نزدیک صرف اسلام کا دعویٰ کر لینا ہی اُن کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے، ایسے مدعیانِ اسلام اور اُن صاحبانِ جُتہ و دستار کے ساتھ اسلامی حکومت کیا سلوک کرتی جنہوں نے برٹش گورنمنٹ اور ہندو بے بہود کے ایما پر، اُن کے وظائف کے تحت، مقدس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی قلیں لگائیں، اسلام کے اینگلو انڈین ایدیشن تیار کیے، بعض اسلام اور عیسائیت کا فرق ملتے رہے تو کتنے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کو شیرو شکر بناتے اور سب کو اپنے گاندھی مہاراج کے قدموں میں جھکانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے، ایسے اسلام دشمن عناصر کا اسلامی حکومت کے ہاتھوں کیا عشر ہوتا، اگر بد قسمتی سے آج کہیں بھی ایسی اسلامی حکومت نہیں تو ایسے افراد کی نشان دہی جرم کون سے اسلام کے تحت ہو گئی، کیا مسلمانوں کو ازراہ ہمدردی غلط کار لوگوں سے خبردار کرنا منافی اندازِ فکر ہے، کیا آج کل کے اسلام میں رہنروں کو رہنما اور بدخواہوں کو خیر خواہ ماننا اور منواتا مثبت اندازِ فکر قرار دیا گیا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہر صدی میں مجدد بھیجتا ہی اسی لیے ہے کہ تخریب کاروں نے جو دینِ تین میں غتر بورد کر رکھی ہو، اُس کا تجزیہ کریں، صحیح و غلط اور حق و باطل میں اپنی خداداد قوت فیصلہ اور ہمتِ مردانہ سے تمیز کر دکھائیں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔ مثلاً امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۵ھ) نے فلاسفہ، معتزلہ اور زنادقہ کے عمائدین و سرغٹوں کو ہر میدان میں علی محاذ پر شکست دی۔ مباحثہ و مناظرہ اور تقریر و تحریر میں عمرِ صبر اُن کا محاسبہ کرتے رہے اور اپنے اس علی کارنامے کے باعث اُمتِ محمدیہ میں حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں حالانکہ امام موصوف کے مخالف علماء کا دعویٰ بھی دورِ حاصر کے بتدعین کی طرح یہی تھا کہ اصلی اسلام کے حقیقی علمبردار وہی ہیں۔

اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے اکبری دود

کے پیدا کردہ غلط کار علماء اور صوفیہ کا زبردست تعاقب کیا اور اسلامی خطوط سے ہٹی ہوئی حکومت کو تائید ایزدی اور ہمت مردانہ سے راہِ راست پر گامزن کر دیا۔ کیا اُس دور کے بے فیض و فضل یعنی نام نہاد ابوالفضل و فیضی اور غلط کار علماء و صوفیہ مسلمان ہونے کے دعویدار نہیں تھے؛ اُن کے دعویٰ اسلام کے باوجود انہیں آج بھی غلط کار اور سرہندی مرد حق آگاہ کو گیارہویں صدی کا مجتہد تسلیم کیا جاتا ہے۔

لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو سمجھنے سے ہم یقیناً بڑی حد تک اپنے آپ کو قاصر ہی سمجھیں گے کہ پچھلے تخریب کاروں یعنی رہنمائی کے بھیس میں رہنمائی کرنے والوں کو رہن ہی مانا جاتا ہے مگر رٹش گورنمنٹ جیسی استعماری طاقت اور ہندو بے بہبود جیسے مسلمانوں کے ازلی دشمنوں نے جن جتنے جتنے والوں کو خریدنا، اُن سے رہنمائی کے پردے میں رہنمائی کا کام لیا، ایسے لصوص دین اور بدخواہان اسلام و مسلمین کی نشان دہی کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے شر سے بچانے کو منطقی انداز فکر کون سے اسلام کے تحت قرار دیا جاتا ہے؟

۶۔ ہر حکومت امن عامر اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے پیش نظر جرائم پیشہ افراد پر کڑی نظر رکھتی، اور کتاب مجرم کی پاداش میں انہیں سزا میں دیتی ہے تاکہ انہیں عبرت ہو اور آئندہ لوگوں کو جانی اور مالی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کیا حکومت کا یہ اقدام فقہانہ طور پر یا اپنی رعیت کی خیر خواہی کا ثبوت؟ نیز جو حضرات آیتے عنانہ کی نشان دہی کریں تاہذا ذمہ دار حضرات اُن سے باخبر ہو کر مناسب اقدام اٹھا سکیں تو نشان دہی کرنے والوں کو غلط کار کہا جائے گا یا ملک و ملت کا خیر خواہ؟

۷۔ ہر حکومت کا ایک آئین ہوتا ہے، جسے وہ ملک میں نافذ کر کے تمام باشندوں کو اُس کی پابندی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر کوئی ایک شخص یا جماعت اُس آئین کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے گھر میں بیٹھ کر اُس آئین میں ترمیم کرے اور کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر انہیں اس ترمیمی آئین پر عمل کرنے کی ترغیب دے، بلکہ اس ترمیمی آئین ہی کو حکومت کا اصل آئین بتایا جائے تو ان حالات میں حکومت وقت ایسے فرد یا جماعت کو اپنا خیر خواہ سمجھے گی یا باغی شمار کرے اُس کے دماغ کو سیدھا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی؟ جو ایسے



پُر اسرار باغیوں کی نشان دہی کرے وہ غلط کار لوگوں کی نظر میں تو واقعی کھٹکے گا لیکن کیا حکومت وقت اُس نشان دہی کرنے والے کو بُرا سمجھے گی؟ کیا عقلاء کے نزدیک اُس کا یہ اقدام ملک و ملت کی خیر خواہی شمار ہوگا یا قابلِ ملامت و نفرت؟ جب دنیاوی حکومت کے پُر اسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا (جیسا کہ حکومت کی مشاورتخواہ کے تحت سیکورٹی فورس کرتی ہے) پسندیدہ اور قابلِ تحسین فعل ہے تو حکومت الہیہ کے ایسے پُر اسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا منطقی اندازِ فکر کہاں سے ہو گیا؟

۸۔ کیا جو حضرات اُن اکابر صحابہ کرام کو گالیاں دینا ثواب شمار کریں جن کے تقویٰ و طہارت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ چشمِ فلک کس نے جن کی نظیر ہرگز نہیں دیکھی۔ علاوہ بریں اسوائے چند اصحاب کے باقی اُس سارے مقدس گروہ کو مرد شمار کریں، کلام الہی جس میں کوئی ایک لفظ کی کمی بیشی کر سکا ہے نہ کر سکے، اُسے محرف بلکہ اول سے آخر تک گہری چھوٹی کتاب بتائیں، انجیل موجودہ کو غیر محرف ٹھہرائیں، مجاہد بن کربلاؤں کے خون سے بولی کھلیں، اُن کے مال و جان کو اپنے لیے مباح اور اُن کی پُر و برتری کرنے کے کارِ ثواب بتائیں، بلکہ مسلمانوں کے قتل کو کھلے کافروں، ٹھیٹھ بت پرستوں کے قتل سے زیادہ باعثِ ثواب شمار کریں، اپنے مہدی ہونے بلکہ صاحبِ وحی و عصمت ہونے کے راگِ الہی اور یوں اپنی جعلی نبوت کے پُر اسرار سانگ بھریں، اپنے بڑوں سے ایسی کراہتیں منسوب کریں کہ انبیائے کریم کے پھر سے بھی چمکے رہ جائیں، اللہ تعالیٰ سے مکلام ہونے بلکہ مصافحہ کرنے کا جھوٹا دعویٰ کریں تاکہ سپہ الانبیاء علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام کی تخصیص مٹائیں، اپنا کلمہ پڑھوانے کی تلقین کریں بلکہ اپنی ذات پر درود پڑھوائیں یہی سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش پر مسرت کرنے کو کنجیا کا سانگ گنائیں، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے آپ کے زمانے میں چھٹیل و نظیر اور سنائیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم شیطان لعین کے علم سے کم بتائیں۔ محیط زمین کے علم کا خرد و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے انکار کر کے بلکہ شرک بنا کر اسی علم کو شیطان مردود کے لیے نصوص سے ثابت سنائیں، یوں نصوص سے شیطان کو خدا کا شریک ہونا ثابت ٹھہرائیں،

سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علوم غیبیہ کثیرہ و عظیمہ وافرہ کو بچوں، پاکلوں اور جانوروں کی معلومات کے برابر سنائیں اور ذرانہ شرمائیں، نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کو جلاہ کا خیال اور فضل و کمال سے خالی بلکہ قرآن کریم کا انکار بتائیں اور مرتبی کے نام سے تیرھویں صدی میں نئی خاتمیت گھڑیں اور اُسے آپ کے شایان شان گناہیں یوں برٹش گورنمنٹ جن سے دعویٰ نبوت کر داتی ان کے لیے چور دروازے بنائیں، احادیثِ مطہرہ کے دفاتر کو من گھڑت پلندے ٹھہرائیں، پیشانی پر قشقہ کھینچ کر ہنود کی بے کے نعرے لگائیں، اُن کی ارتھیاں اٹھائیں، سماہیوں پر پھولوں کی چادریں چڑھائیں، گاندھی کو نہ صرف اپنا پیشوا اور امام علی الاطلاق بنائیں بلکہ اُس ٹھیٹ مشرک، کھلے بت پرست کو نبوت کا اہل سنائیں، باری تعالیٰ شانہ کو مجسم ٹھہرا کر حادث بنائیں بلکہ اُس کا جھوٹا ہو جانا ممکن بنا کر کاذب بالفعل تک ٹھہرائیں بلکہ وقوع کذب کے معنی درست ہو جانا تک سنا کر اپنا منکر انوکھیت ٹھیٹ دہریہ ہونا دکھائیں، کیا ایسے حضرات کو محض اُن کے جتہ دوستار کی بنا پر یا مولوی، مولانا، مفتی، حضرت جی، امام الہند، شیخ الاسلام، شیخ الہند، امام ربانی، قطب الاقطاب، فقیر النفس، میمانے قوم شاعر ملت، مصلح، ریفارمر، حکیم الامت، مفسر، محدث، نابغہ عصر، شمس العلماء، مجدد، شیخ اکمل اور امیر المؤمنین وغیرہ کہلاتے کے باعث ہی مسلمانوں کے رہنا، ملت اسلامیہ کے پیشوا اور اسلام کے خیر خواہ شمار کر لیا جائے، جلا کون سا مسلمان انہیں اپنا پیشوا مان سکتا ہے؟ کیا کسی صاحب عقل و دانش کو تزیب دیتا ہے کہ وہ رہناؤں کو چھوڑ کر لصوص دیہ کو رہنا تسلیم کریں، ایسے حالات میں شیطان، منافقین، بدینہ ایزید پلید اور دوسرے ملت اسلامیہ کے دشمنوں کی طرح ان حضرات کے سیاہ کارناموں سے درمیان اسلام کو باخبر کرنا ایک اخلاقی اور دینی فریضے کی ادائیگی ہے۔ کیا ایمان کے ظہروں سے لوگوں کو خبردار کرنا منافی اندازہ فکر ہے؟

۹۔ پاکستان کو معرض وجود میں آتے ہوئے اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا لیکن تاحالی تحریک پاکستان کی کوئی شایان شان تاریخ منظر عام پر نہیں آسکی اور نہ ابھی تک نظریہ پاکستان کو

انجا کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی تو بلکہ اندرون خانہ اسے منانے لگا۔ سبے راہبروں کی  
 فروغ دینے کی کوشش ہی ہوتی رہتی ہے۔ پاکستان کا مقصد لا اِلاَ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ  
 رَسُوْلُ اللّٰهِ بتایا جاتا تھا۔ گویا: س

ہم بدنا چاہتے تھے نظم میخانہ تمام  
 آپ نے بدلا ہے لیکن صرف میخانہ کا نام

اگر کوئی بھی حکومت تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کرواتی اور اُسے اسکولوں کالجوں میں  
 رائج کرتی نیز نظریہ پاکستان کے تحت پاکستان کی انتظامی مشینری چلائی جاتی تو یقیناً  
 اس مملکت خدا واد کا نقشہ پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو چکا ہوتا لیکن اس ستم ظریفی کی داد  
 بھلا کون دے سکتا ہے کہ دنیا کی اس سب سے بڑی اور نظریاتی مملکت میں پاکستان  
 بنانے والوں اور اس کی مخالفت میں سر دھڑکی بازی لگا دینے والوں کو ایک ہی لاشی  
 سے بانٹا گیا بلکہ پاکستان کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے والوں کو پامال اور اس کے  
 دشمنوں کو مال مال کیا گیا۔ جب بدخواہوں کو سزا دکھوں پر جگ ملی تو انہوں نے نظریہ پاکستان  
 کو دلوں اور دماغوں سے نکال دینے میں کوئی وقفہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس افسوسناک  
 صورت حال کا الٹا کیمرہ لگا ہوں کے سامنے ہے کہ کئی برسوں سے صرف سلامتی کو نسل کے  
 کا غذات کی زینت بن کر رہ گیا اور ملک کا ایک بازو کٹ چکا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی  
 مملکت اور نظریاتی ملک کا نقشہ سوٹ سکر کر رہ گیا۔ (اتاللہ وانا الیہ راجعون) س

وہاں ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس نہیں جاتا رہا

جب پاکستان کے پُر امراء دشمنوں یعنی اسی ملک میں رہ کر اس کی جڑیں اکھیڑنے والوں نے یہ  
 دیکھا دیا تو جن حضرات نے برطانوی اور گاندھی دور سے دین متین پر اپنی مخصوص عنایات کی  
 بارش کا برسانا شروع کیا ہوا ہے انہوں نے کیا گل نہیں کھلائے، کسی اہل نظر سے پوچھیے  
 کہ اسلامی اقدار و شعائر کا کیا حشر کیا جا رہا ہے، کیا رہنمائی کے عہد میں یوں رہنمائی  
 کرنے والوں کی نشان دہی اچھی بات ہیں، کیا لٹیروں کو رہنما بنا لینے میں وارین

کی جلدانی ہے؟ افسوس! سہ

متابعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہ کس کا فراد اکا غزہ خوں ریز ہے باقی

۱۰۔ یزیدِ پلید تختِ خلافت پر مٹکن بھی ہوا، اس کے باوجود ہر مسلمان اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، بلکہ کوئی مسلمان اُس کے نام پر اپنے کسی بچے کا نام رکھنا پسند نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود شاہِ گلگونِ قبا، سید الشہداء، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ہمیشہ خراجِ تعظیم پیش کیا جاتا رہا ہے اور لاکھوں مسلمان اپنے بچوں کا نام محمد حسین، علی حسین، غلام حسین اور غلام شہید وغیرہ رکھ کر امامِ عالی مقام سے اپنی تعظیم کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی اور سلطان یحییٰ شہید کی یادگاہوں میں ہر پڑھا لکھا مسلمان حسین و آفرین کے چھول نچاؤ کرتا ہے لیکن جعفر بنکال و صادق دکن نفرت و عقارت کی نگاہوں سے ہی دیکھے جاتے رہے ہیں مسلم شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا ہے:

جعفر از بنکال ہے صادق از دکن

ننگہ ملت، ننگِ دین، ننگِ وطن

کیا علمِ اقبال مرحوم کا یہ اندازِ فکر منطقی ہے؟ ہمارے کرم فرمانا صحیحین کی تلقین کلامِ حاصل

یہی ہوگا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یزیدِ پلید اپنے کپنی کو ایک ہی نظر سے

دیکھا جائے۔ حضرت مجتہدِ الف ثانی قدس سرہ اور ابوالفضل و فضلی کو کساں حیثیت دی جائے

سلطان فتح علی یلیو اور میر صادق جیسے قیمتِ فروش میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے۔ نواب

سراج الدولہ اور علی ویزوی خاں کو میر جعفر کے برابر ہی ٹھایا جائے۔ فخرالشیخ، خاتج سونٹا،

سلطان محمود غزنوی سے ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، عیدالکریم چھاگلہ، مولوی حسین احمد

ٹانڈوی، مولوی احمد سعید دہلوی، مولوی حفص الرحمن سیواری، مولوی عطاء اللہ شاہ

بخاری، مولوی داؤد غزنوی، عبد الغفار خاں سرحدی گاندھی اور شیخ عبد اللہ کشمیری

جیسے قیمتِ فروشوں کو فرو تر نہ سمجھا جائے۔

لیکن ہمارے ناصحین حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک دنیا میں ایک بھی نومی ہوش اور انصاف پسند باقی رہے گا اس وقت تک حضرت امام حسین، حضرت مجدد الف ثانی، سلطان محمود غزنوی، سلطان فتح علی بیگ اور نواب سراج الدولہ وغیرہ کو علی قدر مراتب ادب و احترام کی نگاہوں سے ہی دیکھا جائے گا لیکن یزید پلید، فیضی، ابوالفضل، میر جعفر، میر صادق اور ان کی معنوی ذریت کے نام سے بھی گھن آتی رہے گی۔ حق و باطل میں تمیز سوتی رہے گی اور انہیں شیرو شکر نہیں کیا جاسکے گا، کیونکہ ہر جو چپ رہے گی زبانِ سخن، لہو پھارے گا آستین کا

دریں حالات جن صاحبانِ مجتہد و متانت نے ہوش گریٹ کی جڑیں پاتاں تک پہنچانے اور گاندھی جیسے اسلام دشمن بڑے پست کو اپنا امام اور پیشوا بنا کر اسلام کو ہندومت میں مدغم کرنے اور ہندو مسلم کا فرق مٹانے بلکہ دونوں کی ایک مشترکہ قوم بنانے کی خاطر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر ڈالیں، ملتِ اسلامیہ کا رُخ کلمہ معظّمہ اور مذہبِ منورہ کی جانب سے لندن اور دوار کا کی طرف پھیرنے کی سر توڑ کوشش کی اور اس طرح مستعدانوں کی ایمانی زلفت کو ٹوٹ کر، ان کی اجتماعی عزت کو منتشر کر کے اسے مقابلہ ملالی نقصان پہنچاتے رہے، آخر ایسے حضرات کا اسلامیانِ پاک و ہند کے چہرے پر جو اہل ان سے کیا رشتہ ہے؟ ایسے روزوں سے عقیدت رکھنے والے ہیں دنیا و آخرت کی کون سی جلائی کاراڑیہاں ہے؟ آخر انہیں کابر کرنے سے روکا کیوں جاتا ہے؟

یہ دہشتور زبانِ بدی ہے کیسا تیری محفل میں

یہاں تو بات کرنے کو جگہ کتنی ہے زبانِ مسبری

۱۱۔ اگر تخریب کاروں کی نشان دہی مایہ نسیب مددگار سے تو ہر ایک حکومت میں ہوتی ہے، ذی حکے محکمے کا مقصد کیا ہے؟ پولیس کس لیے رکھی جاتی ہے؟ فوج میں سپینوڑی کا عملہ اور ایم اے پی کا کام کیا ہے؟ آخر ہر حکومت اس اقدام پر کیوں مجبور رہتی ہے؟ عدالتی نظام کا مقصد کیا ہے؟ ملزموں کا ریکارڈ رکھ کر ان کی اور ان کے لواحقین کی دل آزاری کیوں کی جاتی ہے؟ کیا ناصحین حضرات بتا سکتے ہیں کہ حکومت کا یہ نظام غلط ہے یا ملک اور قوم کی خیر خواہی کا

جذبہ ہی اس کے پیچھے کارفرما ہے؟

یقیناً ہر عاقل ان انتظامی امور کو ضروری قرار دے گا کیونکہ یہ اقدام ملک اور قوم کی بہتری اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہیں۔ جب اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ کار نہیں تو اس جانب سے آنکھیں کیوں بند کر لی جاتی ہیں کہ جان اور مال سے ایمان تو لاکھوں گنا عزیز ہے۔ جان و مال کے دشمنوں کی نسبت ایمان کے دشمنوں اور رہنوں کا محاسبہ بدرجہا ضروری ہے۔ اسلامی حکومت تو ایسے افراد کا محاسبہ کیا کرتی تھی کیا ان کا انداز فکر منفی تھا۔ آج حکومت اگر اسلامی ہونے کا ثبوت دینے سے محروم ہو جاتی ہیں تو ملک و ملت سے بھدروی رکھنے والا کوئی فرد جب صرف مسلمانوں کی بھدروی کے تحت ایسے رہنوں کی نشان دہی کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کا انداز فکر کس طرح منفی قرار دیے دیا جاتا ہے؟

کیا ایسے نامحین حضرات حکومت کو مشورہ دینے کے لیے تیار ہیں کہ وہ ملازموں کا ریکارڈ نہ رکھے، غلط کار اور جرائم پیشہ افراد کو سزائیں نہ دے کیونکہ ایسا کرنا نا صحیح کی اصطلاح کے مطابق ان مجرموں اور ان کے لواحقین کی ولایت دہی کا باعث ہے۔ کیا حکومت عدالتیں توڑ دے، پولیس، سی۔ آئی۔ ڈی اور سکیورٹی وغیرہ کے محکمے ختم کر دے؟ کیا ایسا کرنے سے نظام سلطنت درہم برہم نہ ہو جائے گا؟ کیا ایسا کرنے سے لوگوں کے مال و جان محفوظ رہ سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔ لہذا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ دینی معاملات میں کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا اس سے بھی ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔ اسے منفی انداز فکر قرار دینا کھوٹے سیکوں پر پردہ ڈالنا اور خود اپنے بھی کھوٹے کو چھپانے کا ایک حربہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ملکیت خدا اور پاکستان میں اس ستم ظریفی کا سلسلہ روز اول ہی سے چلا آ رہا ہے کہ محکمہ تعلیم نے اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتب میں ایسے ہی علماء اور لیڈروں کو ملت اسلامیہ کے رہنماؤں میں شمار کیا ہے جنہوں نے پراسرار طریقے پر قوم کو اپنے پیچھے لگا کر برٹش گورنمنٹ کی جڑیں مضبوط کیں یا گاندھی کو اپنا پیشوا بنا کر ملت اسلامیہ کو اس کے قدموں میں جھکانے اور ہندو مسلم فرق مٹانے، دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانے پر اپنی عمر عزیز

برباد کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کے عہد میں جو علمائے کرام مسلمانانِ پاک و ہند کی ناخداہی کا فریضہ ادا کرتے رہے، پورے نصاب میں ابتدائی جماعتوں کی کتابوں سے لے کر انتہائی جماعتوں کی کتب میں بھی ان حضرات کے بارے میں ایک ٹوٹا پھوٹا لفظ تک نہیں ملتا۔ کیا انگریزوں اور ہندوؤں کے چھینے لیڈر اور علماء کو ان کی تمام تر سیاہ کاریوں اور زہری کے باوجود مسلمانوں کا رہنا بتانا اور نیچے نیچے کو یہی رہنا نامنفی انداز فکر اور مسلمانانِ پاکستان کو گمراہ کرنا نہیں ہے؟ آخر ملک و ملت کے بدخواہوں کو خیر خواہ اور رہزنیوں کو رہبر بنانے میں دنیا اور آخرت کا کون سا نفع متوقع ہے؟ کیا خود اپنی قوم کو یوں اندھیرے میں رکھنا اور لصوصِ دین کا معتقد بنانا ایک قومی المیہ ہے یا نہیں؟

اے صاحبانِ عقل و دانش! انصاف سے کام لیجیے، کھرے کھوٹے میں تمیز کیجیے۔ رہزنیوں کو رہنا اور رہناؤں کو رہن بنانے کا مشغلہ ملک و ملت سے غداری اور واریں کی بربادی کا باعث ہے۔ خدا را خود اپنی اور دوسروں کی عاقبت برباد نہ کیجیے۔ آخر اس تخریب کاری کا پڑا سرا رجال بچانے والا انگریز بوریال ستر لے کر بھاگ گیا اور اپنے بڑے میں آوندے منہ جا پڑا ہے۔ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے وظیفے بند ہو گئے۔ وظیفہ خوار آنجہانی ہو چکے۔ اب ان کا معاملہ براہ راست اپنے پروردگار سے ہے۔ انہوں نے جیسے درخت بونے تھے ان کے پھل کھا رہے ہوں گے۔ انہوں نے اپنی عاقبت محض دنیا سنجانے کے لیے بھی تھی لیکن ان کے معتقدین و تابعین جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں رہنما تسلیم کر بیٹھے۔ ان بیچاروں کو نہ دنیاوی نفع نہ آخروی یعنی نہ وظیفے نہ ثواب۔ صرف نسبی یا علمی نسبت کی لالچی بکڑا کر، کسی نہ کسی اندھے کے پیچھے اپنی آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے کٹوتی میں گر رہے ہیں، لیکن ان کی لالچی چھوڑنے یا آنکھیں کھولنے کی آن بلکہ سمجھانے والے مسلمانوں پر وہی تباہی بہتان۔ جہلا اس زالی عقلمندی اور دانشوری کا کوئی ٹھکانا ہے؟

مجملہ مدعیانِ اسلام سے اپیل ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کا از روئے انصاف فیصد کریں۔ اگر کسی کی محبت یا نفرت پہلے سے دل میں جاگزیں ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اُسے

بالائے طاق رکھ دیجیے۔ غیر جانبدار ہو کر اور تنقیدی نظر سے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ یہ ایک شفاف آئینہ ہے۔ اس قدر نے بساط بھر یہی کوشش کی ہے کہ یہ آئینہ انصاف اور دیانتداری سے تیار ہو جاتے۔ جن کتابوں سے اسے مرتب کیا ہے وہ خود بتدعین حضرات کی ہیں۔ فیصد ہر قاری کی دیانت پر منحصر ہے۔ اگر موجودہ بتدعین کا دل بھی بے ساختہ شہادت دینے لگے کہ جن حضرات کو انھوں نے پیشوا بنایا ہوا تھا وہ ہرگز پیشوا نہیں تھے تو جانِ برادر! ناچی گروہ میں آنے، مسلمانوں کی جس حقیقی جماعت یعنی اہلسنت و جماعت سے آپ یا آپ کے بڑے بڑے کسے کے بہلانے پھیلانے پر علیحدہ ہو گئے تھے، اسی میں شامل ہو جانے سے کون سا نقصان پہنچ جائیگا؟ کیا یہ دارین کی بھلائی کا ذریعہ نہ ہوگا؟ آئیے! اپنے قدیم مرکز پر جمع ہو جائیے تاکہ سارے بھائی بھائی بن کر گلے لگ جائیں اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت بڑھ جائے۔ ایک مرکز پر جمع ہو جانے میں ہی دارین کی کامیابی و کامرانی ہے۔

اسے کاش ترے دل میں اتر جائے مری بات

جن حضرات کو پیش کردہ حوالوں میں سے کسی حوالے کی صحت کے بارے میں شک گزرے یا اس کے برعکس حوالے ان کے پیش نظر ہوں اور وہ افہام و تفہیم کے طور پر گفتگو کرنا چاہیں تو مکتبہ حامدیہ، گنج بخش روڈ، لاہور کی معرفت بعد شوق تحریری گفتگو کر سکتے ہیں۔ علامت اہلسنت کے پاس اگر کوئی ایسی کتاب ہو جو بتدعین کی تالیف یا مجددانہ حاضرہ قدس سرہ کے تجدیدی کارنامے میں معین و مددگار ثابت ہو سکتی ہے تو مذکورہ پتے پر ارسال فرمائیں۔ استفادہ کے بعد فوراً بعد شکریہ واپس کر دی جائے گی۔ امید ہے کہ علامت کرام تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ کے تحت راقم الحروف کو فراموش نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں مولانا انوارالاسلام صاحب سے ملنا، انھیں کوئی کتاب مرحمت فرمانا اس قدر ہی کو عطا فرمانا سمجھ جائیگا۔ مجددانہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کو بیان کرنے کے سلسلے میں جتنی کتابوں کا موجود ہونا ضروری تھا وہ یقیناً ہمارے پاس ساری نہیں ہیں اور نہ ہم اتنی کتابیں فراہم کر ہی سکتے ہیں۔ اپنی اس تنگدہانی کے باعث جلد اول سدرت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں، جو ہمارے نزدیک نامکمل ہوتے ہوئے بھی اپنے موضوع کی جملہ تصانیف سے بڑھ کر



مواد سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ محض علمائے کرام کی نظرِ کرم اور ان بزرگوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اہل علم حضرات سے ہم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی خاطر تعادد کی پھر اپیل کرتے ہیں کہ کتابوں کے ذریعے ہمیں زیادہ سے زیادہ نوازیں تاکہ منعاً براہ کی بقیہ جلدیں ترمیم و اضافوں کے ساتھ شایان شان طریقے سے منقذ شہود پر جلوہ گر ہوں۔ نیز فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جتنی بھی تصانیف کی فہرست ملے اور آپ کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط کی نقل و مرمت فرمائیں جن کے نام المجلد المعدد اور سوانح اعلیٰ حضرت میں درج نہ ہوں۔

اس مجموعے کی تدوین میں جن حضرات نے بعض کتابیں عنایت فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے ہماری مدد کی، احقر ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ جو صلہ افزائی کرنے والے قدر دانوں کا بھی شکر گزار اور ممنون ہوں۔ اپنے مخدوم و محترم عالیجناب محمد مسعود احمد صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج مٹھی ضلع تھریپارکر (صوبہ سندھ) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس ایسے الفاظ کہا، یقین جانیے کہ موصوف کی ہدایات نے راقم الحروف کو مشعلِ راہ کا کام دیا۔ اس عظیم و ضمیم مجموعے کو منظرِ عام پر لانے والے مولانا انوار الاسلام قادری رضوی جیسے عاشقِ رضویت کا احقر کیا شکریہ ادا کر سکتا ہے، باری تعالیٰ شانہ! انھیں اس خلوص و محبت اور جذبہٴ صادقہ کا آخرت میں بہترین صلہ دے اور اس دنیا میں انھیں اس سے بدرجہا زیادہ مزید مہذب اہلسنت و جماعت کی خدمت کا حوصلہ اور مواقع عطا فرماتے۔ (آمین)

اہل علم حضرات کو اس میں جس قدر خامیاں نظر آئیں، انھیں اس ناچیز کی کوتاہ علمی پر محمول کرتے ہوئے مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ جو کام کی باتیں نظر آئیں انھیں اس ناکارہ کے ولی نعمت، مرشدِ برحق، مفتی اعظم دہلی، حضرت شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ کرم اور فیضِ رضا کا کرشمہ شمار کیا جاتے۔ اللَّهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَ الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَ الْحَقُّنِ بِالصَّالِحِينَ۔ وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلٰى حَبِيْبِهِ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اٰلِهِ وَ صَحْبِهِ اَجْمَعِينَ۔

باب اول

marfat.com

Marfat.com

کھا اقبال نے شیخِ حرم سے  
 تو طلبِ مسجد سے کیا کون  
 نذر مسجد کی پیلاد ~~.....~~ جاتی  
 فرنگی بستکدے میں کھو گیا کون

(اقبال)

حَامِدًا وَ مُصَلِّيًا۔ تاریخین کرام! زیرِ نظر رسالے میں چودھویں صدی کے تجدیدی کارنامے کو پیش کرنا ہمارا موضوع سخن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جب تخریب اپنے عالم شباب میں ہو۔ تخریب کاری جب تک اپنے نقطہ عروج پر نہ پہنچ جائے تجدید کب منظر عام پر آتی ہے؛ کیونکہ سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب تجدید ہی اصلاح کا نقطہ عروج ہے۔ ظاہر ہوا کہ تجدید سے پہلے انتہائی تخریب کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمیں امام احمد رضا غلابریلوئی قدس سرہ کے تجدیدی کارنامے پر بحث کرنے سے پہلے ان افراد و عناصر کو ضرور دیکھنا ہوگا جنہوں نے تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی میں اصلاح کے نام پر اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی جسارت کی، اُمتِ محمدیہ کے تیرہ سو سالہ اجماعی اور سنیہ عقاید و نظریات سے انحراف کر کے غیر اسلامی نظریات کی مقدس شجرِ اسلام میں پتھوکاری کی اور اسی طرح ان بتدعین زمانہ نے اپنے اپنے انداز میں تخریبِ دین کا ناپاک فریضہ انجام دیا۔

سب سے پہلے تصویر کا یہ رُخ دکھانا ضروری ہے۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکمِ اِذَا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

جن حضرات نے سابقہ مجددین کے حالات پڑھے اور ان بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک ان خرابیوں کا ذکر نہ کیا جائے جن پر مذہبی رنگ و رخ چڑھا کر، اسلامی لیبیل لگا کر دین میں شامل کیا جا رہا ہو، اُس وقت تک یہ واضح کیا ہی نہیں جاسکتا کہ فلاں مجدد نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ مثلاً اکبری دور کی اسلام دشمنی اور "دین الہی" کی فتنہ ستانی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۴۲ھ/۱۶۲۴ء) کا، کیا کارنامہ پیش کیا جاسکتا ہے؛ اسی ضرورت کے تحت بتدعین زمانہ کی تخریبی کارروائی کا پیش کرنا لازم آیا ورنہ ہمیں اس گندگی کو کُردینے، اس سٹاس میں جھانکنے اور اس گُڑی کو اَدلنے بدلنے کی ضرورت کیا پڑی تھی؛ خدا گواہ ہے!

اُس کا حبیب شاہ ہے کہ کسی کی محبت یا نفرت کو درمیان میں حاصل کیے بغیر، مبتدعین کی صورتیں، تخریب کاروں کے چہرے، خود اُنہیں کے اُمینوں میں دکھائے ہیں۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں بغرض خیر خواہی صرف یہی کہا ہے کہ جن اپنے اُمینوں کو رانحوں نے منتشر کر کے گھروں میں چھپایا ہوا تھا، اُنہیں جمع کر کے قارئین کرام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب ہر چشم بنا خود ہی دیکھ لے گی کہ اسکے ہی اُمینوں میں مبتدعینِ زمانہ کی صورتیں کیسی نظر آتی ہیں؟

۵ اُنہیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی  
اُنہیں کے مطلب کی کہہ ہا ہوں، زبان میری ہے بات اُن کی

## انگریزوں کا قبضہ اور مظالم

۵ منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی  
اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں بٹھے

دوسری یورپین اقوام کی دیکھا دیکھی انگریزوں کو بھی متحدہ ہندوستان میں تجارت کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ ملکہ الزبتھ سے بعض انگریز تاجروں نے اجازت لے کر ۱۶۰۰ء میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ ۱۶۳۳ء میں باجن نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے مغل فرما نرو شاہجہان کی بڑی لڑکی جہاں آراء بیگم کا علاج کر کے کمپنی کے لیے مزید مراعات حاصل کیں۔ تلاش ملک کے باشندوں نے سرزمینِ پاک و ہند کو سونے کی پڑیا دیکھا تو چوری چھپے دونوں ہاتھوں سے ٹوٹنے اور جہد وقت یہاں اپنے پیر مضبوط کرنے میں کوشاں اور سرگرم عمل رہنے لگے۔

سلطان محی الدین اورنگ زیب کے زمانے میں انہوں نے چند سرکاری جہازوں کو لوٹ لیا۔ بادشاہ کے حکم سے ان کی کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ مگر فریب کی بن زدہ تصویروں نے سترہ ہزار پونڈ جرمانہ ادا کر کے رجم دل بادشاہ سے معافی حاصل کر لی۔ بنگال کا مکر پیدار علی ویردی خاں ایک بیدار مغز آدمی۔ ہم شناس حاکم تھا۔ انگریزوں کی فطرت اور خفیہ چالوں کو جانپ کر وہ ان عیاروں پر کڑی نظر دکھاتا تھا۔ موصوف نے اپنے ہانشین اور نواسے سراج الدولہ کو بھی انگریزوں کی فطرت اور کارگزاریوں سے باخبر رکھتے ہوئے

ان کے بارے میں سخت ہدایت کر رکھی تھی۔

علی ویردی خاں کی وفات کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ ہنگال کا نواب بنا تو انگریزوں نے علی ویردی خاں مرحوم کے دوسرے نواسے شوکت چنگ کو گانٹھو کر قلعہ بنڈیاں شروع کر دیں۔ اس پر فوراً تادیبی انداز میں نواب سراج الدولہ نے قاسم بازار اور کلکتہ کی انگریزی کوٹھیوں پر قبضہ کر کے ان کا انتظام مانک چند نامی ایک ہندو افسر کے سپرد کر دیا۔ لارڈ کلائیو مدرا سے فوج لا کر کلکتہ پر حملہ آور ہوا، لیکن مانک چند اس حملے کی اطلاع ملتے ہی انتظام چھوڑ کر بھاگ گیا تو کلائیو نے بغیر کسی مزاحمت کے آسانی سے کلکتہ اور ہنگلی پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعے سے اُس کی جرات یہاں تک بڑھی کہ سات روز تک کلکتہ میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ نواب سراج الدولہ نے ان کے استیصال کی ٹھان لی اور ایک لشکرِ جزار لے کر انگریزوں پر ہتھ بول دیا تھا تا کہ یہ آٹے و بون کا جھگڑا ایک روز مٹا ہی دیا جائے۔ کلائیو نے مقابلے کی تاب نہ دیکھتے ہوئے صلح کی پیشکش کر دی اور عہد نامہ مدرا اس کی رو سے صلح ہو گئی۔

یہ صلح کلائیو نے محض اس لیے چاہی تھی کہ نواب کی عظیم طاقت کو سازشوں کے جال میں الجھا کر کمزور کرنے کے لیے کچھ وقت مل جاتے۔ سراج الدولہ کے سپہ سالار لشکر اور علی ویردی خاں کے بہنوئی یعنی میر جعفر کو گانٹھو لیا نیز نواب کی فوج کے ڈومیل راج ورلہ اور مانک چند بھی خرید لیے گئے۔ ان غداروں کا ہاتھ میں آنا ہوا اور کلائیو نے زیادہ مہلت دینے بغیر ۱۷۵۷ء میں عہد نامہ مدرا اس کی دھجیاں اڑا کر پھینک دیں اور پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کے خلاف جنگ آزماہی کے لیے صف آراء ہو گیا۔

انگریزوں سے نواب کی فوجی قوت اگرچہ کٹی گئی تھی لیکن گھر کے بھیدی لشکا ڈھار ہے تھے اس لیے اپنوں کی بدولت شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنی غداری کے سرٹیفکیٹ پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے میر جعفر کے لڑکے میرن نامی نے نواب شجاع الدولہ کو اپنے ہاتھوں شہید کر دیا۔

۷ دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر

دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

شجاع الدولہ کی جگہ کلائیوں نے اپنے محسن اور چہیتے لیکن ننگ ملک و ملت یعنی میر جعفر کو  
 بنگال کا نواب مقرر کر دیا۔ میر جعفر نے ازراہ تشکر و امتنان انگریزوں کے لیے قومی خزانے کا  
 منہ چوڑا کھول دیا۔ قوم کی گاڑھے خون پسینے کی کمانی کو انتہائی بے دردی سے اپنے آقاؤں  
 پر نچاؤ کرنا شروع کر دیا۔ کلائیوں کو اس خوشی میں دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ نقد اور چوبیس  
 لاکھ جاگیریں دیے۔ کونسل کے ممبروں کو بڑی بڑی بھاری رقمیں دیں۔ کپتان سے نچلے درجے  
 کے ہر افسر کو تین تین ہزار پونڈ انعام ملا۔ اسی لیے تو بنگال کے لوگ میر جعفر کو "کلائیوں کا گدھا"  
 کہا کرتے تھے۔ انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے میر جعفر نے انعامات و تحائف کا سلسلہ  
 باقاعدگی سے جاری رکھا لیکن ایک روز خزانہ بھی اسی طرح خالی ہو گیا جس طرح میر جعفر کا  
 سینہ ملک و ملت کے درد سے خالی تھا۔ انگریز صاحب بہادروں کی یہ حالت دیکھ کر موڈ  
 خراب ہو گیا۔ میر جعفر کو برطرف کرنے کے اُس کے داماد میر قاسم کو نواب مقرر کر دیا گیا۔  
 میر قاسم بیدار مغز اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ کمپنی کی ٹوٹ کھسوٹ اور بنگالی جیسے  
 خوشحال ترین صوبے کی بد حالی اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ شروع میں تو مصلحتاً میر جعفر  
 کی سنت کو ادا کرنا پڑا لیکن کچھ عرصے بعد بڑا نومی ٹیڑوں کے مطالبات ماننے اور انھیں  
 پورا کرنے سے اپنے مجبور و معدوم ہونے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے ناراض  
 ہو کر اپنے اصلی پٹھو میر جعفر کے دوبارہ نواب ہونے کا اعلان کر دیا، تو اس موقع پر میر قاسم  
 اور انگریزوں میں طعن گئی۔ ۱۷۵۷ء میں بکسر کے مقام پر ایک فیصد گن لڑائی ہوئی، جس میں  
 میر قاسم کو افسوسناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس جنگ سے کیا نتائج برآمد ہوتے؟ اس کا  
 جواب میاں محمد شفیع کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"بکسر کی لڑائی (۱۷۵۷ء) نے ہندوستان کی کر توڑ دی اور انگریز کی ریڑھ  
 کے ٹہرے مضبوط ہو گئے جو ابھی تک لرزتے رہتے تھے۔ شجاع الدولہ کو

۱۷۵۷ء میں صاحب بھول گئے یہاں سراج الدولہ کے بجائے میر قاسم لکھنا چاہیے تھا۔ نواب سراج الدولہ تو بکسر کی لڑائی  
 سے چند سات سال پہلے پلاسی کی جنگ میں جاہم شہادت نوش کر چکا تھا۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی۔

بالکل دب کر صلح کرنی پڑی۔ الہ آباد کے ساتھ کئی علاقے انگریزوں نے دبا لیے۔ غنیمت ہوا کہ ریاست بنگال اور ہندو مسلمان کی چند روز زندگی نکل آئی۔ بنگال کے انگریز بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔ دولت ان کی لونڈی ہو گئی، اس لیے کہ صرف بنگال سے انھوں نے تین کروڑ ستائیس لاکھ ستر ہزار آٹھ سو تینتیس پونڈ وصول کیے۔ خاص نوابوں کی جیب سے جو رقم نکالی، اکیس لاکھ اہتر ہزار چھ سو پینسٹھ پونڈ تھی۔ ان رقموں کے علاوہ اور بہت کچھ دیگر ذرائع سے وصول کیا گیا، جس کے ساتھ عوام و خواص کی رگوں تک کا خون کھینچ کر لندن چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال کا رزق انھیں دنوں ختم ہو گیا اور اس امیر صوبے پر ہمیشہ کے لیے افلاس دوڑ گیا۔

جناب غلام رسول قہر نے انگریزوں کی ان عیاریوں کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

- ۱۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اصل ناظم سراج الدولہ تھا۔ اس سے جھگڑا پیدا کیا پھر صلح کر لی اور باہم معاہدہ ہو گیا، بایں ہر امیروں اور درباریوں خصوصاً میر جعفر نے خفیہ ساز باز کر کے سراج الدولہ کو ختم کر دینے کا بندوبست کیا گیا۔
- ۲۔ میر جعفر نے نظامت کی خاطر اپنے آقا سے غداری کی اور انگریزوں کے لیے کامیابی کا دروازہ کھولا، اسے نظامت ضرور دی گئی لیکن بے اندازہ رقمیں وصول کی گئیں بلکہ مالی مطالبوں کا ایک لاکھ تالیس سہ ہزار روپے جاری ہو گیا۔ میر جعفر تنگ آ گیا تو اسے مسند سے اتار کر اس کے داماد میر قاسم کو ناظم بنا دیا گیا۔

۳۔ میر قاسم بھی ٹوٹ کا سلسلہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا تو اس سے جنگ ہوئی اور دوبارہ میر جعفر کو گدی پر بٹھایا گیا۔

۴۔ اسی اثنا میں بادشاہ دہلی سے چھبیس لاکھ سالانہ دینے کے وعدے پر

۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اول، ۱۹۵۷ء، ص ۵۰



بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لی گئی۔ بالآخر بادشاہ کے چھپس لاکھ بھی ضبط کیے اور اس کے ملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گویا سراج الدولہ سے وفا کی نہ میر قاسم یا میر جعفر سے اور نواب شاہ دہلی سے۔ جس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نکلا، فائدہ اٹھایا، پھر اسے بے مصرف سمجھ کر پھینک دیا۔

ریاست ٹونک کے بہادر حکمران، نواب امیر خاں نے بھی انگریزوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لارڈ دارن ہیسٹنگ نے یہ محاذ حسب تصریحات مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی وغیرہ کے سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ) کے ذریعے فتح کیا، جس کا مفصل اور مدلل ذکر آگے آئے گا۔ موصوف نے بڑی رازداری اور نیک حلالی کے ساتھ اس پھرے ہوتے شیر کو انگریزوں کے شیطانی پھرے میں گرفتار کیا تھا، اپنے مہربان آقاؤں کے آہنی پھرے میں بند کر دیا اور اس طرح اپنی مہربان، بے روبریا اور غیر متعصب سرکار کی حدود مملکت کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں پورا پورا ہاتھ بٹایا کیونکہ اس انگریزی عملداری کو موصوف فخریہ طور پر اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے اور لارڈ دارن ہیسٹنگ بھی سید احمد صاحب کے ایسے کارناموں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا اور ان پر اعتماد رکھتا تھا۔ وسط ہند کے نواب امیر خاں، سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف جو کچھ برٹش گورنمنٹ کرنا چاہتی تھی وہ خود پرشے میں رہ کر سید احمد صاحب سے ہی کروایا گیا۔ نظام حیدر آباد کے بعد اگر مسلمانوں میں سے کسی نے سب سے بڑھ کر برٹش گورنمنٹ کے قیام و استحکام میں مدد دی تو وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی ہے لیکن ان صاحبان مجتہد و ستار نے اپنے ملک و ملت سے غداری کے کارناموں پر اصلان، جہاد اور شکھوں کے مظالم کا توڑ وغیرہ ایسے ایسے خوشنما لیل لگا کر قوم کے سامنے پیش کیے کہ عوام الناس کی کافی تعداد اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ آئندہ صفحات میں ہم تفصیلی طور پر حقائق پیش کر کے قارئین کرام سے فیصلہ چاہیں گے کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے

دین کی اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا تھا یا تخریب دین اور افراق بین المسلمین کا، موصوف  
 فی سبیل اللہ انگریزوں سے بھاگنے کے نکلے تھے یا انگریزوں کی غلداری کو دُست دینے کی  
 خاطر انگریزی امداد کے سہارے سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کے سکھوں کا زور توڑنے کیلئے  
 بھیجے گئے تھے، وہ مجاہد بننا چاہتے تھے یا انھیں بادشاہت اور نبوت کا سودا سما یا ہوا تھا؟

وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ حق یہ ہے کہ جس طرح اس  
 ظالم حکمران نے ویسی عوام و خواص کے خون کا آخری قطرہ تک پوس لینے کی اگر کوئی کسر رہ گئی تھی  
 تو پوری کر دکھائی اسی طرح جعفر بنگال اور صادق دکن جیسے ملت فردشوں سے جس جس شعبے میں  
 جو کمی رہ گئی تھی وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے پوری کر دکھائی اور ایسی رازداری سے کہ  
 پوری قوم آج تک اسی بجران میں مبتلا چلی آرہی ہے، موصوف کی تخریب کاری کے اثرات  
 متعدی مرض کی طرح پھیلے اور آج تک پھیلتے ہی جا رہے ہیں کیونکہ اُس پر جو خوشنما میل لگایا گیا  
 اُس کے پیش نظر کتنے ہی مسلمانوں نے اسے مرض کے بھاتے شفا اور بدخواہی کی جگہ خیر خواہی  
 سمجھ لیا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز کی ظالمانہ روش کا میاں محمد شفیع نے یوں نقشہ کھینچا ہے،

’وارن ہیسٹنگز نے ہندوستان اگر انگریزی اخلاق کی تکمیل کر دی۔ کوئی ظلم ایسا  
 نہ تھا جو اُس نے نہ کیا ہو اور کوئی بد عہدی ایسی نہ تھی جو عمل میں نہ لایا ہو۔  
 ملک گیری کی ہوسناکیوں اور زرکشی کی حرص پرستیوں کو آخری حد پر پہنچا دیا۔  
 اُس کے بعض مظالم تو ایسے دردناک ہیں کہ لکھتے وقت قلم کانپ جاتا ہے اور  
 ایسے شرمناک ہیں کہ غیرت اذی تحریر نہیں دیتی۔“

جیدر علی نے سیور کی پہلی اور خصوصاً دوسری لڑائی میں انگریزوں کی فوجی طاقت کا  
 جائزہ نکال دیا تھا۔ دوسری لڑائی میں انگریزوں کے مایہ ناز اور تجربہ کار جرنیلوں یعنی کرنل ہیلی  
 اور منرو جیسوں کی شیخی گر کر رہی کر کے انھیں عبرت ناک شکست دی تھی۔ جیدر علی کا اگرچہ  
 دوران جنگ ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن اُس کے جانشین سلطان فتح علی ٹیپو نے اپنے والد

کی طرح ایسی کامیابی سے دو سال تک متواتر جنگ لڑھی کہ وارن ہیسٹنگز کو مجبور ہو کر صلح کی پیشکش کرنی پڑی۔ معاہدے کی رو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیے گئے۔ آئندہ باہم نہ لڑنے اور دوستی کا عہد و پیمان ہو گیا، لیکن انگریز اور بدعہدی کے بھائی بہن ہیں۔

وارن ہیسٹنگز کے بعد ۱۷۸۵ء سے ۱۷۹۵ء تک لارڈ کارنوالس گورنر جنرل رہا۔ اس نے آتے ہی نظام اور مرہٹوں کو یہ جھانسدے کر اپنے ساتھ ملا لیا کہ آئندہ جو علاقے فتح کیے جائیں ان میں تینوں طاقتیں حصہ دار ہوں گی اور تینوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند رہیں گے۔ یہ اتحادِ ثلاثہ یا تثلیث انگریزوں نے اپنی فوجی قوت کو کمزور دیکھ کر کیا تھا۔ نظام کی نالافتی تو مشہور تھی لیکن اس موقع پر مرہٹے بھی دھکا کھا گئے کیونکہ ان کا مشہور اور مدبر سیاستدان، نانافرنیس مرچنٹ تھا۔ مرہٹوں نے اسلام دشمنی تو یہ نظر رکھی لیکن غلامی کی جن ظالمانہ اور عیارانہ زنجیروں میں پورا ملک جکڑا جا رہا تھا، ان کی طرف مرہٹوں کی نظر ہی نہ گئی۔

میسور کی دوسری لڑائی کے خاتمے پر انگریزوں نے جو سلطان فتح علی ٹیپو سے نہ لڑنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ کیا تھا، اسے پس پشت ڈالتے ہوئے ڈرانگور کے راجہ کی مدد کے بہانے سے، لارڈ کارنوالس نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر سلطنتِ میسور پر حملہ کر دیا۔ ایک سال تک ٹیپو سلطان مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا لیکن رسد کی کمی اور دشمن فوجوں کی کثرت کے پیش نظر سلطان کو صلح کرنی پڑ گئی۔ تین کروڑ تاوان جنگ دینا پڑا اور ریاست میسور کے تقریباً نصف حصے سے دستبردار ہو کر باقی آدھی ریاست کو بچانا پڑا۔ مفتوحہ نصف علاقے کو انگریزوں، مرہٹوں اور نظام نے آپس میں بانٹ لیا۔

کارنوالس کے بعد ولزی آیا جو ۱۷۹۵ء سے ۱۸۰۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ ولزی کو ملک گیری کی ہوس اپنے پیشرو سے بھی زیادہ تھی۔ سلطان نے فوراً اس خطرے کو محسوس کیا۔ نظام اور مرہٹوں کو سارے نشیب و فراز سمجھائے، لیکن تمام کوششیں رائیگان گئیں۔ ان سے مایوس ہو کر فرانس، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کے پاس اپنے سفیر بھیج کر مدد طلب کی۔ فرانس اور ترکی ان دنوں اپنے ہی مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے اس لیے بروقت کوئی مدد

نہیں کر سکتے تھے۔ زمان شاہ والی افغانستان نے اس اپیل کا غیر مقدم کیا اور سلطان فتح علی ٹیپو کی امداد کے لیے ایک لشکر جو اس کے فوراً روانہ ہو گیا۔ زمان شاہ ابھی پنجاب سے ہی گزر رہا تھا کہ افغانستان میں اپنے بھائی کے باغی ہو جانے کی خبر سن کر اس کی سرکوبی کرنے کی غرض سے مجبوراً واپس لوٹنا پڑا۔

بیرونی امداد سے سلطان یوں محروم نہ گیا اور اندرونی طور پر ولزلی نے سازش کا ایسا جال پھیلایا کہ میسور کے اراکین سلطنت میں سے میر صادق، میر غلام علی اور پورنیا جیسے انگریزوں کے ہاتھوں ہک گئے، سلطنت میسور کو چند روزہ زندگی کے آرام کے بدلے بیچنے اور متحدہ ہندوستان کو انگریزوں کا غلام بنانے پر تمل گئے۔ اس موقع پر کمپنی نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر بغیر کسی خوف و خطر کے تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کی فوجیں، میر صادق وغیرہ کی بدولت بغیر کسی روک ٹوک کے سرنگاپٹیم تک پہنچ گئیں۔ انیسویں صدی کا ہنوز آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمانانِ پاک و ہند کی امیدوں کا آخری چراغ بھی ۱۷۹۹ء میں بجھ گیا، ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ سلطان حیدر علی والی میسور جیسے شیر دل سپاہی، مدبر جرنیل اور اسلامی غیرت کے نشان کا مایہ ناز فرزند اور لائق ترین جانشین یعنی سلطان فتح علی ٹیپو بھی سرنگاپٹیم کے قلعے میں غداروں کی بدولت اس طرح محصور ہو گیا جیسے شیر آہنی پنجرے میں۔ ان نامساعد حالات میں بھی وہ مردِ مومن، شیر دل مجاہد اور مسلمانانِ پاک و ہند کی عظمت کا نشان، آخری وقت تک لڑتا رہا۔ جان دے دی لیکن اسلامی آن پر دھتہ نہ گئے دیا۔ انگریزوں کے سامنے گردن نہ جھکائی اور شہیدانِ کربلا کا سچا غلام ہونا ثابت کر گیا۔

زندگی کے اس نازک موڑ پر بھی عظمتِ اسلام کا یہ بیباک نقیب اپنوں اور بیگانوں کے سامنے یہ تاریخی اعلان کرتا ہے کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ بہادر سلطان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ سلطان کی لاش کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر فرطِ انبساط میں جنرل ہیٹرس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے: "آج سے ہندوستان ہمارا ہے، یہ کسی مجنون کی بڑ نہیں بکریب حقیقت کا اظہار تھا۔" انگلینڈ میں اس فتح کی خوشی میں جشن منایا گیا، چراغاں ہوا۔ برطانوی حکومت نے ولزلی

جیسے ننگ انسانیت کو مار کوس کا خطاب دیا اور جنرل ہیٹس کو لارڈ بنا دیا گیا۔ شہیدانِ کربلا کی سنت کو زندہ کر دکھانے والے عظیم سلطان کے متعلق ہر غیرت مند اور حریت پسند مسلمان کے منہ سے یہ الفاظِ دلی خلوص اور عظمت و عقیدت کے جذبات کے ساتھ دعا تہ انداز میں جاری ہو جاتے ہیں: س

ابر رحمت تیرے مرقد پر گہر باری کرے  
حشر میں شانِ کبریٰ ناز برداری کرے

وہ سلطانِ میپوشید جس سے انگریز ہر وقت خائف رہتے تھے۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کو جس کے ملک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی، کیا لارڈ ولزلی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس کی ریاست میں داخل ہو گیا تھا؟ سلطانِ میپوشید جیسے مدبر اور بیدار مغز حکمران کو خبر نہ ہوئی اور انگریزی فوج اپنے اتھاویوں سمیت سلطنتِ میسور کا جگر چیرتی ہوئی سرنگاپٹیم تک جا پہنچی، یہ ناممکن امر کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت سے ممکن ہو گیا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ اسی گھر کے ایک منحوس چراغ قابلِ حد ہزارہ نفرت و حقارت کا نام ہے۔ خود میر صادق نے ہی اپنے ہاتھوں اس گھر کو آگ لگائی تھی۔ اسی ناہوشنائے دروہمت نے پاک و ہند کے باشندوں کو برطانوی ڈاکوؤں کا غلام بنانے کا ناپاک فریضہ انجام دے کر تاریخ میں اپنے لیے بدترین مقام پسند کر لیا تھا۔ اسی لیے تو ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا: س

جعفر از ہنگال و صادق از دکن  
ننگِ ملت، ننگِ ویں، ننگِ وطن

سلطان حیدر علی اور اس کے فرزندوں۔ نامدار کی فراست، تدبر اور باریک بینی کو خواجہ تحسین پیش کرتے ہوئے نظام اور مرہٹوں کی کوتاہ اندیشی کا غلام رسول مہر نے یوں رونا رویا ہے:

تو ایسی حکمرانوں میں سے میسور کا فرماں روا حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے انگریزوں کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا۔ اس کی دور رس نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تو ملک خوفناک

آفات کا ہدف بن جائے گا۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جا سکتا ہے ...  
 حیدر علی کی تمام کوششیں انگریزوں کو ختم کر دینے کے لیے وقت رہیں ...  
 حیدر علی، نظام مرہٹوں اور ناظم کرناٹک کو بھی بار بار آگاہ کرتا رہا۔ اُس کے  
 فرزند میو سلطان نے بھی زندگی اسی مقصد کی تذر کر دی لیکن نظام اور مرہٹے  
 کوئی بھی شایان کام نہ کر سکے، صرف اسی وہم میں مبتلا رہے کہ انگریزوں کے  
 ساتھ ہو کر سلطنت میسور کو ختم کر دیں۔ وہ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے نظام کو  
 اس درجہ بے دست و پا بنا دیا کہ اُس کا عدم اور وجود برابر ہو گیا اور مرہٹوں کا  
 نشان تک باقی نہ چھوڑا۔۔۔ غرض سلطنت میسور کی تباہی انگریزوں کی جنگی  
 قوت کا کارنامہ نہ تھی بلکہ ویسی حکمرانوں خصوصاً نظام اور مرہٹوں کی نالائقی،  
 کو نہ اندیشی اور تفرقے کا نتیجہ تھی۔ ۱۵

سلطان میو کی شہادت اور سلطنت میسور کی تباہی کے بعد حسبِ منشا ٹھل کر کھینے  
 کے لیے ولزلی کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ بعض ریاستیں تو پہلے ہی انگریزوں کی باج گزار  
 ہو گئی تھیں، اب ولزلی نے باقی ویسی حکمرانوں کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ اپنی اپنی ریاست  
 میں انگریزوں کی امداد ہی فوج رکھیں اور اُس کے اخراجات بڑاشت کریں۔ جن ریاستوں نے  
 ایسا کرنے سے انکار کیا ان پر فوج کشی کر کے بعد دیگرے قبضہ کر لیا گیا لیکن جن حکمرانوں نے  
 اپنی اپنی ریاستوں میں انگریزی فوج رکھنا منظور کیا تھا ان کا انجام بھی دوسروں سے چٹاں  
 مختلف نہیں رہا۔ کسی سے ہمتی ہوتی فوج کے اخراجات پورے نہ ہو سکے، کوئی بساط سے  
 باہر خراج ادا کرنے سے قاصر رہ گیا اور کسی سے انگریزی عسکری کے مطالبات پورے نہ  
 ہو سکے تو اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے اُس ریاست کا ایک حصہ خرید لیا جاتا، دل  
 چاہتا تو ایسے حکمران کو ہٹا کر کسی اپنے نمک خولہ کو گدھی نشین کر دیتے اور اُس کے ذریعے  
 اُس ریاست کے عوام کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے اور

آنکارا اس علاقے کو ہڑپ کرنے پر جا کر ہی وہ قضیہ ختم ہوتا۔ انگریزوں کی اس پالیسی کا ولیم ہور نے یوں تجزیہ کیا ہے:

... نہ پورٹس اور حکمران انگریزوں کی دوستی کے جادو سے مسحور ہوئے ان کیلئے یہ دوستی انجام کار ہلک ثابت ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک کو تختِ حکومت سے اترنا پڑا یا وہ اس طاقت کے ہاتھ میں بے جان کھلونے بن کر رہ گئے جو اپنی مرضی پوری کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ ان حکمرانوں نے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی، نتیجہ دونوں حالتوں کا یکساں نکلا۔ اگر انھوں نے غاصب انگریزوں سے دوستانہ تعلقات گوارا نہ کیے تو ان پر ادا دہ ہائے بدکا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور ان کے علاقے مسحور ہو گئے۔ اگر انھوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی، تو وہ ڈپلومیسی کے بال میں اس طرح الجھ گئے کہ اپنی عزت اور موروثی مقبوضات سے محروم ہوتے بغیر نجات نہ پاسکے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے وہاں قیدی بن کر رہ گئے تھے۔

انگریز جو تاجر کے روپ میں آئے تھے لیکن ایک بلائے ناگہانی بن کر متحدہ ہندوستان کے اکثر حصے پر قبضہ جما بیٹھے کتنی ہی ریاستوں کو کال میٹاری سے معوم کر چکے تھے۔ بیماری کا کوئی ٹکڑا ایسا نہ تھا، جو انگریزوں نے ادا کو نہ دیکھا ہو، ٹوٹ کھوٹ کا کوئی ترکیب ایسی باقی نہ رہی تھی جو انھوں نے جاری نہ کی ہو۔ کیا پنجاب کی مسکھ ریاستوں نے اس خطرے سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار کی یا اسی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے بنی کو دیکھ کر بوڑھے آنکھیں بند ریارتا ہے، ہر صاحب کے اس حقیقت کے پورے کو یوں بے نقاب کیا ہے:

• مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں حکمرانوں نے مستحج اور جفا سکنے اور میان چند مسلیں قائم کر لی تھیں، جنہیں مسکھ ریاستوں کا آغاز سمجھنا چاہیے اور ستلج کے شمال میں بھی ان کی چند مسلیں تھیں، جن میں سے انجام کار رنجیت سنگھ نے

لے غلام رسول تہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲

خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر وہ ذرا دور اندیشی سے کام لیتا تو حمام سیکھوں کو متحد کر کے ایک پائیدار حکومت کا انتظام کر سکتا تھا لیکن اُس نے ذاتی برتری کے جھنڈے میں سٹیج اور جہنما کے درمیان کی سکھ مسلوں کو بدظن کر دیا اور وہ بھی انگریزوں کی آغوش میں چلی گئیں۔ رنجیت سنگھ کو پھر بھی ہوش نہ آیا۔ اُس نے اپنوں کو غیروں کے قبضے سے نکال کر اپنے ساتھ لانے کے بجائے انگریزوں سے (۱۸۰۹ء میں) معاہدہ کر کے سٹیج کو اپنی اور انگریزی سلطنت کے درمیان حدِ فاصل بنا لیا، گویا سیکھوں کی نصف قوت انگریزوں کے پاس چلی گئی، باقی نصف کارٹیس رنجیت سنگھ اس بنا پر خوش ہو گیا کہ اب کسی غلشن اور خدشے کے بغیر شمال اور مغرب میں اپنے حدود بڑھا سکے گا۔ اگرچہ حقیقتِ حال کے اعتبار سے اُس نے سیکھوں کے مستقبل پر سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔

اُس نے ایک طرف سیکھوں کے دو ٹکڑے کیے، دوسری طرف اپنے دائرہ حکومت کی توسیع کے لیے ایسی کوتاہ اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ ہر لادہ غیر مطمئن ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب انگریز ہندوستان کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک ہی جہت میں دیکھتے سٹیج سے پشاور جا پہنچے۔ سیکھوں کی حکومت کا نشان تک باقی نہ رہا اور ایک بھی آنکھ سیکھوں کی تباہی پر اشک باری کے لیے نہ مل سکی۔ آخر میں سیکھوں کے لیے فخر کی صرف ایک دستاویز باقی رہ گئی کہ انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر پورے ملک کو غلامی کی زنجیریں پسنائیں۔ سچا پس ساٹھ سال تک وہ ایسی سرمایہ فخر کے سہارے انگریزوں کی نظر میں محترم علیہ بنے رہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب انگریز متحدہ ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قبضہ جا چکے تھے۔ کتنی ہی چھوٹی بڑی ریاستوں کا حسرت ناک انجام سامنے تھا، اُن دنوں امیرانِ سندھ نے



سکھوں جیسی بداندیشی اور خود فریبی سے ہی کام لیا تھا یا کوئی قابلِ قدر ایسا بھی اقدام کیا جو  
حریت پسندی اور عاقبت اندیشی کے تحت کرنا پڑتا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی ہر صاحب  
کے لفظوں میں ہی پیشِ خدمت ہے:

”سندھ کی مثال سب سے بڑھ کر دردناک ہے۔ وہاں کے امیر ایک طرف  
انگریزوں سے بدکتے تھے اور دوسری طرف انہیں سکھوں کی پیش قدمی کا  
خطرہ پریشان کر رہا تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے  
کام لیا، وہ سکھوں کی پیش قدمی کے خطرے کو زیادہ سے زیادہ بھیانک  
صورت میں پیش کر کے امیروں پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جاتے رہے۔  
ذہنیت سنگم میں اتنی وسعتِ قلب اور وسعتِ نظر تھی کہ وہ امیروں کو  
پورا اطمینان دلا کر انگریزی اثرات کو دور رکھا اور نہ امیروں میں اتنی ہوشمندی  
تھی کہ وہ سکھوں کے خطرے کی روک تھام کے لیے کسی دوسری تدبیر سے  
کام لیتے اور انگریزوں سے بچے رہتے جو تقریباً بیسویں ویسی حکومتوں کو  
ہضم کر چکے تھے۔

امیروں سے حتیٰ معاہدہ تھا کہ نوج اُن کے علاقے میں سے نہ گزاری  
جانے گی لیکن پہلی جنگِ افغانستان میں انگریزوں نے اس شرط کی خلاف ورزی  
کی بلکہ شاہِ شجاع کو امیروں سے نہ پر یہ بھی بولا یا۔ جنگِ افغانستان ختم ہو گئی  
تو انگریزوں نے امیروں کو دوبارہ شروع کیا کہ تم نے تو ہماری مشکلات کے  
وقت دوستی کا حق ادا نہ کیا تھا، اب نیا معاہدہ کرو۔ مجوزہ معاہدہ امیروں کے  
استقلال کو ختم کرنا تھا۔ وہ بچا رہے تذبذب میں پڑے اور اُن پر حملہ کر دیا۔  
متحدہ ہندوستان کی جس ریاست پر بھی انگریزوں نے قبضہ کیا اسے دوستی کے چکر میں

اے غلامِ رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

لکھ ایضاً: ص ۱۷

پھنسا یا دوسروں کو ساتھ لے کر، اُسے دشمن ٹھہرا کر حملہ آور ہوئے اور قبضہ کر لیا۔ کیشی نے انگریزوں کی اس چالبازی پر یوں تبصرہ کیا ہے :

”کہا جاتا ہے کہ امیرانِ سندھ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے معاہدے توڑنے کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اگر معاہدوں کو توڑنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا کہ علاقے چھین ہاتے تو آج حکومتِ برطانیہ کے پاس دریائے برہم پتر اور دریائے سندھ کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی باقی نہ رہتا۔“

پنجاب، ناگپور اور ستارہ پر انگریزوں نے کس طرح قبضہ کیا؟ یہاں کس قسم کا جال پھیلا کر اپنی توسیع پسندی کی ہوس اور سرزمینِ پاک و ہند کے چتے چتے کو غلام بنا کر لوٹنے کی خواہش پوری کی، ملاحظہ ہو:

۱۔ ہارڈنگ نے سکھوں کی حکومت کا صرف ایک حصہ چھینا تھا اور کھنیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا، ڈلہوزی نے پورا پنجاب لے لیا اور ولپ سنگھ کو معزول کر کے فتح گڑھ (یو۔ پی) پہنچایا۔ اُس نے عیسائیت قبول کر لی، شاید اسی لیے کہ تختِ حکومت حاصل کرنا سہل ہو جائے گا لیکن عیسائیت اُسے انگریزوں کے قریب تر نہ لائی۔ اور آخری دور میں اُس سے جو بدسلوکیاں ہوئیں وہ بڑی ہی درد انگیز اور عبرت افزا تھیں۔

۲۔ ستارہ کی چھوٹی سی ریاست سیوا جی کے خاندان کے لیے رکھی گئی تھی۔ معاہدہ یہ ہوا تھا کہ وہ دو امانا قائم رہے گی۔ اپریل ۱۸۴۸ء میں ستارہ کے راجہ نے وفات پائی۔ اُس کے اولاد نہ تھی۔ لیکن ہندو دھرم کے رواج کے مطابق اُس نے ایک لڑکے کو متبلی بنا لیا تھا۔ ڈلہوزی نے

لے غلام رسول تھرا، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۷

متبنتی کو راجہ بنانا منظور نہ کیا اور ریاست ضبط کر لی۔

۳- ۱۸۵۳ء میں رگھوجی بھونسلوا والی ناگپور فوت ہوا۔ اُس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی اور غالباً اس خیال سے اُس نے کسی کو متبنتی نہ بنایا تھا کہ عوام اُسے اولاد پیا کرنے کی صلاحیت سے محروم سمجھ لیں گے، تاہم ملک کے سہاج اور بندود عہد کے مطابق اُس کی بیوہ متبنتی تجویز کر سکتی تھی۔ ڈلہوزی نے وڈ ریاست بھی بے تکلف سنبھال لی، پھر محلات کا سارا اسباب انتہائی بے دردی سے برسرِ عام نیلام کرایا، یہاں تک کہ ایک رانی بدسلوکی پر خفگی کے جوش میں پورے محل کو آگ لگوا دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔" بل

یہ ہے برطانوی لیٹروں کے متحدہ ہندوستان پر قابض ہونے کی مختصر سی کہانی اور نہ ماننے والوں کی خود اپنی زبانی۔ اس کے باوجود کتنی تم نظر یعنی ہے کہ بعض مُبتدعینِ زمانہ اور لصوصین نے برٹش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور اس کے باوجود انگریزوں کے اُن نمک خرابوں، ملک و ملت کے غداروں کو آج تک مسیحاٹے قوم، مسیح ربنا، ریفارمر اور معلوم نہیں کیا کیا منوانے کی ہم برابر جاری ہے۔ ایسے بیانات اسی کتاب کے باب چہارم کے اندر ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں۔ اب بانی علی گڑھ کالج سر سید احمد خاں کا انگریزوں کے متعلق ایک بیان ملاحظہ ہو کیونکہ پاکستان کا ایک طبقہ موصوف کو پاکستان کا معیارِ اول منوانے پر بضد ہے:

"اُن (سر سید) کی نہایت پختہ راستے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان

لے خیر۔ سول تہ : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳

کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت  
 نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بے زور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے ، بلکہ  
 درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی ، سو اسی  
 ضرورت نے ہندوستان کو ان کا محکوم بنا دیا ہے ۔

موصوف کے ہر لفظ سے کس طرح انگریزوں کی محبت کے دریا رواں ہیں ، عقیدت و احترام  
 کے کیسے کیسے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور ساتھ ہی دردندان ملک و ملت کی آنکھوں میں دھول  
 جھونک کر قوم کو کیسا خوش نادمو کا دیا جا رہا ہے کیونکہ مسیحائے قوم اور نا خدا سے کشتی ملت  
 بڑھ رہی ہے ۔ اکرالہ آبادی نے اسی لیے تو کہا تھا : ۔

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا ، ستید کو مرید بنا ہی لیا

سب پیروں سے تو بیچ نکلے ، اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

ایک طرف انگریز اپنی مخصوص پالیسی کے ذریعے ویسی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے  
 قبضہ جمانے لگے اور دوسری طرف اُس متحدہ ہندوستان کو ، جو کبھی سونے کی چڑیا مشہور تھا  
 اور جسے اپنی بعض مصنوعات پر بجا طور پر ناز تھا ، اُسے صنعتی لحاظ سے مفلوج کرنے میں بھی  
 برطانوی لٹیروں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا ۔ برطانوی لوگوں کے تاثرات ہمارے  
 سوتی کپڑے کی صنعت کے بارے میں اُس وقت یہ تھے : (بقول میاں محمد شفیع)

”ہندوستان کی جس چیز نے سب سے زیادہ تباہی مچائی ہوئی ہے وہ سوتی

کپڑا ہے ۔ ہمارا ( برطانوی ) اونی کپڑا اُس کے سامنے بے قدر ہو گیا ہے ۔

افسوس ہے کہ ہندوستانی دولت کوٹ رہے ہیں لیکن عیسائی برباد ہو رہے ہیں ،

کیا انجام ہوگا ؟ یہی کہ ہندوستانی دولت مند ہو جائیں گے اور ہم مفلس کے مفلس بنیں ۔

یہی میاں صاحب ہماری ریشمی صنعت کے بارے میں مسٹر شیڈن کا ایک بیان یوں

۱۔ الطاف حسین حالی : حیات جاوید ، ص ۶۸۲

۲۔ محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء مطبوعہ لاہور ، بار اول ، ۱۹۵۶ء ، ص ۱۰۱

نقل کرتے ہیں :

”انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا ہے، اس لیے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے ادھی قیمت پر انگلستان پہنچ جاتا ہے اور دونوں سے بہتر ہے۔“

اس سونے کی چڑیا پر قابض ہونے سے پہلے برطانیہ انتہائی پس ماندہ اور غریب ملک تھا۔ سرزمین پاک و ہند کو ٹوٹ کر انگریزوں نے اپنے ملک کو صنعتی بنا لیا اور صرف اول کے خوشحال ملکوں میں انگلستان کا شمار ہونے لگا۔ میاں محمد شفیع اس حقیقت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

”ہندوستان پر تصرف حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کی حیثیت نہایت معمولی تھی یہ سونے کی چڑیا ہاتھ لگی۔ پشت پالشت کی نسلوں کے خزانے انگلینڈ پہنچے تو کارخانوں کی بنیادیں شروع ہو گئیں۔ جہاں سرسبز چھاگا ہیں، تو تازہ مرغزار تھے وہاں چھتیاں ڈھواں اگلنے لگیں۔۔۔۔۔ ۱۸۵۰ء سے ہندوستان کی صنعت رُو بہ زوال ہوئی اور انگلستان میں کپڑا بننے کی دیگر صنعتی آسانیاں پیدا ہو گئیں، کھپیں مگلی آئیں، گھنٹوں کے کام مٹوں میں ہونے لگے۔ سستے مال ہندوستان کی بندرگاہوں میں پہنچے۔ ہندوستان کے ہاتھ سست پڑ کر پانے ڈھیر پھیلے رہے۔“

جب انگریزوں نے یہاں کی دولت کے ذریعے اپنے ملک کو صنعتی بنا کر شروع کیا تو چونکہ بنگال کے سوئی اور ریشمی کپڑوں نے فرانس اور اٹلی کی صنعتوں کو ناکارہ بن کے رکھ دیا تھا، اسی خطرے سے بچنے اور اپنی مصنوعات کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے کی غرض سے انگریزوں نے متحدہ ہندوستان کی صنعت پارچہ باقی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کمر

۱۔ محمد شفیع میاں، ۱۸۵۰ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۱

۲۔ ایضاً: ص ۱۰۲

اٹھانہ رکھی۔ اس سلسلے میں میاں صاحب نے مسٹر بورڈس کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

”پارچہ بافوں پر جرمانے کیے جاتے تھے، قید کی سزائیں دی جاتی تھیں، کوڑے لگاتے جاتے تھے۔ اُن سے چہرہ تجارتی عہد ناموں پر دستخط کرائے جاتے تھے۔ اس سے مصنوعات ناپید ہو گئی ہیں اور یہیں تو سخت گراں ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں اور علی ویردی خاں کے زمانے میں یہ پارچہ باف نہایت خوش تھے اور اب بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔“

وہی صنعتوں کو اس طرح تباہ کرنے کا معاملہ کہاں جا کر ختم ہوا یہ بھی میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

۱۸۵۰ء تک مکمل طور پر انگریزوں نے یہاں کی صنعت و تجارت کو ٹھکانے لگایا اور ہندوستان سوئی ٹیک کے لیے وہاں (انگلستان) کا محتاج ہو کر بیٹھ گیا۔ نہ تجارت رہی نہ جہاز رہے۔ روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ سلطنت، جاہلادیں، عزتیں، یہ سب تو جا ہی چکی تھیں، صنایعوں اور کارخانہ داروں کے طبقے کی تباہی نے قوم کی شومی قسمت کی داستان کو مکمل کر کے دلوں کے لیے ایک اور مسلسل ہرجاقت کا سامان مہیا کر دیا۔“

جب انگریز اپنی کمال عیاری سے ملک پر قبضہ کر رہے تھے، دونوں ہاتھوں سے یہاں کی دولت کو لوٹ رہے تھے، ہندوستان کی وہ صنعتیں جنہوں نے یورپ کی مصنوعات و پارچہ جات کو مقابلے میں بالکل ردی ثابت کیا تھا، ان ظالموں نے انہیں ٹھکانے لگا کر یہاں کے پارچہ بافوں اور صنعت کاروں کو محتاج بنا دیا۔ تجارت ختم کر دی اور ہر طرح تباہ و برباد کر کے سوئی ٹیک کے لیے انگلستان کا اس خطے کو محتاج بنا دیا تھا۔ اُن دنوں بھی انگریزوں کے ویسی نمک خوار وکیل صفائی بن کر اپنے آقاؤں کی یوں قصیدہ خوانی کر رہے تھے:

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۵

۲۔ ایضاً: ص ۱۰۸

”غرض ان (قاسمی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ درستی ملک اور صفائی راہ اور رفاہ عوام اور امنِ خلافت اور امانِ مخلوق اور راحتِ رسائی رعیت اور آرامِ دہی بریت میں حکامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اس وقت میں بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے ملا اور مفتی خوشامد کی راہ سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں، مگر میری نظر میں جو راج اور صحیح معلوم ہوا، وہ لکھ دیا اور قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔“

شاید اکبر الہ آبادی نے ایسے ہی انگریزوں کے مذاہن کی فوج کو دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا تھا:

ایمان نیچنے پہ ہیں اب سب ٹٹلے ہوئے

لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

داخلت فی الدین: جیٹ انگریز ویسی ریاستوں پر قبضہ جاتے جا رہے تھے، ملک کی دولت کو طرح طرح کے حربوں سے ٹوٹ رہے تھے، یہاں کی صنعتوں کو تباہ و برباد کر کے اور اپنے ملک کو صنعتی بنا کر پاک و ہند کے باشندوں کو انگلستان کا دستِ نگرینا کر گئے تو اہل ملک کی عزیز ترین متاع یعنی دولتِ دین و ایمان کو ٹوٹ لینے کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انگریزوں کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ ایٹیا کمپنی کے خرچ پر انگلینڈ سے پادری بلائے جاتے، وہ متحدہ ہندوستان میں آکر دوسرے مذاہب پر اعتراضات کا لائقا ہی سلسلہ شروع کر دیتے اور اپنی حقانیت جتانے کی غرض سے جگہ جگہ مناظروں کا چیلنج بھی دے دیا کرتے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیت کی حمایت میں بے شمار کتابیں شائع کروا کر مفت تقسیم کرنے لگے۔ چنانچہ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان مولوی عبدالرشید ارشد نے یوں نقل کیا ہے:

”انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو عیسائی بنانے کی اسکیم بنائی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا“

اس لیے انقیاد و اطاعت سے سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف، تسلط و قبضے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اس لیے پوری جانفشانی اور تندی کے ساتھ مذہب و ملک کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و چیلے سے کام لینا شروع کیا انہوں نے بچوں کو نافرمانوں کو اپنی زبان اور دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

خود مولوی عبدالرشید ارشد نے انگریزوں کی اس ظالمانہ روش کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے:

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے بجائے جبر و استبداد، لوٹ کھسوٹ کا عام دور دورہ تھا۔ مسلمان چھ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر انہوں نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ ہندو مسلمان باہم وگرتیرو و شکر کی طرح دہتے تھے مگر انگریزی عملداری میں ہندوستان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پارٹیوں کو نہ صرف تبلیغ کی عام اجازت تھی بلکہ انگریزی حکام ان کی پشت پناہی کرتے اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین کو پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس ضروری کر دیا گیا تھا۔ پادری عام جموں میں نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ ہی کرتے بلکہ ہندو اور مسلمانوں پر بے محابا جارحانہ حملے کیے جاتے۔ چونکہ انگریز کی نظر میں اس کا اصل نہ مقابل مسلمان تھا اور اسی کو وہ اپنا سیاسی خلیف سمجھتا تھا۔ اسی لیے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کو لپٹ اور ناکارہ نہ بنا دیا جائے گا اس وقت تک حکومت اور سر بلندی کا نشہ ان کے دماغوں سے نہیں نکلے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ظلم و جور اور تبلیغ عیسائیت کا نشانہ بنایا گیا۔

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۹۴

۲۔ ایضاً، ص ۹۴



اس منصوبے کے تحت بے شمار عیسائی پورے ملک میں پھیل گئے۔ ان میں پادری فنڈر کی سرگرمیاں سب سے نمایاں تھیں۔ ہر جگہ اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ اور مناظرے کا چیلنج دیتا پھیرا جاتا تھا۔ اہلسنت وجماعت کے مایہ ناز عالم دین یعنی پائیہ حرین مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے آگرہ کے تاریخی مناظرے میں اُسے وہ شکست فاش دے کر ساکت و صامت کیا کہ انگلستان کی طرف بھاگتے ہی بنی۔ غلام رسول مہرنے اس امر کا تذکرہ یوں سپرد قلم کیا ہے:

اس ضمن میں پادری فنڈر کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۵۲ء میں یہاں آیا تھا اور آتے ہی اسلام پر اعتراضات کا لاقبنا ہی سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ اُسے عربی اور فارسی سے خوب واقفیت تھی۔ اسلامی علوم کی کتابیں بھی دیکھ چکا تھا سادہ لوح علماء جنہیں عیسائیت سے چہاں واقفیت نہ تھی۔ فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ آخر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر ذریخاں نے بمقام آگہ فنڈر سے مناظرہ کیا۔ موضوع مناظرہ یہ تھا کہ توریت و انجیل میں تحریر ہوئی یا نہ ہوئی؟ فنڈر نے شکست کھائی اور وہ واپس چلا گیا تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ واضح ہو گئی کہ پادریوں کو دور دراز کے سفر کر کے یہاں آنے اور لوگوں کے عقائد بگاڑنے کی کوشش کرنے کا جو حصلہ کیوں ہوا؟

پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اس مناظرے کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

مولوی رحمت اللہ بن خلیل اللہ عثمانی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ کیرانہ ضلع مظفرنگر وٹن ہے۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولوی محمد حیات اور مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ سے تحصیل علم کی۔ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۵۲ء میں آگرہ میں پادری فنڈر سے مناظرہ کیا۔ فنڈر نے راہ فرار اختیار کی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بڑے زور کے ساتھ حصہ لیا، جس کے نتیجے میں جائیداد و

املاک ضبط ہو گئی اور مکہ معظمہ کو ہجرت کرنی پڑی۔ مکہ معظمہ میں صولت النصار بیگم کی استعانت و امداد سے مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔ عیسائیت کے رد میں بڑا کام کیا ہے۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔

میدانِ مناظرہ میں اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے سرکاری سطح پر دوسرا رنگ بدل دیا۔ تمام ملازموں کے نام عیسائیت قبول کر لینے کے پادری ایڈمنڈ سے خطوط لکھوائے گئے۔ انگریزوں کی اس شرمناک کارگزاری کا تذکرہ غلام رسول مہرنے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے،

”۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ایک طویل خط ملک کے تمام تعلیم یافتہ آدمیوں، خصوصاً معزز سرکاری ملازموں کے پاس بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا: اب ہندوستان میں ایک عہد ادبی ہو گئی، تار برقی سے سب جگہ کی جبر ایک ہو گئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی، مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔“ ان تمام باتوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا، اب حکومت نے عیسائیت کو فروغ دینے اور سابقہ مذاہب کو مٹا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔“

میاں محمد شفیع نے پادری ایڈمنڈ کے مذکورہ خطوط کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

”پہلے پہلے سکتی آگ پر پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ۱۸۵۵ء میں تمام دفاتر اور اہم اداروں میں ذیل کا اعلان بھیج کر تیل چھڑک دیا۔ جو شک میں تھے اُنھیں بھی یقین ہو گیا کہ انگریز ہمیں مذہب سے بھی محروم کر دیں گے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، دونوں پر اس کا یکساں اثر پڑا اور دونوں تپ گئے۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۰

۲۔ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹

۳۔ محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اول، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۷

پادریوں کی ان شرمناک سرگرمیوں میں حکومت کا ہاتھ تھا یا نہیں؟ میاں صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ پادریوں کی تحریک و تبلیغ میں خود گورنر شامل رہے ہیں۔ مبلغین عیسائیت کو باقاعدہ امداد دیکر تنخواہیں دی جاتی تھیں اور بعض گورنر تبلیغ میں خاصی دل چسپی اور جوش و سرگرمی رکھتے تھے۔

برٹش گورنمنٹ کا نظریہ و منصوبہ پادریوں کی سرگرمیوں سے واضح تھا۔ آخر ہزاروں میل دور سے یہاں آکر، اتنا خرچ برداشت کر کے پادریوں کو یہاں تبلیغ کرنے، دوسروں کے مذاہب پر اعتراضات جڑنے کی آخر کون سی ضرورت پڑی تھی؟ ضرورت بھی تسلیم کی جانے تو آمد و خرچ اتنے مصارف ایک مذہبی مبلغ کے پاس کہاں سے آئے؟ اگر مصارف ہوں بھی تو ہزاروں روپے خرچ کر کے یہاں آکر تبلیغ کرنے کے بجائے ایک کوڑی خرچ کیے بغیر اپنے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم رہ سکتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ پادریوں کو ہزاروں میل دور سے یہاں آنے کی قطعاً کوئی ضرورت تھی اور نہ کسی عام آدمی میں استطاعت پادریوں کی ضرورت تھی تو برٹش گورنمنٹ کو اور انھیں یہاں لانے، ان کے سارے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت تھی تو ایسٹ انڈیا کمپنی میں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ساری کارگزاری انگریزی حکومت کی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود یہاں کے ایک علی گڑھی ویل نامار، اپنی سرکار ابد قرار کی صفائی میں یوں گہرا ہوتے تھے:

”اول یہ ہے کہ کلکتے کے بعض پادریوں نے اپنے حسبِ عادت، مذہب و ملت کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کے طریقے پر ایک اعلان چھپوا کر عام طور پر ہندوستانیوں کے پاس بھیجا ہے اور ہندوستانیوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس قسم کے مضامین ابد پانڈار گورنمنٹ کے اشارے سے بھیجے گئے ہیں حالانکہ گورنمنٹ کو اس کی مطلقاً خبر نہیں ہے اور سرکار عالی مقدار کی یہ شان

برگز نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا کو اپنے دین و مذہب کی ترغیب و تخریب دے۔  
صاف ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں جو الگ الگ  
آئین رکھتے ہیں اور ان کا علاقہ اس سرکار والا اقتدار کے ماتحت ہے۔ گورنمنٹ  
ان پر لطف و کرم کی یکساں نظر رکھتی ہے۔ اقتدار کو اتنی مدت ہو چکی ہے، کبھی  
کسی سے مذہب و ملت کے بارے میں تعرض نہیں کیا گیا، اس میں اسلام  
ہوں یا دوسرے مذاہب و مملے!

ایسے آلہ کاروں کی صفائی کے باوجود گورنمنٹ کے خلاف نفرت کے عام جذبات بھڑکنے لگے،  
پادریوں کی ان سرگرمیوں کی ذمہ داری ہر کوئی حکومت پر ڈالتا تھا، ان سب سے قطع نظر  
علمائے دین کے مقابلے میں پادریوں کی شکستیں اور ذلت و ناکامی کے واقعات نے حکومت  
پر واضح کر دیا کہ اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تجویز نہایت ٹیڑھی رکھیر  
ثابت ہو کر رہے گی، اس حقیقت و تجربے کی روشنی میں جو کام پادریوں سے لینا تھا وہ حکومت  
نے اپنے کانٹے پادریوں سے لینا شروع کر دیا اور یورپین تعلیم و تہذیب کی قدروانی و حوصلہ افزائی  
شروع کر کے دینی علوم اور علوم مشرقیہ کی تحصیل کرنے والوں کو عضو معطل بنا دینے کی ٹھان لی۔  
ہر صاحب لکھتے ہیں:

”ابتداء میں مدرسوں اور کالجوں کے اندر تعلیم کا دوسرا طریقہ تھا۔ وہ تمام السنہ  
و علوم پڑھائے جاتے تھے جن کا پہلے رواج تھا، مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت،  
فقہ، حدیث، ہندو دھرم کی کتابیں وغیرہ، ان کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی  
جاتی تھی۔ بعد ازاں عربی اور فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی۔ فقہ، حدیث اور  
دوسری مذہبی کتابیں بند کر دی گئیں۔ اردو اور انگریزی کا زور ہوا۔ مذہبی  
علوم کی تعلیم ختم ہونے پر تشویش تھی ہی، اچانک حکومت نے اشتہار دے دیا  
کہ جو شخص سرکاری سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ ہو گا یا فلاں فلاں علوم اور

انگریزی میں امتحان دے کر سند حاصل کرے گا اسے دوسروں کے مقابلے میں ملازمت کے لیے ترجیح دی جائے گی۔ اس طرح تعلیم کے متعلق بھی سو دن پیدا ہو گا۔

جب انگریزی حکومت نے مذہبی تعلیم اسکولوں اور کالجوں سے خارج کر دی اور اس کی جگہ انگریزی زبان و علوم کو دے کر ملازمت کے سلسلے میں انگریزی تعلیم کو فوقیت اور اولیت دے کر مشرقی اور مذہبی علوم کو پامال کرنا شروع کیا تو اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ملازمت کے سلسلہ میں اپنے مقرر کردہ ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ کو لازمی قرار دیا۔ یہ امر متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نظر میں زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا کیونکہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ہی اس وقت ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے خدائے انگریزوں کے ایجنٹ سمجھتے تھے اور انہیں کالا پارہی کہا کرتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اس امر کا یوں اظہار کیا ہے:

”دفترا پیشگاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ

ہو گا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہو گا،

وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی

ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر، جن کو اب تک سب لوگ کالا پارہی

سمجھتے تھے، منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دلوں پر ایک

غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں عداوتی گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی۔

اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح سے معاشی اور محتاج کیا جاتا ہے کہ

تاجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائیگا۔“

سر سید احمد خاں صاحب بہادر نے اپنی سرکار نامہ دارہ بد پائمار کی صفائی پیش کرتے ہوئے

اور ملک و ملت کے دین و ایمان کی تباہی و بربادی کی اسکیموں کی تائید و تصدیق کرتے ہوئے

۱۔ غلام رسول قمر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰

۲۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۷

اپنی انگریز دوستی اور اقتدار پرستی کا ایسا کھل کر ثبوت دیا کہ دین فروشوں کی علی الاعلان حکومت کی حمایت اور ملک و قوم کے خلاف بولنے کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ موصوف اُس وقت خود ساختہ منصف بن کر یوں بیان داغتے ہیں:

”چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے عادل کانون تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اس ملک کے رہنے والے علوم و فنون اور انگریزی زبان حاصل کرنے کے اسکولوں کو اپنے مذہب و ملت کی تبدیلی کا سبب جانتے ہیں، اسی وجہ سے لوگ تحصیلِ علم و تکمیلِ فنون میں سستی کرتے ہیں، بچوں کو اسکولوں میں نہیں بھیجتے، یہ سب خیالات بد عقلی و کج فہمی کی وجہ سے ہیں۔“

انگریزی حکومت کی چال یہ تھی کہ جب اپنے کسی تخریبی منصوبے پر عمل کرنا منظور ہوتا تو اپنے ویسی ایجنٹوں سے اُس کے بارے میں تجویزیں پیش کروادی جاتی تھیں اُس کے بعد حکومت یہ کہہ کر احکامات جاری کر دیتی کہ ملک کے بعض اہل الرائے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم یہ حکم نافذ کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب حکومت نے سررشتہ تعلیم کے ذریعے مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں میں برائے نام باقی رکھا ہوا تھا تو عالیجناب، معنی القاب سرسید احمد خان صاحب نے یوں تجویز پیش کی تھی:

”سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے، وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خواب کرنے والا تربیت اہل ہند کا ہے۔ اُردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر نیکو تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو۔۔۔۔۔ میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت ویسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے، صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے

اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر طرح کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔“

بعض حضرات آج تک یہ کہتے ہوتے نہیں تھکتے کہ سر سید احمد خاں صاحب اردو زبان کے بہت بڑے حامی تھے اور آپ نے اس زبان کی بڑی خدمت کی تھی، ایسے حضرات ذرا آنکھیں کھول کر حیات جاوید کے اس حوالے کو پڑھیں اور انصاف کو یہ نظر رکھیں۔ مسلمان قوم کو بدلنے، اسلام سے نا آشنا کرنے اور نئی نسل کو دین سے ناواقف محسن رکھ کر انگریزی آہن اور بے راہ رو بنانے اور بنوانے میں کہیں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مرصوف بھی پورے پورے شریک کار تو نہیں تھے؟ یہ فیصلہ کرنا قارئین کرام کا کام ہے، وہ یہ کہتے ہیں، بسا یا ہے میاں ہم نے ہم یہ کہتے ہیں، اجاڑا تھا گلستان کس نے؟

جب مذہبی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں سے قطعاً خارج کر دیا گیا تو دینی علوم حاصل کرنے والے مسلمان ملازمتوں سے محروم رہ کر در بدر کی ٹھوکریں کمانے لگے یا قوم کے رحم و کرم پر پلنے کے لیے کسی مسجد میں اڈہ جما کر بیٹھ جاتے۔ اس کے برعکس جس نے انگریزی پڑھی ہوتی، اُسے کالے پادریوں (ڈپٹی انسپکٹروں) سے ملازمت کے لیے سرٹیفکیٹ مل جاتے اور خاصی گزر بسر کرتے نظر آتے۔ ان حالات میں کون سا والد ہے جو اپنے بچوں کو بے روزگار دیکھنا چاہتا ہو؟ انھیں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہو؟ اگرچہ دوسری طرف ایمانی غیرت اور دینی حمیت دامن جھلکتی تھی لیکن اولاد کی خوشحالی اور بد حالی کے جو مناظر روزانہ نگاہوں کے سامنے آرہے تھے اُن کے پیش نظر اکثر حضرات نے اپنے بچوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں کا راستہ ہی اختیار کیا جیسا کہ آزاد ہونے کے بعد سے مملکتِ خداداد پاکستان میں بھی کمال سعادت مندی اور فرمانبرداری کے ساتھ انگریزوں کی اسی اسلام دشمن پالیسی پر متواتر چھپس سال سے آج تک عمل ہوتا آرہا ہے۔

لے الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۱۴۲

بہر حال یہ راستہ اختیار کر کے ملازمت تو مل جاتی تھی۔ یہ تعلیم معاش کا ایک ذریعہ ضرور ہو گئی تھی لیکن جب یہ نونہالی اسکولوں اور کالجوں کی چار دیواری سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے تو وہی کچھ بن کر نکلتے تھے جو انگریز انجینئرز بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ مسلمان عیسائی بننے پر تو آمادہ نہ ہوئے اور انگریز اپنے اس مقصد میں واقعی ناکام رہے لیکن حکومت نے اپنا مقصود دوسری طرح حاصل کر لیا کہ ان کی تعلیم حاصل کرنے والی نئی نسل کی اس انداز سے ذہنی تربیت شروع کر دی، گفتار و کردار اور غور و فکر کے زاویے اس طرح بدل دیے کہ ادعات مسلمانوں کے علاوہ ان کے مسلمان ہونے کا ثبوت شاید ہی کوئی ملتا تھا۔ گویا عیسائی نہ بنے تو حقیقی مسلمان بھی نہ رہنے دیا۔ یہ تھا برطانوی منصوبہ جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے اور اسلام کے عظیم النظیر فیوض و برکات سے محروم رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کا ٹکراؤ: انگریز جس طرح ملک کے بلا شرکت غیر حاکم بنے، دولت لوٹی، یہاں کی صنعتیں تباہ کیں، پاک و ہند کے باشندوں کی پشت پالشت کے گاڑھے خون پسینے کی کماٹی سے جس طرح اپنے قلاشیں ملک انگلستان کو خوشحال اور صنعتی بنا دیا، ان میں ہرزخم دوسرے سے گہرا تھا۔ اہل ملک کو تڑپانے کے لیے ان میں سے ایک نظم بھی کافی تھا، لیکن پلے در پلے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے اور خون کا گھونٹ پی کر مظلوم سہتے جا رہے تھے مگر جب پاک و ہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر عمل شروع ہوا تو مظلوم لبیلانے لگے۔ حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے نقطہ عروج پر

جانچے۔ اس ستم پالائے ستم نے غیظ و غضب کی ایک لہر و طراوی، پورا ملک ایک آتش فشاں پہاڑ بن گیا صرف کسی خاص بہانے کی ضرورت تھی کہ چربی والے کارتوسوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ فوجیوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو جو کارتوس دیے جاتے ہیں ان پر خنزیر کی چربی اور ہندوؤں کو دیے جانے والے کارتوسوں پر گائے کی چربی لگائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کارتوس زبان سے لگائے بغیر چل نہیں سکتے تھے لہذا ہندو اور مسلمان فوجیوں کا یہی خیال تھا کہ اس طریقے سے حکومت ان کے دھرم اور ایمان کو خراب کرنا چاہتی ہے اور ان کے جذبات کو



ٹھیس پہنچا رہی ہے۔ میرٹھ چھاؤنی کے بعض سپاہیوں نے وہ کار تو س استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو انھیں اطمینان دلانے کے بجائے نشتر اقدار میں بدمست رہنے والے افسروں نے ان کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا۔ اس امر کا تذکرہ جناب غلام رسول مہر نے مؤرخانہ انداز میں یوں کیا ہے :

”۹ مئی کی صبح طلوع ہوئی۔ ویسی رسالے کو پیدل پریڈ کے میدان میں آنے کا حکم مل گیا۔ یورپی فوج کو اور توپ خانے کو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی خفیف سی بھی حرکت کرے تو توپوں کے منہ کھول دیے جائیں اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ سپاس مجرموں کو دھنوں نے میرٹھ چھاؤنی میں ۲۲ اپریل، ۱۹۵۱ء کو چربی واسطے کار تو س استعمال کرنے سے انکار کیا تھا اور جنھیں انگریز سزائے موت کا حکم سنا چکے تھے، پہرے میں لایا گیا۔ پریڈ کے میدان میں پہلے ان کی وردیاں لٹاری گئیں، پھر توپاروں کو حکم دیا گیا کہ ان مجرموں کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ کیٹی بنے لکھا ہے: یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ ان بد نصیب مجرموں کے پاس انگریزوں کے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہو گئے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو فوج کے گلے سبب سمجھے جاتے تھے۔ وہ سپاہی جنھوں نے حدود جبرامتحانی حالات اور اجنبی مقامات میں حکومت برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور ان کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا۔ قیدی ہاتھ اٹھاٹھا کر اور بلند آواز کے ساتھ جرنیل سے التجا میں کہتے تھے کہ ہم پر دم کیجئے اور ایسی ذلت خیز سزا نہ دیجیے۔ جب انھیں امید کی کوئی جھلک نہ نظر نہ آئی تو وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بڑا بھلا کھنے لگے کہ کیوں چپ چاپ کھڑے ہمیں ذلت کا نشانہ بننے دیکھ رہے ہو؟“

ظاہر ہے کہ گرد و پیش تو میں لگی ہوئی تھیں اور ان کی امداد کے لیے ایک بھی حرکت سب کی یقینی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ لہذا اگرچہ دونوں میں غیظ و غضب کا

طوفان متلاطم تھا، تاہم صبر و ضبط کے سوا چارہ نہ تھا۔ ذمہ دار انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ فعل سراسر احمقانہ تھا اور اس درجہ احمقانہ جو تصور میں نہیں آسکتا۔

مصوف نے اس جرنیل کے اسی احمقانہ فعل کے بارے میں فارسٹ جلد اول صفحہ ۳۴ کے حوالے سے اس وقت کے انگریز گورنر جنرل کے تاثرات یوں پیش کیے ہیں،

”آدمیوں کو پرید میں بیڑیاں پہنانا جس میں کئی گھنٹے صرف ہوتے اور ان لوگوں کی موجودگی میں سب کچھ کرنا جن میں سے بہتروں کی طبیعتیں برگشتہ تھیں اور وہ کار تو سوں کی داستان کو درست سمجھتے تھے، یقین ہے کہ اس سے پرید کے دل پر سخت ضرب لگی ہوگی۔ فوج کے مزاج اور ان لوگوں کے جرم کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں ایسی رسم کی بجا آوری کے بعد محض ویسی گارڈ کی حفاظت میں جیل بھینانا قابل تصور حماقت تھی۔“

یہ ہیں گورنر جنرل کے تاثرات۔ جب حکومت ایسی بیٹا اور ظالم ہو تو لاوا کیوں نہ پکتا۔ میرٹھ چھاؤنی میں مذکورہ برطانوی جرنیل نے فوجوں پر وہ قیامت خیز ظلم ڈھایا کہ مظلوموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ابتداء میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کو وہاں فوج نے بغاوت کر دی۔ انگریزوں کی فوج سے تصادم ہوا۔ جنگل کی ہوا کی طرح یہ خبر دوسری چھاؤنیوں میں پہنچی اور وہاں بھی ویسی اور پر ویسی فوجیں بہم دست و گریباں ہوئیں۔ فوجوں کی طرف دیکھ کر سب کے ہونے عوام بھی اپنے ختنے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور ظالم حکمرانوں سے بدلہ لینے میں شریک کار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک میدان کارزار بن گیا۔ ویسی اور پر ویسی، محکوم اور حاکم، مظلوم اور ظالم آپس میں اس طرح ٹکرائے کہ ایک فریق کی مکمل تباہی یقینی تھی۔

۱۔ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۶۸

۲۔ ایضاً: ص ۶۹

اس مسلح اور بھری پور تصادم کا نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پاک و ہند کی سر زمین پر حکومت کرنے کا انگریزی کار نامہ چند روز میں حرفِ غلط کی طرح ٹٹے والا تھا کتنے ہی مقامات پر ویسی فوجوں کا قبضہ ہو گیا اور انگریزوں کا کسی شہر پر قبضہ باقی رہ جانا تو دور کی بات ہے یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید ایک بھی انگریز واپس برطانیہ جانے کے لیے زندہ و سلامت نہ بچ سکے گا لیکن بعض ملک دشمن اور ملت فروش عناصر نے تن من و دھن کی بازی لگا کر اپنے آقاؤں کی بگڑی بنا دی، اکھڑی ہوئی حکومت پھر جہادی اور اس طرح ہزاروں برادرانِ جعفر و صادق نے اپنے عمل سے ملت فروش ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

صوبہ یوپی سے انگریزی اقتدار کا جوازہ سب سے پہلے نکالا گیا اور جگہ جگہ قومی پرچم لہرا دیئے گئے، لیکن ان جہاں نصیبوں کو کیا معلوم تھا کہ انگریزوں کے بعض ہی خواہ، چند سگوں پر بک جانے والے ملک دشمن اور ملت فروش عناصر اس خوشی کو پھر بائیسویں میں تبدیل کر دیں گے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوٹے سال کے لیے انگریزوں کو پاک و ہند کی قسمت کے مالک بنائے رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انگریزوں کی حمایت میں خود اپنے بھائیوں کا خون اس جرم کی پاداش میں اپنے ہاتھوں بہائیں گے کہ وہ ایک غیر ملکی ظالم قوم کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ میاں محمد شفیع نے صوبہ یوپی کے حالات کا نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچا ہے:

”حقیقت یہ ہے کہ اس ساری تحریک کا مرکز یوپی تھا، جس کا کونا کونا سنگ اٹھا، جس کے ایک ایک دل سے انگریزوں کے خلاف لاوا پھوٹ بہا۔ جس نے ملک اور دین کے لیے جان و مال، عزت و آبرو، محبت، شفقت، دنیا طلبی، حرص، لالچ، مال اندیشی، بہتری، بہبود، ہر چیز کی بازی لگادی۔ نہ ماضی کی شان کو دیکھا، نہ مستقبل کی تباہی کو سوچا، نہ جاگیروں پر نظر گئی، نہ دولت کا خیال آیا۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں آزادی خواہی میں بھڑک گیا۔ آبادیوں اور جنگلوں میں آگ لگ گئی۔“

لے محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۵

جنرل نجت خاں، خان بہادر خاں اور دیگر مجاہدین جنگِ آزادی نے جس دانش مندی اور جرات سے بریلی شہر کو سب سے پہلے انگریزی تسلط سے آزاد کر دیا، وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بریلی کی اس شاندار اور جرات مندانہ معرکہ آرائی کے بارے میں میاں محمد شفیع صاحب نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے:

”آفرین ہے رویکھنڈ کے اُن مجاہدین پر جنہوں نے بریلی کے میدان میں شجاعت اور قربانی کی مثال قائم کی تھی اور بتا دیا تھا کہ مسلمان بیچارگی میں شیر نیستیاں اور پیل دیاں ہے۔ جب وہ اللہ کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے تو وہ کائنات کو ٹھکرا کر موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ باطل کا ہجوم اُس کے ضمیر کو زیر نہیں کر سکتا۔ طاقت و جبروت کے سینے میں نیچے ڈال دیتا ہے“

خان بہادر خاں صاحب نے بریلی کو فتح مندی سے ہمکنار کرنے کے بعد دیگر اصلاح اور خصوصاً دہلی میں بادشاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ پاک و ہند کے باشندوں کو آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے گرمایا اور سر تور کو شش کرنے کی ترغیب دلائی۔ میاں صاحب نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے:

”یہ ساری کوشش خان بہادر خاں اور اُس کے کارکنوں کی تھی کہ اتنی آسانی سے بیک وقت رویکھنڈ کا صوبہ آزاد ہو گیا۔ پھر اُس نے خود ایک عرضداشت بادشاہ کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی اور رویکھنڈ کے تمام اصلاح میں بھی شائق کی؟ ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظار کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ تم اسے قبول کرتے ہو یا رد کرنا چاہتے ہو؟ تم اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے یا اپنے ہاتھوں سے دے دینے پر تیار ہو اور فائدے کے خواہشمند نہیں؟“

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۷

۲۔ ایضاً: ص ۳۰۶

بریلی اور اُس کے گرد و نواح کو انگریزی تسلط سے پاک کرنے کے بعد وہاں کا انتظام خان بہادر خاں کے سپرد کیا گیا اور ۸۵ء کی جنگ آزادی کا ممتاز مجاہد و مدبر، جنرل بخت خاں عازمِ دہلی ہوا۔ فوج، خزانہ اور سامانِ حرب و ضرب ساتھ تھا تاکہ بادشاہِ دہلی کی مدد کر کے مغلیہ حکومت میں جان ڈالی جاتے۔ بریلی سے لاؤٹسگر سمیت بخت خاں کا جانا خود ظاہر ہے۔ انگریز حکومت میں کسی جگہ روکنے یا ٹکڑانے کی سکت نہیں تھی۔ انگریزی طاقت چھوٹے چھوٹے اجزاد میں منتشر ہوئی پڑی تھی۔ لیکن اس مجاہدِ ملت کی اُمنگیں اور آرزوئیں کامیاب ہوتے ہوتے ناکام ہو کر رہ گئیں۔ غلام رسول مہرنے ان حقائق کو یوں بیان کیا ہے:

”جنرل بخت خاں اور خوجوں میں ہنچا۔ وہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اُسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی۔ سانسو سامان بھی لایا تھا اور روپیہ بھی خزانہ سرکار میں جمع کیا تھا۔ اس میں جنگی اور انتظامی دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ لیکن اُس کے پہنچنے سے پیشتر شہزادوں نے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خاں کو پورے اختیارات دے دیے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا اور کوئی اور شخص دہلی میں مختار بن جائے۔ وہ ہر کام میں روٹے اٹکاتے رہے یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہ سکا۔“

جنرل بخت خاں کی قابلیت کو میاں محمد شفیع صاحب نے یوں مزاج عقیدت پیش کیا ہے:

”بخت خاں میں دو باہیں جمع تھیں، اول تو وہ روہیلہ تھا، جو شجاعت و جہادِ نبوی کا سبب ہے، پھر یہ کہ اُس میں بادشاہی خون بھی تھا، جس نے نحل، شائستگی اور مزید شرافت کی خوبوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ باقی طبعی خوبیاں بھی اس اچھے روہیلے میں کسی سے کم نہ تھیں۔۔۔۔۔ انگریز نے اس کی دانائی اور فوجی شعور دیکھ کر تمام دیسی توپ خانہ اُس کے ماتحت کرنا۔ جس بیڑی کا یہ سردار تھا وہ کارگزاری میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ غدار کے“

۱۲۱

قرب یہ لائق صوبیدار بدل کر اپنے باپ دادوں کے اصل وطن بریلی میں چکا تھا اور اس کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ بھی اس سے بے خبر تھا۔ ۲۱ جون کو جب بریلی میں انگریزوں کا صفایا ہو گیا تو نجات خاں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سات ہزار باقاعدہ سوار اور پیدلوں کی چھتیس اور کئی ہزار مجاہد لے کر مع سامانِ حرب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچا۔

مولانا احمد اللہ شہید مدرسی رحمۃ اللہ علیہ ایک فہم عالم دین اور صاحبِ اجازت تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں آپ نے عظیم النظیر جنگی کارنامے سرانجام دیے۔ جس فنی مہارت کے ساتھ مولانا نے انگریزوں کے مایہ ناز اور نچتہ کار جنرلوں کو پکے درپے شکستیں دیں اور ان کے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا، وہ تاریخِ عالم کے جنگ آزمائہ جنرلوں کی تاریخ کا ایک سنہرا اور تابناک ورق ہے۔ اس سلسلے میں میاں محمد شفیع یوں رقمطراز ہیں :

”مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں اور باقی لیڈر بریلی سے نکل گئے (کیوں کہ انگریزوں نے حریت پسندوں کو شکست دے کر دوبارہ بریلی پر قبضہ کر لیا تھا) مولوی احمد اللہ شہید پھر شاہجہان پور پہنچے۔ ان کی تیز نظر نے بجانب لیا تھا کہ انگریز وہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بریلی پر آئے ہیں۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر اُس تھوڑی سی فوج کو مار بھگا یا اور بریلی کی شکست کی تلافی کر لی۔ جنرل ہیل کو سخت ہزیمت دی۔۔۔۔۔ اب لڑائی کا رنگ یہ ہو گیا کہ سرکومن اودھ کو فتح کرتا تھا تو مولوی صاحب روہیلکھنڈ پر قبضہ جمالیتے تھے۔ وہ روہیلکھنڈ (بریلی) کو لیتا تھا تو یہ اودھ کو فتح کر لیتے تھے۔ اس پریشانی میں انگریز نے طے کیا کہ اس آہنی ہاتھ کو شل کر دینا چاہیے۔ اس بے مثل مجاہد سے جب تک پھیپانہ چھڑایا جاتے گا اُس وقت تک ساری کوشش بیکار ہے، اس کے سوا اور کوئی ایسا خطرہ نہیں، پھر بھی لڑائی میں قابو

۱۔ محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۰

پانا یا اس کو زیر کرنا مشکل تھا، اس لیے سوچ لیا کہ یہ کام غدار اچھی طرح  
کر سکیں گے، لے

انگریزوں نے "پاون" نامی ایک ہندو راجہ سے ساز باز کی جس نے پچاس ہزار روپے انعام پانے  
کے بدلے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو اور حریت پسندوں کے عیدم النظر جرنیل کو شہید کر کے  
پاک و ہند کی غلامی کے محض پر دستخط کر دیے۔ میاں صاحب نے مولانا احمد اللہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو  
ان کے محیر العقول کارناموں کے پیش نظر یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

آخر کار قوم اور دین کا سب سے بڑا مجاہد، ملک کی آزادی کا عظیم ترین حامی،  
شجاعت کا تمیز نیتاں، اس آخری وقت کا سہارا، عقل و تدبیر کا نمونہ، جنگ  
چالوں میں انگریز کے جگر کو پگھلانے والا، غریب و استغلال کی چٹان، اسلام  
اور مسلمانوں کا فخر، انقلابیوں کے ٹوٹے ہوئے دل کی جان، آزادی خواہوں کی  
امیدوں کا روشن آفتاب، اس طرح اپنے ہی ایک غدار کے ہاتھ سے موت  
کی وادی میں غروب ہو گیا، لے

مولانا احمد اللہ شہید نے شاہ جہان پور کے محض کے میں جس فراست، تجربہ کاری اور عزم و  
استقلال سے انگریزوں کے ایک باپڑناز سپہ سالار جرنیل جیل، کوشکست فاشس دی اور  
اس کے سارے جگی منصوبوں کو خاک میں ملایا تھا، مولانا کی اس مہارت اور ذہنی کارکردگی  
پر میلسن کے تبصرے کو میاں صاحب نے یوں نقل کیا ہے:

"مولوی کا یہ جملہ بالکل اچھوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی یورپ کا  
جرنل لڑ رہا ہے، لے

مولانا احمد اللہ شہید کی شہادت کا علم ہونے پر جوشِ مسرت میں "ہومز" نے اپنے خیالات کا

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۹۷۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۸

۲۔ ایضاً: ص ۲۵۹

۳۔ ایضاً: ص ۲۵۸

یوں اظہار کیا:

”شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن، سب سے خطرناک انقلابی

ختم ہو گیا ہے۔“

اودھ کے علاقے میں مدتوں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہاں جس استقامت اور پامردی کے ساتھ حریت پسندوں نے آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے جنگ جاری رکھی، اُس پر خود میلیسن نے یوں تبصرہ کیا تھا:

”اودھ کے لوگ اپنے سپاہی بھائیوں کے شریکِ کار ہو گئے اور ملک کی آزادی

کے لیے جانیں دے دیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اُنھوں نے کس عزم و ارادہ اور

سرفروشی کے ساتھ ہم سے جنگ آزمائی کی، اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی

حصے میں ایسی طویل اور استقامت آمیز جنگ نہیں ہوئی۔ ان تمام معرکوں میں

اُس ظلم کی داستان (واجب علی شاہ کی معزولی) آگ لگاتی رہی جو ہم نے ۱۸۵۶ء

میں کیا تھا۔ یہی خیال، یہی رُوح تھی جس نے اُن کے دلوں کو فولاد سے زیادہ

مضبوط کر دیا تھا۔۔۔۔۔ شکستوں پر بھی اُن کا یہ حال تھا کہ بھوکوں مر جانے کو

ہماری اطاعت پر ترجیح دیتے تھے اور اُن تمام طبقوں نے اُس آخری وقت

میں خاموشی اختیار کی جب دنیا میں اُن کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔“

اودھ کے معزول حکمران واجب علی شاہ کی بیگم، حضرت محل، جس نے میدانِ جنگ تو کیا

زندگی بھر محل سے باہر کی فضا بھی نہیں دیکھی تھی، چونکہ برطانوی مظالم سے سینہ دکھا رہی تھی، اسی

لیے جب اس خاتون نے شمعِ حریت کے پروانوں کو سینہ سپر دیکھا، تو خاموش نہ بیٹھ سکی،

برجیس قدر کی سرپرست بن کر، رعایا میں نئی رُوح بن کر میدانِ کارزار میں انگریزی فوجوں سے

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۸

کے ایضاً: ص ۲۸۶



مصروف پیما ہو گئی۔ میاں صاحب نے یوں اس امر کی وضاحت کی ہے:

”خیر اس بادشاہ کی کوتاہیوں کو اس کی ایک بیگم، حضرت محل نے اس طرح پورا کیا کہ انتقام کی آگ میں اگر دشمنوں کو نہ جلا سکی تو کیا، خود اس میں جل کر قوم کو سُرخرو کر گئی اور جو کچھ بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا، اس کی کھنویں رہ جانے والی اس بیگم نے ہر طرح کی قربانی دے کر حق ادا کیا، حالانکہ لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) کی طرح نہ آزاد فضا کی پٹی ہوئی تھی، نہ اس نے تیر و تنگ کا استعمال کیا تھا، نہ مردوں کے دوش بدوش رہی تھی، وہ تو شاہی محلوں کی پرہ نشین خاتون تھی۔۔۔ اس لائق بیگم نے اپنے بیٹے بھیس قدر کی سرپرستی لے کر محبوب علی کو نیابت دی اور سب سے پہلے بادشاہِ دہلی کو آزادیِ اوہ کی مبارک باد دے کر علاقے کے زمینداروں، جاگیرداروں، نوابوں اور راجاؤں کو خط لکھے۔ سب نے اطاعت میں تلوار اٹھالی اور سینہ سپر ہو گئے۔“

نیموری خون کا امین، شہزادہ فیروز شاہ ان انتہائی بگڑے ہوئے اور ناسازگار حالات میں باہر اور اورنگ زیب کی یادگار غماخت ہوا۔ دہلی سے گواہی تک کے اکثر معرکوں میں حریت پسندوں کی مختلف جماعتوں میں شامل ہو کر مردانہ عار لڑتا اور شہجہ حریت کے پروانوں کو غاصب انگریزوں سے لڑاتا رہا۔ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر گیا کہ بایر کی شجاعت اور اورنگ زیب کی ایمانی فراست کا کم از کم ایک امین، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت مظہیر خاندان میں ضرور موجود تھا۔ اس عظیم شہزادے کو میاں صاحب نے یوں خواجہ عقیدت پیش کیا ہے:

”جس وقت غدر ہوا، اس سے پہلے ہی فیروز شاہ جج کے لیے گیا ہوا تھا۔ جبہ واپس آیا تو ساحل پر قدم رکھتے ہی انقلاب کی خبر کا فون میں پڑی اور یہ جو انگریز شہزادہ دہلی پہنچ کر ہنگامہ دارو گیر میں کود پڑا۔ داد شجاعت دی اور جب دہلی پر انگریز قابض ہو گئے تو نہایت احتیاط کے ساتھ مشرقی دروازے سے

نکل کر بریلی کی طرف آگیا۔ بریلی کی جنگ کا خنزیر معرکہ ختم ہوا تو راجا صاحب کے پاس جا پہنچا اور جب تانپیا توپنی ناگپور سے دوبارہ گویا آیا ہے تو یہ اور نواب ہاتھ بھی اُس سے جنگوں میں آئے تھے۔ وہ (تانپیا توپنی) بھی گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ گیا تو فیروز شاہ کچھ دنوں ادھر ادھر بھٹک بھٹکا کر خوش قسمتی یا ہوشیاری سے بچ نکلا اور مکتے چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ وہیں باقی زندگی فقیرانہ حالت میں گزار کر دنیا کو رخصت کیا۔ رحمت ہو اُس باہمت شہزادے پر! لے

جھانسی کی رانی، لکشمی بانٹی نے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عورت ہونے کے باوجود جس طرح مردانہ وار حصہ لیا اور اپنی حریت پسندی کا لوہا منوایا اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

لکشمی بانٹی بھی حضرت محل کی طرح محل کی راحتوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئی، ورنہ انگریز کے قدموں پر سر جھکا دیتی تو اُس کی زندگی کی راحتوں میں ذرا سا بھی شک نہ آتا۔ اُس نے جھانسی سے غاصب انگریزوں کو نکال دیا۔ اُس کے انقلابیوں نے ساگر، نوگاؤں، باندہ، باناپور، شاہ گڑھ اور کرکی سے انگریزوں کا نام نشان مٹایا۔ رانی نے اس کے بعد امن و امان اور انتظام کی وہ یاقوت دکھائی کہ لوگ حیران رہ گئے! لے

تانپیا توپنی برہمن نے جس شجاعت اور جوانمردی سے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا وہ بھی حریت پسندوں کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ نامساعد حالات میں بھی مختلف انقلابی لیڈروں کے ساتھ مل کر اور تنہا انگریزوں سے اس طرح مقابلہ کرتا رہا کہ ستم پیشہ انگریزوں کو ناک چنے چوادیے۔ مولانا احمد اللہ شہید کے بعد تانپیا توپنی کی رزم آرائیاں، فنونِ حرب و ضرب کے لحاظ سے کسی بھی دوسرے انقلابی لیڈر سے کم حیرت انگیز نہیں۔ اس محبتِ وطن برہمن کے کارناموں کا کرمشہد ملاحظہ ہوں:

لے محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۹

لے ایضاً: ص ۲۷۲

جنرل ونڈم جس نے یورپ میں اپنی لیاقت دکھانی تھی، اُس وقت کان پور کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ تانٹیا بھمن نے جو کبھی نانا صاحب کا کلرک اور اب جنرل تھا، سوچ لیا کہ اب کان پور میں تھوڑی سی فوج ہے، جنرل ونڈم پر ضرب لگانا چاہیے اور اپنی بے قاعدہ فوج لے کر جنرل ونڈم کے مقابلے پر آ گیا۔۔۔۔۔ باقاعدہ سخت گولہ باری شروع ہوئی۔ تانٹیا نے اپنی فوج کو تیم دائرے کی شکل میں ترتیب دے کر بڑھنا شروع کیا۔ ونڈم نے حلقہ توڑنے کی کوشش کی لیکن تانٹیا کی توپوں نے معذور کر دیا۔۔۔۔۔ تانٹیا کے دائرے لے گرفت کو زیادہ مضبوط کر دیا۔ شام کے چھ بجے تک انگریزی فوج نے پورے طور پر حوصلہ ہار دیا اور بہت سا سامان جنگ انقلابیوں کے ہاتھ آیا۔۔۔۔۔ دن نکلنے ہی ملائی شروع ہو گئی اور انقلابیوں نے دونوں پہلوؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ دایان بازو بالکل اڑا دیا۔ برگیڈیر ولسن، کیپٹن ایم کری ماری، میجر سٹرنگ، میجر گین سب مارے گئے۔ تیسرے دن انقلابیوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ انگریزی فوج بالکل تباہ ہو گئی۔ اُس دن تانٹیا کا پورے کانپور پر قبضہ ہو گیا۔

متعدد بار حوصلہ شکن حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کیونکہ غداروں کی سرگرمیوں کے باعث ملکی حالات میں نشیب و فراز آتے رہتا لیکن واہ سے بہادر بھمن جو جذبہ حب الوطنی سے مرشار اور آزادی وطن کا واہمانہ طلبگار تھا، بے سرو سامانی کی حالت میں بھی اُس کے عزم و متزلزل نہ ہوتے۔ مثلاً:

”تانٹیا رانی جھانسی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑتا رہا اور جب یہ بہادر رانی جنگ آزادی میں ماری گئی تو اکیلا رہ گیا اور نانا صاحب سے بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ نہ کوئی فوج تھی، نہ سامان تھا، پھر بھی پوری ہمت رکھ کر صاحب اور پیشوا کو ساتھ لے کر سرمتھورا (متوسط ہندوستان) میں جا بیٹھا اور غداروں کو

لے محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷۰



بیچارگی اور کس پرسی کی حالت میں بھی اپنے خون سے ماورِ وطن کی سرزمین کو لالہ زار تو کر دیا لیکن  
برطانوی ٹیروں کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ میاں صاحب اس امر کی یہ وضاحت فرماتے ہیں:

”نیپال کی ترائی اُن بہادروں کے خون سے رنگین ہو گئی، جنہوں نے اپنے ملک  
کی آزادی کے لیے ہر عزیز سے عزیز چیز کی بازی لگا کر ڈھائی سال تک  
انگریزوں کی طاقت کو ہلکان کیا تھا۔ بے سرو سامانی اور بد نظمی میں انتہائی معذوری  
مجبوری اور بے بسی میں بھی اپنے ملک کی عزت کو بلند رکھ کر جانیں قربان کیں۔  
ہر طرف سے مایوسی کے بادل سر پر منڈلاتے دیکھے۔ اہل ملک کی غداری سے  
سارے سہارے ٹوٹ گئے۔ موت کے سوا کوئی آس نگاہوں کے سامنے  
نہ رہی، پھر بھی تلوار ہاتھ سے نہ رکھی اور غاصب، ظالم انگریز کے سامنے  
سر نہ جھکایا۔ یہاں تک کہ ہالیہ کے دامن میں آخری حملے کے خون میں نہاتے  
اور زمین پر گر کر آنے والی نسلوں کو سعی آزادی کا پیغام دے گئے۔“

فاریں کرام ایہ تھا، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا ایک رخ۔ اب اسی تصویر کا دوسرا  
رخ بھی ملاحظہ فرمایا جاتے ہیں کہ یہ واقعہ جو ہائے ۱۸۵۷ء میں لاکھوں حریت پسندوں کا  
خون کن مٹوس چہروں کی وجہ سے راتیکاں گیا۔ وہ کون سے وطن دشمن اور ملت فروش عناصر تھے  
جن کے باعث مٹی بھر پوئسی پاک و ہند کے کروڑوں باشندوں کو دوبارہ طاقت کے ذریعے  
غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مرزا الہی بخش کا کارنامہ ملاحظہ ہو:

یہ (مرزا الہی بخش) شاہی خاندان کا بوڑھا، سمجھ دار آدمی، بادشاہ کا دستے میں  
چچا اور سہمی تھا۔ بہادر شاہ اس سے تمام معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔ اس  
ظالم کو ملک و مذہب سے تو کیا ہمدردی ہوتی، خاندان کی بہتری سے بھی بے بہرہ  
نکلا۔ انگریزوں کا پٹھو بن کر ٹھٹھا تو دیا بھی بچھا دیا۔ ذرا ذرا سی خبریں پہنچائیں،  
زمینت محل کو سبز باغ دکھا کر ہم راستے کر لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی ڈور سے

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۸۶

اور انھوں نے اور انقلابیوں کو ہتھیار دیا اور ان کے ہاتھوں میں اس کے لئے ہتھیاروں کا انبار بنایا۔  
 اور شش کی تکرار اس کا انعام ہوا اور اس کا ایف پی اے اور ایف پی کے ساتھ ساتھ  
 سب سے بڑا کارنامہ جو اس نے کیا وہ تھا کہ اس نے شاہ کو تختوں  
 کے ساتھ چاہئے کہ وہ روکا جائے اور اس کی فتنہ کی پوری کارروائی کو بند کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ  
 کی گرفتاری کے وقت بھی ہتھیاروں کی سہولتوں میں وہی ہتھیاروں کی گرفتاری کا جلالہ کا ایف پی  
 تھا کہ سب ہتھیاروں کے آگے اور گرتے ہوئے اور ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 نہایت جنت زبان اور سکھایا ہوا تھا کہ اس نے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 یہ تکرار اور اس کے لئے اس کے انقلابیوں کی مشرقی سرحدوں میں ہتھیاروں کی گرفتاری کا ایف پی  
 تھا کہ اس کے انعام دینے کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 سالانہ پیش دی جو سب سے سب سے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 عزیزوں کی طرف سے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 شگرتی ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 مراد کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ

شاہ شہزادہ کے معتاد اور مشہور معتمدوں میں سے ایک تھے اور ان کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 ان کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 جس پر جب علی اور انہی شش کا جادو چلے، وہ غداری نہ کرے یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ ان کے  
 افسوس تو یہ ہے کہ ان کے ہتھیاروں اور ان کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 بھی ان کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 ولی نعمت جس سے وفائی رہتے، ان کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ  
 اس کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ

۱۔ محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۰۔ ۲۔ جینٹلمن، ۱۹۰۷ء، ص ۱۰۰۔ ۳۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔  
 ۴۔ ۲۱۶۔ ۵۔ ۲۱۷۔ ۶۔ ۲۱۸۔ ۷۔ ۲۱۹۔ ۸۔ ۲۲۰۔ ۹۔ ۲۲۱۔ ۱۰۔ ۲۲۲۔ ۱۱۔ ۲۲۳۔ ۱۲۔ ۲۲۴۔ ۱۳۔ ۲۲۵۔ ۱۴۔ ۲۲۶۔ ۱۵۔ ۲۲۷۔



وہ نکال دیا گیا تھا اور نکال دیا جاتا۔

بھلا ہو میاں والی اور علیسی خلی والوں کا، بھلا ہو پنجاب کے پھلنے پھولنے والے زمینداروں کا، بھلا ہو ریاست ہائے پھلیکیاں کا اور سب سے زیادہ بھلا ہو سکتے قوم کا، جس نے صرف روٹی کے لیے انگریز کی غلامی کا پٹا گلے میں ڈال کر بڑی خوشی اور انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ اُس کی جڑیں پاتاں تک پنجاب میں اور ملک کے آزادی خواہوں کے سینے چھلنی کر کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کو لوٹ کر ہندوستان (پاک و ہند) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لیے گلگ کا ٹیکہ لگا دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں صوبہ پنجاب نے جس طرح حصہ لیا اُس کے متعلق سر جان لارنس کی رپورٹ کا ایک اقتباس اور میاں صاحب کے اپنے تاثرات اور تحقیق ملاحظہ ہو:

”انگریز یوپی میں بے دست و پا ہو گیا تھا لیکن پنجاب اُس کے اثر میں تھا۔ پنجاب کے سیکرٹری اور مسلمان فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور انھیں کے ذریعے وہاں کے جن اضلاع میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی اُن کو سختی سے تباہ کر دیا گیا۔ اب وہی کامرہ درپیش تھا اور اُس کے بعد ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس آگ (تحریکِ آزادی) کو بجھانا تھا۔ بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی گئی اور لوگ بہت خوشی کے ساتھ انگریز کے دست و بازو بن کر ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اُن کی کیا نیت اور کیا ارادے تھے، کس خیال پر اتنی آسانی سے شرکت کی، سر جان لارنس کی زبانی مینے، وہ غدر کی رپورٹ میں لکھتا ہے: پنجابی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اپنی برتری کا احساس تھا اور پنجابی خیال کرتے تھے کہ ہم اُن سے بہتر ثابت ہوں گے۔ اسی بنا پر خیال کرتے تھے

لے محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۷





کے باغیوں سے لڑا پھر ظالم کوپر کے ساتھ مل کر نمبر ۱۶ کے باغیوں سے چالبازی کی اور ان کو گرفتار کرایا اور اجالے کا کنواں آزادی خواہوں کی لاشوں سے پائنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ اس کے بعد مختلف علاقوں میں بہت کارگزاریاں کیں۔ تانیا کے مقابلے میں کالپی کا میدان انقلابیوں کے خون سے رنگیں کیا اور وہاں سے جزل نیپٹر کے ساتھ وسطی ہند کے جھگڑے نٹائے۔

پنجاب میں واپس آ کر خان بہاؤی کا خطاب چار سو اسی روپے کی پنشن اور بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ اپنی محنت اور جستجو سے بہت سی زمین حاصل کر کے دریائے جہلم سے نہر تک کھدوائی۔ گھوڑوں کی نسل کو قابل رشک ترقی دی۔ خاندانی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہا، عزت پائی اور اسے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور آخر میں تمام جائیداد ملا کر ایک اچھی خاصی ریاست ہو گئی اور صرف تدبیر سے شاہ پور کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک رئیس اعظم بن گیا۔ بارے مجاہدین وطن اور جاں نثاران دین و ملت کے خون کی سیاہی کہاں جاسکتی ہے؟" لے

لاہور کے قزلباش خاندان کے بارے میں بھی میاں صاحب کی ایسی ہی تحقیق ہے۔ معلوم نہیں ان کے پاس کیسے دلائل تھے؟ ان دلائل میں کتنا وزن ہے؟ بہر حال انہوں نے لکھا ہے:

"علی رضا خاں قزلباش۔ اس نے غدر میں وہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائیداد بیچ کر خرچ بھرا۔ اس میں اس کے چاروں بھتیجے (بلکہ پانچوں) عبداللہ خاں، محمد حسن خاں، محمد زمان خاں، غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اس فوج نے نکلسن کی نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی۔ محمد رضا خاں اس کا بھائی بہت دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں

لے محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۰۳

دو مرتبہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں ہے محابا گھس جاتا تھا،  
 اس لیے "آرڈر آف میرٹ" حاصل کیا۔ سردار بھاپوری کا خطاب اور دو سو  
 روپے پنشن علی الدوام ملی۔ علی رضا خاں کو بہڑا سچ اور اودھ میں تعلقہ داری ملی،  
 خان بہادر کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے۔ ۱۸۶۴ء  
 میں علی رضا خاں کو نوابی کی عزت بخشی گئی۔ اس کے بڑے بیٹے نواز شہ علی خاں  
 کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور پاپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا۔ دوسرے بیٹے  
 ناصر علی خاں کو بعد میں اسٹنٹ کمشنر بنایا گیا۔ نواز شہ علی خاں نے خدمتِ خلق  
 سے بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہوا، بلکہ پنجاب کے چوٹی  
 کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں  
 چھوٹا بھائی ناصر علی خاں نواب ہوا اور عزت سے کارگزاریاں دکھا کر ۱۸۹۶ء  
 میں مرا۔ فتح علی خاں نے اسی کی جگہ لی، جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و  
 فرماں برداری سے انگریزوں کے نزدیک سر بلند و باوقار رہا۔

شاید ایسے ہی کارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر دیوبندیوں کے امیر شریعت اور  
 شعلہ بیان خطیب یعنی مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری (المتوفی ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) نے بقول  
 علامہ خالد محمود صاحب سرزمین پنجاب کی یوں منظوم تعریف فرمائی ہے:

ندیم کشورے مردود و مرتاب	بہ شوی ہائے کفر آباد پنجاب
چہ ہلکے ننگ و عافیت ہفت کشور	ز شرق و غرب بادش خاکہ بر سر
خیر طینتش مردم کشی ہا	ز قتل سلبش بہ شد خوشی ہا
چہ پرائش مریدانِ بندگی	لقب کافد و ذات پاک زنگی
ز نواب و رئیسانش چہ پرستی	سگ و سگ زادگان کرسی بہرستی
چنانہ زند نامہ سوار زلیہ	کہ از خرقہ پیش بر تر نیاید

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۲

چکداز لالہ اشش خون مسلمان  
 جوانش عنلمان فرنگی  
 ازونالان حجاز و مصر و ایران  
 پناوشان بدامان فرنگی  
 معسکر را غلام احمد پیر  
 فرنگی را معسکر ہست پنجاب  
 فضائش کفر ریز و کفر بیز است  
 بہ آئین الہی در ستیز است

زمین فتنہ زاتے فتنہ خیزے

کہ شیطان پیش پائش سجدہ ریزے

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو کہاں کہاں سے بھرتی کرنے کے لیے جوان ملے، جن کے بل بوتے پر حریت پسندوں کو بڑی طرح کچل کر برٹش گورنمنٹ کو دوبارہ استحکام نصیب ہوا تھا، ملاحظہ ہو :

”یکم اپریل ۱۸۵۸ء تک انگریزی فوج کی تعداد چھانوے ہزار تک پہنچ گئی۔“

سکو، پٹھان اور پنجابی مسلمان بھرتی ہو ہو کر آگئے۔ راجاؤں اور نوابوں

نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اس طرح بے شمار فوج جمع ہو گئی اور چاروں طرف

پھیل کر انقلابیوں کا صفایا بول دیا۔ لیوگارڈ اور ڈگلس، بہار کی طرف

چلے گئے۔ سرہنری لارنس نے نیپال سے شروع ہی میں مدد منگالی تھی

اور جنگ بہادر خاندان نہایت خلوص اور پابوسی سے پانچ ہزار گورکھوں کے

ساتھ ملکر پہنچ گیا۔

مشرقی پنجاب میں پٹیالہ، ناہر اور جیند وغیرہ حکومتوں کی ریاستیں تھیں۔ یہ ریاستیں

آزادی وطن کی تڑول سے دشمن نکلیں۔ انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں کے خلاف

بڑھ چڑھ کر کارنامے دکھاتے۔ انقلابیوں پر دل کھول کر ضرر نہیں لگائیں اور انگریزوں سے

۱۔ عبدالرشید ارتقد، مولوی، مینیں بڑے مسلمان، ص ۸۸

۲۔ محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

بھی بڑھ کر مظالم کے پہاڑ ڈھالتے۔ ان کے کارہائے نمایاں کی کہانی پنجاب کے مشہور مورخ جناب غلام رسول مہر کی زبانی سماعت فرماتی ہے:

”ان ریاستوں کو موقع حاصل تھا کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں یا اسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور ان کی امداد کے بغیر انگریزوں کا عقب خافت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بھی بیٹھی رہتیں تو اس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے خاصے امکانات موجود تھے لیکن جب پٹیالہ، ناہجہ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان تعلقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان ریاستوں نے شہنشاہِ دہلی کی دعوت ٹھکرائی، جو سوار پیغام لے کر آئے تھے انھیں قتل کر دیا۔ اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے، اپنی فوجیں جمع کیں، جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا انھیں بچائے رکھا، پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا۔“

ان ریاستوں کی مذکورہ کارکردگی پر موصوف نے یوں تبصو کیا ہے:

”جیند، ناہجہ اور پٹیالہ کے علاقے ایسی جگہ واقع تھے کہ اگر وہاں اس کے رئیس ذرا صبر کرتے تو دہلی سے سٹیج کا پورا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتا تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے اور ان کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلہٴ مخالفت قائم کر لینے کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ یقیناً مارے جاتے۔ اس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندوستان کو از سر نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً اس میں کامیاب ہونا آسان نہ رہتا، لیکن ان سکھ ریاستوں کی انگریز دوستی اور

وطن دشمنی نے صورت بگاڑ دی ہے۔

سکتوں کی وطن دشمنی اور انگریز دوستی، جو اس موقع پر واضح ہوئی وہ قومی لحاظ سے پاک و ہند کی تاریخ میں ایک امتیازی کارنامہ ہے کیونکہ پوری سکتھ قوم انگریزوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچا کر کنارے پر لگانے کی غرض سے آزادی چاہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف صفت آراء ہو گئی، مثلاً:

”سکتوں نے اس اہم موقع پر جبکہ مذہب و ملت کے درد نے ہر ہندوستانی کے دل کو آگ بگولہ بنا دیا تھا، خاص طور پر خلوص کے ساتھ انگریز کی غلامی کو راحت سمجھ کر گلے میں ڈالا اور دست و بازو بن کر ہندوستان کے دل پر ضربیں لگائیں، جیسے خاص اسی کام کے لیے پیدا ہوئے تھے، اور تو اور اپنی رانی مائی جنداں کا بھی انگریزوں کے لیے مقابلہ کیا۔ وہلی میں اگر تو گویا حتیٰ تک ادا کر دیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں اور باغیوں کو ذاتی دشمن سمجھ کر لڑے،“

انگریزوں نے سکتوں کو حریت پسندوں کو کچلوانے اور خاص طور پر ان سے تختِ دہلی اور مسلمانوں کو نیست و نابود کروانے کی غرض سے عیارانہ طریقے پر اشتعال انگیزی کی، اس چاب بازی کا ذکر میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”انگریزوں نے سکتوں کو بھڑکانے کے لیے ایک عجیب چال چلی۔ وہ یہ کہ بادشاہِ دہلی کی طرف سے ایک جھوٹا اعلان چھپو اڈیا کہ سب کاموں سے پہلے باغیوں کا یہ فرض ہے کہ سکتوں کو تباہ کر دیں۔ سکتھ پہلے ہی وطن پرستی سے خالی تھے، اس تحریک سے کوئی ہمدردی نہ تھی، اس اعلان سے اور بھند ہو ہو کر بھرتی ہوتے تاکہ دہلی اور دہلی والوں سے خوب بدلہ لیں“

۱۔ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

۲۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۳

۳۔ ایضاً: ص ۱۹۸

پاک و ہند کے مختلف گوشوں میں پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے جو کارنامے انجام دیے ان کی ایک جھلک پیش کی جا چکی۔ پنجاب کے اندر جو دوسرے صوبوں کے فوجی مختلف چھاؤنیوں میں تھے، جب انھوں نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف علم جہاد بلند کیا تو ان مسلح حریت پسندوں کے ساتھ پنجاب میں جو سلوک ہوا وہ ملاحظہ فرمائیے:

”پنجاب میں بھی فتح کے بعد پوربیوں ہی کی پلٹنیں پشاور تک پھیلی پڑی تھیں وہ ہر جگہ بگڑیں لیکن انگریز یہاں معذور و مجبور نہ تھا۔ ملک (پنجاب) کے لوگ اُس کے دست بازو تھے۔ ہر جگہ اُن کو کھل دیا گیا۔ باقی مقامات سے پلٹنیں پہنچتی رہیں، فیروز پور سے بھی قریب ہونے کی وجہ سے پہنچیں؛ لے

نواب احمد علی خاں منڈل نے اس جنگ آزادی میں جو کارنامہ انجام دیا اُس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو:

”منڈل خاندان کا نواب (احمد علی خاں) جس کی خدمات کی تعریفیں لارڈ کیننگ تک نے کیں۔ سالانہ پانچ سو روپے لگان کے ادا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا گیا، اس لیے کہ اُس نے غدر میں انگریز کی ایسی مخلصانہ مدد کی کہ ملک و کٹوریہ کا بیٹا بھی نہ کرتا؛ لے

جن حضرات کی انگریز دوستی اور ملک دشمنی کی طرف سطور بالا میں اشارات کیے گئے۔ ان مقصود کسی پر کھڑا اچھا نا یا کسی کو بدنام کرنا نہیں، بلکہ ان حضرات کا ذکر ضمناً اس وجہ سے آگیا ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں نے جس طرح سرزمین پاک و ہند پر قبضہ جمایا، مدتوں یہاں باشندوں پر حکومت کرتے رہے، کتنے ہی اہم ترین مواقع پر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی اُن کے اندر جو صلاحیت تھی اُس صلاحیت کے دو جز ہیں، ایک یہ کہ اُن کے اندر ایجنٹ تلاش کرنے اور اُن کے ذریعے سازشوں کا جہال پھیلانے کی بڑی مہارت تھی اور دوسرا

لے محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۸۶

لے ایضاً: ص ۳۲۷

جزیرہ ہے کہ ملک کے اندر ایسے حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ہر بڑی سے بڑی چیز قربان کر دیا کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ کی ساری کامیابیوں کا راز دراصل ان حضرات کی ملک دشمنی، پیدل پرستی اور ملت فروشی کی مرہون منت ہے۔ یہاں صرف ان حضرات کا تعارف منظور تھا جن کی بدولت برطانوی یہاں اپنی حکومت قائم کرنے اور مٹھی بھر ہونے کے باوجود اپنا قبضہ، اقتدار ایسے وسیع و عریض ملک پر برقرار رکھنے میں کامیاب و کامران رہے۔ ملک اور قوم کا اپنے ذوق اور گھٹیا مفاد پر سوداگر بنوالوں کی نشان دہی کر دینا بھی انگریزوں کی عیاری اور غلام کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی س

لاؤ تو قتل نامہ ذرا ہم بھی، دیکھ لیں  
کس کس کی مہر ہے سرِ محمد زنگی ہوئی

اس تحریک آزادی کے دوران اور دوبارہ غلبہ پایا بننے کے بعد انگریزوں نے اہل ہند کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً کیسے کیسے ظلم و ستم روار کئے اور تاریخ عالم کے بے رحم ترین حکمرانوں کو بھی شرمندہ کر کے کس طرح امتیازی مقام حاصل کیا؟ اس کے ثبوت میں چند نکتہ نشین اور وحشیانہ مظالم کے واقعات پیش کرتا ہوں۔ جب مرزا الہی بخش نے مغل شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر دیا، تو جنرل ہوڈسن نے ان کے ساتھ کاسلوک کیا:

شہزادے رتھ پر سوار اور سواروں کے حلقے میں چلے آ رہے تھے۔ جیل خانے کے قریب پہنچے تو ہوڈسن نے سامنے بٹو کر، کپڑے اتروا کر، پھر اسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں مقام قلب پر ماریں اور شہرگ کو سنگین سے چیر دیا اور اسی طرح چوڑے کوتوالی میں جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا، لے  
شہزادوں کے ساتھ یہ ظالمانہ اور بہیبت کاسلوک روار کھنے کی، خود ہوڈسن نے یہ وجہ بتائی تھی:

لے غلام رسول مرزا، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۳



میں بے درد نہیں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ان بد بختوں (تین شہزادوں) کے وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انہیں چھانسی پر لٹکاؤں گا، لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ رہیں گے یا ہم، تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہ تھا؛ لہٰذا

جو سنا ہے جو ڈس کا یہ بیان انگریزوں یا دوسرے انصاف پسند دشمنوں کو مطمئن کر گیا ہو لیکن اصل سوال تو اپنی جگہ پر علیٰ عالمہ قائم ہے۔ بتانا تو یہ تھا کہ شہزادوں کو یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی تھی؟ متحدہ ہندوستان کے شاہی خاندان کو ختم کرنے کا برطانوی ٹیڑوں کو کہاں سے پرمٹ ملا تھا، کون سا ضابطہ اخلاق انہیں اس سفاکی کی اجازت دے رہا تھا، شہزادے کون سی ناپاکی پھیلا رہے تھے جس کے پیش نظر جو ڈس جیسے پاکباز کو ان کے وجود سے زمین کو پاک کرنا پڑا، کیا انگریزوں کے پاس ان مظالم کے جواز کا کوئی ثبوت ہے، ان کے علاوہ دیگر مغل شہزادوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روار کھا گیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

”دلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے، پکڑے گئے۔ ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب چھانسی میں لٹکائے گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا قیصر مرزا (ابن شاہ عالم ثانی) اکبر شاہ کا بھائی تھا اور مرزا محمود شاہ، اکبر شاہ کا پوتا و جج مفاصل میں مبتلا تھا۔ ان کی لاش چھانسی میں گولا لٹھی لگی ہوئی لٹکتی تھی..... شہزادے بے تیزی کے ساتھ چھانسی پاتے تھے؛ لہٰذا

چھانسی دینے سے پہلے شہزادوں کو تڑپانے کی غرض سے خیل خانے میں رکھ کر، ان سے مشقت لی جاتی، مارا پٹیا جاتا تھا۔ آخر اس سلوک کی وجہ؟ کس جرم کی یہ پاداش تھی۔ جناب غلام رسول مہر کی زبانی شہزادوں کا یہ قصور تھا:

۱۔ غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۰

۲۔ ذکا، اللہ مولوی، عروج عہد انکلاشیہ، ص ۲۰۸

”جس شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی اُن سے عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی وہ بیچارے مشقت کیا کر سکتے تھے؛ اُن سے چکی لپوٹی جاتی تھی، سپس نہ سکتے تو تو کوڑوں کی مار پڑتی یہاں تک کہ وہ بیچارے چند روز میں مر جاتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کتنے مرے، اُن کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ بہادر شاہ کے خاندان سے تھے“۔

کیا چشم فلک کہن نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے کہ کسی قوم نے حکمران خاندان کو چُن چُن کر چھانسی پر لٹکایا ہو، جب گدھ اُن کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں تو ڈھانچے دریا میں پھینکوائے گئے ہوں۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو نہ سہی، انگریزوں نے متحدہ ہندوستان میں شاہی خاندان کے افراد سے، ۱۸۵۷ء میں یہ سلوک کر کے اپنی برتری کا لوہا منوایا۔ وٹانک ساور کرنے ان بہیمانہ مظالم پر یوں تبصرہ کیا ہے:

”جب گدھ کچھ مدت تک اُن کا گوشت نوچ چکے تو ٹرے ہوتے جسدوں کو کھنچو کر دریا میں ڈلوادیا گیا۔ آہ زمانے تیرے انقلابات! شہنشاہِ اکبرِ اعظم کی اولاد پر نمازِ جنازہ ادا کرنے اور انھیں آغوشِ زمین میں سلانے والا بھی کوئی نہ تھا؛ مغل شہزادوں پر تو یہ ظلم کے پہاڑ ڈھانے گئے لیکن جب متحدہ ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں انگریز فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تو باشندگانِ دہلی پر جو قیامت برپا کی وہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی زبانی سنئے:

”سپاہِ شہر کشتانے شہر میں قدم رکھا تو اُس کے سامنے جو مرد آیا اُس کو وہ گولی مارتے۔ اُس وقت دوست دشمن، مجرم و غیر مجرم میں تیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں کچھ ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔“

۱۔ غلام رسول قہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۶

۲۔ وٹانک ساور کر، ساور کر، طبع اول، ص ۲۸۰

۳۔ ذکاء اللہ مولوی، عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۰۵

دہلی میں انگریزی سپاہ اور سکھوں کے حبش جب فاتحانہ انداز میں داخل ہو گئے تو سبکے چکھے باشندوں کے ساتھ انھوں نے انسانی ہمدردی کا کہاں تک ثبوت دیا تھا۔ یہ جناب مرصاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”کرنل برن شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا، جس نے قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی۔ شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لشکریوں کے حبش مقرر ہو گئے جو بازاروں، گلیوں کے چکر لگاتے، جہاں کسی گھر کو آباد پاتے، مردوں، عورتوں، بچوں سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے اور پھونے کے پشتارے مردوں کے سروں پر ہوتے۔ تلاش میں جو چیز قیمتی ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو کوڑھی میں کوئی نہ خریدتا اُسے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں سینک سائیں، چلے جائیں۔ اس طرح باقی شہر بھی خالی کر لیا گیا۔“

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لال قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب رابرٹس کان پور جانے لگا تو اُس نے دہلی کو بھی گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہجہان آباد کی بربادی کا نقشہ رابرٹس نے یوں کھینچا تھا:

”صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہرِ غم و غمناک معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سُمون کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تاکہ انسانی تشنگی

لے غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۱

ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔ جی مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوتیں وہ بڑے ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔

کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو جھنجھوڑ کر کھا رہا تھا۔ کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا تھا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا، اس لیے وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھے پھلارہے تھے۔ پوری فضا ناقابل تصور حد تک بھیا تک تھی، جو بڑی مضر اور بیماری آور بدبو سے لبریز تھی، یہ باشندوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے پر ٹوٹ مار کا جس طرح بازار گرم کیا گیا وہ مہر صاحب کی زبانی کہنے سے۔۔۔

”فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین دن کے لیے ٹوٹ کی اجازت دے دی گئی تھی۔ باسور تھ سمجھنے لگا ہے کہ اجازت نہ بھی دی جاتی تو سپاہ اس حالت میں بھی باز نہ رہتی۔ سکھوں اور دوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دہلی میں اعلیٰ قیمتی سامان، جواہرات، سونے پاندی کے بزنوں اور روپے کے انبار لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ شکاری کتوں کی طرح جھولی ڈال وہ گلی گلی اور بازار بازار پھر نکلے۔ ایک بے آباد گھر کے بعد دوسرے میں داخل ہوتے۔ ہنرمندوں کی طرح آہستہ آہستہ دیواروں اور تختوں پر تھپکیاں مارتے، فرش پر پانی ڈالتے اور دیکھتے رہتے کہ کہاں جلد مرتا ہے، پھر عقاب کی آنکھ یا سرخ ہندوستانی کے کان یا شکاری کتے کی ناک سے کام لے کر سیدھے گڑھے یا تہ خانے یا

زمین میں دبے ہوئے برتن نکال لیتے، جن میں عمر بھر یا پشتوں کی بچائی ہوئی  
پونجی موجود ہوتی ہے۔

دہلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک  
روا رکھا اس کا تصور بھی انتہائی دردناک اور وحشت انگیز ہے۔ سید کمال الدین حیدر نے اس کا  
اجمالی تذکرہ یوں کیا ہے:

”ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتل عام رہا اس کا  
سبب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسلی تیموریہ کو دکھا مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورت  
سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔“

عبادت گاہیں ہر مذہب و ملت کے نزدیک قابل احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں، لیکن  
انگریزوں نے نہ انسانی اور اخلاقی ضابطوں کو نظر رکھا اور نہ اپنے عیسائی ہونے کے دعوے  
کا کوئی پاس لحاظ کیا۔ مسلم کشی کے جذبے نے انہیں اتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف  
جامع مسجد کو سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا۔ سکھوں نے بھی انسانی اور اخلاقی کسی زاویے  
سے اس حرکت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی، بلکہ اس خانہ خدا میں وہ نازیبا اور شرمناک  
کام کیے جو ان کی قومی ذہنیت کا ایک جز ہی کر رہ گئے۔ مولوی ذکا اللہ لکھتے ہیں:

”جامع مسجد جو شہر کی کل مساجد کی ناک تھی اس کو یوں نکٹا بنایا کہ سکھ سپاہ  
کی بارک اس کو بنایا۔ اس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز انہوں نے نہیں  
کیا۔ سکھوں نے اپنے کڑھاتے حلوسے بکے سُرخ مینار کے نیچے خوب چڑھائے  
سور ذبح کر کے پکائے۔ کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف  
میں پڑے پھرتے تھے۔“

جب دہلی کے باشندوں کو خاک و خون میں ملا دیا، بچے کچے افراد کو شہر سے بھگا دیا، اپنے نزدیک

۱۔ غلام رسول تہر: ۱۸۵۶ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۲

۲۔ کمال الدین حیدر، سید: قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۲۵۲

۳۔ ذکا اللہ، مولوی: عروج عہد انگلشیہ، ص ۷۱۹

تیموریہ خاندان کو مٹا دیا تو صرف دو چیزیں باقی رہ گئی تھیں، ایک مغلوں کی آخری نشانی ضعیف العمر اور حرماں نصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر، جو انگریزوں کی قید میں تھا اور دوسری چیز دہسلی کی نوحدگناں خالی عمارتیں۔ ان کے بارے میں انگریزوں کا روزنامہ کرائیکل لاہور، اکتوبر، ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں یہ سوال کرتا ہے:

”دہلی کو اب تک کیوں تباہ نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک کیوں زندہ ہے؟ اس کا جواب اختصار سے دے دینا چاہیے۔ شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود دفتری حکومت کا ممنون ہے۔ دفتری حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیے۔“

یہی مطالبہ لاہور کے دوسرے انگریزی اخبار ”پنجابی“ نے ماہ نومبر میں اپنی حکومت سے ان لفظوں میں کیا:

”دہلی مسلمانوں کا یروشلم ہے، کیوں اب تک اسے زمین کے برابر نہیں کیا گیا؟ بادشاہ مسلمانوں کی محبت و عقیدت کے جگدے کا پروہت ہے، کیوں اب تک اسے پھانسی نہیں دی گئی یا گولی نہیں ماری گئی؟“

جن کے خون پینے کی کماٹی سے انگریز پھلے چھوٹے تھے، جن کی پشت ہا پشت کی پونجی کو لوٹ کر انگلستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کو صنعتی، مالدار اور ترقی یافتہ بنا بیٹھے تھے۔ آزادی اور دولت چھین لینے ان کے مذاہب میں مداخلت کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی پاداش اور آزادی چاہنے کے مجرم میں وہ مظالم ان غریبوں پر ڈھانے کہ جن کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دہلی میں جو کچھ کیا اس کی جھلک شیش کی جا چکی۔ باقی ملک میں شہروں اور دیہات میں، اس بد نصیب ملک کے باشندوں سے کیسا سلوک کیا گیا ملاحظہ ہو: ”نیل نے الہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں ظلم و جور کی بھٹیاں دہکار رکھی تھیں۔“

لے غلام رسول مہر : ۱۸۵۷ء ، مطبوعہ لاہور ، ص ۳۶۱

لے ایضاً : ص ۳۶۱

اس اثنا میں اُس کی جگہ ہنری ہیوسے لاک کو سپلائی بنا دیا گیا اور ہیوسے  
۳۰ جون کو الہ آباد پہنچ گیا۔ نیل جتنا کام انجام دے چکا تھا، اُس کی تفصیلات  
بیان کیں نیز بتایا کہ ریٹاؤ کو ہراول کے طور پر بھیجتے وقت اُس نے کیا کیا ہدایا  
دیں؟ ہیوسے لاک نے ان تمام ہدایات پر تحسین کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی  
تصدیق کر دی۔ گویا ظلم و جور اور بے پناہ تشدد و محض نیل ہی کو پسند نہ تھا،  
تمام انگریز جرنیل ایسے ہی طور طریقوں کو پسند کرتے تھے۔“ لے

ریٹاؤ جس کو کرنل نیل مذکور نے ہراول کے طور پر آگے بھیجا ہوا تھا۔ اہل ملک کے ساتھ  
اُس کے سنگین مظالم، جن کی کوئی بااخلاق آدمی ہرگز جرات نہ کر سکتا تھا، انگریزی ذہنیت کے  
پوری طرح آئینہ دار ہیں:

”دو روز میں بیالیس آدمیوں کو چانسیاں دی گئیں۔ بارہ آدمیوں کے ایک  
گروہ کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ جب کالم کوچ کرتا تھا اُن کے پاس  
سے گزرتا تو انھوں نے منہ پھیر رکھے تھے۔ ریٹاؤ جب پڑاؤ ڈالتا تو سامنے  
کے تمام دیہات کو آگ لگا دیتا۔“ لے

کرنل نیل نے ایک مکان کے اندر فرشیں بچھو کر علیحدہ علیحدہ گائے اور سور کے خون کا  
چھڑکاؤ کرایا ہوا تھا۔ جو عینت پسند گنہگار جو کہ اُس کے سامنے پیش کیا جاتا اُسے چانسی  
دینے سے پہلے یہ تعذیب دی جاتی کہ اگر مسلمان ہے کہ اُس مکان میں اپنے جھٹے کا سور کا  
خون زبان سے چاٹ کر فرشیں کو صاف کرے اور اگر قیدی ہندو ہے تو اُس سے گائے کے  
خون والی جگہ کا ایک قطعہ اسی طرح صاف کر دیا جاتا۔ جو انکار یا جیل و محبت کرتا تو درزے  
گتے۔ انکار کی صورت میں درزے مار مار کر اُسے ختم کر دیا جاتا اور نہ صاف کرنے کے بعد چانسی  
پر لٹکا دیا جاتا اور اس طرح موت سے پہلے چند منٹ زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی۔ یہ

لے غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

لے ایضاً: ص ۲۵۶

طریقہ کار نیل نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو جاری کیا تھا۔ اس طریقہ تعذیب کو میلی سن جلد دوم ص ۲۰۰ سے یوں نقل کیا گیا ہے:

”برگیدر جنرل نیل کا عزم مصمم ہے کہ بے گناہوں کے خون کا سرد حباب ان بد معاشوں (حریت پسندوں) سے قبل از نفاذ سزا سے موت صاف کرایا اور ڈھلویا جائے جو آئندہ غدر میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر گرفتار ہوں۔ انہیں حیثیت، ذلت اور درجہ جرم کی بنا پر اس کام کے لیے منتخب کیا جاتے۔ سہرہ معاش کو موت کی سزا کا حکم سن لینے کے بعد پرے کے ساتھ متعلقہ مکان میں لے جایا جائیگا، اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ دھتوں کا ایک حصہ صحت کرے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز بنا دینا چاہیے۔ اگر مجرم کام پورا نہ کرے تو فوجی کو تو ال تاربانے لگواتے۔ اپنے حصے کا کام کر چکنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے اس غرض سے پھانسی پائس ہی نصب کی جائے گی۔“

نیل نے اپنی اس تجویز پر دل کھول کر عمل کیا لیکن ہنری ہیوسے لاک جسے نیل کی حبیبت الہ آباد کے علاقے کا فوجی افسر مقرر کیا گیا تھا اس نے ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو جو سلوک بر صغیر پاک و ہند کے باشندوں کے ساتھ روارکھا، وہ ایک انگریز رسول افسر کی زبانی میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۷۷ سے یوں منقول ہے:

راستے کے بہت سے گاؤں جلا دیے گئے تھے اور انسان وہاں قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دلہل تھی، جلی ہوئی جھونپڑیوں کے سیاہ کھڑکتے، جنہیں موسم کے اثرات نے اور زیادہ بد وضع بنا دیا تھا۔ ایک بھی صدا نہ سنی جاتی تھی جو کسی انسان کے وجود کا پتہ دیتی یا معلوم ہو سکتا کہ آدمی کام کاج میں لگے ہوتے ہیں۔ ایسی صداؤں کی جگہ مینڈکوں کے ٹرانے کا شور تھا یا ٹڈیوں کی تلخ و تیز بانسریاں بج رہی تھیں یا ہزاروں پردار

لے غلام رسول تہرہ: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۱



کیڑے دھیمے دھیمے عنقار ہے تھے جونہی اور گرمی کے باعث پیدا ہو گئے تھے ، پھر نیم کے درختوں کی ناعوشگوار بوجھی وقتاً فوقتاً لٹکی ہوئی نعشوں کی بدبو ہوا خراب کر رہی تھی ، جنہیں ہماری آنکھوں کے سامنے مکروہ ستور مزے سے کھا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمارے مختلف حواس پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور مل کر بربادی ، تباہی اور رنج و ماتم کا ایسا مرقع تیار کر رہی تھیں جو میرے نزدیک موجود انگوں میں سے کسی کو عمر بھر فراموش نہ ہوگا۔

لیفٹیننٹ رابرٹس نے ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو جہلم سے اپنی والدہ کے نام ایک خط انگلستان بھیجا۔ اُس میں اپنی قوم کے عوام اور متحدہ ہندوستان کے باشندوں کو اذیت ناک سزائیں دینا اور توپ سے اڑانا جس فخریہ انداز میں لکھا وہ انگریزوں کی ذہنیت کی صحیح تصویر ہے۔ اُس خط کا ایک اقتباس مولانا غلام رسول فہر کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

”سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑا دیا جاتے۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے۔۔۔ ہمارا مقصد ان بد معاشرستوں کو پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے۔“

جو ظلم و ستم دہلی میں ڈھایا گیا اسی طرح دیگر شہروں اور دیہات میں غالب آنے کے بعد انتقام کی بھٹیاں گرم کی گئیں۔ نیل ، ہیونے لاک اور ریناؤ کے جو مظالم بیان ہوئے ، پورے ملک میں یہی کچھ کیا گیا۔ اس کے بعد فوجی عدالتیں بچے کچھے باشندوں کے لیے قائم کر دی گئیں ، اُن کا عدیم المثال انصاف ملاحظہ ہو :

”مذموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے فوجی کمیشن کے سربراہ کے روبرو پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا۔ موت کے ہوا

۱۔ غلام رسول فہر ، ۱۸۵۷ء ؛ مطبوعہ لاہور ، ص ۲۵۹

۲۔ ایضاً : ص ۳۲۶

کوئی سزا نہ تھی اور اثباتِ مجرم کے سوا کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے مجرم کی پھان میں تھا وہ نرمی کے چنداں روادار نہ تھے۔

انگریزوں کا مقصد اس فوجی نظامِ عدالت سے یہ تھا کہ بچے کھچے باشندوں کو مزید ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ بعد میں کوئی سر اٹھانے کا تصور بھی دل میں نہ لانے پاتے۔ اکثر کو ماخوذ کر لینے کے بعد سزائے موت کی سزا ہی دی جاتی تھی۔ طریقہ ہائے اذیت ایسے وحشت ناک اور غیر انسانی تھے کہ بعض انگریز بھی ان پر اظہارِ ملامت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ٹامپسن ص ۳۱ سے ایک انگریز کا بیان یوں منقول ہے:

”ہندوستانیوں کے لیے تعذیبات، یہ مسلمانوں کو (چھانسی دینے سے پہلے) سوروں کے چھڑوں میں سینا یا ان کے جسموں پر سوروں کی چربی ملنا اور ان کے جسموں کو جلانا یا ہندوؤں کو بھرست ہونے پر مجبور کرنا، یہ تمام حرکات سراسر عقمانہ اور غیر مسیحی ہیں اور ہمارے لیے باعثِ بے عزتی ہے۔ انجام کار یہ ہم پر مصیبت بن کر گریں گی۔ ان روحانی اور ذہنی تعذیبات کے بعد یورپ والوں کو منہ دکھانے کے قابل (ہم) نہیں رہ سکتے۔“

فتح دہلی کے دو ماہ بعد لارڈ لارنس نے دہلی میں فوجی کمانڈر کے نام ایک آرڈر بھیجا، جس کا ایک اقتباس ولیم میور کی کتاب جلد اول صفحہ ۲۳۹ سے یوں نقل کیا گیا ہے:

”مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریق پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو ٹوٹا ہے اس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہو گا۔ بہر حال دو مہینے کی ٹوٹ کو کافی سمجھنا چاہیے۔ میرے پاس اس بارے میں مہی سے بھی شکایتیں پہنچ رہی ہیں۔۔۔۔۔ میں نے یہ بھی سنا ہے، اگرچہ یقین نہیں آتا

لے غلام رسول تہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۷۲

لے ایضاً: ص ۳۲۹

کہ افسر باہر نکل نکل کر ویسی باشندوں کو بیدروی سے قتل کر رہے ہیں....  
 اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا  
 یہی ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی چیرہ دستیوں سے باز رکھیں باغیوں  
 اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑانے کے لیے مجھ سے زیادہ  
 کوئی مستعد نہ ہوگا، لیکن ہمیں دوست دشمن میں امتیاز کرنا چاہیے۔ موجودہ  
 صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں اور چاولی  
 جنگ شروع ہو جائے، ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے۔  
 پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا ہی ممکن نہ رہے۔" ل

سکھوں نے بھی انگریزوں کے دوش بدوش خیریت پسندوں کو بلا امتیاز ہندو مسلم کے  
 جمانی اور روحانی اذیت پہنچانے اور دونوں قوموں کو برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی  
 غرض سے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے،  
 جو مورے ٹامس نے ہنری کاٹن کو بتایا اور ٹامسین صوفیہ ۴۴ سے جناب غلام رسول مہرنے  
 اپنے لفظوں میں اسے یوں بیان کیا ہے :

"اندھرا ہو چکا تھا، ایک سکھ اردلی میرے پیچھے نیتن آیا اور سلام کرنے کے بعد  
 بولا کہ ہم نے قیدیوں سے جو ملوک کیا ہے، میں سمجھتا ہوں آپ اسے دیکھنا  
 پسند کریں گے۔ مجھے (ہنری کاٹن کو) شبہ ہوا۔ فوراً اٹھا اور حوالات میں  
 گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بد بخت مسلمان گھڑی دھون پر ہیں۔ ان کی ٹانگیں کسی  
 ہوتی ہیں، کپڑے اترے ہوتے ہیں اور تانبے کے پیسے گرم کر کے ان کے  
 جسموں کو سر سے پاؤں تک داغاً جا پکاتے ہیں۔ میں نے خود انھیں گولیوں سے  
 ہلاک کر دیا، تاکہ ان کی اذیتیں ختم ہوں۔" ل

غلام رسول مہرا، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۲

۷۴۸ ص ۲۴۸

اسی سکتہ ذہنیت کا مظاہرہ ہندوؤں کے بارے میں بھی ملاحظہ ہو کہ اجنالے میں کیس  
مظاہرہ کیا :

”اجنالے کے ارد گرد پہرے کھڑے کر دیے گئے تاکہ کوئی آدمی تھانے کی طرف نہ  
آنے پاتے۔ دس دس کے جھنڈوں میں قیدیوں کو باہر لایا جاتا، ان کے نام  
اور پتے لکھے جاتے اور اُس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سکتہ سپاہی اُنھیں  
گولیاں مارنے کے لیے متعین تھے۔ کو پر نے خود لکھا ہے کہ اُنھیں قتل گاہ  
کی طرف بھیجا جاتا تو وہ غصے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے کہ ٹھہرو!  
تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہو گا۔ کبھی سکھوں کو طعنہ دیتے، کبھی گنگا جی کو  
مدد کے لیے پکارتے۔“ لے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بعض انگریز افسروں نے جو بہیمیت اور درندگی کا ثبوت  
دیا اہل ملک کے ساتھ محض اس وجہ سے غیر انسانی برتاؤ کیا کہ اُنھوں نے آزادی حاصل  
کرنے کا تصور بھی کیوں کیا؟ انگریزوں کو دوسروں کے ملک پر قبضہ جمالینے، وہاں کی دولت  
ٹوٹنے، صنعتیں تباہ کرنے، اس کی دولت سے انگلستان کو صنعتی اور ترقی یافتہ بنانے کا  
اخلاقی اور انسانی حق حاصل تھا لیکن ویسی باشندوں کا کوئی حق نہیں تھا کہ جب اُن کا ملک  
اجازاً جابرا تھا تو اُنھوں نے اُن کیوں کی؟ صنعتیں تباہ کی جاری تھیں تو کیوں بلبلائے؟ عیسائی  
بنانے کی سر توڑ کوشش کر کے اگر انگریزوں نے اُن کے دلوں پر آدے چلائے تو دسیوں کے  
مذہب سے سی سی کی آواز کیوں نکلی؟ یہ تھی متحدہ ہندوستان میں بسنے والوں کے جرائم کی فرد۔ کیا  
انگریزوں کے نزدیک یہ جرم قابل معافی تھے؟ لیکن اخلاق اور انسانیت کی رُو سے ویسی  
جرم تھے یا انگریز، اہل خانہ اپنے گھر کو بچانا چاہتے تھے تو مجرم ٹھہرے لیکن ڈاکو اسی گھر کو  
صرف متواتر ٹوٹنا چاہتے تھے بلکہ اُس پر قبضہ جائے رکھنے پر مُصر تھے اور ایسا کرنا اُن کی  
نظر میں نہ جرم تھا نہ معیوب۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ انگریزوں کے جن جزیروں اور دیگر

لے غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۹

فوجی افسروں نے زیادہ سے زیادہ ورندگی کا ثبوت دیا، سفاکی، وحشت اور بربریت کے اگلے پھلے سب ریکارڈ ۱۸۵۷ء میں متحدہ ہندوستان کے اندر توڑ دکھائے انہیں ہیرو قرار دیا گیا، انہیں اور ان کی اولاد کو پنشنوں اور جاگیروں سے نوازا گیا، انگلستان کی تاریخ میں ان ننگ انسانیت افراد کو نمایاں کر کے دکھایا گیا۔ گویا پوری برطانوی قوم کی ذہنیت ڈاکوؤں جیسی اور ڈاکو نوازیں کر رہ گئی تھی۔ انگریزوں کی اسی ذہنیت اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے جس ورانگی کا مظاہرہ کیا، اس کے پیش نظر جناب غلام رسول مہر کیسا پیارا سوال کرتے اور باشندگان پاک و ہند کے ضمیر کو تھنجھوڑتے ہیں:

اب سوچئے کہ جس کے دل میں ۱۸۵۷ء کے واقعات محزنہ کی یاد تازہ ہوگی، کیا اس میں انگریزوں کے لیے کسی بھی خوشگوار خیال کی گنجائش باقی رہے گی، شعلوں کو کون پھول سمجھتا ہے اور خارزار کو کون حیرت پر نیاں کا فرش قرار دیتا ہے؟ تاریخ قوموں کے اعمال کا مرقع ہے۔ انگریز جب اس میں اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے اور اس کے اوراق پر ۱۸۵۷ء کے خون ناحق کا حصار امتلاطم نظر آئے گا، تو ان کی حالت کیا ہوگی؟ وہ تیل، ٹیکسن، ہمدسن یا ان جیسے دوسرے بڑوں کے ہارسے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اس دنیا کا ہر ذرہ ذرہ پکار کر کہے گا کہ انگریزوں نے وہ حرکتیں کیں جو انسانیت ہی نہیں بلکہ جنگلی دندوں کے لیے بھی باعزت ننگ تھیں۔

مولانا غلام رسول مہر کے مذکورہ بالا سوال اور وضاحت سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ انگریزوں

نے ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں اور خاموش رہنے والوں کے ساتھ بغیر کسی امتیاز کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے اوپر مظالم کے چھاڑ ڈھائے، اندھا دھند گویاں چلائیں، دیہات جلواتے، گول لاسٹی لگا کر درختوں سے اٹے لٹکاتے، سورا اور گائے کا خون فرش زمین سے چاٹ کر صاف کر دیا، توپ سے اڑایا، اسباب چھینا، گھربار سے

۱۔ غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۱

نکالا، جا تا دیں ضبط کیں، کالے پانی کی مزائیں دیں، ایسے بے شمار طرقِ مظالم ایجاد کیے جن کے پیش نظر کوئی انصاف پسند انھیں پھول نہیں بلکہ شعلہ سمجھنے پر مجبور ہوگا، ان کی ظاہری عنایات کو حریر و پریاں کا فرش نہیں بلکہ خارزار ہی قرار دے گا۔ خود بعض انگریز مورخوں اور انصاف پسند افسروں نے اپنی قوم کے ان مظالم کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

اس باب کے گزشتہ اوراق میں ہم نے متحدہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط، لوٹ مار اور جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں انھوں نے بربریت کے جو المناک مناظر پیش کیے، ان کو بیان کیا، جس کی محض یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انگریزوں کے مظالم پیش کیے جائیں اور دوسری طرف بعض صاحبانِ جہت و دستار اور علمِ پیڑ کے امین کہلانے والوں کے اس شعلہ راہ کتاب کے بابِ چہارم میں ایسے بیانات و اعلانات بھی قارئین کرام کے سامنے رکھے جائیں، جن میں انھوں نے انگریز کو خار نہیں بلکہ پھول بتایا ہے۔ ظالم نہیں بلکہ عادل ٹھہرایا ہے، انھیں اپنا پشت پناہ اور حامی و ناصر سنایا ہے۔ ایسے بیانات اور حوالے پیش کر کے ہم قارئین کرام سے انصاف چاہیں گے اور فیصلے کے طلب گار ہوں گے۔

مولانا غلام رسول مہر کا سوال اپنی جگہ پر بجائے لیکن یہ یقین نہیں آتا کہ ایسے وسیع النظر مورخ سے وہ تاریخی پھرے پنہاں ہوں جنھوں نے انگریزوں کو خار نہیں بلکہ پھول بتایا ہے یقیناً انھیں خبر ہوگی اور ان جیسے کتنے ہی اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں، لیکن یہ راز سمجھنے سے ہم آج تک قاصر رہے کہ ایسے حضرات خار کو پھول بتانے والوں کے گرویدہ کیوں بنے رہتے ہیں؟

علمائے کرام اور جنگِ آزادی، آخر میں چند ان علمائے کرام کا ذکر خیر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ مولانا احمد اللہ شہید جنھوں نے بریلی اور شاہجہان پور وغیرہ کے معرکوں میں انگریزوں کے نامی گرامی جرنیلوں کو بھی گٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا اور حریت پسندوں میں نئی رُوح پھونک کر اس علاقے سے انگریزوں کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ ان کے جنگی کارناموں کی ایک جھلک

گزشتہ صفحات میں دکھائی جا چکی ہے۔ موصوف ۱۸۴۰ء سے برطانوی اقتدار کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر سرگرم عمل تھے۔ چنانچہ موصوف کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی یوں رقمطراز ہیں:

”۱۸۴۰ء میں مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ بن محمد علی، نواب چھپا پٹن، جے پور میں میر قربان علی، گوالیار میں مہراب شاہ قلندر سے بیعت جہاد کرتے ہوئے دئی گئے مفتی صدیق الدین خاں آزرہ کے مشورہ سے آگرہ آئے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر کے یہاں مقیم ہوتے۔ مجلس علماء کی تشکیل کی اور بیعت جہاد کا سلسلہ شروع کر دیا۔“

مولانا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ) جو ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد کے محرک اور جاری کرنے والے تھے، ان کے بارے میں زمانہ حال کے قابل فخر مورخ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں:

”جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ وہی میں جنرل بنجیت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا۔ بعبور دیرپائے شور کی سزا ہوئی، جزیرہ اندمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔“

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اس سلسلے میں فتویٰ جہاد اور علامہ کی حریت پسندانہ سرگرمیوں کا ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے لفظوں میں یوں تذکرہ کیا ہے:

ٹہینی کے عمال کی بدعہدی، خود غرضی اور بدینیتی نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔ عوام اعراض کرنے لگے تھے تو خواص کا کیا عالم ہو گا، ویسی

۱۔ انتظام اللہ شہابی، مفتی، مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی، مطبوعہ کراچی، ص ۵

۲۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، ترجمہ اردو تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳

بدیسی کی کشمکش کی یہ زبردست ٹکراؤ بالکل فطری تھی اور آخر ۱۸۵۷ء کو  
 دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ نکلا۔ عوام کی اس بے چینی کا اثر مولانا  
 (فضل حق خیر آبادی) پر بھی پڑے بغیر نہ رہا۔ وہ دہلی آتے ہی قلعہ میں گئے۔  
 بہادر شاہ سے اگلی راہ و رسم تھی۔ بادشاہ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔  
 انہوں نے ایک اشرفی نذر کی، موجودہ صورت حال کے متعلق بادشاہ سے  
 گفتگو کی، بادشاہ کی اُسکیں ختم تھیں، دوسرے شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ  
 اور تخت شاہی کی تمنائیں باہمی رقابت کا میدان گرم کیے ہوئے تھیں۔ مولانا  
 نے دیکھا کہ عمائد شہر میں بھی دو گروہ تھے، ایک بادشاہ کا ہم نوا، دوسرا  
 حکومتِ چھپنی کا بھی خواہ۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔ حریت پسندوں کی دو جماعتیں  
 ایسی بھی تھیں جو ایک مقصد کو لیے ہوئے جان پر کھیل رہی تھیں۔ ایک جماعت  
 مجاہدین کی تھی دوسری جماعت روہیلوں کی۔ یہ لوگ جنرل بخت خاں سردار  
 روہیلہ کی زیرِ کمان تھا۔ مولانا کی خیر سُن کر جنرل بخت خاں ملنے آئے۔

چنانچہ مولانا نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد  
 میں علماء کے سامنے تقریر کی اور استغناء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں جزیب  
 ہوئے۔ مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد ہدایونی،  
 ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رامپوری وغیرہ نے دستخط  
 کر دیے، مگر مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آزادہ) بالآخر کو بالآخر لکھ گئے۔  
 اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار  
 سپاہ جمع ہو گئی تھی۔

علامہ فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۸/ ۱۷۷۷ھ / ۱۸۶۱ء) معقولات کے امام و مجتہد، فنِ مناظرہ  
 میں لاثانی، تبحر عالم دین اور ماہرِ قانون تھے کیونکہ سررشتہ دار سے صدر الصدوری تک کے فرائض

۱۷ انتظام اللہ شہابی، مفتی؛ مولوی فضل حق خیر آبادی اور جنگِ آزادی، ص ۳۵



امتیازی شان سے ادا کر چکے تھے۔ جب علامہ گرفتار ہو گئے اور مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو لطف کی بات یہ ہے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں بلکہ آپ سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے۔ برطانوی قانون کے ٹیکنیجے کو آپ تاریک بھوت کی طرح توڑ کر عدالت کو رہائی پر مجبور کر دیتے تھے۔ سرکاری وکیل کو ہر بار لاجواب کر کے آپ اس طرح کھلا رہے تھے جیسے بی کسی چوہے کو سُنہ میں دبا کر بعض اوقات ڈھیلا کر دیتی ہے۔ مثلاً:

”سیرۃ العلماء میں ہے کہ ۵۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وقاداری یا فتویٰ جہاد

کی پاداش میں مولانا موصوف (فضل حق خیر آبادی) ماخوذ ہو کر سیٹاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری مینٹی۔ ایک اسپر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وکیل سرکار کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے، بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کرتے اور خود ہی مثل تاریک بھوت عقلی و قانونی بحث سے توڑ دیتے تھے۔ حج یہ رنگ دیکھ کر ڈنگ رہ گیا۔ حج نے صدر الہندوری کے ہمد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا، وہ مولانا کی عظمت اور تجربے واقف بھی تھا، وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں، اُسے سچہ جہردی تھی۔ اُس وقت تک صورت بھی یہ تھی کہ مولانا پر جرم ثابت نہیں ہو رہا تھا اور اُمید تھی کہ بری ہو جائیگا۔ وکیل لاجواب تھے۔

ماہر قانون اور امامِ عقلیات ہونے کی بنا پر سرکاری وکیل کو لاجواب تو کر دیا، قانون کی رو سے عدالت جرم ثابت نہیں کر پاتی لیکن حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ فتویٰ جہاد آپ ہی کا جاری کردہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خان، مولانا احمد اللہ شہید اور حضرت محل کو جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں اہم مشورے، جنگی تیاریوں، مقابلے کی صورتوں اور اپنی خامیوں کو پورا کرنے کے بارے میں تجویزیں پیش کرتے رہے۔ علماء کا جو بورڈ تشکیل دیا گیا تھا اُس میں آپ بھی شامل تھے۔ لکھنؤ سے دہلی آتے ہوئے رستے میں شہروں اور دیہات میں انگریزوں کے خلاف

جہاد کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے آئے تھے۔ اگر قانون کے ذریعے عدالت ان میں سے کسی امر کو بھی گواہوں کے ذریعے ثابت نہ کر سکی تو نہ سہی لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدل گئی تھی۔ اس حق پسندی اور صداقت کی داد کہاں تک دی جائے کہ قانون کو لا جواب کر دینے کے باوجود، بری ہونے کے نزدیک پہنچ کر خود اعلان کرتے ہیں کہ فتویٰ میرا تھا، علماً نے میرے کہنے سے اس کی تصدیق و تائید کی تھی۔ اس اقرار کا نتیجہ صاف ظاہر تھا لیکن علامہ نے ثابت کر دکھایا کہ میں نے قانون کے شکنجے کو توڑ دیا ہے لیکن جس کام کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر کیا ہے، آج اس کا اظہار نہ کر کے، خدا کے اس انعام اور اپنے شرعی فریضے کی ادائیگی کا انکار کر کے عظیم انہودی سعادت سے خود کو محروم کیوں قرار دوں؟ علامہ کے اس تاریخی فیصلے نے اُنہیں اہل بعزیت کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب موصوف

کہتے ہیں :

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رو کر دیے۔ پھر پٹا کھایا اور کہا، جس مُخبر نے فتویٰ کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں توثیق و تصدیق کرتا ہوں، میرا ہی لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورہ سے علماً نے دستخط کیے۔ پہلے اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے مراد ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور میں جانا ہے غلط بات مذہب کے مسئلہ میں نہیں بول سکتا۔ آج اس بیان سے حیران ہو گیا گٹری گٹری مولانا کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ رنگ دوسرا ہو چکا تھا۔ جج کو رعایت کی (اقبالِ جرم کی قانونی صورت میں) کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ بعد بیچ و غم جس دورانِ حکم سنایا۔ مولانا نے بڑی مسرت سے حکم کو منظور کیا۔۔۔۔۔ آخر جس مولانا اندمان روانہ ہو گئے۔“ لے

مولانا کی اس عزیمت کی قدر اہل کمال ہی کر سکتے ہیں۔ قانونی طور پر رہائی یقینی ہو چکی ہے۔

لے انتظام اللہ شہابی، مفتی، مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، ص ۳۹

جس جرأت و استقلال سے فتویٰ جاری کیا، اسی عزم و استقامت سے تمام قانونی شکنجوں کو توڑ کر، وکیل سرکار کو لا جواب کر کے خود اقرار کرتے ہیں۔ اس اقرار کے نتائج سامنے ہیں، قانونی سزا معلوم ہے مگر دنیا کی زندگی میں ہر تکلیف اٹھانے اور ہر سختی سے سخت سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اگرچہ دنیاوی راحتیں جو اب بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ قانونی رہائی کے پس پردہ علامہ کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں، آپ کی قدم بوسی کا منظر تھیں لیکن آفرین ہے اس جرأتِ زندان پر کہ ایسی رہائی اور دنیاوی تمام راحتوں کو پانے استحقاق سے ٹھکر کر اپنے عظیم کارنامے فتویٰ جہاد کا، جو حریت پسندوں کے لیے صورِ اسرافیل اور فرنگی اقدار پر صاعقہ تھا، خود اقرار کر لیتے ہیں اور ہر دنیاوی سختی کو خذہ پشیمانی کے ساتھ سینے کھیلے از خود تیار ہو جاتے ہیں۔ قافلہ سالارِ عشق سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صبر و استقامت کی اس آخری زمانے میں جھلک دکھا دینے والے اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہ کی جرأتِ زندان کی یاد پھر تازہ کر دکھانے والے اس خیر آبادی مردِ قلند کو باری تعالیٰ اپنی خاص نعمتوں سے نوازے، اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے۔ آمین یا اللہ العالمین

خیر و ذکر سکا مجھے جہلہ دانش فرنگ

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خلکِ دینہ و بخت

جب علامہ کو بصورتِ دیریا سے شہد کی سزا دی گئی، جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تو اس شہانہ زندگی گزارنے والے، ناز و نعم میں پلنے اور پروان چڑھنے والے، کو دولتِ جس کی لونڈی، باعقی اور پالکی کی سواری تھی، دیاروں اور سکادوں میں راہ و رسم تھی، اُس علامہ سے انڈمان میں کیا کام لیا جاتا تھا؟ یہ مفتی صاحب مذکور سے پوچھیے:

”مولانا کو انڈیمان میں خدمت بہت ذلیل سپرد کی گئی تھی، بارہوں کی صفائی بچا کرتے تھے“

لہ انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، ص ۱۴

مولانا فیض احمد بدایونی بھی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصہ لینے والے علمائے کرام میں سے ایک ہیں۔ موصوف کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں:

”مولانا فیض احمد، مولوی عبدالقادر (بدایونی بن مولانا فضل رسول) کے چھوٹی زاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ مولانا فیض احمد نے جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔“

مولانا فیض احمد بدایونی کے متعلق دوسری جگہ موصوف نے یوں تفصیلی وضاحت کی ہے:

”مولانا فیض احمد بدایونی جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہدین میں ہیں۔“

مولوی رحمت اللہ کیرالوی اور پادری فنڈر کے درمیان جو مناظرہ ۱۰ اپریل

۱۸۵۴ء کو آگرہ میں ہوا، اس میں بھی مولانا فیض احمد بدایونی کی سرگرمیوں

کو دخل تھا۔ مولانا اس زمانہ میں وہاں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار تھے

..... جب جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو ڈاکٹر وزیر خاں کے ہمراہ سیدھے

دہلی پہنچے اور بادشاہِ دہلی کی طرف سے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز رہے۔

ستوڑ دہلی کے بعد روہیل گنڈ کا رخ کیا۔ بدایوں (گکراہ) اور بریلی وغیرہ

میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اودھ کی طرف نکل گئے اور پتہ

نہیں چلا کہ کہاں گئے اور کیا حشر ہوا۔“

مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی جو اہلسنت و جماعت کے جید عالمِ دین اور سچے

عاشقِ رسول تھے، انہوں نے بھی، ۱۸۵۷ء میں پوری سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ

حصہ لیا تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں آپ گرفتار ہوئے، سزائے موت کا حکم ملا اور پھانسی

دی گئی۔ پروفیسر موصوف نے آپ کے کارناموں کا یوں اعتراف کیا ہے:

”مولانا کفایت علی نام، کافی تخلص تھا، مراد آباد کے رہنے والے تھے۔“

لے محمد ایوب قادری : تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

کے ایضاً : ص ۳۸۶

تحصیل علم بدایوں، رامپور اور لکھنؤ میں کی۔ مفتی ظہور اللہ لکھنؤی کے شاگرد تھے۔  
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ مراد آباد کے صدر الشریعہ  
بنائے گئے۔ مراد آباد پر جب انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مئی ۱۸۵۸ء میں  
ان کو پھانسی دی گئی۔ قبر عقب جیل ہنوز موجود ہے۔ ہمیشہ نعت لکھتے تھے۔  
شرح شامل ترمذی کا نظم میں ترجمہ کیا۔ مولانا کفایت علی کافی کے ہاتھ کا تحریر کردہ  
شامل ترمذی کا پہلا مستودہ خاکسار مترجم کے پاس محفوظ ہے۔

مفتی صدر الدین خاں آزرہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۷۰ء) دہلی میں صدر الصدوری  
کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں فتاویٰ جہاد کی تصدیق و تائید کی اور آپ کی وجہ سے  
اُس فتوے کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔ جب حریت پسند ناکام رہے اور فرنگی دوبارہ  
غالب آئے تو اُنھوں نے موصوف کے ساتھ جو سلوک کیا، ملاحظہ ہو:

۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانہ میں فتویٰ جہاد کے اتہام میں منصب  
اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ ان سے چھین لی گئی۔ چند مہینے نظر بند بھی رہے۔  
تحقیقات کے بعد باہر ہوتے۔ جائداد غیر منقولہ واپس مل گئی اور جائداد منقولہ  
جو نیلام ہو چکی تھی نہ ملی۔

مفتی صاحب موصوف کے بارے میں یہی پروفیسر محمد ایوب قادری آگے یوں وضاحت  
فرماتے ہیں:

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیے۔ اُس کی وجہ سے گرفتار  
عزلِ منصب اور ضبطی جائداد کی نہت پینچی۔ چند ماہ کے بعد رہائی ہوئی۔ نصف  
جائداد و اگزاشت ہوئی۔ . . . . تین لاکھ روپے کی مالیت کا کتب خانہ  
۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گیا، اُس کے حصول کے لیے لارڈ لارنس کے پاس

لے محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۲۳، ۲۲۴  
کے ایضاً: ص ۲۲۷

لاہور پہنچے، مگر کچھ حاصل نہ ہوا، لے

مفتی عنایت احمد کاکوروی (المتوفی ۹، ۱۲، ۱۳۱۸ھ / ۱۸۶۳ء) بھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مردانہ وار لڑے، فتویٰ جہاد کی تشہیر کی اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف خوب اُبھارتے رہے۔ کالے پانی کی سزا ملی اور جزیرہ انڈمان بھیجے گئے مفتی صاحب کے بارے میں قادری صاحب نے ضمناً لکھا ہے:

”مفتی لطف اللہ ولد شیخ اسد اللہ... پندرہ برس کی عمر کے بعد مفتی

عنایت احمد کاکوروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مفتی صاحب (مفتی عنایت احمد

کاکوروی) اُس زمانہ میں مفتی و منصف تھے۔ عہدہ افتاء کے ساتھ مفتی

عنایت احمد صاحب سلسلہ درس و تدریس بھی جاری رکھتے تھے۔ جب مفتی

عنایت احمد صاحب کا تبادلہ بحیثیت صدر امین علی گڑھ سے بریلی ہوا تو

مولوی لطف اللہ صاحب بھی مفتی صاحب کے ہمراہ پہنچے۔ وہاں جدت کتب دہلیہ

کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ بعد فراغ مفتی صاحب نے اپنے ہی اجلاس کا

سررشتہ دار مقرر کر لیا۔ اُسی زمانہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔

..... جب مفتی عنایت احمد انڈمان سے واپس آتے تو مدرسہ فیض عام

کان پور میں اُنھوں نے مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس دوم رکھ لیا، پھر

مدرس اول ہو گئے۔“ لے

مفتی عنایت احمد کاکوروی علیہ الرحمہ، بریلی میں خان بہادر خاں کے مشیر اور جنرل

سخت خاں کے ہمراہ رہے تھے۔ مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو جہاد کمیٹی بنائی تھی آپ بھی

اُن حضرات میں شامل تھے۔ لیجوروریاتے شور کی سزا ملی اور جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تھے لیکن

۱۲۶۶ھ / ۱۸۶۱ء میں وہاں سے رہا کر دیے گئے اور واپس گھر آ پہنچے۔ جب آپ حج بیت

لے محمد ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۴۸

لے ایضاً: ص ۲۵۱

اور زیارتِ روضہ مطہرہ کی غرض سے جا رہے تھے تو جہ کے قریب اُن کا جہاز کسی چٹان سے ٹکرایا اور نماز پڑھتے ہوئے، ۲۷ ستمبر ۱۸۶۹ء / ۱۷ اپریل ۱۸۶۳ء کو ماہکِ حقیقی سے جا ملے۔  
 اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا رسول بخش کا کوروی شروع میں نواب واجد علی شاہ والی اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر آپ نے کورنی اور اُس کے نواح میں تقریریں کر کے انگریزوں کے خلاف ایک لشکرِ جزا تیار کر لیا تھا۔ اودھ کے فوجیوں کا کافی حصہ آپ کے جھنڈے تلے آکر جمع ہو گیا تھا۔ تیاریاں جب مکمل ہو گئیں اور حملہ کرنے کی تجویزیں کی جا رہی تھیں، تو انگریزوں نے اس عظیم مجاہد کو اُس کے سترہ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا اور شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر ان جلد مجاہدینِ جنگِ آزادی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت عمر کی اڑتالیس منزل طے کر چکے تھے۔ آپ خان بہادر خاں کے نہ صرف مشیر بلکہ سرپرست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں کی ہدایات کے بموجب خان بہادر خاں کبھی مولانا رضا علی خاں کی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ موصوف کا دوسال ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا نقی علی خاں (المتوفی، ۱۲۹۰ھ / ۱۸۸۰ء) ابن مولانا رضا علی خاں بریلوی رحمۃ اللہ

علیہا جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء کے وقت آپ خان بہادر خاں کے دستِ راست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں اور مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو "جہادِ گھنٹی" بنانی تھی اُس میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کوروی اور مولانا رضا علی خاں بریلوی سرپرست تھے۔ مولانا نقی علی خاں بریلوی کی ڈیوٹی مجاہدین کے لیے رسد کا انتظام کرنا تھا۔

مولانا وہاج الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علاقہ مراد آباد میں امیر المجاہدین اور

مولانا کفایت علی کافی رامپوری ان کے دستِ راست تھے۔ مران بزرگوں نے مراد آباد سے انگریزی تسلط کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مولانا وہاج الدین نے جنرل بخت خاں اور صوبیدار بریلی خان بہادر خاں سے مکمل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی معیت میں مراد آباد کے آخری معرکے میں شکست کھائی، روپوشی کی حالت میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

انا لله وانا اليه راجعون۔

ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ارشاد حسین رامپوری، مولانا ہدایت الرسول، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا امام بخش صہبانی، مولانا تراب علی خواجہ، مفتی ریاض الدین، مولانا غلام جیلانی، مولانا کریم اللہ، مولانا غلام احمد شہید، مفتی عبدالوہاب گوپاٹھی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مفتی انعام اللہ خاں، مولانا سرفراز علی شاہمان پوری، مولانا بیاقت علی الہ آبادی، مولانا اعتقاد علی بیگ، مولانا نور الحسن، مولانا رضی الدین بدایونی اور دیگر سیکڑوں علمائے دین نے سرگرم حصہ لیا۔ بعض میدان جنگ میں مارے گئے تو بعض کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ کتنے ہی تھے جو پھانسی پر لٹکائے گئے اور کئی حضرات کو عبور دیا تے شوہر کی سزا دی گئی۔

یہاں ایک حقیقت کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف، ۱۸۵ء کے صفحہ ۲۰۵ پر مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں کو وہابی بتا کر ان حضرات کی رُوحوں کو تڑپانے کی مذموم سعی کی ہے حالانکہ یہ مولانا شہید تو سید قربان علی شاہ جے پوری علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور فرقہ خلافت آپ نے پیر مہراب شاہ قلندر گواپاری رحمۃ اللہ علیہ سے پایا تھا۔ جب علامہ فضل حق خیر آبادی دہلی پہنچے تو جنرل بخت خاں ان سے خود ملنے آئے تھے۔ جنرل بخت خاں کے قلب و دماغ میں اگر وہابیت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو علامہ خیر آبادی جیسے دشمنِ خارجیت و وہابیت سے ملنا کب گوارا کیا جاتا بلکہ دہلی میں وہابی علماء بھی موجود تھے لیکن کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بخت خاں ان کے پاس گئے ہوں یا وہ حضرات خود آئے ہوں اور اپنی حمایت کا یقین دلایا ہو۔ ان سب باتوں پر طرز یہ کہ مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں نے جو علامہ کی "جہاد کھیتی" بنائی تھی اس کے سرخیل علامہ فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء)، مفتی عنایت احمد کاکوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء)، مولانا رضا علی خاں بریلوی (المتوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء) اور مولانا فیض احمد بدایونی (المتوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) تھے۔ اگر حضرات وہابی ہوتے تو جہاد کھیتی کے سربراہ علمائے اہلسنت کیوں بنائے جاتے، کیا وہابی علماء پر مشتمل "جہاد کھیتی" نہ بنائی جاتی، معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہابیوں میں شاید



جھوٹ بولنے کو عیب شمار نہیں کیا جاتا، یا ہو سکتا ہے کہ یہ امکان کذب باری تعالیٰ کے عقیدے کا اثر ہو کہ جب وہ اپنے معبود کو جھوٹا مانتے ہیں تو خود جھوٹ سے کیوں پرہیز کریں؟ ہو سکتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر جیسے بھاری بھر کم موزن نے اسی وجہ سے یہ پہاڑ جتنا جھوٹ بولنا کوئی عیب یا تاریخ پر ظلم نہ شمار کیا ہو۔

## ایک تاریخی مغالطے کا حائل

اسی سلسلے میں ایک اور تاریخی مغالطے کا ازالہ بھی از حد ضروری نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض علماء کے بارے میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ بتایا جاتا رہا، انہوں نے خود یہی کہا کہ ہم برٹش گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے مطلقاً حریت پسندوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اگر کسی سے ہو سکا تو خضیا یا اعلانیہ انگریزوں کی نصرت ضرور کی ورنہ خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں نئے سال بعد جب انگریز یہاں سے دوڑ گئے، تو بعض حضرات نے اپنے قلم کا زور اس امر پر صرف کرنا شروع کیا کہ ہمارے وہ علماء تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو بلکہ انگریزوں کے اصلی بھگسانے والے اور ملک کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے والے تھے۔ اسی سلسلے میں ہم ان علماء کے بارے میں دونوں قسم کے بیانات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کو ہمیں اس تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر آسانی سے فیصلہ کر سکیں:

۱۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ۹ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ /  
۱۸۲۹ء میں گنگوہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔

نام شیخ ہدایت احمد ولد پیر بخش ہے۔۔۔۔۔ حضرت حاجی ابراہیم کے مرید

لے پیر بخش نام رکھنا تو تعویذ الایمان، فتاویٰ رشیدیہ اور بشتی زیور حقہ اول وغیرہ کتابوں میں  
مشکر لکھا ہے۔ یہ فقہی مسئلہ تو علما نے دیوبند ہی حل فرما سکتے ہیں کہ داد اجماع کے مشرک ہونے سے  
اولاد کے نسب میں تو کوئی فرق نہ آئے گا۔

ہوئے۔ جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں معرکہ شاملی میں شریک ہوئے۔ جس کے نتیجے میں چھ ماہ قید و بند کے شدید معائب جھیلے۔ دارالعلوم اسلامیہ دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں رہے۔ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔<sup>۱</sup>

مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث یعنی مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء) کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں تحریر فرماتے ہیں:

۲۔ ”مولوی محمد مظہر نانوتوی بن حافظ لطف علی ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے

ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن اپنے والد سے کیا۔ پھر مولانا ملک علی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی (یعنی دہلی کالج میں)۔ علم حدیث شاہ عبدالغنی سے حاصل کیا۔ تحصیل علم کے بعد اجیر کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے آگے کالج تبادلہ ہوا۔ جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیا۔ جہاد شاملی میں شریک ہوئے۔ پیر میں گولی لگی۔ کچھ دنوں بریلی رہے، معافی حاصل نہ ہو سکی۔“<sup>۲</sup>

مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے اس واقعے کو تفصیل سے مولانا حسین احمد فیض آبادی سابق صدر دارالعلوم دیوبند کی تصریح کے مطابق ”نقش حیات“ جلد ثانی کے صفحہ ۲۱ تا ۲۳ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

۳۔ ”جب انقلاب، ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطرافِ دہلی میں چلتی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش و خروش میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ وہ انگریزوں کے افعال مافیہ اور احوالِ حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت شاہ ضامن صاحب قدس سرہ العزیز زیادہ

<sup>۱</sup> محمد ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند ادوارہن ۵۷۰

<sup>۲</sup> ایضاً ص ۵۰۳

پیش پیش تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہمراہ ضرورتے مگر پیش پیش اور اُس قدر جوش میں نہ تھے۔۔۔۔۔ بد قسمتی سے مولانا (شیخ محمد تھانوی) کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔

اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرت نے بلوایا۔۔۔۔۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نا تو توی اور حضرت حافظ صاحب تھانوی کو مہینہ، میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔ چنانچہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم و تصوف اور تشریح کا بہت زیادہ شہرہ تھا۔۔۔۔۔ اُس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی، عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جن کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے، مگر ہتھیار پرانی وضع کے تھے۔ بندوبست توڑے دار تھیں، کار تو می رہا نہیں نہ تھیں، یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تیار ہوئے اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے۔۔۔۔۔ جب پلٹیں توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یحرم فرمایا۔ پلٹیں گھر آئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب جھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی صاحب نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے ان حضرات کی۔۔۔۔۔ ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا، نئے سہارن پور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اُس پر حملہ

کیا جاتے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی مغلوب ہو گئی۔

حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت

حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ لہ

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمت اللہ علیہ کے تذکرے میں اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

۴۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور اُس کے قریب وجوار کے مسلمانوں

نے حضرت حاجی صاحب کو امیر جہاد مقرر کر کے شمالی ضلع مظفرنگر میں

انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا، جس میں حافظ محمد ضامن صاحب شہید

ہوئے۔ اس معرکہ جہاد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی،

مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی اور قاضی عنایت علی تھانوی

وغیرہ حضرات شریک تھے۔ جنگ آزادی کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔

حاجی امداد اللہ نے ۱۲ ص ۱۸۵۹ء میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور اپنی سرگرمیوں

کا مرکز مکہ معظمہ کو بنالیا۔ مکہ معظمہ ہی میں ۱۲ ص ۱۸۵۹ء اور ۱۳ ص ۱۸۹۹ء

میں انتقال ہوا۔

قارئین کرام! مذکورہ الصدر علماء کے بارے میں تصویر کا ایک رنگ پیش کر رہا ہے کہ ان

حضرات نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ بہر حال اس دعوے کو سامنے رکھے

اور اسی تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔

مولوی محمد احسن نانوتوی جو ۱۲ ص ۱۸۴۷ء سے ۱۸۴۷ء سے بنارس

اسی تصویر کا دوسرا رخ کالج میں فارسی کے مدرس اول رہے اور ۱۲ ص ۱۸۴۷ء

لے عزیز الرحمن نٹھوروی، مفتی: تذکرہ پیشانیخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۷۶ تا ۸۰۔

لے محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند گزشتہ، ص ۱۲۳۔

۱۸۵۱ میں تبدیل ہو کر بریلی کالج آگئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت بھی برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ رہے جیسا کہ پروفیسر محمد ایوب قادری تصریح فرماتے ہیں:

۵۔ "۲۲ مئی (۱۸۵۷ء) کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔ نواب بہادر خاں، کمشنر بریلی مسٹر ایگزیکٹو کے بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد تھا، اس سلسلے میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے: "پچھلے صدی کے ... محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خاں بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پوری پوری تائید کی اور (بریلی) کالج سے فلسفہ ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف شرع ہے۔"

موصوف کی اس تقریر نے بریلی کے مسلمانوں میں آگ لگا کر رکھ دی۔ مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف غیظ و غضب کا ایک طوفان اُٹ آیا کیونکہ یہ مسلمانوں کے جذبہ حریت کے لیے کھلا ہوا چیلنج، اُن کی دینی غیرت کو لٹکانا اور تعلیماتِ الہیہ کو بازو پھٹا اطفال بنانا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب لکھتے ہیں:

۶۔ "اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کو تو الٰہی شہر شیخ بدر الدین کی فمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسی تقریر کا ردِ عمل یہ بھی ہوا کہ ۲۵ مئی، ۱۸۵۷ء کو بروز جمعہ نو محلہ کی مسجد میں مولوی رحیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی اور اس موقع رنجت خاں بھی موجود تھے۔ مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا مگر کو تو الٰہی

۱۔ محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار ایول ۱۹۹۷ء، ص ۵۰

نے اپنی حکمتِ عملی سے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا، لے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت بعض علماء و علماءِ دین کا ایک ہنگامی اجلاس ہوتا ہے۔  
جنگِ آزادی کے بارے میں غور کیا گیا۔ گفتگو کیا ہوئی، ملاحظہ فرمائیے:

۷۔ ”تھانہ بھون میں حضرت حاجی امد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ

محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد تقی

نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس

مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہوئے (جنہوں نے ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء

کو بریلی میں تقریر کرتے ہوئے برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو خلافِ شرع

بتایا تھا) مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا:

جب قاضی عنایت علی جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس

میں سے بھی اُس وقت کسی نے اُس کو جہاد سمجھ کر اُس (جنگِ آزادی)

میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتہا کا جذبہ کار فرما ہے، اس لڑائی

کو جہاد کیسے کہا جاسکتا ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری

اور بے بس سامانی کو عدمِ جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔ لے

مولانا اشرف علی تھانوی جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے چھ سال بعد ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں

پیدا ہوئے تھے انہوں نے بھی جب اس جنگِ آزادی کے جملہ حالات و کوائف پر نظر

دورانی تو یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ یہ محض ایک لڑائی تھی، اسے جہاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔

چنانچہ قادری صاحب لکھتے ہیں:

۸۔ ”مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ نیت کا حال

تو خدا ہی جانتا ہے بظاہر تو اُس (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) کو جہاد کا درجہ

لے محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۱

لے ایضاً: ص ۵۲

نہیں دیا جاسکتا ہے

بعض عہدے دیوبند نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو امیر المؤمنین مقرر کر کے اپنے علاقے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ حکومت اس لیے قائم کی گئی تھی کہ انگریزی افکار کا مختلف و متعدد مقالات سے جنازہ نکل گیا تھا۔ اپنے موافقین کو حکومت سے مطلع کر دیا کہ اب تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑے گی کیونکہ حکومت تو آپ ہی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ چنانچہ تھانہ بیہون کے گرد و نواح میں علاقے دیوبند نے حریت پسند کی یلغار سے خود کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ اس حقیقت کو مشہور دیوبندی عالم اور مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کے سوانح نگار مولوی عاشق الہی میرٹھی نے بیان کر کے یوں حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہوا ہے:

۹۔ "اس برائے کی حالت میں جس کو قعدہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔ عام باشندگانِ قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا اُن کا مرتبی و منتظم بادشاہ (برٹش گورنمنٹ) سر سے اٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و مخضات میں بھی کوئی خبر گزرتا رہا، جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزراؤں دشوار ہے گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھایا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لیے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لیے دنیاوی تنظیم حکومت کا بھی بار اپنے سر پر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قصبے چکاویا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو اُن کی درخواست کے موافق اُن کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک

لے محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۴ حاشیہ

قاضی شرع بن کر فیس بھی فرمائے۔ اسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونگی  
راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی خبری کا موقع دیا۔

انگریز کی حکومت اٹھ جانے اور برٹش گورنمنٹ کے اعلان پر عمل کرنے کی غرض سے  
علمائے دیوبند نے جو سیلف گورنمنٹ قائم کر لی تھی اور حریت پسندوں کی یلغار سے خائف  
ہو کر منظم ہوتے تھے کیونکہ حریت پسندانہ انتہا کو عموماً مجبور کرتے یا ٹوٹ لیا کرتے تھے جو  
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر انگریزوں کی حمایت کرتے یا تحریک آزادی میں حریت پسندوں  
کا ہاتھ نہ بٹاتے تھے۔ علمائے دیوبند کا ایک مرتبہ حریت پسندوں سے مقابلہ بھی ہو گیا تھا،  
جس کو بعد والوں نے تو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے لیکن مولوی عاشق الہی میرٹھی یوں  
تصریح کرتے ہیں:

۱۰۔ "ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولانا محمد قاسم نانوتوی اور طبیب عانی) اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوچیوں کے مقابلہ ہو گیا۔ یہ بندوچیاں اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اسی لیے اہل پہاڑ کی طرح پراجا کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جانثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ سے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہونٹا کہ منظر سے تیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہر آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوچیوں کے سامنے ایسے جھے رہے گویا زمیں نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پرفیرس ہوئیں اور حضرت ضامن صاحب زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔"

انگریزوں نے جیب دوبارہ غلبہ پایا تو مخبروں نے مولانا رشید احمد گنگوہی پر برٹش گورنمنٹ کے باغی ہونے اور دیوبندی اصطلاح کے مفسدوں یعنی حریت پسندوں کی معاونت کرنے کی تمت لگادی، جس کا ان کے سوانح نگار نے یوں شکوہ کیا ہے:

عاشق الہی میرٹھی، مولانا رشید، تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۴۲،  
لے ایضاً: ص ۵۰



۱۱۔ شروع ۱۲، ۶ ہجری نبوی / ۱۸۵۹ء دو سال تھا جس میں حضرت امام ربانی

(مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے

باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔

موصوف نے آگے اس الزام تراشی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی فرمائی ہے:

۱۲۔ جب بغاوت و فساد کا قہقہہ فرو ہوا اور ہم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ

غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے

اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ چھوٹی سچی تہمتوں اور منجبری کے پیشے سے سرکاری

خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انہوں نے اپنا رنگ جھپٹا دیا اور ان گوشہ نشین حضرات

(علما تے دیوبند) پر بغاوت کا الزام لگایا اور یہ منجبری کی کہ تھانہ کے فساد میں

اصل الاصول یہی لوگ تھے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۱۲ھ / ۱۹۰۵ء) پر ۱۸۵۴ء میں حکومت کے باغیوں

کا ساتھ دینے یا خود بغاوت کرنے کا جس شخص نے پاک و ہند میں سے الزام لگایا، وہ واحد

شخص قاضی محبوب علی خاں تھے۔ اگرچہ آج ان پر یہی الزام عائد کرنے والے کتنے ہی حضرات

ہیں اور وہ مولانا گنگوہی پر الزام تراشی کر کے ان کے قبیح ہونے کا دم بھرتے اور اس کے باوجود

اپنا شمار موصوف کے عقیدت مندوں میں کرتے ہیں، حالانکہ گنگوہی صاحب کے سوانح نگار

نے لکھا ہے:

۱۳۔ حاکم کے انتظام کا اٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دہلی ہوئی عدالت نکلنے

اور خدا جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا کہ جدھر دیکھو مار پیٹ

اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی بجگ۔ ایسی بلاخیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد

واقع ہوا، جس میں قاضی محبوب علی خاں کی منجبری سے حضرت مولانا رشید احمد

۱۔ عاشق الہی میرٹھی، مولانا، تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۳۷

۲۔ ایضاً: ص ۷۶

گنگوہی) پر مقدمہ قائم ہوا۔<sup>۱۴</sup> جب مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کر لیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلنا شروع ہوا تو عدالتی کارروائی کس مزے کی ہوئی یہ موصوف کے زبردست قبیح و معتقد مفتی عزیز الرحمن تھوروی کی زبانی سنئے :

۱۴۔ حضرت حاجی ادا اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔ آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال راپور تشریف لے گئے لیکن منبر کی خبر سانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارن پور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مفسد چنار ہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے قبیح دکھلا کر فرمایا: ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے، سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل منتقل کیا گیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا، رہا کر دیا گیا۔<sup>۱۵</sup>

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) اینڈ کمپنی نے، ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا اور اپنے گروہ کی زبانی مفسدوں میں شریک رہے تھے یا حکومت کے خیر خواہ رہے؟ اس سوال کے جواب میں خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار، مولانا عاشق الہی میرٹھی نے یوں جواب دیا ہے:

۱۵۔ جیسا کہ آپ حضرات (گنگوہی و نانا توہی صاحبان) اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تا زلیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔<sup>۱۶</sup>

<sup>۱۴</sup> عاشق الہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۴۷

<sup>۱۵</sup> عزیز الرحمن تھوروی، مفتی، تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۷

<sup>۱۶</sup> عاشق الہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۹

مولانا رشید احمد گنگوہی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا، حکومت کا آپسے بھرگورنمنٹ کے وفادار رہے یا ملک و ملت کے اس کا جواب خود گنگوہی صاحب کی زبانی ملاحظہ ہو:

۱۶- میں (گنگوہی صاحب) حقیقت میں سرکارِ کافران بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بچی بیکار نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکارِ مالک ہے، اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے یا نہ

۷ مدعی لاکھ پے بھساری ہے گواہی تیری

قارئین کرام! یہ مندرجہ بالا سولہ بیانات و جہارات علمائے دیوبند کی تصانیف سے ہی پیش خدمت ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان پر اتنا کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ فیصد کرنا تو قارئین حضرات کا کام ہے۔ لیکن بغرض سہولت ہم مذکورہ جہارتوں کا مفاد اور جہاں متضاد باتیں ہیں ان کی مطابقت پیش کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق:

۱- جب گنگوہی صاحب خود اعلان فرما رہے تھے کہ میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار ہوں،

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے وقت بھی وفادار رہا تھا اور انگریزوں کے خلافت کوئی قدم

نہیں اٹھایا تھا، اس کے باوجود بھی جو یہ کہتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں سے بغاوت یا اس

لڑائی کی تھی وہ موصوف پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ آپ کی اس ذاتی تصریح کے بعد

جیسا کہ آخری عبارت سے معلوم ہو رہا ہے، کسی کا دعویٰ کہ گنگوہی صاحب نے ۱۸۵۷ء

کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا خاصا سربے معنی اور خلافت واقعہ ہو کر رہ جاتا ہے یا نہیں؟

۲- گنگوہی صاحب کے اس ذاتی بیان سے پہلی چاروں عبارتیں غلط اور ان کے دعوے

بے بنیاد ثابت ہو کر رہ گئے۔ گنگوہی صاحب کے انکار کے سامنے کسی دوسرے کا

بیان کہاں قابل قبول ہے؟

۳- تذکرۃ الرشید کتاب، جو مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات ہے وہ موصوف

سے عاشق الہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۸۰

کی زندگی میں ہی لکھی گئی، اسی کے خاص متعدد معتقد نے لکھی، جو دیوبندی جماعت کے ایک  
 بید عالم بھی تھے اور یہ کتاب پہلی مرتبہ میرٹھ سے ۱۳۱۳ھ/۱۹۰۵ء میں چھپی۔ کسی دیوبندی  
 عالم نے اس کے مندرجات پر تنقید نہیں کی بلکہ بسو چشم تعلیم کرتے آئے۔ دریں حالات  
 ۱۹۶۱ء میں چھپنے والے تذکرہ علمائے ہند اردو میں اگر تذکرۃ الرشید کی طباعت کے  
 چھپنے سال بعد اپنے اکابر کی حقیقت کو بدل کر پیش کیا جائے، اس طرح کہ رات کو  
 دن اور دن کو رات کہنے اور کھلوانے کی ہم شروع کر دی جائے، اس سے اگرچہ  
 حقیقت نفس الامری تو نہ بدل سکے گی لیکن جس جماعت کا اپنے روزِ اول سے طریقہ و  
 دستور ہی یہی ہو کہ "جنا گئے تو جناد اس، گنگا گئے تو گنگا رام" اگر وہی عمت انگریزوں  
 کے چلے جانے کے بعد اپنے اکابر کی تاریخ میں اول بدل نہ کرے تو آخر دنیا والوں  
 کو منہ کیسے دکائے؟

۴۔ مولانا عاشق الہی میرٹھی جیسے ۱۹۰۵ء میں علی الاعلان لکھ رہے تھے کہ اکابر دیوبند  
 تمام عمر برٹش گورنمنٹ کے خبر خواہ رہے، کسی دیوبندی عالم نے اس خیال کی  
 تردید نہیں کی جیسا کہ عبارت ۵ سے ظاہر ہے۔ دریں حالات ان پر برٹش گورنمنٹ سے  
 لڑنے یا اس کی بدخواہی کا دعویٰ کرنا سراسر الزام ہے یا نہیں؟

۵۔ جب علمائے دیوبند کے نزدیک ۱۹۰۵ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے  
 لڑنے والے باغی اور مفید ہیں جیسا کہ عبارت نمبر ۱ اور نمبر ۱۱ سے ظاہر ہے تو معلوم  
 نہیں کہ جکل کے دیوبندی علماء کیوں اپنے اکابر کی توہین کے مرتکب ہونے لگے کہ  
 ان حضرات کو باغیوں اور مفیدوں کی فہرست میں شامل کرنے پر بضد ہیں۔

۶۔ جب علمائے دیوبند کے نزدیک یہ جنگ آزادی شرعی نقطہ نظر سے جہاد نہ تھا، جیسا کہ  
 عبارت ۵، ۵ا اور ۵ب میں ہے، دیوبندیوں کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی  
 کا بھی یہی فیصلہ ہے جیسا کہ عبارت نمبر ۱ سے ظاہر ہے ان حالات و حقائق کے  
 پیش نظر عبارت نمبر ۴ میں اس لڑائی کو معرکہ جہاد کہنا کس وجہ سے ضروری سمجھا گیا؟  
 ۷۔ اگر علمائے دیوبند نے باغ میں بیٹھے ہوئے انگریزی فوج سے لڑائی کی تھی، تو پ خانہ بھی

چھپا تھا اور شمالی قصبے سے بھی انگریزی فوج کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا، بلکہ بقول مولانا حسین احمد فیض آبادی انگریزی توپ خانے کو کھینچ کر حاجی صاحب کے پاس پہنچانے والے خود گنگوہی صاحب تھے جیسا کہ بھارت نمبر ۲ میں ہے تو بھارت نمبر ۱۴ ملاحظہ فرمائیے کہ یہاں گنگوہی صاحب عدالت کو تسبیح دکھا کر فرما رہے ہیں کہ حضور! ہمارے پاس تو صرف یہ ہتھیار ہے بلکہ آگے تصریح موجود ہے کہ گورنمنٹ کو کوئی ثبوت اس بات کا نہ مل سکا کہ گنگوہی صاحب نے، ۱۸۵۵ء کی جنگ آزادی میں حکومت کے خلاف کوئی حصہ لیا تھا اور اسی وجہ سے مجبور ہو کر رہا کرنے پڑے تھے لیکن پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد آج ان کے معتقدین کہاں سے ثبوت بل گیا کہ موصوف بھی انگریزوں سے معرکہ آراء ہوئے تھے؟

اگر واقعی علمائے دیوبند اور عالیجناب گنگوہی صاحب نے انگریزی فوج سے باغ میں چھپ کر اور قصبہ شمالی میں لڑائی کی ہوتی، بلکہ توپ خانہ تک چھینا ہوتا تو انگریزی عدالت کے پاس سیکڑوں گواہ اس امر کی شہادت دیتے، توپ خانہ جیسی چیز چھین جانے پر بھی حکومت کو ثبوت نہ ملتا ایک ایسی بھارت ہے جو کسی ذی ہوش کی سمجھ میں مشکل ہی آسکتی ہے نیز گنگوہی صاحب پر ہی کیا منحصر اگر علمائے دیوبند نے باغ میں اور شمالی قصبے کے اندر ہی کچھ کیا ہوتا تو، ۱۸۵۵ء میں ہی انگریزوں نے کتنے ہی علمائے دیوبند کو پھانسی دے دی ہوتی لیکن انگریزوں نے تو ۱۸۵۹ء تک ان سے یہ بھی نہ کہا کہ اے ہمارا توپ خانہ چھیننے والو! اے قصبہ شمالی سے ہماری فوج کو بھگا دینے والے روحانی پیشواؤ! ہمارا توپ خانہ واپس کرو اور پھانسی پر لٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آخر ایسا کیوں نہ کہا گیا؟

۹ - ۱۸۵۹ء میں جب بعض حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تو ساری دیوبندی جمعیت میں سے اور پورے پاک دہند کو انگریزی اقتدار سے بزعم خود نجات دینے اور دلانے والوں کے لشکرِ جوار کے ایک راس مجاہد، نام رشید احمد، ساکن قصبہ گنگوہ کو تین سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ وہ بھی از خود نہیں بلکہ قاضی محبوب علی خاں کی مخبری پر گرفتار ہوئے

ورنہ اس تکلف کی بھی حکومت کو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اگر ان حضرات نے اس جنگ میں واقعی انگریزوں کے خلاف کوئی حصہ لیا ہوتا، جس طرح کہ پہلی چاروں عبارتوں میں تاثر دیا گیا ہے تو، ۱۸۵۷ء کے آخر سے ۱۸۵۹ء تک ان حضرات کو مہلت کیوں دی جاتی؟ کیا حکومت اپنے باغیوں کو اتنی مہلت دے سکتی تھی؟

۱۰۔ ان حضرات کو مجاہد بنانے کی عمارت جنگِ شمالی کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس لڑائی کا تذکرہ، پیش کردہ عبارت ۷، ۸، ۹ اور ۱۰ میں موجود ہے۔ پہلی چاروں عبارتوں کا نقطہ نظر عبارت ۷ کے خلاف ہے۔ یہاں علمائے دیوبند کی مذکورہ پانچوں عبارتوں میں تطبیق دینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورتِ حال سامنے آجائے۔

۱۱۔ عبارت ۷، ۸ اور ۹ میں ایک بات مشترک ہے کہ حافظ محمد بن من صاحب جنگِ شمالی میں مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ صرف یہی جانی نسیان ہوا تھا۔ باقی سب خیریت سے۔

۱۲۔ باقی رسیہ تعیین کہ جنگ ۷ میں ہوں ہوئی تھی، عبارت ۷ جو تذکرۃ الرشید کی ہے اس میں تو یہی تصریح کی گئی ہے کہ شمالی کے نزدیک جب یہ حضرات باغ میں چھپے ہوئے تھے اور اس وقت قصداً یا اتفاقاً جو لڑائی ہو گئی یا لڑنا پڑ گیا، اسی کا نام جنگِ شمالی ہے، اور اسی باغ واسطے معرکہ کے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے لیکن مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحبان فرماتے ہیں کہ باغ کی معرکہ آرائی کے بعد یہ دو عانی گروہ قصبہ شمالی میں انگریزی فوج سے بھی جا کر لڑا تھا، وہاں سے انگریزی فوج کو ہجٹا کر اپنا قبضہ بھی جایا تھا اور اس آخری معرکہ میں جو شمالی قبیلے کے اندر ہوا، حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اس کی عطا سے پھر اس کا محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ لیکن ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کا بیان ہی درست ہے کیونکہ مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کے بیانات سے صریحاً بناوٹ کی بو آ رہی ہے۔ اگر غیر جانب داری سے ذرا بھی دماغ پر زور دیا جائے تو معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا

قطعاً مشکل نہیں رہتا۔ مثلاً :

۱۳۔ اگر باغ کی لڑائی کے علاوہ ان حضرات نے شاملی قبضے میں جا کر انگریزی فوج کو بھگایا ہوتا تو غلبہ پانے کے بعد انگریز فوراً ان حضرات کو گولی کا شانہ بنا دیتے یا پھانسی پر لٹکا دیتے کیونکہ اس حالت میں گواہوں کی کمی رہتی نہ ثبوت کی۔ لیکن ان حضرات کے ساتھ حکومت نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ علمائے دیوبند شاملی قبضے میں جا کر ہرگز انگریزوں سے نہیں لڑے بلکہ صرف باغ والی لڑائی کا واقعہ ہی درپیش آیا تھا اور حافظ ضامن صاحب باغ والے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔

۱۴۔ عبارت ۷ میں فیض آبادی صاحب نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ شاملی قبضے کے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہونے لگے۔ لیکن تذکرۃ الرشید کی عبارت ۷ میں باغ والے معرکے کو شاملی کی لڑائی بتایا اور اسی میں حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا لکھا ہے۔ لہذا معلوم ہی ہوتا ہے کہ لڑائی صرف باغ والی ہوئی۔ یہیں حافظ صاحب شہید ہوئے اور اسی کو مولانا حسین احمد صاحب نے شاملی قبضہ تک بغیر کسی ثبوت کے محض اپنے جوشِ عقیدت سے پھیلا دیا، پھر دوسرے حضرات نے اسی فرضی بنیاد پر ہوائی قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

۱۵۔ اس سلسلے میں یہ بات تصفیہ طلب نہ گئی کہ لڑائی تو صرف باغ میں چھپ کر ہوئی تھی لیکن وہ لڑائی کس سے لڑی گئی؟ انگریزی فوج سے یا جریت پسندوں سے؟ عبارت ۷ اور ۸ اشارہ اور عبارت ۷ اور ۸ مزاحمتاً یہ بتا رہی ہیں کہ ان حضرات نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی، جن میں سے تین بیانات قیام پاکستان سے بعد کے ہیں یعنی ۱۹۶۱ء کے اور صرف ایک بیان ایسا ہے جو قیام پاکستان سے شاید پہلے دیا ہو لیکن کانگریس کی ہنوائی اور گاندھی کی پیشوائی کا سہارا لے کر انگریز دشمنی کا اعلان کیا گیا کہ نہ صرف ہم اپنے ہندو بزرگوں اور بھائیوں کے دیرسایہ انگریزوں سے لڑنے کو تیار ہیں بلکہ ہمارے تو اکابر بھی برٹش گورنمنٹ سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ مقصد صرف ہنود کا اعتماد حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں اگر ان حضرات نے انگریزوں سے

لائی کی ہوتی تو کم از کم دس بیس بڑے بڑوں کو ضرور انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا ہوتا لیکن معاملہ برعکس ہے کہ قریباً ڈیڑھ سال بعد صرف ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو پکڑا گیا اور چھ ماہ کے بعد وہ بھی رہا کر دیے گئے کہ ان کی انگریز دشمنی کوئی معمولی سا بھی ثبوت خود حکومت کو نہ مل سکا۔ ان حقائق کے پیش نظر عبارت ت اور ست معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرات برٹش گورنمنٹ کی حمایت میں حریت پسندوں سے لڑے تھے اور حکومت کے باغیوں کا قلع قمع کرنے کی غرض سے باغ میں مچھے ہوئے تھے۔

۱۶۔ ہو سکتا ہے یہاں کوئی صاحب یہ سوال کر دیں کہ اگر علمائے دیوبند حریت پسندوں سے لڑے تھے تو مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کیوں کیا گیا تھا نیز اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی (المتوفی ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۹ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۹ء) کے وارنٹ گرفتاری کیوں جاری ہوئے تھے؛ معلوم تو کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کا قصہ ہی من گھڑت ہے اور اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو شاید ایسا ہوا ہو گا کہ حکومت کے پاس ان حضرات کے خلاف جتنار بیکارڈ تھا جس کی بنا پر وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے تھے، اس سارے ریکارڈ اور وارنٹ گرفتاری کے جملہ حروف علمائے دیوبند کی عظیم روحانی طاقت نے مٹا دیے ہوں گے اور خالی کاغذات کو دیکھ کر حکومت کے کارندے کوئی انتہائی کارروائی کرنے سے عاجز رہ گئے ہوں گے۔ اس شبہ کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ قبلہ حاجی امداد اللہ علیہ تو چھپ چھپا کر مکہ معظمہ کی طرف نکل گئے تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی تو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۹ء تک متحدہ ہندوستان میں ہی رہے اور دارالعلوم دیوبند کے بانی کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے لیکن ان بائیس سالوں میں بھی حکومت کے جاری کردہ وارنٹ گرفتاری مولانا کی روحانیت سے خائف ہو کر ان پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

باقی رہا مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کی گرفتاری والا معاملہ۔ تو اس سلسلے میں گزارش یہی ہے کہ موصوف کو اس بنا پر ہرگز گرفتار نہیں کیا گیا



کہ انہوں نے انگریزوں سے ۱۸۵۷ء میں کوئی لڑائی بھڑائی کی تھی بلکہ انہیں تو تقریباً ڈیڑھ سال بعد محض مجبوروں کی تسکین خاطر کی غرض سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ کسی کے مال جان کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ حالات ایسے موڑ پر آ پہنچے ہیں کہ اب سرکوئی اپنی حفاظت آپ کرے۔ اس اعلان کے پیش نظر تھانہ بمون اور اس کے گرد و فواح میں اپنے انتظامی امور سرانجام دینے کی غرض سے ایک انتظامیہ کمیٹی بنالی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی بنا پر بعض حاسدوں نے انگریزی حکام کے کان بھرے تو انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے پورے علاقے میں سے ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کر لیا گیا اور چار ماہ کے بعد حکومت نے موصوف کو اپنا سچا وفادار تسلیم کر کے صاف بری کر دیا۔ ان جملہ حقائق کو پیش کردہ عبارت ۱۷ میں ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے، اسی عبارت کا یہ آخری جملہ کتنا معنی خیز ہے۔ "اسی قصہ نے مسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مجبوروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔"

۱۷۔ عبارت ۱۷ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں چھپ کر جب ان بانگے جانشانوں نے حریت پسندوں پر فائرنگ کی تھی اس وقت شاید رات تھی جیسا کہ ان الفاظ سے ترشح ہوتا ہے کہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یکدم فریاد کیا، پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جاسنے کس قدر آدمی ہوں، جویہاں بچھے ہوئے ہیں، اگر یہ رات کا وقت نہیں تھا تو یہ صورت رہی ہوگی کہ باغ میں سے چھپ کر ہی فائر کرنے رہے ہوں گے سامنے مقابلے پر نہیں آتے ہوں گے جس سے ان کی تعداد کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جاسکتا۔

۱۸۔ عبارت ۱۷ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ صرف چند حضرات تھے، ہاتھوں میں تلواریں لیے پھر رہے تھے کیونکہ اپنے علاقے کے حاکم بن بیٹھے تھے کہ حریت پسندوں کے کم از کم اپنی حکمرانی کو محفوظ رکھیں۔ حریت پسندوں یعنی اپنی انگریزی سردکار کے باغیوں کو دیکھ کر ان حضرات کے جذبہ جہاں ناری نے جوش مارا اور ان سے بڑھ گئے۔

۱۹۔ جہاں تک ان حضرات کی جوائنڈی و شجاعت کا تعلق ہے تو وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے

بالا تڑھے۔ مولانا عاشق الہی میرٹھی کے یہ الفاظ ترجمانی کے لیے کافی ہیں۔ "بند و قچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جھٹا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اسی لیے اہل پہاڑ کی طرح پراجا کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ سے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہونناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جاتے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بند و قچیوں کے سامنے ایسے جھے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔" اس عبارت کا ایک۔ ایک لفظ ان حضرات اکابر دیوبند کے اقوال و افعال کی ترجمانی کا واقعی پورا پورا حق ادا کر رہا ہے۔ اپنے اکابر کی شجاعت و جوانمردی اور برٹش گورنمنٹ پر جاں نثاری کے جذبے کی اس سے بہتر شاید کوئی بھی دیوبندی عالم الفاظ کے آئینے میں تصویر نہ دکھاسکا ہوگا۔ ہر منصف مزاج ان لفظوں کو دیکھ کر پکارا اٹھتا ہے: کشت لفظوں میں ایسی ہے کہ ہم بھی صا د کرتے ہیں

۲۰۔ عبارت ۲۰ تو بتا رہی ہے کہ ان حضرات کے جھنڈے تلے ہزاروں مجاہد جمع ہو گئے تھے لیکن عبارت ۲۱ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اپنی طرز کے مجاہدوں میں یہی چند فقیر (علمائے دیوبند) تھے۔ بہر حال تعداد کچھ بھی سہی اتنا ضرور ہے کہ حافظ ضامن صاحب کے شہید ہونے سے پہلے ان حضرات نے گورنمنٹ کی مخالفت یا حمایت میں کوئی لڑائی نہیں لڑی اور جس معرکے میں حافظ صاحب شہید ہوئے تھے اس کے بعد باقی مجاہد خواہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے یا کم و بیش، لیکن سب کی شجاعت و جوانمردی کا تلامح نیز طوفان تہم گیا تھا اور صرف ایک آدمی کے شہید ہو جانے کی وجہ سے باقی سب نے خاموشی اختیار کر لی، علامتِ غیر جانبداری اور ہر طرف مشکف ہو بیٹھے تھے۔ اس حقیقت کو مولانا حسین احمد ٹانڈوی صاحب (المتوفی، ۱۳۰۴ھ / ۱۹۵۷ء) نے کیسے حسرت و یاس کے الفاظ میں بیان کر کے ان حضرات کے مجاہدانہ عوام اور شجاعت و دلیری کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ موصوف کا اس طرح آہ سرد بھرنا صورتِ حال کی پوری پوری

غمازی کر رہا ہے۔

۲۱۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ علمائے دیوبند برٹش گورنمنٹ کے سرگز مخالف نہیں تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر جہاں نثار سپاہی بھی بن جاتے تھے کیونکہ یہ پورا بھی انگریزی حکومت کا خود کاشتہ تھا اور اسے اپنی پرورش کے لیے سخت ضرورت تھی کہ حکومت اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر رکھے۔ ۱۸۵۷ء میں اس نوزائیدہ گروہ نے پورا پورا ثبوت اپنی انگریز دوستی کا فراہم کر دیا تھا۔ نہ انہوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے اور نہ ایسا کوئی فتویٰ خود جاری کیا۔ نہ بادشاہ کی حمایت کا کوئی اعلان کیا اور نہ انگریزوں کے خلاف ایک لفظ کسی دیوبندی عالم نے منہ سے نکالا۔ نہ یہ حضرات جنرل بخت خان مولانا احمد اللہ شہید یا کسی بھی دوسرے حریت پسند کی زیرِ کمان انگریزوں سے لڑے اور نہ کسی بھی مرحلے پر ان سے رابطہ قائم کر کے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جو حضرات گاندھی کو پیشوا مان بیٹھے انہوں نے توڑنگے جھنڈے کے زیر سایہ ہندوؤں کی ہمنوائی میں انگریزوں کے خلاف ضرور لب کثافی شروع کی باقی جملہ علمائے دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو ہمیشہ غدر کہا، حریت پسندوں کو باغی اور مفسد ہی ٹھہراتے رہے۔ یہ وہ امور ہیں جو تاریخ سے ثابت ہیں، کوئی دیوبندی عالم اس کے برعکس آج تک ثابت نہیں کر سکا ہے، اگرچہ پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب بعض اوقات اکابر دیوبند کو محض تجاہل عارفانہ کے بطور اور علمائے دیوبند کو خوش کرنے کی غرض سے مجاہدینِ جنگِ آزادی لکھ دیا کرتے ہیں ویسے حقیقت میں ان کے نزدیک بھی علمائے دیوبند وہی کچھ ہیں جو کچھ وہ حضرات تھے اور جو کچھ ۱۸۵۷ء سے پہلے خرد ان کے متعلق کہا جاتا رہا۔ باری تعالیٰ شانہ کی حکمت زالی ہے۔ جس محمد ایوب قادری صاحب کے بل بوتے پر آج علمائے دیوبند اپنے اکابر کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہد منوانے کی مہم چلا رہے ہیں۔ ان موصوف کے قلم سے ہی قدرت نے وہ الفاظ لکھوا دیے جن کے آئینے میں علمائے دیوبند کی حقیقی تصویر نظر آرہی ہے اور کم از کم احقر یہ کہہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف کی اس عبارت کا برجہ معنی نیز اور حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ گزشتہ صفحات

میں اگرچہ عبارت نمبر ۱ کے تحت موصوف کے وہ بیانات پیش کیے جا چکے ہیں لیکن ہماری نظر میں بھی چونکہ علمائے دیوبند کی پوزیشن ہی کچھ ایسی ہے جو محمد ایوب قادری صاحب نے اس عبارت میں پیش کی ہے۔ لہذا اس عبارت کے آخر میں فیصلہ کن بیان کے طور پر پھر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

انتھارہ جون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد نسامی، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد تاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں مولانا محمد حسن بھی شریک ہوئے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا: جب قاضی عنایت علی، جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اُس وقت کسی نے اُس کو جہاد سمجھ کر اُس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جاسکتا ہے؛ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کزداری اور بے سرو سامانی کو عدم جہاد کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت چُپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے  
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

**ضروری وضاحت** بعض حضرات یہاں یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ مجدد مائتہ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرتے ہوئے

انگریزوں کا ذکر کس غرض سے کیا گیا اور اس کا یہاں کیا جوڑ تھا؛ احتقر یہ گزارش کرے گا کہ تجدید کی ضرورت تخریب کے وقت پیش آتی ہے۔ انگریز نے جس عیاری اور فن کاری سے پاک و ہند پر قبضہ جایا، اسی طرح مقدس اسلام کو مٹانے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ چونکہ دین میں تخریب کاری انگریزوں نے براہ راست نہیں کی بلکہ اپنے زر خرید علماء سے

۱۔ محمد ایوب قادری، مولانا محمد حسن نانوتوی، ص ۵۴

یہ خدمت لی تھی، لہذا اس راز کو سمجھنے کے لیے انگریزوں کے ان کاناموں کا مجملہ انظر  
 نقد و رمی سمجھایا جن سے انگریزوں کی ذہنیت کا اندازہ ہو سکے۔ چونکہ اگلے ابواب میں تخریب کار  
 علماء کا بیان ہے بایں وجہ پہلے انگریزوں کی فطرت پر قلم اٹھانا پڑا۔ یعنی : ۵  
 حافظ بخودز پوشیدہ این جاڑے آلود  
 اسے شیخ پاک دامن ! معذور وار مارا

# باب دوم

## ارمغانِ عجایب

سودِ رفتہ باز آید کہ ناید؛  
 نیسے از حجاز آید کہ ناید؛  
 سر آمد روزگارِ این فقیرے،  
 وگر دانائے راز آید کہ ناید؛  
 (علاء اقبال)

## حکومت نے مسلمانوں کو اسلام سے کیوں بے بہرہ کیا؟

۵ دل کے پھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے  
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایسٹ انڈیا کمپنی کا غلبہ جب روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور بڑے صغیر پاک و ہند میں اُس کے مقبوضات کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں اور پورے ملک پر غلامی کے بادل منڈلا رہے تھے، اُس وقت بھی ویسی ریاستوں کے درمیان ڈپلومیسی کا جال پھیلانے والے انگریز، اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے کہ اس ملک میں وہ قوم بھی آباد ہے جس نے قیصر و کسریٰ کی عظمتوں کو حوتِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا تھا، جس کے منٹھی بھر جانوں نے صلیبی جنگوں میں نہ صرف یورپ کو شکست دی تھی بلکہ قبیلہ ازل کو تہلیلت پرستوں کے چنگل سے بچانے کی خاطر یورپی دنیائے عیسائیت کی مجموعی طاقت و قوت کو کچل کر بیت المقدس کے نزدیک دفن کر دیا تھا، جس کے راستے میں پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندروں کی گہرائیاں بھی حائل نہ ہو سکی تھیں، جو قوم افغانستان کی طرف سے چل کر متعدد بار پاک و ہند کو نہ صرف تہہ و بالا کرتی اور روندتی رہی تھی بلکہ صدیوں تک انتہائی جاہ و جلال کے ساتھ پورے ملک پر حکمران رہی ہے۔ یہ تاریخی حقائق اُنہیں زُتار داروں کی طرف سے تو مطمئن کر دیتے تھے لیکن مسلمانوں کی جو انہری، جہان بینی اور قوتِ ایمانی کا تصور ان کی نیندیں حرام کر دیا کرتا تھا۔ انگریزوں نے بخرنی اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی جو انہری اور جہان بینی حقیقت میں ان کی ایمانی قوت کے ثمرات ہیں، اگر اس گنج گراں مایہ اور سرمایہٴ حیات کو ان کے دلوں سے کسی طرح خارج کر دیا جائے تو مسلمانوں اور دیگر اقوام میں کوئی ایسا امتیاز باقی نہ رہے گا جو دیگر اقوام و ممالک کو ان کے سامنے بھگنے پر مجبور کر دیتا ہے اور جس کی بدولت قوموں اور ملکوں کی تقدیریں ان کی نوکِ شمشیر سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کی غرضت پہلے تو پاک و ہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کا وسیع پیمانے پر جال بچھایا گیا۔ اس



میدان میں جب ناکامی کا سامنا ہوا تو مسلمانانِ پاک و ہند کی آئندہ نسلوں کو اسلامی تعلیمات سے محروم رکھنے اور ان کی جمعیت و قوت کو منتشر و پریشان کرنے کی غرض سے فرقہ بازی کا بیج بونے کی ٹھان لی۔ یہ تخریبی منصوبہ عیسائی بنانے والے منصوبے سے بھی بدتر، دُور رس نتائج کا حامل و ضرر رساں تھا، کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس تخریب کو تعمیر، بگاڑ کو بناؤ، دشمنی کو دوستی، پینے کسی کو رواداری، فساد کو اصلاح اور مداخلت فی الدین کو عدم مداخلت سمجھتے آئے ہیں اور انگریزوں کے اس تخریبی منصوبے پر کار بند ہو کر مسلمانانِ پاک و ہند اپنے ملی خصائص اور قربِ ایمانی کو مٹانے میں ایک آٹویٹک مشین کی طرح آج تک سرگرم عمل چلے آ رہے ہیں۔

اس منصوبے کے تحت حکومت نے اپنے جاری کردہ اسکولوں اور کالجوں سے دینی تعلیمات کو خارج از نصاب کر کے رحمت کا ذاتی معاملہ قرار دے دیا۔ ملازمین انگریزی اسکولوں کی تعلیم پر منحصر ہو کر نہ گئیں تو نتیجہ ظاہر ہے کہ دینی مدارس ویران ہونے لگے۔ اشک ثوئی کیلئے اسکولوں میں برائے نام دینیات کو شامل رکھا، جس میں چند بزرگوں کی کہانیاں پڑھائی جاتی تھیں یا ان اینگلو انڈین علماء کے فضائل و مناقب ذہن نشین کر دئے جاتے جو برٹش گورنمنٹ کے اس تخریبی منصوبے کو بڑی ہوشیاری، رازداری اور کمال شک و حلاکت پر وہان چڑھا رہے تھے۔ رہبرتی کے پردے میں قوم کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے، لیکن جن حضرات نے طقتِ اسلامیہ کی پاک و ہند میں حقیقی خدمات انجام دیں ان مجاہدوں، بادشاہوں، شہیدوں اور رہنماؤں کو زینتِ ظاہری نہیں بلکہ بنیاد یا ایگلو انڈین سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کی اکثریت کا یہی عالم ہونا تھا اور آج بھی ہے کہ حقیقی اسلام سے بڑی حد تک نا آشنا، شننے نئے اسلاموں کے ماننے والے، اینگلو انڈین ملتا کے معتقد اور مغربی تہذیب کے دلدادہ۔ ابن بظاہر پڑھے لکھے مسلمانوں کی حقیقی حالتِ ذار پر، اسلامی عینک سے دیکھنے والی آنکھیں یوں اشکبار ہوتی ہیں:۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا  
انسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوچھی

اسلامی تعلیمات سے بلے بہرہ ہو جانے کے باعث، جب ایمان جیسی متاعِ عزیز

کئی شروع ہو گئی۔ جس ایمان کو بچانے کی خاطر یہی مسلمان سب کچھ ٹٹا دیا کرتے تھے۔ وہ ایسے مسور ہوئے کہ چند روزہ زندگی کے راحت و آرام کے بدلے ایمان جیسی دولت کٹانی شروع کر دی۔ دوسری طرف دین اسلام میں خود علمائے دین کے ہاتھوں وہ سہل سہراچی اور اصلاح کے نام پر شریعت مطہرہ میں اس طرح ترمیم و اضافہ کروایا گیا کہ اپنی طرف سے ان سرکاری علمائے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ الغرض کتاب اسلام کے مختلف ماڈرن ایڈیشن ایسی آج و تاب اور منظر فریب دکھائی دے رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسلام ان برطانوی اسلاموں کے زرخیز میں گھر گیا۔ نئے نئے اور چمکیے اسلاموں کی ظاہری پیک و مک نے ناواقفوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تو اصل دین کی اصلیت ان کی نگاہوں میں شکوک ہو کر رہ گئی جب عوام کی نظروں سے اصل اور نقل، حقیقی اور جعلی کا فرق اوجھل ہونا شروع ہوا تو ہر کوئی اپنی پسند کا اسلام چن کر اس کا پیروکار بننا شروع ہو گیا۔ یوں مسلمانوں کی جمعیت پریشان ہو گئی، وہ فرقوں میں بٹ گئے اور انگریزوں کا مقصد، جسے وہ حاصل کرنے سے عاجز تھے، بعض صاحبان جتہ و دستار کی بدولت پورا ہو گیا۔

ایسا کہ گورنمنٹ نے سے برٹش گورنمنٹ کی بڑا ہڈی طرح پر آئی، اولاً، جماعتوں اور فرقوں میں مسلمانوں کو اس طرح بات و دیا اور اختلافات کی تلخ اتنی وسیع کرادی کہ یہ سوال ہی میٹ گیا کہ کبھی متحد ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر حکومت کے لیے وہ سرکار باعزت ہو سکتے ہیں یا انگریزی اقتدار کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ثانیاً: اسلامی تعلیمات سے ایک کثیر تعداد کو نابالہ رکھ کر اور جعلی اسلاموں کا پیروکار بنا کر بھی حکومت نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا کیونکہ اسلام کے حقیقی فیوض و بركات سے بڑی حد تک مسلمانانِ پاک و ہند خود کو محروم کر چکے تھے۔ ایمانی قوت کمزور ہو گئی، شوقِ جہاد اور جو شوشِ عمل کا رخ حکومت کی وفاداری کی طرف پھر گیا۔ ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اگر انھوں نے بہادری بھی دکھائی تو یہی برٹش گورنمنٹ کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرتے رہے یا ہندوؤں کے معاون بن کر ان کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑی جو امری بس انہی

دلہائی جاسکی کہ اسلام کا نام لے کر غریب مسلمانوں کے دوٹوں سے پاکستان بنایا لیکن جس قسم کی اسلام ورزی انگریز سکھائے تھے اُس نے اپنا پورا زندگی دکھایا کہ چوتھائی صدی گزر گئی لیکن کوئی حکومت پاکستان میں اسلامی قانون رائج کرنے کی جرأت نہ کر سکی بلکہ پورا زور متواتر اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ حقیقی اسلام کو مجبوس رکھا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ غریب انگریزوں سے جو کمی رہ گئی تھی اُسے اب مسلمان خود پورا کر رہے ہیں۔ اس بے راہ روی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ عذاب الہی سبوں پر مستط ہے لیکن کیا مجال کہ ہمارے دائرہ اور اصحاب اقتدار قوم کو اس غلط روش سے ہٹانے کی ضرورت بھی محسوس کریں۔ باری تعالیٰ شانہ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل ہمیں راہ راست پر چلائے اور ہماری غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین۔

اس باب میں چونکہ فرقہ بازی کے بارے میں تاریخی طور پر کچھ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ انگریزوں کی دور رس نگاہوں نے دہلی کے نابینا زعلی وہینی گھرانے کے بیک منچلے، جوشیلے اور نوجوان عالم دین کوتاڑ لیا، یعنی مولوی محمد اسلم لیل دہلوی (ف ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کو اور پاک و ہند کی سرزمین میں فرقہ سازی کا سنگ بنیاد موصوف سے رکھ لیا گیا۔ فرقہ بازی کے پاک و ہند میں جو فلک بوس محل نظر آ رہے ہیں ان کی بنیاد رکھنے کا سہرا ان موصوف ہی کے سر ہے۔ آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۶۹ھ / ۱۸۶۲ء) کے پوتے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۲۳ھ / ۱۸۱۶ء) رحمۃ اللہ علیہم کے بھتیجے اور شاہ عبدالعزیز بنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند تھے۔ منچلے نے خوب گل کھلایا، علمی میدان میں بازی ہار گئے تو انگریزوں کے کتے پر سکوں کا نام لے کر سرحد کے مسلمانوں کے خون سے ہولی جا کھیلے، انھیں طعونین اشرار، کلاب النار اور محل الدم ٹھہراتے رہے۔ ان کے ننگ و ناموس پر دست درازی کرتے رہے۔ پٹانوں نے آخر کار مجبور ہو کر میزبانی سے ہاتھ اٹھایا اور اس جمعیت کے اکثر افراد کو ان کے اصلی مقام پر پہنچایا۔ ایک ہی رات کے اندر جتنے ہاتھ آسکے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جو باقی رہے

انہیں سکھوں نے آدھوچا اور جو چند اشخاص بھاگ سکے ان کے علاوہ سب کو بالاکوٹ کے مقام پر ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۳۱ء کو ذبح کر کے اس المناک ڈرامے کا پہلا پارٹ ختم کر دیا۔

تیسری صدی میں خارجیت نے نجد کی سرزمین سے سراٹھایا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) اس بلاسٹے ناگہانی کے ٹھیکدار بنے تھے۔ جب وہا بیت کے فتنے کو اس زمین مقدس میں قدم جانے کی جگہ مل گئی تو اسی گمراہی کو وہی پہنچا یا گیا مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اس مشن کو دل و جان سے قبول کر لیا اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہنے لگے۔ چونکہ حقیقت میں یہ وہی خارجی فرقہ ہے جس کی خبر مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے ہی دی تھی کہ قیامت تک یہ فرقہ مختلف ناموں سے ظاہر ہوتا رہے گا اور اس کا آخری گروہ دجال کے ساتھ ہوگا۔ لہذا موصوف کی کارگزاری پر گفتگو کرنے سے پہلے، جن جن رنگوں میں نواج آج تک نمایاں طور پر ظاہر ہوتے رہے ہیں، ان کے بارے میں اختصار سے کچھ تاریخی طور پر عرض کر دیا جائے تاکہ ایک منصف مزاج کے لیے صورت حال کو سمجھنے میں کوئی دقت یا سچپیڈگی باقی نہ رہ جائے۔

انگریزی دور سے چونکہ یہ دو خاندانی جاری رہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نیا ہی مکتبہ فکر گھڑا ہوا ہے اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی چونکہ حضرت شاہ صاحب دہلوی کے پوتے ہیں لہذا انہیں ولی اللہی مکتبہ فکر کا ایک عظیم علمبردار ٹھہرا دیا جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں دعوتے محض گھڑنت اور فرضی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا کوئی اپنا مکتبہ فکر نہیں بلکہ وہ سستی حنفی عالم دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ شاہ صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے دینی عقائد میں بعد المشرقین ہے کیونکہ مولانا نے نہ صرف وہا بیت قبول کی تھی بلکہ سرزمینِ پاک و ہند میں وہا بیت کا سنگ بنیاد رکھنے والے اور اس کے بانی آپ اور صرف آپ ہیں۔ موصوف کا اپنے خاندان سے دینی و مذہبی انقطاع بھی اسی طرح ہے جس طرح نجد کے بانی وہا بیت کا دینی سلسلہ اپنے خاندان سے حتیٰ کہ اپنے والد ماجد مولانا عبدالوہاب (المتوفی ۱۱۵۳ھ / ۱۷۶۰ء) سے نہیں ملتا۔ کیا محض حسب و نسب کے سامنے رکھ کر کنعان کا دینی و مذہبی رشتہ لوح علیہ السلام سے جوڑا جاسکتا ہے؟ ہرگز

نہیں۔ تحقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ/۱۸۲۱ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کا مذہب اختیار کیا تھا، محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء) نے ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے ابو یعلیٰ وغیرہ سلفی حضرات کا مذہب قبول کیا تھا اور ابو یعلیٰ قاضی وغیرہ نے مسلک خوارج کو اپنا دین ٹھہرایا تھا۔

## خوارج

ابراہیم الحروف اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آخری رسول، نبی الانبیاء، فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوارج کے بارے میں مسلمانوں کو کیا ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ناچیز سب سے زیادہ اپنے آقا و مولیٰ، سرور کون و مکان شفیع انس و جان، نبی مختار، حبیب پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا محتاج ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کے بارے میں پیار سے نبی کے چند پیارے پیارے کلمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید کوئی خوش نصیب یہ سوچ سکے کہ جس نبی کا کلمہ پڑھے اور جس کے اُمتی ہونے کا دم بھرتے ہیں، جب خود اُس آقا کی نگاہوں میں یہ جماعتیں ایسی ہیں تو بعض علماء کے جُتے دستار پر کیوں جائیں، بہتر یہی ہے کہ آقائے دو جہاں کے قدموں سے لگ جائیں۔ اگر ایک بھی خوش نصیب رہو، ہاں بہت پر آگیا تو الحمد للہ، احقر کی منت ٹھکانے لگی۔ اب پیارے مصطفیٰ کے پیارے ایہ شہادت کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے کہ پیشگوئی کس پر صادق آتی ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ	سنا میں (ابو بردہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے
تعالیٰ علیہ وسلم باذن و	اپنے کانوں سے اور دیکھا میں نے اپنی آنکھوں
سرایتہ بعینی اقی رسول	سے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہار گاہ
اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم	میں کچھ مال حاضر کیا گیا، آپ نے تقسیم فرمایا۔
مال فقیہ فاعطی من عن	دائیں اور بائیں طرف والوں کو عطا فرمایا اور
بمینه ومن عن شمالہ وسلم	پچھ والے کو نہ دیا۔ تو پچھ والوں سے ایک

آدمی کھڑا ہو کر کھنکے گا، اسے محمد!

آپ نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا۔ وہ آدمی

سیاہ رنگ اور مُنڈے ہوئے سردالا تھا۔

اُس نے بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سخت

تاراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: خدا

کی قسم، میرے بعد تم مجھ سے زیادہ انصاف

کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔ مزید فرمایا: آخری

زمانے میں ایک قوم نکلے گی، گویا یہ بھی اسی قوم کا

ایک فرد ہے۔ وہ قرآن بہت پڑھیں گے لیکن

قرآن کا اثر اُن کے دلوں کی طرف نہیں جائیگا۔

اسلام سے وہ ایسے نکل جائیں گے

جیسے تیر شکار سے۔ سر نہ اٹانے لوگوں کی

نشانی ہوگی۔ وہ ہر دور میں ظاہر ہوتے

رہیں گے، یہاں تک کہ کائنات کی آخری جماعت

دجال کی ساتھی ہوگی۔ جب تم اُن لوگوں کو

پاؤ تو سچ لینا کہ دو بدترین مخلوق ہیں۔ دنوڈ

بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِهِمْ

يعط من ورائه شئ فقام رجل

من ورائه فقال يا محمد ما عدلت

في القصة رجل اسود مطوم

الشعر وعليه ثوبان ابيضات

فغضب رسول الله صلى الله تعالى

عليه وسلم غضباً شديداً قال

والله لا تجدون بعدى رجلاً

هو اعدل مني ثم قال يخرج

في آخر الزمان قوم كان هذا

منهم يقرؤون القرآن لا تجاوز

تواقيهم يبرقون من اسلام

كما يبرق السهم من الرمية

سياهم التعليق لا يزالون

يخرجون حتى يخرج اخرهم

مع الصير الدجال فاذا

لقيتهم شر الصلح و

الخليقة

رسائل مشكوة، باب قتل الجالوت

آخری زمانے کی جس قوم کا اس حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے اُس کے بارے میں

یہ تو معلوم ہو گیا کہ مدعی اسلام ہونے کے باوجود وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگی اور

سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو بدترین مخلوق قرار دیا تھا۔ اس کے

ساتھ ہی اُس گروہ کی چار نشانیاں بھی بتادی ہیں:

۱۔ وہ شان رسالت میں گستاخانہ کلمات استعمال کیا کریں گے۔

۲- زیادہ تر سرمنڈائیں گے۔

۳- قرآن خوب پڑھیں گے لیکن ان گستاخانِ رسول کے دلوں پر قرآن کا اثر نہیں ہوگا۔

۴- وہ قوم ہر دور میں کافروں کی معیسی و مددگار بن کر رہے گی حتیٰ کہ دجال کا ساتھ بھی ہی لوگ دیں گے۔

قارئین کرام! شانِ رسالت میں گستاخانہ عبارتیں لکھنے والے بالکل ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے نازیبا الفاظ بھی سید الانبیاء علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں جاری کر دیے جن کی کبھی بدترین دشمنوں اور کھلے کافروں کو بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح وہ جماعت یا قوم بھی بالکل ظاہر ہے جو اپنی اور بیت پرستوں کی ایک قوم بناتی اور متحد قومیت کا کیت گاتی رہی ہے۔ کیا اس فرمانِ رسالت کے مطابق کھرے اور کھوٹے کو پہچاننے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ ہرگز نہیں رہتا۔ اب دوسرا ارشادِ گرامی ملاحظہ ہو:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضر تھے اور آپ اُس وقت بال تقسیم فرما رہے تھے اسی اثناء میں ذوالخیرہ آیا جو بنی تمیم سے تھا، اُس نے کہا، اے اللہ کے رسول! انصاف کرو۔ آپ نے فرمایا: کبخت! اگر میں انصاف نہیں کرتا تو اور کبھی انصاف کرے گا؟ تیسرے اس گمان کی وجہ سے کہ میں بھی عدل نہیں کرتا، تو صریح زبانی کار ہو گیا۔ حضرت عمر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اجازت دیکھیے میں اس کی گروں اڑا دوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اسے جانے دو، اس کے ساتھ بہت ہیں

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال بیانا نحن عند رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ویقسم قسماً اتاد ذوالخیرہ وهو رجل من بنی تمیم فقال یا رسول اللہ اعدل فقال ویبک فمن یعدل اذ لم اعدل قد خبت وخسرت ان لم اکن اعدل فقال عمرو ائذن لی اضرب عنقه فقال دع عفتان لہ اصحابا یحقر احدکم صلاتہ مع صلاتہم وصیامہ مع صیامہم یقرؤن

تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے مقابلے میں حقیر جانو گے۔ یہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ (ادعاۃ اسلام کے باوجود) یہ لوگ دیں سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیرشکار سے نکل جاتا ہے۔

القرآن لا یجاوز تراقیمہ  
یمرقون من الدین  
کما یمرق السم  
من الرمیة۔  
(مشکوٰۃ، باب المعجزات)

یہی واقعہ دوسری روایت میں یوں مذکور ہوا ہے:

ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی، پشانی اٹھی ہوئی، وارسی گھنی، رخسار اونچے اور سر منڈا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا: اے محمد! اللہ سے ڈرو۔ حضور علیہ القلوۃ والسلام نے فرمایا: اگر قبول تمہارے، میں بھی تمہاری نافرمانی کرتا ہوں تو کون ہے جو اس کے احکام کی اطاعت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے اہل زمین پر ایسی بنایا ہے اور تم مجھے ایمن نہیں مانتے۔ ایک مروی ہے اس کو قتل کرنے کی اجازت مانگی لیکن اسے منع کر دیا گیا۔ جب وہ گستاخ واپس لوٹ گیا تو سرکار نے ارشاد فرمایا: اس کی اہل سے ایک قوم ہوگی، وہ لوگ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے زخروں سے نیچے نہ اترے گا۔ جیسے تیرشکار سے نکل جاتا ہے وہ اس طرح اسلام سے نکل جائیں گے۔ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کریں گے۔ اگر میں اس قوم کو

اقبل رجل غاثر العینین وناق  
الجهتہ کث اللحیہ مشرف  
الوجتین مخلوق الراس فقال  
یا محمد اتق اللہ فقال  
لمن یطعم اللہ اذا عصیتمہ  
فیامننی اللہ علی اهل الارض  
ولا تا منونی فسأل رجل قتله  
فمنعہ فلما ولی قال عن من  
فیضی هذا قوم یقرؤن  
القرآن ولا یجاوز  
حنا جزہم یمرقون عن  
الاسلام مروق السم  
من الرمیة فیقتلون اهل  
الاسلام ویدعون  
اهل الاوثان، لسن  
ادریکتہم لاقتلہم  
قتل عاد۔ (ایضاً)



پانا تو انہیں اس طرح بلا کر دیتا جیسے قوم عاد  
کی گئی۔

قارئین کرام! ان دونوں روایتوں میں مذکورہ گستاخ ٹولے کی مزید نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اُمّتِ محمدیہ انہیں پہچان کر خبردار ہو جائے، ان کی باتیں سننا یا ان کے گروہ میں انہیں مسلمان سمجھ کر بل جانا تو دور کی بات ہے، مسلمان ان کے سائے سے بھی بچیں۔ ان کے ظاہری حال اور ادعائے مسلمانی پر نہ جائیں۔ پہلی روایت کے تحت چار نشانیاں خبردار پیش کریں، مزید ملاحظہ ہوں:

۵۔ پابندی اور ادائیگی نماز روزہ وغیرہ عبادات میں یہ اصلی مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر منظر آئیں گے۔

۶۔ مختلف جیلے بہانے تراشیں کہ مسلمانوں کو قتل کرنا ان کی مردانگی ہوگی۔

۷۔ بُت پرستوں سے بگاڑیں گے نہیں بلکہ ان کے یار و مددگار بن کر رہیں گے۔

مسلمانو! اپنے خدا کے پتے نبی نے رحمتِ جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جس گروہ کی یہ سات نشانیاں بیان فرمائی ہیں، کیا ان نشانیوں کے ذریعے آپ اس گروہ کو پہچان نہیں سکیں گے؟ گروہ دورِ حیدری سے شروع ہو گیا تھا۔ ہر دور میں مختلف رنگ بدل کر ظاہر ہوتا رہے گا، پہلے تک کہ اس گروہ کی آخری جماعت و مجال کی معین و مددگار ہوگی۔ کیا اسی جماعت کو آپ نے ماضی قریب میں چھوٹے مجالوں کے ساتھ نہیں دیکھا؟ کیا مسلمانوں کے مفادات پر وہ آج بھی ضرر نہیں لگا رہے؟ کیا اب انہوں نے چھوٹے مجالوں کو مجال مان کر اس روش سے کنارہ کر لیا ہے؟ ایسے اب دیکھیں کہ پارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہِ انور میں اس گروہ کی قدر و قیمت اور شرعی پوشیش کیا ہے:

۱۔ یہ گروہ اسلام سے خارج ہے جیسا کہ تینوں مذکورہ روایتوں میں ہے:

۲۔ یہ بدترین مخلوق ہیں — جیسا کہ پہلی روایت میں ہے۔

۳۔ اللہ کا رسول ان سے سخت ناراض ہے — پہلی روایت

- ۴۔ رسول خدا کے نزدیک یہ گروہ زیاں کار ہے۔۔۔ دوسری روایت
- ۵۔ صحابہ کرام کے نزدیک یہ لوگ قابلِ گردن زدنی ہیں جیسا کہ حضرت عمر کی درخواست سے واضح ہے۔۔۔ دوسری روایت
- ۶۔ یہ قوم عادی کی طرح ہیں اور اسی کی طرح ہلاک کیے جانے کے سزاوار۔ تیسری روایت
- ۷۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انہیں پاتے تو ان کے خلاف جہاد فرماتے۔۔۔

### تیسری روایت

مسلمان بھائیو! کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! اللہ تعالیٰ کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے پیارے پیارے الفاظ پیش کر کے خوارج کی جملہ جماعتوں کی سات نشانیاں اور ان کے بارے میں سات احکام ان روایتوں سے ہی اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں، کسی مخالفت جماعت کی کھینچ تان نہیں، اسی آقا کے ارشادات ہیں جس کا کلمہ یہ حضرات بھی پڑھتے ہیں، جن کے اُمتی ہونے کا یہ لوگ بھی دم بھرتے ہیں، دیکھیے ان ارشادات کو سن کر کس کو ڈٹ گرتے ہیں؟ یا جس گھر سے نکل کر جاگے تھے پھر اسی کا رخ کرتے ہیں؟ اسے میرے رب! اسے ساری کائنات کے رب! ہدایت فرما کہ یہ لوگ بھی اندھیرے کو چھوڑ کر اسلام کے اجالے میں آئیں اور اپنی عاقبت کو برباد ہونے سے بچائیں۔ امین یا اللہ العالمین بحق سید المرسلین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ جیبہ محمد و آلہ و صحبہ اجمعین۔

خوارج باقاعدہ جماعتی شکل میں پہلے پہل مولائے کائنات، امیر شمش جہات، تاجدارِ ولایت امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جنگِ صفین کے بعد ظاہر ہوئے۔ قبل ازیں یہ آپ کے ساتھی اور قبیح تھے لیکن سُنہِ حکیم کی آڑ میں بگڑے اور اپنا اصلی رنگ روپ ظاہر کرنے لگے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

”عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علی کو حکیم کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر ایک خاص حکم مقرر کرنے پر تزلزل گئے، جلد ہی اپنے خیالات سے منحرف ہو گئے اور حکیم کو ایک جرم قرار دینے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جس طرح ہم نے حکیم کو قبول کر کے ارتکابِ کفر کیا تھا اور پھر اُس سے تائب ہوئے آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کا اعلان کریں۔ عرب کے بدو بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملائے لگے۔ **لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** کے نعرہ کو اپنا شعار بنایا اور حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے خلافتِ لڑائی کا آغاز کر دیا۔

خوارج کے گروہ کی یہ اپنے روزِ اول سے ہی فطرتِ چلی آتی ہے کہ جو حضرت اسلام کا مکمل نمونہ پیش کر رہے تھے، جو بابِ دینۃ العلم تھے اور جن حضرات، قدسی صفات سے بہتر اسلام کی مکمل عملِ تفسیریں ختمِ تکمیل نے بھی آج تک غیر انبیاء کے گروہوں میں نہیں دیکھی تھیں، خوارج نے اُن حضرات کو بھی باسلام سے خارج ٹھہرانے اور کافر بتانے بلکہ اُن کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کی اکابر و دشمنی پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ابو زہرہ مصری مزید یوں وضاحت کرتے ہیں:

”**لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** کے الفاظ ہر اُن کے پیشِ نظر رہتے۔ یہی اُن کا دین تھا جس سے مخالفین پر آوازے کتے اور ہر بات کو ختم کر کے رکھ دیتے۔ جب حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو مصروفِ گفتگو دیکھتے یہی نمونہ لگاتے۔ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور ظالم حکام سے انہماں بیداری کا خیال اُن پر حاوی رہتا تھا۔ یہ چیز اُن کے قلب و دماغ پر چھا گئی۔ اُن کے لیے حق تک رسائی حاصل کرنے کے سبب دروازے بند کر دیے تھے۔ عثمان و علی، ظلم اور زہر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور قاتلینِ بنی امیہ سے برأت کا انہماں کرنے والے کو اپنے زمرہ میں شامل کر لیتے تھے اور بعض دوسرے اصول و مبادی میں نسبتاً اس سے نرم سلوک کرتے، حالانکہ وہ مسائل ان سے اہم ہوتے اور اُن میں مخالفت کا ارتکاب کرنے سے وہ ان سے

زیادہ دُور جا پڑتے اگر اظہارِ برأت کی مخالفت میں یہ خطرہ نہ تھا...  
 برأت کا خیال اُن کے اعصاب پر بڑی طرح سوار تھا اور جمہور مسلمانوں کی  
 جماعت میں داخل ہونے سے مانع تھا،

جس طرح یہود کی خواہ گردن اڑادی جاتے لیکن وہ موت کی تمنا نہیں کرے گا اسی طرح  
 خارجیوں کی خواہ جان جاتی رہے لیکن مسلمانوں اور اُن کے اکابر کو مشرک اور خارج عن الاسلام  
 کہنے سے نہ کبھی باز آئے اور نہ تاقیامت باز آئیں گے۔ یہی سلوک ان بد بختوں نے اپنے  
 اولین زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کو مسلمان شمار کرنے والوں کے ساتھ  
 روا رکھا تھا۔ حضرت حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے دیگر ساتھیوں نے اپنے عمل سے  
 پوری اُمتِ محمدیہ کو یہ دکھا دیا تھا کہ خوارج اُن کے نزدیک واجب القتل ہیں کیونکہ خود ارشاد  
 نبوی اس پر شاہد نہیں۔ اس سلسلے میں فاضل ابو زہرہ معری لکھتے ہیں:

”یہی حال خوارج کا تھا، بے محابا علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اُن کے  
 خطبوں بلکہ نماز میں تنگ کرتے تھے۔ یہ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ  
 عنہما) کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں کو حلیج کرتے اور انہیں مشرک قرار  
 دیتے تھے۔ ان لوگوں نے جب عبداللہ بن جناب الارت (رضی اللہ تعالیٰ  
 عنہ) کو قتل کیا اور اُن کی لونڈی کا پیٹ پھاڑ ڈالا تو حضرت علی (رضی اللہ  
 تعالیٰ عنہ) نے اُن سے کہا: ”عبداللہ بن جناب کے قاتلوں کو ہمارے  
 حوالے کر دو۔“ خوارج نے جواب دیا: ”عبداللہ بن جناب کو ہم سب نے  
 قتل کیا ہے۔“ آخر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو اُن سے لڑنا پڑا، یہاں تک  
 کہ اُن کا تقریباً قلع قمع ہی کر دیا، تاہم جو بچ بچے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے  
 طریقے سے بٹے نہیں بکے پوری دلیری اور شجاعت کے ساتھ اپنی دعوت میں  
 مصروف رہے۔“

۱۔ غلام احمد حیرانی: اسلامی مذاہب، ص ۸۵

۲۔ ایضاً: ص ۸۶

خارجی حضرات اپنے روزِ اول سے ہی زلاتِ تین و اخلاص پیش کرتے آئے ہیں لیکن یہ ہمیشہ دوسروں کی آنکھوں میں تنکے ہی دیکھتے رہتے ہیں اپنی آنکھوں کے شہتیروں کو دیکھنے کی یہ حضرات کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کیا کرتے۔ خوارج کی اولین جماعت نے اپنی اس مخصوص فطرت کا ایک یہ ثبوت بھی پیش کیا تھا،

”فہم دین کی کوتاہی نے اخلاص کے باوجود انھیں گمراہ کر دیا اور یہ اسلام کے جوہر اور روح کو پامال کرنے لگے۔ انھوں نے عبد اللہ بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشرک تصور نہیں کرتے تھے مگر قیمت ادا کیے بغیر ایک عیسائی کی کججوری لینے سے انکار کر دیا تھا۔“

دوسرے پر تنقید و نکتہ چینی کرنے کی بیماری تو عام ہے لیکن بعض اوقات انسان غیر شعوری طور پر یا کسی گمراہ پارٹی سے اپنا خلاف واقعہ اختلاف دکھانے اور اس سے اپنی برأت کا نام نہاد اظہار کرنے کی خاطر، خود اپنے ہی عقاید و نظریات پر تنقید کر جاتا ہے۔ زمانہ حال کے خارجیوں اور وہابیوں میں سے کسی کسی بعض حضرات بھی یہی طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور دیوبندی عالم مولوی بدر عالم میرٹھی نے خوارج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”اُن (خوارج) کے اقوال و عقاید دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درکِ مقاصد، فہمِ معانی، استنباط و استنتاج کا اُن میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا انھیں شوق ضرور تھا مگر اس کے معانی کی انھیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن اُن کی زبانوں پر تھا مگر اُن کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے۔ اُن کی اس علمی بے ماٹنگی کی طرف حدیث کے الفاظِ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے: یقرؤون القرآن لا یحباوزحناجرہم۔“

یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف ان کی زبانوں پر ہوگا ،  
ان کے قلوب میں علم و فہم کا کوئی ذرہ نہ ہوگا۔

دوسری علامت ان کے علم نما جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ: یقتلون  
اہل الاسلام ویدعون اهل الاوثان۔ بت پرستوں کو چھوڑ کر اہل اسلام  
کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور  
نفس میں تقشفت پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما  
جب ان سے مناظرہ کے لیے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ انہوں نے فرمایا ہے،  
وہ یہ تھا، میں ایسی جماعت کے پاس سے آ رہا ہوں جس میں یہ قرآن اتر آ  
اور جو براہ راست آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے۔  
اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن واں نہیں۔ اگر  
انصاف کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کی صحیح مراد وہ لوگ زیادہ جانتے تھے  
جن میں سب سے پہلے قرآن اتر اور جنہوں نے براہ راست صاحب کتاب  
سے اس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اس پر عمل کا طریقہ دیکھا۔

کاشش! موصوف یا ان کے ہم خیال علماء بھی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں اپنے  
دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے والے، اس کی سچی  
ہدایات اور لطیف مضامین سے محروم رہنے والے، کہیں آجکل وہ حضرات ہی تو نہیں ہیں جو  
قرآن کریم سے پھر دگیا عالم کو چھوٹا بنا سنے اور اس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین  
و تقصیر کے وسائل فراہم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اولین خوارج نے تو حضرت علی رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ کو مشرک اور اسلام سے خارج کہا تھا لیکن موجودہ خوارج کے ہدف تحقیق سے  
تو نہ انبیائے کرام ہی بچے اور نہ خالق کائنات۔ اس کے ساتھ ہی ان جماعتوں یا افراد  
کو بھی دیکھ لیتے جو علی الاعلان بت پرستوں کا ساتھ دیتے رہتے ہیں، مسلم مفادات کی

لے بدر عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنہ، جلد اول، مطبوعہ دہلی، بار اول ۱۹۴۸ء، ص ۳۰۴

مخالفت کرنا ہمیشہ شیوہ رہا ہے اور مسلمانوں کے خون کے دہنے ابھی تک جن کے دامنوں پر صاف نظر آ رہے ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان ہے، ان کے ارشادات علیہ کو درست تسلیم کرتے ہیں، تو پیارے نبی کے اس پیارے اعلان پر عمل کرتے، "یقنوں اهل الاسلام ویدعون اهل الاوثان" کے جن کو مصداق پاتے، بغیر کسی رورعایت کے انہیں خوارجِ زمانہ تسلیم کرتے اور ان سے کنارہ کش ہو جاتے۔ کیا خوارج پر ان تنقید کرنے والوں نے حق و باطل میں تمیز کرنے کی ایسی زہمت برداشت کی، تاریخ اس کا جواب نفی میں دے رہی ہے کیونکہ منجرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "لا یعودون" بھی تو فرمادیا تھا۔ ایسے حضرات سب کچھ جانتے ہیں لیکن حق کی طرف آئے کی آن، باطل پر ڈٹے رہنے کے ارمان، واللہ، ہوا المستعان۔

وجہ یہ ہے کہ موجودہ حضرات کا رخ خوارج کی ہمیشہ ہی یہ کیفیت رہی ہے کہ تصویر کا جو رخ ان کے سامنے ہوتا اسی کو دیکھتے اور دوسری طرف نظر نہ ڈالنا ہی معیوب سمجھتے تھے۔ اپنے نظریات کو غلطی سے قطعاً مبرا اور دوسروں کے عقاید کو مراسر غلط ماننا گویا خارجیت کی اولین شرط ہے اور اس سے ذرا ادھر ادھر ہٹ جانا ان کے نزدیک دین سے نکل جانے اور جہنم میں گرو جاتے کے مترادف رہا ہے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

یہ حقیقت ہے کہ خوارج کے مناظرات و مناقشات پر محض کارنگ نمایاں ہونا ہے۔ وہ کبھی نہ محض کی دلیل کو تسلیم کرتے ہیں نہ اس کے نظریات کی صحت کا اعتراف کرتے، وہ حق سے کسی قدر بھی قریب کیوں نہ ہو۔ مخالفت جس قدر زیادہ قوی دلیل پیش کرتا اسی قدر یہ اپنے عقیدے پر زیادہ راسخ ہو جاتے اور اپنی تائید میں دلیلیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے افکار ان کے نفوس پر چھانے رہتے تھے اور ان کے نظریات و معتقدات ان کے قلب کی گہرائی تک جا گزریں ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوت فکر و نظر کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں اور ان کے ادراکات و احساسات

میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہی۔ بایں ہمہ خوارج میں شدتِ نزع و خصومت کا جذبہ کار فرما رہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر خوارج کے افکار میں بڑی تنگ نظری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ان کی جانب صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھا کرتے تھے اور دوسروں کے نظریات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُن خوارج قرآن کریم کے مفہوم و مطالب کو جس طرح اخذ کیا کرتے تھے اُس کے بارے میں موصوف یوں تصریح کرتے ہیں:

”خوارج ظواہر قرآن سے تمسک کرتے تھے اور اُس کے معانی و مفہوم کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہ کرتے۔ نصوص پر سطحی قسم کی نگاہ ڈالنے سے جو سرسری مفہوم ذہن میں بیٹھ جاتا بس اُسی کے ہورہتے اور اُس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر سرکنا گوارا نہ کرتے۔“

خوارج میں موصوف کے نزدیک وضعِ احادیث کا مرض بھی سرایت کیے ہوئے تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

”مذہب و مسلک کی اندھا دھند تائید کا جذبہ بعض اوقات خوارج کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دروع گوئی کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ایک خارجی جس نے اِس عقیدہ سے توبہ کر لی تھی، علماء سے کہا کرتا تھا کہ احادیثِ نبویہ کی اچھی طرح چھان بین کریں کیونکہ خوارج کو جب کوئی دلیل نہ ملتی تو وہ خود ساختہ کلام کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔“

خوارج کے نظریات و عقائد چونکہ تعصب، تنگ نظری اور کج فہمی پر مبنی تھے یہی وجہ ہے کہ طبائع کے اختلاف کی بنا پر مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن ازارقہ کہلانے والے خارجی

۱۔ غلام احمد حیرری: اسلامی مذاہب، ص ۹۹، ۱۰۰

۲۔ ایضاً: ص ۱۰۰

۳۔ ایضاً: ص ۱۰۰



باقی سب سے تعداد میں زیادہ اور مضبوط تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے دیگر خوارج سے ان کے چھ امتیازی عقاید کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار یہ ہیں:

(الف) یہ اپنے مخالفین کو صرف خارج از ایمان ہی قرار نہیں دیتے بلکہ ان کو مشرک اور دائمی جہنمی تصور کرتے ہیں، ان کا قتل و قتال بھی ان کے نزدیک روا ہے۔

(ب) غیر خوارج مسلمان کا ملک دار الحرب ہوتا ہے اور وہاں پر ہر وہ کام مباح ہے جو دار الحرب میں مباح ہوتا ہے مخالفین کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا اور

انہیں لوندی غلام بنانا جائز ہے۔ جنگ سے جی بچانے والوں (قتل مسلم سے پرہیز کرنے والے خارجوں) کو قتل کرنا روا ہے۔

(ج) مخالفین کے بچے بھی مشرک ہیں اور ابدی جہنمی ہیں۔ اس سے ان کا

مقصود یہ تھا کہ مخالفین کا کفر صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہے گا

بلکہ ان کے بچوں تک بھی پہنچ جائے گا، باوجودیکہ انہوں نے اس

جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ خوارج کا یہ نقطہ نظر ایک عظیم فکری انحراف

کی آئینہ داری کرتا ہے۔

(د) گناہِ صغیرہ یا کبیرہ کا ارتکاب انبیاء سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان

ازار قد خوارج کے موخر الذکر عقیدے کے بارے میں موصوف نے اپنے تاثرات کا یوں

انہما کیا ہے:

”اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے۔

ایک طرف تو وہ کبار کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دیتے اور دوسری

جانب انبیاء سے بھی ان کا صدور جائز سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں انبیاء

کفر کا ارتکاب کر کے توبہ کر لیا کرتے ہیں۔“

لے غلام احمد حیرانی: اسلامی مذاہب، ص ۱۰۲

۷۰ ایضاً: ص ۱۰۲

خوارج کے بارے میں بحیثیت مجموعی پروفیسر صاحب مذکور اپنے خیالات یوں ظاہر کرتے ہیں:

”در اصل خارجی مذہب کی بنیاد تشدد اور غلو پر ہے۔ دین اور فہم دین کے معاملہ میں یہ لوگ بہت زیادہ غالی اور تشدد تھے۔ اس چیز نے انہیں گمراہی کے راستے پر لا ڈالا تھا اور عامہ مسلمین کو بھی گمراہ کرنے کے درپے رہتے تھے۔“

موجودہ زمانے کے خارجی حضرات باوجود اتمام حجت کے اور دلائل کے میدان میں عاجز رہ جانے پر بھی اپنے عقاید و نظریات سے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتے لیکن یہ حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات کی اولین جماعت پر خود امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یوں اتمام حجت فرمائی:

”ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہم عصر خوارج کے مزعومات کے دندان شکن اور مدلل جواب دیے۔ ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”اگر تمہارا خیال صحیح ہے کہ میں خطا وار ہوں اور گمراہ ہوں تو میری گمراہی اور غلطی کی سزا اُمت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیوں دیتے ہو؟ تم نے اپنے کندھوں پر تلواریں لٹکار رکھی ہیں اور انہیں موقع بے موقع بے پیام کر لیتے ہو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ گنہگار کون ہے اور بے گناہ کون؟ دونوں کو تم نے ایک ساتھ ملا رکھا ہے۔“

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا، پھر اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی، اس کے اہل خانہ کو اس کا وارث بھی تسلیم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قاتل کو مجرم قتل میں قتل کیا لیکن اس کے اہل کو اس کی میراث سے محروم نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چور کے ہاتھ کاٹے اور غیر شادی شدہ زانی کو ڈسے مارے لیکن دونوں کو مالِ غنیمت

میں سے حقہ بھی دیا۔ آپ نے گنہگاروں کے مابین اللہ تعالیٰ کا حکم قائم کیا،  
لیکن اسلام نے مسلمانوں کو جو حقہ دیا تھا اُس سے اُن گناہگاروں کو محروم  
نہیں کیا، نہ اُن کا نام دائرہ اسلام سے خارج کیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اِس اتمامِ حجت کے بارے میں پروفیسر ابو زہرہ مصری  
نے یوں لکھا ہے:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اِس مدلل اور عمدہ تقریر کا خوارج کے پاس  
کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس موقع  
پر کتابِ الہی سے دلیل لانے کے بجائے عملِ رسول سے دلیل پیش کی،  
کیونکہ عمل کی تاویل نہیں ہو سکتی، اِس کو درست طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے  
اور جس میں خوارج کے سطحی نظریات اور فکرِ خام کے لیے کوئی گنجائش نہ  
نکل سکتی تھی۔ سطحی فکر تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتا ہے۔ اُس کی نظر ایک  
جزیتے پر ہوتی ہے اور فہمِ عبادات و اسالیب میں جزئی میلان سے گرا ہی تو  
حاصل ہو سکتی ہے، مقصد تک پہنچنا مشکل ہے۔ امورِ کلیہ پر نظر رکھنے سے  
حق کا ادراک کیا جاسکتا ہے اور درست فیصلہ تک پہنچا جاسکتا ہے، نظریں  
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا  
عمل پیش کیا تاکہ اُن پر تاویل کے دروازے چند کر دیے جائیں، بغیر اِس  
کے کہ اُن کی تلبیساتِ فاسدہ کے لیے ہجرت و اضطراب کا کوئی ذمہ باقی  
نہ رہنے دیا جائے۔

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خوارج کو برا و راست کی طرف بلائے اور اتمامِ حجت  
کی غرض سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو اُن کے پاس بھیجا۔ آپ کی

۱۔ غلام احمد حیرتی، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۹۲

۲۔ ایضاً: ص ۹۵

خارج سے جو گفتگو ہوئی اُسے حافظ ابن عبد البر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۴۶۳ھ) کے حوالے سے مولوی بدر عالم میرٹھی دیوبندی نے یوں بیان کیا ہے:

”جب خارج حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر چڑھائی کر کے آئے تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اسے امیر المؤمنین! دیکھیے یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلے میں آمادہ پیکار کھڑے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ پہلے انہیں جنگ کر لینے دو۔“

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجیے، میں اُن لوگوں (خوارج) سے گفتگو کروں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھڑک رہی ہے۔ شب بیداری کی وجہ سے اُن کے چہرے سیا ہی مائل ہیں۔ سجدوں کے نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اُونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیکیں پڑ گئی ہیں۔ دُعلیٰ ہوئی قیض پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو دیکھا تو بولے: ابن عباس! کیسے آتے اور یہ حُذہ کیسا پہن رکھا ہے، حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کہتے ہیں، میں نے جواب دیا: تمہیں اس حُذہ پر کیا اعتراض ہے؟ میں نے خود اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے مٹی کپڑے دیکھے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی آیات تلاوت کی: ”قل من حرم ذمیتہ اللہ التي اخرج لعبادہ والطيبات من الرزق“۔ آپ کہہ دیجیے کہ یرزیت اور اچھی اچھی غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں، کس نے حرام کیں؟ پھر انہوں نے دریافت کیا، کہو کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا نہیں، جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ میری آمد کا

مقصد یہ ہے کہ ان کی باتیں تو تک اور تمھاری باتیں ان تک پہنچا دوں۔  
 انھوں نے آپس میں کہا: ان سے بات مت کرو کیونکہ یہ قریشی ہیں اور ان کے  
 حق میں قرآن کہتا ہے: "بل ہم قوم خصمون" بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔

بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد ان میں سے دو تین  
 شخص سامنے آئے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر تمہیں  
 کیا اعتراض ہے؟ انھوں نے کہا، تین اعتراض ہیں۔ میں نے کہا، بتاؤ۔  
 انھوں نے کہا، پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں  
 کو حکم بنایا، حالانکہ قرآن کریم میں ہے: "انما احکمہم اللہ" فیصلہ  
 صرف خدا کا ہے۔ میں نے کہا، چلو ایک بات ہوئی، اور بولو۔ کہنے لگے،  
 حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)  
 سے جنگ کی، پھر وہ کسی کو قید کیا اور زبالی غنیمت لوٹا۔ اب اگر ان کی جماعت  
 مسلمان تھی تو ان سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح ان کے ساتھ  
 جنگ درست تھی، قید کرنا بھی درست تھا۔ میں نے کہا، اچھا اور کچھ بولے  
 تیسری بات یہ ہے کہ انھوں (امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)  
 نے اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا؟ اس لیے اگر وہ مومنین کے امیر  
 نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہونے۔ (فقوذا للذم من ذالک)

میں نے کہا اگر میں ان سب باتوں کا تمہیں خود قرآن و سنت سے ہی  
 جواب دے دوں تو کیلو آپس چلے جاؤ گے؟ انھوں نے کہا، کیوں نہیں۔  
 اس پر میں نے کہا، اچھا تو سنو۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن  
 ہی میں دوسروں کو حکم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے چنانچہ حالت احرام میں  
 کوئی شخص شکار کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جزا مقرر کی ہے اور اس کا  
 فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے، جو وہ کہہ دیں گے وہی قابل تسلیم  
 ہو جائے گا۔ اسی طرح خلع میں طرفین کے دو شخص بلا کہ فیصلہ ان کی رائے

پر زکھ دیا ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابل تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں تسلیم نہیں ہوگا؟ اب بتاؤ تمہارا اعتراض جاتا رہا یا نہیں؟ کہنے لگے، جی ہاں۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتاؤ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، تمہاری ماں تھیں یا نہیں؟ اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں؟ اگر اس کا اقرار کرتے ہو، تو بھی کافر ہو، کہو اس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں۔

میں نے کہا: اب تیسری بات کا جواب سنو۔ صلح حدیبیہ میں ابوسفیان و سہیل کے اصرار پر کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا؟ پھر اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا؟ سوال و جواب کے بعد ان میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہو گئے اور جو رہ گئے وہ قتل کر دیے گئے۔

مذکورہ بالا طویل حوالہ ہم نے اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ خوارج کے عقاید، ذہنیت اور ان کے ساتھ صحابہ کرام کا سلوک وغیرہ بہت سے گوشے قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔ احادیث میں ان کی جو نشانیاں مذکور ہوئیں وہی مشاہدہ میں آئیں مثلاً:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبیبی مہستی کو توحید کا مخالف ٹھہرانا اور ہر اس مسلمان کو کافر و مشرک قرار دینا جو حضرت امیر المومنین کو مشرک نہ کہے اور ان سے اپنی برأت کا

لے بدر عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنۃ، جلد اول، مطبوعہ دہلی، ص ۲۲

اظہار دکرے۔

- ۲۔ صحابہ کرام کے نزدیک خوارج کا عقیدہ توحید جیسا کہ انہوں نے اُس کی پیش خویشی حدود متعین کی ہوئی تھیں، قرآن و سنت کے خلاف اور اسلامی توحید کے منافی تھا۔
- ۳۔ بات بات میں قرآن سے استدلال کرنا خوارج کا طرہ امتیاز تھا لیکن قصورِ فہم کے باعث قرآنی آیات کو اپنے مخصوص عقاید و نظریات کا تابع رکھنے کے عادی تھے۔
- ۴۔ جہازت گزاری اور شب بیداری میں یہ مسلمانوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔
- ۵۔ اپنے فیصلے کے روبرو یہ خدا اور رسول (جل جلالہ) و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلے کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت اور ان کا جنتی ہونا خود قرآن کریم سے ثابت، حضورِ جان نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں عشرہ مبشرہ میں شامل فرمایا، اہل بیت میں ٹھہرایا اور آپ کے ایسے فضائل و خصائص بتاتے جن میں آپ منفر و بھی ہیں اور اپنے گونا گوں فضائل و کمالات کی بنا پر امتِ محمدیہ میں آپ کو ہمیشہ اتمہائی عقیدت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اسی طرح دیگر صحابہ کرام کے فضائل و صفات سے ثابت لیکن خوارج نے اپنی ساختہ توحید کا ان حضرات کو دشمن ٹھہرایا، ہمارے تعالیٰ شانہ، اور اہل بیت کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلے کو اپنے توحیدی جوش میں پس پشت پھینک کر، اسلام کے علمبرداروں اور امتِ مرحومہ کے سرداروں کو بھی مشرک قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ مروجہ زمانے کے خوارج بھی اپنی ساختہ توحید کی ایسی ہی حدود متعین کیے ہوئے ہیں، جن کے پیش نظر امتِ مرحومہ کا کوئی فرد موجد نہیں ثابت کیا جاسکتا بلکہ ان کی اصطلاح میں مشرک ہی قرار پاتا ہے اور اس طرح یہ امتِ مرحومہ کو یا مشرکوں کا ایک گروہ یا اہمیتِ طعونہ بن کر رہ جاتی ہے (نعوذ باللہ من شرورہم)۔
- ۶۔ جو خارجی اپنی ساختہ توحید سے تائب ہو کر حقیقی اسلام کے پیروکار نہ بنیں وہ صحابہ کرام کے نزدیک مستحل الدم ہیں جیسا کہ خوارج کا حشر امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا۔

۴۔ خارجی صرف خود کو اسلام کا صحیح تابع مان سکتے ہیں، اس کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی بہستی پر عقیدہ کرنے، اس کی شان میں کھڑے نکلنے، اسے خوفِ خدا سے عاری یا سنتِ رسول کا مخالف کہتے ہوئے انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے محلے پر اعتراض کیا تھا۔

اس کے علاوہ اور جتنے گوشے ہیں وہ مذکورہ بالا تجارت سے خود ہی واضح ہیں۔ جب خوارج کا تشدد حد سے بڑھا تو ذوالفقار جیوری پیام سے باہر نکل آئی۔ مسلمانوں نے خوارج کا زور توڑ کر رکھ دیا۔ چن چن کر انہیں قتل کیا۔ بہت تھوڑے ہی سب کے ورنہ سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نہ انہیں کلمہ گو شمار کیا نہ اہل قبلہ، نہ صحابہ کرام و تابعین حضرات نے ان کے جتوں جتوں کو دیکھا اور نہ ان کے ظاہری تدین کو، نہ ان کا مثالی قاری ہونا انہیں مسلمان ثابت کر سکا اور نہ پیشانیوں پر پڑے ہوئے سجدوں کے نشان ان کے اہل اسلام ہونے کی دلیل بن سکے، نہ شب بیداری نے انہیں کفریہ عقاید سے بچایا اور نہ خانہ ساز توحید نے۔ وہ صحابہ کرام و تابعین عظام کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ نہ صرف محاربین کو ان کا برسنے تر تیغ کیا بلکہ اس ناپاک گروہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی خاطر، اس ساختہ توحید کے علمبرداروں کو چن چن کر ذبح کیا اور ملکِ عدم کی سیر کرائی۔ کذاک العذاب و لعذاب الاخرة اکبر لو کانوا یعلمون ۵

خوارج کے غیر اسلامی عقاید و نظریات کا مرکزی نقطہ نظریہ یہی تھا کہ وہ اپنا ذوق تکفیر پورا کرنے کی غرض سے، ان آیات کو جو بتوں اور بت پرستوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں انہیں بزرگانِ دین پر چسپاں کر کے مسلمانوں کو انبیائے کرام و اولیائے عظام کی عقیدت و محبت کے باعث مشرک قرار دیتے تھے اور آج تک یہی کچھ مظاہرہ کیا جا رہا ہے، خوارج کی اس عادت کا مشہور دیوبندی عالم، مولوی بدر عالم میرٹھی نے یوں تذکرہ کیا ہے:

”خوارج کا نقطہ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں انہیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انہیں کافر قرار دیتے، پھر اس جاہلانہ بنیاد پر ان سے آمادہ جنگ ہو جاتے تھے۔“

۵ بدر عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنۃ، جلد اول، ص ۲۲



بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے بارے میں اُس مروج آگاہ کی رائے گرامی کا اظہار بھی کر دوں، جو علم کی وافر دولت سے ہی مالا مال نہ تھے بلکہ روحانیت کے لحاظ سے اویس کرام میں اپنی مثال آپ ہوئے۔ میری مراد شہنشاہ بغداد، قطب الاقطاب، غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

وقد وصفهم النبي صلى الله عليه وسلم بانهم يهرقون من الدين كما يهرق السهم من الرمية ثم لا يعودون فيه فهم الذين مرقوا من الدين والاسلام وفارقوا الملة وشرذوا عنها وعن الجماعة وصلوا عن سواء الهدى والسبيل وخرجوا عن السلطان وسلوا السيف على الائمة واستحلوا دماشهم واموالهم وكفروا من خالفهم يسمون اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم واصهاره ويتبرون منهم ويرمونهم بالكفر والعظائم ويرمونهم ولا يؤمنون بعذاب القبر ولا الحوض ولا الشفاعة ولا يخرجون احدا من النار ويقولون من كذب كذبة او اتي صغيرة

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے اور پھر دین میں واپس نہیں آئیں گے۔ پس یہ وہی لوگ ہیں کہ دین اسلام سے خارج ہو گئے۔ ملت اسلام یہ میں تفریق کی اور اُس سے جدا گئے اور مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر رہ گئے۔ ہدایت کے سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ سلطان وقت کے بانی ہوئے اور ائمہ مطہرین پر تلوار اٹھائی اور ان حضرات کا خون بہا اور مال لوٹا حلال ٹھہرایا اپنے مخالفوں کو کافر کہتے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب اور خیروں کو گالیاں دیتے، ان پر تبر بازی کرتے اور ان حضرات پر کفر اور کبیرہ گناہوں کی تہمت لگاتے اور غیر خوارج کو متہم کرتے۔ یہ عذاب قبیرہ، حوض کوثر، شفاعت اور دوزخ سے کسی کے نکالے جانے کا انکار کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جس نے ایک فحش چوٹ بولا یا گناہ کبیرہ

اور کبیرہ من الذنوب فمات | یا کبیرہ کیا اور بغیر توبہ کے مرگیا، تو ایسا آدمی  
من غیر توبۃ فهو کافر فی النار مخلدٌ | کافر ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

حضرت غوث صمدانی، محبوب سبحانی، سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
(المتوفی ۵۶۱ھ) نے آگے خوارج کے پندرہ فرقے، ان کے بانیوں کے نام اور ہر فرقے  
کے مخصوص عقائد کا ذکر کر کے آخر میں جملہ خوارج کی قدر مشترک یعنی ایسے دو غیر اسلامی معتقدات  
تحریر فرماتے ہیں، جن پر نجدات کے سوا سب خارجیوں کا اتفاق ہے۔ فرماتے ہیں:

واقفت جمیع الخوارج علی | خوارج کے تمام فرقوں کا بوجہ مستند حکیم حضرت  
کفر علی رضی اللہ عنہ لاجل | علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کفر اور کبیرہ گناہ کے  
التحکیم و علی کفر مرتکب الکبیرۃ | مرتکب کو کافر سمجھنے پر اتفاق ہے، ماسوائے  
الا تجدات فانہا لہ یوافقہم | نجدات فرقے کے کیونکہ اس بارے میں  
علی ذلک۔ | وہ دیگر خوارج سے متفق نہیں ہے۔

امام الامم حضرت سیدنا ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نے جو بلاشبہ  
امام المسلمین ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں اپنا اہم رجحان مسلمین کا عقیدہ نیز مرتکب کبار کا  
شرعی حکم یوں بیان فرمایا ہے:

افضل الناس بعد النبیین علیہم | جملہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد  
الصلوٰۃ والسلام ابو بکر الصدیق | تمام افسانوں میں افضل ترین حضرت ابو بکر صدیق  
ثم عمر بن الخطاب الفاروق | ان کے بعد حضرت عمر فاروق، پھر ان کے بعد  
ثم عثمان بن عفان ذو النورین ثم | حضرت عثمان بن عفان ذو النورین پھر ان کے  
علی ابن ابی طالب المرتضیٰ | بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین  
رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین | ہیں۔ یہ سب عبادت گزار، سچے پرکاشان اور

سیدنا عبدالقادر جیلانی غوث اعظم، غنیۃ الطالبین، شائع کردہ مکتبہ سعویہ کراچی، ص ۳۱۰، ۳۱۱

کے ایضاً: ص ۳۱۵، ۳۱۶

حق کے ساتھ تھے۔ ہم ان سب سے محبت رکھتے ہیں اور ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (صحابہ کرام) کو جھلائی کے ساتھ ہی یاد کرتے ہیں اور ہم کسی مسلمان کو کسی بھی گناہ کی وجہ سے اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، کافر نہیں کہتے، جب تک کہ وہ اُس کو حلال سمجھے اور ہم اُس کو ایمان کے وصف سے نہیں نکالتے بلکہ طمانناحقیقت اُسے مومن ہی گردانتے ہیں۔

عابدین علی الحق ومع الحق  
نولیم جیعا ولا نذکر احد من  
اصحاب رسول اللہ (صلی اللہ  
علیہ وسلم) الا بخیر ولا نکتفر  
مسلمایذب من الذنوب  
وان صکان کبیرة اذا لم  
تستحلها ولا نزیل عنه اسم  
الایمان ونسبته مومنا  
حقیقۃ لہ

## خارجی سلفی

چوتھی صدی ہجری میں اتباع سلف کا دعویٰ کرتے ہوئے بعض حضرات نمودار ہوئے جو خود کو امام احمد ابن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۴۱ھ) کا پیروکار کہتے اور دینی حق کا علمبردار ٹھہرا کر مسلمانوں کو اسلام سے خارج بتایا کرتے تھے۔ حقیقت میں یہ خارجیت کے علمبردار تھے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

”اتباع سلف سے مراد جیسے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سلفی المشریق کہتے تھے اگرچہ ہم ان کے بعض عقائد و افکار کی نسبت اسلاف کی جانب صحیح نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ غالباً سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں منہجہ شہاد پر جلوہ گر ہوئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے تمام اقوال و آراء امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں۔ جنہوں نے عقائد سلف کو حیات زنجشی اور ان کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مخالفین کے سامنے سینہ سپر رہے

لے نغان ابن ثابت، امام اعظم، الفقہ الاکبر، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۳۲، ۳۵

..... یہ حنابلہ مسئلہ توحید اور قبروں سے اُن کے ربط و تعلق پر گفتگو کرتے تھے۔ آیاتِ تاویل و تشبیہ کا مسئلہ بھی ان کے یہاں اکثر زیر بحث آتا۔ ان کا ظہور چوتھی صدی ہجری میں ہوا۔ یہ اپنے عقائد و افکار کو امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ بعض حنابلہ (جو حقیقت میں حنبلی تھے) ان عقائد کی نسبت امام احمد کی جانب درست نہیں سمجھتے، اس ضمن میں ان سے جدل آزما ہوتے تھے؛ لہٰذا

سلفی حضرات نے جب خارجیت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی غرض سے اپنے عقائد فاسدہ کی نسبت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المستوفی ۲۲۱ھ) کی طرف کرنے لگے تو علمائے اہلسنت کے ساتھ ہی وہ حنبلی علمائے کرام بھی سلفیوں کی تزوید میں انتہائی سرگرمی دکھانے لگے جو حقیقت میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے قبیح تھے۔ امام ابن جوزی حنبلی نے ان کا سب سے بڑھ کر تعاقب کیا تھا۔ مثلاً:

”حنابلہ نے چوتھی صدی ہجری میں بعینہ انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور انہیں سلف کی جانب منسوب کیا۔ علماء اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس سے خدا کی تجسیم و تشبیہ (خدا کا مخلوقات کی طرح جسم دار ہونا) - لازم آتی ہے۔ وجہ لزوم یہ ہے کہ جب خدا کی جانب حسی اشارہ کیا جاسکتا تو وہ ضرور مجسم ہوگا۔ حنابلہ کے انہی نظریات کی بنا پر مشہور حنبلی فقہیہ و خطیب ابن جوزی اُن کی مخالفت پر تمل گئے۔ انہوں نے کہا: امام احمد بن حنبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یہ افکار و آراء نہیں رکھتے تھے؛ لہٰذا

علامہ ابن جوزی حنبلی کی سرگرمیوں کے بارے میں موصوف نے کچھ آگے یوں وضاحت کی ہے:

لہ غلام احمد حریری، اسلامی مذاہب، ص ۲۵۶

لہ ایضاً، ص ۲۶۳

۳۔ روضہ نبوی کے اردگرد دینی شعائر و احکام (مثلاً طواف) کا بجالانا توحید کے منافی ہے۔

۴۔ کسی نبی یا ولی کی قبر کے اوپر خدا سے دعا مانگنا، خلاف توحید ہے۔  
۵۔ سلف صالحین کا مذہب یہی تھا، اس کی خلاف ورزی کرنیوالے بدعات کے مرتکب اور توحید کے مخالف ہیں۔

وہ محبوب پروردگار جو باعثِ ایجادِ کائنات اور وجہِ قیام مخلوقات ہے، ان کے روضہ مطہرہ کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) مبلغِ خارجیت کی نظر سے کمزیدگیوں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

”ابن تیمیہ اسی لیے فرماتے ہیں کہ ازراہ تبرک روضہ نبوی کی زیارت جائز نہیں، اس لیے کہ آنحضرت نے اپنی قبر کو مسجد بنانے سے روک دیا تھا، جس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ آپ کا روضہ زیارت گاہِ خلافتِ زمین جائے۔“

پروفیسر ابو زہرہ مصری نے موصوف کے اس نظریہ کے بارے میں یوں اپنا عندیہ ظاہر کیا ہے:

”مسئلہ زیر نظر (زیارتِ روضہ انور) میں امام ابن تیمیہ کا موقف جمہور اہل اسلام کے خلاف ہے بلکہ ان کے نظریات کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمہور صلحا اور ان کی منت و زیارت کے مسئلہ میں ہم کسی حد تک ابن تیمیہ کے ہمراہ ہیں مگر روضہ نبوی کی زیارت کے مسئلہ میں ہم ان کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔“

موصوف کی اس کتاب کے مترجم یعنی لاپور زری یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے

۱۔ غلام احمد حریری، پروفیسر، اسلامی مذاہب، ص ۲۶۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۸۲-۲۸۳

پروفیسر جناب غلام احمد حریری نے روضہ نبوی کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حُرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے نظریے کی حمایت اور پروفیسر ابو زہرہ مصری کے موقف پر، جیسا کہ مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، چپیں بچیں ہو کر یوں تنقید کی اور دھاندلی مچائی ہے۔  
 "مصنف کا یہ قول مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے (یعنی جمہور اہل اسلام کے خلاف بتانا)۔ حدیث نبوی "لا تشدوا الریح" کے پیش نظر محدثین کی اکثریت امام ابن تیمیہ کی ہمنوا ہے اور تبرک و تمین کے نقطہ نظر سے روضہ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔"

چونکہ برٹش گورنمنٹ کے عہد اقتدار سے آج تک مدعیان اسلام کو ایسی آزادی رائے حاصل ہے کہ خدائی کے دعویدار بن بیٹھو یا نبوت کے مدعی ہو جاؤ، باری تعالیٰ شانہ، کو جھوٹا ٹھہراؤ یا انبیائے کرام کو چار سے بھی ذلیل کہتے پھرو۔ سرور کون و مکاں اور عالم علوم اولین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز میں خیال لانا گدھے بیل کے تصور میں سراپا ڈوب جانے سے بدتر اور شرک بتاؤ یا ان کے کپڑے، وا فرہ، مختلف علوم غیبیہ کو بچوں، پاگلوں اور جانوروں کے معلومات کے برابر ٹھہراؤ، نبی آخر الزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلحاظ زمانہ آخری نبی ہونے کا انکار کرتے پھر ویا ان کے جملہ اقوال و افعال پر خطِ تنسیخ کھینچ کر، برے سے اُن کے قابلِ حجت یا لائقِ استناد ہونے ہی کا انکار کر بیٹھو، پوچھنے والا جھلا کون ہے؟ عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفوی کا دفاع کرنے کی کسی صاحبِ اقتدار و قدرت کو ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟ ایسے پُر فتن دور میں کون کسی کی زبان پر پہرہ بٹھا سکتا ہے؟ ہاں جس وقت قرآن و حدیث سے غیر اسلامی عقائد و نظریات کو اسلامی عقائد کا جامہ پہنایا جائے گا، وہاں دلائل کے میدان میں ایسی دھاندلی کا راز فاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور علمائے اسلام نے ایسا دفاع ہر دور میں مثالی طور پر کیا ہے۔

پروفیسر غلام احمد حریری نے چونکہ یہاں حدیث "لا تشدوا الریح" سے استناد

کر کے ایک بہت بڑا دعویٰ کر دیا ہے جو سراسر محتاجِ دلیل ہے۔ موصوف نے دعویٰ تو کر دیا ہے کہ محدثین کی اکثریت علامہ ابن تیمیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کی ہمنوا ہے اور اس غرض سے روضہ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔ لیکن ہمیں فاضل مترجم کے اس دعویٰ سے اختلاف ہے کیونکہ اس حدیث کے پیش نظر محدثین نے روضہ نبوی کی زیارت کو ہرگز ناجائز نہیں کہا اور نہ علامہ ابن تیمیہ عراقی کی قطعاً ہمنوائی کی۔ موصوف اگرچہ محدثین کی ہمنوائی کا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ انہیں دلائل کے میدان میں محدثین کے مبارک طبقہ میں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر ہستی ایسی نہ ملے گی جس نے علامہ ابن تیمیہ کی ہمنوائی کی ہو۔ ماسوائے گروہِ خوارج کے جو اسلامی عقاید و نظریات کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج ثابت ہوتا رہا ہے۔

مقابر بزرگانِ دین کی زیارت اور ان کے توسل کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ عراقی

کا نظریہ یہ تھا:

”جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ قبروں کی منتیں گناہوں کے حاجات کا ذریعہ ہیں،

ان سے ازالہ تکلیفات ہوتا، رزق کے دروازے کھلتے اور شہر مامون و

محفوظ رہتا ہے، وہ مشرک ہونے کی وجہ سے واجب القتل ہے۔“

موصوف کے اس نظریے کے بارے میں پاکستان کے مشہور اہل قلم اور حق و انصاف

کے عظیم علمبردار، سیدی وسیدی و مرشدی حضرت مفتی اعظم ہند شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی

رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۶ء) کی زندہ یادگار، مخدومی و مکرمی پروفیسر

محمد مسعود احمد زید مجدہ یوں رقمطراز ہیں:

”ابن تیمیہ نے ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء میں اولیاء و اقبیاء کے مزارات پر حاضری

کے خلاف ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس کی پاداش میں کافی عرصہ بعد ۷۶۶ھ /

۶۱۳۲۶ء میں سلطانِ وقت نے ان کو قید کیا اور اسی قید و بند میں انتقال ہوا

لے غلام احمد حیرانی، اسلامی مذاہب، ص ۲۸۱

ابن تیمیہ مزارات پر معاصرہ کے علاوہ استغاثہ کے بھی خلاف تھے۔ چنانچہ یوسف النہانی نے اپنی کتاب "شواہد الحق فی الاستغاثہ بسید الخلق" میں ابن تیمیہ کے اس عقیدے کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔<sup>۱</sup> سلفی حضرات کا طرز عمل تو یہ تھا کہ وہ خود کو حنبلی ظاہر کر کے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد و نظریات کی نشر و اشاعت کو اپنا نصب العین بنا کر خارجیت کو پھیلانے میں مصروف رہا کرتے اور فقہاء و محدثین و متکلمین امت محمدیہ پر تنقید کرنے سے باز رہتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ حزانی (المتوفی ۷۲۸ھ) پہلے مبلغ خارجیت ہیں جنہوں نے گروہ اکابر کے بڑے بڑے علمائے کرام و علمائے عظام، حتیٰ کہ ائمہ دین تک کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، کسی بڑی سے بڑی اور مستحکم ہستی کی شہرت کو داغدار کرنے اور چھلنی بنانے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ علامہ ابن تیمیہ کی اس روش کے بارے میں جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب یوں وضاحت کرتے ہیں:

"ابن تیمیہ صوفیائے کرام اور مسکین سے بھی تالاں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں (النقد من الضلال اور احیاء العلوم الدین) پر بڑی جرح کی ہے۔ یہ وہی امام غزالی ہیں، جن کی شان میں شیخ ابوالفضل نے گستاخانہ کلمات کہے تھے تو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فوراً اس کی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے تھے اور معلوم ہے کہ مجدد الف ثانی کون بزرگ تھے؟ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے: ظ

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

جب تک فیضی نے معافی نہیں مانگی لی، آپ اس کی مجلس میں تشریف نہیں لے گئے۔ انھیں امام غزالی اور دوسرے صوفیہ کرام کے متعلق ابن تیمیہ کہتے ہیں

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ مظہری، مطبوعہ کراچی، بار اول، ۱۹۷۰ء، ص ۶۷



”صوفی اور متکلمین ایک ہی کشتی پر سوار ہیں“ لے

علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے یوں اُن کی سوانح حیات بیان کی ہے:

”مگر ایک زمانہ وہ آتا ہے جب اختلاف رائے ایک خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور علمائے کرام کے طبقے سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جن کے افکار و خیالات ملت اسلامیہ میں غیر مختم تفریق کا باعث ہوئے۔ اس سلسلے میں ہم ایک عالم کا ذکر کریں گے یعنی تقی الدین ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالمحلم المعروف بہ ابن تیمیہ الحرانی المہلبلی (۶۶۱ھ-۷۲۸ھ) یہ عالم بلا کے ذہین و فطین تھے۔ سترہ برس کی عمر میں فتویٰ نویسی کا آغاز کیا تقریباً پانچ سو کتابوں کے مصنف ہوئے۔ جب ابن تیمیہ نے مناظروں میں اپنے افکار و خیالات کا آزادانہ اظہار کیا تو راسخ العقیدہ علمائے اہلسنت و جماعت میں غم و عقہ کی لہر دوڑ گئی اور وہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور بعض علماء نے تو یہ کہہ کر دیا کہ جو ابن تیمیہ کو طعنہ سمجھے وہ خود ملحد ہے۔“ لے

علامہ ابن تیمیہ کی تنقید کا نشانہ صرف ائمہ دین ہی نہیں بنے بلکہ حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر و اعظم بھی اس اندھا دھند تیر اندازی و ناوک ننگنی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

”ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ابن تیمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ اُنھوں نے الصالحیۃ الجلیل کی مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر کہا ”حضرت عمر بن الخطاب نے بہت سی غلطیاں کیں“۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے

لے محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ مظہری، ص ۶۷

لے ایضاً: ص ۶۶

کہ انھوں نے کہا: علی بن ابی طالب نے تین سو غلطیاں کیں۔

ابن تیمیہ حرانی کے عقائد و نظریات کی تردید تو کتنے ہی اکابر اہلسنت نے کی اور متاخرین علمائے اہلسنت نے ان کے نظریات سے ہمیشہ برأت کا اعلان ہی کیا اور انھیں دین و ایمان کی موت قرار دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ ان عقاید سے بچنے کی تلقین ہی کرتے رہے۔ اہلسنت کے مایہ ناز محدث شیخ احمد شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے مخصوص عقاید و نظریات کے پیش نظر، شرعی فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے:

ابن تیمیہ ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے رسوا کیا، گمراہ کیا، اندھا کیا، بہرا کیا اور ذلیل کیا۔ اسی لیے ائمہ دین نے اس امر کی صراحت کی اور اس کے فساد و احوال اور چھوٹے اقوال کو بیان کیا۔ جو تصدیق کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اس امام و مجتہد کی تصانیف کا مطالعہ کرے جن کی امامت، جلالت اور مرتبہ اجتهاد تک رسائی پر سب کا اتفاق ہے یعنی شیخ ابوالحسن سبکی نیز ان کے فرزند ارجمند علامہ تاج الدین سبکی اور اماموں کے شیخ حضرت عزین جماعہ اور ان کے معاصرین اور دیگر علمائے شافعیہ مالکیہ اور حنفیہ وغیرہ کی۔ ابن تیمیہ نے صوفیہ متاخرین پر اعتراض کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے حضرت عمر بن خطاب اور علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر صحابہ پر بھی اعتراضات کیے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اس کا

ابن تیمیہ عبد خزله اللہ واضلہ  
واعماہ واصتہ واذلہ وبذلک  
صرح الائمة الذین بیئوا  
فساد احوالہ وکذب اقوالہ  
ومن اراد ذلک فعلیہ بمطالعة  
کلام الامام المجتہد  
المتفق علی امامتہ وجلالتہ  
وبلوغہ مرتبۃ الاجتہاد اچ  
الحسن السبکی وولده  
التاج وشیخ الامام العزین  
جماعہ واهل عصرہم وغیرہم من  
الشافعیہ والمالکیہ والحنفیہ  
ولم یقصر اعتراضہ علی متاخری  
الصوفیۃ بل اعتراض علی مثل  
عمر بن الخطاب وعلی بن ابی طالب  
رضی اللہ عنہما کما یأتی والحاصل

لے محمد سعید احمد پروفیسر، مراعظ مظہری، ص ۶۳

کلام کوئی وزن نہیں رکھتا بلکہ ویرا سنے میں پھینکنے کے لائق ہے۔ ابن تیمیہ کے بارے میں عقیدہ رکھنا چاہیے کہ وہ بدعتی، گمراہ، گمراہ کن، جاہل اور حد سے نکل جانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ اپنے عمل سے معاملہ کرے اور ہمیں اُس کے جیسے طریقے اور عقیدے سے بچائے۔ آمین۔

ان لا یقام لکلامہ وزن بل یری فی کل وعرو و حزن و یعتقد فیہ انہ مبتدع ضال و مضل جاہل غال عاملہ اللہ بعد لہ و اس جاہلنا من مثل طریقہ و عقیدتہ و فعلہ آمین۔

یہی حضرت فخر المحدثین آگے چل کر ابن تیمیہ، اُن کی تصانیف اور اُن کے متبعین کے بارے میں مسلمانوں کو اُن کی خیر خواہی کے پیش نظر یوں فہمائش کرتے اور حکمِ شرح بیان فرماتے ہیں:

ابن تیمیہ اور اُس کے شاگرد ابن قیم جوزی وغیرہ کی کتابوں پر کان رکھنے سے بچو کیونکہ اُنہوں نے اپنی خواہش نفسانی کو معبود بنا لیا تھا اور خدا نے اُس کو علم کے ذریعے گمراہ کیا اور اُس کے کان اور دل پر ٹھہر کی اور اُس کی آنکھ پر پردہ ڈالا۔ پس کون ہے جو اس کے باوجود اسے ہدایت دے۔ ان محدودوں نے کس طرح اسلامی حدود سے تجاوز اور رسوم سے تعدی کی اور شریعت و حقیقت کی چادر کو پھاڑ کر بھی گمان کیا وہ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں حالانکہ وہ راہِ راست پر نہیں ہیں بلکہ وہ بدترین گمراہی اور قبیح ترین خصائل اور انتہائی بد نفسی

”و یأک ان تصغی الی مافی کتب ابن تیمیہ و تلمینہ ابن قیم الجوزیہ وغیرہا من اتخذ اللہ ہواہ و اضلہ اللہ علی علم و ختم علی سمعہ و قلبہ و جعل علی بصرہ غشاوۃ فن یرہد ینہ من سعد اللہ و کیف تجاوزہؤلاء الملحدون الحدود و تعد الرسوم و خروا سباح الشریعۃ و المحقیقۃ فظنوا بذلک انہم علی ہدی من ربہم ولیسوا کذلک بل ہم علی اسواء الضلال و اقبح

لہ اخذ شہاب الدین بن حجر کی، امام: فتاویٰ حدیثیہ، ص ۹۹

<p>خارے اور جھوٹ بہتان میں مبتلا ہیں۔          اُن کے پیروکاروں کو گمراہ کرے اور          اُن جیسے عقیدے رکھنے والوں سے زمین کو          پاک کرے۔</p>	<p>الخصال و ابلغ المنطق والنحو          وانسہی الکذب و          البہتان فخذ اللہ متبعہم و طہر          الارض من امثالہم۔</p>
---	--

## خارجی و باہنی

ساتویں صدی میں اٹھا ہوا یہ خارجیہ کا فتنہ آخر کار علمائے اہلسنت شکر اللہ سبعم کی  
 ماسعی جلیلہ سے ختم ہو کر رہ گیا۔ علامہ ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن تیمیہ وغیرہ کی تصانیف ایک  
 حد تک ناپید ہو گئیں۔ بارہویں صدی میں یہ ناسور پھر چوٹی دفنہ اُبھرا آیا۔ نجد میں محمد بن عبد الوہاب  
 نامی ایک عالم نے خوارج کے مذہب کو ابن تیمیہ کی تصانیف سے حاصل رکے اُس کی تبلیغ  
 و اشاعت شروع کر دی۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اس سلسلے میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

”اتباع محمد بن عبد الوہاب نے مسلک ابن تیمیہ کو از سر نو زندگی بخشی۔ اس

تحریک کے بانی و مؤسس محمد بن عبد الوہاب سے جن کی وفات ۱۰۸۴ء

میں ہوئی۔ محمد بن عبد الوہاب تصانیف ابن تیمیہ سے مستفید ہو چکے تھے۔ انہوں

نے بنظرِ غائبان کتب کا مطالعہ کیا اور اُن کو فکر و نظر کی حدود سے نکال کر عمل کے

دائرہ میں داخل کیا۔ جہاں تک عقاید کا تعلق ہے انہوں نے عقاید ابن تیمیہ پر

ذرہ بھر اضافہ کیا اور اُن کو بچوں کا توں اپنا لیا۔ البتہ انہوں نے امام ابن تیمیہ

کی نسبت زیادہ تشدد سے کام لیا اور ایسے علی امور کو ترتیب دیا، جن سے

ابن تیمیہ نے تعرض نہیں کیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امور اُن کے عصر و مہر

میں مشہور نہ تھے۔“

۱۔ احمد شہاب الدین بن حجر مکی، محدث: فتاویٰ حدیثیہ، ص ۱۲۲

۲۔ غلام احمد صری: اسلامی مذاہب، ص ۲۸۸

پروفیسر محمد مسعود صاحب نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ابتدائی حالات یوں قلمبند کیے ہیں:

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی عیینہ کے ایک علمی گھرانے میں ۱۱۰۵ھ/۱۷۰۳ء

میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز

کیا اور سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے استغاثہ کے خلاف

آواز بلند کی نتیجہً معاصرین علماء اور خود اُن کے والد بزرگوار کی مخالفت کی

وجہ سے ابتدا میں ابن عبدالوہاب کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، لیکن

جب ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں اُن کا انتقال ہو گیا تو اس تحریک میں ذرا گرمی پیدا ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی موصوف نے تحریکِ وہابیت کا ابن تیمیہ سے تعلق اور دیگر امور کا یوں تاریخی

طور پر ذکر کیا ہے:

”تحریکِ وہابیت کے بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی تھے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے

کہ یہ تحریک، بانی تحریک کے والد بزرگوار کے نام پر مَعْنُون ہوئی جو اس

تحریک کے آغاز کے بعد سے مرتے دم تک اس کے مخالف رہے اور اسی

بیزاری کے عالم میں اُن کا انتقال ہوا۔ ابن عبدالوہاب، ابن تیمیہ سے

پوری طرح متاثر ہیں بلکہ اُن کیوں کہا جائے کہ جو چیز ابن تیمیہ نے نظری طور پر

پیش کی تھی ابن عبدالوہاب نے اس کو ایک عملی جامہ پہنایا تو بے جا نہ ہوگا۔

ابن تیمیہ اور فرقہ وہابیت کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے دائرہ معارف اسلامیہ

کے مقالہ نگار لکھتے ہیں: ہمیں معلوم ہے کہ وہابی فرقے کے بانی کا تعلق

دمشق کے حنبلی علماء سے تھا اور اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس نے اُن

کی کتابوں سے استفادہ کیا بالخصوص ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن القیم

الجوزی کی تعلیمات سے، اس لیے وہابی عقیدے کے اصول وہی ہیں جن

کے لیے یہ حنبلی عالم عمر بھر لڑتے رہے۔“ دوسری جگہ لکھتے ہیں: ”آپ (ابن تیمیہ)

نے محمد مسعود احمد، پروفیسر، مراعات مظہری، ص ۶۹

کی پُرچوش تصانیف کے نتیجے میں محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک اُبھری۔<sup>۱</sup> وہابیہ نے بھی اولین خوارج کی طرح معمولی باتوں پر بھی مسلمانوں کو اسلام سے خارج بتانا اور مشرک ٹھہرانا شروع کر دیا تھا، اس سلسلے میں پروفیسر ابو زہرہ مصری نے ان حضرات کی مخصوص ذہنیت کا بون تہزیہ کیا ہے :

وہابیہ کی رائے میں عبادت کا مقصد صرف یہی نہیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں چند ارکان ادا کیے جائیں جیسا کہ ابن تیمیہ کا خیال ہے، بخلاف ازیں اسلامی اخلاق و عادات کا اپنانا بھی ایک مسلمان کے لیے از بس ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمباکو نوشی کو حرام تصور کرتے اور اس میں تشدد سے کام لیتے تھے بکہ اس سے بڑھ کر عام وہابیہ، تمباکو نوشی اور مشرک میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ گویا وہ اُن خوارج کی طرح تھے جو مرتکب کبائر کی تکفیر کرتے تھے۔<sup>۲</sup>

اپنے ساختہ عقائد و نظریات کی صحت کا وہابیہ کو بھی اپنے پیشرو خوارج کی طرح ایسا ہی یقین تھا کہ ساری اُمت کو اسلام سے خارج قرار دینا آسان سمجھتے تھے لیکن اپنے مخصوص نظریات کو کسی مرحلے پر بھی قابل اصلاح ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ دوسروں کو تشدد کے ذریعے اپنے عقائد کی تکلیف دینا اُن کے مسلک کا اولین رکن تھا۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اس سلسلے میں یوں وضاحت کرتے ہیں :

اس فرقہ کے علما اپنے آزاد و افکار کو اپنی برصحت و ثواب و دُور از خطا تصور کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں دُوروں کے افکار اُن کی نگاہ میں مجبوظہ اغلاط اور ناقابلِ صحت ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قبۃ سازی اور اُن کے ارد گرد طواف کرنا صنم پرستی کے مترادف ہے۔ اُن کے یہ نظریات، افکارِ خوارج سے ہم آہنگ ہیں، جو اپنے مخالفین کی تکفیر کرتے اور اُن سے بُرو آزما

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ مظہری، ص ۶۸، ۶۹

۲۔ غلام احمد عری، اسلامی مذاہب، ص ۲۸۸

ہوتے تھے۔ جن دنوں وہا پر صومرا نشین تھے ان کی تبلیغ و دعوت سے چڑاں  
 خطرہ نہ تھا، جب سووی خاندان بلا و عرب میں برسرِ اقتدار ہوا تو ان کو دوسرے  
 لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آنے، جس سے خطرہ بڑھ گیا۔  
 وہا پر کو قبر شکنی میں بڑا مزہ آتا تھا اور اس شرمناک حرکت کو وہ دین کی اہم ترین خدمت  
 توحید کا تحفظ اور اپنا عظیم کارنامہ شمار کرتے تھے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری نے ان کے اس  
 مشغلے کا ذکر یوں کیا ہے:

”شہر ہو یا دیہات، جہاں ان لوگوں کا بس چلتا وہاں پہنچتے اور قبے گرا دیتے۔  
 اس کی حد یہ کہ بعض یورپین مصنفین ان کو ”معبد شکن“ کے نام سے پکارتے  
 ہیں۔ یہ لقب مبالغہ پر محمول ہے۔ اس لیے کہ قبہ جات کو معبد کی حیثیت  
 حاصل نہ تھی۔ غالباً یہ لوگ ان مساجد کو شمار کر دیتے تھے، جن میں قبے  
 ہوا کرتے تھے۔“

وہا پر نے اسی پر بس نہیں کر دی تھی۔ بلکہ صحابہ کرام اور دیگر بزرگان دین کے مزارات کو  
 شمار کرنے کی خدمت بھی انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے انجام دی۔ شہناز اللہ کی  
 اس طرح پامالی کو وہ اپنی ساختہ توحید کی معجزہ کا جزو اعظم سمجھتے تھے اور اپنے اس  
 کارنامے پر وہ نازاں تھے کہ دنیا سے کفر و شرک کا نام و نشان مٹا رہے ہیں حالانکہ جس  
 بلا سے وہ دوسروں کو بچانا چاہتے تھے وہ خود ان پر ہی مسلط تھی لیکن خوارج کی فطرت شرع  
 سے ہی یہ چلی آرہی تھی کہ وہ دوسروں کی آنکھوں میں تنگے تلاش کرنے کی کھوج میں لگے  
 رہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے شہتیر دیکھنے سے وہ ہمیشہ ہی قاصر رہے اور تا حال قاصر  
 ہیں۔ مثلاً:

”وہا پر کے تشدد کی یہ (قبر شکنی) آخری حد تک نہ تھی بلکہ اس سے

لے غلام احمد صریحاً پروفیسر اسلامی مذاہب، ص ۲۹۰، ۲۹۱

۲۹۰، ۲۸۹ ص ایضاً

ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے مقبروں کو مسمار کر دیا۔ جب دیارِ عرب میں وہ برسرِ اقتدار آئے تو صحابہ کے مقبرے گرا کر ان کو زمین کے برابر کر دیا۔ اب صرف اشارات باقی رہ گئے جن کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں صحابی کی قبر ہے۔ قبروں کو زمین سے ہموار کرنے کے بعد انھوں نے اس پابندی کے ساتھ ان کی زیارت کی اجازت دے دی کہ زائر صرف استلامِ علیکم کے اور بس۔

دہائیوں کی قبہ شکنی اور مقابر کی پامالی کے سلسلے میں پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے بعض مورخین کے حوالے سے، مورخانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

”ابن عبد الوہاب اور ان کے تابعین نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے جان و مال کو اپنے لیے حلال کیا بلکہ مرحومین صحابہ اور صلحائے امت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قبوں کو بے دریغ مسمار کیا۔ چنانچہ ابن عبد الوہاب نے ان قبوں کو منہدم کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا جو مسلمانوں کی عقیدت و محبت کے نشان تھے۔ مثلاً، مقامِ جلیلیہ پر حضرت زید بن خطاب (جو جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے قبۃ شریف پر اپنے ہاتھ سے کدال مارا اور دھڑا دھڑا کر کے زمین کے ہموار کر دیا۔“

اسی طرح جب ۸ محرم ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کو سعود بن عبدالعزیز فاتحاً انداز سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو اہل نواحی قبوں اور شریک مشاہد (۹) کے انہدام پر مامور کیے گئے۔ سعود نے بیس دن تک مکرمہ قیام کیا اور اس دوران مسلمان (تابعین ابن عبد الوہاب) قبوں کو گرتے رہے تاکہ مکہ مکرمہ کے تمام مشاہد اور قبۃ برابر کر دیے گئے۔“

سید غلام احمد حری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۹۰



کہنے کے خواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیے گئے، قبتے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے، بلکہ ایک دل ہلا دینے والی خبر ولفرڈ بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام میں ملتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے: "ہر جگہ قبتے مسمار کر دیے گئے اور سرزمین حجاز کے مقدس مقامات اُس (ابن عبدالوہاب) کے متبعین کے قبضے میں آ گئے تو صوفیہ و ادویاء کے قبتے، حجاج کرام جن کی صدیوں سے عزت و احترام کرتے چلے آئے تھے زمین کے برابر کر دیے گئے۔۔۔۔۔ ان حرکتوں سے عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور وہابیوں کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا۔"

خارج کی فطرت، زبان رسالت سے "یقتلون اهل الاسلام ویدعون اهل الادیان" بیان ہوئی تھی کہ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کیا کریں گے۔ وہابیہ نے بھی اپنی خارجیت کا مکمل ثبوت پیش کرتے ہوئے مسلم کشی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور کبھی اُن مانگے جو اندروں کی تگوار غیر مسلموں کے خلاف نہ اٹھنے پائی۔ تاریخ اقوام کے اعمال کا مرقع ہے، زمانے سے بڑھ کر کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ ہر شخص اس ارشاد نبوی اور عمل وہابیہ کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتا تو کل بروز قیامت خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ خیر و ہاب یہ سب مسلمانوں کی جان و مال اور ننگ و ناموس سے خوب کھیل رہے تھے اور اُس کی تاویل یوں بیان کیا کرتے تھے:

"جب عالم و عامی نے ابن عبدالوہاب پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں اور اُن کا مال و دولت لوٹ رہے ہیں تو اُن کے متبعین نے جواب دیا کہ حاشا وکلا، ہم مسلمانوں کا قتل عام نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم تو اُن مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں جو اعمال و انکار کی وجہ سے مشرک و کافر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس طرح صفائی پیش کی گئی۔۔۔۔۔ شیخ رحمہ اللہ نے

صرف اُن صنم پرستوں کی تکفیر کی جو اولیاء اور نیکو کار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں جنہوں نے حجت کے ثبوت اور طریقِ حق کی وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب اور اللہ کا شریک ٹھہرایا اور پھر انہوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب شیخ نے اُن سے قتال کیا اور اُن کا خون بہایا اور اُن کا مال لوٹا، اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ بہنے کے قابل ہیں؟ شاید لاکھوں میں محدود سے چند ہوں تو ہوں؟

وہابیہ چونکہ اپنے سوا جملہ مدعیانِ اسلام کو کافر و مشرک کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اصطلاحی مشرکوں کا خون بڑے ذوق و شوق سے بہایا کرتے تھے۔ چنانچہ الدرر السنیہ اور رد المحتار کے حوالے سے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ان حضرات کی فطرت اور نخلتِ مسلم کشی کو یوں لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے:

”ابن عبد الوہاب اپنے متبعین کے علاوہ اس آسمان کی نیلی چھت کے نیچے اُن تمام مسلمانوں کو علی الاطلاق کافر و مشرک سمجھتے تھے جو اُن کی اطاعت و پیروی سے گریز کرتے تھے۔ اس لیے اُن کا خون بہانے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ بات نبی کو زبیب دیتی ہے مگر کسی مصلح کی یہ کیفیت کم علمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔“

وہابیہ کی تلوار مسلمانوں کے خلاف کیوں اٹھتی رہی؟ اس کا سب سے بہتر جواب تو خود فرامینِ رسالت میں موجود ہے لیکن اس المناک طرزِ عمل پر ایک فکر انگیز اور اچھوتا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

”تاریخِ اسلام میں اس قسم کے بہت سے دوح فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا ہے مگر یہاں

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ منظہری، ص ۳۷۔

۲۔ ایضاً: ص ۴۰۔

ذکر اِس شخص کا ہے جو پیغمبرِ انبیا کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرِ انہ صفات کو تلاش کیا جائے اور اسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے خلاف آمادہٴ پیکار رہے، مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف؛

محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کے متعلق دعویٰ تو یہی تھا کہ شرک و بدعت کے خلاف لیکن حقیقت کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ وہابیوں کا طرزِ عمل اصلاح کی بجائے برعکس ثبوت پیش کرتا ہے۔ اصلاح کی جگہ فساد کیا، مسلمانوں کو ان سے کوئی تقویت پہنچنے کی بجائے افتراق و انتشار ملا۔ مسلمانوں کا خون ان کے ہاتھوں بہا، ننگ و ناموس اور مال و دولت پر دست درازی ہوئی۔ غرضیکہ اس گروہ کا وجود گویا ڈاکوؤں اور ٹیروں کا جگمگا ہوا کر رہ گیا جس سے مسلمانانِ عالم کے جذبات ان لوگوں کے خلاف بھڑک اُٹھے اور یہ قدرتی و فطرتی بات تھی۔ وہابیوں نے قوت حاصل کرنے کی ہر ممکن اور گھٹیا تدبیر اختیار کرتے وقت بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ مثلاً:

ابن عبدالوہاب نے جن مسائل کے متعلق آواز اٹھائی ان میں سے بعض یہ ہیں۔ امکانِ کذب، امکانِ نظیر، استغاثہ، استعانت، علمِ غیب، الحالت بغیر اللہ، زیارت القبور وغیرہ۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ تحریک مروجہ بدعت اور اعمالِ شرکیہ کے خلاف ایک مخلصانہ کوشش ہے مگر بعض تاریخی واقعات کی روشنی میں باطن، ظاہر سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً جب ابن عبدالوہاب نے امیرِ عربینہ کو اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو ان الفاظ میں اَنی ارجوان انت تمت بنصر لالیہ الا اللہ ان یظہرک اللہ تعالیٰ وتمتک نجد او عرابہا۔ اگر تم لا الہ الا اللہ کی ادا کے لیے

۱۔ محمد مسور احمد، پروفیسر: مواظظ مظہری، ص ۶۳-۶۴

آبادہ ہو جاؤ تو میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غالب کرے گا اور نجد اور اہل نجد کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ کارِ خیر کی طرف بلا یا جبار ہے تو یہ لالچ کیوں وی جا رہی ہے کہ نجد اور اہل نجد کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہوگی؟ حالانکہ اُس وقت ان علاقوں پر کوئی مشرک و کافر حکمران نہ تھا۔ یہ انگ بات ہے کہ ابن عبد الوہاب اپنے مخالفین کو کافر اور واجب القتل تصور کرتے تھے۔ اعلیٰ کلمۃ الحق کے لیے تخریص و ترغیب کا یہ انداز مومنانہ نہیں۔

جب محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء) نے درعیہ کے امیر یعنی محمد مسعود کو اپنی تحریک کا ساتھ دینے کی دعوت دی تو اُس نے دو شرطیں عائد کی تھیں، دوسری یہ تھی کہ میں اہل درعیہ سے فصل کے وقت کچھ مقررہ محصول وصول کیا کرتا ہوں، آپ اس سے نہیں روکیں گے۔ علمبردارِ توحید و سنت اور ماحیِ شرک و بدعت ہونے کا دعویٰ کرنے والے محمد بن عبد الوہاب نجدی نے اس کا جواب دیا وہ تبصرہ کے ساتھ پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب سے سنیے:

”رہی دوسری شرط، سوائے اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔“  
 کس پر فتوحات، کیسی غنیمت، انہیں مسلمانوں پر فتوحات اور انہیں مسلمانوں کی دولت جن کو مشرکین و کفار کے زمرے میں شمار کر کے ان کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ ستم رسیدہ مسلمانوں کی متاع عزیز کو غنیمت سمجھ کر کھانا اور کھلانا کیسی ستم ظریفی ہے، یہی نہیں بلکہ جب ابن عبد الوہاب کو ذرا قوت حاصل ہو گئی تو پھر رنگ کچھ اور ہو گیا۔ چنانچہ جب حاکم ریاض، وہام بن دواس نے ابن عبد الوہاب کے پیروؤں کے معتقدات سے

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ مظہری، ص ۷۹، ۷۰۔

تنگ آکر ان پر سختی کی تو ابن عبد الوہاب نے فوراً جدال و قتال کا حکم صادر فرمایا، بس پھر کیا تھا، مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے، لہ

تحریکِ وہابیت کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے موصوف کیا پتے کی بات کہ گئے ہیں، "ضمناً ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتا چلوں اور وہ یہ کہ تحریکِ وہابیت نے بعض مسلمانوں کو اکابرینِ ملت کی جناب میں بہت بیباک بنا دیا ہے جیسا کہ تعجبِ اس بات پر ہے کہ اکابرین اور صلحائے امت پر اعتراضات اور تنقیدات ان حضرات کی جانب سے ہوتی ہے جن کی نظر سطحیت کی غماز سے اور اعتراض اس انداز سے کرتے ہیں گویا نظر ہے تو بس انہیں کے پاس پہلے

محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) کے بارے میں اہلسنت و جماعت کے

ماریہ ناز فقیہ علامہ محمد امین ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) رحمتہ اللہ علیہ یوں رقمطراز ہیں:

جیسا کہ ہمارے زمانے میں (ابن) عبد الوہاب کے قبیلوں میں واقع ہوا، جو نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر قابض ہوئے۔ اپنے آپ کو خلیفہ مذہب کا پیروکار ظاہر کرتے تھے، حالانکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلمان بس وہی ہیں اور ان کے عقاید سے اختلاف رکھنے والے سب مشرک ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اہلسنت و جماعت اور ان کے علماء کو قتل کرنا مباح ٹھہرایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طاقت توڑ دی، مسلمانوں کے لشکروں کو

"كما وقع في زماننا في اتباع  
تبرر الوهاب الذين خرجوا من  
نجد وتغلبوا على الحرمين  
وكانوا يفتحلون مذهب المناطقة  
لكنهم اعتقدوا انهم هم  
المسلمون وان من خالف  
اعتقادهم مشركون واستباحوا  
بذلك قتل اهل السنة وقتل  
علماءهم حتى كسر الله مشركتهم  
وخرب بلادهم وظفر بهم عساكر

لہ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ مظہری، ص ۷۱

لہ ایضاً: ص ۸

السلین عام ثلاث وثلثین ومائین اُن پر فتح دی یعنی ۱۲۳۳ھ میں۔

والف لہ

دوبارے کے بارے میں دیوبندیوں کے بہت بڑے عالم، برائین قاطع جیسی کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبٹھوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء) نے سوال و جواب کے طور پر اپنا اور اپنی جماعت کا موقف یوں بیان کیا ہے:

”سوال سے، محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مالی و آبرو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اور کیا سلف اور اہل قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟“

جواب، ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے اور خوارج ایک جماعت ہے شوکت والی، جنہوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے، کہ امام کو باطل یعنی کفر یا ایسی معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں، اُن کا حکم باغیوں کا ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم اُن کی تکفیر صرف اِس نیلے نہیں کرتے کہ یہ فعل تاویل سے ہے، اگرچہ باطل ہی ہے۔ اور علامہ شامی نے اِس کے ماسیہ میں فرمایا ہے، جیسا کہ (مثل خوارج) ہمارے زمانے میں عبدالوہاب کے تابعین سے سرزد ہوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوئے اپنے کو حنبلی مذہب بتلاتے تھے لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدہ کے خلاف ہو، وہ مشرک ہے۔ اور اسی بنا پر اُنہوں نے اہلسنت اور علیائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے

لے محمد امین ابن عابدین شامی، فقہہ: ردالمحتار، جلد سوم، ص ۳۱۹

اُن کی شریعت توڑ دی۔ ۱

دیوبندی جماعت کے دوسرے جید عالم، دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۲۰۰ھ / ۱۹۵۷ء) نے دیوبندیوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس انداز سے کیا ہے،

صاحبو! محمد بن عبد الوہاب نجدی ابتداءً تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہوا اور چونکہ یہ خیالاتِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اُس نے اہل سنت والجماعت سے قتل و قتال کیا، اُن کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا، اُن کے قتل کرنے کو باعثِ ثواب و رحمت شمار کرتا رہا۔ اہل حرمین کو خصوصاً اور اہل حجاز کو عموماً اُس نے تکلیف شادہ پہنچائی۔ سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے۔ بہت سے لوگوں کو بوجہ اُس کی تکلیفِ شدیدہ کے دینہ منورہ اور مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے آؤر اُس کی لڑائی کے باعث شہید ہو گئے۔ الحاصل وہ ایک ظالم و باغی، خونخوار، فاسق شخص تھا۔ ۲

دیوبندیوں کے مشہور فاضل، علامہ نذیر شاہ کشمیری (المتوفی ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء) جو

مولوی حسین احمد ٹانڈوی سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے صدر بھی تھے، اُنہوں نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کے بارے میں یوں لکھا ہے:

امام محمد بن عبد الوہاب - محمد بن عبد الوہاب نجدی جو تھا، وہ تو ایک  
النجدی فانہ کان رجلاً - کتاہ فہم اور کم علم انسان تھا، اسی لیے  
بلید اقلیل العرفان یسارنا - کفر کا حکم لگانے میں بڑا چست و چالاکی تھا  
الی الحکم بان کفر۔ ۳

۱۔ خلیل احمد انیسٹوی، مولوی، المہند علی المہند اردو، مطبوعہ کراچی، ۲۲۰۲۱  
۲۔ ٹانڈوی صاحب نے توجہ سے کام نہیں لیا، یہاں اہل سنت والجماعت یا اہلسنت وجماعت لکھنا چاہیے۔  
۳۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، الشہاب النقیب، ص ۲۲  
۴۔ نذیر شاہ کشمیری، مولوی، فیض الباری، ج ۱، ص ۱۷۱

مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تکفیر بازی اور مسلمانوں کے مال و جان کا دشمن ہونے کے بارے میں مزید یوں وضاحت بھی کی ہے:

”محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہل عالم و تمام مسلمانانِ ديار مشرک و کافر ہیں اور ان سے قتل و قتال کرنا، ان کے اموال کو ان سے چھین لینا سلال اور جائز بلکہ واجب ہے۔“

دہلیوں نے جہاں وہ قابض ہوئے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ عملی طور پر کر کے دکھا دیا تھا۔ آج بھی ان کے اس طرزِ عمل کو سراہنے والے بگڑے ہوئے اور ریغار مرتبانے والے موجود ہیں لیکن ایسے حضرات تھوڑی دیر کے لیے اگر تعصب کی عینک کو اتار کر دیکھیں کہ جن مسلمانوں کو یہ حضرات کافر و مشرک قرار دے کر قتل کرتے رہے اور آج تک شجرِ وہابیت کی جملہ شاخیں مشرک و کافر ہی قرار دے رہی ہیں ان کے ان اصطلاحی مشرکوں کا وجود نہ ہوتا تو ہندو پاک کے مٹھی بھرنا بیوں کو تو ہندو شروع میں ہی کچے چبا گئے ہوتے اور نجدی دہلیوں کی تو عیسائی دنیا کے حصے میں ایک ایک بوٹی بھی نہ آتی۔ مسلمانوں کے دم قدم سے قائم رہ کر انھیں کافر و مشرک بتانا اور بس چلے تو ان کے خون سے ہولی کھیل لینا، محسن کشی کی المناک مثال ہے یا نہیں؟

اس سے قطع نظر، وہابی حضرات کو سوچنا چاہیے تھا کہ علمائے اہلسنت نے وہابیہ کے متعلق جو کچھ آج تک کہا، زبان اور قلم سے کہا ہے، اگر مسلمانانِ عالم بھی وہابیوں کو تیغ و تبر کے ساتھ اپنے مذہب کی دعوت دینا شروع کر دیتے یا اب ایسا کرنے لگیں تو نتیجہ کیا سامنے آئے گا؟ ہتھیار تو غیر مسلحوں کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس کی وہابیہ کو اپنے روزِ اول سے کبھی توفیق ملی ہی نہیں، رہے مدعیانِ اسلام کے باہمی اختلافات تو انھیں خلوصِ دل کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے۔

لے حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۲۳



## خارجی اسماعیلی

یہی خارجی تحریک نجد سے چل کر متحدہ ہندوستان میں وارد ہوئی۔ کسے خبر تھی کہ دہلی کا جو خاندان دین برحق کی خدمت میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہا ہے، اسلام میں تخریب اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کا مشغلہ بھی اسی خاندان کا ایک فرد اختیار کرے گا اور پانچ ہند میں تخریب کاری کا ایسا پودا لگا جائے گا جس کی شاخیں پورے ملک میں پھیل جائیں گی اور بھولے بھالے مسلمان ایسے چکر میں پھنس کر رہ جائیں گے کہ اصل اور فعل میں تیز کرنا بھی مشکل ہو کر رہ جائے گا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے مسلک کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کی وہابیت و خارجیت سے کوئی مماثلت ہے یا نہیں؟ مرزا حیرت دہلوی اس سلسلے میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

”وہ پیارا شہید (محمد اسماعیل دہلوی) تھا جس نے ہندوستان میں (ابن) عبدالوہاب کی طرح شریعت محمدی کا ٹھنڈا خوشگوار شربت ہندوستانی مسلمانوں کو پلایا“ لے

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے نجدی اور نجدی وہابیت کے تعلق پر یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

”ہندوستان میں ابن عبدالوہاب کے عقاید کی اشاعت بعض حضرات کے ذریعے سنہ ہجری ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۱ء میں مولانا اسماعیل دہلوی (م ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور مولانا سید احمد بریلوی (م ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے اہم کردار ادا کیا۔ مولانا سید احمد بریلوی نے تحریک وہابیت کے قریبی ذمہ داروں (۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۱ء) میں سفرِ حجاز بھی کیا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ خیالات و جذبات لے کر آئے ہوں گے“ لے

لے حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۴۶

لے محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ منظری، ص ۸۲

کچھ آگے چل کر مصوف نے اسی تعلق کی یوں وضاحت فرمائی ہے:

”ابن عبد الوہاب کی تحریک اور ان دونوں حضرات کی سیاسی اور مذہبی کوششوں میں کئی مناسبتیں نظر آتی ہیں۔ ابن عبد الوہاب پر یہ الزام تھا کہ وہ بلاوجہ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرتے ہیں اور ان کے مال و قناع کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات مولوی سید احمد اور مولانا اسماعیل کی زندگی میں بھی نظر آئیں گے“ ۱

ڈاکٹر صاحب نے آگے چند واقعات ان حضرات کی مسلم کشی کے پیش کیے ہیں لیکن اس موضوع پر ہم نے آگے تفصیلی بحث کرنی ہے لہذا انہیں یہاں پیش نہیں کرتے۔ اس کے بعد مصوف نے دونوں تحریکوں کے عقائد کے بارے میں یوں لکھا ہے:

”جہاں تک ان حضرات (سید احمد و اسماعیل دہلوی صاحبان) کے معتقدا کا تعلق ہے وہ سختی و درشتی میں ابن عبد الوہاب سے کسی طرح کم نہیں۔“ ۲

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے جب اپنے اکابر کے مسک اور مسک اہل سنت و جماعت سے بغاوت کی تو اپنا علیحدہ جتھا بنانے میں مصروف ہو گئے اور اس کا نام ”محمدی گروہ“ رکھا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور وہابی مورخ اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سوانح نگار، قرزا حیرت دہلوی یوں لکھتے ہیں:

”پیارے شہید نے ہزاروں بگڑ لاکھوں کی زبان سے یہ نکلوا دیا کہ ہم محمدی ہیں۔ چاروں طرف سے آدازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اس ضلع میں اتنے محمدی آباد ہیں اور اس ضلع میں اتنی تعداد مسلمانوں کی ہے۔“ ۳

یہی نہیں بلکہ مولانا محمد اسماعیل دہلوی کے پیر یعنی سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا تو مسلمانوں کے جملہ روحانی سلسلوں سے منقطع

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ منظرہ، ص ۸۲

۲۔ ایضاً: ص ۸۳

۳۔ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۸

ہو کر اپنا سلسلہ نیا "محمدی طریقہ" کھڑا کیا۔ اُس کے قواعد اور آداب و اشغال بھی ایسے وضع کیے کہ طریقت کا ایک ابجد خوان بھی اس بازگری کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "طریقہ محمدی" کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

"اُس زمانہ میں تصوف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ سید احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر، پھر محمدی طریقے پر، جو انھوں نے خود مقرر کیا تھا، بیعت لیا کرتے تھے۔ وہ اس کی تشریح یوں کیا کرتے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں: ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کیلئے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے اور مذکورہ صوفی طریقے ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ زندگی میں صحیح اوددینی کردار بجالانا، اور محمدی طریقہ اسی کی نگہداشت کرتا ہے۔"

"طریقہ محمدی" کی موصوف نے آگے تشریح کرتے ہوئے اُسے جو امتیازی مقام بخشا ہے وہ ملاحظہ فرمائیے:

"اس انوکھے طریقہ بیعت کی تشریح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگر ابتدا کی سرستی و سرشاری سے معزاً ہو چکے تھے پھر بھی عام و ماخوں میں اُن کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ انہیں طریقوں پر بیعت کے خواہتے تھے۔ اُن کا ایک بیک ترکِ کامل ایک غیر عملی یا اُن ہونی سی بات ہوتی۔ طریق محمدی میں جو صحیح طرز معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا، اُس کی تفصیلات خود صراحتاً مستقیم اور مختلف و بابی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ اُن میں سے دو

ڈاکٹر صاحب نے طریقے چار بتائے لیکن گناہے تین۔ معلوم ہوتا ہے وہ سلسلہ عالیہ قادریہ سے کچھ زیادہ ہی ناراض تھے۔

ڈاکٹر محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۰

رسول بہت نمایاں ہیں۔ باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارتاً بھی کسی مخلوق سے منسوب نہیں کی جاسکتی ہیں، سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی زندگی میں عملی اخلاق پر کاربند رہنا۔

جب مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنا محمدی گروہ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے جدا بنانا شروع کر دیا۔ اپنے خاندانی بزرگوں کے مسلک کو بھی خیر باد کہہ دیا بلکہ اُس طریقے پر چلنے والوں کو ہر مقام پر مشرک اور بدعتی کہنا شروع کر دیا تو مسلمانوں کے جذبات کا بھر پور کنا اور لڑائی جھگڑنے تک نوبت آجاتا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ متعدد مقامات پر تصادم بھی ہوئے۔ اس حقیقت کو مرزا حیرت دہلوی نے اُلٹ پھیر کے ساتھ کئیوں بیان کیا ہے:

”جب بدعتیوں کو پلے درپلے یہ فاش شکستیں ملیں تو اب اُنہوں نے مخالفت کا دوسرا پہلو بدلا اور وہ پہلو یہ تھا کہ ہر گلی کے نکتہ پر ایک ملانا کھڑا کر دیا کہ وہ مولانا شہید کو کا فر بتائے اور گمراہ کے۔ غرض سوائے بتوں کے اور کچھ نہ کہے۔ جب اس قسم کے دغظ ہونے لگے تو دو چار جگہ لاسھی بھی چل گئی، کیونکہ اب محمدیوں کا گروہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔“

انصاف والے ذرا اس حوالے کو غور سے پڑھیں۔ وہابی حضرات خود کو قدیمی جماعت بتاتے اور ولی اللہی تعلیمات کا علمبردار ٹھہراتے ہوئے نہیں تھکتے لیکن یہ محمدی گروہ کس نے بنایا تھا؟ جدید گروہ اور اہلسنت سے جدا ہونے والا گروہ کس کا ہے؟ غور فرمائیے اہلسنت و جماعت سے کٹ کر علیحدہ اپنا گروہ بنانے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی ہیں یا مولانا احمد رضا خاں بریلوی، جو ان واقعات کے تقریباً چالیس سال بعد پیدا ہوئے ہیں۔

بہر حال جب لڑائی جھگڑنے تک نوبت پہنچے لگی تو بانی و بابت نے بد معاشوں اور غنڈوں کا اپنی حفاظت کے لیے ایک محافظ دستہ تیار کیا۔ ہادی اکبر، نبی آخر الزماں صلی اللہ

لے محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۱۰۰

لے حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کائنات کے سامنے روشن ترین مثال ہے۔ جب آپ نے مجھو بیٹے انسانوں کو راہِ راست کی طرف بلانا شروع کیا تو اکثر مخاطبین دشمنی پر نکل گئے لیکن آپ نے مخالفوں کی پروا کیے بغیر، اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر حق و صداقت کی تبلیغ جاری رکھی اور ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں شب و روز منہمک رہے جو بجا طور پر کُوری اُمت کے پشوراؤں کے بھی پشورا کھلانے کے حق دار ہیں۔ بعد میں بزرگوں، مصلحوں اور ریفاہ مروں نے ہمیشہ نیک لوگوں کی دین کے پھیلائے میں مدد لی لیکن معلوم نہیں مولوی محمد اسماعیل دہلوی کس قسم کے مصلحتی تھے اور کیسی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس کے پیش نظر اُنہوں نے خدا پر توکل اور نیک بندوں کی اعانت حاصل کرنے کے بجائے معاشرے کے گھٹیا افراد کی خدمات حاصل کیں۔ اسی سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی، حقیقت کے چہرے سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

مولانا شہید نے خطہ کے وزن کو پہچان لیا تھا اور گواہی عائد و ایمان شہر اس طرف رجوع نہ ہوئے تھے اور نہ ابھی مولوی فضل حق صاحب کی مجالغانہ کارروائی شروع ہوئی تھی، پھر بھی عقلمندی یہ تھی کہ ہر طرح سے بندوبست کیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ مخالف غافل پاک کے کوئی جسمانی مضرت پہنچائیں۔ آپ نے پہلے چند بڑے بڑے بد معاشوں کے سرغنوں کو اپنی جادو بھری تقریر سنا کے نہ یہ کیا اہم اُنہیں اپنا ایسا معتقد بنایا کہ وہ اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مسلت اِس کی مقتضی تھی کہ یہ کارروائی کی جائے کیونکہ دن بدن مخالفت کی آگ بھڑکتی جاتی تھی۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی جگہ جگہ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے لگے اُن کے مذہبی عقائد کو کا فرانہ بتانے لگے تو چاروں طرف سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) کے پاس شکایتیں پہنچی شروع ہو گئیں کہ حضرت! آپ کے جتنی آج یوں کہہ رہے ہیں اور کل اُنہوں نے یہ کہا تھا۔ مرزا حیرت دہلوی نے شکایات

لحیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۵۸

کے معاملے کو اس عجیب انداز میں سپردِ قلم کیا ہے،  
 بڑے بڑے رئیس جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے معتقدین میں سے تھے،  
 خواہ شیعہ ہوں یا سنی، آؤ کے سمجھانے لگے آپ اپنے بھتیجے کو روکیے،  
 یہ بڑی بدنامی کی بات ہے۔ شاہ صاحب سب کو یہی جواب دیتے تھے جب تک  
 اسماعیل سے خلافِ شریعت عمل سرزد نہ ہو، میں کیونکر اسے روک سکتا ہوں۔  
 وہ کوئی فساد انگیز تقریر نہیں کرتا کہ اس پر میں معترض ہوں۔ آخر کوئی معقول  
 وجہ بھی تو ہونی چاہیے جس سے میں اس کی کارروائی میں دست اندازی کر سکوں  
 جب اعیان شہر شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ جواب پاتے تھے تو اپنا سا  
 منہ لے کے چلے جاتے۔

انسان جب کسی کی ناجائز عقیدت یا نفرت کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی خوبیاں یا  
 خامیاں بیان کرتے وقت انصاف کے تقاضوں کو مد نظر رکھنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور  
 بعض اوقات ایسے ایسے بیانات دینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو بڑے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔  
 مرزا حیرت دہلوی کے دل و دماغ میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی عقیدت و محبت کے جذبات  
 کچھ اس طرح رچے بچے معلوم جو رستہ ہیں کہ انہوں نے اپنے اس بیان کے سامان  
 تضحیک بننے کی بھی مطلقاً پروا نہ کی، بس صفائی پیش کرنا تھی، عقیدت کا اظہار کرنا تھا۔  
 دوسری بات ہے کہ ایسے بیانات سے مرزا صاحب خود بھی ایک تماشا بن کر رہ گئے۔ مثلاً  
 چند متعلقہ باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ جب بڑے بڑے رئیس شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایتیں کر رہے تھے  
 اور وہ بھی ایسے حضرات جو حضرت شاہ صاحب کے معتقد تھے، اگر مولوی محمد اسماعیل  
 دہلوی کا مسک حضرت شاہ صاحب کے مسک سے ہٹا ہوا نہیں تھا تو ان سے  
 شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

۲۔ اگر موصوف کے خیالات میں کوئی بات خلاف شرع اور فساد انگیز نہیں تھی تو شکایت کرنے والے بذنامی کی بات خود شاہ صاحب کے روبرو کس چیز کو بتا رہے تھے؟

۳۔ اگر اعتراض کرنے کی بقول مرزا صاحب کوئی معقول وجہ نہیں تھی تو کیا شکایت کرنیوالوں کی دماغ خراب ہو گیا تھا کہ شکایت کرنے والے آتے ہی رہتے اور اپنا سامنڈلے کر چلے جاتے۔ آخر آنے کی وجہ؟

۴۔ کیا شکایتیں صرف رڈ سا ہی کر رہے تھے۔ اُن کی تصنیف "حیاتِ طیبہ" بھی یہی بتا رہی کہ عوام و خواص یعنی اُن پڑھ مسلمان سے لے کر علمائے کرام تک سب بلداٹھے تھے اور شاہ صاحب جیسے نابغہ عصر سے شکایتیں کر رہے تھے کہ حضرت کیا یہ خاندان اب دینِ برحق کی خدمت سے اکتا گیا ہے جو تخریبِ دین و اضلالِ مسلمین کا کام بھی خود ہی سنبھال لیا۔ مرزا صاحب یہاں شکایت کرنے والے صرف رئیس حضرات کو بتا رہے ہیں گویا باقی سب خیریت تھی۔

۵۔ علمائے کرام کی جگہ پڑے پڑے رئیس کو کہ مرزا صاحب شاید یہی تاثر دینا چاہتے ہونگے کہ مذہبی لحاظ سے اُن کے محبوب رہنما کے خیالات و نظریات بالکل درست، خاندانی مسلک کے مطابق اور جمہور اہلسنت کی آواز تھے، بس رئیسوں کو کچھ شکایتیں، بخشش اُن کی اصلاحی تقریروں سے ہو گئی تھیں لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اسی کتاب کے متعدد صفحات اُن کے اس بیان کی تکذیب و تردید کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں فریقِ ثانی کے متعدد علمائے کرام نے ان شکایتوں کا تذکرہ جس انداز میں کیا اور حضرت شاہ صاحب نے جو جواب مرحمت فرمایا، اگر تنقید کی نظر سے غیر جانب دار ہو کر دیکھا جائے تو اُن کے بیانات حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً قاضی فضل احمد لدھیانوی نے فریادِ مسلمین کے حوالے سے یہ واقعوں بیان کیا ہے:

آنحضرتؐ دنوں ایک کتاب شیخ (ابن) عبد الوہاب نجدی کی تصنیفات کا انتخاب  
میں سے دہلی میں آئی۔ چونکہ عبد الوہاب مسطور ملک عرب کا باشندہ زبانِ دان تھا

مولوی اسمعیل ان کی فصاحت و بلاغت پر فریفتہ ہو گئے۔ اُس کے کچھ مسائل انتخاب و اخذ کر کے علمائے دہلی حنفی مذہب سے چھٹ چھاڑ کر تی شروع کر دی اُنھوں نے اس کو خور و سال، خام خیال سمجھ کر ان سے بحث نہ کی مگر مولانا عبدالعزیز (رحمۃ اللہ علیہ) سے ان کی بے اعتدالی کے شاک کی ہوئے مولانا موصوف نے کچھ رنجیدہ خاطر ہو کر مولوی اسمعیل کو پیغام بھیجا کہ میری طرف سے کو اُس لڑکے نامراد کو جو کتاب مجھ سے آئی ہے، میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے۔ اُس کے عقائد صحیح نہیں بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں آج کل بیمار ہوں اگر صحت ہو گئی تو میں اُس کی تڑپ دیکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم ابھی نوجوان نیچے ہو، تاحق شور و شر برپا نہ کرو۔

مذکورہ بالا عبارت لے کر کئی غلط فہمیوں کو دور کر دیا اور صورتِ حال کا اُس کی اصل شکل میں اظہار کر دیا۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) نے اسی خاندانی مسلک سے اختلاف کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:

اِس کے متعلق مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب جواب دیا تھا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے ہر باتناہین کے متعلق کہا تھا کہ حضرت آئین بالہر سنت ہے اور یہ سنت مُردہ ہو چکی ہے اِس لیے اِس کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شاہ عبد القادر صاحب نے فرمایا کہ یہ حدیث اِس سنت کے باب میں ہے، جس کے مقابل بدعت ہو اور جہاں سنت کے مقابل سنت ہو وہاں یہ نہیں اور آئین بالہر بھی سنت ہے تو اِس کا وجود بھی سنت کی حیات ہے۔ مولانا شہید نے کچھ جواب نہیں دیا۔

یہی مولوی اشرف علی تھانوی ایک واقعہ اور بیان کرتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے

لے فضل احمد قاسمی : انوار آفتاب صداقت ج ۱ ص ۵۱۶

انسانات ایومیہ ، ج ۲ ، ص ۱۶۰



کہ ان بزرگوں کی زندگی میں اُن کی پروا کیے بغیر مولوی محمد اسمعیل نے وہاں بیت کی کسی قدر ترویج و اشاعت جاری کر دی تھی:

”شاہ عبدالقادر صاحب نے مولوی محمد یعقوب کی معرفت مولوی اسمعیل صاحب سے کہہ دیا تھا کہ تم رفع یدین چھوڑ دو، اس سے خواہ مخواہ فتنہ ہو گا۔ جب مولوی محمد یعقوب صاحب نے مولوی محمد اسمعیل صاحب سے کہا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو پھر اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے ”من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر ما تہ شہید“ کیونکہ جو کوئی سنت متروکہ کو اختیار کرے گا عوام میں ضرور شورش ہوگی۔ مولوی محمد یعقوب صاحب نے عبدالقادر صاحب سے اُس کا جواب بیان کیا۔ اُس کو سُن کر شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا: بابا ہم تو سمجھتے تھے کہ اسمعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں سمجھتا۔ یہ حکم تو اُس وقت ہے جبکہ سنت کے بمقابلہ خلافتِ سنت ہو اور ماہنجن فیہ میں سنت کا مقابل خلافتِ سنت نہیں ہو سکتی۔“

پروفیسر محمد مسعود صاحب نے ایسے ہی واقعات کے پیش نظریوں و فصاحت فرمائی ہے:

”مولانا اسمعیل تو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کے دونوں چچا (کیونکہ تیسرے چچا شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ کا ۱۲۲۲ھ میں انتقال ہو گیا تھا) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ان پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے، مگر جب زورِ علم نے بیباک بنا دیا تو بات یہاں تک پہنچی کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلس مبارکہ سے ان کو اٹھا دیا۔ آخر میں دونوں چچا ان سے ناراض ہو گئے تھے لیکن سوانح نگار صرف ابتدائی دور کا

ذکر کرتے ہیں، مجلس سے اٹھانے کا واقعہ تو شاید مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی باور النوا اور میں تحریر فرمایا ہے۔

سیف اللہ المسلول، مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے جو مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے معاصر اور دیگر علمائے اہلسنت وجماعت کی طرح ہندی وہابیوں کی حرکاتِ قبیحہ کے عینی گواہ اور علمائے اہلسنت میں تازمقام رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۲ء میں محمد اسمعیل دہلوی اور ان کے معتقدوں کی تردید کی اور اس تخریب کاری کے چہرے سے یوں پردہ اٹھایا:

’اس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی، گویا اسی کتاب التوحید کی شرح ہے۔ اس دین کی بڑی شہرت ہوئی اور عوام الناس بہت اس بلا میں پھنسے۔ تو میں و تخییر انبیاء و اولیاء کی اور تکفیر تمام امت سلف و خلف کی خوب جاری ہوئی۔ دین دار اہل علم جہاں تھے ان کے فیضِ صحبت سے جو بچا سو بچا ورنہ اول و پہلے میں اکثروں کو اس طرف میل آ گیا، بسبب شہرت ان کے خاندان کے اور ناواقفی کے فن سیرت اور حدیث سے جب نوبت دہلی میں پہنچی ہزاروں ہزار آدمی کہ شاگرد و مرید اور دیکھنے والے صحبت یافتہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) کے اور علم میں ان سے زائد لوگ موجود تھے، مولوی اسمعیل اور مولوی عبدالحی سے دست و گریباں ہوتے اور خواص نے فہمائش کی کہ اس سفر میں یہ نیارین کیا نکال لائے کہ اس کی دوسے تمہارے استادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچتا اور قبل اس سفر کے تم بھی اسی طریقہ پر تھے اور ویسا ہی وعظ کتے تھے اور فتویٰ لکھتے تھے، جس کو اب شرک کتے ہو۔ یہ دین میں فساد ڈالنا اور قرآن و حدیث میں تحریف کرنا اور خلافت کو گمراہ کرنا، بہت

ہر چند نصیحت کی، کچھ سود مند نہ ہوئی، لاپچار ہو کر سب نے اُن کا رد و ابطال کیا۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی موصلی صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب کے صاحبزادوں نے فتویٰ اور رسالے اُن کے رد میں لکھے، نوبت تکفیر تک پہنچائی۔ مولوی فضل حق خیر آبادی نے جزاء اللہ خیراً کہ علم و فضل میں مولوی اسمعیل وغیرہ کو اُن سے کچھ نسبت نہیں.... ہر طرح مولوی اسمعیل کے رُو برو اُن کا رد و ابطال کیا اور تکفیر کی نوبت تحریر میں آئی۔ مسئلہ شفاعت میں مولوی اسمعیل نے حرکت مذبحی کچھ جواب میں کی آخر کو عاجز و ساکت ہو گئے اور تحقیق القتوی فی مرد اہل الطغویٰ "کمال شرح و بسط سے مولوی فضل الحق (رحمۃ اللہ علیہ) صاحب نے لکھا۔"

مفتی صدر الدین آندوہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) نے بھی مولوی اسمعیل دہلوی کو خوب سمجایا کہ دین میں تخریب کتنا اور اپنے خاندان کی عظیم الشان مذہبی خدمت پر پانی پھیرنا عقلمندی نہیں ہے۔ موصوف نے اقرار بھی کر لیا تھا لیکن معلوم نہیں اندریں خان کیا مجبوری پیش آگئی کہ پرنا لہ دیں رہا۔ مثلاً:

مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آندوہ) اسمعیل کو فہمائش کر کے زیادہ راست پر لائے اور اُن سے اقرار کرایا کہ اب ہم نے تحقیق کی اور افراد و تفریط کو چھوڑا، سوادِ اعظم کے مخالف سے منہ موڑا اور بیانات خاص و عام پر جامع مسجد میں شائع و ذائع ہو گئے۔"

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء) کے نامور فیض یافتہ مولانا رشید الدین خاں صاحب علیہ الرحمہ نے بھی فہمائش کا فریضہ ادا کیا۔ چنانچہ

لے نفس رسول بدابونی۔ مولانا: سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۵۸، ۵۹  
لے فضل احمد قاسمی مورانا: انوار آفتاب صداقت، ج ۱، ص ۱۴۵

قاضی فضل احمد صاحب یوں تصریح کرتے ہیں :

مولانا رشید الدین خاں صاحب نے تخلیہ میں بذریعہ و بلاذریعہ اسمعیل کو بہت سمجھایا کہ دین میں فتنہ ڈالنا اور جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا قبیح ہے اور واجب ترک اور مفروض الاجتناب۔ اگر دل میں کچھ خلش ہے (یعنی شک شبہ) تو آؤ ما و شما و دیگر علماء و صلحاء متفق ہو کر کتب دین کی طرف رجوع کریں اور احقاقِ حق قبول کر لیں اور شقاق و نفاق کو جماعتِ مومنین سے استیصال کریں اور نواتے اعانت و اشاعت کا راہِ راست پر کہ اتباعِ سوادِ اعظم ہے بلند کریں اور خاص و عام کو حق سے آگاہ کریں۔ مولوی عبدالحی اور مولوی اسمعیل اس خوف سے کہ ہمارے عقائد فاسدہ طشتت از بام نہ ہو جائیں رو براہ نہ لائے، اے

جب مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے خاندانی بزرگ سمجھا بھا کر تھک گئے، اُس خاندان کے فیض یافتہ علمائے کرام نے تمنا نش کا فریضہ ادا کر لیا اور دیگر علمائے اہلسنت انہیں سمجھاتے راہِ راست پر لاتے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے سے روکتے تھے تو موصوف کا پارہ اور چڑھ گیا، خادجیت و نجدیت کا اصلی رنگ موصوف کی تقریر و تحریر سے ظاہر ہونے لگا۔ بات بات پر مسلمانوں کو ٹھیٹھ مشرک بتانا شروع کر دیا۔

حضرات علمائے کرام نے مولوی محمد اسمعیل دہلوی سے یہی تو کہا تھا کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا نہ کریں متحدہ ہندوستان کے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کو مشرک بنا کر تیو صدیوں کے مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن قرار نہ دیں، خود شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہا نے سمجھا بھا کر اور ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا اور موصوف کسی کے کہنے کو خاطر میں لائے ہی نہیں تو مجبور ہو کر مسلمانانِ اہلسنت و جماعت نے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ اُس وقت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۰۸ھ / ۱۸۶۱ء)

۱۔ فضل احمد قاضی، مولانا: انوار آفتاب ہدایت، ج ۱، ص ۵۱۴

نے اس فتنے کے متعلق جو ریمارک دیا وہ اُن کی انتہائی وسیع النظری کا بہن ثبوت ہے۔  
 مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اُس موقع کے جملہ حقائق  
 کو بیان تو کیا ہے لیکن اس طرح کہ اپنے محبوب رہنما کی اُن پر حرف نہ آئے۔ واقعات تو  
 بیان کر دیے لیکن انصاف کا خون کر کے۔ قارئین کرام مندرجہ ذیل بیان کو پڑھیں اور حقائق  
 کی روشنی میں تجزیہ کریں :

”یہ زمانہ گویا مولانا شہید کی ریفاہ میشن کا آغاز تھا اور یہی زمانہ اُس تلخ تر  
 دشمنی کا تھا جو خواہ مخواہ حاسد مولانا سے کرتے تھے۔ جب مختلف مضامین پر  
 وعظ ہوئے تو لوگوں میں جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں ایک شورش سی پھیل گئی اور  
 چاروں طرف ایک دُند چم گیا۔ بھلا وہ تو مدت سے مختلف پیروں، شہیدوں،  
 سیتلاماں کے پوجنے کے عادی تھے، اُنھیں اکیلے خدا کی پرستش کا ہے کہ  
 اچھی معلوم ہوتی۔ وہ بھڑکتے بھڑکتے مولانا شہید کے فقیری وعظ سے پورے  
 بھڑک اُٹھے اور اب اُنھوں نے عدالت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا کیونکہ  
 اکبر شاہ (بادشاہِ دہلی) کی طرف سے تو صاف جواب بل چکا تھا، مگر  
 عدالت میں جانے سے پہلے اُنھیں ضرور ہوا کہ وہ مولوی فضل حق صاحب سے  
 مشورہ کر لیں کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق  
 خیر آبادی) رزیڈنٹ کے بڑے مہتر چڑھے اور معتبر تھے اور وہ اُن ہی کے کہنے  
 پر زیادہ چلتا تھا۔ جب یہ لوگ سررشتہ دار (علامہ خیر آبادی) کے پاس پہنچے  
 اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آہ پر یہ ہو کے کہنے لگے کہ ”اسماعیل دین محمدی  
 کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔“ یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو  
 اُنھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔“

بہر حال قانونی چارہ جوئی سے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا وعظ بند کروا دیا گیا۔ اس

۱۱۱  
 لہ حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۰

بندش کے دوران میں معلوم نہیں اعلیٰ انگریزی حکام کے ساتھ مل کر کیا کھڑی پکائی گئی کہ ریزڈنٹ نے مولوی محمد اسماعیل صاحب کے وعظ پر جو پابندی لگائی تھی اُسے منسوخ کر دیا گیا۔ منسوخی کا حکم متوقع وقت پر نہ پہنچا تو موصوف اپنے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ ریزڈنٹ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔ ریزڈنٹ نے جو موصوف کا معنی خیز اور خلاف توقع اعزاز و اکرام کیا یا وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا، اُس نے اہل نظر علمائے اہلسنت کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ واقعہ بھی مرزا حیرت دہلوی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

”آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ غلام وقت طے ملانے اور فرصت کا ہونا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے۔ ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا فشتی پیر لال تھا اور ایک خدمت گار تھا۔ پہلے آپ نے جا کے اطلاع کرائی۔ جونہی ریزڈنٹ نے سنا کہ شہاد اسماعیل آئے ہیں، فوراً باہر نکل آیا اور باہر براڈ سے سے آ کے لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا، آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا۔ معمولی مزاج پُرسی کے بعد ریزڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب! ہمارے سرپرستہ دار (علامہ فضل حق خیر آبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور محقول وہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکم تلافی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو،“

زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وعظ پر جو پابندی لگادی گئی تھی اُسے اٹھایا جاتا، دوبارہ وعظ کرنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ”قدیمی طور پر جاری کیا جائے“ کے الفاظ کچھ اور ہی غمازی کر رہے ہیں اور ”کوئی مزاحم نہ ہو“ کا آرڈیننس اُس خدشے کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی نظر میں مسلمان تو سب کسب

مشرک ہی تھے لیکن ایک ظاہر بت پرست اور ٹھیٹھ مشرک یعنی ہیرالال کو کس عقیدت، محبت  
 حاکمیت کے تحت منشی (پرسنل سیکرٹری) رکھا ہوا تھا، جو رازداری کے مواقع پر بھی  
 سائے کی طرح ساتھ ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ تو یہ ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ  
آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً تَنْدُوْنَكُمْ۔ اسے ایمان والوں! غیر مسلموں کو اپنا رازدار  
 نہ بنانا۔ لیکن یہ زالے ریفارمر صاحب ہیں کہ ہیرالال ہندو کو منشی رکھتے ہیں اور عجیب و غریب  
 مجاہد ہیں کہ راجہ رام ہندورا چپوت کو تو پچی رکھتے ہیں۔ کہیں یہ میراثِ خوارچ سے بہرہ وری  
 اور يَقْتُلُوْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ وَيَدْعُوْنَ اَهْلَ اِلْدِيْنِ کی جلوہ گری تو نہیں۔ اسی منشی  
 ہیرالال کے متعلق مرزا حیرت دہلوی نے یہ بھی لکھا ہے :

”ہیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (محمد اسماعیل دہلوی) کا وعظ بلفظہ  
 نقل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کاغذات منشی ہیرالال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے  
 ہیں ملے ہیں وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بہ خط لکھے ہوئے ہیں کہ  
 ہم بلفظہ نقل کرنے کا فرض حاصل نہ کر سکے۔“

جب فحاشیوں سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا، تادمی چارہ جوئی نے کچھ اور ہی نظارہ  
 دکھایا کہ چودہ طبقہ روشن ہو کر رہ گئے تو یقین ہو گیا کہ جس راستے پر موصوف گا مزن ہو چکے ہیں  
 اس سے ہٹنا اور اپنے بزرگوں کے مسلک کی پیروی کرنا اب ان کے بس سے باہر ہے،  
 یہ اپنی مرضی کھو چکے، کسی کی مرضی کے پابند ہو چکے ہیں تو علمائے کرام نے طے کیا اب فرض کی امانگی کا یہی اور  
 صرف یہی طریقہ باقی رہ گیا ہے کہ موصوف سے بحث مباحثہ کے اعضاء مسلک سے ہٹا ہوا  
 اور مذہب اہلسنت و جماعت سے کٹ کر خارجیت و دوہایت کا علمبردار ثابت کیا جائے تاکہ  
 عوام الناس ان کے دائم فریب میں گرفتار ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنے سے محفوظ و مامون  
 رہ سکیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۲۴ء)  
 کے خلفاء اور مولوی محمد اسماعیل کے چچا زاد بھائیوں نے ان سے جامع مسجد دہلی میں ایک

لے حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، س ۸۴

فیصدکن مباحثہ کیا، جو پاک و ہند کی سرزمین میں حقیقت و دہا بیت کا سب سے پہلا مناظرہ تھا۔ اس مباحثے کی روڈ اور حضرت فضل رسول بدایونی قدس سرہ نے ۱۲۴۰ھ میں موصوف کے عین حیات یعنی ان کے قتل ہونے سے پانچ چھ سال پہلے یوں بیان فرمائی اور کسی نے ایک لفظ کی تعلیظ ثابت نہ کی۔ لکھا ہے :

”مجلس جامع مسجد کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ایک استفتاء مرتب ہوا، بہرہ و دستخط مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی فضل حق صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب و مولوی موسیٰ صاحب و مولوی محمد شریف صاحب و مولوی عبد اللہ صاحب و آخون شیر محمد صاحب، صبح کے وقت مشکل کے دن انتیسویں ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو، کہ مولوی عبدالحی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب و مولوی موسیٰ صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور مولوی محمد شریف صاحب وغیرہ علماء و طلبہ، خاص و عام اس مجلس پر مجتمع ہوئے جب مولوی عبدالحی وعظ کہہ چکے، غلبہ اللہ طالب علم نے استفتاء پیش کیا کہ اپنی مہراس پر کر دیجئے۔ مولوی عبدالحی نے کہا، میں نہیں مہر کرتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے کہا: یہی کہہ دیجئے اور اصرار کیا تو مولوی عبدالحی نے انکار کیا اور لال طاہر کرنے لگے۔“

مفتی شجاع الدین علی خاں صاحب نے کہا کہ اس کا تصفیہ ضرور ہے کہ بڑا اختلاف پڑ گیا ہے۔ مرزا غلام حیدر شاہزادے اہل علم کی مکرار سے رنجیدہ ہوئے اور مولوی عبدالحی وغیرہ کو مجمع علماء میں واسطے مناظرہ لائے۔ مجمع بے شمار خاص و عام، امیر و فقیر کا ہوا گیا۔ کوتوال بھی واسطے بندوبست کے آہنچا۔ مولوی عبدالحی نے فاضلوں سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ کسی نے کہا کہ آپ کے بلانے کے موافق کہ بروز کہا کرتے تھے کہ جس کو تاب مناظرہ کی ہو ہمارے سامنے آوے۔ سن کر چپ ہوئے۔ مولوی مخصوص اللہ شاہ رفیع الدین محدث



دہلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے) نے کہا کہ ہم بموجب حکم خدا کے آئے ہیں کہ حق ظاہر ہو جائے  
 مولوی موسیٰ (شاہ رفیع الدین محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے) نے کہا کہ تم ہمارے  
 استادوں کو (شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر و دیگر علماء اہلسنت کو) بُرا کہتے ہو۔ بوسلے کہ میں نہیں کہتا۔  
 مولوی موسیٰ نے کہا کہ یہ ایسے مسئلے بناتے ہیں کہ اُن سے بُرائی استادوں  
 کی ثابت ہوتی ہے۔ پوچھا وہ کیا ہے؛ کہا کہ مثلاً قبر کے بوسے کو شرک کہتے ہو  
 اور ہمارے اکابر (شاہ عبدالعزیز و شاہ ولی اللہ وغیرہ) اُس کے مباشر  
 ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ کھ دو تاکہ تمہارے  
 اوپر جھوٹ باندھنے کی تکذیب کی جاوے۔ مولوی عبدالحی نے کانپتے ہوئے ہاتھ  
 سے لکھ دیا، بوسہ دہندہ مشرک نیست۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کے ہاتھ میں فتویٰ دیا گیا اور قریب  
 مولوی عبدالحی کے آبیٹھے۔ مولوی عبدالحی نے گلہ شکوہ اُن سے شروع کیا کہ  
 خانصاحب مجھے آپ کی خدمت میں دوستی تھی، تم بر ملا مجھے ذلیل کرتے ہو۔  
 خانصاحب نے فرمایا کہ ہم تمہارے اعزاز و اظہار کمال کے واسطے آئے ہیں  
 لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تم مسئلے خلاف سلف کے کہتے ہو، اس سبب سے  
 تم سے خلق کو دشت ہے۔ ایسے مجمع میں مفسریوں کی تکذیب ہو جاوے گی۔  
 مولوی عبدالحی شکوے ہی کی پریشان باتیں کرتے رہے۔ خانصاحب نے  
 فرمایا کہ تمہارے لوگ (مبتغ و ہابیت و نجدیت مثل شاہ اسمعیل) کہتے ہیں  
 کہ عبدالعزیز کی راہ، راہ جہنم کی ہے (نعوذ باللہ) اسی وقت گواہی سے یہ  
 بات ثابت ہو گئی، لوگ بُرا کہنے لگے۔ مولوی عبدالحی نے بھی تبرا کیا باواز بند  
 اور مولوی رشید الدین خاں صاحب سے کہا کہ مولانا عبدالعزیز کی محبت اور  
 اعتقاد، علم و بزرگی میں، میں مثل تمہارے ہی، طحاوی اور کرنی کے برابر  
 جانتا ہوں۔ پھر استفسار شروع ہوا۔ ہر مسئلے کا جواب دیا کہ چنداں مخالف  
 جمہور کے نہ تھا۔

مولوی اسمعیل نے پہلے ہی استفسار سے ارادہ کیا اٹھ جانے کا۔

مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا: ذرا تشریف رکھیے کہ جناب کے بھی دستخط اس تحریر پر ضرور ہیں۔ مولوی اسماعیل نے کہا کہ میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں، میرے واسطے محتسب لا، اسے مردود، میرے ساتھ سختی کرتا ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت! میں سختی نہیں کرتا، عرض کرتا ہوں۔ پھر مولوی اسماعیل نے کہا کہ میرے رسالے کا جواب لکھ۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا کہ رسالہ آپ کا میری نینل میں ہے اگر فرمائیے، اسی مجمع میں جواب عرض کروں۔ غصہ کھا کر کچھ نہ کہا پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ جواب عقلی لکھوں یا نقلی۔ کہا جیسا چاہیے۔ پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ جواب اس کا لکھو گے؟ کہا کہ میں محکوم کسی کا نہیں ہوں۔ مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ نئے عقیدے اپنے دل کے بنائے ہوئے کسی سے نہ فرما۔ ایسے اور نہیں تو ابھی بحث کر لیجئے۔ مولوی اسماعیل اٹھ بھاگے اور چلتے ہوئے۔

رشید الدین خاں صاحب مولوی عبدالحی سے پوچھا کیسے، وہ جواب دیتے تھے، ایسے کہ قدامد کے خلاف نہ تھے۔ تیرھویں سوال میں کہ بدعت کی بحث تھی مولوی عبدالحی نے کہا کہ میرے نزدیک بدعت حسنیہ ہی ہے، گو اصل ہر بدعت کی بد سے مگر سبب نیکی کا اس میں ہو تو حسنہ ہو جاتی ہے و الا فلا۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی بد نہیں ہے بوجہ حدیث "من سن سنة حسنة ومن سن سنة سيئة" (المحدث) کے اور حدیث "من احدث في امرنا هذا ما ليس منه" اور حدیث "من ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاها الله" کہ ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نیا طریقہ نیک بھی ہوتا ہے، بد بھی اور خدا اور رسول کی مرضی کے موافق بھی، مخالفت بھی، گمراہ بھی، غیر گمراہ بھی۔ اسی سبب سے علماء نے کہا ہے کہ بعض بدعت واجب، مندوب و مباح بعضے حرام، مکروہ۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب (ابن شاہ رفیع الدین) نے کہا، جس بدعت کی وجہ حسن و قبح ظاہر نہ ہو وہ کیا ہے؟ مولوی عبدالحی نے کہا: سید۔ انہوں نے کہا: اس تقدیر پر بدعت و مباح میں کیا فرق ہے؟ مولوی

عبدالحمی ساکت ہو گئے۔ کس نے کہا کہ احکامِ خمسہ میں سے ایک حکم کم ہو گیا۔ پھر مولوی عبدالحمی نے کہا کہ بر بدعت کو بڑا اس واسطے کہتا ہوں کہ "کل بدعتہ" کا کلیہ ظاہر ہے اور مخصوص نہ ہو جاوے۔ خانصاحب نے کہا کہ تخصیص سے کیا قباحت لازم آتی ہے؟ اور کمومات میں تخصیص مشہور ہے۔ مولوی محمد شریف نے پڑھا "ما من عام الا وقد خص منه البعض" خانصاحب نے کہا کہ "تینوں حدیثیں مذکورہ بالا تخصیص کو جاہتی ہیں، پس تخصیص ضرور ہوئی۔" مولوی عبدالحمی نے کہا کہ اصل بر بدعت کی قیح بعض علماء کا مذہب ہے۔ خانصاحب نے کہا کہ یہ قول حضرت مجدد (قدس سرہ) کا ہے مگر تمہارے مذہب (خارجیت و دوہا بیت) سے نہایت دور کہ ان کے مذہب میں جس کی اصل شرع میں دہائی جاوے وہ سنت ہے و بدعت وہی ہے جس کی اصل نہ پائی جائے۔ پھر مولوی عبدالحمی نے غوطہ میں جا کر کہا کہ یہ قول نووی کا ہے، فتح المسبین میں لکھا ہے۔ اسی وقت فتح المسبین شرح اور بیچیں امام نووی کی پیش کی گئی۔ عبارت اس مقام کی باوازینہ مع ترجمہ پڑھی گئی۔ پھر تو مولوی عبدالحمی اچھی طرح سے قائل معقول ہو گئے۔

پھر اذان میں بعد و فن کے کلام ہوا۔ بعد کسی قدر تکرار کے کہا کہ میں کسی کو منع نہیں کرتا۔ پھر کلام ہوا، سووم کے فاتحہ میں۔ بعد قیل و قال کے کہا کہ اگر اس دن میں ثواب زیادہ جانتا ہے ممنوع ہے اور اگر ثواب ناند نہیں جانتا اور برعایت مصلحت کے کتاب ہے تو منع نہیں ہے۔ تمام ہوا خلاصہ نقل مجلس کا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ ہر ایک مسئلہ میں ادنیٰ ادنیٰ آدمی سے قائل (ساکت) ہونے لگے اور اطراف و جوانب میں بھی یہ تقریریں اور تحریریں جا بجا پھیل پڑیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ مولوی اسمعیل کا طریقہ مخالف ہے تمام سلف صالح کے اور اپنے خاندان کے بھی مخالف ہیں اور سب اعتبار کا وہی نسبت خاندان کی تھی۔ جب اس کے بھی خلاف ٹھہرے

تو کچھ اعتبار نہ رہا اور ساری قلعی کھل گئی اور برعکس جو اہل علم تھے متوجہ ہوئے ان کی بے دینی کے اظہار اور اس کے ردِ غصے پر۔ ایسے سببوں سے آگ ان کے فتنے کی ٹھنڈی ہو گئی اور نئے دین والے بھی زبانِ دباکریاں کرنے لگے۔

قارئین کرام! یہ تھا وہاں بیتِ کاسنگِ بنیاد جو دہلی میں رکھا گیا اور ولی اللہی خاندان سے مولوی محمد اسماعیل صاحب نے جس نجدی شجر کی آبیاری کا کام بڑی تندہی سے کیا۔ علمائے اہلسنت نے اپنی بساطِ بھرا اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ خاندانی بزرگوں اور دیگر علمائے اہلسنت نے سمجھایا، قانونی چارہ جوئی کی، بحث و مناظرہ کی محفلیں گرم کی گئیں، لیکن مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) تھے کہ اپنے جدید مذہب سے کسی طرح نہ ہٹے، مغلوب ہوئے مگر ڈٹے رہے، اپنے اکابر سے روزِ گرداں ہوئے، خاندان سے رشتہ ٹوٹا، دہلی مرکز سے رابطہ چھوٹا تو جہاد کا چکر چلایا، سید احمد صاحب کو صاحبِ وحی و عصمت پیر بنایا، ان کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور سابقہ رو سیاہی کا داغ دھونے کی خاطر، اس خوشحال میں بھولے بھالے مسلمان چھٹائے۔ نجدیت کی پوری مصلحت حاصل کرنے، نجدیوں سے فتنہ و فساد کے گر سیکنے کی خاطر، حج بیت اللہ کا بہانہ کر کے ایک قافلے لگے، وہاں کیوں گئے اور کیا وہاں سے لائے، جتنے منہ اتنی باتیں، حقیقت کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اس کی عطا سے اس کے برگزیدہ بندے۔ باقی تو صرف عقل و نظر کی باتیں ہیں۔ اس دوحہ حج کے بارے میں چٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب نے بعض موزخین کے خیالات یوں نقل کیے ہیں:

حضرت سید احمد صاحب کا شاندار سفر حج ان کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سید احمد کا سفر حج ان کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ ان کے خیال میں اسی دوران سفر میں ان کو عربی وہابیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا، اس کے عقائد سے بہت

لے نفس رسول بہ ایلی، مولانا سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۶۱ تا ۶۴

تاثّر ہوئے اور ہندوستان میں اُن کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنفِ فلبی لکھتا ہے: یہی زمانہ تھا جبکہ ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے ہندوستان کو وہ بیچ لے گیا جس نے ..... ۱۸۲۲ء میں اُن کی شہادت کے بعد وہاں یوں کو کوہِ سیادِ کارِ عمل بخشا اور اطراف تک اُس کی گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔

ہندوستانی وہاں بیت پر ایک اور مشہور تر مصنف، ہنٹر لکھتا ہے: ”سید احمد کے قیام تک کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ، اُن کی تعلیمات کی اُن بدو قبائلوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منعطف ہوئی، جن کے ہاتھوں تکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر اُن کی تخریب کی گئی اور شہر برباد کر دیے گئے۔ اس جو روتعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستان آئے تو ایک مذہبی خواب میں اور مشرکانہ بد اعمالیوں کے مصلح کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔“

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب ان مصنفوں سے اتفاق رائے نہیں رکھتے لیکن موصوف کو اس امر کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ نجدی اور ہندی وہاں بیتِ اصل میں ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ شراب وہی ہے لیلِ جُدا جدا ہیں۔ موصوف کی تصریح اُن کے اپنے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

”حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبداء ایک ہی ہے، قرآن و حدیث۔ دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ ان دونوں تحریکوں (نجدی اور ہندی تحریک و وہاں بیت) کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کو دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے، جن میں بنیادی چیز توحید

اور ترکِ بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبد الوہاب کی التوحید (کتاب التوحید) اور شاہ اسمعیل کی تقویۃ الایمان ان بنیادی امور پر زور دینے میں متفق الخیال ہیں۔

غیبت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندی اور نجدی وہابیت کی مماثلت تقسیم کر لی، باقی رہا ان کا دعویٰ کہ دونوں تحریکیں اپنا مبداء اور مخرج قرآن و حدیث کو ٹھہراتی ہیں اور توحید و ترکِ بدعات پر زور دیتی ہیں تو اس سلسلے میں ہماری رائے تو یہی ہے کہ آج تک ایسا کون سا بد مذہب گروہ کھڑا ہوا ہے جس نے اپنے مخصوص نظریات کا مخرج، قرآن و حدیث کو نہ ٹھہرایا ہو؟ رہی توحید والی بات، تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی پیمانہ توحید سے ناپ کر تو اولین خوارج نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انھیں مسلمان جاننے والے صحابہ کرام اور تابعین عظام کو مشرک اور اسلام سے خارج ٹھہرایا تھا، اگر اسی ساختہ توحید کو لے کر محمد بن عبد الوہاب نجدی اور مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) بھی بارہ صدیوں کے مسلمانوں کو مشرک بنا کر جہنم کا ایندھن ٹھہرائیں، ساری امتِ محمدیہ کو مشرکوں کا جگمگا بتائیں تو اتنی بات پر متفق ہونے کی وجہ سے یہ دونوں حضرات اس ساختہ توحید پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک کیوں نہ مصلح اور یقیناً مرقر قرار پائیں؟ ڈاکٹر صاحب نے دونوں تحریکوں میں دو اختلافی امور بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے امر دوم اور موصوف کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرہ امتیاز ایک مرحلے پر ہمدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔ ہمدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر تشریح فراہم کر لیا تھا۔ اسی کے بعد سید احمد نے رحلت کی۔ ہمدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔ لہذا ظاہر ہے کہ دونوں تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک ماخذ استفاضہ اور یکساں حالات و

کوائف کی موجودگی کا نتیجہ تھا، نہ کہ ایک دوسرے کے تتبع و تقلید کا۔ لہٰذا

پروفیسر الحاج فیروز الدین روحی اس سلسلے میں اپنی تحقیقاتِ عالیہ یوں پیش فرماتے ہیں:

”اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں عرب میں بھی وہاں کی مذہبی و سماجی خرابیوں کی بنا پر تجدید و اصلاح دین کی تحریک شروع ہوئی، جس کے قائد شیخ محمد بن عبدالوہاب تھے، ترکی کا اُس وقت عرب پر اقتدار تھا، لہٰذا ترکی کو نقصان اٹھانا پڑا، پھر اس تحریک کو مصر کے بادشاہ محمد علی پاشا نے ہوا دی اور یہ دونوں ملک انگریز کے دوست تھے، وہاں اس تحریک کو وہابی کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ لہٰذا ہندوستان میں بھی سید احمد شہید کی تحریک کو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی شاخ اور تمہ بتایا، بلکہ بعض انگریز مسنفین نے یہاں تک لکھ مارا کہ حضرت سید احمد شہید جب حج کو گئے تو شیخ محمد بن عبدالوہاب سے پڑھ کر آئے، حالانکہ سید احمد کی پیدائش ۱۷۸۶ء کی ہے اور شیخ کا انتقال ۱۷۹۱ء میں ہو جاتا ہے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں تحریکیں ایک ہی جہت اور ایک ہی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں، اور اُس وقت کے ماحول کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی طریقہ کار و دونوں نے اختیار کیا، لہٰذا

حیران ہوں کہ پروفیسر فیروز الدین روحی صاحب کی اس عبارت اور ان کی اس ساری کتاب کو دیکھ کر کوئی موصوف کو کس مضمون کا پروفیسر تصور کرے گا۔ اردو، عربی، تاریخ اور اسلامیات میں کیسے کیسے گھل کھلائے ہیں۔ اردو کی ادبی شان تو ہر جگہ سے نمایاں عربی دیکھیے تو ساری کتاب میں ایسی کوئی عربی عبارت نظر آئے گی جو صحیح نقل کر سکے ہوں، اسلامیات سے مراد صرف وہابیت کی تفسیر خوانی ہو کر رہ گئی اور وہ بھی ثبوت کی محتاج اور تاریخ دانی کیلئے یہی عبارت کافی رہے گی۔ مزید اور ملاحظہ فرمائیے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا سن وفات یہاں ۱۷۸۶ء لکھا ہے لیکن دوسری جگہ:

لہٰذا محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۷، ۵۸

لہٰذا فیروز الدین روحی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵، ۲۶

”شیخ نے مسلسل پچاس سال دعوت و تبلیغ کے بعد شوال یا ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ مطابق جولائی ۱۸۹۲ء میں رحلت کی۔ شیخ نے چار لڑکے اور ہزار ہا شاگرد چھوڑے۔“

نطقہ سر بگہریاں ہے اسے کیا کیجے !

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اس سلسلے میں اپنی تحقیق کا نفاذ کچھ عجیب انداز میں بجایا ہے۔ ذرا کان لگا کر سماعت فرمائیے:

”مولوی اسماعیل جو ہندوستان میں فرقہ موحدیہ کا بانی ہے، کبھی کسی نجدی شیخ سے نہیں ملا اور نہ اس نے اُن کی کوئی کتاب دیکھی۔ اس نے وہی تعلیم دی جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بتاتی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی پیدائش سے پہلے محمدیت کی بنا اس کے خاندان میں پڑ چکی تھی اور جو کچھ اس نے اور اس کے خاندان نے حاصل کیا وہ اپنے ہی باپ داداؤں سے۔ اسلامی دنیا میں ایک ہی خاندان ہے جسے غیر کے شاگرد بننے کا افتخار حاصل نہیں ہوا۔ یورپس کا یہ گھنا کر محمد بن عبدالوہاب نے ہندوستان تک اپنے مذہبی اصول کے خیالات پھیلائے جنھیں لغو اور بے سرو پا بات ہے۔ جس پرے پر ایہ میں محمدیوں کو، جنھیں سخت غلطی سے وہابی کہا ہے، انگریزوں نے گورنمنٹ کو دکھایا ہے، سخت حقارت انگیز کارروائی ہے۔ گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اُس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کس قدر تسلیم کر لیا ہے اور اُس کے کیسے فرماں بردار، مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں۔ ان پر کیا، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی اُن کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی

۱۰ فیروز الدین رومی، پروفیسر، آئینہ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۲



جاتی ہیں :۔

موسون کے یہاں تین دعوے مذکور ہونے میں نہیں کم نمبر وار بیان کیے دیتے ہیں،

۱۔ مولوی محمد اسمعیل دہلوی نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔

موسون کا یہ دعویٰ کسی سستی یا دباہی تک کو بھی تسلیم نہیں ہو سکتا۔ باب سوم میں ہم کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی مطابقت دکھائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

۲۔ دوسرا دعویٰ کہ مولانا محمد اسمعیل دہلوی کا مذہب اپنے خاندان کے مطابق تھا اور

اس محمدی مذہب کی بنا پہلے ہی ان کے خاندان میں پڑ چکی تھی۔ یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ گزشتہ صفحات میں قدرے وضاحت کی جا چکی ہے۔

۳۔ تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے پیرو، جو پہلے محمدی اور بعد میں اہلحدیث

کہلائے، وہ برٹش گورنمنٹ کو بابرکت تسلیم کرتے اور اس کے پورے پورے

فرمانبردار اور مطیع ہیں۔۔ دعویٰ انہوں نے جس عاجزانہ اور ذلیلانہ انداز میں کیا ہے،

ان کے پیش نظر ہر کوئی کہہ اٹھے گا کہ: **عظ**

کشش لفظوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی سادہ زرتے ہیں

حقیقت کچھ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۳۶ھ/

۱۸۲۱ء) نے کتاب التوحید کو دیکھا یا یہ کتاب انہیں دکھائی گئی۔ موسون نے دل بیان سے

اس کے مندرجات کو قبول کیا اور اس کے خیالات و نظریات کی ذمگی چھپے لفظوں میں

تبلیغ شروع کر دی، شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور شاہ عبدالنور

علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۶ء) تک شکایتیں پہنچیں۔ دونوں حضرات نے باواسطہ

اور بلاواسطہ سمجھایا بجھایا لیکن پرنا لہ وہیں ہا۔ یہ دونوں بزرگ وفات پا گئے تو موسون کی

باگیں ڈھیلی ہو گئیں۔ خوب کھل کر کھیلنے لگے۔ قانونی طور پر نقص امن کے پیش منظر پابندی گوانی

توزلا ہی انکشاف ہوا، حکومت کی پشت پناہی صاف نظر آنے لگی۔ آخر کار دلائل کے

لے حیرت دہلوی۔ مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸

ذریعے علمائے کرام نے محاسبہ شروع کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور جتیموں نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی کا محاسبہ شروع کر دیا۔ ایک طرف یہ دونوں حضرات تھے اور دوسری طرف سارے ملک کے علمائے اہلسنت اور پورا خاندان ولی اللہی۔ جب دلائل کے میدان میں ان حضرات کا مجید کھلنا شروع ہو گیا تو جو بھولے بھالے مسلمان ان حضرات کے دلکش الفاظ کے چکر میں چنس گئے تھے وہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور جو تھوڑی بہت جمعیت فراسم کی تھی وہ بھی منتشر ہو گئی۔

ان حالات میں دوسرا منصوبہ تیار کیا گیا جو پہلے کی سراسر ضد ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا دلکش نعرہ مچھایا تو بادشاہی کا دماغوں میں سودا سما گیا اور لبیک کہہ کر قبول کر لیا۔ اب نکر لاتی ہوئی لاڈل شکر کی، اس کے لیے جہاد کے فضائل اور سکھوں کے مظالم پورنی ولسوزی سے بیان کیے جانے لگے، ساتھ ہی سید احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کی وہ شان بیان کی جانے لگی کہ لوگوں کی عقلیں حیران رہ جاتیں۔ جلد اولیائے کرام سے انھیں بڑھایا گیا بکہ صاحب عصمت و وحی ٹھہرا کر انبیاء کی صف میں بٹھایا گیا۔ سرور کون و سماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشابہ اور باری تعالیٰ شانہ سے ہم کلامی کاشرف حاصل ہونا سنایا گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تک صعود اور اسس سے مصافحہ ولین دین کی کہانیاں گھر گھر سنائی گئیں، صراط المستقیم کتاب لکھ کر اس میں ہر جملہ فضائل و کمالات درج کر کے، متبعین کے دلوں اور دماغوں میں سید احمد صاحب کی شان یکسانی کا تصور پیدا کر کے ان کا پجاری بنایا گیا۔

سید احمد صاحب نے بھی اپنے منصب کا پوری طرح لحاظ رکھا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی ان کی جو صفات بیان کرتے، جس مقام پر انھیں بٹھاتے جاتے، یہ کمال دانشمندی سے اس کے مطابق پیشین گوئیاں اور بشارتیں داغنے رہتے۔ مکانوں اور سمندروں کی رُو میں موصوف سے اسی لیے باتیں کرنے لگ جاتیں، جنات حاضر ہوتے، اولیائے متقدمین تشریف لاکر نوازتے، انبیائے کرام بشارتیں سناتے آتے، مقدس

ہستیوں آکر غفلت میں لہر کپڑے پہناتے کی خدایت انجام دے پاتیں۔ پنجاب کا بادشاہ  
 بننے کی خوشخبری بھی سناتے نیز افغانستان کا تفاق، چین کا کفر اور ہندوستان کا شرک اپنی  
 زندگی میں مٹانے کی بشارت بھی بالہام خداوندی سناتے اور اُس پر حلت اٹھاتے تھے۔  
 غرضیکہ تالیفِ قلوب اور اجتماعِ جمعیت کا فو کوں سا غامض اور معانی حیرت جو کام میں  
 لایا گیا وہ علمی باتوں پر ڈکایا گیا ہے۔ دلیل باور ثبوت کا مطلق برکت و شواہد میں مستلا  
 کر دیتا ہے لیکن روحانی معاملات کا چکر، ایکسپریٹس اور کالج، جمعیت کا فو کوں اور ثبوت خارج از  
 بحث۔ یعنی آم کے آم گھٹیوں کے دام، ہدی کی شہرہ شکر کی، حکومت نے ولایت و ثبوت چکے  
 عطا کر دی۔ بس تھری کی جرح حل ملے کہ سناتے تھے ایدہ بہ مقام کے حصول کا وہاں غلام احمد قادیانی  
 (۱۸۸۰ء) کی طرح بتقدیر کے لعل و کونیا چاہتے تھے لیکن نزلی تصور پر پہنچنے سے  
 پہلے راستہ میں ہی بالاکوٹ کا ایسا مقام ہو گیا کہ نزلی تصور میں وہی وطن ہو کر رہ گیا اور مرزا غلام احمد  
 صاحب ہی وہ فرور و آمد رنگ جو برٹش گورنمنٹ کے کیا ہیں منسوب ہے لاپائیدگی کیلئے ایک پتہ کے ذریعہ  
 کہتے ہی سید احمد صاحب جیسے ہوں پیشہ نظر تھے نزلی تصور پر پہنچنے سے پہلے ہی راہی حکم  
 ہوتے رہے اور اس کے بعد لاپائیدگی کیلئے ایک پتہ کے ذریعہ لاپائیدگی ہو گیا۔  
 اور ان کے بعد سید احمد صاحب اور مولانا محمد امجد علی صاحب کے دونوں تصور پر لاپائیدگی کے  
 سراسر خلاف میں پہلی تحریک ہو کر وہی وقت کے حالات بتائی جاتی ہیں کہ نزلوں کی وجہ سے یہی  
 نظائر کی گئی کہ مسلمانوں کا ہر پستی اور شرک میں گرفتار تھے۔ لیکن ان میں سے لاپائیدگی کے  
 دوسری تحریک میں سید احمد صاحب کی پرورش کا وہاں تمام کیا جس کی نظیر ان کے علاوہ کسی  
 مشرکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ سید احمد صاحب کو صاحبِ وحی حضرت بتایا جاتا تھا  
 باری تعالیٰ بختانہ، ایک صوفی اور اس میں کی ہرگز کسی کے شرف سے موصوف کو شرف بتایا جاتا  
 تھا۔ علامہ شریعتی نے لاپائیدگی کی رو سے کسی کے بارے میں ایسی باتوں کا عقیدہ رکھنا، اسے  
 نبی ماننے کا مترادف ہے۔ ان حضرات کے لیے مخصوص ہے کہ ترجمان و تقویۃ الایمان ہے  
 لہذا دوسرے تصور کے صحیفہ صراط و استقامت کو بتایا گیا۔ یہ دونوں کتابیں اگر انصاف کی  
 نظر سے دیکھی جائیں تو صفات و کمالات کے علاوہ دونوں ایک دوسری کے خلاف ہیں۔

دوسرا منصوبہ تو مکمل طور پر ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء کو بالاکوٹ میں دفن ہو گیا، کیونکہ جب  
 نبی ہفتے والا ہی نہ رہا تو آگے بات کیے چلتی پہلے منصوبے کے اثرات تقویۃ الایمان کتاب کی  
 بدولت باقی رہ گئے کہ مٹتے مٹاتے بھی موصوف اس فتنے کی چنگاری دہلی و کلکتہ میں پھوڑ  
 ہی گئے۔ تقویۃ الایمان کے من تالیف کے بارے میں غلام رسول ہر کی تحقیق یہ ہے:  
 'یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ تقویۃ الایمان کس زمانے میں لکھی گئی۔ اس  
 میں ایک مقام پر کعبہ ہند کے معنی کا منظر پیش کیا گیا ہے، جس سے دل  
 پر اثر پڑتا ہے کہ یہ منظر چشم دید ہے، لہذا سمجھا جاسکتا ہے کہ کتاب سفر حج سے  
 واپس آ کر لکھی گئی۔ ملام صاحب بغدادی نے بعض اصحاب کی اگنیت سے تقویۃ الایمان  
 پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ شاہ شہید نے اس کے جواب میں ایک خط کا پورا  
 نسخہ لکھا تھا جس پر ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء تک اس سے بھی اپنی آواز نہ ہونے کو  
 کتاب سفر حج سے مراجعت پر ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء کے اوائل میں لکھی گئی۔ اس زمانے  
 میں شاہ شہید بہترین دعوت تنظیم و جہاد کے لیے وقف ہو چکے تھے اور  
 جہاد کی الاغزی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء کو جہاد کے لیے روڑہ ہو گئے تھے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب غلام رسول ہر من تصنیف کے بارے میں یوں تصریح  
 کرتے کہ دربیح الثانی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء کو جامع مسجد دہلی میں سارے ولی اللہی خاندان اور شاہ عبدالعزیز  
 محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) کے حوضہ میں جلانے دہلی کے  
 علمداران و ابیت و خالہیت سے ہونے لگے۔ و بناظرہ و بناظرہ کیا تھا، تقویۃ الایمان اس سب سے  
 پہلے حنفی دہلیی مناظرے سے کہ فرمہ پہلے لکھی گئی تھی کیونکہ نوران بناظرہ اسل زمانے کا  
 ذکر بھی آیا تھا لیکن موصوف ایسی تصریح کرانے سے جملہ دہلیی مؤرخین و علماء کی طرح کیوں گریز  
 کرتے جبکہ انہوں نے اسل خارجیت کے خلاف سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ  
 (المتوفی ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء) پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/

۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء) پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/

۱۰۲۳ء) بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ (المتوفی ۱۰۴۴ھ / ۱۶۲۴ء) سے طرانے کی دھاندلی بڑے اہتمام سے مچانی ہے۔ اس کی اشاعت کے بارے میں موصوف یوں رقمطراز ہیں:

”تقویۃ الایمان جس کے نئے ایڈیشن کے تعارف میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، پہلی مرتبہ ۱۲۲۳ھ / ۱۸۲۶ء میں چھپی تھی، جب شاہ شہید، امیر المومنین سید احمد بریلوی اور جماعت مجاہدین کے ہمراہ وطن مالوف سے ہجرت کر کے جا چکے تھے اور ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے جہاد بالسیف کا آغاز ہو چکا تھا۔“

واقعی غلام رسول مہر صاحب بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں کیونکہ ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے اس طرح کا جہاد بالسیف تو نظام اور مرہٹے بھی کر چکے تھے۔ جب وہ انگریزوں کے دست و بازو بن کر گئی دفعہ شیردکن سلطان فتح علی ٹیپو شہید پر چڑھ دوڑے تھے۔ اس تحریک جہاد کی حقیقت اسی کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی حکمت عملی بھی دیدنی ہے کہ جب تک دہلی میں رہے تو ما بیت کے لیے میدان ہموار کرتے رہے اور جب جہاد کے نام سے مغربی ہند کی سرحد پر پہنچ گئے اس وقت تقویۃ الایمان کو شائع کروایا گیا، تاکہ اس کی اشاعت سے جو آگ بھڑکتی ہے وہ عدم موجودگی میں بھڑکے اور مصنف مواخذے سے محفوظ رہے۔ مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے تقویۃ الایمان کی تفریط کے بارے میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے:

”مسلمانوں کی شدت مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبہ اصلاح غلو کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تفریط تھی تو دوسری جانب افراط۔ شاہ اسماعیل صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کیا..... وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔“

۱۔ غلام رسول مہر، مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۱۶

پہلے ۲۰ بی میں، پھر اردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اس میں حد اعتدال سے تجاوز کیا گیا۔ اس کا خود مصنف کو بھی احساس تھا، لہٰذا

مولانا وکیل احمد سکندر پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ) نے مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں اپنے تاثرات یوں قلمبند کیے :

”جب سے اسلام ہندوستان میں آیا، قریب ہزار برس ہوئے، کبھی ایسا ترکِ تقلید و جدال فی الدین کا پرچا نہ تھا۔ مولوی محمد اسمعیل دہلوی یہ بلا دینِ اسلام پر لائے، لہٰذا

مولانا مفتی سید عبدالفتاح، اشرف علی گلشن آبادی نے تقویۃ الایمان کی پہلی اشاعت کے سن طباعت وغیرہ کے ساتھ تقویۃ پر یوں تبصرہ کیا ہے :

”کتاب تقویۃ الایمان مؤلف مولوی محمد اسمعیل دہلوی، شہر کلکتہ میں مطبع

احمدی باہتمام سید عبداللہ بن سید بہادر علی ۱۲۴۲ھ میں مطبوع ہوئی ہے۔

مضمونِ شرک و بدعت کے دور کرنے کے واسطے جو آیاتِ متوں کی شان

میں اوریت پرستوں کے واسطے نازل ہوئی ہیں، سوائے سیاد و اولیاء

کی شان میں لکھیں اور مسلمانانِ اہلسنت و جماعت و مقلدین ائمہ اربعہ،

عام و خاص سب کو مشرک و بدعتی کہہ دیا اور فاتحہ اموات و زیارت،

وہم، ہلم، تذر و نیاز کو باطل کہا اور اعتقاد میں اہل سنت و جماعت کے

بہت سی بدعتیں داخل کر دیں اور (ابن) عبد الوہاب نجدی کی کتاب التوحید

کا سارا ترجمہ شرح و بسط سے کیا۔ غیبِ اضافی کو غیبِ مطلق بنایا اور

ایمانت و حقارتِ انبیاء و اولیاء بدرجہ کمال پہنچایا۔ ۱۲۵۱ھ میں شہر

مدراں کے نواب والا جاہ کے حضور میں مجمع علماء کے درمیان مفتی صبغۃ اللہ

لے عبدالشاہد شاہ شروانی، مولوی : باغی ہندوستان ، ص ۱۱۲

لے وکیل احمد سکندر پوری، مولانا : وسید جلیل ، مطبع مصطفائی ، ۱۳۰۱ھ ، ص ۱۸۴

قاضی الملک اور افضل العلماء محمد ارتضاعلیٰ خاں مفتی صدر عدالت سیکرٹری  
مدراکس نے مولوی محمد علی رامپوری خلیفہ سید احمد سے کتاب مذکور میں  
چند مقامات پر مباحثہ کیا اور معتقدہ کور کو کافر ثابت کر دیا اور اس مباحثہ  
کی حقیقت اور استغناء "تحفہ محمدیہ" کے صفحہ ۱۵ میں مرقوم ہے:

مولوی محمد اسمعیل دہلوی تو سکتوں سے جہاد کرنے کا نام نہاد اعلان کرتے ہوئے  
۱۲۴۱ھ میں صوبہ سرحد کی طرف چلے گئے۔ موصوف کی عدم موجودگی میں تقویۃ الایمان کا  
انگریز کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ سے ۱۲۴۲ھ میں شائع ہونا بلکہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی  
کلکتہ سے لاکھوں کی تعداد میں انگریزوں نے تقویۃ الایمان شائع کی اور پورے ہندوستان  
میں جہاں تک انگریز اسے پہنچا سکتے تھے وہاں تک ہفت پہنچاتے رہے۔ کیا یہ افسوسناک  
صورت حال اہل فکر و نظر کے لیے لمحہ فکریہ نہیں ہے؛ وہی کے ایک نیم مولوی کی تصنیف اور  
اس کی نشر و اشاعت ایسٹ انڈیا کمپنی کرے، انگریزوں، قاضی احسان الحق نعیمی مرقوم  
نے متحدہ ہندوستان میں اس خارجیت کی تخم ریزی کے بارے میں لکھا ہے:

یہ وہاں سرزمین نجد سے اٹھی۔ صحیح بخاری شریف کی حدیث میں حضور سید انبیا  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صدیوں پہلے اس کی خبر دی تھی۔ وہ آگ بھڑکی  
وہ فتنہ پیدا ہوا اور عبد الوہاب نجدی کے گزرتے تھل عرب کے بعض  
مقامات میں پہنچا، وہیں سے رز کیا گیا۔ کسی سرزمین نے اسے قبول نہ  
کیا۔ حجاز میں اس کے قدم نہ گئے، عراق و مین نے اس کو جگہ نہ دی،  
کوزہ و بصرہ میں، مصر و شام میں، ترکی و ایران میں، غرض دنیا کے کسی  
مقام میں، کسی قلمرو اور کسی ولایت میں اس فتنہ کو دخل نہ ہوا اور اس  
تلخ تخم کو کسی سرزمین نے قبول نہ کیا۔ نجد کے چھوٹے اور خشک اور بے رونق  
خطہ کے چند خشک دماغ، درندہ صفت انسانوں کے دماغ میں وہاں بیت کا

۱۰ عبد الفلاح اشرف علی گلشن آبادی، مفتی، جامع الفتاویٰ، جلد دوم، ص ۶۱

تخیل گھومتا رہا۔ مگر افسوس کہ جو چیز دیتا اسکے ہر خطہ نے ٹھکرا دی تھی افسوس کہ  
ہندوستان میں جگہ ملی، اُس کا حکم دتی میں لگایا گیا اور وہ جب کچھ بچو ماتا اُس  
کو دیوبند میں تربیت کیا گیا۔ وہاں وہ اسٹیشن صدر بڑھا کہ اُس کی شاخیں ہندوستان  
کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں اور اُن سے اِس ملک کی فضا مسموم ہو گئی اور  
اُس کے زہریلے اثر نے ملک کے بہت سے نوجوانوں کو برباد کر دیا اور فساد  
کی آگ لگا دی۔ زمانے گزر گئے مگر یہ فقرہ دفع نہ ہوا۔

موافقین یا مخالفین کی آراء پیش کرنے کے بجائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا  
محمد اسلمیل دہلوی کے اپنے تاثرات تقویۃ الایمان کے بارے میں پیش کر دینے جائیں  
چنانچہ موصوف کا ایک بیان یوں نقل کیا گیا ہے:

”میں جانتا ہوں کہ اِس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز اظہار  
بھی آگئے ہیں، بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً اُن امور کو جو شرکی خفی  
ہیں، شرک بھی لکھ دیا ہے۔ اِن وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش منشن  
فرزور پھیلے گی۔“

دیوبندی حضرات کے حکیم الامت یعنی مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ  
۱۹۴۲ء) مولوی محمد اسلمیل دہلوی مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں  
یوں وضاحت کرتے ہیں:

”مولوی اسلمیل شہید مرحوم (وہابی غیر متقدم) تھے۔ چونکہ محقق تھے، چہ شد  
مسائل میں اختلاف کیا اور اسکا پیران خود مثل شیخ ولی اللہ وغیرہ پر  
انکار فرمایا۔“

۱۔ ماہنامہ السواد الاعظم، مراد آباد: بابت شعبان ۱۳۴۹ھ، ص ۱۴، ۱۵۔  
۲۔ عبد الشاہد خاں شروانی، مولوی، باغی ہندوستان، ص ۱۵۔  
۳۔ اشرف علی تھانوی، مولوی: انداد المشائق، ص ۹،



قارئین کرام! آپ نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا اعتراف ملاحظہ فرمایا کہ موصوف نے شرک خفی کو شرک جلی ٹھہرایا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں؟ کیا کوئی شرعی احکام کی حقیقت بدلنے کا مجاز ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے ایسا کیوں کیا تھا، اس کا صاف سیدھا جواب یہی ہے کہ موصوف نے خواتین کے مذہب کو قبول کر لیا تھا اور خارجیت کا خاصہ یہی ہے کہ خارجی و نجدی عینک لگا کر دیکھنے سے سارا جہان مشرک ہی مشرک نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی تھانوی صاحب کی تصریح بھی ملاحظہ فرمائی کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا مسک اپنے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے مسک کے خلاف تھا، لیکن کہاں تک داد دی جائے ان حضرات کے دین و دیانت کی، جو مصنف تقویۃ الایمان اور ان کے تابعین کو ولی اللہی مکتبہ فکر والے بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہابی مفکر ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

”شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ اسماعیل شہید کی منصب امامت، عبقیات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ ولی اللہ صاحب کی زبان بولتی نظر آتی ہے۔“

جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، جو کسی کے مقلد ہونے کے روادار نہیں بلکہ اپنی تحقیق کی بنیاد پر عقاید و نظریات کی عمارت تعمیر کیا کرتے ہیں۔ جو محقق، مفکر اسلام۔ نابغہ عصر اور عبقری اسلام تک مشہور کیے جاتے ہیں لیکن یہاں اگر ان کی تحقیق و عبقریت کیوں لیلیٰ نجد کے مزار کی جھینٹ چڑھ گئی؟ کیا واقعی سید احمد صاحب کے خطوط کی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو پھنسانے کے لیے جھوٹی پیشگوئیاں سناں تھیں؟ کیا

لے ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید اجیائے دین، بارہشتم، ص ۱۱۴۔

صراط المستقیم کتاب کے مندرجات کی طرح شاہ صاحب نے بھی وحی و عصمت کا دعویٰ کیا تھا یا خدا تک صعود اور اُس سے ہمکلام ہونے، مصافحہ کرنے اور لین دین کرنے کے مدعی ہونے تھے؛ کیا شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں شرک خفی کو شرک جلی ٹھہرا کر مسلمانوں کو شرک بتانے کی مہم چلائی تھی؛ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ہم مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ ایسے بیانات سے حقیقت ہرگز بدل سکے گی۔ دنیا نے دنی میں آپ حضرات پر وہ پیگنڈے کے زور پر اگر مسلمانوں کی اکثریت سے ایسا ہی منوا بھی لیں تو حاصل کیا ہوا؛ کیا جب بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو کر جواب دینا پڑے گا اُس وقت یہ حربے کام آسکیں گے؛ کیا یہ دھاندلی دیاں بھی چل سکے گی؛ موصوف آگے ان ساترہ مصلحین کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

شہید صاحب اور شاہ اسماعیل صاحب دونوں روحاً و معنئاً ایک وجود رکھتے ہیں اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ لہ

سمجھنے کو مودودی صاحب جو چاہیں سمجھیں لیکن اتنی وضاحت کرنے کا حق ہمیں بھی از روئے شرع حاصل ہے کہ مسلمانوں کے دین کی تجدید کرنے والے کا گروہ اہلسنت و جماعت سے ہونا ضروری ہے کیونکہ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي كِي مَصْدَاقِ يَهِي جَمَاعَتِ هِي اُوْر اَتَّبِعُوا السَّوَادُ الْاَعْظَمُ اِسِي كِي مُتَعَلِقُ فَرَايَا كِيَا تَحَا اُوْر اِس سِي مُجْدَا هُوْنِي وَاَلُوْن كِي حَقِ يَهِي قَائِلُهُ مَن مَشَدَّ شُدَّ فِي النَّارِ سَيَا كِيَا هِي۔ وریں حالات مولوی محمد اسماعیل دہلوی جو خارجیت کے مبلغ اور زمرہ اہلسنت و جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے وہ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کے مجدد ہرگز نہیں ہو سکتے، ہاں اپنی جماعت میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح مجدد بنائے جائیں یا نبی، مسلمانوں کا اُن کی تجدید سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ موصوف نے اپنے آبا و اجداد کے مذہب اور ناجی گروہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا تھا۔ یہ اُن کا اپنا

لہ ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا: تجدید و احیائے دین، بارہشتم، ص ۱۱۵





معافی ضمیری، ثالثِ اثنین بدلیجی و حریری، المعنی وقت و موزعی اوان،  
 فرزوقِ عمد و لبید دوران، کبطلِ باطل و محققِ حق، مولانا محمد فضل حق۔ یہ حضرت  
 خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر اللہ لہ، المنعم کے اور  
 تحصیلِ علومِ عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبان  
 قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخرِ خاندان لکھا اور فکرِ وقیق نے جب سرکار کو  
 دریافت کیا، فخرِ جہاں پایا۔

جمیع علوم و فنون میں یگانے روزگار ہیں اور منطوق و حکمت کی تو گویا انہیں  
 کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بلکہ فضلاء نے دہر کو کیا طاقت ہے  
 کہ اس گروہِ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بار بار  
 دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف  
 سُننا، دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ بایں ہم  
 کمالاتِ علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا کہ فصاحت کے واسطے ان  
 کی عبارت شستہ محضرِ مزاج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی  
 طبع رسا و ستاویز بلندی معارج ہے۔ سجاں کو ان کی فصاحت سے سربلایہ  
 خوش بیانی اور امرادِ نقیص کو ان کے افکارِ بلند سے دستگاہِ سروج معانی  
 الفاظِ پاکیزہ ان کے رشکِ گوہرِ خوش آب اور معافی رنگین ان کے غیرت  
 لعلِ ناب۔ ہر وان کی سطورِ جبارت کے آگے پارِ گل اور گل ان کی عبارتِ زین  
 کے سامنے نجلِ زین

مولانا رحمن علی مصنف تذکرہ علمائے ہند نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے:

۱۔ علومِ منطوق و منقول۔ فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر و فاش الاقران و  
 استحضار سے فوق البیان داشت۔

۲۔ سرسید احمد خاں: آثارِ سناوید، ص ۵۶۲-۵۶۳

۳۔ رحمن علی، مولانا: تذکرہ علمائے ہند فارسی، ص ۱۶۴

اس عبارت کا ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں کیا ہے:

”علوم منطق، حکمت، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے“

پروفیسر صاحب مذکور اسی کے حاشیے میں علامہ مرحوم کے بارے میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

”مولانا فضل حق خیر آبادی علوم معقول کے امام تھے..... جنگ آزادی

۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مروانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل نخت خاں

کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں

گرفتا رہ گئے، مقدمہ چلا، بصورتِ دریا نے شور کی سزا ہوئی۔ جزیرہ انڈمان

بھیجے گئے۔ وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔“

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے چچا زاد بھائی یعنی مولانا مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء) بن شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی

۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۶ء) نے مصنف تقویۃ الایمان کا ڈٹ کر لکھا۔ جامع مسجد دہلی کے تاریخی

بساتے میں پُر زور حصہ لیا اور وہاں بھی اسماعیل صاحب سے بر ملا کہا کہ آپ نے جو اپنے خاندانی

مذہب کے خلاف یہاں محمد بن عبد الوہاب نجدی کی بے دینی کو رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے

اس حرکت قبیلہ سے باز آ جانا چاہیے۔ کیوں اپنے اکابر کے کارناموں پر پانی پھیرنے اور جنگِ خاندان

بننے کی ٹھان لی ہے؟ لیکن مصنف تقویۃ الایمان موع پر اُدھر اقرار کر لیتے مگر پر نالہ احساس کی

جگہ سے ذرا نہیں ہٹاتے تھے۔

چونکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۸ء) نے

فرمایا تھا کہ میں ضعف بصارت سے معذور ہوں، لہذا کتاب التوحید کا ردہ اس شرح و بسطاً

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۳۸۲

۲۔ ایضاً: ص ۳۸۲

لکھنا چاہتا ہوں جس طرح روافض کے رد میں کتاب تحفہ اثنا عشریہ لکھی ہے۔ شاہ صاحب تو کتاب التوحید کا رد نہ لکھ سکے کیونکہ بصارت ہی جواب دے گئی تھی اور اس کے بعد پیغام اجل آ پہنچا تھا۔ لیکن سفر آخرت سے پہلے اتنا ضرور کر گئے کہ مصنف "تقویۃ الایمان" کو اپنی وراثت و خلافت سے محروم کر گئے تھے۔ آپ کی آنکھیں بند ہونی تھیں کہ کتاب التوحید نے "تقویۃ الایمان" کا روپ دھاریا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کو ان کے دوسرے بھتیجے شاہ مخصوص الدین شاہ رفیع الدین نے اس طرح پورا کیا کہ تقویۃ الایمان کے رد میں "معیۃ الایمان" شرح و بسط سے لکھی اور تقویۃ الایمان کے مندرجات کو اسلام کے خلاف اور اپنے خاندانی معتقدات و مسلک اہلسنت و جماعت کے خلاف ایک چیلنج ثابت کیا۔ علمائے خاندان دہلی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وارثوں نے "معیۃ الایمان" کی تصدیق و تائید کر کے تقویۃ الایمان کے نظریات سے اپنی برائت کا اظہار کیا تھا۔ مولانا بدر الدین احمد صاحب نے مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کی ان کاوشوں کا یوں تذکرہ کیا ہے:

"شاہ معیۃ الایمان محدث دہلوی کے بھتیجے اور شاگرد، مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی اور مولانا شاہ محمد موسیٰ دہلوی، جو مولانا شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے اور خود مولوی اسمعیل دہلوی کے چچا زاد بھائی تھے، اچھ کھڑے ہوئے اور مولوی اسمعیل کے عقائد باطلہ اور ان کی بلا بیت فاسدہ کا ڈھکے بھانڈے کیا۔ مولوی اسمعیل کے رد میں فتاویٰ اور رسالے مرتب کیے جن میں مولوی اسمعیل کو ان کے عقائد باطلہ کے باعث گمراہ اور کافر قرار دیا اور حق آشکارا کرنے میں رشتہ خاندانی کا کوئی پاس و لحاظ نہ کیا۔ حضرت مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی نے خاص تقویۃ الایمان کے رد میں "معیۃ الایمان" لکھ کر واضح کر دیا کہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا علمی و نسب گھرانہ و بلا بیت نیز تقویۃ الایمان سے متنفر و بیزار ہے۔"

مولانا بدر الدین احمد، مولانا: سوانح اعلیٰ حضرت، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۸، ۱۳۹

مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے مولانا مخصوص اللہ دہلوی بی شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا کہ اپنے چچا زاد بھائی محمد اسماعیل دہلوی اور اُن کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ کتاب آپ کے خاندانی معتقدات کے مطابق ہے یا مخالف؟ اپنے سات سوالات اور مولانا مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کے جواب کو موصوف نے اپنی کتاب "تحقیق الحقیقت" کے صفحہ ۲۴ پر درج کیا اور اُسے ۱۲۹۷ھ میں بمبئی سے شائع کروایا۔ مولانا مخصوص اللہ دہلوی اس کتاب کی اشاعت کے بعد پانچ چھ سال بیعت رہے لیکن مولانا فضل رسول بدایونی نے اُن کے جوابات کو جن لفظوں میں شائع کیا تھا، اُن کے بارے میں مطلقاً کوئی بات ایسی منظر عام پر نہیں آئی کہ موصوف پر الفاظ میں کمی یا بیشی کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ دریں حالات یہ جوابات شاہ مخصوص اللہ علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ ہم وہ سوالات اور اُن کے جوابات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے دیتے ہیں:

### معرضہ

"بعد گزارش آداب تسلیمات کے معرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے معرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے وقت سے لاگوں میں بڑی نزاع ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ وہ کتاب، خلاف ہے تمام سلف صالح اور سوادِ اعظم کے اور مخالف مصنف کے خاندان کے اور احسن کتاب کی دوسے اُن کے استادوں نے لکھا ہے تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچتا اور اُن کے مخالف لگتے ہیں کہ وہ کتاب موافق سلف صالح اور اُن کے خاندان کے ہے۔ چونکہ اس بات کو جیسا آپ جانتے ہوں گے، غالب کہ دوسرا نہ جانتا ہوگا، اہل البیت اور می مافی البیت۔ اس خیال سے چند باتیں معرض ہیں۔ امید کہ جواب باصواب مرحمت ہو:

پہلا سوال: تقویۃ الایمان آپ کے خاندان کے موافق ہے یا مخالف؟  
دوسرا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ اس میں انبیاء و اولیاء کے ساتھ بے ادبی



کی ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟

تیسرا سوال: شرعاً اس کے مستف کا کیا حکم ہے؟  
چوتھا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ عرب میں وہابی پیدا ہوا تھا۔ اس نے  
یہ نیا مذہب بنایا تھا۔ علمائے عرب نے اس کی تکفیر کی۔ کیا تقویۃ الایمان  
اس کے مطابق ہے؟

پانچواں سوال: وہ کتاب التوحید جیب ہندوستان آئی، آپ کے حضرت  
عم بزرگوار اور حضرت والد ماجد نے اسے دیکھ کر کیا فرمایا تھا؟

چھٹا سوال: مشہور ہے کہ جب اس مذہب کی نئی شہرت ہوئی تو

آپ جامع مسجد میں تشریف لے گئے اور مولوی رشید الدین خان صاحب

وغیرہ تمام اہل علم آپ کے ساتھ تھے اور مجمع خاص و عام میں مولوی اسمعیل

صاحب اور مولوی عبدالحی کو ساکت اور عاجز کیا۔ اس کا کیا حال ہے؟

سانواں سوال: اس وقت آپ کے خاندان کے شاگرد اور مرید، ان

(اسمعیل دہلوی) کے طور پر تھے یا آپ کے موافق؟ امید ہے کہ جواب

ان سب مراتب کا صاف صاف مرحمت ہو کہ سبب ہدایت ناواقفوں کا،

## جواب

پہلے بات کا جواب یہ ہے کہ تقویۃ الایمان کہ میں نے اس کا نام تقویۃ الایمان

ساتھ فارغ رکھا ہے۔ اس کے رد میں جو رسالہ میں نے لکھا ہے اس

کا نام "معیذ الایمان" رکھا ہے۔ اسمعیل کا رسالہ موافق ہمارے خاندان

کے کیا کہ تمام انبیاء اور رسولوں کی توحید کے خلاف ہے کیونکہ پیغمبر سب

توحید کے سکھانے کو اور اپنے راہ پر چلانے کو بھیجے گئے تھے۔ اس کے

رسالہ (تقویۃ الایمان) میں اس توحید کا اور پیغمبروں کی سنت کا پتہ بھی

نہیں ہے۔ اس میں شرک اور بدعت کی افراد گن کر جو لوگوں کو سکھاتا ہے

کسی رسول اور ان کے خلیفہ نے کسی کا نام لے کر شرک یا بدعت لکھا ہو،

اگر کہیں ہو تو اُس کے پیروں سے کہو کہ ہم کو بھی دکھاؤ۔  
دوسرے سوال سے کا جواب یہ ہے کہ شرک کے معنی ایسے کہتے ہیں کہ اُس  
کی رُو سے فرشتے اور رسولِ خدا شرک کا حکم دینے والا ٹھہرتا ہے اور  
وہ شریک کہ شرک سے راضی ہو وہ مبغوضِ خدا ہوتا ہے۔ محبوب کو مبغوض  
بنانا اور کھوانا ادب ہے یا بے ادبی ہے اور بدعت کے معنی وہ بنائے  
پھیلاتے ہیں کہ اصفیاء اولیا بدعتی ٹھہرتے ہیں۔ یہ ادب ہے یا بے ادبی؟  
تیسرے مطلب کا جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں جوابوں سے دیندار اور  
سمجھنے والے کو ابھی کھل جائے گا کہ جس رسالہ سے اور اُس کے بنانے والے  
سے لوگوں میں بُرائی اور بگاڑ پھیلے اور خلافت سب انبیاء و اولیاء کے ہو، وہ  
گمراہ کرنے والا ہو گا یا ہدایت کرنے والا ہو گا؟ میرے نزدیک اُس کا  
رسالہ عمل نامہ بُرائی اور بگاڑ کا ہے اور بنانے والا (یعنی مصنف) فتنہ گر اور  
مفسد اور خادوی اور مغوی ہے۔ سچ اور سچ یہ ہے کہ ہمارے خاندان سے دو  
شخص ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز اور فرق نیتوں اور عیثیتوں اور اعتقادوں  
اور اقراروں کا اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بے پروائی  
سے سب چھن گیا تھا۔ مانند قول مشہور کے "چوں فرق مراتب نہ کنی ز ندیقی"  
..... ایسے ہی ہو گئے۔

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی (محمد بن عبد الوہاب نجدی) کا رسالہ  
(کتاب التوحید) تم تھا، یہ شخص (اسمعیل دہلوی) اُس کی شرح (بنام  
تقویۃ الایمان) کرنے والا ہو گیا۔

پانچویں بات کا جواب یہ ہے کہ بڑے عظیم بزرگوار (یعنی شاہ عبد العزیز  
محدث دہلوی علیہ الرحمہ) کہ وہ بیانی سے معذور ہو گئے تھے، اُس (کتاب  
التوحید) کو سنا، یہ فرمایا کہ میں اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو تحفہ  
اثنا عشریہ سا جواب، اس کے رد میں بھی لکھتا۔ اس کریم کی بخشش سے....

اس بے اعتبار نے شرح (تقویۃ الایمان) کا رد لکھا، جس (کتاب التوحید) کا مقصد بھی نابود ہو گیا۔ ہمارے والد ماجد نے اُس (کتاب التوحید) کو دیکھا نہ تھا (کیونکہ ۱۲۲۳ھ میں وہ مال ہو گیا تھا) بڑے حضرت (شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ) کے فرمانے سے کھل گیا کہ جب اُس کو گمراہ جان یا تب اُس کا رد لکھنا فرمایا۔

چھٹی تحقیق کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تحقیق اور سچ ہے کہ میں نے مشورت کی راہ سے کہا تھا کہ تم (اسماعیل دہلوی) نے سب سے جدا ہو کر تحقیق دین میں کی ہے، وہ لکھو۔ کچھ ظاہر نہ کیا۔ ہماری طرف سے جو سوال ہوئے تھے (مباحثہ جامع مسجد دہلی میں) اُس سے جواب نہیں دیا جی، ہاں جی، کر کے مسجد سے چلے گئے۔

ساتویں بات کا جواب یہ ہے کہ اُس عین تک سب ہمارے طور پر تھے پھر اُن کا جھوٹ سُن کر کچے کچے آدمی آہستہ آہستہ پھرنے لگے اور ہمارے والد کے شاگردوں اور مریدوں میں بے بہت نپکے رہے، شاید کوئی ناور پھرا ہو (دوبابی بنا ہوا) تو مجھے اُس کی خبر نہیں۔ انتہی بلفظ۔ لے

مولانا محمد مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حقیقت کے پیش نظر فرمایا کہ میں تقویۃ الایمان کتاب کو تقویۃ الایمان ہی کہتا اور لکھتا ہوں لیکن قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی ارمیانی نے تاریخ دہلی دیوبندیہ، مطبوعہ کیمپی پریس کلکتہ ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴

ہاتھ سے لکھایا تھا۔ سچ ہے یہ کتاب ایمان کو فوت کرنے والی ہے۔" ل  
 مولانا مخصوص اللہ کی طرح شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ /  
 ۱۸۱۷ء) کے دوسرے صاحبزادے یعنی شاہ محمد موسیٰ دہلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے چچا زاد  
 بھائی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے رد میں پوری طرح اپنا فریضہ ادا کیا۔ جامع مسجد دہلی کے  
 تاریخی مباحثے میں دورانِ گفتگو بھی پوری طرح حصہ لیا اور اپنے اکابر شاہ ولی اللہ محدث  
 دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ و شاہ عبدالقادر  
 رحمۃ اللہ علیہم کے مسلک کی روشنی میں مولوی عبدالحی دہلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے  
 معتقدات کی تردید کی اور انھیں اپنے بزرگوں کے مسلک سے بغاوت کرنے والے ثابت  
 کر کے دکھایا تھا۔ شاہ محمد موسیٰ نے اپنے اس عظیم کارنامے کو کتابی شکل میں "حجۃ العمل  
 فی ابطال الجہل" کے نام سے جمع کر دیا تھا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس کتاب  
 کے بارے میں یوں ذرا شرماتے ہوئے، مصنفِ تقویۃ الایمان کو چھپاتے ہوئے، وضاحت  
 فرمائی ہے:

"مولوی محمد موسیٰ کی تصنیف سے ایک علمی فارسی کتاب "حجۃ العمل فی  
 ابطال الجہل" ہماری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ہفتدہم ربیع الاول  
 ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں اتمام کو پہنچی۔ یہ کتاب ساٹھ اوراق (۱۲۰ صفحات)  
 پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مضمون ردِ وہابیت ہے۔" ل

اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء)  
 کے شاگردوں، بھتیجوں اور خوشہ چیں علمائے کرام نے مصنفِ تقویۃ الایمان کے رد میں  
 پوری پوری سرگرمی دکھائی۔ مولانا رشید الدین خاں اور مفتی صدر الدین آزاد ہر طرح پیش پیش  
 رہے، جن کا کچھ ذکر ہو چکا اور باقی تصانیف کے ضمن میں کیا جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد

لے فضل احمد قاسمی، مولانا انوار آفتاب صداقت، ج ۱، ص ۵۳۱

لے محمد ایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۹۱، ۵۹۲

المستوفی ، ۱۳۰۰ھ / ۱۹۵۸ء) کے والد ماجد کے نانا جان یعنی مولانا منور الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے شاگرد اور مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے ہم سبق تھے۔ انھوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں ایک مبسوط کتاب لکھی تھی ، جس کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد کی تصریح ملاحظہ ہو:

”اس میں تقویۃ الایمان کے تیس مسئلے ماہہ النزاع منتخب کیے ہیں اور پھر تیس بابوں میں ان کا رد کیا ہے۔ ایک رسالہ اس باب میں ہے کہ مولانا اسمعیل شہید کے عقائد کا رد خود ان ہی کے خاندان اور اساتذہ کی کتب سے کیا جائے۔ چنانچہ اس میں برسٹلے کے رد میں شاہ عبدالرحیم ، شاہ ولی اللہ ، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اقوال سے اپنے نزدیک روکیا ہے۔ کیا کسی انصاف پسند کے لیے اس کے بعد بھی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ تقویۃ الایمان کی تعلیمات کے اتذہ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المستوفی ۱۱۰۹ھ / ۱۷۶۲ء) سے ملائے اور تقویۃ الایمانی و محرم واہوں کو ولی اللہی کتبہ فکر کے علمبردار ٹھہرانے کی جرأت کرے۔ مولانا منور الدین دہلوی نے مصنف تقویۃ الایمان کو پہلے خوب سمجھایا بجھایا کہ دین میں تفرقہ بازی اور فتنہ پر بازی ایک ظلم عظیم ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن خارجیت ان کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح ساکنی تھی کہ ان کا نہایتش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور مجبوراً مولانا منور الدین کو ان کی ریہینہ کمزرت بنا دینی پڑی۔ مولانا منور الدین نے رد وہا بیت میں جس طرح سرگرمی دکھائی اس کا تذکرہ جناب ابوالکلام آزاد نے یوں کیا تھا:

”مولانا اسمعیل شہید مولانا منور الدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعسز (رحمۃ اللہ علیہ) کے انتقال کے بعد جب انھوں (مولوی اسمعیل) نے تقویۃ الایمان اور جلال العینین لکھی اور ان کے اس مسلک کا چرچا ہوا تو علماء میں پھیل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بکھر رہی مولانا منور الدین

۱۔ ابوالکلام آزاد ، مولانا ، آزاد کی کہانی ، ص ۵۰

نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کرایا پھر حرمین سے فتویٰ منگوایا۔ ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتدا میں مولانا اسمعیل او ان کے رفیق یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب کے ولما مولانا عبدالحمی کو بہت کچھ فمائش کی اور ہر طرح سمجھایا، لیکن جب ناکامی ہوئی تو بخت ورد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرہ آفاق مناظرہ ترتیب دیا، جس میں ایک طرف مولانا اسمعیل اور مولانا عبدالحمی تھے اور دوسری طرف مولانا نور الدین اور تمام علمائے دہلی۔

یہ بیان کسی ایسے عالم کا نہیں جس کو بریلوی بتا کر اس کی بات ناقابل توجہ ٹھہرا دی جائے۔ یہ دہلیوں کے امام الہند کا بیان ہے۔ کیا اس سے صاف اور صریح طور پر واضح نہیں ہو رہا ہے کہ مصنف تقویۃ الایمان نے اپنے آباؤ اجداد سے، مذہب اہلسنت وجماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ سرزمینِ پلک و ہند میں فرقہ بازی کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہاں محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کی جگہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے خارجی مذہب کو رائج کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ پس پشت کوئی ایسی طاقت کام کر رہی تھی جو کسی کی فمائش کا کوئی اثر نہیں ہونے دیتی تھی۔ گھر بار، خلاف، سارا خاندان، خلاف، متمدن ہندوستان کے تمام علمائے کرام مخالف تھے، لیکن کسی کی پروا نہیں کی۔ نہ خاندان کو خاطر میں لائے، نہ اپنے بزرگوں کا کوئی پاس لحاظ کیا اور نہ علمائے کرام کے محاسبے اور ان سے بار بار زک اٹھانے، لاجواب رہنے پر کوئی ندامت محسوس ہوتی تھی۔ پس تفریق بین المسلمین کی دھن تھی کہ پوری تندی سے اُس میں لگے رہے اور کسی بھی ڈکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ حقانیت پر تھے اور پاک و ہند کے سارے علمائے کرام سب مشرک و کافر تھے؟ کیا ولی اللہی خاندان کے اکابر مشرک و کفر کی تعلیم ہی دیتے رہے تھے اور یہ ان کی اصلاح

لے ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد کی کہانی، ص ۵۶

کرنے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے؟ آخر یہ اصلاح جو رہی تھی یا تخریب، مسلمانوں کو ملایا جا رہا تھا یا توڑنے اور منتشر کرنے کی سعی نامحسوس تھی؟ اگر جوڑنے کا پرکرام تھا، تو یہ بات ناقابل یقین ہے کیونکہ اُس وقت مسلمان ٹوٹے ہوئے اور فرقوں میں بٹے ہوئے کب تھے کہ انہیں جوڑنے کی ضرورت پڑتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض سماجی خرابیاں ان کے مذہب و معمولات میں داخل ہو چکی تھیں، ان کی اصلاح مد نظر تھی۔ اس سلسلے میں یہی عرض کر دوں گا کہ کاشش! موصون کے ارادے یہی کچھ ہوتے تو یہ تخریب قابل احترام اور لائق ستائش قرار پاتی لیکن افسوس! نعرہ کچھ ایسا ہی لگایا گیا مگر ساتھ ہی اسلامی عقائد و نظریات پر عملِ جراحی کی اس طرح مشق کی گئی کہ پتے اور پتے مسلمانوں کو بھی خوارج کی طرح بیک جنبشِ قلم مشرک و کافر ٹھہرا دیا۔ بعض اسلامی عقائد کو غیر اسلامی اور کتنے ہی غیر اسلامی اہل صریح کافرانہ نظریات کو اسلامی عقائد منوانے کی مہم پورے زور شور سے شروع کر دی گئی۔ آخر سماجی خرابیاں دُور کرنے ہی کا ارادہ تھا تو مسلمانوں کو خارجی بنانے کی مہم چلانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ کیا مسلمانوں کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دین، ان کی نجات کے لیے کافی نہیں تھا؟ کیا نجات کا ذریعہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کا دین ہے؟

مولوی ابوالکلام آزاد کے والد ماجد، مولانا خیر الدین جانہ صہری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) اپنے نانا، مولوی شہر الدین دہلوی اور مفتی صدر العین آزادہ (المتوفی ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۱ء) کے نامور شاگرد تھے۔ مددِ ہدایت میں آپ نے بھی انتہائی سرگرمی دکھائی کہ کسی طرح یہ فتنہ جوڑ پکڑنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے اور مسلمان اپنا دین و ایمان برہاد کرنے سے محفوظ ہو سکیں۔ موصون کے ایسے کارناموں کو ان کے فرزند مولوی ابوالکلام نے یوں بادلِ ناخواستہ بیان کیا ہے:

”اُسی زمانے میں علمائے مکہ نے والد مرحوم سے کہا کہ وہابی عقائد (وہابیان ہند) کی کتابیں اُردو میں ہیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے نیز نجدی عقائد کا بھی رد کافی طور پر نہیں ہوا ہے۔ شیخ احمد دحلان نے اس بارے میں خاص طور پر زور دیا اور اس طرح والد مرحوم نے ایک کتاب نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی، جو

ان کی تصانیف میں سب سے بڑی ہے۔ اُس کا نام "نجم الرجم الشیاطین" ہے۔ یہ دس جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم ہے۔ اس کی ترتیب اس طور پر ہوئی ہے کہ ایک سو چودہ مسئلے مابہ النزاع منتخب کیے ہیں۔ اتنی تعداد جزئی جزئی اختلافات کے استقصاء کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ ہر مسئلے کے لیے ایک باب قائم کیا ہے۔ اُس میں پہلے قرآن سے، پھر احادیث سے، پھر اقوالِ علماء سے رد کا التزام کیا ہے۔ اس طرح کتاب ایک سو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک جلد صرف مقدمہ میں ہے اور چونکہ وہ اُن مسائل کے متعلق نہیں ہے، اس لیے معلومات کے اعتبار سے بکار آمد ہے۔ اس میں اصولی طور پر عقائدِ اہلسنت پر بحث کی ہے اور ہر طرح کے اختلافات کو ختم کر کے اپنے مسلک کو بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے، سلم

اب ہم ذیل میں چند اُن علماء کے نام کا ذکر کریں گے جنہوں نے تقویۃ الایمان کے فتنے کو دفع کرنے کی غرض سے اس کے کئی یا جزئی رد لکھے۔ اگرچہ ایسی تصانیف کا شمار حد و حساب سے باہر ہے لیکن ہم تیرہویں صدی میں لکھی جانے والی بعض اُن تصانیف کے نام پیش کرتے ہیں جو گزشتہ روز اول کے بطور لکھی گئی تھیں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، شاہ منصور اللہ بلوچی، شاہ محمد موسیٰ بلوچی، مولانا مسعود الدین دہلوی اور مولانا خیر الدین جالندھری رحمۃ اللہ علیہم کا ذکر چھ گز چکا۔ اب بفضلہ تعالیٰ بعض دیگر علماء اہلسنت اور اُن کی کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہیں و باللہ التوفیق :

۶۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے نامور

شاگرد مولانا رشید الدین خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء)

نے مصنف تقویۃ الایمان کو خوب فہمائش کی۔ مباحثہ جامع مسجد دہلی میں علماء نے دہلی

کی سربراہی کی اور مولوی عبدالحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء) سے سوالات

سے ابوالکلام آزاد، مولوی: آزاد کی کہانی، ص ۹۰



کرتے رہے۔ آپ نے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تحصیل علم کی تھی۔ مفتی صدر الدین آزرہ کے رشتہ دار تھے۔ تعلیم و تعالیم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اسی وجہ سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے منظور نظر تھے۔ رواقی کارڈ کرتے رہے اور آخر میں رقبہ بیت میں سرگرمی دکھاتے رہے۔

۷۔ مفتی صدر الدین آزرہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء) اور مولانا فضل امام خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۲۸ء) وغیرہ سے تحصیل علم کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں قندہار اور فتویٰ جہاد کی تسدیق کی جس کی پاداش میں منصب صدر الصدوق سے معزول ہوئے اور جاہ و منقولہ غیر منقولہ چھین لی گئی۔ وہاں پر کے روز میں منہجی العقول فی نسوح حدیث لاشذہ المرحال کتاب لکھی۔ آپ کا کتب نام مجموعہ ۱۰۰۰ میں حکومت نے ضبط کیا تقریباً تین لاکھ کی مالیت کا تھا۔

۸۔ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے تحصیل علم بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی تھلی (المتوفی ۱۲۴۵ھ/۱۸۱۹ء) کے شاگرد رشید، مولانا نور الحق فرنگی محلی (المتوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۲ء) سے کی۔ مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سخاوت علی جرن پوری، مفتی اسد اللہ آبادی، مولانا شاہ احمد سعید رامپوری اور مولانا عنایت رسول چریا کوٹی جیسے مشاہیر علماء کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ سندھ ہائیم کے رد میں مثالی کارنامہ انجام دیا۔ "بوارق محمدیہ" ان کے رد میں شرح و بسط سے لکھی، جس کا ترجمہ مولانا غلام قادر بھیروی سنہ اردو میں "شوارق محمدیہ" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۲۶۵ھ میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ "استقاق حق" اور "تصیح المسائل" کے ذریعے ان کے باطل مذہب کا رد کیا۔ "سیف الجبار" بھی ۱۲۶۵ھ کی تصنیف ہے اور اس میں نجدی اور ہندی وہابیوں کے

مکائد و مظالم، ان کی تاریخ اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کے مضامین میں باہم مطابقت دکھا کر مبرہن کیا ہے کہ حقیقت میں یہ دونوں مذاہب ایک ہیں۔ مولانا نے عقائد اہلسنت و جماعت کو ایک عربی تصنیف "المعتقد المنتقد" میں منضبط فرمایا اور اس کتاب کے ذریعے بھی ضمنی طور پر وہابی عقائد و نظریات کی تردید ہوتی ہے۔ یہ تصنیف لطیف علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۸ھ / ۱۸۹۱ء) کی مصدقہ ہے۔ یہی وہ مبارک تصنیف ہے جس پر امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ (المتوفی ۱۲۴۰ھ / ۱۸۶۱ء) نے "المعتقد المستند" کے نام سے حاشیہ لکھا اور اس میں گمراہ گروں کے پانچ سرغنوں کی تکفیر کا شرعی فریضہ ادا کیا تھا۔

۹۔ مولانا کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء - ۱۳۰۲ء) یہ سید احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے مرید اور خلیفہ تھے لیکن مکائد ظاہر ہونے پر دوبارہ زمرہ اہلسنت میں واپس آگئے۔ وہابیہ کی "تقویۃ الایمان" کے رد میں "قوة الایمان" لکھی۔ اس کے نزو، ان باتہ بین فی تردید میں اور متعدد رسائل لکھے۔

۱۰۔ مولانا سید جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ / ۱۸۵۶ء) عرف اللہ والے، نائب: یہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ تقویٰ و طہارت اور عوام حدیثیہ میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ انہوں نے تقویۃ الایمانی عقائد و نظریات کے رد میں رسالہ "صاعقہ راہبہ در رد عقائد وہابیہ" لکھا۔

۱۱۔ مولانا ترازاب علی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء) نے "سبیل النجاة الی تحصیل السلام" کے نام سے تقویۃ الایمان کا رد لکھا ہے۔

۱۲۔ مولانا برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ ساکن دیوبند، مشہور فقیہ اور محدث ہو گزرے ہیں۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں جو حنفی وہابی اختلاف پر سب سے پہلا اور تاریخی مناظرہ ہوا تھا۔ موصوف نے "محاکمہ" کے نام سے اس مباحثے کی مکمل روڈ اور درج کر کے وہابیہ کے دلائل کا رد کیا ہے۔

۱۳۔ مولانا محمد سعید اسلمی مدرسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۵۵ء) نے تقویۃ الایمان

کے رزمیہ سفینۃ النجات نامی کتاب لکھی اور تحفہ اثنا عشریہ مصنفہ شاہ عبدالعزیز  
محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) اور زوہد میں ترجمہ بھی  
کیا تھا۔

۱۴۔ مولانا خلیل الرحمن مصطفیٰ آباری رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رزمیہ کتاب رسم الخیرات  
لکھی جو ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۲ء میں سنہ ۱۸۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

۱۵۔ مولانا محمد عبداللہ خراسانی فخرانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء) نے مصنف  
تقویۃ الایمان کا "السیوف المدقذ علی خزائن الفاسقہ" کتاب لکھ کر رد کیا۔ یہ کتاب  
مطبع قیسریہ سے ۱۳۰۶ھ/۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ کے سرتاج العلماء،  
مفتی شافعیہ، سید احمد دسلان مکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) سے موصوف  
نے تفسیر حدیث اودقہ کی کسبیں حاصل کی تھیں۔ مذکورہ کتاب "السیوف ابارقہ"  
بھی حضرت مفتی شافعیہ کی مصدقہ ہے۔ مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں موصوف  
یوں لکھتے ہیں رقمطراز ہیں:

فان قيل ان العلقه الهندی  
اسمعیل الدہلوی کان من  
تلامذۃ مولانا الشاہ عبدالعزیز  
رحمۃ اللہ علیہ فلیف یومئذ  
عن دینہ وقلت لحدث الباطن  
وحب الریاضۃ کالمستذین  
الاولین کانوا یحضرون مع  
النبی صلی اللہ علیہ وسلم  
فی الحج والجهاد والصوم  
والصلوة۔  
الذکوئی یہ کہتے کہ محمد ہندی اسمعیل  
دہلوی جبکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی  
رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے تو وہ  
اپنے دین اسلام سے کس طرح  
پھریکتے تھے؛ میں کہتا ہوں کہ سابقہ  
مردوں کی طرح باطنی خجاست اور جوہس  
ریاست کے باعث ایسا ہوا، حالانکہ  
وہ لوگ بھی تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم  
کے ساتھ حج، جہاد، روزہ اور نماز  
میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۱۶۔ مولانا کریم اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اور مولانا رشید الدین خاں علیہ الرحمہ  
(المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء) وغیرہ سے تحصیلِ علوم کی۔ سید آل احمد عرف اچھے میاں  
مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء) سے شرفِ ارادت اور اجازت و  
خلافت حاصل تھی۔ وہابیہ کے رد میں آپ نے "ہادی المصلین" کتاب لکھی۔

۱۷۔ مولانا سید عبدالفتاح المعروف بہ مفتی اشرف علی گلشن آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلِ علوم  
مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) اور کئی دیگر علمائے کرام  
سے کی۔ مصنفِ تقویۃ الایمان کے رد میں اور ان کے مکائد کا رد کرتے ہوئے  
ایک کتاب "تحفہ محمدیہ فی رد وہابیہ" شرح و بسط سے لکھی۔ دوسری "تائید الحق" جو  
۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔

۱۸۔ مولانا محمد آسن واعظ پشاور کے معروف بہ حافظ و راز رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۳ھ /  
۱۸۴۷ء) ایک مشہور بزرگ اور قبحِ عالم جو گزرے ہیں۔ ساری عمر درس و تدریس اور  
تصنیف و تالیف میں گزارے۔ بخاری شریف کی "منہج اباری" کے نام سے فارسی  
میں شرح لکھی اور شرح قاضی مبارک پر فاضلانہ حواشی لکھے۔ انہوں نے مصنف  
"تقویۃ الایمان" کو بارہا فحاشی کی اور علی گشتک کے ذریعے انہیں تطیہ اور رنج یدین  
وغیرہ مسائل میں لاجواب کرتے رہے۔ جب ان کے فاضلانہ و مختصانہ دلائل کے سامنے  
موصوف کی کسی طرح پیش نہ گئی تو موصوف نے خارجیت کا پرنا لہ وہیں رکھا لیکن  
رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ان وہابیوں نے ہند سے پنجاب میں جو علمائے اہلسنت نے  
شہرہ آفاق مناظرہ کیا تھا اس میں آپ بھی موجود تھے۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی اس  
مناظرے میں ہر موضوع پر ساکت و صامت ہوئے اور خارجیت و نجدیت سے تائب  
ہونے کا اعلان کر دیا تھا، لیکن فوراً بعد ہی بعض وہابی علمائے کہنا شروع کر دیا کہ  
مصنفِ تقویۃ الایمان نے وہابیت و خارجیت سے توبہ کرنے کا کوئی اعلان نہیں  
کیا تھا۔ یہ ان پر بہتان ہے۔ قربان جاہیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی  
کے محتاطانہ پر کہ آپ نے اسی شہرت توبہ کی بنا پر مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی

- ۱۲۳۶ھ/۱۸۳۱ء کی تکفیر سے اجتناب کیا حالانکہ ان کی تصانیف میں کتنی ہی عبارتیں صریح کفریہ ہیں جن کی آج تک کوئی اسلامی تاویل نہیں کی جاسکی۔ حالانکہ اس واقعے سے چھ سال پہلے علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۰۸ھ/۱۸۶۱ء) نے ۱۲۴۰ھ میں "تحقیق الفتویٰ" کے اندر مصنف تقویۃ الایمان کی جامع مسجد دہلی میں تکفیر کی اور ولی اللہی خاندان کے علماء، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے علمی فرزندوں، دیگر علمائے دہلی اور علمائے شاہجہان پور نے اس فتوے کی تصدیق و تائید مہری و دستخطی فرمائی تھی۔ مولانا محمد آسن پشاوری نے دیکھا کہ یہ لوگ بیعت خوارج کی طرح توحید اور شرک کو آپس میں گڈ مڈ کر رہے ہیں لہذا ان کی ترویج میں کتاب "تحقیق توحید و شرک" تصنیف فرمائی تھی۔
- ۱۹۔ مولانا محمد صبغتہ اللہ دراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "گلزار ہدایت" نامی کتاب لکھی جو مطبع کشن راج مدراس سے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔
- ۲۰۔ مولانا محمد خلیل الرحمن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "میراث" کتاب لکھی اور اسے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۲ء میں بمبئی سے شائع کروایا تھا۔
- ۲۱۔ مولانا محمد جید علی کھنوی ثم جیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) نے تحصیل علم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہم سے کی۔ فی مناظرہ اور علم کلام میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ رد افض سے مناظرہ کرنے میں اپنی نظیہ نہیں رکھتے تھے۔ جیدر آباد کن میں قاضی القضاہ رہے۔ "رد تقویۃ الایمان" کتاب بڑی کاوش و جستجو سے لکھی، جس کے آخر میں "مراۃ المستقیم" کتاب کے بارے میں علمائے دہلی و کھنؤ کے فتوے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۳ء میں لکھی گئی۔
- ۲۲۔ مولانا سید معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۹۶ء) سجادہ نشین احمد آباد نارہ نے وہاں کے رد میں "ہدایت المؤمنین الی سلسلۃ الصالحین" کے نام سے کتاب لکھی اور اسے مطبع نوکٹور کھنؤ سے ۱۲۶۵ھ/۱۸۵۹ء میں شائع

کروایا گیا۔

- ۲۳۔ مولانا محی الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء) نے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل اپنے والد ماجد مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) سے کی اور اپنے جد امجد مولانا عبد المجید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء) سے شرفِ ارادت حاصل کیا۔ مولانا فضل رسول بدایونی کی کتاب "احقاقِ حقی" کا کسی وہابی نے "سراج الایمان" کے نام سے جواب لکھا تھا۔ آپ نے اُس "سراج الایمان" نامی کتاب کا قلم توڑ جواب "شمس الایمان" کے نام سے لکھا اور ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں اُردو اخبار پریس دہلی سے شائع کروایا۔
- ۲۴۔ مولانا مفتی علی خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۸۰ء) جو امام اہلسنت و مجدد مائتہ حاضرہ، مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) کے والد ماجد ہیں، آپ نے تعویۃ الایمان کے رد میں "تزکیۃ الایقان فی ردّ تعویۃ الایمان" کتاب لکھی۔ آپ کے زمانہ میں حنفیت کا دعویٰ کرنا اسلئے وہابیوں کا ظہور ہو چکا تھا، اُن کے رد میں متعدد کتابیں لکھ کر مذہب اہلسنت کا دفاع کیا۔ تین چیزیں آپ کی تصانیف میں بہت نمایاں ہیں: (۱) درسِ عشقِ رسول، (۲) مذہب اہلسنت و جماعت کا دفاع، (۳) بد مذہبوں کا رد، خصوصاً دیوبندیوں اور نچریوں کی تخریب کاری کا سترباب۔
- ۲۵۔ مولانا قاضی ارتضیٰ علی خاں گوپاموی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء) اور بقول بعض ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء) نے جو در اس کے قاضی القضاة تھے اور صدر اور علا جلال وغیرہ کے حواشی اور شروح لکھ چکے تھے، اُنہوں نے "خطبہ الحاقیہ" کے نام سے وہابیہ کے رد میں کتاب لکھی۔
- ۲۶۔ مولانا سید بدر الدین جید آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے رد میں رسالہ "احقاقِ الحق" تصنیف کیا۔
- ۲۷۔ مولانا محمد عمر امپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) نے وہابی عالم

محمد رحیم بخش پنجابی کا رد کیا تھا۔ موصوف تقویۃ الایمان کے حامی تھے اور آپ نے ان کے جملہ مزعموں و دلائل کے تار پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اس کے علاوہ مولوی محمد حسین بٹالوی، وکیل غیر مقلدان کے بارہ سوالات کا مسکت جواب دیتے ہوئے ایک رسالہ مرتب کیا جس کا نام "عشرہ مبشرہ" ہے۔ یہ کتاب ان کے تبحر علمی کی دلیل اور نہایت بلند پایہ ہے۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں ریاض ہند پریس امرتسر میں طبع ہوئی۔ اول الذکر کتاب کا نام "فتح الاسلام فی مرآة اصغاث الاحلام" ہے اور وہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں نامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔

۲۸۔ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے مصنف تقویۃ الایمان کے رد میں ایک پر لطف کتاب "فیوض ارواح القدس" کے نام سے بھی لکھی تھی اور اس میں یہ التزام کیا تھا کہ مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے عقائد و نظریات کو ان کے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ عبدالرحیم دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۹ء) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ/۱۷۱۲ء) اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/۱۷۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کے عقائد و نظریات کے خلاف ثابت کر کے دکھایا ہے۔

۲۹۔ مولانا ہدایت اللہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں پر سب کے رد میں "سبیل النجاح فی تحصیل الصلاح" کتاب لکھی۔

۳۰۔ مولانا قاضی محمد حسین کو فی رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں پر سب کے رد میں "ہدایت المسلمین الی طریق الحق والیقین" کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں بمبئی سے طبع ہوئی تھی۔

۳۱۔ مولانا شاہ عبدالحمید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء) جن کو شرف ارادت شاہ آل احمد مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۹ء) سے حاصل تھا۔ آپ کی بیعت کے واقعہ کو مولانا جس علی مرحوم نے تذکرہ علمائے ہند میں یوں بیان کیا ہے،

”علم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد مرشدِ کامل کا خیال پیدا ہوا اور ہر طرف شیخِ کامل کی تلاش شروع کی۔ چونکہ بہت سے مشائخِ وقت (کامل طور سے) شریعت کا اتباع نہیں کرتے تھے اس لیے اُس گروہ سے نفرت شروع ہو گئی۔ قسمت یاد تھی۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت ہادی المصلین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جناب محبوب سبحانی، غوثِ صمدانی، شیخ عبدالقادر جیلانی۔ مخدوم الانام، کاننک گنج شکر شیخ فرید الدین نیز دوسرے اولیاءِ (رحمۃ اللہ علیہم) موجود ہیں۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ سے جناب غوثِ الاعظم نے صاحبِ ترجمہ (مولوی عبدالمجید بدایونی) کا ہاتھ، شاہ آل احمد مارہروی کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب وہ بیدار ہوئے تو مارہرو کا راستہ لیا اور اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زہد و تقویٰ اور اتباعِ شریعت کو کامل طور سے پایا، اُن کے مرید ہوئے، خلافت سے سرفراز ہوئے، اپنے مرشد سے ”عین الحق“ کا لقب پایا۔“

آپ مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) جیسے نابغہ عصر کے والد ماجد اور حضرت آل رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) جیسے گوہرِ یکتا کے استاد تھے۔ آپ نے بتدوین زمانہ کے رد میں ”رسالہ رد و ہاب یہ“ تصنیف فرمایا تھا۔

۳۲۔ مولانا فخر الدین احمد آلہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء) نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی بانی وہابیت کی تردید میں ”رسالہ اذالۃ الشکوک والادھام بجواب تقویۃ الایمان“ شرح و بسط سے لکھا۔

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۲۳



۳۳۔ مولانا سید حیدر شاہ حنفی قادری رحمۃ اللہ علیہ متوطن کچھ بھوج المعروف پیر بھروہ نے  
مبتدعین جدید کے رد میں "ذوالفقار الحیدریہ علی اعناق الوہابیہ"  
کتاب لکھی۔

۳۴۔ علمائے دہلی و علمائے حرمین کے فتاویٰ کا مجموعہ بنام تنبیہ الضالین و ہدایۃ  
المسالحین جس میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی محمد اسحق دہلوی کے نجدی عقائد و  
خلاف اہلسنت مسائل کی تردید ہے۔

۳۵۔ مولانا سید جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ / ۱۸۵۶ء)۔ یہ  
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۴۲ء) کے شاگرد تھے۔  
انہوں نے دو ایسا بیان ہند کے عقائد کی تردید میں رسالہ "صاعقہ سماویہ در رد عقائد  
وہابیہ" لکھا، جو قلمی صورت میں موجود ہے۔

۳۶۔ مولانا حافظ محمد عبداللہ بگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء)۔ آپ حضرت  
فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) اور مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی  
۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء) کے شاگرد تھے۔ مفتی شافعیہ مدرس مدرسیت الحرام،  
سید احمد دحلان رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء) سے تفسیر، حدیث اور فقہ  
کی سند حاصل کی۔ وہابیت کے رد میں "رسائل دوہابیت" کتاب لکھی۔

۳۷۔ علمائے بریلی نے تقریر "الایمان کے دو درجے" صحیح الایمان و ردو تقریر الایمان کے  
نام سے ایک متفقہ کتاب سنوارنے کی۔

۳۸۔ مدرس کے پینتیس علمائے اہلسنت نے تقریر الایمان کے عقائد و نظریات کو  
غیر اسلامی اور کفر پر بتایا اور ۱۳۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں وہ مجموعہ شائع ہوا۔ ان  
علمائے کرام نے اپنے فتوؤں میں اذکار ثلاثہ سے ثابت کیا ہے کہ تقریر الایمانی  
عقائد و نظریات، اسلامی عقائد کے خلاف اور اشاعت کفر و خارجیت ہیں۔ جو اس  
کتاب کو اسلامی سمجھیں اور اس کے پیش کردہ عقائد کو درست جانیں وہ اسلام سے  
انحراف کرنے والے ہیں۔

۳۶۔ مولانا معین الحق رحمۃ اللہ علیہ پہلے وہابیوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مطلع ہونے پر تقویۃ الایمان اور صراط المستقیم کے رد میں رسالہ ”جواہر منظومہ“ لکھا، جو مطبع جعفریہ سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں طبع ہوا۔

۳۷۔ علمائے حیدرآباد دکن نے تقویۃ الایمان کے غیر اسلامی نظریات کا رد کرتے ہوئے اپنے فتوؤں کا ایک مجموعہ ”رد تقویۃ الایمان“ کے نام سے شائع کروایا۔

۳۸۔ مولانا سید ابوالسعود مفتی مدینہ منورہ رحمۃ اللہ علیہ کی مہری دستخطی تصدیق کے ساتھ وہابیوں کے رد میں اور ان کے متعلق شرعی حکم بیان کرتے ہوئے علمائے حرمین شریفین کے فتاویٰ کا مجموعہ ”فتویٰ حرمین شریفین“ کے نام سے ۱۲۶۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اس میں تقویۃ الایمان اور اس کے مصنف کا رد ہے۔

۳۹۔ مولانا فیض اللہ رحمۃ اللہ علیہ پنجابی نے ۱۲۶۰ھ/۱۸۵۴ء میں مصنف تقویۃ الایمان کے رد میں طریقۃ المسلمین، مذہب سنیہ رد وہابیہ“ بمبئی سے شائع کروایا۔

۴۰۔ مولانا جمال الدین فرنگی محلی ثم مدراسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۹ء) نے جدید فرقہ وہابی اور ان کے تقویۃ الایمانی نظریات کے رد میں ایک کتاب ”جمال الملکت والدین“ کے نام سے ۱۲۶۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع کروائی۔ آپ نے مختلف درسی کتب پر حواشی لکھے اور نواب غلام غوث خاں، رئیس کرنامک کے آپ استاد تھے۔ تبحر علمی اور سخاوت میں مشہور تھے۔

۴۱۔ مولانا احمد علی خلیفہ شیخ عبدالغفور عربی حضرت اخوند رحمۃ اللہ علیہا نے وہابیوں کے رد میں ایک عربی کتاب ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں مطبع حیدری بمبئی سے بنام ”مدیان المؤمنین علی عقائد المسلمین“ شائع کروائی۔

۴۲۔ مولانا عبدالسبحان پشاوری مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں علمائے حرمین شریفین سے فتوے حاصل کیے۔ آپ نے ان کا مجموعہ مع اردو ترجمہ مطبع ہاشمی مدراس سے ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں شائع کروایا۔

۴۳۔ مولانا محمد عبدالسبحان احمد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) نے

وہابیوں کے رد میں دلائل قاطعہ در تحقیق فرقہ ناجیہ، خیر المقالہ فی ازالۃ المجاہد اور التہدید فی وجوب التقلید وغیرہ کتب و رسائل لکھے۔

۴۷۔ علمائے قاہرہ و مصر نے ہندوستانی زندیقوں کے بارے میں حکم شرع بیان کرتے ہوئے فتوے جاری کیے، ان کا مجموعہ بنام "رسالہ زندیقیہ" بمبئی سے شائع ہوا۔

۴۸۔ مولانا محمد عمر امپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) نے وہابیہ کے رد میں "سجوماً للشیاطین و دافع وساوس الخناس" لکھا، جو ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۴۹۔ مولانا عبدالرحمن سلمٹی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیوں کے رد میں "سیف الابرار المسلول علی الکفار" کے نام سے ایک کتاب ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع کروائی۔

۵۰۔ مولانا جلال الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بتدوین ہند کے رد میں "شواہد الحق" کتاب لکھی اور ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۸ء میں چھپی۔

۵۱۔ مولانا مخلص الرحمن چانگامی علیہ الرحمہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "شرح الصدور فی دفع الشروز" کتاب لکھی۔

۵۲۔ مولانا سید لطیف الحق بن مولانا سید غلیل الحق قادری بتاوی رحمۃ اللہ علیہما نے مسلمانوں کو خارجیت کے شر سے بچانے کی غرض سے "صلاح المؤمنین فی قطع الخارجین" کتاب لکھی، جو قلمی نسخہ کی صورت میں موجود ہے۔

۵۳۔ مولانا محمد عبداللہ سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ شفاعت و استواد و تصرف میں تقویۃ الایمانی نظریہ کا بالغ رد کرتے ہوئے کتاب "تحفۃ المسلمین فی حیات سید المرسلین" لکھی۔ یہ بھی قلمی موجود ہے۔

۵۴۔ مولانا معلم ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء) خطیب جامع مسجد بمبئی نے نجدی عقائد کی روک تھام کے پیش نظر کتاب "نعم الانتباہ لدفع الاشتباہ" لکھی۔

۵۵ - مولانا خیر الدین مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کی تردید میں "خیر الزاد لیسوم المعیاد" نامی کتاب لکھی۔

۵۶ - مولانا خادم احمد فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء) - آپ شرح وقایہ کے شارح بھی ہیں۔ انہوں نے منکرین تقلید کے رد میں "ہدایت الانام فی اثبات تقلید الائمة الکرام" کتاب لکھی۔

۵۷ - مولانا سلامت اللہ بدایونی کان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء) - آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہما کے نامور شاگرد تھے۔ موصوف کو ان بزرگوں سے تفسیر و حدیث اور خاندان ولی اللہی کی اکثر تصانیف کی سند و اجازت حاصل تھی۔ انہوں نے وہابیان ہند کے رد میں رسالہ اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام اور رسالہ در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین لکھا۔ آپ ایک تبحر عالم دین اور سیکڑوں علماء و فضلاء دہر کے استاد ہو گزرے ہیں۔

۵۸ - مولانا عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) - آپ اہلسنت کے بانی ناز عالم دین و بزرگ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) کے فرزند ارجمند اور امام معقولات و جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے مجاہد اعظم و ناسخہ فتویٰ جہاد، اسیرانڈمان، حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز اور سربراہ روزگارا شاگرد ہوئے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی سرپرستی میں جب ندوۃ العلماء کی تحریک کا پتھر چلایا گیا تو آپ نے سرگرمی سے اس کی مخالفت کی۔ وہابیہ کے رد میں "احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام (عربی)، سیف الاسلام والمسئول علی المناع لجمال المولد والقیام (فارسی)، حقیقۃ الشفاعہ اور شفاعہ السائل وغیرہ کتب و رسائل آپ کے تبحر علمی اور حق پسندی کے روشن دلائل ہیں۔

۵۹ - نواب قطب الدین خاں دہلوی (المتوفی ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء) - آپ نے مشکوٰۃ

انسابیح کی اردو میں "مظاہر الحق" کے نام سے شرح لکھی۔ آپ نے غیر مقلدین کے رد میں "نور الحق" ، توفیر الحق اور تحفۃ العرب والعجم وغیرہ رسائل لکھے۔ انتقال تک معظمہ میں ہوا تھا۔ آپ غیر مقلدین کے خلاف اور مقلد و باہی تھے

۶۰۔ مولانا محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۰۲ھ / ۱۰۲۹ء) نے عالم جوانی میں مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وہاں سے رد میں رسالہ "حیات النبی" عربی زبان میں لکھا تھا۔

۶۱۔ مولانا مفتی ولی اللہ فرخ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۲ء)۔ فاضل اہل اور مفسر قرآن تھے۔ وہاں سے رد میں "سبب التوسل الی جناب سید الانبیاء والاسل" کتاب لکھی۔

۶۲۔ مولانا مفتی مارث رحیمین رام پوری نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۳ء)۔ اہل علم میں آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ سرگودہ غیر مقلدان ، میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) کی کتاب "معیار الحق" کا ایسا وسیع انٹروی سے فاضلانہ رد "انتصار الحق" کے نام سے لکھا کہ کسی غیر مقلد کو انتصار الحق کا جواب لکھنے کی آج تک جرأت نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے ۸۰ صفحات ہیں۔

۶۳۔ مولانا وکیل احمد مسکنہ ریوسی رحمۃ اللہ علیہ مشہور عالم دین اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۹ء سے حیدرآباد دکن، سرکار آصفیہ کی ملازمت میں رہے۔ وہاں سے رد میں "ارشاد العنود الی طریق ادب عمل المنور" نامی کتاب لکھی۔

۶۴۔ مولانا محمد شوکت علی صدیقی سندھی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ مشہور عالم اور بزرگ ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے مولوی محمد اسحاق دہلوی کی ماتہ مسائل کے غلط دلائل و مسائل کا راز کھولنے اور ان کو خفیہ و باہت کار از افشاء کرنے کی غرض سے "افہام المسائل بجواب ماتہ مسائل لکھی اور "علم الیقین فی مسائل الاربعین" بھی آپ کی قابل دید تصنیف ہے۔

۶۵۔ مولانا عبدالکريم درویش رحمۃ اللہ علیہ نے شفاعت کے بارے میں تقویۃ الایمانی نظر بتا

کے رد میں بنام "جو اہر الایقان فی شفاعت رسول الانس والجان" تصنیف فرمائی۔

۶۶۔ مولانا حیدر علی رام پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۶ء)۔ آپ نے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) سے

حدیث کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے رد میں "انہام الغافل در تفہیم المسائل کتاب لکھی۔

۶۷۔ مولانا عبدالغفور خاں نساح رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی

(المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) وغیرہ غیر مقلدین کے رد میں "نصرة المسلمين، الرد

على غیر المقلدین" کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۸۹ھ / ۱۸۶۹ء میں مطبع حامی الاسلام

دہلی سے باہتمام فیض الحسن خاں صاحب طبع ہوئی۔

۶۸۔ مولانا صبغتہ اللہ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے منکرین حیات انبیاء کے رد میں "تنبیہ الانبیاء

فی حیات الانبیاء" نامی کتاب لکھ کر ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء میں مدراس سے شائع کروائی۔

۶۹۔ مولانا بشیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مقلد و غیر مقلد و ایوں کی گمراہی و گمراہ گری

کے بارے میں ایک فتویٰ لکھا اور تمام علمائے دہلی نے اس کی تائید و تصدیق میں

مہر و دستخط کیے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ازراہ تفتیہ اور ان دنوں اپنی جماعت کا

وجود و عدم برابر دیکھتے ہوئے غیر مقلدوں کے شیخ الکل اور سرپرست میاں نذیر حسین

دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) نے بھی اس فتویٰ کی تائید کرتے ہوئے

مہر و دستخط کیے ہوئے ہیں۔ یہ مبارک فتویٰ مطبع بنیدالانتہاریہ سے ۱۲۶۲ھ /

۱۸۴۶ء میں طبع ہوا۔

۷۰۔ مولانا محمد شاہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے میاں نذیر حسین دہلوی کی کتاب "معیار الحق"

کے رد میں بسوط کتاب "دار الحق فی رد معیار الحق" لکھی، جو مطبع حسنی دہلی

سے ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی۔ صفحات ۴۸۸ ہیں۔

۷۱۔ مولانا منصور علی بن مولانا محمد حسن مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہما نے غیر مقلدین کے

رد میں "فتح المبین فی کشف مکائد غیر مقلدین" کے نام سے ایک بسوط کتاب لکھی

اور اس کا ضمیر "تنبیہ الوبابین" کے نام سے لکھا۔ کتاب ۵۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس پر دہلی، حیدرآباد اور بریلی کے ۳۳ علما نے کرام کے دستخط ہیں۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۲ء میں یہ کتاب مطبع دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے باہتمام مولانا محمد یعقوب طبع ہوئی۔

۶۲۔ مولانا محمد امیر الدین اکبر آبادی علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کے بہتر سوالات کے مسکت جواب "انوار محمدی" کے نام سے لکھے اور وہ کتاب مطبع نذکثور لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی۔

۶۳۔ مولانا حافظ محمد یعقوب دہلوی علیہ الرحمہ نے مسئلہ شفاعت میں وہابیہ کے نظریات کا رد کرتے ہوئے کتاب "افضل البضاعة فی حقیقة الشفاعة" لکھی۔

۶۴۔ مولانا محمد عظیم علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کی فحاشی کے لیے اثبات و جواب تفسیر شخصی بالقرآن والاحادیث النبوی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو احسن المطابع پٹنہ سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں چھپی۔

۶۵۔ مولانا محمد عبدالرشید بن مولانا محمد عبدالکیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہا نے منکرین تقلید کے رد میں "القول الرشید فی اثبات التقلید" کتاب لکھی جو مطبع احمد قلندر معسکر بنگلور سے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں چھپی۔

۶۶۔ مولانا محمد مجید الدین سہاروی پروردی علیہ الرحمہ نے وہابیہ کے رد میں "اعانة المسلمین فی امور الدین" کتاب لکھی۔

۶۷۔ مولانا زین العین حنفی درابھی علیہ الرحمہ نے "القول المتین" کتاب لکھی وہابیہ کا رد کیا اور اسے مطبع منظر التجائب دراس سے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں طبع کروایا۔

۶۸۔ مولانا قادر علی قادر پوری رحمۃ اللہ علیہ نے "دلیل الیقین فی رد المنکرین" کتاب وہابیہ کے رد میں لکھی۔ یہ مطبع قادریہ کلکتہ سے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں طبع ہوئی۔

۶۹۔ مولانا احمد حسن کان پوری رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حاجی امداد اللہ مہاجر تکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۹ء) کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ مولوی محمد اسمعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں کنایت اور یکہ وزی میں صراحت جو اسکا کذب کا غیر اسلامی بلکہ

خلافتِ اسلام نظریہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اُس کے رد میں اور جملہ حمایت کرنے والوں کی تردید کرتے ہوئے کتاب "تذریب الرحمن عن شائبۃ الکذب النقصان" لکھی۔

۸۰۔ مولانا عبد السبحان ہسوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۹ء)۔ آپ حضرت

شاہ احمد سعید مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۴ھ / ۱۸۶۰ء) کے خلیفہ تھے۔

مکریں تقلید کے رد میں ایک کتاب "التہدید فی وجوب التقلید" کے نام سے لکھی۔

اسی طرح دیگر کئی ہی علمائے اہلسنت اور علماء دین و ملت نے وہابیہ کی تردید میں

مختلف کتب و رسائل لکھے اور "گرہ بستن روز اول" پر عمل کرتے ہوئے اس نجدی پودے

کو پروان چڑھنے سے پہلے بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے پر تیار ہو گئے، تقریر و تحریر کے ہر میدان

میں ان کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ خود ولی اللہی خاندان کے علمائے کرام اور شاہ

عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے خوشہ چین حضرات

یعنی علمی و روحانی فرزندوں نے بڑھ چڑھ کر ان خارجیت کے علمبرداروں کا محاسبہ کرنا

شروع کر دیا تو مصنفِ تقویۃ الایمان کا رشتہ اپنے خاندان اور دہلی مرکز سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ تبصیح

بھی ٹوٹنے شروع ہو گئے، مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے کٹ کر جو اپنا "محمدی گروہ"

بنانا شروع کیا تھا، بہت سے مسلمان خیروار ہونے پر اس سے علیحدگی اختیار کرنے لگے اور

اس طرح برٹش گورنمنٹ کا پہلا تحریری منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

دوسرے منصوبے کے دوران، مولوی محبوب علی کی

دیوبندیت کی ابتدا: اس تحریر سے علیحدگی بلکہ مخالفت کے بعد جب

سید احمد صاحب کے پاس امدادی سامان و رقوم کی ترسیل کا سلسلہ اور نئی بھرتی کر کے

افرادِ امداد بھیجنے کا معاملہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا، تو مرکز سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی،

ادھر مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء) جانشین شاہ عبد العزیز محدث

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) بھی دولت کی ادھر فراوانی دیکھ کر کسی قدر

مائل ہو چکے تھے، لہذا جلد ہی ان کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا یا قائم کر دیا گیا۔ مولوی محمد اسحاق

دہلوی بڑی حد تک صلح کمال اور خاموش طبع عالم تھے۔ اس خارجی ٹولے کے ساتھ بھی



کسی قدر ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی لیکن ایسے انداز میں کہ وہابیوں کی جوڑ سوائی ہو رہی تھی اُس سے بچنا اور علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں اپنا وقار بھی بحال رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویۃ الایمان میں جن امور کو کفر و شرک ٹھہرایا گیا ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف 'ماتہ مسائل' میں، اُن میں سے بعض باتوں کو حرام اور بعض کو ناجائز یا مکروہ لکھا ہے۔ موصوف کی یہ دوغلی پالیسی بھی اُن کے وقار کو قائم رکھنے میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں وہ گرنے شروع ہو گئے تو شرمندگی سے بچنے کی خاطر، ۱۲۵ھ / ۱۸۴۱ء، حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ موصوف کی اس دوغلی روش کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد نے یوں وضاحت پیش کی ہے:

انہوں (مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیر الدین) نے وہابیت کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کتے تھے، دو فرقتے ہیں، ایک اسمعیلیہ ہے دوسرا اسماعیہ۔ اسمعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا جو رسوم و بدعات کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک (یعنی غیر مقلد وہابی) ہو، جیسا کہ مولانا اسمعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلال العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔

اسماعیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے، جو حنفیت و تقلید سے تو انکار نہیں کرتا لیکن بدعات و رسوم کا مخالفت (مقلد وہابی) ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ اسماعق نے ماتہ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ (مولانا خیر الدین جالندھری) کہتے تھے کہ جب اسمعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہابیت نے اپنے مکائد کی اشاعت کے لیے راہِ تقیہ اختیار کر لی اور حنفیت کی آڑ قائم کر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔

مولوی محمد اسماعق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء) اصل میں اُس وہابی گروہ کے

۱۶۵

بانی ہیں جو مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت یعنی محمدی یا موحد یا اہل حدیث جماعت کے  
 ناکام رہ جانے کے بعد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں بیت کے لپیل سے بچنے اور سنیوں  
 میں بہرم رکھنے کی خاطر موصوف ہجرت کر گئے اور جاتے وقت اپنے نئے گروہ کے مفادات کا  
 تحفظ کرنے کی خاطر مولوی ملک علی نانوتوی کی قیادت میں ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے۔  
 پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے :

”مولانا عبید اللہ سندھی کا خیال ہے کہ جب ۱۲۵۰ھ میں شاہ اسحاق حجاز مقدس  
 کو ہجرت کر گئے تو تحریک (یا ڈرن وہاں بیت) کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ  
 بنایا گیا، جس کے صدر مولانا ملک علی اور تین رکن، مولانا نواب قطب الدین  
 (د ۱۲۸۹ھ)، مولانا مظفر حسین کاندھلوی (د ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ)،  
 م ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء) اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی (د ۶ محرم ۱۲۹۵ھ)  
 تھے۔“

مولانا عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۶ھ / ۱۹۲۲ء) کے اس سلسلے میں جو  
 تاثرات تھے، بہتر یہی نظر آتا ہے کہ انہیں خود مولانا سندھی کے لفظوں میں ہی بیان  
 کر دیا جائے، چنانچہ موصوف یوں وضاحت کرتے ہیں :

”مولانا محمد اسحاق مگر معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے  
 ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا ملک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین  
 دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر  
 ایک بورڈ بنا دیا، جو اس نئے پروگرام (یعنی وہاں بیت کی جدید تشکیل) کی  
 اشاعت کر کے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت  
 ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۸  
 ۲۔ عبید اللہ سندھی، مولوی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۰

مولوی ملک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء)  
 اینگلو انڈین علماء کی کھیپ : جو دہلیوں کی تہی جماعت کے سرپرست مقرر  
 کیے گئے تھے۔ وہ دہلی کالج میں شعبہ عربی کے صدر مدرس تھے۔ تجویز یہی ہوئی ہوگی کہ  
 جماعت میں عام لوگوں کی باقاعدہ بھرتی کرنے سے پہلے ایسے علماء تیار کیے جائیں، جو گورنمنٹ  
 کے پروردہ اور وابستہ جدیدہ کے دلدادہ ہوں۔ چنانچہ خاموشی اور مستعدی سے اینگلو انڈین  
 علماء کی کھیپ دہلی کالج میں تیار کی جانے لگی۔ مولوی مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں :  
 "نانوتہ کے لیے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا ملک علی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے  
 کھل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ  
 دہلی کالج کے استاد تھے۔ صرف نانوتہ بکر عثمانی مشیوخ کی برادری اطراف  
 و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی وہاں تک کے بچے مولانا ملک علی  
 کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔"

دہلی کالج سے جس قسم کے علماء کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی، وہ گورنمنٹ کے منظور نظر  
 بن کر نکلتے تھے اور وہی انگریز جوستانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھانسنے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ  
 محسوس نہیں کرتے تھے، وہ اس کالج کے تیار کردہ علماء کو دوڑ کر بیٹھنے سے لگاتے اور  
 جلد از جلد انھیں برسر روزگار کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب رقمطراز ہیں :  
 "مولانا ملک علی دہلی کالج کے شعبہ عربی کے صدر مدرس تھے اس لیے  
 نانوتہ اور دیوبند کے حضرات ان کی وجہ سے کالج کے تعلیمی وظائف اور  
 دوسری سہولتوں سے بھی مستفید ہوئے ہوں گے لہذا دہلی کالج کے خارج التحیل  
 ہونے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں غسک ہونے میں بھی آسانی  
 رہی ہوگی۔ بلکہ ان حضرات کے سرکاری اداروں میں تقرر کے لیے دہلی  
 کالج میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی ایک قسم کی سند خیالی کیا گیا اور یہ سمجھا

لے مناظر احسن گیلانی، مولوی : سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۲۱۰

گیا ہوگا کہ یہ حضرات دہلی کالج کے ذریعے طریقہ تعلیم وغیرہ سے واقف ہو چکے ہیں، ورنہ اتنی آسانی سے قدیم طرز کے فارغ التحصیل علماء کو گورنمنٹ، سرکاری اسکولوں، کالجوں اور محکمہ تعلیم کے ذمہ دار عہدوں پر مقرر نہیں کر سکتی تھی۔

زمانے کی نیرنگیاں عجیب ہیں، ایک وقت تھا کہ مولوی ملوک علی نانوتوی اہلسنت و جماعت میں شامل تھے اور ہندی و ماہیت کے سنگ بنیاد یعنی تقویۃ الایمان کو تقویۃ الایمان (ایمان کو ختم کرنے والی کتاب) کہا کرتے تھے لیکن ایک وہ وقت آیا کہ وہاں بیہ کے جدید بیڑے کا امیر البحر بنا بھی منظور کر لیا۔ مولوی ملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) نے مطلوبہ علماء کی جو کھپ تیار کی ان میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں:

”مولانا ملوک العلی کے تلامذہ کی تعداد کا استحصاء ناممکن ہے۔ ان کے شاگردوں

میں بڑے بڑے علماء مثل مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی،

مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی،

مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی

دیوبندی، مولانا فضل الرحمن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، نسی جمال الدین

نثار الہام بھوپال، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، مولوی

عالم علی مراد آبادی (ف ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء)، مولوی سنجی اللہ دہلوی،

مولانا عبدالرحمن پانی پتی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت، جو آجکل اہلحدیث کے نام سے متعارف

ہے جب متحدہ ہندوستان میں غیر مقبول ہو کر راندی گئی تو مولوی ملوک علی کی سرپرستی میں

دوسری جماعت بنانے کی سکیم تیار کی گئی پہلے اس کے چلانے والے علماء تیار کیے گئے،

۱۔ محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۷

۲۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۸۲

اس کے بعد برٹش گورنمنٹ نے اپنے اُن منظور نظر علماء کو کس طرح اور کہاں کہاں مسلمانوں پر مسلط کیا، ایک دہلی کالج کی کتنی برانچیں اور ذیلی شاخیں قائم کی گئیں، اس سلسلے میں مشہور دیوبندی عالم، مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء) یوں رقمطراز ہیں:

”۱۸۵۷ء میں اس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطان دہلی کی طرفداری اور غیر جانبداری کی بنا پر ایک اختلاف رونما ہوا اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعد میں اس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کی بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم، دہلی کالج کے عربی عرصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خان نے کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔“

نئے مراکز یعنی دیوبند اور علی گڑھ کا برٹش گورنمنٹ کے بارے میں کیا نظریہ تھا، مولوی عبدالحق قدوسی کی زبانی سنئے:

”دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر علی گڑھ فریق اور دیوبند جماعت گورنمنٹ کے معاملہ میں قدم سے قدم ملاتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کا مقصد علمی میدان میں مسلمان قوم کو آگے بڑھانا ہے۔ حصولِ جنت کے لیے انگریزوں سے بحال و تاداری کو دونوں ہی توجیہ دیتے ہیں۔“

بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مسلمانانِ پاک و ہند میں سے سرکاری تعلیم دیوبند مرکز حاصل کرنے والوں کو علی گڑھ میں تربیت دینے اور دیوبند علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کو مدرسہ دیوبند میں مخصوص انداز پر پڑھانے کی فہم پھلائی گئی۔ بعض وہ مسلمان تھے جو دہلی کالج کی انگریزی تعلیمات سے کتراتے تھے تو دوسرے دینی علوم سے جان چراتے تھے، دونوں قسم کے حضرات کو پابندِ سلاسل رکھنے کی خاطر ایک مرکز کے علیحدہ علیحدہ دو مرکز بنا دیے گئے۔ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر واضح ہے کہ حکومت کی

۱۱۲ لے عبید اللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۲

۱۱۳ لے ہفت روزہ الاعتصام، لاہور۔ بابت ۹، اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۶

فرماں برداری کرنے اور اس طرح حکومت کا اعتماد حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مراعات و عنایات کی بھیک مانگ کر پھینے چھوٹنے کے مواقع حاصل کرنا تھا اور قوم کے انگریزی خواندہ یا مویبانہ ذہن رکھنے والوں کو اسی غلامانہ ذہنیت کی افیون کھلا کر اپنے اپنے دائرہ کار میں کھل کھیلنے کے مواقع فراہم کرنے تھے۔ دونوں مراکز کے راستے الگ الگ لیکن منزل مقصود ایک تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری کون سی ڈھکی چھپی بات ہے کہ وہ کوئی غلط اقدام کرنے یا ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے تو بسا اوقات وہ تاویلات کا سہارا لیتا ہے اور اس غلط حرکت کو درست منوانے کی اس انداز سے سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ گویا دوسروں کا اس کی صحت پر ایمان لانا ہی اولین فریضہ اور ان کا مقصد حیات ہو۔ اس مرحلے پر خواہ زاویہ نظر کتنا ہی خلاف دین و ریاست ہو جائے اس کی کم ہی پروا کی جاتی ہے۔ ایسے واقعات کا مظاہرہ اگر ایک فرد سے سرزد ہوا اس کی سنگینی کا عالم اور ہے لیکن یہی طرز عمل اگر جماعتی طور پر اختیار کر لیا جائے تو اس کی مضرت کا ایسے حالات میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہی کالج کو علی گڑھ اور دیوبند کے مراکز میں تبدیل کرنے کی وجہ یا بالکل صفات اور سیدھی سادی بات تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ افسانہ نویسی میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ مدرسہ دیوبند کے موجودہ مہتمم قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں:

• اچانک چند نفوس قدسید نے پالہ نام خدو بندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ (چشم بدور) ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں۔

موصوف رسی سلسلے میں مزیدیوں وضاحت فرماتے اور قارئین کو خواب آور گویاں کھلاتے ہیں:

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولانا: بنیل بڑے مسلمان، ص ۲۴

”اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان میں یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کے پر وہ میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی“ لے

اگر انبیائے کرام کے علوم و معارف کا ذکر آجائے تو علمائے دیوبند کی برداشت کا پیمانہ نہ صرف لبریز ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات اس طرح چھلک اٹھتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑ دینا گویا تکیہ کلام بن جاتا ہے۔ لیکن یہی حضرات جب اپنے مولویوں کا ذکر کرتے ہیں تو سننے اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو دروازے ان کے بقول انبیائے کرام پر بھی بند تھے وہ علمائے دیوبند کے لیے کس طرح اور کس نے کھول دیے؟ اور پھر وہ یہ خلش محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ جن باتوں کے حصول کا یہ حضرات انبیائے کرام تک کے لیے انکار کرتے ہیں، وہی باتیں اپنے علماء کے لیے کیوں ثابت کرتے رہتے ہیں؟ آخر یہ اپنے علماء کا مقام انبیائے کرام سے بھی اونچا دکھانے میں کیوں کوشاں رہتے ہیں؟ آئیے، قاری محمد طیب صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمائیے:

”حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اُس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے“ لے

جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو جھونپڑیوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کی ہمہ گیری نے آج تو اعلان اور پروپگنڈے کے انداز ہی بدل دیے لیکن جب یہ ذرائع حاصل نہ تھے اُس وقت بھی آخر تبلیغ اور پروپگنڈے کے پسندیدہ طریقے موجود تھے مگر کارکنان دارالعلوم دیوبند نے اُس وقت بھی اپنے پروپگنڈے کی بنیاد کشف و کرامات پر رکھی جو وہابیت و دیوبندیت کی ضد ہے۔ چنانچہ مفتی عزیز الرحمن ہنٹوری لکھتے ہیں کہ:

لے عبد الرشید، مولانا، مین اڑے مسلمان، ص ۲۵

لے ایضاً، ص ۲۹

جس وقت دیوبند کے مدرسہ میں چھتر پڑے ہوئے تھے، آپ (مولانا محمد یعقوب صاحب) نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں مکان پکے ہیں اور ان پر چھتر پڑے ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ الحمد للہ، مدرسہ کے یہ مکانات مقبول ہیں۔ لے مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے کی ضرورت کس کو پیش آئی تھی؟ اس کے بانی، مدرس اور چلانے والے کون حضرات تھے؟ اس سلسلے میں جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم، مولوی سید الخالق قدوسی یوں لکھتے ہیں:

”ایسے میں چند ایسے حضرات میدان میں آئے جن کی پوری تربیت گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی اور سرکاری ملازمت میں رہ کر وہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کے مکمل وفادار ثابت کر چکے تھے۔ انہوں نے دیوبند میں ایک عربی دینی مدرسہ ”دارالعلوم“ کی بنیاد رکھ دی۔ اوپر کے بیان کردہ پس منظر میں دیکھا جائے تو دینی تعلیم کا یہ اہتمام، گورنمنٹ انگریزی کی منشا اور پالیسی کے مطابق تھا اور چونکہ اس پہلے دینی مدرسہ کے یہ بانی اور صدر مدرس، دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور سرکاری ملازمت میں رہ کر گورنمنٹ کا مکمل اعتماد حاصل کر چکے تھے، نیز یہ حضرات ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، اس لیے قدرتاً انگریزی گورنمنٹ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی، بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اس مدرسہ کے قیام میں اس (حکومت) کا کسی طرح کا ایما و ثنالی ہو۔ لے قادی محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے بانی، موسس، اراکین مجلس اور معادین کا تذکرہ یوں کیا ہے:

”اس بنا میں خصیعت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہ،

لے عزیز الرحمن نشوروی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۷۷

لے ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۶



حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہ اور مولانا فضل الرحمن صاحب قصبہ میں

قابل ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات

ان خصوصیت سے حضرت نانوتوی صاحب قدس سرہ (مولانا محمد قاسم) کے

دست و بازو رہے ہیں اور بنا کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رہیں

کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔ لے

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پہلا صدر المدرسین کون مقرر کیا گیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادری  
یوں جواب دیتے ہیں:

جب ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ اسلامیہ دیوبند قائم ہوا، تو مولانا

محمد یعقوب صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس وقت مولانا محمد یعقوب سرکاری

ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ لے

مولوی عبدالخالق قدوسی نے موصوف کی تقرری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں  
کیا ہے:

”قیام مدرسہ کے بعد سب سے پہلے صدر مدرس کی حیثیت سے جس شخص کا

مقرر ہوا وہ مولانا ملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ یہ بزرگ بھی بانیان مدرسہ کی طرح ڈپٹی انسپکٹر مدارس

کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ بزرگ بھی ۱۸۵۷ء کے وقت اسی عہدہ

پر فائز تھے۔“ لے

بانیان مدرسہ اور اس کی مجلس کے خاص اراکین میں سے مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور

مولوی فضل الرحمن دیوبندی نیز اس مدرسہ کے اولین صدر مدرس یعنی مولوی محمد یعقوب نانوتوی

کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھتے ہوئے ان حضرات کی ملازمتوں کا اظہار

لے عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۲۶

لے محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد حسن نانوتوی، ص ۱۹۲

لے ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

کر کے ایک بہت بڑی الجھن کو سلجھا دیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

”دہلی کالج کے فاضل مدرس، مولانا ملک العلی کے وطن و برادری کے جن حضرات نے مولانا کی سرپرستی میں تعلیم پائی وہ حضرات بھی تعلیمی نظام میں منسک نظر آتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن دیوبندی اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا ملک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نافوتوی اجیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے پھر بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔“

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے بارے میں ایک جگہ موصوف نے یوں مزید وضاحت فرمائی ہے:

”شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بریلی کالج میں پروفیسر تھے۔ مولانا ذوالفقار علی کابریلی میں کئی سال قیام رہا۔“

مدرسہ دیوبند کے اولین صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نافوتوی اور مولوی فضل الرحمن دیوبندی کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے:

”مولانا محمد یعقوب بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا محمد حسن کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب نافوتوی بریلی میں تھے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمن دیوبندی بھی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ جب مولانا محمد احسن نے القلاب ۱۸۵۷ء میں بریلی کو چھوڑا تو بعض معاملات و اختانات ضروری مولانا فضل الرحمن ہی کے سپرد کیے تھے۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نافوتوی، ص ۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۳۔ ایضاً، ص ۴۶

اگر پروفیسر فرید الدین رُوحی ناراض نہ ہوں اور میں اس جبارت پر معذور سمجھتے ہوئے رہتا ہوں تو ہم ان کی خدمت میں یہ التجا بصداد بکرتے ہیں کہ وہ اپنے ممدوحین علمائے دیوبند یعنی برٹش گورنمنٹ کے پروردہ اور ریڈی میڈ نہیں، بلکہ تیار کردہ اینگلو انڈین علما کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کا یہ بیان پڑھیں اور اسے اپنی تصنیف میں جس کا غلطی سے "آئینہ صداقت" نام لکھ بیٹھے ہیں، درج فرمائیں، کیونکہ درج ذیل دونوں بیان اگر "آئینہ صداقت" کے اگلے ایڈیشن میں ایڈ کر لیے جائیں تو ان کے پڑھ لینے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ لیجئے پہلا بیان موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا ملک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی

سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں اور مسلمانوں (اینگلو انڈین علماء) کی ایک ایسی

کھیپ تیار ہوئی کہ جن نے نئے نئے نظام تعلیم میں منسک ہو کر خاطر خواہ خدمات

انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس

بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی

دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمن دیوبندی

(ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، تو خاص راجہ سیکھ اعجاز و احباب ہیں۔ ان کے علاوہ

شمس العلماء شیخ ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ،

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲)، شمس العلماء محمد حسین آزاد

(ف ۱۹۱۰)، پیر زادہ محمد حسین (پیش منج)، خواجہ محمد شفیع (منج)،

خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی

(ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے

حضرات ہیں کہ جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و

بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسک ہو کر نمایاں خدمات

انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور جس صلہ سے نوازا۔

نذیر احمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۷۷

جس مقصد کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے مدرسہ دیوبند قائم کرنے کا ان حضرات کو  
الہام کیا تھا، حکومت کا وہ مقصد کہاں تک پورا ہوا تھا؟ حکومت نے اس امر کا  
خفیہ طور پر جائزہ لیا۔ پڑتال کرنے والے انگریز افسر کے تاثرات یہ تھے:

”اس مدرسہ نے یوماً فیوماً ترقی کی۔ ۱۴ جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ  
لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسٹری پائرن نے اس مدرسہ کو دیکھا  
تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند  
سطور درج ذیل ہیں: جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے  
صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں  
روپیہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کر رہا ہے۔  
یہ مدرسہ خلافت سرکار نہیں بلکہ مدد و معاون سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ  
لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن (سلیم الطبع) ہیں کہ ایک کو دوسرے سے  
کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں جو یہاں تعلیم نہ ہوتا ہو۔ صاحب  
مسالوں کے لیے تو اس سے بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی  
اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پاوے تو خالی نفع  
سے نہیں۔ اسے صاحب اسٹنا کرتے تھے کہ ولایت انگلستان میں اندھوں  
کا مدرسہ ہے، یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں  
کف دست پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید و بشاید“

مولوی عبدالخالق قدوسی نے اس معائنہ پر جو تبصرہ کیا ہے، اس دست وہ بھی ملاحظہ  
فرمایا جائے۔ چنانچہ موصوف نے مذکورہ واقعہ نقل کرنے کے بعد یوں اپنے تاثرات کا  
اظہار کیا ہے:

”معائنہ کرنے والے انگریز نے اپنی رپورٹ کے اس ٹکڑے میں دارالعلوم

مولانا محمد ایوب قادری، پروفیسر؛ مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۱۷

دیوبند کی دو خصوصیات بتائی ہیں۔ (۱) موافق سرکار (۲) مدد و معاون سرکار۔ پہلی خصوصیت تو واضح ہے کہ اس مدرسہ میں کام کرنے والے لوگ سرکار انگریزی کے پورے پورے وفادار ہیں اور یہاں کسی قسم کی بغاوت کے جراثیم موجود نہیں، لیکن دوسری خصوصیت کہ یہ مدرسہ سرکار کا معاون بھی ہے، غور طلب ہے، سوال یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا مدرسہ جس میں چند درویش منش بزرگ صبح و شام عموماً قال قال ابو حنیفہ کی تعلیم دیتے ہوں، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت سے کیا تعاون کر سکتے تھے؟ لے

مولوی عبدالخالق قدوسی کو مسٹر پامر کی اس رپورٹ پر کہ یہ مدرسہ مدد و معاون سرکار کا حیرانگی تھی کہ چند نلاؤں کا جگھٹا، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت کی کیا مدد کر سکتا تھا، لیکن موصوف اس رابطے کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس اعادہ و اعانت کے بارے میں وہ خودیوں رقمطراز ہیں:

”یہ تو ہم نہیں کہتے کہ یہ لوگ، ۱۸۵۰ء کے بعد میدان جنگ میں انگریزی فوج کے نشانہ بٹانہ مجاہدین کے خلاف لڑے تھے اور نہ ہی ہمارے پاس کسی قسم کے مادی تعاون کا کوئی ثبوت ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ۱۸۶۵ء میں بننے والے اس دینی مدرسہ نے جذبہ جہاد کو بروکرنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا اور ہماری رائے میں یہی وہ خدمت جلیلہ ہے جسے مسٹر پامر اپنے الفاظ میں کہہ رہے ہیں، کہ یہ مدرسہ مدد و معاون سرکار ہے“ لے

مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد اسی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی ملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۵۱ء) کے شاگردوں نے ”مظاہر العلوم“ کے نام سے سہارن پور میں دوسرا مدرسہ بھی قائم کر لیا۔ قدوسی صاحب لکھتے ہیں:

”اسی پُر سکون ماحول میں علمائے احناف (وہابی دیوبندی) علمائے ۱۸۶۷ء

لے ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۲ اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۵

لے ایضاً، ص ۶

کو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اس سے صرف چھ ماہ بعد مظاہر العلوم (سہارن پور) کا قیام عمل میں آیا۔ ان مدارس نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ اول الذکر مدرسہ کو بجا طور پر ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں مدرسے ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئے لیکن ان کا تصور ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد بعض ذہنوں میں آچکا تھا، بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی تو دارالعلوم دیوبند کو دہلی کالج کا ہی ایک حصہ قرار دیتے تھے، لہٰذا

اینگلو انڈین علماء کی دوسری دینی درسگاہ یعنی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کس نے قائم کیا؟ صدر مدرس اور پہلے شیخ الحدیث کون مقرر ہوئے؟ اس بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں وضاحت فرماتے ہیں:

”رجب ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۷ء میں مولوی سعادت علی سہارن پوری نے ایک مدرسہ سہارن پور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضل حق (ف ۱۳۰۶ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرید اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے۔ مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام ”مظاہر العلوم“ تجویز ہوا۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری بھی اس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم ہندوستان کی مشہور اسلامی درسگاہ ہے۔ اس نے مذہب و علوم اسلامی کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ بڑے بڑے

لے ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۹، اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۶

نامور علماء اس درگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور برصغیر پاک و ہند  
میں دین و ملت کی خدمات میں مصروف ہیں۔ لے

مدرسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء)  
کون تھے اور کہاں کے فیض یافتہ تھے؟ اس سوال کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری یوں  
رقم فرماتے ہیں:

”مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۷۳ء میں نانوتہ میں  
پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و حفظ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔  
”دہلی کالج“ میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے زانوئے تاد  
طے کیا۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی۔۔۔۔۔ مولانا محمد مظہر  
تحصیل علم کے بعد اجیر کالج میں ملازم ہو گئے، وہاں سے آگرہ کالج تبادلوں ہوئے۔ لے

مولوی محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء) کے دوسرے بھائی مولوی محمد احسن  
نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) بھی مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور دہلی کالج کے  
پروردہ تھے۔ تحصیل علم کے بعد موصوف بنارس کالج اور بریلی کالج میں تدریسی خدمات  
سرا انجام دیتے رہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قادری صاحب نے یوں وضاحت فرمائی ہے:  
”اسی طرح مولوی مملوک العلی کے عزیز و تلمیذ مولانا محمد احسن جب تعلیم سے  
فارغ ہوئے تو ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرس  
اول فارسی ان کا تقرر ہوا۔ لے

”بنارس میں مولانا ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء میں پہنچے اور جمادی الاول ۱۲۶۴ھ  
مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں مولانا محمد احسن کا تعلق بنارس سے یقیناً ختم ہو چکا تھا

لے محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۵۵

لے ایضاً: ص ۱۵۴

لے ایضاً: ص ۳۸





اس کے بعد بڑھاپے تک اُنھیں سرکاری ملازمت میں رکھ کر اچھی طرح اُن کی وفاداری کا سوا  
 تیا گیا۔ بعض حضرات کو کالجوں میں پروفیسر رکھا گیا اور دوسرے ڈپٹی انسپکٹر مدارس (کالے  
 پادری) بنا کر رکھے گئے۔ جب یہ صاحبان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنی مہربان حکومت  
 کے وفادار ہی ثابت ہوئے تو ریٹائر ہونے کے بعد ان کی طرف الہام کر دیا جاتا تھا کہ اب  
 آپ دین کے نام پر مسلمانوں کے دیندار طبقے کی رہنمائی کریں یعنی مسلمان آپ حضرات سے  
 دین بصد شوق حاصل کریں لیکن حکومت کے مکمل وفادار اور ہی خواہ رہنے کی تربیت دینی ہوگی  
 اور اُنھیں اُسی رنگ میں رنگنا ہوگا، جس میں آپ لوگوں کو رنگا گیا ہے۔

حکومت نوان مدارس کی اندرون خانہ سرپرستی کر رہی تھی اور یہ ساری مشینری  
 اسی دستِ غیب سے چل رہی تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ادھر مائل کرنے کی غرض سے  
 دیوبندیوں نے کارکنانِ دارالعلوم دیوبند کے ذہد و تقویٰ، خلوص و لہیت اور کشف و  
 کرامت کے ایسے افسانے گھڑنے شروع کر دیے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بھی کان کاٹ  
 لیے اور جو لے بھالے مسلمان ان کے جال میں پھنسے شروع ہو گئے۔ یہ جال ایسا ظلماتی بنا گیا  
 کہ اُس وقت اس چکر کو کیا سمجھ سکتے تھے کہ پاک و ہند کے کتنے ہی مدعیانِ اسلام آج تک  
 اس کی تعلیمات کے زہرِ بلا ہل کو اُس کی ظاہری خوشنمائی کے پیش نظر سمجھ نہیں پائے اور  
 اس زہر کو تریاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہابیت کا اصلی اور پہلا ایڈیشن مکمل طور پر ناکام ہوا۔ رہی سہی کسر معرکہ باناکوٹ  
 نے نکال دی۔ علمائے کرام کا اس کی تردید اور بیخ کنی میں کسر گرم ہو جانا اور عوام الناس  
 کا اس نئے مذہب والوں سے نفرت کرنا، ایسے امور تھے جن کی بنا پر یہ گروہ بڑھنے کی بجائے  
 مزید سکڑ کر رہ گیا اور ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، یہ شروع میں محمدی  
 گروہ پھر موحدین اور آجکل اہلحدیث کہلانے والے ہندو پاک میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔  
 آخر اس گروہ نے گورنمنٹ کی سرپرستی کے باوجود ترقی کیوں نہ کی، بات دراصل یہ ہے  
 کہ جب کتاب وہابیت کا دوسرا ایڈیشن دیوبندیت کے نام سے دارالعلوم دیوبند سے  
 شائع ہونے لگا تو یہ اتنا چھیٹھا اور خوش نماز ہر تھا کہ عوام الناس اس کی مضرت کو

محسوس نہ کر سکے اور اس کثرت سے اس زہر بلا ہل کے طلبگار ہونے شروع ہو گئے کہ حکومت بھی ہزار جان سے اس کی بلا نہیں لینے لگی اور اہلحدیث جماعت پر جو خصوصی نظر تھی وہ مع اضافہ دارالعلوم دیوبند پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

چند علما نے دیوبندی قسم کی روش اختیار کر کے دہلی کالج سے تربیت پا کر، یہ مشن جاری کیا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ درخت پروان چڑھا، پھلا پھولا اور اس کی شاخیں پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں کیونکہ بعض بھولے بھالے مسلمان ان حضرات کے زبردست پڑپگنڈے کے باعث انہیں خطرناک ترین وہابی نہیں بلکہ مصلح سمجھ بیٹھتے تھے۔ یہ اسلامی عقائد میں اس غیر محسوس طریقے سے کفریہ عقائد و نظریات کی آمیزش کر کے مسلمانوں کے دین و ایمان کو برباد کرتے رہے ہیں کہ مارے غوشی کے انگریزی حکام بھی پھرک اٹھتے تھے اور عنایات و نوازشات کا اندرون خانہ وہ اہتمام کیا کہ جس جماعت کی تعداد پانچ دس ہزار سے زائد نہ تھی ان کا مدرسہ دیوبند، چھپروں اور جھونپڑیوں سے ترقی کرتا ہوا، جامع ازہر کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مذہبی درس گاہ بن گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی گروہ کی ترقی گو یا اہلحدیث حضرات کی تنزلی کا پروانہ تھا۔ اس کی ترقی کے ساتھ ہی یہ حضرات قیسی اور کس مہر سی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ اس دوران میں اس محمدی یا اہلحدیث گروہ کا دو چار مقامات پر انگریزوں سے ٹکراؤ بھی ہوا، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا بلکہ نقصان ہی اٹھاتے رہے اور آخر کار یہ لوگ بھی اپنی اکثریت کے ساتھ متفق ہو کر حکومت کی وفاداری اور بھی خواہی پر ایمان لے آئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء)، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) اور مولانا محمد حسین بٹالوی وغیرہ حضرات کی سرکردگی میں ساری جماعت ہی حکومت کے قدم چومنے پر متفق ہو گئی۔ اس جماعت کی زندگی کے یہ تین ادوار ہیں یعنی پہلے دور میں گورنمنٹ کے منظور نظر، دوسرے دور میں اکثریت وفادار اور بعض حکومت کے خلاف اور تیسرے دور میں سب حکومت کے بھی خواہ اور منتظر نظر کرے۔

دارالعلوم دیوبند جو دہلی کالج کی شاخ اور وہابی حضرات کا دوسرا مرکز بنا، اس پر بھی

دو دور گزرے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف۔ ابتدائی ایام اور پہلے دور میں انگریزوں کی مکمل سرپرستی اور تائید و حمایت حاصل رہی۔ خوب جی بھر کر عنایت سرکار کے مزے لوٹے۔ دوسرا دور وہ ہے جب متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں گاندھی کی آندھی چلی۔ ہنود نے خفیہ منصوبے کے تحت حکومت کے ہر محکمے میں فوج اور پولیس میں اپنے آدمی کثیر تعداد میں شامل کر لیے۔ تجارت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے ذریعے خوشحال ہونے لگے تو ہندوؤں کے جال بھاگ سو در سوڈ کے چکر نہیں مسلمانوں کی جائدادوں پر قابض ہونے شروع ہو گئے۔ غرضیکہ ہر قسم کی طاقت و قوت حاصل کر لینے کے بعد ہندوؤں نے حصول آزادی کی خاطر انگریزوں سے سرد جنگ جاری رکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس دور میں علما نے دیوبند نے محسوس کیا کہ ہنود کی بے پناہ تیاریوں کے مقابلے میں اب انگریز زیادہ عرصہ ہندوستان پر قابض نہیں رہ سکتے اور وہ دن دور نہیں کہ ہندوستان کی فضاؤں میں اوم کا ترنگا جتدا لہرا رہا ہوگا۔ صورتِ حالات کا اس طرح تجزیہ کرنے کے بعد علما نے دیوبند نے اپنے سرپرستوں اور محسنوں کو الوداعی سلام کیے بغیر متوقع حکمرانوں کے در کی گدائی شروع کر دی۔ کانگریس نے ان حضرات کی ناز برداری اور تالیفِ قلب کا پورا پورا خیال رکھا اور انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر انھیں نوازتے رہے۔ اس دور میں یہ حضرات مکمل طور پر ہندو مفادات کی خاطر اپنا تین من دھن سب کچھ ٹٹانے کے لیے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت یہ حضرات ہندوؤں پر کچھ اس طرح پروانہ دار نثار اور گاندھی جی کے پجاری ہو کر رہ گئے کہ ہندوؤں نے انھیں انگریز کی گولیوں کا نشانہ بننے کی ترغیب دی تو یہ لیک کہہ کر سوراخ کے دیوتا پر جینٹ بن کر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ایسی موت کو شہادتِ عظمیٰ سے کسی طرح کم ماننے پر تیار نہ ہوتے اور اگر گاندھی جی یا شہت جواہر لال نہرو نے انھیں مسلم مفادات پر کاری نہیں لگانے کا حکم دیا یا ترغیب ہی دلائی تو یہ حضرات اپنے اصطلاحی مشرکوں اور بدعتیوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ پاک وہند کے مفادات کو جتنا نقصان اس تحریک و ہابیت نے پہنچایا ہے اتنا مشرکین ہند بھی آج تک نہیں پہنچا سکے ہیں۔ اپنے دوسرے دور میں دیوبندی حضرات واقعی انگریزوں کے

مخالف بن کر بھی رہے لیکن ہندو مفادات کی خاطر مسلم مفادات کے لیے ان حضرات کا وجود  
مجہد غوارج کی طرح ہمیشہ ایک چیلنج بن کر ہی رہا ہے۔ باری تعالیٰ شانہ، ابنائے زمانہ کو  
سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین۔

بقول مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۲ء) دہلی کالج کا  
علی گڑھ مرکز انگریزی حصہ، اسی کالج کے تربیت یافتہ سرسید احمد خاں علی گڑھ لے گئے۔  
گو یا پہلے جو وہابی حضرات کا ماڈرن اور پُراسرار مرکز، دہلی کالج مقرر ہوا تھا، آگے چل کر  
اُس کے دو حصے یا دو مراکز بن گئے، ایک دیوبند اور دوسرا علی گڑھ۔ اس دوسرے مرکز  
علی گڑھ کو مغربی تعلیم و تہذیب کے ولدا دگان کا مرکز قرار دیا گیا اور آہستہ آہستہ پورے  
ملک میں اس کی برائچیں قائم کر دی گئیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مستقل مراکز کی حیثیت  
حاصل کرتی چلی گئیں۔ اس طرح پورے ملک میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب چھا گئی اور یہ  
دونوں چیزیں اس طرح پاک و ہند کے باشندوں کے دماغ و اعصاب پر سوار ہوئیں کہ  
انگریزوں کو ہمارے ملک سے گئے ہوئے چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے لیکن ان  
مغربی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا تو دور کی بات ہے، خود مسلمان کہلانے والوں نے انہیں  
اس طرح اپنا ضابطہ حیات اور لائیکر عمل بنایا ہوا ہے، جیسے مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کا  
راز قرآن و سنت کے احکام کی پیروی میں مضمر نہیں بلکہ مغربی لعنتوں میں ہے۔ باری تعالیٰ شانہ،  
ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علی گڑھ کالج کے بارے میں عرض کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا  
ضروری نظر آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد برٹش گورنمنٹ نے جو پالیسی وضع کی اس کو مولوی عبدالحق  
قدوسی کے لفظوں میں بیان کر دیا جائے:

’بات دراصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے تلخ تجربہ کے بعد انگریز سرکار اس قدر حساس  
ہو چکی تھی کہ وہ جب بھی ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں کسی قسم کے  
اضطراب و اشتعال کے آثار محسوس کرتی تو قبل اس کے کہ حالات خطرناک  
صورت اختیار کر جائیں، مسلمان قوم کے سامنے کوئی نئی چیز مسلمان لیڈروں

کے ہی ذریعے پیش کر دیتی، جس سے مشتعل قوم کا رخ خود بخود دوسری طرف پھر جاتا ہے۔

علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کی تحریک کیوں چلائی گئی، مولوی سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) نے اس پر اسرار حقیقت کے چہرے سے یوں پردہ ہٹایا تھا: "واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور ان کی ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھتی تھی۔ حکام کے سامنے ان ناخوشگوار حالات کا تدارک از بس ضروری تھا۔ اس لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رخ کو ادھر سے ادھر پھیر دے۔ یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا، جس کو لے کر ہرنائنس سرآغا خاں، جو اُس وقت کے مسلم قومی راہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے۔"

علی گڑھ کالج کے اصل کڑا دھرتا سر سید احمد خاں تھے۔ وہی کالج سے تخریف شدہ مذہب یعنی وہابیت کو لبیک دیو بندیت لے کر آئے تھے لیکن علی گڑھ میں آکر کریلا اور نیم پر چڑھ گیا، موصوف نچرٹ کے بانی بن گئے اور اس طرح مسلمانوں کی خیر خواہی و اصلاح کے نام پر ساتھ ساتھ مقدس اسلام کی بیخ کنی کا فریضہ، جو حکومت کی طرف سے عائد ہوا تھا سرانجام دے کر گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرتے رہے۔ مسلمانوں کی خیر خواہی مصیوب نہیں، انہیں تباہ کن حرکتوں کے نتائج سے خبردار کرنا دشمنی نہیں، دولت، علم و فن اور اخلاق و کردار میں مسلم قوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنا بد خواہی نہیں بلکہ یہ امور تو مستحسن ہیں۔ اگر واقعی یہ مصلح اور ریفارمر بننے والے بھی کچھ کرنا چاہتے تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

۱۷ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

۱۷ سلیمان ندوی، مولوی، حیاتِ سخیل، ص ۵۳۱

عیدِ وسلم کے دین پر عملِ جراحی کی مشق کس غرض سے فرمائی گئی تھی؟ مسلمانوں کے دین و ایمان کو تباہ و برباد کرنے والا کیا ان کی حقیقی خیر خواہی کے تصور سے بھی آشنا ہو سکتا ہے؟  
 نیچریت پر گفتگو، ہم انشاء اللہ تعالیٰ باب سوم میں کریں گے۔ دہلی کالج کا انگریزی حصہ علی گڑھ لایا گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ سے کہاں تک پھیلا۔ بریلی اور میرٹھ کی درس گاہوں کے بارے میں ملاحظہ ہو:

”بریلی کی یہ درس گاہ اور میرٹھ اسکول، دہلی کالج کی شاخ قرار پائے۔ ۱۸۴۸ء تک بریلی اسکول میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں بریلی کا اسکول، کالج بنا دیا گیا۔“

ڈاکٹر یونیورسٹی کے قیام کی وجہ مولوی سید سلیمان ندوی (۳، ۱۳ھ / ۱۹۵۲ء) نے یہ بتائی ہے:

”گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اس کا نام ڈاکٹر یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اس سب کمیٹی میں داخل ہوتے جو اسلاک سٹڈیز کے لیے بنی تھی۔“

”وہ زخم کیا تھا، جن پر ڈاکٹر یونیورسٹی کے قیام کا مرہم لگایا گیا؟ اس کا جواب مولوی عبدالحق قدوسی کی زبانی سنئے:

”اسی طرح ۱۹۱۰ء میں جب تقسیم بنگال کی تشیح کا فیصلہ ہوا تو مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گورنمنٹ نے اس کا علاج جو تجویز کیا، وہ ڈاکٹر یونیورسٹی کا قیام تھا۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۲

۲۔ سلیمان ندوی، مولوی احویات شبلی، ص ۵۲۰

۳۔ ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۳، اکتوبر، ۱۹۵۰ء، ص ۵

یونیورسٹیوں کا قائم ہونا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلا دیا گیا اور انگریزوں نے ان کے ذریعے جس مقصد کو حاصل کرنا تھا وہ بڑی آسانی سے حاصل ہو گیا۔ انگریزی زبان کا سیکھنا اور سکھانا بڑا نہیں، یہ بھی دوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے اور اس کا سیکھنا کسی طرح معیوب نہیں ہو سکتا۔ ان انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی دو باتیں معیوب تھیں جو سنتِ نصاریٰ کے ظہور پر آج تک کمال عقیدت کے ساتھ اپنائی ہوئی ہیں اور مسلمان کھلانے والے بھی ان معائب کو دگور کر کے اپنی درس گاہوں کو باعثِ خیر و برکت کر دکھانے اور انھیں دنیا و عقبیٰ کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنانے سے کتراتے رہتے ہیں۔ ان سرکاری درس گاہوں کی دونوں خواہیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ادارے مغربی تہذیب و تمدن سکھانے کی تربیت لگائیں بنائیں گئے ہیں اور دوسری خرابی یہ کہ اسلامی علوم و معارف سے طلبہ کو علمی اور عملی طور پر، بڑی حد تک دور ہی رکھا جاتا ہے۔ انگریز تو مسلمانوں کو اور خصوصاً ان کے پڑھے لکھے طبقے کو دین سے ناواقف دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا لیکن پاکستان کی کبھی حکومت نے آج تک یہ وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اپنی درس گاہوں سے اسلام کو باہر نکالی کر، مسلمانوں کی موجودہ نسل کو دین سے ناواقف رکھ کر کون سا مقدس مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے؟

پاک و ہند میں انگریزی درس گاہوں کے ٹکر کب بننے کا جس ہستی کو حکومتِ وقت نے شرف بخشا تھا، وہ سرسید احمد خاں تھے۔ موصوف کے بارے میں شیخ اکرام صاحب اسی تعلیم سے متعلق یوں وضاحت کرتے ہیں:

”خود سرسید، ۱۸۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: ”عجب یہ ہے کہ جو تعلیم

پاتے جاتے ہیں اور جی سے قوی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور

بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں“

اصل بات یہ ہے کہ ان درس گاہوں کے ذریعے حکومت یہی چاہتی تھی کہ مسلمان اپنے اسلاف

رشتہ منقطع کر لیں اور حکومتِ وقت کے مکمل وفادار بن جائیں۔ شیخ اکرام صاحب نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :

”علی گڑھ تحریک کے راہنماؤں میں ذہنی آزادی کی کمی نہ تھی۔ قوم کو سلف کی کورانہ تقلید سے آزاد کرانے اور اس تقلید کے حمایتیوں کی مخالفت پر اُمت کرنے کے لیے بڑی جرأت اور صحیح آزاد خیالی کی ضرورت ہے اور سرسیدؒ عالی اور اُن کے رفقاء میں یہ آزاد خیالی پوری طرح موجود تھی، لیکن اس کے باوجود ان بزرگوں کی تصانیف پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ انہیں مغرب سے ایک قسم کا حُسنِ ظن تھا اور مغربی تعلیم، مغربی ادب اور مغربی علوم و فنون سے انہیں ایسی توقعات تھیں جو زیادہ تر عقیدت پاناواقفیت پر مبنی تھیں۔ مغرب سے ان بزرگوں کو تو فقط ایک حُسنِ ظن تھا لیکن جن لوگوں نے انگریزوں کالجوں میں تعلیم پائی، اُن میں غلامانہ ذہنیت بڑی طرح جلوہ گر تھی۔ اُن کے نزدیک مغرب کی ہر ایک چیز اچھی تھی اور مشرق کی ہر ایک چیز بُری“۔

علی گڑھ تحریک نے مغربی علوم و فنون کو متحدہ ہندوستان میں رائج کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے دین و مذہب سے بے بہرہ رکھنے کی جس برطانوی پالیسی کی پہل منڈھے چڑھائی اُس کے بدترین نتائج آج بھی پوری قوم کو بھگتے پڑ رہے ہیں اور اب وہی لوگ قوم کی قسمت کے مالک اور ان کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد، جس اسلام کے نام پر پاکستان معرض وجود میں آیا ہے اُسی سے پاکستان کی ہر حکومت اس طرح ڈرتی اور بدکتی آئی ہے جیسے گگنیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور اسی خطرے کو ٹالنے کی خاطر اسلام کے رہے سے نشانات کو مٹانے کی اس طرح سے مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے کہ گویا اسلام دشمنی میں انگریز بھی ان کے شاگرد ہی تھے۔ ان در سگاہوں کی مضرت کا پہلا اہل نظر کو بروقت بھی نظر آتا تھا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اس حقیقت کا

لے محمد اکرام شیخ، موج کوثر، ص ۲۰۰



ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے :

”اگر آپ اُن بزرگوں کا معاملہ اُن کے ضمیر اور احساسِ فرض پر چھوڑیں اور ارکانِ مذہب کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں تب بھی علی گڑھ کی نضا میں اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کمزوری کا سراغ ملے گا۔“

اس قدر تسلیم کر لینے کے بعد بھی آج تک کالج اُسی ڈگر پر چلائے جا رہے ہیں، خود علامہ شبلی نعمانی اور حالی پانی پتی بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ان دونوں حضرات کے متعلق یوں مذکور ہے :

”علی گڑھ کی علی پستی سے مولانا (شبلی) کو جو شکایت تھی وہ بجا ہے اور ہم اس پر گزشتہ اوراق میں تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ کالج کی یہ کوتاہی اس قدر افسوسناک تھی کہ اُس نے حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کو بدل کر دیا۔ وہ سرسید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”چھبیس برس کے تجربے سے اُن کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو روسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ کمٹی، فضول اور اصلی یاقوت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔“

مسمِ یہ نیوز سٹری کے قیام، اسکولوں اور کالجوں کے اجراء اور ان کے ذریعے مغربی علوم و فنون اور تہذیب سے سنہا ناں ہند کو بہرہ ور کرنے نیز اسلام سے گورا رکھنے کی جو سرسید احمد خاں صاحب اور حکومت نے کوشش کی تھی، اُس میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ اس حقیقت کے چہرے پر آج تو مطلقاً کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر اپنی آنکھوں سے نوہاناں قوم کی حالتِ زار دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے کہ یہ ہے قوم کی

۱۔ محمد اکرام شیخ : سوج کورٹر، ص ۱۵۱

۲۔ ایضاً : ص ۲۸۸

وہ متاعِ گراں مایہ جن کے ہاتھوں میں کل ملت کی تقدیر ہوگی۔ جس قوم کی قسمت کے مالک یہ  
 فرہمال ہوں گے اُس کا مقدر اندھیری رات میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ مغربی علوم و فنون  
 سے فیض یاب ہونے والوں کی یہ افسوس ناک حالت پہلے ہی روز سے دکھائی دینے لگی تھی۔  
 چنانچہ مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کے شریکِ کار، فضل الدین احمد  
 صاحب کا ایک بیان یوں منقول ہے:

”یہ بات عام طور پر مسلم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ  
 نہیں اور اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں  
 ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اور ٹھے ہوئے، نماز پڑھتا ہوا نظر  
 اہانتا یا قرآن شریف کی کوئی آیت اُس کی زبان و قلم سے نکل جاتی تو لوگوں کو  
 ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک ناس واسفہ کی  
 طرح اُس کا ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے اور ساتھ ہی  
 نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے“۔

یہ تھے ایگلو ایڈین علماء کے قائم کردہ دو مراکز جو دیوبند اور علی گڑھ میں قائم ہوئے۔ اول الذکر  
 مرکز کے کارکنوں نے خود کو دینی تعلیم کی کمی دور کرنے اور مسلمانوں کو علوم دینیہ سے مالا مال کر دینے  
 والے ٹھیکیداروں کی صورت میں ظاہر کرنا شروع کیا اور نوظہرانہ ذمہ نے ملت اسلامیہ کو بتانا  
 شروع کیا کہ ہم تو آپ کی مادی حالت کو سنوا کر مسلمان قبہ کو ترقی کی منزلوں پر لے جانا  
 چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی دونوں مراکزت و ہا بیت کے درمیانے اپڈیشن بھی شائع ہوئے  
 اور وہ مستقل فرقوں کی شکل میں منقسم ہو کر جلوہ گر ہوئے مسلمانوں میں تفریق و تشقت کا بیج  
 بوگئے۔ دونوں مراکز کے ظاہری طور طریقے اگرچہ ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن بہر صورت  
 دونوں میں اشتراکِ عمل کا بندہ موجود تھا۔ مثلاً:

”علی گڑھ اور دیوبند کے اختلافات اصولی تھے اور کسی بغض و عناد یا رشک

حد پر مبنی نہ تھے۔ اس لیے ان میں تلخی کبھی نہیں آئی۔ اس کے علاوہ چونکہ دیوبند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پورا کرتے تھے، اس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا جب انہوں نے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے اشتراک عمل کیا۔ لے

اہلسنت وجماعت کے ناجی گروہ میں سے مسلمانوں کو اغوا کر کے جو فرقے بنائے جا رہے تھے ان کی تعداد یہاں آ کر تین ہو گئی تھی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اہلحدیث — بانی مولوی محمد اسماعیل دہلوی

۲۔ دیوبندی — بانی مولوی محمد اسحاق دہلوی

۳۔ نیچری — بانی مسید احمد خاں علی گڑھی

اہلحدیث جماعت کی ترقی تو کس پیرسی کے باعث جا مدہو کر رہ گئی تھی مگر دینی سے دلچسپی

رکھنے والے بعض مسلمان دیوبندی گروہ کے جال میں پھنستے رہے، پھر بھی ایک دو مدرسے پورے ملک کے عوام پر کیا اثر انداز ہو سکتے تھے؛ لیکن جبکہ مسلمان حضرات نے اپنے تبلیغی رخصت کاروں کو اس امر پر مامور کر دیا کہ وہ اہلسنت کے عوام کو اغوا کریں اس وقت سے اس جماعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا ہے۔ نیچری مذہب خود تو ختم ہو گیا لیکن مرسلہ سے پہلے دو وارث چھوڑ گیا

۱۔ منکرین حدیث

۲۔ مرزائی

نحریت سے بھی زیادہ نقصان، ملت اسلامیہ کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی مدد سے تعلیم نے پہنچایا، جس کے باعث اکثر پڑھے لکھے صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور بعض تو نرسے تنگ دین و ملت ہی ثابت ہوئے ہیں اور قوم کو ذہنی آوارگی اور پراگندہ خیالی

لے محمد اکرام شیخ، موج کوثر، ص ۲۴۹

کی ترتیب دینے کا یہ سلسلہ ہنوز اسی طرح جاری ہے۔ نوہالان ملت ان دونوں چکروں میں پھنتے جا رہے تھے اور ان پڑھ مسلمان بھی، ان دونوں جماعتوں کی کامیابی کے راستے میں ممانے اہلسنت ہی مزاحم تھے لہذا ان حضرات پر قابو پانے کی غرض سے ندوة العلماء کا جال بچھا یا گیا۔ لیکن کیسی مزیدار ڈپلومیسی کے ذریعے یہ جال پھیلایا، مندرجہ ذیل حوالے کی تہ میں جھانک کر اس کا اندازہ کیجیے:

”اس عمدہ خیال (قیام ندوہ) کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے، مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی کان پوری خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، جو اس کے بانی اور ناظم اول تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اکابر قوم مثلاً سر سید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے اور ۱۸۹۹ء میں روسا، شاہ جہان پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطور وقف ندوة العلماء کو حاصل ہوئی۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔“

وہ کون سی ضرورت یا مصلحت تھی جس کے تحت ”ندوة العلماء“ کا قیام عمل میں آیا؟ اس بارے میں جناب شیخ محمد اکرام ایم۔ اے نے اپنے خیالات کا ان لفظوں میں اظہار فرمایا ہے:

”جدید علم الکلام بالعموم ان شخصوں نے ترتیب دیا، جو عربی اور فارسی کے فاضل تھے لیکن عام علماء کی جماعت سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا اور بالعموم علماء نے ان کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ علماء میں بھی کچھ لوگ ایسے

پیدا ہو گئے جنہیں اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اسلامی مدارس کا نصاب  
 ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے اور قدیم علماء اور علی گڑھ پارٹی  
 کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقہ کار قائم ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے  
 ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا۔

ندوہ کے بارے میں دیوبندی جماعت کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی  
 (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) نے اپنے تاثرات کا مشاہدے کی روشنی میں اس طرح  
 اظہار کیا ہے:

”خود ندوہ کا جو حشر ہوا سب کو معلوم ہے کہ وہ ایسوں کے ہاتھ میں مدت  
 تک رہا جن کی طبیعت میں بالکل نیچریت تھی۔ وہی سرستید احمد خاں کے  
 قدم بقدم اُن کی رفتار رہی۔ وہی جذبات، وہی خیالات، کوئی فرق نہ تھا۔  
 یہ ندوی حضرات کے عقائد و نظریات کی باطن تھی۔ مناسب نظر آتا ہے کہ علی گڑھ اور  
 دیوبند کی خرابیوں کا ازالہ کرنے کا بیڑا اٹھانے والے، قوم کے دکھوں کا علاج کرنے والے،  
 مسلمانوں کی کشتی کو مجبور سے نکال کر ساحل پر پہنچا دینے کا اعلان کرنے والے ندوی علماء کے  
 زہد و تقویٰ، خلوص و لگن اور خیر خواہی اسلام و مسلمین کی روحانیت سے لبریز اور سنسنی خیز  
 کہانی مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کی زبانی پیش کر دی جائے۔  
 ملاحظہ ہو:

”ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن علماء کی جو حالت منکشف ہوئی کیونکہ  
 منتسبینِ ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حُسنِ ظن تھا، اُس سے طبیعت کو اور  
 زیادہ مایوسی اور طبقہ علماء کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہو گئی۔ مخالفین  
 ندوہ وہاں جو کچھ کہ رہے تھے اُن کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں

۱۔ محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۸۷

۲۔ ملفوظاتِ نغانوی صاحب: الاقاضات الیومیہ، جلد ۵، ص ۱۱۰

لیکن جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے تک ان سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھنا رہا، اس لیے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیا داروں کی سی کارروائیاں کی جا رہی ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوہ کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلس وعظ میں کیونکر اُن کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز نچتہ ہو گئی۔ اس کے بعد واعظ نے جونہی تنوی کی ایک حکایت شروع کی دوسرے صاحب نے معاً کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اس سے مجلس وعظ میں بڑی رقت ہو گئی اور اس قدر آہ و بکا ہوا کہ اس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اس طرح کی بیسیوں باتیں روز میں دیکھنا تھا اور میرے دل میں اس طبقے کی طرف سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔

ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد کس بزرگ نے رکھا تھا، یہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے: ”ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال صوبہ (یو۔ پی) کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لیے پانچ سو روپے ماہوار امداد طنی شروع ہوئی۔“

جب ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا، اس وقت رنگ بزنک

لے آزاد کی کہانی، ص ۲۰۰، ۲۱۸

لے شیخ محمد اکبر، سبیل نامہ، ص ۱۷۸

حاضرین کا مجمع، ندوہ کے کرتادھرتا، علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) کی روایت سے  
کو کس طرح مسور کر رہا تھا، اس کا اندازہ خود علامہ شبلی کے مندرجہ ذیل فخریہ بیان سے  
بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

”یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔  
یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرما زوا کے سامنے دلی شکرگزاری  
کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی  
درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ  
ایک مذہبی درس گاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب (یعنی انگریز) کے ہاتھ  
سے رکھا جا رہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقفت کے نیچے  
نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی،  
واعظ، خرد پوش اور کجگلاہ سب جمع تھے۔“

جن معصومین غاظرندۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، سہی بسیار کے باوجود وہ  
مقصد حاصل نہ کیا جاسکا۔ علمائے اہلسنت اس پر فریب جال سے دُور ہی رہے۔ بعض  
سادد لوح علماء جو بروقت صحیح اندازہ نہ لگا سکے، صورتِ سال کے سامنے آتے ہی محتجب  
ہو گئے۔ شروع میں ندوہ ہر قسم کی بد مذہبی کامیجوں تکب رہا اور نہ چریت اس کا جزوِ اعظم تھا۔  
یہ معجون صلح کلیت کے زہریلے قوام سے تیار کی گئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی  
۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء) کے آخری دور میں یہ ادارہ دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ ہی  
شمار کیا جانے لگا تھا۔

علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) اپنے آخری ایام میں کچھ دہریت کی طرف  
مانل ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں جیسا کہ ان کی تصنیف ”الکلام“ کے مطالعہ سے واضح  
ہوتا ہے۔ رہی موصوف کی ایجاد کردہ صلح کلیت، تو اس کے بعد گاندھویت کی بلاخیز آندھی

ایسی ہمدگیر بن کر چڑھی تھی کہ اس کے عظیم نقصانات کے سامنے صلح کلبیت کے بگولے کی مضر توں کا چرچا بھی عام زبانوں سے اُتر جانا قدرتی امر تھا۔ گاندھویت اور گاندھوی علما کے کارناموں کی جھلک باب پنجم میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے۔

انگریزوں نے جب برصغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جما لیے اور سارے **مرزائے قادیان** ملک پر قابض ہو جانے کے اُنھیں امکانات بھی نظر آنے لگے تو اُنھوں نے اپنے بعض پادریوں کو اس امر کا جائزہ لینے کی دعوت دی کہ مسلمانان ہند کے اندر، داخلی طور پر، مستقل اور پائیدار انتشار و افتراق کس طریقے سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پادری حضرات نے جائزہ لے کر بورپورٹ پیش کی وہ علامہ خالد محمود سیالکوٹی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اس کے حلقہ نبوت میں ہزاروں لوگ بوق در بوق شامل ہو جائیں گے، لیکن مسلمانوں میں اس قسم کے دعویٰ کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس کی نبوت کو حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اس وقت فوجی نقطہ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی، لیکن اب جبکہ ہم برصغیر کے چپے چپے پر حکمران ہو چکے ہیں اور برطرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔

لے عبدالرشید ارشد: ہمیں بڑے مسلمان، ص ۶



اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔ تھے۔ اس قسم کے مسلمان حاکم اُن دیار میں مسلمانوں کی فائزگی کرتے تھے۔ یہی وجوہات تھے جن کی بنا پر سر زمین ہند گمراہ فرقوں کی قرار گاہ بن گئی۔ غالباً قلتِ تعداد کے علی الرغم اُن فرقوں میں زیادہ نمایاں، قوی تر اور ترقی یافتہ قادیانی گروہ تھا۔ قادیانی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کے بانی و مؤسس مرزا غلام احمد قادیانی تھے، جن کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُس کی نسبت قادیان کی طرف سے جو ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مرزا غلام احمد وہاں مدفون ہیں۔ اُن کی قبر ”مرزا غلام احمد موعود“ کے الفاظ مرقوم ہیں۔ موعود سے مراد یہ ہے کہ مرزا صاحب وہی مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا تھا کہ وہ اگر شریعت کی احیاء و تجدید کریں گے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات کے بارے میں مذکورہ مطبوعہ فاضل کی رائے قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں،

”حق بات یہ ہے کہ آپ کا قریب تعلق ائمہ شیعہ سے ہے۔ شیعہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے ائمہ معصوم و ملہم ہیں اور اُن کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے تاہم وہ یہ نہیں کہتے کہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے یا وہ خدا سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتے ہیں۔ بہر حال مرزا صاحب کی تعلیمات کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“

قارئین کرام! جن حضرات کے ذریعے برٹش گورنمنٹ نے تخریبِ دین اور افتراقِ بین المسلمین کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچایا تھا، اُن میں سے بعض حضرات کا گزشتہ سطور میں مختصر سا تذکرہ کر دیا ہے۔ یہی تھے وہ حضرات جنہیں پراسرار طریقے پر، پروپیگنڈا مشینری کے بل بوتے پر

۱۔ غلام احمد جبریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۳۰۵

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۵

پورے برطانوی دور میں مسلمانوں کے رہنما منوایا جاتا رہا اور آج تک انگریزوں کی اسی سنت پر کمال سعادت مندی سمجھ کر عمل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت تو ہر چشم بنیا کے سامنے واضح ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اُلٹی گنگا بہائی ہوئی ہے یعنی :۔

راہزن خضرِ رَہ کی قبا چھین کر  
رہنما بن گئے ، دیکھتے دیکھتے

## اعلانِ حق

علامہ جو رضاتے تو نجوم  
 جزاں راہے کہ نہ مہدی نہ پویم  
 ولیکن گر بایں نادان بگوئی  
 خوں را اسپ تازی گو ، نہ گویم  
 (علامہ اقبال)

## فرقہ سازی

قارئین کرام! گزشتہ باب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ برٹش گورنمنٹ نے انتہائی رازداری کے ساتھ کن کن علما کے ذریعے سچے اسلام کو بدلنے اور مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر و پریشان کرنے کا کام لیا۔ کہاں کہاں ان کے مراکز قائم کیے۔ حکومت اور اس کے کارندے اس منصوبے میں یہاں تک کامیاب ہوتے کہ اہلسنت میں سے جن لوگوں کو اغوا کر کے مختلف جماعتیں علیحدہ علیحدہ قائم کر لیں، ان جماعتوں کو کافروں اور مشرکوں سے مقابلہ کرنے کی تو آج تک توفیق نصیب نہیں ہوئی لیکن ان کے نمائندے اور کارندے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے آج تک برسہا برس پکار چلے آتے ہیں، جو برطانوی منصوبے کی منزل مقصود تھی۔ مسلمانوں کی سابقہ جماعت سے علیحدہ یوں تو کتنی ہی ٹوئیاں بنائی گئیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں آج ان میں سے پانچ قابل ذکر اور مستقل فرقے موجود ہیں، جو مذکورہ برطانوی منصوبے پر اب بھی آٹھ میٹک مشین کی طرح سرگرم عمل میں۔ وہ سارے جدید فرقے یہ ہیں:

۱۔ اہلحدیث فرقہ

اس گروہ کے بانی بگہ برصغیر پاک و ہند میں جتنے بھی فرقے برٹش گورنمنٹ کے منہوس دور میں پیدا ہوئے ان سب کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) ہیں۔ سب جماعتوں کا سلسلہ نسب

یہاں آکر ہی ملتا ہے جبکہ موصوف کی اصل جماعت وہی تھی جو آج فرقہ اہلحدیث کے نام سے

متعارف ہے۔ شروع ایام میں یہ فرقہ ”محمدی گروہ“ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ جب مسلمانانِ

اہلسنت و جماعت نے کنا شروع کر دیا کہ واقعی یہ محمدی ہیں کیونکہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے

پیروکار جو ہیں۔ اس نشانِ دہی سے بچنے کی خاطر ان حضرات نے اپنا سابقہ لیبل ہٹا کر خود کو

موحد کنا شروع کر دیا۔ علمائے اہلسنت کہنے لگے کہ یہ حضرات چونکہ عقیدہ رسالت کے ایسے

اندام ہیں قائل ہیں جو انکار رسالت سے چننا مختلف نہیں، لہذا منکر رسالت ہونے کی صورت

میں سکھوں کی طرح بڑے موحد ہی تو رہ گئے، اگرچہ ان کا عقیدہ توحید بھی خانہ ساز یا خواجہ والا ہے۔

آخر اس لیبل سے بھی یہ فرقہ بدکنے اور کترانے لگا۔ ان حالات میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اس جماعت کا نام اپنی مہربان سرکار سے اہلحدیث منظور کروایا، سرکاری کاغذات میں لکھوایا اور ملک کے ہر گوشے میں برٹش گورنمنٹ نے یہ حکم پہنچایا کہ آئندہ اس جماعت کو اہلحدیث کے نام سے موسوم کیا جائے۔ چند سال محمدی اور موحد کہلانے کے بعد ۱۸۸۸ء سے یہ فرقہ اہلحدیث کے نام سے موسوم چلا آ رہا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت اور صراط المستقیم کتاب سے رفض پھیلا یا تھا۔ اہلحدیث حضرات نے موصوف کے رفض کو چھوڑ کر ان کی خارجیت و ظاہریت کو اپنے دین کی بنیاد بنا رکھا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر دیکھا جائے تو یہ حضرات اب محمد بن عبد الوہاب نجدی کے بالکل نزدیک اور رفض چھوڑنے کے باعث مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے کافی دور ہو چکے ہیں۔

۲۔ دیوبندی فرقہ۔ یہ فرقہ بھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا قبیح اور موصوف کا عاشق زار ہے۔ اس فرقہ کے جماعت اہلحدیث سے جدا ہونے کی وجہ اور علیحدہ تشخص کی ضرورت ان کی مخصوص ذہنیت اور سابقہ جماعت کی ناکامی سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس جماعت کا سنگ بنیاد مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) نے رکھا۔ اس گاڑی کو باقاعدگی سے چلانے کی غرض سے علماء کی کھپ مولوی محمد علی نانوتوی (المتوفی ۱۳۶۶ھ/۱۸۵۱ء) نے دہلی کالج میں تیار کی جب مدرسہ دیوبند قائم ہو گیا، اُسے مرکز قرار دے کر علیحدہ جماعت کی تشکیل ہونے لگی تو اس نوزائیدہ گروہ کے مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) اور مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء) سرگرمہ قرار پائے۔ وہابیوں کا یہ گروہ خود کو سنی حنفی ظاہر کر کے ابتدائی دلفریب انداز میں جوئے۔ اسے اور حقیقت حال سے بے خبر سنیوں کو رات دن اغوا کرنے میں مصروف ہے۔ یہ گروہ اس لحاظ سے وہابیوں کی جملہ جماعتوں سے خطرناک ہے کہ ان کے وہابی ہونے کا عوام تو اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ علاوہ بریں اس جماعت کے بقی بند تبلیغی رضا کار اس درجہ تابعین قلوب اور دلفریبی کے ساز و سامان سے مسلح ہو کر سنیوں کو اغوا کرنے اور اپنی جماعت میں ملاسنے کی خاطر نکلتے اور ملک کے کونے کونے میں پھیلتے ہیں کہ اس پراسرار حال

خوش نصیب مسلمان ہی بنتے ہیں ورنہ کہتے ہی اس کا ہری و لفریبی سے دھوکا کھا کر خود اس  
جال میں پھنسنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

۳۔ نیچری فرقہ یہ بھی محمدی گروہ کی ایک شاخ اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے مستقرین  
و قبعین کا ایک مخصوص ٹولہ ہے۔ اس کا سنگ بنیاد سر سید احمد خاں  
علی گڑھی نے رکھا تھا۔ اس کا مرکز حلی گڑھ کالج قرار پایا۔ موصوف کے معاونین میں مرزا خاں  
خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سمیع اللہ خاں دہلوی وغیرہ حضرات تھے۔  
مذہبی معاملات میں ان کے مشن کو مولوی چراغ علی (المتوفی ۱۸۹۵ء)، رائٹ آزیل  
سید امیر علی چسوری (المتوفی ۱۸۹۵ء) و قازان ملک (نواب مشتاق حسین)، محسن الملک  
(سید ہندی علی خان) اور ڈپٹی کمشنر احمد وغیرہ نے پروان چڑھانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت  
نہ کیا بلکہ ہمہ وقت نیا مذہب گھڑنے اور مقدس اسلام کو ذبح کرنے میں مصروف رہے۔

سبب عبد اللہ چکرا اوی، مولوی محمد اسلم خیرا چوری اور ڈاکٹر غلام جیلانی برقی کے  
ہاتھوں میں نیچری مذہب پہنچا تو اس نے چکرا اویت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ فرقہ عقیدہ رسالت  
اور احادیث مطہرہ کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ قرآنی تعبیرات کے علمبردار ہونے کا مدعی لیکن  
کلام الہی کے خلاف پراسرار حقائق ہے۔ دعویٰ مسلمان ہونے کا ہے لیکن ان کے نظریات  
اسلامی تعبیرات کو صیغ کرتے ہیں۔ آج کل اس فرقے کے سربراہ، پروفیسر غلام احمد پرویز ہیں  
موصوف نے چکرا اویت میں کمپوزنگ اور سوشلزم کو بھی شامل کر کے ایک فلسفی معجون تیار کی  
ہوئی ہے جو پرویزیت کے نام سے متعارف اور ۲۵ بی گلبرگ لاہور سے دستیاب ہے۔

۴۔ مرزائی فرقہ اس فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۳۲۶ھ /  
۱۹۰۸ء) ہیں۔ موصوف نے دعویٰ نبوت کر کے اپنے قبعین کے

دائرہ اسلام میں رہنے یا مسلمان کہلاتے جاتے کا سوال ہی ختم کر دیا۔ مرزا صاحب شروع  
ایام میں نیچریت کی طرف مائل تھے۔ دیوبندیت سے کسی قدر پیار اور مولوی رشید احمد گھنگوہی  
(المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے بھی درپردہ عاشق زار تھے۔ شیعہ حضرات کی صحبت،  
بہائیت کے مطالعے اور گورنمنٹ کی حوصلہ افزائی سے نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے، جس کی جسارت

کوئی مسلمان کہلانے والا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔ موصوف کی جماعت بھی دو گروہوں میں بٹ گئی ہے، (۱) قادیانی (۲) احمدی لاہوری

قادیانی حضرات مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور لاہوری پارٹی والے موصوف کے دعویٰ نبوت کی تاویلیں کر کے اُنھیں چودھویں صدی کا مجدد قرار دیتے ہیں۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھا جاتے تو آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے حضرات کو سرورِ کون و مکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نبی، مجدد یا محض ایک مسلمان بھی نہیں بلکہ دجال ٹھہرایا ہے اور ایسے دجالہ کی فہرست کا اعلان فرماتے ہوتے اُن کی تعداد بھی بتائی ہوئی ہے۔ چونکہ قادیانی اور لاہوری مرزائی خود کو مسلمان ہی کہتے ہیں، لہذا ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ شانہ ان حضرات کو مسلمان ہی بنا دے اور ہمیں اسلام پر قائم رکھے۔ آمین

ذکورہ چاروں فرقوں کے علاوہ، جو برٹش گورنمنٹ کے منوس دور کی زندہ یادگاریں ہیں، اور بھی چند فرقوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جن کا یہاں ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں:

۵۔ صلحِ کلیت و دہریت بالکل دینی اور دوسرا سراسر و بناوی معلوم ہوتا تھا، لہذا بعض حضرات کی رائے ہوئی کہ ایک ان کے مابین راستہ قائم کیا جائے۔ اس خیال کے پیش نظر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۱۳ء) اس کے کرتادھرتا تھے۔ موصوف نے اپنی مخصوص ذہنیت و خیالات کے تحت ندوے سے تین فائدے حاصل کرنا چاہے:

- ۱۔ علمائے اہلسنت کو برٹش گورنمنٹ کے جال میں پھنسانا۔
- ۲۔ صلحِ کلیت کی تبلیغ کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے، خواہ وہ خدا کا انکار کرے یا رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ صحابہ کرام کو گالیاں دے یا نبوت کا دعویٰ کرے، قرآن و سنت کا منکر ہو یا عقائد اسلام سے منحرف، کسی حالت اور کسی صورت میں اُس کے

مسلمان ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

۳۔ دہریت کا پرچار

مؤخر الذکر نظر یہ چونکہ دیوبندی حضرات نے ٹھکرا دیا تھا لہذا علی گڑھی حضرات بھی دب گئے۔ علمائے اہلسنت کو اس جال میں پھنسانے کی اسکیم بھی ناکام رہی، لہذا باقی رہ گئی صرف صلح کلیت جس کو تحریک خلافت نے اپنا امتیازی علم بنا کر گاندھی صاحب کی چوٹی پر بعد عقیدت لہرا دیا۔ جب یہ علم بھی دیوبندی حضرات کے ہاتھوں میں آگیا تو غلام سلیمان ندوی کے دور سے ندوۃ العلماء ایک دیوبندی ادارہ ہو کر ہی رہ گیا۔ ندویوں نے رنگ تو بہت سے بدلے لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی نیا فرقہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۴۔ خاکسار پارٹی اس فرقے کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ) اٹھاتے لیکن نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ بلبلیہ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس جماعت کا نام تو موجود ہے لیکن وجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے برائے نام ہی رہ گیا۔

۵۔ جماعت اسلامی اس گروہ کے بانی مہتابی جناب ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ یہ جماعت دینی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سیاسی عزائم اس جماعت کی منزل مقصود ہے۔ دینی لحاظ سے بھی اس فرقے کا ذہن مخصوص ہے جو اہلحدیث اور دیوبندی حضرات میں سے کسی کے ساتھ مکمل اتفاق اور مطابقت نہیں رکھتا۔ چونکہ اس جماعت کا سیاسی اور مذہبی مزاج مودودی صاحب کی ذات کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے، وہیں حالات امید یہی ہے کہ اس فرقے کا حشر بھی خاکسار پارٹی سے چندان مختلف نہیں ہوگا۔ اگر مودودی صاحب کے بعد یہ جماعت باقی رہی بھی تو محض ایک سیاسی جماعت کے طور پر باقی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

مذکورہ فرقوں کی اصل وہابیت اور اس کا سنگ بنیاد رکھنے والے، متحدہ ہندوستان میں اس کی نشرو اشاعت کرنے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) ہیں۔ اس باب کے اندر ہم نے اسی امر کی وضاحت پیش کرنی ہے کہ دہلوی صاحب موصوف



اور دیگر فرقوں کے بانیوں نے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر عمل جراحی کی مشقیں کر کے، ان کے نزدیک دین میں خدا اور اس کے آخری رسول سے جو غلطیاں ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کر کے، جو نئے نئے اسلام گھڑے تھے وہ تعلیمات و نظریات کیا ہیں جو محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین سے متصادم اور رُوحِ اسلام کے سراسر منافی ہیں۔ وباللہ التوفیق وبہ الوصول الی نہری التحقیق اللہم ارننا الحق حقاً والباطل باطلاً والحقنا بالحقین امین یا ارحم الراحمین بحق سید المرسلین و صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد و علی آلہ وصحبہ اجمعین الی یوم الدین۔

## رئیس المذہبین مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تخریب کاری

جیسا کہ قبل ازیں وضاحت کی جا چکی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں فرقہ بازی کا سنگ بنیاد مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۱ء) نے رکھا۔ موصوف نے اپنی رسوائی اور ایمان سوز کتاب تقریۃ الایمان کے ذریعے خارجیت کی تبلیغ کی۔ اس کے ساتھ ہی داؤد ظاہری کے انکارِ تقلید اور معتزلہ کے مزہ دار ہر فرقہ سے امکانِ کذب کل حشیہ کے مرتبہ کو تقریۃ الایمان میں اکٹھا کیا گیا۔ تقریۃ الایمان کی اصل بنیاد تو محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کتاب توحید پر رکھی گئی لیکن اس میں ظاہری المذہب اور اعتراضات کی قیادتوں کے لیے بھی پوری پوری گنجائش رکھی گئی۔ دوسری طرف صراط المستقیم کتاب کے ذریعے "رفض" کی بھی کھل کر اشاعت کی۔ شیخہ حضرات جو اپنے الحق کی شان بیان کیا کرتے ہیں، انہیں صاحبِ وحی و عصمت اور انبیاء کرام سے بھی افضل بتاتے ہیں، موصوف نے یہ تمام صفات اپنے پیروی میں بتا دیں بلکہ انہیں اتنا بڑھایا چڑھایا کہ اگرچہ دعویٰ نہیں کیا مگر ہر قدم پر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی افضل و اعلیٰ ہی منوانے کی کوشش کی۔ یہ امر صراط المستقیم کتاب سے بخوبی واضح ہوتا ہے اس کا روشن بیان عنقریب آنے والا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ موصوف کے کارہائے نمایاں کے چند اہم گوشے ملاحظہ ہوں :

انکارِ تقلید کی طرف مولوی محمد اسمعیل کیوں راعب ہوئے جبکہ ان کے پیشوا  
 ترکِ تقلید نجدی و بابی بھی تقلید کے منکر نہیں بلکہ حنبلی ہونے کے مدعی تھے۔ حقیقت  
 یہ ہے کہ تقلیدِ ائمہ دین ہی ایک ایسی چیز ہے جو مسلمانوں میں فرقہ بازی اور دین میں فتنہ و فساد  
 برپا کرنے والوں کے راستے میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہو جاتی تھی۔ حکومت نے محسوس کیا  
 کہ تخریب کاروں کے راستے کی اس رکاوٹ کا سب سے پہلے دور ہونا از بس ضروری ہے  
 تاکہ ان کے بعد جس پر بھی محقق، مصلح، ریفارمر اور شمس العلماء کا لیل لگا کر کھڑا کیا جائے،  
 اسلاف سے انکارِ تقلید کی بدولت رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے، بہت سے مسلمان ان کے  
 پیچھے لگ جائیں گے۔ چونکہ ہر مصلح و ریفارمر کی تعلیم جدا ہوگی لہذا جتنے ریفارمر کھڑے کیے  
 جائیں گے اتنے ہی فرقے باسانی بن سکیں گے۔ اس برطانوی منصوبے کے تحت موصوف  
 نے مسلمانوں کا رشتہ اکابر سے منقطع کرنے اور فرقہ سازی کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض  
 سے تقلید کو شرک اہد گیارہ سو سالہ مسلمانوں اور اُمتِ محمدیہ کو مشرک و جہنی ٹھہراتے ہوئے صاف  
 صاف مشرک کہہ دیا اور اپنے خاندانی اکابر کو بھی روزِ رخ سے بچانے کی پروا نہ کرتے ہوئے  
 لکھ دیا۔

لیت شعری کیف یجوز المسترأب  
 یعنی میں کیسے جانوں کہ ایک شخص کی تقلید  
 تقلید شخص معین مع تمكن الرجوع  
 کو لیے رہنا کیونکر حلال ہوگا جبکہ اپنے  
 الی غیر وایات المنقولۃ عن النبی  
 امام کے مذہب کے خلاف صریح حدیثیں  
 صل اللہ علیہ وسلم الصریحۃ الدالۃ  
 چاہے اس پر بھی امام کا قول پھور  
 علی خلاف قول الامام فان لم یترک  
 تو اس میں شرک کا میل ہے۔  
 قول امامہ خفیہ ثابۃ من الشریک  
 (فوز باللہ من ذلک)

مشرک کہنے کے ساتھ موصوف نے مقلدین کو زالی جرات مندی سے نصرانی بھی ٹھہرایا ہے۔  
 چنانچہ لکھتے ہیں:

اتباع شخص معین بحیث یتمسک بقولہ وان ثبت علی خلافہ دلائل من السنۃ والکتاب وبأول الی قولہ شوب من النصرانیۃ وحفظ من الشریک والعجب من القوم لا یخافون من مثل هذا الاتباع بل یخیفون تاساکہ۔ لہ

یعنی ایک امام کی پیروی کہ اُس کی بات کی سند پکڑے اگرچہ اُس کے خلاف کتاب و سنت سے ثابت ہو اور انہیں آیات و احادیث کو اُس قول کی طرف پھیرے۔ یہ نصرانی ہونے کا میل اور شرک کا حصہ ہے اور تعجب ہے کہ وہ لوگ خود تو اس عقیدے سے ڈرتے نہیں بلکہ اِس کے چھوڑنے والے کو ڈراتے ہیں۔

ائمہ مجتہدین و اکابر اسلاف سے مسلمانوں کو رشتہ تعلق منقطع کرنے کی موصوف نے کئی بار تلقین کرتے ہوئے عقیدے کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے:

اس زمانہ میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں، کتنے پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں، کتنے قصبے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کتنے مولویوں کی باتوں کو جو اُنہوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں اور کوئی اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں۔ ان سب سے بہتر راہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے کلام کو اصل رکھیے، اُس کی سند پکڑیے۔ لہ

یہ بالکل بجا کہ اللہ و رسول کا کلام اصل ہے، سند بھی اُسی کی پکڑنی چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ و رسول کے کلام کو سند کون پکڑے؟ عالم یا جاہل؟ جاہل تو اللہ و رسول کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یقیناً وہ علمائے کرام کی طرف ہی رجوع کرے گا یا تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے تو بزرگوں کی آسان تصانیف سے دین سمجھنے کی کوشش کرے گا۔

لہ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تنویر العینین

لہ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۵، ۲۶

اُن بزرگوں کی تصانیف سے جن پر اُمتِ محمدیہ کا اعتماد رہا ہے لیکن دہلوی صاحب فرماتے ہیں کہ خواہ تم قرآن و حدیث کا ایک لفظ نہیں جانتے، اُس زبان سے مطلقاً ناواقف ہو لیکن پہلے بزرگوں کی باتیں مت مانو، وہ تو اُسٹھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکال کر کھڑی کر دی تھیں، پس قرآن و حدیث کی سند پکڑو۔ لیکن یہ نکتہ نہیں سمجھایا کہ وہ ناواقف کس طرح قرآن و حدیث کی سند پکڑیں؟ نیز جب پہلے بزرگ اور مولوی سب ناقابلِ تلقین ہیں تو خود یہ حضرتِ ناصح کہاں سے قابلِ اعتماد بن کر آگئے تھے اور خود لوگوں کو کیوں تلقین کرنے اور تقویۃ الایمان و دیگر تصانیف پڑھنے کی اور اپنی تقریریں سننے کی تلقین فرمانے لگے تھے؟ کیا موصوف کے ارشادات کا نام کتاب و سنت ہے؟

عوام الناس کو اکابر سلف سے رشتہ منقطع کرنے کا درس دینے اور براہِ راست قرآن و حدیث سے استفادہ کرنے کی تلقین فرما تو دہی لیکن کھٹکا ہوا کہ کہاں متحدہ ہندوستان کے مسلمان اور کہاں قرآن و حدیث کی تعلیمات۔ یہ بیچارے تو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ضرور وہ عرض کریں گے کہ حضرت! ہم قرآن و حدیث سے براہِ راست کس طرح ہدایت حاصل کریں؟ جب اسلاف کی تعلیمات پر کان ہی نہیں دھرنا تو موجودہ علماء میں ہی کون سے سرخاب کے چنگے چھوئے ہیں کہ یہ اپنے ذہن کی تیزی سے باتیں نہ نکالیں گے یا خدا نے ان کے ماتھے پر لکھ دیا ہے کہ یہ ضرور کتاب و سنت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ لہذا گزشتہ موجودہ علماء کو چھوڑا سب سے منہ موڑا، لیکن ہم تو قرآن و حدیث میں الف کے نام ب نہیں جانتے۔ اب بتائیے دین کیسے حاصل کریں؟ موصوف اسی خدشے کے پیش نظر لوگوں تلقین کرتے ہیں،

”یہ جو عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ در رسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے، اس کو بڑا علم چاہیے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں کہ اُن کا کلام سمجھیں۔ اُس راہ پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے، ہماری کیا طاقت کہ اس کے موافق چلیں، بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں جن پر چلے جاتے ہیں۔ سو یہ بات بہت غلط ہے۔ اس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف و صریح ہیں، ان کا سمجھنا مشکل نہیں“ لے

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۶

ناخواندہ مسلمانوں کے سوال کا موصوف کے پتے جواب تو کوئی نہیں تھا لیکن چونکہ اُنھیں اسی راستے پر لگانا مقصود تھا لہذا حوصلہ دینا پڑا کہ چاہے ایک لفظ کا بھی پتہ نہ چلے لیکن بات قرآن و حدیث سے کرو۔ یہ خطرہ نزدیک بھی نہ آنے دو کہ ہم بے علم ہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہی کب ہے؛ اور قرآن و حدیث کے سمجھنے میں الجھن ہی کہاں ہے جو تم ڈرتے پھرتے ہو؛ اللہ کا نام لے کر خود کو مفسر اور محدث سمجھنا شروع کرو۔ آگے یوں تسلی دے دی ہے:

”اللہ در رسول کا کلام سمجھنے کو بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کے راہ بتانے کو، جاہلوں کے سمجھانے کو اور بے علموں کے علم سکھانے کو آئے تھے یہاں آگے سورہ جمعہ کی آیت ۶۲ پیش کر کے، قرآنی تحریف کے مرکب ہو کر یوں ایٹمی حکم سنا دیا، ”جو کوئی یہ آیت سن کر پھر یوں کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی نہیں سمجھ سکتا اور ان کی راہ پر سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا، سو اس نے اس آیت کا انکار کیا اور اس نعمت کی قدر نہ سمجھی۔“

ہمیں اپنی اس کوتاہ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھک محسوس نہیں ہوتی کیونکہ باوجود سعی بسیار کے یہ معلوم کرنے سے ہم آج تک قاصر رہے کہ دہلوی صاحب موصوف کی اصطلاح میں عالم اور بزرگ کی تعریف کیا ہے؛ آخر یہ ملکہ قرآن ہونے کا حکم کس دلیل سے ہے؟ ستم ظریفی تولاحظہ ہو کہ مذکورہ آیت میں جس حقیقت کا واضح ثبوت ہے اسی کی قدر نہ ہوئی صاحب اسے دلیل بنا لاتے ہیں۔ یعنی آئیے کہ یہ میں نے تین امور کا تذکرہ ہے کہ سبھی آخلاق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشاغل یہ ہیں:

- ۱۔ لوگوں پر قرآن پڑھنا
- ۲۔ انسانوں کا تزکیہ نفوس کر کے اُنھیں پاک کر دینا۔
- ۳۔ اُنھیں کتاب و حکمت سکھانا۔

۱۔ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۶

۲۔ ایضاً: ص ۲۷

آپ کے بعد یہ فراتض علمائے کرام و اولیائے عظام کے سپرد ہیں۔ لوگوں کو قرآن کریم نے ترغیب دی ہے کہ وہ کتاب و حکمت سیکھنے کے لیے علمائے کرام کی طرف اور تزکیہٴ نفوس کے لیے اولیائے عظام سے رجوع کریں۔ چنانچہ حکم خداوندی ہے:

فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ  
لَا تَعْلَمُونَ - ۱۷  
جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اہل علم (علماء) سے دریافت کرو۔

دوسرے مقام پر بزرگانِ دین کے اتباع کے بارے میں یوں واشکاف لفظوں میں فرما دیا گیا ہے:

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ  
إِلَىٰ - ۱۸  
اُس کا اتباع کرو جو تیری طرف رجوع لایا۔

لیکن مولوی محمد اسماعیل دہلوی معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت باری تعالیٰ شانہ کے حریف بن کر کھڑے ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کو علمائے کرام اور اولیائے عظام کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتا ہے تو موصوف اُس کے احکام کو قرآن کے خلاف اور انکار آیات الہیہ بنا کر علماء و اولیاء سے کنارہ کش ہو کر خود قرآن و حدیث کو سمجھنے کی تلقین فرماتے ہیں حالانکہ جب تک علمائے کرام کی طرف رجوع کیا جائے قرآن و حدیث کا ایک لفظ بھی کوئی جان نہیں سکتا۔ دہلوی صاحب کی اس تلقین سے جو نتائج برآمد ہوتے وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ انکارِ تعلیم کی وجہ سے فرقہ بازی و فتنہ پردازی کا دروازہ کھل گیا۔
- ۲۔ قرآن و حدیث کے علوم حاصل کرنے کی غرض سے وہابی حضرات اپنے علماء کی طرف توجہ کرتے ہیں لیکن تیرہ صدیوں کے اکابر سے ان حضرات نے اپنا رشتہ حقیقتاً منقطع کر لیا ہے۔ تعلق کا صرف نام باقی ہے۔
- ۳۔ تزکیہٴ نفس کے لفظ سے یہ لوگ آشنا ہوتے ہیں، لیکن اُس کی حقیقت ان کے لیے

۱۷ سورہ النحل، آیت ۴۳

۱۸ سورہ لقمن، آیت ۱۵

منفا ہو کر رہ گئی ہے۔

۲۔ توہین الوہیت  
مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے معتقدین یہی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ جب دنیا شرک کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی تو موصوف نے مسلمانوں کو توحید سے آگاہ کیا اور شرک و کفر سے بچایا، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ جب وہ خارجیت کا علم لے کر کھڑے ہوئے تو باری تعالیٰ شانہ کو کس طرح معاف کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے باری تعالیٰ شانہ کو جھوٹا بتانے اور منوانے کی خاطر یوں اپنی منطق دانی کا اظہار کیا ہے:

”لانسلم کہ کذب مذکور محال بمعنی مسطور باشد چه عقد قضیہ غیر مطابقتہ  
للواقع والواقعاتے آن بر ملائکہ وانبیاء خارج از قدرت الیہ نیست والا  
لازم آید کہ قدرت انسانی ازید از قدرت ربانی باشد۔“  
اسی سلسلے میں موصوف نے مزید یوں کھل کر وضاحت کی ہوئی ہے:

”عدم کذب را از کمالات حضرت حق سبحانہ ہی شمارند و اور اجل شانہ  
بآن مدح میکنند بر خلاف انحرس و عماد و صفات کمال ہیں است کہ شخصے  
قدرت بزرگم بکلام کاذب وارد و بنا بر رعایت مصلحت و مقتضائے حکمت  
بنزہ از شوب کذب تکلم بکلام کاذب نماید، ہماں شخص ممدوح می گردد  
و بخلاف کے کہ لسان او موقوف شدہ یا ہر گاہ ارادہ تکلم بکلام کاذب نماید  
آواز بندگہ دیا کے دہن اورا بند نماید، ایں اشخاص نزد عقلاء قابل  
مدح نیستند۔ بالجملہ عدم تکلم بکلام کاذب ترغیباً عن حیب الکذب و تنزیہاً  
عن التلوٹ پر از صفات مدح است۔“

اس مسئلے کے بارے میں چونکہ اسی مجموعے کے اندر ایک مستقل عنوان کے تحت بحث

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، ایک روزہ، مطبوعہ صدیقیہ پریس ملتان، ص ۱۰

۲۔ ایضاً: ص ۱۰، ۱۱

موجود ہے لہذا یہاں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ ناپاک نظریہ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا لیکن اٹھاون سال بعد برٹش گورنمنٹ کے ایما و اشارے پر ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۷ء میں گنگوہ سے پھر ظہور پذیر ہوا اور براہین قاطعہ جیسی شرمناک کتاب کے صفحات پر چہل قدمی کرتا ہوا دکھایا گیا۔

موصوف صرف خدا کو جھوٹا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اُسے مجسم مانتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ جو شخص خدا کو زمان و مکان و جہت سے پاک جانتا اُس کی رویت بغیر جہت و محاذات کے مانتا تو ایسے شخص کو بدعتِ حقیقیہ کا مرتکب یعنی کافر ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ ان امور کی تصریح موصوف نے یوں کی ہے:

تتزیہ اُو تعالیٰ از زمان و مکان و جہت و اثباتِ رویت بلا جہت و محاذات  
..... ہمہ از قبیل بدعاتِ حقیقیہ است، اگر صاحب آں اعتقاداتِ مذکورہ  
را از جنس عقائدِ غیر می شمارد؛ ملخصاً لہ

موصوف کی اس تصریح سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ جب مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے نزدیک اللہ تعالیٰ زمان و مکان میں گہرا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دَھو بَکَلِ مَشَبٰیءِ مَحْبِیْطِ کِیے کہا جاسکے گا؛ اس طرح تو زمان و مکان کو ہر چیز پر محیط ماننا لازم آتا ہے، جن کے احاطے سے خالق بھی باہر نہ رہے۔

۲۔ اس صورت میں اللہ اکبر کتنا کس طرح درست قرار پاتے گا، جبکہ زمان و مکان اللہ تعالیٰ پر بھی محیط بنا دیتے اور تسلیم نہ کرنے پر بدعتِ حقیقیہ کا خطرہ سنا دیا۔

۳۔ اولاً جو زمان و مکان میں گہرا ہوا ہے، ثانیاً جس کا دیدار بغیر جہت و محاذات کے نہ ہو سکے، یقیناً وہ مجسم قرار پاتا ہے اور ہر مجسم فانی ہے اور جو فانی ہو وہ الوہیت کے لائق نہیں۔ اب کیا فرماتے ہیں توحید کا فرضی ڈھول بجا کر مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے

۱۔ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، ایضاح الحق، مطبوعہ دیوبند، ص ۲۲، ۲۵



علماء، کہ ان کے امام نے الوہیت کا خاتمہ اور وجود باری تعالیٰ شانہ کے انکار کی یہ بنیاد کس خوشی میں رکھی تھی؟

دہلوی صاحب موصوف نے اپنی نثرالی توحید کی ترنگ میں باری تعالیٰ شانہ کا عالم الغیب ہونا اپنے مخصوص انداز فکر سے اس طرح بیان کیا ہے،

» ظاہر کی چیزوں کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے، جب چاہیں کریں

جب چاہیں نہ کریں۔ سو اسی طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو،

جب چاہے کرے یعنی یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔»

یہ عبارت بالکل آسان اردو میں ہے۔ ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بخوبی اس کا مطلب

سمجھ سکتا ہے۔ کوئی مشکل یا غیر ملکی زبان کی فلسفیانہ عبارت تو ہے نہیں، جس کا مفہوم و

مطلب باسانی معلوم نہ کیا جاسکے۔ موصوف نے اس دہلوی عبارت میں کئی قسم کا زہر گھولا ہے۔

لیکن یہاں اظہارِ کراہت اس امر کا مقصود ہے کہ انہوں نے اپنے اہلہ صاحب کی علمی

شان کس قسم کی بیان کی ہے۔ اس عبارت سے جو کچھ ہم سمجھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ

۱۔ دہلوی صاحب کے نزدیک ان کا خالق خالق الغیب نہیں اور نہ اس کے متعلق

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ کی بنا پر استدلال ہے۔ ان کے نزدیک غیب پر اس کا

کنٹرول ہے۔ جب چاہتا ہے کسی غیبی بات یا عمل معنیات سے یا خبر ہو پھٹتا ہے

نہ چاہے تو دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر کے ایک مجذوب کی طرح پڑا رہتا ہے۔

۲۔ موصوف کے نزدیک علم الہی قدیم اور واجب نہیں۔ اسی لیے دریافت کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ ان کے نزدیک باری تعالیٰ شانہ کا جمل ممکن ہے، نہ صرف ممکن بلکہ شان الہی کا ایک

جزء ہے۔ کیونکہ جس بات کو دریافت کرتا ہے، قبل ازیں اس سے بے خبر ہوگا، اسی لیے

تو دریافت کرے گا۔ (نعوذ باللہ من ذلک۔ وما قدر اللہ حق قدرہ)

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۱ء)

۳۔ توہینِ شانِ رسالت کا محبوب ترین مشغلہ توہین و تنقیصِ شانِ رسالت تھا۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقریر الایمان، ص ۵۳

موصوف اس میدان کے ایسے اہلیے شہسوار تھے کہ اگلے پچھلے سارے گستاخوں کے کان کتر لیں، سب سے اُستادری کا لوہا منوالیا۔ قرآنِ کریم سامنے رکھ لیجیے۔ انبیائے کرام کی شان میں شکر و اور گستاخوں نے جو بیہودہ کلمات استعمال کیے انہیں کھ لیجیے۔ پھر احادیثِ نبوی کے ذخائر اور کتبِ تواریخ و سیر سے گستاخوں کے سارے نازیبا کلمات نکال کر اسی فہرست میں شامل کر لیجیے۔ اب اس مجموعہ خرافات کا تقویۃ الایمانی تعلقات سے مقابلہ کیجیے۔ اگر دل میں انبیائے کرام کی عظمت و رفعت کا تصور موجود ہے اور کسی بے دین کے پیچھے لگ کر یہ رُوحِ ایمان ضائع نہیں کی ہے تو ہر منصف مزاج ذی علم اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک شانِ رسالت میں جتنے گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں، مصنفِ تقویۃ الایمان اُن سب پر سبقت لے گیا اور موصوف نے اس میدان کی بین الاقوامی چیمپین شپ جیت لی ہے۔ اُن نازیبا کلمات کے نقل کرنے سے دل دہلتا اور کلم شق ہوتا ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی اور نقل کفر کفر نباشد کے پیش نظر، اہل اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے چند عبارتیں بطریق پر پتھر رکھ کر نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں جو دیکھتے ہیں:

بعضائے ظلمت بعضہا فوق بعض، از  
بعضائے ظلمت بعضہا فوق بعض  
دوستوں کا خیال بجا محبتِ زود بخود بہتر  
دوستوں کے دوستوں سے اپنی بی بی کی بجا محبت  
ست و صرف ہمت بسوتے شیخ و امثال  
کا خیال بہتر ہے اور شیخ یا اسی جیسے  
آن از معنیں گرجاب رسالتاب باشند  
جرگوں کی طرف خواہ جناب رسالتاب  
بچندیں تر بہتر از استراق در صورت  
ہی ہوں، اپنی ہمت کو لگا دینا، اپنے  
گادو فر خود ست، کہ خیال آن تعظیم و اجلال  
بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے  
بسویڈے دل انسان می پسند، بکلاف  
خیال گادو خوکہ نہ آن قدر چسپیدگی می بود  
تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے  
دل میں چمٹ جاتا ہے اور بیل اور گدھے  
ز تعظیم بکہ مہاں و محقر بود و این تعظیم و اجلال  
کے خیال کو نہ تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے  
غیر کہ در نماز طحونہ مقصود می شود بشرک  
اور نہ تعظیم، بکہ حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور  
می کشد؛ لہ

لہ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی : صراط المستقیم، ص ۵۵  
marfat.com

غیر کی تعظیم اور بزرگی جو نماز میں ملحوظ ہو  
وہ شرک کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔

مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم کتنا ایمان سوز، عبارت کا ہر تیور کتنا کفر بیز و کفر بیز ہے۔  
قرآن کریم کو اول سے آخر تک پڑھیے، انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے مبارک  
تذکروں سے بھرا ہوا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کا ذکر ان کے خالق و مالک نے انتہائی پیار سے  
انداز میں کیا، وہ تذکرے امت محمدیہ کی ترغیب و تشویق کی خاطر اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ  
وسلم پر نازل فرماتے، ان محبت بھرے بیانات، تعظیم و اجلال کے اعلانات کا نمازوں میں بھی  
پڑھنا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ جو ان بزرگوں کے خلبے، زبان الہی میں نمازوں کے  
انداز پڑھے، ان کے کمالات عالیہ عین حالت نماز میں بیان کرے، ان کے گن نہ گائے اس  
کی نماز ہرگز نماز ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ہر نماز میں محبوب پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی  
بارگاہ عالی میں مدیہ سلام پیش کرنا ہوتا ہے۔ آپ پر اور آپ کی آل پر جب تک صلوٰۃ و تسلیم کے  
سچول نچاؤرنہ کیے جائیں نماز مکمل نہیں ہوتی۔ یہی وہ مبارک طریقہ ہے جو تیرہ سو سال سے  
امت محمدیہ میں جاری تھا اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ امام اہلسنت علیہ الرحمہ  
نے ایسے حضرات کو یوں فہمائش کی تھی،

ذکر خدا جو ان سے جدا چاہو نجدو!  
واللہ ذکر حق نہیں، کنجی سقر کی ہے

دہلوی صاحب موصوف کے اس اصطلاحی شرک سے وہ آدمی بچ سکتا ہے جو نمازوں  
میں قرآن کریم کی تلاوت کے نزدیک بھی نہ جائے۔ نمازوں میں درود و پاک پڑھنے، تشہد میں  
عرض سلام کرنے سے پرہیز کرے ورنہ آنجناب کے نزدیک وہ شرک کے اتھاہ سمندر میں  
ڈوب جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف کے اس اصطلاحی شرک سے مسلمان رہتے  
ہوئے بچنے کا کون سا راستہ ہے؟

لے صراط مستقیم اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۲۰۱

یہ اجلال و تعظیم جب نماز میں شرک ٹھہرائی تو دوسری عبادتوں میں یہی شرک جزو ایمان تو نہیں بن جائے گا، وہاں جائز کیسے ہو جائے گا، کیا خدا کو صرف نماز کی حالت کا شرک ہی ناپسند اور باقی عبادتوں میں مقبول و پسندیدہ ہے، ہرگز نہیں، جو امر نماز میں شرک ہے دوسری عبادتوں کے درمیان اگر اس کا ارتکاب کیا گیا تو وہاں بھی شرک ہی ٹھہرے گا۔ پس جس نے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے محمد رسول اللہ کہا وہ بھی شرک کے سمندر میں گرا۔ درود پاک کا تو ہر لفظ گلے میں شرک کا پھندا ڈالے گا۔ اذان و اقامت کے وقت بھی یہی ماجرا پیش آئے گا۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے بیٹھے تو ہر آیت شرک ساگر میں غوطہ دے گی۔ اس و باقی شرک سے بچنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ جملہ عبادتوں بلکہ اسلام ہی کو خیر باد کہہ کر، بیک بینی و دوگوشی شہرِ خموشاں کا مکین ہو جائے (نعوذ باللہ من ذلک) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے باطل نظریات اور گمراہ گروں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین

انبیائے کرام و اولیائے عظام کا تصور لانے، دل میں خیال جمانے کے بارے میں موصوف کا نظریہ پیش کر دیا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے علوم مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی نظر میں کیاتے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”جو کچھ اللہ اپنے بندوں سے معاملہ کرے گا، خواہ دنیا میں، خواہ قبر میں، خواہ آخرت میں، سو اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ نہ نبی کو، نہ ولی کو، نہ اپنا حال، نہ دوسرے کا۔“

دوسرے مقام پر موصوف نے یوں وضاحت کی ہوئی ہے:

”اسی طرح کچھ اس بات میں بھی ان کو بڑائی نہیں ہے کہ اللہ صاحب نے غیب دانی ان کے اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کا احوال جب چاہیں معلوم کر لیں، یا جس غائب کا احوال جب چاہیں معلوم کر لیں کہ وہ جتنا ہے کہ مر گیا، یا کس شہر میں ہے، یا کس حال میں، یا جس آئندہ بات کو جب ارادہ کریں

تو دریافت کر لیں کہ فلا نے کے ہاں اولاد ہوگی یا نہ ہوگی، یا اس سوداگری میں اس کو فائدہ ہوگا یا نہ ہوگا، یا اس لڑائی میں فتح پائے گا یا شکست؛ کہ ان باتوں میں بھی بندے بڑے ہوں یا چھوٹے سب یکساں بے خبر ہیں اور نادان۔

ایک اور جگہ اسی رسوائے عالم کتاب میں اس طرح تصریح کی گئی ہے:

کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلا نے کے دل میں کیا ہے، یا فلا نے کی شادی کب ہوگی یا فلا نے درخت کے کتنے پتے ہیں، یا آسمان میں کتنے تارے ہیں، تو اس کے جواب میں برون کہے کہ اللہ ورسول ہی جانتے ہیں، کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟

منافقین ہرگز نہ سہرور کون و مکان، عالمِ علوم اور لیلین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا "مَلْبُودٌ مِّنْهُ وَالْغَيْبُ" موصوف نے ان دشمنانِ دین و ایمان کے ساتھ پورے طور پر موافقت کرتے ہوئے، ان کا وہی نازیبا فقرہ اپنی زبان میں یوں دہرایا کہ "غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟" نیز اویاس کے کرام و انبیاء علیہم السلام کو دنیا و آخرت میں اپنے اور دوسروں کے حال سے بے خبر بنا دیا، جراث و جبارت کی حد کرتے ہوئے نادان تک نکھ ویا د فو ذ باللہ منہا، رسول دشمنی کا رنگ اور چڑھا تو درختوں کے پتے اور آسمان کے تارے بھی غیب ہو کر رہ گئے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ رسول کسی درخت کے پتوں کی گنتی جانتے ہیں تو دہلوی صاحب کے نزدیک اس شخص نے رسول کو خدا بنا دیا۔ موصوف نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علومِ غیبیہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

"کسی نبی اور ولی کو، جنت اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۹

۲۔ ایضاً: ص ۱۰۷، ۱۰۸

کی بات معلوم کر لیں، بلکہ اللہ صاحب اپنے ارادہ سے کبھی کسی کو جتنی بات چاہتا ہے،  
خبر کر دیتا ہے۔ سو یہ اپنے ارادہ کے موافق، نہ اُن کی خواہش پر۔ چنانچہ حضرت  
پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بار بار ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بعضی بات دریافت  
کرنے کی خواہش ہوئی اور وہ بات معلوم نہ ہوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا  
ارادہ ہوا تو ایک آن میں بتا دی، لہ

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام غیب سے قطعاً بے خبر بتا دئے،  
ایک چیز کا علم بھی وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں جان سکتے کیونکہ موصوف کے نزدیک  
نورِ نبوت میں بھی اتنی نورانیت نہیں کہ ایک درخت کے پتے تک معلوم کر سکیں۔ اب اسی تصویر کا  
دوسرا رُخ ملاحظہ ہو کہ دہلوی صاحب کے خارجی گروہ میں شامل ہونے والے، انبیائے کرام  
کے گستاخوں میں اپنا نام لکھوا لینے والوں کی حالت کیا ہو جاتی تھی اور موصوف اپنے متبعین کو  
کس طرح عرش و فرش اور جنت و دوزخ کی سیر کو دیا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

بڑے انکشافِ حالتِ سموات و ملاقاتِ ارواح و ملائکہ و سیرِ جنت و نار  
و اطلاع بر حقائقِ اُن مقام و دریافتِ امکانہ آنجا و انکشافِ امرے از  
لوح محفوظ، ذکرِ یاسنجی یا قیوم مست۔ لہ

و یابی حضرات نے اپنے امام کی اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور مقاماتِ ارواح اور ملائکہ اور بہشت  
و دوزخ کی سیر اور اُس مقام کے حقائق پر اطلاع اور اُس جگہ کے مکانوں کے  
دریافت اور لوح محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یاسنجی یا قیوم کا ذکر  
کیا جاتا ہے“ لہ

لہ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۵۴

لہ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۱۲۴

لہ صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۶۱۔

دوسرے مقام پر موصوف نے اسی بات کو اور کھل کر یوں بیان کیا ہوا ہے:

”برائے کشف ارواح و ملائکہ و مقاماتِ آنها و سیراکنہ زمین و آسمان و جنت و نار و اطلاع بر لوح محفوظ مشغل دورہ کند و باستعانت ہر مشغل بہر مقامیکہ از زمین و آسمان و بہشت و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسیراں مقام احوال آنجا دریافت کند و باہل آن مقام ملاقات سازد۔“

اس عبارت کا ترجمہ خود وہابی حضرات نے یوں کیا ہے:

”کشفِ ارواح اور ملائکہ اور ان کے مقامات اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی سیر اور لوح محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے دورے کا مشغل کرے پس زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے جس مقام کی طرف متوجہ ہو اسی مشغل کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اُس جگہ کے حالات دریافت کرے، وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کرے۔“

قاریین کرام! یہ ہیں اس تصویر کے دونوں رخ کہ دہلوی صاحب کے نزدیک انبیائے کرام کو اپنے یا کسی کے خاتمے تک کا پتہ نہیں، آئندہ کی ہر بات سے انھیں بے خبرا و نادان بتا دیا، حتیٰ کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہہ دیا کہ اگر وہ کسی ایک بات کو معلوم بھی کرنا چاہتے تو معلوم نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک باری تعالیٰ شانہ نے اپنے محبوب کو ایسی کوئی طاقت نہ دی تھی اور اس قسم کا کوئی طریقہ نہیں سکھایا تھا، جس کے ذریعے وہ کسی بات کو معلوم کر لیا کرتے لیکن دوسری طرف مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے مجاہدین و معتقدین کو ایسے عملیات سکھا دیے اور شائع فرما دیے تھے کہ ان کے عامل جب چاہیں انبیاء و ملائکہ سے ملاقات کر سکتے تھے، جنت اور دوزخ کی سیر کر سکتے تھے جس گوشہ یا آئندہ واقعے کو معلوم کرنا چاہتے، اپنے یا کسی اور کے خاتمے کا حال معلوم کرنا منظور ہوتا تو لوح محفوظ سے پڑھ

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی دصراطِ مستقیم، ص ۱۲۸

۲۔ دصراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۰

سکتے تھے۔ گویا باری تعالیٰ شانہ، تو انبیائے کرام بلکہ سید الانبیاء کو بھی اس طرح معلوم کر لینے کا کوئی طریقہ نہیں بتا سکا لیکن مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے خدمت گزاروں پر چودہ طبقہ روشن کر کے دکھا دیے۔ یعنی جو کام اللہ تعالیٰ سے بھی نہ ہو سکا تو وہ دہلوی صاحب موصوف نے کر دکھایا اور جن علوم کے دروازے انبیائے کرام پر بھی بند رہے وہ دہلی کے ایک عالم نے اپنے معتقدین کے لیے چوٹ کھول کر دکھا دیے۔ اندر کی طرح باہر کی آنکھیں بھی بند کر داتے اور چند لمحات میں دنیا و مافیہا کے جلوے دکھا دیا کرتے تھے۔ یہ فیصلہ اب قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ علوم عطا کرنے میں دہلوی صاحب نے خود کو خدا سے کتر بتایا ہے یا ذات باری سے بھی اپنے آپ کو بڑھا کر دکھایا ہے، نیز موصوف کی تصریحات کے پیش نظر، علوم غیبیہ پانے میں انبیائے کرام بڑھ کر رہے یا دہلوی صاحب کے خدام بھی ان حضرات سے ہزاروں گنا سبقت لے گئے؟

پیارے قارئین! سنا تو یہی ہے کہ کسی تصویر کے زیادہ سے زیادہ دو رخ ہو سکتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلم خارجیت اس قید سے بھی آزاد تھے۔ موصوف کے پاس بعض ایسی تصویریں بھی تھیں جن کے بے شمار رخ تھے۔ زیر بحث تصویر کے آپ نے دو رخ ملاحظہ فرمائیے دوسرا رخ یہ تھا کہ دہلوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ایسے عملیات بھی بتا دیے تھے کہ ان کی مدد سے جب وہ چاہتے تو ارواح و ملائکہ سے ملاقات کر لیتے، جنت و دوزخ کی سیر فرما سکتے، لوح محفوظ سے گزشتہ و آئندہ کے واقعات اور ساری کائنات کے حوادث اور تقدیریں پڑھ لیتے۔ ہر مقام کا ان کے لیے کشف ہو جانا اور ہر جگہ پر وہ بنفس نفیس پہنچ سکتے تھے۔ اب اسی تصویر کا صرف تیسرا رخ ملاحظہ ہو:

اس آیت (۹/۵) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس ایسا کچھ علم ہے کہ جب چاہوں اس سے غیب کی بات دریافت کروں اور آئندہ باتوں کا معلوم کر لینا میرے قابو میں ہے، سو وہ بڑا جھوٹا ہے کہ دعویٰ خدائی کا رکھتا ہے۔ "لے

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی تقویۃ الایمان، ص ۴۵



دوسرے مقام پر اپنے عملیاتی چکر اور دعویٰ کشف کے بارے میں خود یوں فیصلہ صادر فرمایا ہے:

”اس آیت (۳۱) سے معلوم ہوا کہ یہ سب جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں کوئی کشف کا دعویٰ رکھتا ہے، کوئی استخارہ کے عمل سکھاتا ہے، کوئی تقویم اور پترانکا لتا ہے، کوئی رنل اور قرعہ چھینکتا ہے، کوئی فالنامہ لے پھرتا ہے، یہ سب جھوٹے ہیں اور دغا باز۔ ان کے جال میں ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔“

ادھر تو موصوف نے اپنے معتقدین پر چوڑا طبقہ روشن کر دئے ہیں لیکن ادھر فرما رہے ہیں کہ کشف کا دعویٰ رکھنے والے سب جھوٹے اور دغا باز ہیں، ان کے جال میں ہرگز نہیں پھنسنا چاہیے کیونکہ ایسا دعویٰ کرنے والا خدا کی کافر ہے۔ وہابی حضرات اپنے امام کی ان تصریحات پر غور کریں، حق و باطل میں تمیز کریں اور کسی کی بے جا محبت و طرفداری میں ایمان جیسی متاعِ عزیز کو گنوا نا کون سا نفع بخش سودا اور کھانا کی عقلمندی ہے؟ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو کل بروز قیامت خود فیصلہ ہو جائے گا۔ حقیقت کا مجید کھلنے پر اس وقت کفِ انسوس ملنا کیا کام آئے گا؟ ہم نے اپنا فرض تبلیغ ادا کر دیا، باری تعالیٰ شانہ، قبول فرمائے اور یہ دعا ہے کہ:

اے خدا راہِ ہدایت اس مسلمان کو دکھا

لذتِ ایمان کی دولت سے جو محروم ہے

اب قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ اوپر دیئے عظام و انبیاء کے کرام بلکہ سید الانبیاء والمرسلین

علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خدا داد تصرفات کے بارے میں مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا نظریہ کیا تھا؟ باری تعالیٰ شانہ نے جس محبوب کو اَنَا عَطَيْنَكَ الْخَوْشَرِ اور وَصَّانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا کے شروع سنائے اسی مالکِ تسنیم و کوثر اور باری تعالیٰ شانہ کے خلیفہ اعظم و تاجدارِ دو جہاں کے بارے میں موصوف یوں رقمطراز ہیں:

”جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔“

لے محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۶

لے ایضاً، ص ۸۲

اختیار و تصرف کے مسئلے سے قطع نظر، اس طرز تکلم کے تیور تو ملاحظہ ہوں۔ کیا ان الفاظ سے کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی اس امر کا ملتا ہے کہ ان الفاظ کا لکھنے والا، نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا امتی ہو۔ خالق و مالک جل جلالہ نے اپنے جس بے مثل بندے کو پورے قرآن کریم میں ایک مرتبہ بھی نام لے کر مخاطب نہ کیا، جس کی آواز سے کوئی اپنی آواز بلند کرے تو اسے سائے اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید سنا دی ہو، بزرگان دین نے جس مولائے کائنات کے ادب کی یوں تمکین فرمائی ہو:۔

ادب کا ہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر  
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

اُسی ہستی کا تذکرہ اس عامیانہ انداز میں! اگر گولڈ میں بسنے والا چھنگا فضا کی وسعتوں کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتا، ایک چمکاوڑ مہر درختوں کی تابانیوں کا نظارہ نہیں کر سکتا، جو ہڑکا مینڈک محیط بیکراں کی وسعتوں سے قطعاً نا آشنا ہے تو اس سے فضا کی وسعتوں، سورج کی تابانیوں اور سمندر کی بیکرائی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہ تو خود چھنگے کی کوتاہ نظری، چمکاوڑ کی محرومی اور جو ہڑ کے مینڈک کی تنگ دامانی ہے۔

یہاں بعض حضرات یوں مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ موصوف نے یہاں اختیار ذاتی کے بارے میں ایسا لکھا ہے لیکن درحقیقت یہ ذاتی اختیار ہی کے متعلق نہیں بلکہ موصوف عطا کی اختیار بھی ناپسند ہی کرتے رہے تھے وہ نہ ضرور تصریح فرمادیتے، اس صورت میں لب و لہجہ کے علاوہ نفس مستلک میں ان سے اختلاف ہی کیوں ہوتا؟ علاوہ یہی ایسی تاویلوں کی دہلوی صاحب نے خود یوں جڑ کاٹی ہوئی ہے۔

”اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی“۔

ایک اور مقام پر موصوف خوب کھلے ہیں اور وہاں اسی امر کی تصریح کرتے ہوئے یوں اپنے دل کی لگی بچھائی ہے:

اس آیت (۲۳/۸۸-۸۹) سے معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر اپنے بتوں کو اس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے، اسی سے کافر ہو گئے۔ سوا اب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے، سو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابل کی طاقت اس کو ثابت نہ کرے۔

مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی دُھن میں موصوف خارجیت کے سیلاب میں بہتے ہوئے حقیقت سے کتنی دُور نکل گئے کہ انہیں اللہ جل شانہ کے خلیفہ اعظم اور اینٹ پتھر کی مورتیوں کے اختیارات میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ انبیائے کرام اور نبی الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تو بات ہی اور ہے ایک ماہل مطلق اور معمولی سوجہ دار آدمی بھی زید و عمر اور اینٹ پتھروں کے اختیارات کو اپنے مشابہت سے کی بنا پر کبھی ایک جیسا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ زید و عمر کتنے ہی بے اختیار سہی لیکن پھر جی قدرت نے انہیں بہت سے اختیارات دیے ہونے ہیں۔ لیکن اینٹ پتھر محض بے اختیار ذلیلے ہیں۔ اس سکہ باوجود کیا کہنا ہے اُن علماء کی بے بصری کا جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے خلیفہ اعظم اور اینٹ پتھروں کے اختیارات و تصرفات میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ اس کے باوجود ایسے نہیں سکہ حضرات کو مسلمانوں کے مصلح اور ریاضیاء وغیرہ متوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے تاکہ اس گئے گور کے زمانے میں مسلمانوں کی اگر کوئی ایک آدھ آنکھ کھل جاتی ہے تو اسے بھی پٹم کر دیا جائے اور اپنے اسی کارنامے پر نازاں ہیں کہ وہ اسلام کی بلے مثالی خدمت کر رہے ہیں، ایمان کا نور پھیلا رہے ہیں۔ کاشش! یہ حضرات کبھی تنہا قی میں سوچیں اور اپنی روش پر نظر ثانی کریں۔

موصوف نے انبیائے کرام حتیٰ کہ سید الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خدو اور تصرفات و اختیارات کا یوں کھل کر انکار کر دیا لیکن اہل انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے

پیرجی وغیرہ کی شان یوں بیان کی ہے :

”ارباب این مناصب رفیعہ مازون مطلق در تصرف عالم مثال و شہادت  
می باشند۔ این کبار اولی الایدی والابصار رامی رسد کہ تمامی کلیات را  
بسوتے خود نسبت نمایند۔ مثلاً ایشان رامی رسد کہ بگویند کہ از عرش تا  
فرش سلطنت ماست“ ۱

اب اسی عبارت کا ترجمہ وہابی حضرات کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایا جاتے :

”اسی طرح ان مراتب عالیہ اور مناصب رفیعہ کے صاحبان عالم مثال و  
شہادت میں تصرف کرنے کے مطلق مازون و مجاز ہوتے ہیں اور ان بزرگواروں  
کو پہنچتا ہے کہ تمام کلیات کو اپنی طرف نسبت کریں۔ مثلاً ان کو جائز ہے کہ کہیں  
عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے“ ۲

کیا اس ستم ظریفی کی ولد کوئی دے سکتا ہے کہ اُدھر یہ حکم کہ ”جس کا نام محمد یا  
علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں“ لیکن پیرجی وغیرہ کو دینا دماغیہا کے اختیارات حاصل ہیں اور  
وہ کہہ سکتے ہیں کہ ”عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے“ مقررین بارگاہِ الہیہ کا معاملہ تھا  
تو بتایا کہ ”اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی“ اور پیرجی وغیرہ  
کی شان بیان کرنے کا وقت آیا تو بتایا کہ یہ ”عالم مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے  
مطلق مازون و مجاز ہوتے ہیں“

وہابی سدا جو! کیا یقینت نہیں آئے گی؟ کیا حساب و کتاب نہیں ہوگا؟ تمام انبیائے کرام  
کے خداداد اختیارات و تصرفات کا اس طرح انکار کہہ کے اپنے پیرجی کے خطبے پڑھنا، انھیں  
انبیائے کرام سے بھی مزاروں درجہ بڑھا چڑھا کر دکھانا، یہ پیرجی کی نبوت کی بنیادیں اٹھانا تھا  
یا اس میں کوئی اور ہی راز پنہاں ہے؟ آخر بتائیے تو سہی، یہ تماشا ہے کیا؟ نیز انبیائے کرام

۱۔ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، مطبوعہ مطبع ضیائی، ۱۲۸۵ھ، ص ۷۶

۲۔ صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۲۳۴

کے لیے یہ تصرفات ماننے پر شرک کا خطرہ بار بار سُنا یا ہوا ہے لیکن اپنے پیر جی وغیرہ کو کس مصلحت یا منفعت کے تحت خدا کا شریک بنا کر دکھایا ہوا ہے ؟

۵ پیہم سجود پاستے صنم پر وزم و دواع  
موتن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مقرینِ بارگاہِ الہیہ کے خداداد تصرفات و اختیارات کے پیش نظر اگر کوئی مسلمان اُن سے استعانت و استمداد کرتا ہے یا ذوق و شوق میں نذائیہ کلمات استعمال کرتا ہے تو جلد خوارج کی طرح مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے نزدیک ایسا شخص مسلمان ہی نہیں رہتا بلکہ مشرک ہو جاتا کیونکہ موصوف کے نزدیک سینٹ پتھروں کو پکارنا اور انبیاء و اولیاء کو پکارنا ایک ہی جیسا ہے اور اُن کا مشابہہ یہی بتاتا تھا کہ بُتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے مقبول ترین بندے بھی بے حس و حرکت اور نفع و نقصان پہچاننے سے عاجز ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اکثر لوگ جو دعویٰ ایمان کا رکھتے ہیں سو وہ شرک ہیں گرفتار ہیں۔ اگر کوئی

سمجھانے والا اُن تو گون کر کے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور اعمالِ ترک

کے کرتے ہو، سو یہ دونوں راہیں کیوں ملاستے دیتے ہو ؟ اُس کو جواب

دیتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کرتے، بلکہ یہنا عقیدہ انبیاء و اولیاء کی جناب

میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک عیب ہوتا کہ ہم اُن اولیاء و انبیاء کو، پیروں تہیوں

کو، اللہ کے برابر سمجھتے ہیں۔ ہم اُن کو اللہ ہی کا قبضہ جانتے ہیں اور اسی کا مخلوق

پر قدرتِ تصرف کی اُسی نے اُن کو بخشی ہے۔ اُس کی مرضی سے عالم میں

صرف کرتے ہیں۔ اُن کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے۔ اُن سے مدد مانگنی

عین اُسی سے مدد مانگنی ہے۔ وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں، جو چاہیں ہوں

کریں۔ اُس کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل۔ اُن کے سنے

سے خدا ملتا ہے اور اُن کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور

جتنا ہم اُن کو مانتے ہیں، اُتنا اللہ سے ہم نزدیک ہوتے ہیں۔ اسی طرح

کی خرافات بکتے ہیں۔

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۰

کسی کو اللہ تعالیٰ جیسا جانتا یا باری تعالیٰ جیسی صفات یا کسی صفتِ مختصہ کا حامل  
مانتا شرک ہوتا ہے۔ لیکن موصوف کی سینہ زوری اور ستم ظریفی کا اندازہ کون کر سکتا ہے جبکہ  
مسلمان کہتے ہیں کہ ہم انبیائے کرام و اولیائے عظام کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور اسی کی مخلوق  
جانتے ہیں۔ ان بزرگوں کے تصرفات کو باری تعالیٰ شانہ کا اعام و عطیہ مانتے ہیں، جس کا عند  
نبی سے ہو تو معجزہ اور ولی سے ہو تو کرامت کہلاتا ہے۔ اس کے باوجود موصوف اسے شرک  
قرار دیتے اور اسلامی و ایمانی وضاحت کو خرافات بنا ٹھہراتے ہیں۔ جب مسلمان اپنے  
بزرگوں کو نہ خدا جیسا یا اُس کے برابر مانتے ہیں اور نہ خدا کی صفاتِ مختصہ کا حامل جانتے ہیں  
پھر شرک کہاں سے آگیا؟ اگر مثبتین کے دلائل موصوف کے نزدیک ناقابلِ یقین تھے تو وہ  
اس عقیدے کو زیادہ سے زیادہ غیر ثابت کہہ سکتے تھے، دلائل کو کمزور ٹھہرا سکتے تھے لیکن  
جب مسلمان اپنے بزرگوں کو خدا کی ذات و صفات میں شریک نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ  
دہوی صاحب نے ہی مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر اپنا شوقِ تکفیر پورا کرنے کی غرض سے  
اللہ تعالیٰ کو مقامِ الوہیت سے اتار کر بندوں کی صفہ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آخر وہ بھی  
مخلوق میں شامل ہو اور اُس کے تصرفات بھی کسی کے عطا فرمودہ ہوں تب ہی انبیائے کرام  
و اولیائے عظام کے تصرفات سے مطابقت ہوگی اور شرک لازم آسکے گا۔ لیکن اس شرک کو  
ثابت کرنے سے پہلے الوہیت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق اور اُس کے  
اختیارات کو عطا فرمانا لازم آتا ہے ورنہ شرک کا حکم صادر فرمانا محض ایک خیالِ خام، نرا حکم  
اور سینہ زوری کے سوا اور کچھ نہیں۔ موصوف مزید لکھتے ہیں:

’جن کو لوگ پکارتے ہیں اُن کو اللہ نے کچھ قدرت نہیں دی۔ نہ فائدہ پہنچانے کی  
نہ نقصان کرنے کی۔ اور جو کہتے ہیں، یہ لوگ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس  
سو یہ بات اللہ نے تو نہیں بتائی۔ پھر کیا تم اللہ سے زیادہ خبردار ہو، سو اُس کو  
بتاتے ہو جو وہ نہیں جانتا۔ اس آیت (سورہ ابراہیم) سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان  
وزمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانے اور اُس کو  
پکارتے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔‘

لغات و اصطلاحات دہوی، دہوی، تقریر الایمان، ص ۳۱

وہابی صاحبو! آخر قیامت نے آکر رہنا ہے۔ حساب و کتاب ضرور ہوگا۔ بجلا یہ ستم ظریفی کس پر تے پر ہے کہ آیت پیش کردہ میں لفظ (يَعْبُدُونَ) موجود، خود اس کا ترجمہ کیا پوجتے ہیں، اس کے باوجود تشریح کرتے وقت لکھ دیا کہ "جن کو لوگ پکارتے ہیں"۔ کیا يعبدون یعنی پوجنے کا مطلب پکارنا ہے؟ آخر اتنی دیدہ دلیری سے قرآنی آیات کے مفہوم و مطالب میں دن دھاڑے یہ معنوی تحریف کس پر تے پر ہے؟ اگر آپ حضرات خوفِ خدا سے عاری نہیں ہو گئے اور صبحِ قیامت کے منکر نہیں تو خدا کے لیے ان امور پر غور تو فرمائیے:

۱۔ اس آیت کے کون سے لفظ کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء و اولیاء نفع و نقصان کی قدرت نہیں رکھتے؟

۲۔ آیت میں کون سا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انبیاء و اولیاء مسلمانوں کے سفارشی نہیں ہیں؟

۳۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین میں کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہے؟

۴۔ آیت تو بتوں کے بارے میں ہے لیکن آپ کے امام کو کہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء و اولیاء بھی بتوں کی طرح اینٹ پتھر ہیں؟

قاری تین کرام! پہلے سورہ یونس کی زیر بحث آیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں تاکہ مفہوم سمجھنے میں آسانی رہے:

”وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَيَعْلَمُونَ

هُوَ الَّذِي شَفَعَاءُ نَا عِنْدَ اللَّهِ قُلْ أَتَسْتَبِقُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ

وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

خود مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء) نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اور پوجتے ہیں ورے اللہ کے ایسی چیزوں کو کہ نہ کچھ فائدہ دیں ان کو، نہ

کچھ نقصان۔ اور کہتے ہیں، یہ لوگ سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ کہہ، کیا

بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں؟ سو وہ زالا

ہے ان سب سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔“

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۱

یہ آیت بُت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جملہ مفسرین نے مِنْ دُونِ اللّٰهِ سے بُت مراد لیں ہیں۔ علاوہ بریں تفسیر قرآن بالقرآن سب سے مقدم و اعلیٰ ہے۔ مِنْ دُونِ اللّٰهِ کی تفسیر خود اس آیت میں مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ سے باری تعالیٰ شانہ نے کی ہوئی ہے۔ نفع و نقصان پہنچانے میں بُت ہی مجبور محض ہیں۔ انسان کو مجبور محض ٹھہرانا، ایمان کے ساتھ ہی عقل کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا نہیں تو اور کیا ہے؟ انسانوں میں زید و عمرو سے لے کر اویاتے کرام و انبیائے کرام علیہم السلام تک سب کو باری تعالیٰ شانہ نے علی قدر مراتب نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت دی ہے۔

دہلوی صاحب موصوف نے یہاں ہاتھ کی صفاتی کا جو کرتب دکھایا وہ محیر العقول ہے۔ آنجناب کو بُت پرستوں کا نہ تو برضا و رغبت کفر میں پڑے رہنا کفر نظر آیا، نہ اُن کا بتوں کو پوجنا دہلوی سرکار میں کفر ٹھہرا، اُن کا کفر بس یہی بتایا کہ وہ بتوں کو اپنا سفارشی مانتے تھے۔ موصوف کی نظر صرف اس آخری کفر پر کیوں پہنچی اور پہلے دونوں کفریات سے کیوں نظریں بچا گئے؟ وجہ یہ ہے کہ وہ انبیائے کرام کی عداوت میں اتنے مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ مقررین بارگاہِ الہیہ کو مجبور محض ثابت کرنے کی تلاش میں رہتے تھے۔ خوارج کو اس کے سوا اور چارہ کار ہی نہیں کہ وہ تسکینِ خاطر کے لیے جو آیات بتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں انہیں انبیاء و اویاد پر چسپاں کر کے، اس طرح بزرگوں کو بتوں کی طرح مجبور محض ٹھہرا کر اپنے دل کی نگی بچایا کریں اور مسلمانوں پر شرک و کفر کی توپ داغتے رہیں۔ موصوف نے ایک مقام پر انبیائے کرام کو بتوں کی طرح مجبور محض ٹھہرا کر، دین و ایمان کے ساتھ شرافت کی حد بھی توڑ دی۔ مسلمانوں سے اتنا س ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمّت کی حیثیت سے اس جبارت پر غور کریں:

”اللہ سے زبردست کے ہوتے ہوئے ایسے عاجز لوگوں کو پکارنا کہ کچھ فائدہ اوّل  
نقصان نہیں پہنچا سکتے، محض بے انصافی ہے کہ ایسے بڑے شخص کا مرتبہ ایسے  
ناکارہ لوگوں کو ثابت کیجے“

لے محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۵



اسے مدعی اسلام، اسے کلمہ طیبہ کے ہمراہی! کیا انبیائے کرام تک کے لیے "عاجز لوگوں اور ناکارہ لوگوں" سُننا تجھ کو ارا ہے؟ خدا نہ کرے کہ تیرا جواب اثبات میں ہو۔ تعظیم رسالت جو جانِ ایمان ہے، جس کے بارے میں تَعَزُّوْذًا و تَوْقِرُوْذًا ارشادِ رحمن ہے۔ کیا اپنے نبی کو عاجز اور ناکارہ کہنا تعظیم و توقیر ہے یا توہین و تنقیص؟ کیا اُس سرکارِ ابدِ قرار کی توہین کرنے والا دولتِ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے یا مسلمانوں کا رہبر، پیشوا، مصلح اور رفیقِ مرہن جاتا ہے؟ جانِ برادر! شانِ رسالت کی توہین کر کے بیجا تاویلوں کا سہارا تلاش کرنا غضبِ الہی کو اور جوش میں لانا ہے۔ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ اور ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں، چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

"ہمارا جب خالق اللہ ہے اور اسی نے ہم کو پیدا کیا تو ہم کو بھی چاہیے کہ اپنے کاموں پر اسی کو پکاریں اور کسی سے ہم کو کیا کام؟ جیسے جو کوئی ایک بادشاہ کا غلام ہو چکا تو وہ اپنے ہر کام کا علاقہ اسی سے رکھتا ہے، دوسرے بادشاہ سے نہیں رکھتا اور کسی چوہڑے چار کا تو کیا ذکر؟"

وہابی صاحبو! انبیائے کرام کو بارگاہِ الہیہ کے چوہڑے چار کہتے ہوتے کوئی شرم تو محسوس نہیں ہوتی ہوگی؟ مانا کہ آپ مقربینِ بارگاہِ الہیہ سے استمداد کرنے کے منکر ہیں، لیکن اُمتی ہونے سے تو کھل کر انکار نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ تنگی گالی کس عقیدت کے تحت دی ہے؟ اس کی صحت ثابت کرنا کون سی دین کی خدمت ہے؟ کیا آپ صاحبان کو کلمہ گوئی کا بھی کوئی لحاظ نہیں؟ آخر انبیائے کرام و اولیائے عظام نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو اس درجہ گرسے ہوئے الفاظ اُن کی شان میں جاری کیے جاتے ہیں؟ کیا دین و دیانت کی طرح شرافت و اخلاق بھی آپ کے نزدیک بے معنی چیزیں ہیں؟ معلوم نہیں کہ ایمان آپ نے کس جانور کا نام رکھا ہوا ہے؟ اب موصوف کا ایک عجیب و غریب اور اسلام دشمنی کا ایٹمی فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

"پیغمبرِ خدا کے وقت میں بھی کافر اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے"

بلکہ اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ سمجھتے تھے اور اُن کو اُس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے مگر یہی 'پکارنا'، 'فتنیں مانتی'، 'نذروتیاز کرنی'، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اُس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابو جہل اور وہ شرک میں برابر ہیں۔" ۱

معلوم ہوتا ہے کہ موصوف انبیائے کرام کی دشمنی میں اتنے مغلوب الخال ہو چکے تھے کہ اُن کے نزدیک صرف وہی امور کفر و شرک ہو کر رہ گئے تھے جن سے عظمتِ انبیاء کا اظہار ہوتا ہو۔ مذکورہ عبارت میں دہلوی صاحب کو تہ تو کفار کا کافر رہنا کفر نظر آیا، نہ اُن کا بتوں کو پوجنا ہی موصوف کی توحید کے خلاف تھا بلکہ وہ لوگ جو اپنے بتوں کو مدد کے لیے پکارتے، اُن کی فتنیں مانتے، نذروتیاز کرتے اور انھیں اپنا وکیل و سفارشی سمجھتے، اُن کے کفر کا صرف اسی میں حصر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ "یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔" مانا کہ بتوں کے ساتھ یہ معاملہ رکھنا یقیناً کفر و شرک ہے کیونکہ نہ اُن کے اندر نفع و نقصان پہنچانے کی صلاحیت اور نہ خدا نے انھیں کسی کا وکیل و سفارشی بنایا۔ لیکن بتوں کے مجبور محض اور مبعوض ہونے کو انبیاء و اولیاء پر چسپاں کر کے یہ اپنی خارجیت پر فخر تصدیق ہی کی ہے۔ دہلوی علماء عوام الناس میں اپنا بھرم رکھنے کی غرض سے لکھ دیا کرتے ہیں کہ ہم ہرگز شفاعت کے منکر نہیں بلکہ انبیاء و اولیاء کی شفاعت کے قائل اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شفیع المذنبین مانتے ہیں۔ لیکن دہلوی صاحب بتا رہے ہیں کہ جو کسی کو اپنا سفارشی سمجھے وہ ابو جہل جیسا مشرک ہے۔ کیا وہ اپنی حضرات کے لیے اپنے امام کے فتوے سے بچنے، خارجی یا ابو جہل جیسا ہو جانے سے بچاؤ کا کوئی راستہ ہے؛ تسلی کے لیے مزید عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

"کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔" ۲

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۳-۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۳۲

”کوئی کسی کا وکیل اور حمایتی نہیں بننے والا۔“ ۱

آپ حضرات کی مزید تسلی کے لیے موصوف نے خود زبان رسالت سے اعلان کر دیا ہے

چنانچہ لکھتے ہیں:

”میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو

دوسرے کو کیا بچا سکوں گا؟“

”اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں میں کسی کی حمایت نہیں

کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔“ ۲

آگے موصوف نے سورۃ زمر کی ایک آیت پیش کر کے یوں اپنا ایٹمی فتویٰ داغ دیا ہے:

ملاحظہ ہو:

”اس آیت (۳۹) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے، گو یہی

جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزدیک حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی

مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر۔“ ۳

قارئین کرام حیران ہوں گے کہ مصنف تَقْوِيَةِ الْاِيْمَان نے انبیائے کرام کی شفاعت کو

برحق جانتا کیوں شرک ٹھہرایا؟ شَفِيعِ الْمَذْنِبِيْنَ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی شفاعت کا یقین رکھنے

والوں کو ابُو جہل جیسا مشرک کیوں بتایا؟ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حضرات کو شفاعت کی اُن کے گمان

کے مطابق ضرورت ہی نہیں رہی تھی، کیونکہ اُن کے رب (معلوم نہیں وہ ہندی تھا یا پڑاؤی؟)

نے اس سارے نوزائیدہ گروہ کی بخشش کا وعدہ کر لیا تھا۔ موصوف خود یوں رقمطراز ہیں:

”ازاں طرف حکم شد کہ ہر کہ بر دست تو بیعت خواہ کر و گو کھو کھا با شتہ ہر یک

را کفایت خواہم کرو۔“ ۴

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تَقْوِيَةِ الْاِيْمَان، ص ۳۲ ۲۔ ایضاً: ص ۶۴

۳۔ ایضاً: ص ۶۶ ۴۔ ایضاً: ص ۳۲

۵۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۰۵

مذکورہ بالا عبارت کا وہابی حضرات نے خودیوں ترجمہ کیا ہے :

”جو شخص تیرے (سید احمد صاحب کے) ہاتھ پر بیعت کرے گا اگرچہ وہ

لکھو کھما ہی کیوں نہ ہوں ہم ہر ایک کو کفایت کریں گے“ ل

قارئین حضرات اب اس تصویر کے دونوں رخ اپنے سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ دہلوی صاحب نے انبیائے کرام کو شفیح و حمایتی بنا کر بتایا ایسے لوگوں کو ابو جہل کے برابر مشرک ٹھہرایا اور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے حق میں تصریح فرمادی کہ وہ قیامت میں اپنی بیٹی فاطمہ تک کے کام نہ آسکیں گے۔ یہ جملہ انبیائے کرام کی شان ہے دوسری طرف دہلوی صاحب کے پیرو مرشد سید احمد رائے بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) ہیں کہ انہوں نے دنیا میں ہی اپنے سارے تابعین کو بخشوا لیا۔ معلوم نہیں انبیائے کرام اور سید الانبیاء علیہم السلام کا رتبہ اونچا رہا یا سید احمد صاحب رائے بریلوی کا ؛ وہابی حضرات اپنے امام کی تصریحات کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ تو کریں۔ اب اسی تصویر شفاعت کا خارجی فلم اسٹوڈیو میں تیسرا رخ جو دکھایا گیا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے :

”وہ تو بادشاہ کا امیر ہے، نہ چوروں کا تھانگی، جو چور کا حمایتی بن کر اس کی

سفارش کرتا ہے تو آپ ہی چور ہو جاتا ہے۔ اس کو شفاعت بالاذن

کہتے ہیں“ ل

معلوم نہیں اپنے سارے مریدین کو بخشوانے والے سید احمد صاحب کیوں خدا کے شریک بن بیٹھے تھے اور دوسری طرف کیوں چور یا چوروں کا تھانگی بننے کا شوق پورا کیا۔ اگر کوئی وہابی عالم یہ فرمائیں کہ سید احمد صاحب نے سفارش نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی کرم نوازی سے ایسا وعدہ فرمایا تھا، تو اس سلسلے میں ہماری درج ذیل گزارشات پر غور فرمایا جاتے :

۱۔ اگر آپ حضرات یہ فرمائیں کہ مریدین میں سے کسی نے سید احمد صاحب سے سفارش

لے صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۶۹۔۷۰

کرنے کی درخواست نہیں کی تھی کہ مشرک قرار پاتا، سید احمد صاحب نے بھی اپنے مریدین کی بخشش کے لیے سفارش نہیں کی تھی تاکہ یہ کہا جاسکے کہ وہ خدا کے شریک بن بیٹھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ بخشش کا مژدہ سنایا تھا اور سید صاحب کی بیعت سے منسلک کر دیا تھا۔ تو ہم عرض کریں گے کہ کیا آپ کے نزدیک باری تعالیٰ شانہ اپنا شریک بنایا کرتا ہے؟

۲۔ یہ وعدہ بخشش یا مژدہ کفایت سید احمد صاحب کی بیعت پر ہی کیوں منحصر کیا گیا؟  
۳۔ بقول دہلوی صاحب ادرہ تو سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نخت جگر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کے بارے میں ایسا مژدہ نہ سنایا گیا لیکن ادرہ سید صاحب کے جمیع مریدین کے متعلق یہ خوشخبری سنائی گئی، تو ان حالات میں خاتون جنت سے سید احمد صاحب کے ہر مرید کی شان آپ حضرات کی نظر میں زیادہ ہونی یا نہیں؟

۴۔ دہلوی صاحب کے نزدیک شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی تک کو نہ بخشوا سکے بلکہ قیامت میں بھی نہ بچا سکیں گے لیکن سید احمد صاحب نے اپنے جملہ مریدین کو دنیا میں ہی بخشوا لیا۔ ان حالات میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتبہ اونچا رہا یا سید احمد صاحب کا؟

۵۔ دہلوی صاحب کی تصریحات کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، شفیع المذنبین ہوئے یا سید احمد صاحب؟

۶۔ سید احمد صاحب تو چور یا چوروں کے تھاکی نہ بنے لیکن ان کے رب نے انہیں چور اور چوروں کا تھاکی بنا دیا یا نہیں؟

اے چشم اشک بار درادیکھ تو سہی!  
یہ گھر جو بہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

موصوف اپنے نبی کو افضل الرسل ضرور کہتے ہیں تو بہن انبیاء کا عالمی ریکارڈ لیکن اس کے خصائص کے قائل نہیں، بلکہ دیگر رسولوں کے مقام پر رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے خود یوں تصریح کرتے ہوئے اپنے

نبی کے دوسرے مقام کا ذکر کیا ہے،

”جو خوبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں، سو بیان کرو، وہ سب رسول

کہہ دینے میں آجاتے ہیں، کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں“

یہ درست ہے کہ آدمی کے حق میں رسالت سب سے بڑا مرتبہ ہے لیکن قرآن کریم کی تصریح کے

مطابق تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم افضل الرسل

اور نبی الانبیاء ہیں۔ آپ کو بعض ایسے کمالات سے بھی نوازا گیا ہے جو دوسرے رسولوں کو نہیں

ملے۔ اگر آپ کے سارے کمالات رسول کہہ دینے میں آسکتے تو یقیناً آپ کے مخصوص کمالات

دیگر انبیاء کو بھی ملے ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ کی جملہ خوبیوں کو رسول کہہ دینے میں محصور

بتانا، خصائصِ مصطفیٰ سے چشم پوشی کا مرض ہے، جو خارجیت کا خاصہ ہے۔ موصوف دوسرے

مقام پر یوں تصریح کرتے ہیں،

”اُس شہنشاہ کی تزیینت ہے کہ ایک آن میں یکم گن سے چاہے نو کروڑوں

نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبرائیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر

پیدا کر ڈالے۔“

قدرتِ خداوندی کے انکار کی کسے مجال، لیکن امکانِ نظیر کا یہ نظریہ، خصائصِ مصطفیٰ کا

انکار کرنے کی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے ایک آن میں کروڑوں پیدا

کیے جاسکتے ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ سراسر غیر اسلامی ہے اور خصائصِ مصطفیٰ کے انکار کا مترادف ہے

اسی لیے علمائے اہلسنت کو اس سے اختلاف رہا جب موصوف نے وہی میں اس نظریے

کا پرچار کرنا شروع کیا تو علمائے کرام نے اُن کا محاسبہ شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں احقر

چند معروضات پیش کرتا ہے:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باری تعالیٰ شانہ نے آخری نبی بنایا اور قرآن کریم میں

لے محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقریر الایمان، ص ۱۱۳

لے ایضاً: ص ۶۷، ۶۸

اس امر کا واضح اعلان فرمایا ہے۔ بقول دہلوی صاحب اگر آپ کے کروڑوں ہمسروں میں ایک بھی پیدا فرما دیا جاتے تو آخری نبی ہمارے آقا رہیں گے یا آنے والا نبی؛ اگر آنی والا آخری نبی نہیں ہوگا تو ہمسر کہاں ہوا؛ اگر وہی آخری نبی ہوگا تو یہ کلام الہی کی تکذیب ہوگی جو محال ہے۔ دریں حالات آپ کا مثل کیسے پیدا ہوگا؟

۲۔ حبیبِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رحمتہ للعالمین بنایا گیا اور کلام الہی میں اعلان فرمایا گیا۔ عالمین کے دائرے میں ساری مخلوق آتی ہے۔ جو پیدا ہو چکے اور پیدا ہوں گے، ان میں سے ایک فرد بھی اس زمرے سے باہر نہیں۔ آپ کے ہمسر بن کر آنے والے نبی بھی اس زمرہ سے باہر نہیں ہوں گے، وہ بھی ہمارے آقا کی رحمت کے محتاج ہوں گے، پھر برابری کہاں ہوئی؟ اگر اُس آنے والے کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی رحمتہ للعالمین بنایا گیا تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمتہ للعالمین نہ رہے بلکہ اُس آنے والے کی رحمتہ للعالمین کے محتاج ہو گئے اور یہ صورت بھی کلام الہی کی تکذیب پر منتج ہوگی۔ پھر ہمسر کیسے آئے گا؟

۳۔ اسی طرح بے شمار خصائص موجود جن میں دوسرے کی شرکت محال ہے مثلاً آپ یومِ یثاق سب سے پہلے بنی فرمانے والے، سب سے پہلے آپ کا نور پیدا ہوا، آپ باعثِ ایجادِ عالم ہیں۔ جلا دوسرے کو یہ اوصاف اب کیسے حاصل ہوں گے؟ اسی طرح آپ کا دین آخری دین، آپ کی شریعت آخری شریعت، قرآن کریم آخری کتاب، دوسرا آتے تو کلام الہی کی تکذیب اور انوکھی بہت کا خاتمہ ہوا اور یہ محال۔ پھر کروڑوں کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بروزِ حشر سب سے پہلے اُٹھیں گے، لواء الحمد آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا، جملہ نبی آپ کے جھنڈے تلے ہوں گے، مقامِ محمود پر آپ رونق افروز ہوں گے، بلصراط سے سب سے پہلے آپ گزریں گے، آپ سے پہلے شفاعت کی کوئی بھی جرأت نہ تھی، آپ سے پہلے آپ جنت میں داخل ہوں گے و غیرہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جو صرف آپ کو عطا ہوں گے لیکن باری تعالیٰ نے ان کا اعلان اپنے حبیب

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کروادیا ہے۔ اگر کسی دوسرے کو یہ صفات دی جائیں تو خدا اور رسول کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا اور دوسرے کو اگر یہ کمالات نہ دیے گئے تو وہ آپ جیسا کہاں ہوا؟ گویا: نہ

رُخِ مَصْطَفٰی ہ ہے وہ آئینہ نہیں جس کے رنگ کا دوسرا  
نہ کسی کے وہم و گمان میں، نہ وکان آئینہ ساز میں

فارقین کرام کا شاید یہ گمان ہو گا کہ دہلوی صاحب صرف اپنے نبی کے خصائص سے چڑتے تھے لیکن دوسرے رسولوں کے برابر ان کا مرتبہ ضرور مانتے ہوں گے۔ لیکن صورت حال یہ بھی نہیں ہے۔ جب خصائص و یکتائی کی کرسی سے اتار کر عام رسولوں والی دوسری کرسی پر بٹھایا ہے تو اعزاز و اکرام کے لیے کبھی ایسا نہیں کیا جاتا۔ موصوف یہاں سے بھی اٹھا کر اپنے نبی کو ایسے انبیاء والی تمیزی کرسی پر بٹھا گئے، جن پر ایمان لانا ضروری نہیں، جن کو ماننا محض غبط ہے۔ آئیے اس منصب کی کہانی خود موصوف کی زبانی ہی سن لیجیے:

”جتنے پیغمبر آئے سو وہ اللہ کی طرف سے یہی حکم لائے کہ اللہ کو ماننے اور اس کے  
سوا کسی کو نہ مانئے“ ۱

”میرے سوا کسی کو حاکم و مالک نہ جانے اور کسی کو میرے سوا نہ مانے“ ۲

”اللہ کے سوا کسی کو نہ مان“ ۳

”اور وہ کو ماننا محض غبط ہے“ ۴

”اگر کتنا ہی گنا ہوں میں ڈوب جاتے، محض بے جا ہی بن جائے، پر ایسا مال  
کھانے میں کچھ قصور نہ کرتے اور کچھ بھلائی برائی کا امتیاز نہ کرے مگر تو بھی شرک  
کرنے سے اور اللہ کے سوا کے اور کسی کو ماننے سے بہتر ہے“ ۵

۱۔ محمد امجد علی دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۴ ۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۳۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۔ ایضاً، ص ۳۹

۵۔ ایضاً، ص ۸۹



یہ تھی وہ تیسری کرسی جس پر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کو بٹھایا کہ وہ نبی تو ضرور ہیں لیکن  
 اُن پر ایمان لانا نہ صرف غیر ضروری اور برا خطبہ ہے بلکہ شرک کی طرح قابلِ اجتناب اور محض  
 بے جا بن جانے سے بھی بدتر ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان حالات میں دہلوی صاحب کے نبی کی  
 شرعی حیثیت کیا ہے؟ شرعی حیثیت بتانے کی غرض سے موصوف نے اپنے نبی کو وہاں سے  
 بھی اٹھا کر پوچھی کرسی پر بٹھا دیا اور اُس کے بولنے والے کی شان یہ بتائی ہے،  
 • انبیاء و اولیاء کو جو اللہ نے سب لوگوں سے بڑا بنایا ہے سو اُن میں ہی بڑائی  
 ہے کہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور بُرے سے بھلے کاموں سے واقف ہیں، سو لوگوں  
 کو سکھاتے ہیں ۱۱۵

دہلوی صاحب نے خود اپنے نبی کی زبان سے بھی یہی اعلان کروا دیا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت  
 کام آئے:

”سب لوگوں سے امتیاز مجھ کو یہی ہے کہ اللہ کے احکام سے میں واقف ہوں۔  
 اور لوگ غافل، سو اُن کو اللہ کا دین مجھ سے سیکھا چاہیے۔“  
 پوچھی کرسی پر بٹھا کر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کا تعارف یوں کروایا ہے کہ وہ پہلے بُرے  
 کام سے واقف تھے اور لوگوں کو سکھایا کرتے تھے یعنی ایک مولوی صاحب ہی سمجھ لیجئے۔ اگرچہ  
 عمل والا معاملہ یہاں زیر بحث نہیں کہ دین کی جو واقفیت تھی اُس کے مطابق وہ خود بھی عمل  
 یا نہیں۔ یہاں پہنچا کر بھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی مشکین تہنوی کیونکہ مولوی صاحبان کا  
 منصب بھی کسی قدر قابلِ اعزاز ہے، لہذا موصوف نے اپنے نبی کو یہاں سے اٹھا کر پانچویں  
 کرسی پر بٹھایا اور ڈرا لاک لپیٹ کے ساتھ اپنے نبی کا تعارف یوں کروایا:  
 ”جیسا ہر قوم کا چودھری لوگ اداں کا زمیندار، سو اُن معنوں کو ہر پھر لہنی آیت  
 کا سردار“ ۱۱۶

۱۱۵ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۵۸ ۱۱۶ ایضاً: ص ۱۱۹

۱۱۵ ایضاً: ص ۱۱۵

موصوف نے مجھا دیا کہ ہمارے نبی کا احترام محض اسی طرح کا ہے جیسے گاؤں کے چودھریوں اور زمینداروں کا ہوتا ہے۔ گویا دہلوی صاحب کے نبی اپنی امت کے چودھری صاحب تھے۔ اس گرسی پر بٹھا کر بھی موصوف کو پچھتا نا پڑا کہ شرعی حیثیت نہ سہی لیکن نبی صاحب دنیاوی لحاظ سے تو اب بھی معظّم رہ گئے۔ ہمت کر کے اپنے نبی کو یہاں سے بھی اٹھا کر چھٹی گرسی پر بٹھا دیا اور یوں اُن کا تعارف کروانا شروع کیا:

”انسان آپس میں سب بھائی ہیں، جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے۔ سو اُس کی بڑے بھائی کی سنی تعظیم کیجیے۔“  
 جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں، وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی۔“

موصوف کو انبیائے کرام کی بڑائی سے تو خاص چڑ تھی۔ پہلی عبارت میں بھول کر اپنے نبی کو بڑا بھائی، ساری امت کا بڑا بھائی اور بڑے بھائی کی سنی تعظیم کے لائق کہہ بیٹھے تھے لیکن فوراً سنبھل گئے اور اگلی عبارت میں بتا دیا کہ بڑے چھوٹے کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس اتنا یاد رکھو کہ ہمارے یہ نبی صاحب ہمارے بھائی ہیں۔ غلطی دیر بعد اس پر بھی تمللا اُٹھے کیونکہ موصوف دہلی کے مشہور و معروف خاندان کے ایک فرد تھے۔ کسی کو اپنے برابر سمجھیں یہ ذرا مشکل بات تھی۔ لہذا فوراً اپنے نبی صاحب کو یہاں سے بھی اٹھایا اور ساتویں گرسی پر بٹھا کر اُن کے منصب و مرتبے کا لحاظ رکھنے کی یوں تلقین کرنی شروع کر دی:

”کسی بزرگ کی شان میں زبان سنبھال کر بولو اور جو بشر کی سنی تعریف ہو، سو ہی کرو، سو اُس میں بھی انحصار ہی کرو۔“

یعنی اپنے نبی کا مقام مطلق بشر جیسا بتایا، ہر ایزا غیر اتھو خیرا جتنی تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے، بس اتنی کا حقدار بتایا جو ایک عام انسان سے بھی کم ہو۔ اتنے پر بھی دہلوی صاحب کے دل کو تسکین نہ ہوئی کیونکہ عام انسان بھی آخر اشرف مخلوق کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لہذا اپنے

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۱۱ ۲۔ ایضاً: ص ۱۱۱

۳۔ ایضاً: ص ۱۱۵

نبی کو آٹھویں کرسی پر بٹھا کر یوں اعلان کیا گیا :

”اس بات میں اولیاء اور انبیاء، جن اور شیطان میں، مجتہد اور پری میں کچھ فرق نہیں“ لے

”خواہ یہ عقیدہ انبیاء اور اولیاء سے رکھے، خواہ پیر اور شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ مجتہد اور پری سے“ لے

”کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر شہید کی، مجتہد پری کی یہ شان نہیں“ لے  
 پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں شہیدوں کی، مجتہد پری کی، اس قسم کی تعظیم کرے..... سو ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے“ لے  
 ”جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جن اور فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور شہید کو یا نجومی اور رمال کو یا جفار کو یا فال دیکھنے والے کو یا برہمن اشقی کو یا مجتہد اور پری کو یا ساجانے اور اس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے، سو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور اس آیت (۱۰۶) سے منکر“ لے

”جو لوگ پہلے اور پچھلے، آدمی اور جن بھی سب مل کر جبرائیل اور پیغمبر ہی سے ہو جائیں تو اس ملک الملک کی سلطنت میں ان کے سب کچھ رونق نہ بڑھ جائے گی اور جو سب لوگ مل کر شیطان اور جبال ہی سے ہو جائیں تو اس کی رونق گھٹنے کی نہیں“ لے

مصوف نے اعلان فرمادیا کہ ہمارے نبی صاحب علم و اختیار میں جن، مجتہد اور پری جیسے ہیں تعظیم و توقیر کے لحاظ سے انہیں جن و مجتہد و پری کے زمرے میں ہی رکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے وجود سے خدا کی بادشاہت میں کوئی رونق نہیں ہے۔ لیکن

۱۔ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۳ لے ایضاً: ص ۳۶

۲۔ ایضاً: ص ۲۸، ۲۹

۳۔ ایضاً: ص ۳۶

۴۔ ایضاً: ص ۶۸

۵۔ ایضاً: ص ۵۲

موصوف کی تسلی اس پر بھی نہ ہوئی۔ اپنے نبی صاحب کو یہاں سے اٹھا کر نوں کرسی پر بٹھایا جاتا ہے اور اُن کا ایسا مرتبہ بتایا جاتا ہے جس سے کم رُتے کی کوئی چیز کائنات میں نہیں مل سکتی۔ مثلاً:

”سب انبیاء اور اولیاء اُس کے رُوبرو ایک ذرہ ناچیز سے بھی کم تر ہیں!“

”اور یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے!“

یہ ہے دہلوی صاحب کے نبی کی آخری شان، امتیازی مقام کہ اگر اُسے ایک ذرہ ناچیز کے ساتھ موصوف بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، تو اُن کا ٹھوٹا خدا، اُن کے ایللیے نبی کو اُس ذرہ ناچیز سے بھی کم تر شمار کرتا ہے اور دوسری دفعہ جب وہ اپنے نبی کو ساری مخلوق سمیت بارگاہِ خداوندی میں مقابلے کے لیے حاضر کرتے ہیں، تو ذرہٴ مخلوق سے الگ دہلوی صاحب کا دریافت کر وہ کوئی چمار بھی ہے، وہ بھی حاضر ہو جاتا ہے۔ خدا سے موصوف مقابلہ کرواتے ہیں۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی اس مقابلے کا نتیجہ خودیوں سناتے ہیں کہ خدا کے مقابلے میں چمار اتنا ذلیل نہیں ہے جس قدر ساری مخلوق اور موصوف کا خیالی نبی ذلیل ہے۔ (لعوذ باللہ منہا)

یہ تھا مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور اُن کے جملہ تابعین و معتقدین کا نبی۔ لیکن ہمارے نبی وہ ہیں جو صرف ہمارے ہی نہیں بلکہ ساری کائنات حتیٰ کہ سارے نبیوں کے نبی اور جملہ رسولوں کے سردار و سرور ہیں۔ دونوں جہانوں میں جس کو جو نعمت، رحمت، عظمت، فضیلت ملی یا ملے گی وہ اُنہی کے صدقے، اُنہی کے ہاتھوں ملی اور ملے گی کیوں کہ باری تعالیٰ شانہ نے اُنہیں رحمتہ للعلیین اور اپنی نعمتوں کا تقسیم کرنے والا بتایا ہے۔ اُنہیں اپنا خلیفہ اعظم و نائب اکبر بنایا اور ساری کائنات کو اُسے محبوب کی خاطر وجود کا لباس پہنایا ہے۔ ہمارے خالق و مالک نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے پیارے نبی کو کونین کا آقا و مولیٰ، بلجا و ماویٰ اور دونوں جہانوں کا تاجدار بنا کر، متاعِ کُل و حاکمِ کُل و مالکِ کُل اور مازون و مختار و

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۰۴

لے ایضاً: ص ۴۳

مجاز بنا دیا ہے۔ یعنی سہ

خالقِ کُل نے آپ کو مالکِ کل بنا دیا

دونوں جہاں ہیں آپ کے قبضہ و اختیار میں

ہمارا نبی، ہمارا اور ساری کائنات کا دو جگ میں سہارا ہے ہمارا نبی وہ ہے جیسے تمام گنہگاروں کی اناٹہا کہہ کر اس روز شفاعت فرماتے گا۔ جب جلالِ خداوندی کو دیکھ کر جلد انبیائے کرام نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ ہمارے نبی نے شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكِبَايُوتِ كَابْنِ نَجْمِ وَرُوحِ پَرِدِ مَرْدِہ سَاكِر، ہم جیسے گناہگاروں اور سیاہ کاروں کے مردہ جسموں میں جان ڈالی ہوئی ہے۔ وہی اول شافع، اول مشفع، ساتی کوثر و نسیم اور صاحبِ مقام محمود ہے۔ بروزِ حشرِ اولین و آخرین سب ان کی تفریبت میں رطب اللسان ہوں گے، سب ان کا شہرہ تھیں گے، انہیں کا سہارا تلاش کریں گے۔ اس روز ثناء الحمد ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا۔ جب سورج سوا ایزرے پر ہوگا، زمین تپ کر تاشے کی طرح ہوگئی ہوگی، اس روز اس جھنڈے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ یحییٰ کو پناہ ملی اس جھنڈے سے نیچے مل سکے گی۔ جو ان سے پھر اُدھ خدائے پھرا، بول ان سے مستغنی ہوا اُدھ خدائے مستغنی ہوا۔ ان کی گستاخی تو دور کی بات جو ان کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کر تو سے اس کے بھی تبارھی زندگی کے ہمارے خالق ہو جاتے ہیں۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہ ماننے والا مسلمان ہی نہیں۔ ایمان انہیں ماننے، انہیں جانتے اور ان کی تعظیم و توقیر کرنے ہی کا نام ہے۔ ان کی صحبت جانِ ایمان، ان کا ذکر راحتِ جان، ان کی قربانیاں اور اسی بخشش کا سامان، ان کی پیاری پیاری اداؤں کو اپنالنا کچھ عمل اور عطا بلکہ حیات بنانے والے پکا مسلمان، دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران۔ ہمارا نبی دستِ قدرت کے کمال کا نشا ہنگام ہے۔ ان جیسا نہ آج تک کوئی ہوا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ سب کے کمالات اس جانِ جہان میں موجود ہیں لیکن ان کے مخصوص کمالات کسی کو بھی نہیں ملے۔ ہمارا نبی ساری کائنات میں سب سے معزز و مکرم ہے۔ انہیں باری تعالیٰ شانہ نے کارخانہ ہستی کا شاہد بنایا، انہیں اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا، مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ

انہیں دکھایا اور بتایا ہے۔ لوح و قلم کے علوم ہمارے آقا کے معلومات کا ایک حصہ اور اسی بحر کی ایک لہر ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ/۱۸۳۱ء) نے علامہ ابن تیمیہ حراتی تکفیرِ مسلمین (المتوفی ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) اور محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر اس بے دردی سے مسلمانوں کی تکفیر کی کہ ساری امتِ محمدیہ کو مشرک و کافر بتانے میں درجہ برابر ہجرتِ محسوس نہیں کی۔ چنانچہ اپنے مخصوص پروگرام کے تحت مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی بنیاد یوں رکھی تھی:

”سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب۔ لیکن اکثر لوگ شرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔“

موصوف نے چونکہ ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کو مشرک بتانا تھا، اسی لیے عوام کے ذہنوں کو تیار کرتے کی خاطر یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ ”شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب“ اب اپنے شریکات کی فہرست یوں شروع کرتے ہیں:

”اکثر لوگ پیروں کو، پیغمبروں کو، اماموں کو، شہیدوں کو، فرشتوں کو، پریوں کو، مشکل کے وقت پکارتے ہیں۔ ان سے مرادیں مانگتے ہیں، ان کی تمناں مانگتے ہیں، حاجت برآنے کے لیے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ بلا کے ٹالنے کے لیے اپنے بیٹوں کو ان کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبداللہی رکھتا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش، کوئی پیر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش، کوئی غلام محمدی الدین۔ ان کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بٹری ڈالتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے جانور کرتا ہے۔ کوئی مشکل کے وقت

دہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ غرض جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں، وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان اہیاد اور اولیاد سے اماموں اور شہیدوں سے، فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمان کا کیے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ منہ اور یہ دعویٰ! لے

موصوف کے یہ شریکات یاد رکھیے اب دوسری فہرست ملاحظہ ہو:

’شُرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھہراتے ہیں، وہ چیزیں اور کسی کے واسطے کرنی۔ جیسے سجدہ کرنا، اُس کے نام کا جانور کرنا، اُس کی منت ماننی، مشکل کے وقت پکارنا، ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنی، سو ان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ پھر اللہ سے چھوٹا ہی سمجھے اور اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ! لے

اب مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۲ء) کے شریکات کی تیسری فہرست ملاحظہ ہو۔

’جو کوئی کسی کا نام اُٹھتے بیٹھتے لیا کرے، دُور نزدیک سے پکارا کرے، بلا کے مقابلے میں اُس کی دہائی دے اور دشمن پر اُس کا نام لے کر ہل کرے، اُس کے نام کا ختم پڑے یا شغل کرے یا اُس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہوں، زبان سے یا دل سے، یا اُس کی صورت کا، یا اُس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اُس کو خبر ہو جاتی ہے۔ اُس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری اور تندرستی، کشائش اور تنگی، مرنا اور جینا، غم اور خوشی، سب کی ہر وقت اُسے خبر ہے۔

لے محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۹

لے ایضاً: ص ۳۳

جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے دل میں گزرتا ہے، وہ سب سے واقف ہے۔ سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے۔<sup>۱</sup>

موصوف کے بتاتے ہوئے مشرکوں میں مندرجہ ذیل امور کے قائلوں کا بھی شمار کر لیا جاتا ہے:

”جو کوئی کسی اور کو ایسا متصرف ثابت کرے، اُس سے مراد مانگے، اس توقع پر نذرینا کرے، اُس کی منگی مانے، مصیبت کے وقت اُس کو پکارے، سو مشرک ہو جاتا ہے۔“<sup>۲</sup>

موصوف کے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست تو کافی طویل ہے۔ لہذا اسی فہرست میں مزید اضافہ یوں بھی کیا ہے:

”بعضے کا تم تعظیم کے لیے اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ اُن کو عبادت کہتے ہیں۔ جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے نام پر مال خرچ کرنا، اُس کے نام کا روزہ رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے یہ لوگ اُس کے گھر کی زیارت کو جاتے ہیں اور رستے میں اُس مالک کا نام پکارنا، نام معقول باتیں کرنے سے اور شکار سے بچنا اور اُسی قید سے جا کر طواف کرنا، اُس کے گھر کی طرف سجدہ کرنا، اُس کی طرف جانور لے جانے، وہاں منگی ماننی، اُس پر غلاف ڈالنا، اُس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی، التجا کرنی اور دین و دنیا کی مرادیں مانگنی، ایک پتھر کو بوسہ دینا، اُس کی دیوار سے اپنا منہ اور چھاتی طنی، اُس کا غلاف پکڑ کر دُعا کرنی، اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجاور بن کر اُس کی خدمت میں مشغول رہنا، جیسے جھاڑو دینی، روشنی کرنی، فرش بچانا، پانی

<sup>۱</sup> محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۵، ۳۶

<sup>۲</sup> ایضاً: ص ۳۶



پلانا، وضو غسل کا لوگوں کے لیے سامان درست کرنا، اُس کے کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر پانی ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانا رخصت ہوتے وقت اُٹے پاؤں چلنا، اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا، یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا، مویشی نہ چگانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لیے اپنے بندوں کو بتائے ہیں۔

پھر جو کوئی کسی پیر پیغمبر کو، یا بھوت پری کو، یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو، یا کسی کے تھان کو، یا کسی کے چلے کو، یا کسی کے مکان کو، یا کسی کے تبرک یا نشان یا تابوت کو، سجدہ کرے، یا رکوع کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو، یا جانور چڑھائے، یا ایسے مکان میں دُور دُور سے قصد کر کے جاوے، یا وہاں روشنی کرے، عکلاف ڈالے، چادر چڑھائے، اُن کے نام کی چھڑی کرے، اُن کی قبر کو بوسہ دے، مور چل جھلے، اُس پر شامیازہ بکھرا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ لے، رخصت ہوتے وقت اُٹے پاؤں چلے، وہاں کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرنے، سوائس پر شرک ثابت ہوتا ہے۔

دہلوی صاحب کے شریکات کا دریا اپنی پورسی طعنا بیوں پر تھا، لہذا تھمنا کہاں؟ وہاں بیت کی گنگا میں جتنا کہاں؟ قارئین ابھی نہ اکتائیں۔ مسلمانوں کو مشکل بتانے کی دہلوی صاحب نے جو فہرست تیار کی اُس میں یہ بھی شامل ہیں:

جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی اماموں شہیدوں کی، بھوت پری کی اس قسم کی تعظیم کرے، جیسے اڑے کام پر اُن کی تدرمانے، مشکل کے وقت اُن کو پکارے، بسم اللہ کی جگہ اُن کا نام لے، جب اولاد ہو اُن کی تدر نیاز کرے، اپنی اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش، پیر بخش رکھے۔ کھیت اور باغ میں اُٹکا

لے محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۶، ۳۷

حقہ لگائے۔ جو کھیتی باڑی سے آئے پہلے اُن کی نیاز کرے جب اپنے کام میں لائے، دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کے جانور ٹھہرائے، پھر اُن جانوروں کا ادب کرے، پانی دانے پر سے نہ ہانکے، کڑی پتھر سے نہ مارے، کھانے پینے پھینے میں رسموں کی سند پکڑے کہ فلا نے لوگوں کو چاہیے فلا نا کھانا نہ کھائیں، فلا نا کپڑا نہ پہنیں، حضرت نبی کی صمنک مرو نہ کھائیں، لونڈی نہ کھائے، جس عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وہ نہ کھائے، شاہ عبدالحق کا تو مشہور حقہ پینے والا نہ کھائے، برائی اور بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے اُس کو اُن کی طرف نسبت کرے کہ فلا نا اُن کی پھنکار میں آکر دیوانہ ہو گیا، فلا نے کو اُنھوں نے راند تو محتاج ہو گیا، فلا نے کو نواز تو اُس کو فتح و اقبال مل گیا، قحط فلا نے ستارے کے سبب سے پڑا، فلا نا کام جو فلا نے دن شروع کیا تھا یا فلا نی ساعت میں سو پورا نہ ہوا، یا یوں کہیں کہ اللہ و رسول چاہنے کا تو میں آؤں گا، یا پیر جانے گا تو یہ بات ہو جاتے گی، یا اُس کے تمیں بولنے میں یا معبود، داتا، بے پروا، خداوندِ خدا بیگان، مالک الملک، شہنشاہ بولے، یا جب حاجت قسم کھانے کی پڑے تو پتھر کی، یا علی کی، یا امام کی یا پیر کی یا اُمی قبروں کی قسم کھائے۔ سو ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔

اب ذرا سجدہ تعظیمی کے بارے میں آنجناب کی تحقیق اتنی ملاحظہ فرمائی جائے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اس آیت (۱۶۴) سے معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں یوں ہی فرمایا ہے: سجدہ کرنا حقِ خالق ہی کا ہے سو کسی مخلوق کو نہ کیا جائے کہ مخلوق ہونے میں چاند اور سورج، نبی اور ولی برابر ہیں۔ جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی کسی مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے، جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت

یعقوب نے حضرت یوسف کو، تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کر لیں۔ اصل بات یہی ہے کہ بندے کو اللہ کا حکم ماننا چاہیے جب اُس نے جو حکم فرمایا اُس کو جان و دل سے قبول کر لینا چاہیے اور حجت نہ نکالے کہ اگلے لوگوں پر تو یہ حکم نہ تھا، ہم پر کیوں ہوا؟ ایسی حجتیں لانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ ۱۰

بزرگوں کے سامنے ادب سے کھڑا ہونا بھی شرک ہے۔ لیجیے موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:  
 اِس آیت (۱۲/۱۶) سے معلوم ہوا کہ ادب سے کھڑا ہونا، اُس کو پکارنا اور اُس کا نام جینا، اُنھیں کاموں میں سے ہے کہ اللہ صاحب نے خاص اپنی تعظیم کے لیے ٹھہراتے ہیں اور کسی عظیم معادہ کرنا شرک ہے۔ ۱۱

دہلوی صاحب اپنے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے آگے یوں وضاحت فرماتے ہیں:  
 ”اِس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کے لیے نہ کیا جاتے ہیں۔ کسی کی قبر یا چلے پڑیا کسی کے تھان پر دور دور سے قصد کرنا، سفر کی رنج و تکلیف اٹھانے، میلے کھیلے ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر با نور چل جانے، غنٹیں پوری کرنی، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا اور اِسی قسم کے کام کرنے اور اُن سے کچھ دین و دنیا کے فائدہ کی توقع رکھنا۔ یہ سب شرک کی باتیں ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔ ۱۲

اِسی سلسلہ شریکاتِ دباہیہ کی آخری عبارت پیش خدمت ہے۔ اِس کے شریکاتِ عجیب سے عجیب تر ہیں۔

۱۰ لے محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۷۸، ۱۱ لے ایضاً: ص ۷۹

۱۲ لے ایضاً: ص ۷۹

” اس آیت (۱۱۶) سے معلوم ہوا کہ جانور کسی مخلوق کے نام کا نہ ٹھہرائیے اور وہ جانور حرام اور ناپاک۔ اس آیت میں کچھ اس بات کا ذکر نہیں کہ اس جانور کے ذبح کرنے کے وقت کسی مخلوق کا نام لیجیے جب حرام ہو۔ بلکہ اتنی ہی بات کا ذکر ہے کہ کسی مخلوق کے نام پر جہاں کوئی جانور مشہور کیا کہ یہ گاتے سید احمد کبیر کی ہے، یا یہ بکر اشیح سدو کا ہے، سو وہ حرام ہو جاتا ہے، پھر کوئی جانور ہو، مرغی یا اونٹ، کسی مخلوق کے نام کا کر دیجیے، ولی کا یا نبی کا، باپ کا یا داد سے کا، بھوت کا یا پری کا، وہ سب حرام ہے اور ناپاک، اور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔  
مناسب نظر آتا ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) جن جن کاموں کے کرنے والوں کو مشرک بتایا ان کی مذکورہ عبارات کی روشنی میں ایک فہرست پیش کر دی جائے جو اس طرح بنتی ہے:

- ۱۔ جس نے مشکل کے وقت کسی نبی یا ولی کو پکارا تو مشرک۔
- ۲۔ ان کی غنتیں مانیں تو مشرک۔
- ۳۔ ان کی تدر و نیاز دی تو مشرک۔
- ۴۔ بلا ٹھننے کے لیے اپنے کسی بیٹے کو ان کی طرف منسوب کیا تو مشرک۔
- ۵۔ اپنے کسی بیٹے کا نام عبد النبی، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، ملا بخش یا غلام محی الدین وغیرہ رکھا تو مشرک۔
- ۶۔ کسی بزرگ کے نام کے غریبوں کو کپڑے پہناتے، کھانا کھلایا تو مشرک۔
- ۷۔ کسی بزرگ کے نام کا جانور ذبح کیا تو مشرک۔
- ۸۔ کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی تو مشرک۔
- ۹۔ کسی کو سجدہ تعظیمی کیا تو مشرک۔
- ۱۰۔ کسی کو اللہ کا بندہ سمجھ کر جھٹلاتے الہی حاضر و ناظر سمجھا تو مشرک۔

۱۰۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۸۱

- ۱۱ — کسی بزرگ کو خدا کی عطا سے تصرف کی قدرت مانی تب بھی مشرک۔
- ۱۲ — اٹھتے بیٹھتے وقت کسی بزرگ کا نام لیا جیسے کلمہ یا ورد کا ورد کرتا رہے تو مشرک۔
- ۱۳ — دُود سے کسی بزرگ کو پکارا تو مشرک۔
- ۱۴ — نزدیک سے کسی بزرگ کو پکارا تب بھی مشرک۔
- ۱۵ — مصیبت کے وقت کسی بزرگ کی دہائی دی تو مشرک۔
- ۱۶ — کسی بزرگ کا نام لے کر دشمن پر ہلایا جیسے عموماً مجاہدین یا علی کہہ کر حملہ کرتے ہیں تو مشرک۔
- ۱۷ — کسی بزرگ کے نام کا ختم پڑھا، جیسا کہ تمام سلاسل میں صد ہا سال سے مروج ہے تو مشرک۔
- ۱۸ — اپنے پیر یا کسی بزرگ کا شغل کیا، جیسا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرسبز قدس سرہ نے خاص طور پر تعلیم دی ہے، تو مشرک۔
- ۱۹ — کسی بزرگ کی صورت کا خیال کیا تو مشرک۔
- ۲۰ — کسی بزرگ کو اپنے حالات سے خبردار مانا، جیسے کہ مولوی رشید احمد گننگوی ذالمتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۰۵ء نے پیروں کی شان بتائی ہے، تو مشرک۔
- ۲۱ — جو کسی بزرگ کے سامنے ہاتھ بڑھا کر کھڑا ہوا، وہ مشرک۔
- ۲۲ — جس نے کسی بزرگ کے نام پر مال خرچ کیا، وہ مشرک۔
- ۲۳ — جو کسی بزرگ کے گھر کی طرف سفر کر کے گیا، تو مشرک۔
- ۲۴ — جو کسی بزرگ کی طرف جانتے ہوئے نہ پہنچے کہتا ہوں یا نہیں کہتے ہوتے نہ گیا، وہ مشرک۔
- ۲۵ — جو بزرگ کی طرف جانتے وقت شکار کرتا ہوا نہ گیا، وہ مشرک۔
- ۲۶ — کسی بزرگ کے لیے جانور لے گیا، تو مشرک۔
- ۲۷ — کسی بزرگ کے مزار پر چادر ڈالی، تو مشرک ہو گیا کیونکہ چادر تو دہلوی صاحب کے خدا کے مزار پر ڈالنی چاہیے تھی۔
- ۲۸ — کسی بزرگ کے آستانے پر جا کر خدا سے دعا مانگی تو مشرک۔

- ۲۹ — کسی کے مزار پر جا کر اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا کی مرادیں مانگیں تو مشرک۔
- ۳۰ — کسی بزرگ کے آستانے کی کسی دیوار سے اپنا منہ لگا یا یا چھاتی ملی تو مشرک۔
- ۳۱ — کسی بزرگ کے مزار کا غلاف پکڑ کر خدا سے دُعا مانگی تو مشرک۔
- ۳۲ — کسی مزار پر روشنی کی، تو مشرک۔
- ۳۳ — جس نے کسی مزار کے پاس فرسش بچھایا تو مشرک۔
- ۳۴ — جس نے مزار کا مجاور بن کر کسی کو پانی پلایا تو مشرک۔
- ۳۵ — جس نے مزار پر آنے جانے والوں کی خاطر وضو و غسل کے پانی کا خیال رکھا، تو مشرک۔
- ۳۶ — جس نے مزار کا خدمت گزار بن کر وہاں جھاڑو دی، وہ مشرک۔
- ۳۷ — جس نے کسی بزرگ کے کنوئیں کے پانی کو برکت والا سمجھا تو مشرک۔
- ۳۸ — وہ پانی بدن پر ڈالا تو مشرک۔
- ۳۹ — اُسے آپس میں بانٹا تو مشرک۔
- ۴۰ — اُسے غائبوں کے واسطے لے گیا تو مشرک۔
- ۴۱ — کسی بزرگ یا حزارے سے نوٹے وقت اگر اُس کی طرف پیچنے کی تو مشرک۔
- ۴۲ — کسی بزرگ کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کیا تو مشرک۔ جیسا کہ ازروئے احادیث مسلمان بدینہ لمبیہ اور ماں کے گرد و پیش کو حرم ہانتے اور ان مقامات کا ادب کرتے ہیں، ایسا ادب کرنے والے موصوف کے نزدیک سب مشرک۔
- ۴۳ — وہاں شکار نہ کیا تو مشرک۔
- ۴۴ — وہاں کے درخت نہ کاٹے تو مشرک۔
- ۴۵ — وہاں کی گھاس نہ اکھاڑی تو مشرک۔
- ۴۶ — وہاں مویشی نہ چگاتے تو مشرک۔
- ۴۷ — کسی بزرگ کی قبر کو بوسہ دیا تو مشرک۔
- ۴۸ — مورچھل جھلا تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدا نے اپنے لیے خاص کیا ہوا ہے کہ اُسی پر مورچھل جھلا جاتے۔
- ۴۹ — کسی بزرگ کے مزار پر شامیانہ کھڑا کر دیا کہ آنے والوں کو دھوپ کی تکلیف نہ ہو

تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدانے اپنے ساتھ خاص کیا ہوا ہے۔

۵۰۔ جس نے اپنے کھیت یا باغ میں کسی بزرگ کا ازراہ عقیدت و خدمت حقہ رکھ لیا تو مشرک۔

۵۱۔ کھیتی باڑی میں سے جو حصہ آتے اُس میں سے پہلے کچھ کسی بزرگ کی نذر کر دیا، تو مشرک۔

۵۲۔ دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کا جانور بٹھا دیا، تو مشرک۔

۵۳۔ ایسے جانور کا کوئی ادب بجاظ کیا، تو مشرک۔

۵۴۔ اُس جانور کو پانی پینے سے نہ روکا، تو مشرک۔

۵۵۔ اگر اُس جانور کو ٹکڑی یا پتھر سے نہ مارا تو مشرک۔

۵۶۔ کھانے پینے میں رسم و رواج کی سہ پکڑی، تو مشرک۔

۵۷۔ اگر کھانے یا پینے پر کسی قسم کی مصلحتاً بھروسہ یا بندی عائد کی، تو مشرک۔

۵۸۔ اگر پی پی کی صحنک کا کھانا، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز اور اُن کے سارے

خانوادہ کی طرح مردوں کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۵۹۔ یہی کھانا اگر وہ سارا خانہ نمک نہ والی عورت کو نہ کھلایا تو مشرک۔

۶۰۔ شاہ عبدالحق کا تو مشرک اگر حقہ پینے والے کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۶۱۔ اگر کسی نے یہ کہا کہ یہ آدمی فلاں بزرگ کی گستاخی کرنے کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے،

تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۲۔ اگر کسی کی محتاجی کا سبب اُس کا بزرگوں کی بارگاہ میں گستاخ ہونا بتایا، تو مشرک۔

۶۳۔ اگر کہے کہ فلاں شخص کو کسی ولی یا نبی نے نوازا تھا، تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۴۔ کہ سماعت کو نجس مانا، تو مشرک۔

۶۵۔ اگر کہا کہ اللہ و رسول چاہئے گا تو میں آؤں گا، یا فلاں کام کر سکوں گا، تو ایسا

کہنے والا بھی مشرک۔

۶۶۔ اگر خدا کے سوا کسی کو داتا کہا، تو مشرک۔

- ۶۷ — اگر خدا کے سوا کسی کو بے پروا کہہ دیا، تب بھی مشرک۔  
 ۶۸ — اگر کسی انسان کو شہنشاہ کہہ دیا، تو مشرک۔  
 ۶۹ — کسی بزرگ کے نام کی قسم کھانی، تو مشرک۔  
 ۷۰ — اگر سجدہ تعظیمی کو شرک نہ سمجھا تو اس کے خلاف قرآن و حدیث سے دلائل پیش کرنے لگا، تو کافر۔

- ۷۱ — اگر کسی بزرگ کے سامنے بے ادبی کے انداز میں کھڑا نہ ہوا، تو مشرک۔  
 ۷۲ — اگر کسی بزرگ کے پاس میلے کچیلے کپڑوں سے پہنچا، تو مشرک۔  
 ۷۳ — اگر کوئی کہے کہ یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے، وہ مشرک۔  
 ۷۴ — کہے کہ یہ بکرا شیخ سدا کا ہے، تو مشرک۔  
 ۷۵ — اگر کہہ دیا کہ یہ مرغی میری بیوی کی ہے، تو مشرک۔  
 ۷۶ — کہہ بیٹھا کہ یہ لونٹ میرے لڑکے کا ہے، تو مشرک۔  
 ۷۷ — کہہ دیا کہ یہ بھیڑ میرے والد محترم کی ہے، تو مشرک۔  
 ۷۸ — اگر کہا کہ یہ بھینس میرے دلہا جان کی ہے، تو مشرک۔  
 ۷۹ — جو حرمت سکے لیے بوقت ذبح غیر خدا کا نام لینا مراد لے، وہ مشرک۔  
 ۸۰ — جو ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام اور ناپاک تسلیم نہ کرے، وہ مشرک۔ لاجول  
 ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

۷ آہ یہ ظالم تلخ حقیقت جتنے سینے غرق ہوئے

اکثر اپنی موج میں ڈوبے، طوفان سے ٹکرائے کم

قارئین کرام! یہ تھا مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۱ء) کا ایک سوچے سمجھے اور سیکھے سکھائے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کا زبانی جمع خرچ۔ اس فہرست کو سامنے رکھیے، تقویۃ الایمان سے مطابقت کر کے سوچیے! اگر تعلیمات قرآن و حدیث اور تصانیف علمائے دین پر نظر ہے تو بتائیے کیا موصوف کے اس خانہ ساز شرک سے مت محمدیہ کا کوئی ایک فرد بھی بچ سکا ہے، بات دراصل یہ تھی کہ موصوف نے محمد بن عبدالوہاب



(المتوفی ۱۲۰۶ھ) کی طرح مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرا کر اپنے خارجی ہونے کا علی ثبوت بھی پیش کرنا تھا۔ مسلمانوں سے قتل و قتال کر کے اپنی ہوس خاک گیری کو تسکین دینی تھی۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے حصول سلطنت

**قتل و قتالِ مسلمین** کی خاطر مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کے لیے تقویۃ الایمان کتاب

لکھی، تاکہ برٹش گورنمنٹ کے حکم کے مطابق پنجاب کے سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کیا جائے اور جس طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر آل سعود کے سہارے خارجی حکومت قائم کی تھی، ہندوستان میں بھی اسی طرح انگریزوں کے سہارے اپنی سلطنت قائم کرنے کا شوق و انگیزہ ہوا۔ سکھوں سے لڑنے کی خاطر پنجاب و سرحد کے خوانین و رؤسا کا تعاون ضروری تھا۔ جب یہ حضرات اپنی جمعیت سمیت فوج پشاور میں پہنچے تو جن خوانین کو آپ کی اطلاع ہوتی تھی وہ بڑی خوشی سے دست تعاون بڑھاتے چلے گئے کیونکہ ابتدائاً وہ انھیں رحمت خداوندی شمار کرتے تھے۔

۱۲ ربیع الثانی ۱۲۲۲ھ کو جٹ کے مقام پر مجمع عوام و خواص یعنی خوانین و رعایا نے

سید احمد صاحب کے ہاتھ پر امانت کی بیعت کی۔ آپ کو امیر المؤمنین بنا لیا، جمعہ میں آپ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سید صاحب کی مہر **امین احمد** اور آپ کے مشیر خاص و سپہ سالار افواج یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی مہر **داؤد کزنی** **الکتاب اسماعیل** مقرر ہوئی۔ عمال اور قاضی مقرر کیے گئے، علاقے کا انتظام سنبھالی لیا، زکوٰۃ و عسکر کا وصول کرنا شروع کیا۔

مقامات کی سماعت کرنے لگے تو جن مسلمانوں نے انھیں تالیفِ قلوب کے سارے اسباب سے لیس دیکھ کر رحمت خداوندی سمجھا تھا، انھیں چند روز میں ہی معلوم ہونے لگا کہ ظلم و ستم کے اصل بانی نیز ہلاک و اور چنگیز خاں کے اصلی نشین یہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور ان کی آبروریزی کا سلسلہ اس لیے جاری ہے کہ یہ ایسے مجاہد خارجیت کے مرض میں گرفتار اور مسلمانوں کو مشرکین و کفار سمجھتے ہیں۔ برطانوی ڈپلومیسی ہیں پورے ماہر ہیں کہ جو امیران سے تعاون کا اعلان کرتا ہے اس کا علاقہ زیر نگیں و خزانہ زیر تصرف۔ یہ صورت حال دیکھ کر جو رئیس ذرا پیچھے ہٹا، اُسے

باغی اور منافق قرار دے کر واجب القتل ٹھہرا دیا۔ موقع ملنے پر چھل کر دیا، مسلمانوں کے خون سے خوب ہولی کھیلی، قیدیوں کو ٹونڈی غلام بنایا اور جو مال ہاتھ لگاؤ کافروں کا مال ٹھہرا کر، مالِ غنیمت شمار کیا اور خمس نکال کر باقی فوج میں تقسیم کر دیا جاتا۔

یار محمد خاں حاکم یاغستان نے اس بھیڑ چال کو دیکھا تو آثار اچھے نظر نہ آتے کہ ان سواٹیوں کے ساتھ لگ کر سکھوں کی منظم قوم کی دشمنی مول لی جاتے اور مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالا جاتے۔ لہذا وہ پیچھے ہٹنے لگا تو غلامیت کی پیشانی پر بل آگئے، وہاں بیت کے تیور بدل گئے اور مسلم کشی کا دریا جوش میں آ گیا۔ یار محمد خاں کے بارے میں مختلف خطوط میں وضاحت کی گئی، سید احمد صاحب نے مختلف لوگوں کو ان کا کافر، منافق، دشمن اسلام، کافروں کا کار و رازدار، فریبی، مکار وغیرہ ہونا بتایا اور اپنے ارادہ مسلم کشی کے لیے راہ ہموار کرتے رہے۔ سوانح احمدی کا تیسرا مکتوب جو اعلام ہے، اس میں سید احمد صاحب نے یہی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

”سروار مذکور نے اگرچہ اس فوج کے ظہور کے آغاز کے وقت ہی اپنے حد بھرے دلی میں مخالفت کا ارادہ رکھا تھا اور اپنے سینے پر کینہ میں لڑائی جھگڑے کا تخم بویا تھا۔ آخر کار ایسے وقت میں جبکہ دشمن کے مقابلہ میں لڑائی کا سندر موجیں مار رہا تھا اور توپ و بندوق کی گرجا آواز میں معرکہ کو جلال لگا لگا دے رہی تھیں، بدبختی اور جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی اور اس نے مسلمانوں کی فوج کو تڑپتار کر دیا اور جہاد کے معاملہ کو لیت و لعل میں ڈال دیا اور دغا و مکر کی چالیں ادا کر دیا اور اپنے نذم میں کفر و فساد کی بڑیاں مضبوط کر دیں اور اسلام و جہاد کی بنیاد متزلزل کر دی۔ اس طرح ایک جھوٹی باطل حکومت کی تنظیم کی اور سچی امامت میں خلل ڈال دیا۔ اس کے علاوہ اس خاکسار کی ہلاکت اور اس ناچیز کو برباد کرنے میں سخت جدوجہد کرتا رہا اور سچی ناکام میں مصروف رہا۔“

لے سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۳

یار محمد خاں حاکم یاغستان ذمی شعور آدمی تھا، حکمتِ عمل کے ساتھ سکھوں سے نباہ کر کے اسلامی علاقوں کو ان کی دست برد سے بچاتے ہوئے تھا کیونکہ خوامین بھی آپس میں متفق و متحد نہیں تھے۔ شروع میں تو دیگر بعض خوامین کی طرح موصوف نے بھی بیعت کر لی لیکن صورتِ حال سے آگاہ ہونے پر وہ شرعی اور سیاسی لحاظ سے تعاون نہ کرنے پر مجبور تھا۔ جس کے وجہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اس بیعت کی شرعی حیثیت وہی تھی جیسے کوئی بے خبر مسلمان اپنے وقت کے کسی ابنِ تیمیہ حرائی یا محمد بن عبدالوہاب نجدی یا مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کر بیٹھا۔

۲۔ موصوف کو جب آگاہ ہی ہوئی کہ وہ لشکرِ علی المرتضیٰ کے قلب میں خوارج کو جگہ دے بیٹھے، مدِ عربی علی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھٹیروں کے ریوڑ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو بھٹیروں کو داخل کر چکے، مسلمانوں کو کافر و مشرک جاننے والوں کو اُنہوں نے اپنی گردنوں پر مسلط کر لیا۔ تو حکمتِ عمل سے چھٹکارے کی صورت نکالنی اور اس بلائے ناگہانی سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا شرعی اعتبار سے ضروری ہو گیا تھا۔

۳۔ یہ معلوم ہونے پر کہ سید احمد صاحب ایڈکھنی تو انگریزوں کی فوج کا ہراول دستہ ہے، اُنہوں نے محسوس کیا کہ اس جنگی کی جتنی بھی مدد کی جاسکے گی اُس کا فائدہ براہِ راست انگریزوں ہی کو پہنچے گا، کیونکہ سید احمد صاحب کی کامیابی انگریزوں کو ایک ہی جہت میں سستی سے کابل و قندھار تک پہنچا دے گی۔

۴۔ پانچ سو علماء و مشائخ نے پنجاب کے مقام پر جمع ہو کر ان حضرات کو فمائش کی کہ وہ اپنے غیر اسلامی عقائد و نظریات ترک کر دیں، تاکہ مسلمانوں کو کھول کر ان کی مدد کریں، سکھوں سے بڑی آسانی کے ساتھ ٹیٹ سکیں، نیز انگریزوں کے آگے کاربٹنے سے باز آجائیں لیکن یہ دونوں باتیں نامنتظر ہوئیں۔

یار محمد خاں نے پیچھے ہٹنے کی وجہ بتائی اُسے اسی اعلام کے اندریوں بیان کیا گیا ہے:

”اُس کافر و سیاہ (یار محمد خاں) کا عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کہتا یہ ہے کہ کافر ملعون سے دوستی محض شعارِ دین کی حفاظت کے واسطے ہے، مسلمانوں کے مقاصد اور جان و مال بچانے کے لیے ہے، یہ بھی مذہبِ اسلام کی

خدمت گزاری کا ایک طریقہ اور سنت سید الانام کے پاس و لحاظ کا ایک ذریعہ ہے۔ غرض یہ صریح مکر و فریب اور گمراہی اور اپنے عیب کو چھپانے کا جلد ہے۔ دین کے احکام کی پاسداری کا دعویٰ بھی خوب ہے یہ تو اللہ کا نہیں اُس کا اپنا دین ہے۔

وقت سے بڑا منصف کون ہے؟ ایک صدی بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ سید احمد صاحب کے قبعین کے فتوے، ایک ٹھینٹ مشرک، پکے بُت پرست، یعنی گاندھی جی کی جنبش لب کے ساتھ گردش کرنے لگ گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو ہنود کی دست برد سے بچانے اور اسلامی اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی خاطر "پاکستان" کا نعرہ بلند ہوا، قرآن حضرات نے سورا ج (اکھنڈ بھارت) کی تائید اور مشرکین ہند کو اپنا ان وانا بنائے رکھنے کی حمایت میں قیام پاکستان کی اتنی سر توڑ مخالفت کی جتنی ہنود کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ یار محمد خاں حاکم یاغستان کے بارے میں سید احمد صاحب کے اس زیہارک کو سامنے رکھتے ہوئے کیا فیصلہ ہے موصوف کے معتقدین کا کیا فیصلہ ہے کانگریسی اور رزٹا ر دوست، گاندھی عمامہ کے بارے میں؟ ان کے متعلق دیوبندی مولوی ظفر علی خاں تو یوں مرثیہ خواں تھے:

رسول اللہ کے گھر میں یہ کیسا انقلاب آیا

کہ گاندھی جی کی کٹیا عالمانِ دین کا ڈیرا ہے

بہر حال، یار محمد خاں کے بارے میں سید احمد صاحب نے جو فیصلہ کر لیا تھا، اُنہیں کی زبانی ملاحظہ ہو:

"سردار مذکور کی منافقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہر عقلمند، ہوشیار، تجربہ کار کی راستے میں جہاد قائم رکھنا بغیر ایسے فتنہ برپا کرنے والوں کے استیصال کے ممکن نہیں۔ ان حالات کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اُس کے ساتھ قتل و جدال اور اُس کی بیخ کنی بھی ایک صورت ہے ازالہ فساد کی۔ اُن لوگوں کی

توہین اور بیخ کنی اقامت جہاد میں شامل ہے۔ جہاد کے نفاذ اور ان کے مقابلہ کے لیے ہم مامور ہیں اور ان سے ہاتھ پائی کرنا ہمارے لیے باعثِ ثواب ہے۔ ہماری فوج کا ہر مبارز تعازی ہے اور اللہ تعالیٰ کی فوج کا سپاہی ہے اور ان کے لشکر کا مقتول گنہگار ہے اور ہمارا شہید اللہ کے پاس قبول اور نوسن ہے اور ان کا مقتول مردود و ملعون۔ اور یہ حکم اسلام کے چاروں مقررہ اصولوں یعنی کتاب و سنت، اجماع اور قیاس سے ثابت ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے پھر یہ کہتا ہوں کہ سردار مذکور منافقین کی ایک قسم میں شامل ہے اور ان کے قتال پر خلاق جہاں جلّ شانہ کی آیات بلحاظ استحقاق ناطق ہیں۔ بلاشبہ وہ منافقین میں سے ہے۔ کفار بد انجام کے ساتھ موالات اور بد بخت ناجرول سے بھائی چارہ وہ اس حد تک رکھتا ہے کہ اس کے آثار روز روشن کی طرح ظاہر ہیں اور ان سے باہم وسیعی ہی لغافی کی علامت ہے۔

کیا سید احمد صاحب کے اسی فیصلے کی رو سے ہندوؤں سے نہ صرف موالات کرنے والے بلکہ ان کے بندہ بے دام بننے والے حضرات بھی منافق قرار پائیں گے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اس کی وجہ؟ کیا سید احمد صاحب کے قبضین پر قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس کا کوئی حکم اثر انداز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا؟ تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے غور تو فرماتے کہ منکھوں سے دوستی رکھنے کا یا محمد خاں پر الوام لگا کر اسے منافق بنا لیا گیا اور اس پر فوج کشی کی گئی۔ اسے شکست ہوئی تو اس کی ساری فوج کو لشکر کفار سمجھ کر ان کے جنگی قیدیوں کو غلام بنایا گیا، ان کا مال، غنیمت کا مال شمار ہوا۔ لیکن جب یہی خارجی ٹولہ گاندھی صاحب کا علی الاعلان نعلین بردار، ہنود کا یار و غمخوار اور مسلمانوں سے بیزار و برسرِ پیکار تھا کیا ان دنوں مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل تھا یا نہیں کہ وہ سید احمد صاحب کے ان فتووں پر عمل کرتے ہوئے ہندو نواز حضرات کو منافق اور واجب القتل قرار دے کر اقرآن و حدیث

اور اجماع و قیاس کے بتاتے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا شروع کر دیتے، جس طرح کہ سید احمد صاحب  
ایندھ پنی نے یار محمد خاں حاکم یاغستان کے خلاف عمل کر کے دکھایا تھا؛ وارویچے مسلمانوں کے  
حوصلے کی اور فیصلہ کیجیے کہ کون مفسد ہے اور مصلح کون ہے؟

سید احمد صاحب نے اپنے فتوے پر عمل کیا۔ یار محمد خاں پر لشکر کشی کی اور اُسے شکست  
ہوتی۔ اس سلسلے میں مولوی عاشق الہی میرٹھی کی مندرجہ ذیل وضاحت بھی نظر انداز کرنے کے  
قابل نہیں۔ موصوف کہتے ہیں:

”مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی، مولوی محمد اسمعیل صاحب دہلوی اور مولوی  
محمد حسن صاحب رامپوری بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب حضرات سید صاحب کے ہمراہ  
جہاد میں شریک تھے۔ سید صاحب نے پہلا جہاد مستی یار محمد خاں حاکم یاغستان  
سے کیا۔“

یہ تو میرٹھی صاحب کی تاریخ دانی اور صحت بیانی کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کہاں مولوی  
عبدالحی صاحب لکھنوی اور کہاں سید احمد صاحب کی یہ رزم آرائیاں؛ لیکن یہ بات قابل غور ہے  
کہ موصوف کے نزدیک سید صاحب کا پہلا جہاد یہی تھا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے خون  
سے ہاتھ دینگے گئے تھے، اس سے پہلے چوڑائیاں ہوتیں، شاید وہ موصوف کے نزدیک  
جہاد نہ تھیں۔

خادینخان حاکم ہنڈ اور یار محمد خاں حاکم یاغستان اور دیگر خوانین و رؤسا کو کافر و مشرک  
اور مرتد واجب القتل ٹھہرانے کے سلسلے میں مولوی محمد اسمعیل دہلوی کا عجیب و غریب اور  
سنسنی خیز بیان ملاحظہ ہو:

”اس موقع پر ذرا تامل سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہاں دو معاملے درپیش ہیں  
ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل و خون کے  
جواز کی صورت نکالنا اور ان کے اموال کو جائز قرار دینا، اس بات سے

قطع نظر کہ وہ اُن کے ارتداد پر یا اُن کی بغاوت پر مبنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا  
 آیا کوئی سبب ہے یا کچھ اور ہے، جبکہ بعض اشخاص کے مقابلہ میں اُن کا مرتد ہونا  
 ثابت ہو چکا ہے اور بعض کے متعلق بغاوت یا اس کا کوئی اور سبب۔ اگرچہ کہ  
 پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی یعنی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے کیونکہ ہم ان فقہ پرانوں  
 کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کو اہل کتاب  
 کے مثل جانتے ہیں۔ لہ

مسلمانوں کے قتل و خون اور اُن کے اموال کا جواز نکال کر دہلوی صاحب موصوف نے میر شاہ علی  
 کو یوں مطلع کیا تھا:

”جناب والا (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر لازم ہوتی۔ جو  
 شخص جناب والا کی امامت کو ابتداء میں قبول نہ کرے یا قبول کرنے کے بعد  
 اس سے انکار کر دے، تو یہ سمجھ لیجیے کہ وہ باغی، مکار اور فریبی ہے۔ اُس کا قتل  
 کرنا کافروں کے قتل کی طرح عین جہاد ہے اور اُس کی ہتک کرنا تمام فساد  
 کرنے والوں کی ہتک کرنے کے مماثل ہے اور پروردگار کی عین مرضی پر مبنی ہے۔  
 ان اشخاص کی مثال حدیث متواتر کی رو سے کتوں کی سی ہے اور یہ تمام ملعون  
 شریر النفس ہیں۔ اس عاجز کا مذہب اس معاملہ میں یہی ہے۔ پس معتزین  
 کے جوابات اس خصوص میں اس عاجز کے پاس تو اُن کو تلوار کے گھاٹے  
 اتارنا ہے، نہ کہ تخریر اور تقریر ہے۔ لہ

سید صاحب کے سوانح نگار مولوی ابوالحسن علی ندوی نے دہلوی صاحب کا یہ  
 فتویٰ یوں ادیبانہ رنگ میں نقل کیا ہے:

”پس آپ (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوتی۔ جو

آپ کی امامت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کر دے ،  
وہ باغی مستحل الدم ہے اور اُس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور  
اُس کی بے عزتی تمام اہل فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے۔ اس لیے کہ  
ایسے لوگ بحکم احادیث متواترہ ، کلاب النار اور طعونین اشرار ہیں۔ اس مسئلے  
میں اس ضعیف کا یہی مذہب ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار سے  
نہ کہ تحریر و تقریر ہے۔

مولوی محبوب علی صاحب بھی مسلمانوں کے کفر پر مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور دوسرے  
وہابی حضرات کی طرح متفق تھے۔ موصوف نے فتویٰ بھی جاری کیا تھا، جس کا خلاصہ مرزا حیرت  
دہلوی نے یوں نقل کیا ہے:

”سکھوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔“

وہابی حضرات کی طرف سے یار محمد خاں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی فوجوں کے  
ساتھ جنگِ شیدو میں شامل ہوا۔ اپنے بھائیوں اور دیگر خواہین کو بھی ساتھ لایا لیکن تماش  
دیکھتا رہا، لڑائی میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیا اور ایس فعل کو اُس کی غداری پر محمول کیا جاتا ہے،  
مثلاً غلام رسول تھر کہتے ہیں:

”اس مدت (دورانِ جنگ) میں یار محمد خاں اپنی سپاہ کے ساتھ بے حس و  
سکت کھڑا رہا۔ غداری میں شریک ہوا، نہ لڑائی میں حصہ لیا۔“

سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگار وضاحت کرتے ہیں کہ یار محمد خاں جنگِ شیدو  
کے دوران اُن کے مجاہدوں کا ساتھ چھوڑ کر جھاگ گیا تھا اور جملہ وہابی حضرات کا یہی فیصلہ ہے  
کہ یار محمد خاں کا یہ اقدام اُس کی منافقت، سکتہ دوستی، مسلمان دشمنی اور غداری ہے۔ لیکن  
ان حضرات کی خدمت میں ہماری ایک دردمندانہ التماس ہے کہ فیصلہ تو آپ صادر فرما چکے لیکن

۱۔ ابوالحسن علی ندوی، مولوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ۲۸۵

۲۔ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۸

۳۔ غلام رسول تھر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۳۷۰



اگر نظر ثانی کی گنجائش باقی ہو، تو اپنے ہی مرزا حیرت دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے،

”مولانا شہید اسماعیل دہلوی، نے پہلے سکھوں کے خونخوار حملہ کو روکا مگر جب دیکھا کہ سید صاحب تو بیوقوف پڑے ہوئے ہیں، ان کا ہاتھی جنبش نہیں کھاتا اور وہ عنقریب سکھوں کے قبضہ میں آنے کو ہیں۔ آپ نے میدان سکھوں کے ہاتھ سوپ کے سید صاحب کو سنبھالا اور بمشکل کئی آدمیوں کی مدد سے آپ گھوڑے پر بٹھا کے صاف میدان جنگ سے نکل آئے۔ جب مجاہدین نے سید صاحب اور مولانا شہید کو اپنے میں پھنسا لیا، ان کے پیر بھی اکھڑ گئے۔ نہ کوئی کانڈر تھا نہ انھیں کوئی خالد جیسا لڑا نے والا اور نہ کوئی قتی جیسا حملہ آوروں کے پنجہ سے نکالنے والا تھا۔ جدھر ان کا سینکڑوں سپاہیوں کا سیر ہو کے بھاگے۔ سکھوں نے تعاقب کیا اور مظلوم مسلمانوں کو نہایت بے بسی کی حالت میں قتل کیا۔ ان کا سلمان لٹ رہا تھا اور ان کی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ اور سید صاحب کے لینے کے دینے پڑ رہے تھے اور مجاہدین کی جانوں پر ہی رہی تھی۔ بہت سے مسلمان سکھوں نے قید کر کے لاہور روانہ کیے جہاں وہ نہایت بے رحمی سے قتل کیے گئے۔“

جناب غلام رسول مہرنے اس لڑائی کے بارے میں ابتدائی فتح کی و عنایت بھی یوں فرماتی ہے:

”جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگے تھے، پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ستم کے غارتگروں نے اس اوٹ پر بھی تہ بول دیا اور دشمن کو جادو کی طرح ہانڈا دینے پڑا۔ ستم گاہ کی سنگھڑ کے پاس پہنچ گئے۔ اس اثنا میں گوری شہزادہ اپنے مجاہدوں کو سنے کر گاؤں سے نکلا اور ہر گاؤں بند رہتا ہوا اسکو لشکر گاہ میں گھس گیا۔ غارتگران ستم

لے حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، ص ۲۱۲-۲۱۵

اور گودڑی شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہل چل مچادی اور ان کی توپیں بھی بند ہو گئیں۔ اب منظر بہ ظاہر اسلامیوں کی فتح میں شبہ باقی نہیں رہا تھا، بلکہ ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارک باد بھی دے دی۔ لے

لیکن یہاں یہ بات بھی تو جائزے غور ہے کہ جس لشکر کی حالت یہ دیکھی جا رہی ہے کہ اس کا سپہ سالار تیمارداری کرتا پھر رہا ہے۔ یہ نہیں کیا کہ سید صاحب کو بعض اشخاص کے ذریعے کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر ہزاروں مسلمانوں کی جانوں کا خیال کرتے اور لشکر کو جنگی تدابیر کے مطابق دشمن سے لڑاتے بلکہ پیرو مشد کو لے کر میدان جنگ سے فرار ہو گئے اور ہزاروں مسلمانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک گئے، موت کے منہ میں ڈال دیا۔ کیا اس مزے کی سپہ سالاری اور ایسی قیادت روئے زمین پر کہیں اور بھی نظر آئی ہے؟

اس کے باوجود یہ حضرات جھگوڑے اور مسلمانوں کے بدخواہ نہیں بلکہ اس ڈوبتی کشتی کے ناخدا ہی رہے لیکن جن حضرات نے ان کی ملائیت کا کرشمہ اور جنگی سوجھ بوجھ کا چشم خود معائنہ کر کے اپنے ساتھی مسلمانوں کو بچانے کی تدبیر کی وہ خدا باغی، منافق، مرتد اور اصل کانفر قرار پا گئے۔ کیا سپہ سالار کے بھاگ جانے کے بعد کسی فرجی یا اس جنگ میں حصہ لینے والوں میں سے کسی جان بچانے والے کو از روئے شرع سپہ سالار سے زیادہ لازم یا گناہگار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ غضب تو یہ ہے کہ بھاگتے وقت کسی کو اپنا قائم مقام بھی مقرر نہیں کیا۔ سرداروں کی کوئی مجلس مشورہ بھی چند منٹ کے لیے نہ بلانی گئی کہ صورت حال سے کس طرح بٹھا جائے گا۔ بس خرابی نظر آئی تو یار محمد خاں کی، کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو بچایا کیوں، گناہ مٹولی کی طرح سکھوں کے ہاتھوں کٹوا کر برطانوی امیر المومنین سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ کیوں حاصل نہ کیا؟ بہر حال اسی جرم کی سزا یار محمد خاں کو یہ ملی کہ جنگِ زیدہ میں شکست کھائی اور ستمبر ۱۸۲۹ء میں ان حضرات کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ ہند کے سردار خادی خاں کو یار محمد خاں سے بھی پہلے اگست ۱۸۲۹ء میں اس کے قلعے کے اندر شہید کر دیا تھا۔ حالانکہ خادی خاں تو حضرت آخون صاحب کا

لے غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۳۶۰، ۳۶۱

مرید اور سچا مسلمان تھا۔ لیکن پیر و مرشد نے ان حضرات کی خارجیت کو جانپ لیا تھا، پہلے فہمائش کی، باز نہ آئے تو تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا اور خادی خان کو بھی علیحدگی کا حکم دیا۔ بانکے مجاہدوں نے حقیقی اسلام قبول کرنے کے بجائے خادی خان کو بھی موت کے گھاٹ اتار کر جشن فتح منایا۔

خادی خان سردار ہند کو ان حضرات نے کس درجے کا کافر سمجھا، یہ واقعات کی روشنی میں

ملاحظہ ہو:

”میں (مولانا اسمعیل دہلوی) یہ کہتا ہوں کہ خادیخان نے امیر المؤمنین کے ہاتھ پر اعلان کے بعد بیعت کی تھی کیونکہ وہ صاحب مدوح کی امامت سے منحرف ہو گیا ہے اور اپنے محفوظ مکان پر، جس سے قراقرم ہند ہے بھروسہ کیا اور کافروں سے امداد طلب کر کے حضرت امام کی مخالفت پر کمر باندھ لی، اس لیے حضرت موصوف نے اُس کو کیفر کر دیا اور کوہ پینچایا اور اُس کا مال تقسیم کر دیا، بلکہ اُس کے ہتھیاروں اور گھوڑوں کو بھی ضرورت کے وقت استعمال فرمایا اور اُس کے دوسرے مال کو ضبط کر کے حفاظت کی خاطر مجاہدین پر تقسیم فرما دیا۔“

یہ محمد خاں حاکم پاکستان، اُس کے ساتھیوں اور اُن کے اہوالی کے بارے میں موصوف کا فتویٰ یہ تھا، جس پر ان حضرات نے عمل کرنے کے کڑا نینوں کے سینوں میں خنجر گھونپ دیے تھے:

”یہ محمد خاں بلاشبک و شبہ اس معاملہ میں قلم و تعدی کا رہبر تھا۔ ایسے رہبر کا قتل اور اُس کا مال ضبط کرنا بلکہ اُس کا نام رہبر کی فوج کا قتل عام اور اُس کی فوج کے تمام مال پر ہر قسم کا تصرف کرنا، یعنی اُس کی فروخت اور تقسیم حسبِ شیعہ جائز ہے۔“

لے سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۲۲

لے ایضاً: ص ۲۲۵

ہر سمجھدار آدمی کے ذہن میں یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب جب دور دراز کا سفر کر کے وہاں پہنچے تو آپس میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں انہیں دور کرنے کی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی گئی اور حالات پر قابو پا کر اتفاق و اتحاد کی فضا کیوں پیدا نہ کی گئی؟ یا خوانین و رؤسا ہی بد نیت تھے کہ وہ کسی طرح اتحاد پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، یا ان کی کوئی فاسد غرض تھی؟ اس سلسلے میں خود سید صاحب کا یہ ارشاد قابل غور ہے:

”میں نے ہرگز ہرگز منافقوں کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کی ہے اور نہ کبھی

ان سے موافقت کی کوئی راہ نکالی ہے۔“

خادمی خان اور یار محمد خان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، گوس نے نواح پشاور کے عام مسلمانوں کے کان بھی کھول دیے اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کون سی بڑی گمراہی میں اس بلا تے ناگہانی کو اپنے گھر میں بٹھایا۔ لیکن خانہ جنگی سے بچتے بڑے نباہ کرتے چلے گئے۔ صرف سلطان محمد خان نے ایک دفعہ ان سے ٹکر لی مگر شکست کھائی۔ علمائے سرحد کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے اپنی جماعت کے متعلق بعض شکایات یوں کی ہیں:

”ان بہتان لگانے والوں کے الزامات کے منجملہ ایک الزام یہ ہے کہ نہ صرف اس فقیر کو بلکہ مجاہدین کے گروہ کو وہ طحود و زندقہ کہتے ہیں۔ یعنی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان مسافروں کی جماعت کا کوئی مذہب ہی نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی مسلک ہے بلکہ یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہیں اور کسی نہ کسی طرح لذت جسمانی کے حیراں رہتے ہیں، خواہ وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔“

”ان افتراء و ظلموں کا یہ اتمام بھی ہے کہ میں ظلم و ستم ڈھاتا ہوں کہ یہ فقیر پلاؤ جو مسلمان کی جان و مال پر دست درازی کرتا ہے اور اس خصوص

لے سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۰۱۔۔

لے ایضاً: ص ۲۲۶

میں چرب زبانی اور جیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ سبحانک هذا بہتان  
عظیمہ..... جو کچھ تنبیہ اور سزا اُس بادشاہ جبار کی طرف سے اس  
ڈرہ ناچیز کے ہاتھ سے بعض مرتدوں، اشرار اور بدخصلت منافقوں کو پہنچی ہے  
اُن کو میں اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں اور اپنی مقبولیت کے آثار  
اپنے میں پاتا ہوں بلکہ دین کی اعانت کی نیرت اور دشمنوں کی اہانت کی طرف  
رغبت تو ایمان کا لوازم ہے ۱

”جو کچھ خدا سے قادر مطلق کی جانب سے اس فقیر کے مدیونہ خادمی خان اور  
یار محمد خان کی دار و گیر ہوتی ہے، اُس کی وجہ سے ان مجاہدین اور مہاجرین کو  
ظلم و ستم کرنے کا ملزم سمجھتے ہیں اور اُن باغیوں اور فتنہ پردازوں کو حق بجانب  
سمجھتے ہیں ۲

مذکورہ اعلانات کے تحت علمائے اہلسنت اکٹھے ہو کر آتے۔ ان حضرات سے  
بالمشاوہ گفتگو کی، مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے عقائد کو غیر اسلامی ثابت کر کے انھیں توبہ  
پر مجبور کیا۔ موصوف نے دفع الوقت کے لیے توبہ کر لی لیکن بعد میں پر تالہ اسی جگہ رکھا۔ اس  
مناظرے کا تذکرہ محمد جعفر تھانیسری نے یوں کیا ہے:

”صدی مولوی اور عالم، کابل، قندھار اور سمرقند اور ماوراء النہر وغیرہ کے  
جمع ہو کر مقام پختاورد مستطاب وجوب تقلید میں آپ سے بحث کر کے گواہی دے  
پختاورد ایک ہفتہ تک یہ بحث رہی۔ آخر کار وہ منب مولوی لاجواب ہو کر  
عدم وجوب تقلید شخصی کے قائل ہو گئے اور کئے گئے کسی شخص زور قرآن و حدیث  
کا حافظ اور محقق اور اس میں غلط لگاتے ہوئے ہے، اس سے کون  
جیت سکتا ہے۔ لیکن اس فتح یابی کے باوجود تیبہ صاحب نے مولوی محمد اسماعیل

۱ لے سعادت مرزا، ترجمہ کتبات سید احمد شہید، ص ۶۶

۲ لے ایضاً، ص ۶۸

صاحب سے فرمایا کہ یہ وقت ترکِ تقلید کا نہیں ہے۔ ہم کو اس وقت کفار سے جہاد کرنا ہے، تقلید کا جھگڑا اٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں ہے۔

سید احمد صاحب کی فہمائش بجا اور بر موقع لیکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس مناظرے کا جو فیصلہ سنایا ہے وہ سمجھ بوجھ سے بالاتر ہے۔ اگر وہ صد با علماء لاجواب ہو گئے ہوتے تو یقیناً ان میں سے کتنے ہی دہلوی صاحب کی طرح منکرِ تقلید ہو جاتے۔ ہزاروں ڈرائی اور پٹھان وہابیت قبول کر لیتے، اصلی اختلاف مٹ جاتا اور جنگ و جدل والا معاملہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ مولوی محمد اسمعیل دہلوی مغلوب اور تائب ہوئے۔ تو یہ کرنا دفعِ الوقتی تھی ورنہ مذہبِ اہلسنت قبول کرنا مرتے وقت تک بھی منظور نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیوں اور پٹھانوں نے ہرگز ہرگز ان کی خارجیت و وہابیت کو قبول نہ کیا بلکہ نفرت کی نگاہوں سے ہی دیکھتے رہے۔ اسی لیے جناب ابوالاعلیٰ مودودی کو یوں مرثیہ خوانی کرنا پڑی:

”یہی وجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد میں ان دونوں شہیدوں کا اور ان کے کام کا کوئی اثر و نفوذ نہیں ملتا، سچ کہ وہ ان کے لوگ ان کے ناموں سے اب کچھ اُردو نظریہ پر کی بدولت واقع ہونے لگے ہیں۔“

غیرتِ ایمانی کچھ عجیب ہی مدانی عطیہ ہے، حالانکہ سید احمد صاحب نے عادی خان کے وارثوں کو یوں تحریریں دلائی تھی:

”بیز اس (عادی خان) کے ورثا کو بھی اس کی طریقت دی، اگر وہ آئیں اور اطاعت قبول کر لیں، تاکہ تمہارے وارث کا مال تم کو دے دیا جائے لیکن ان اشقیاء نے نام کی اطاعت پر ہرگز تسلیم نہ کیا بلکہ انھوں نے بغاوت اور فساد کے معاملہ میں ان ہانیوں کی تقلید کی۔“

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۱۱

۲۔ سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۲۴۴

یاد محمد خاں کے ورثا، ساتھیوں اور فوجیوں کو تحریریں دلانے میں کوئی کمی نہ کی، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ان کے غیر اسلامی نظریات نہ صرف عوام بلکہ اجلہ علمائے کرام تک پر واضح ہو چکے ہیں اور وہ سب انھیں خارجی المذہب شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مذہب اہلسنت قبول کرنے یا مصلحت کی کوئی راہ تلاش کرنے کی بجائے سیاسی رشوت ہر کسی کے سامنے پیش کرنے لگے۔ پنانچہ سید صاحب نے دُزانیوں کو اپنے خط میں یوں لکھا:

”بعض کلمہ گو منافقین نے کفار کی محبت اور خیر خواہی کو اپنے منافقت بھرے دل میں جگہ دی ہے اور تمام مسلمانوں کی بدخواہی کو عام طور پر اور خاص کر بڑے بڑے علماء کے دل میں مہاجرین اور مجاہدین کے حق میں اس قدر عداوت پیدا کر دی ہے کہ ان کی نقصان رسانی کافروں کے نقصان پہنچانے کے مقابلہ میں بہت زائد اور بے انتہا ہے اور ان کی عداوت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ایمان والوں کو جہاد قائم رکھنے سے باز رکھا ہے۔ لہذا جس شخص کو اپنا ایمان عزیز ہے اور دین اسلام کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ کو اپنا پیشوا جانتا ہے اور قیامت میں آنحضرت کی شفاعت کا امیدوار ہے، اُس پر لازم ہے کہ وہ خود کو مجاہدین کی صف میں شریک کر دے اور غیرت ایمانی اور اسلامی حمایت کو کام میں لائے اور کافروں کی خیر خواہی اور منافقوں کا ساتھ دینا چھوڑ دے اور اپنے دل سے ان دونوں بد بخت جماعتوں کی محبت کو نکال دے اور مجاہدین کے لشکر میں منسلک ہو جائے اور جو کچھ کافروں اور منافقوں کی رفاقت میں اُس کو دنیوی فائدہ حاصل ہو اسے اُس سے کہیں زائد مراتب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اُس کو حاصل ہوں گے اور دنیا و آخرت میں اُس کو بزرگی اور سرخروئی حاصل ہوگی۔ غرض جو شخص ایمان والوں کی شرکت کا ارادہ رکھتا ہے اُس پر لازم ہے کہ وہ اس عاجز کو اِس سے اطلاع کر دے تاکہ صورت حال کا جائزہ لے کر اُس کی گزر بسر کا تعین کر دیا جائے۔“

لے سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۱۵

پشاور اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں نے ان حضرات کی موافقت سے منہ موڑ لیا، ان کے نزدیک یہ اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی مہربان سرکار کی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے آئے تھے، مجاہد نہیں بلکہ مفسد نظر آ رہے تھے، مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ مسلم کشی کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہذا سید صاحب بھی علی الاعلان اٹھیں منافق اور واجب القتل قرار دے کر ان کے استیصال کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر رئیس قلات خان خاناں خلیجائی کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے یوں تحریر کیا تھا

”بالخصوص جہاد کے نفاذ اور بغاوت و فساد کے فرو کرنے کے متعلق نیز اور بھی محبت و خلوص کی باتیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں ان کو پڑھ کر دل کو بید سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا..... اگر اس طرف جناب اپنا فاتحانہ قدم اٹھائیں گے تو منافقین اور مفسدین فتنہ و فساد برپا کر دیں گے۔ لہذا نہایت مناسب اور مصلحت یہ ہے کہ ایسا کیا جائے کہ سب سے پہلے تو منافقوں کے استیصال کے متعلق انتہائی کوشش کی جاتے اور جب جناب والا کے قرب جوار کے علاقہ میں ان بدکردار منافقین کا قلعہ پاک ہو جائے تو پھر اطمینان خاطر اور دل بھی کے ساتھ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مصلحت وقت یہی ہے کہ پہلے تو منافقین کے فتنہ و فساد کے دفعیہ کے لیے محنت کوشش فرمائی۔ ان منافقین کے ساتھ جنگ کرنے اور فساد کو دوز کرنے کی تدابیر کے متعلق خود جناب والا خوب جانتے ہیں اور لشکر کشی اور کشور کشائی کے فن میں بھی آپ کو کمال مہارت حاصل ہے، لیکن میری رائے میں مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ گو آپ کا دل ہیبت و جلال کا مرکز ہے۔ آپ اس بڑی مہم کے انجام دینے کے لیے بغیر کسی کئی اعانت کے قدم نہ اٹھائیں۔ اگر منافقین کے استیصال میں جناب کی پیش قدمی سے فتنہ و فساد اور شورش کے بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر کسی کی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی فوج اور قبیلہ کو جمع کر کے جناب والا خود غزنیوں کے نواح میں منافقین پر چھاپے مارنا شروع کر دیں اور اپنے ساتھیوں



میں سے بعض کو قبائل اور فوج کی کثیر تعداد کے ساتھ کابل کے اطراف مقرر فرمائیں تاکہ یہ بھی منافقین پر شب خون مار کر اُس مقام کو تاخت و تاراج کر دیں اور میں بھی ادھر سے پشاور کے منافقوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جب منافقین بدکار کی موجودگی سے وہ مقام پاک ہو جائے تو میں جلال آباد پہنچ جاؤں گا اور اسی طرح پھر دہاں سے کابل جاؤں گا۔ اس طرح مردود منافقین جو پشاور کے قندھار تک پھیلے ہوئے ہیں ان کے پاؤں ایسے اکھڑ جائیں گے اور ہر شخص جو اپنے خیال میں خود گرفتار ہے، بلے دست و پا ہو کر آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکے گا اور ان کا باہم اتحاد اور اجتماع دشوار ہو جائے گا۔ اگر جناب والا اس سلسلے میں اپنے استقلال کو شورش اور فساد کا باعث تصور فرمائیں اور یہ گمان ہو کہ ویرانی قوم اپنی قومیت و ریاست باہمی کے اتحاد کی وجہ سے اپنے قبائل کے ساتھ جمع اور جناب سے مقابلہ پر متحد ہو جائے گی، تو پھر اس بات کی ضرورت ہوگی کہ ان کے سرداروں کو اپنے ساتھ شریک کر لیا جائے اور ارباب سلطنت سے لہذا بھی طلب کر لینی چاہیے۔

ایک مسلمان حکمران کو دوسرے مسلمانوں کے خلاف کس جوش و جذبے سے ابھارا جا رہا ہے مسلم کشی کا بھوت کس بُری طرح سوار ہے کہ خان قلات جو ان حضرات کے ماؤرن اسلام سے بے خبر اور اراغیں اسلام و مسلمین کا خیر خواہ پھر بیٹھا تھا۔ موصوف نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں یوں جھونکے اہاموں اور تحریص کی دھول جھونکی ہے:

ہم پر لازم ہے کہ جان و مال، بھائی بندوں اور اہل خانہ کی محبت کو پس پشت ڈال کر حق تعالیٰ کی رضا مندی کو اپنی بہت کا قبلہ بنائیں اور دین متین کی فتح کی نیت سے پروردگار عالم کے کلمہ کی اشاعت کے لیے کربت باندھیں اور اُس کے لشکر میں شامل ہو کر معرکہ جنگ و قتال میں خود کو دھکیل دیں۔ انشاء اللہ

تعالیٰ اُس سلسلے میں بموجب کلامِ الہی جس کا وعدہ پتا ہے، فتوحات کے دروازے کھل جائیں گے اور ان اشرار و کفار منافقین کے بے شمار خزانوں، ملک و مال اور شہروں پر ضرور بالفور قبضہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن ان تمام دنیاوی چیزوں اور مادی منافع پر جہاد کا ہرگز وار و مدار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ جہاد کے لیے بلند ہمتی سے کام لینا چاہیے۔ پس جس وقت آپ اس نیت پاک سے خود کو مجاہدین کی جماعت میں منسلک کر لیں گے تو بلاشبہ اللہ کے لشکر میں آپ کا شمار ہوگا اور اللہ کے سچے وعدے کے مطابق فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اس فقیر کو بار بار پر وہ غیب سے وارد ہونے والی روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعہ جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے اور چونکہ الہامی وعدے اُس بادشاہِ حقیقی کے کلام کے مطابق ہوا کرتے ہیں اس لیے ان کو ضرور مان لینا چاہیے اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔

یہ اعلان سید صاحب اور ان کے متبعین نے الہام کے نام سے بار بار کیا۔ ان الہاموں اور فتح کی بشارتوں کا جو انجام ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے کہ فتح و نصرت کے بجائے آپ کو شکست اور عبرت ناک ہزیمت کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہو سکا۔ اول سے آخر تک سارے الہامات جھوٹے ثابت ہوتے گئے۔ موصوف کے سچے ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ جملہ دعویٰ و الہامات اور بزرگی و کرامات سے دست بردار ہو کر صاف طور پر اقرار کر لیا جائے کہ یہ الہامات خدا کی طرف سے نہیں بلکہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہو رہے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان حضرات کے لیے حقیقت کا تسلیم کر لینا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کتنے ہی دعویٰ و الہامات جھوٹے ثابت ہوتے لیکن بزرگی پر عرف نہ آیا، مسلمانوں ہی کو کچھ گئے تھے نیکی انھیں

لے سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۴۹، ۵۰

میں جاتے قوم بتانا اور منوانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت سید احمد صاحب نے  
فولاد جنگ بہادر کے نام اپنے خط میں لکھا تھا،

”آپ اپنے ایک فاتح لشکر کو اس طرف روانہ فرمائیں اور مجاہدین کی اعانت  
کے لیے کرمیت باندھ کر خزانہ کھول دیں تاکہ جناب والا کی شرکت پروردگارِ عالم  
کے دین کا پرچم بلند کرنے، کافروں اور اتہام لگانے والوں کا استیصال کرنے  
کے متعلق اچھی طرح منظر عام پر آجائے اور آیت کریمہ فضل اللہ المجاہدین  
باموالہم و انفسہم علی القاعدین کی بے حدت اور مرتبہ آپ کو حاصل  
ہو جاتے۔ جس طرح کہ اس دنیا کی ریاست اور امارت میں نبی نوع انسان  
منازیں ہیں، اسی طرح نبوت نعیم کے مدارج عالیہ اور مقام صدق پر اس  
صاحب بخشش و کرم کے سایہ میں آپ کو فخر و ناز ہو۔ اللہ نے چاہا تو کلام الہی  
کے سچے وعدوں کے مطابق کہ فرمایا ہے ”کان حقاً علینا نصر المؤمنین  
— وان تنصرا للہ یتنصرکم ویثبت اقدارکم نیز غیبی اشاروں اور  
بشارتوں کے بموجب، جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، جس کی بس فقیر کو  
بشارت دی گئی ہے۔ حشریہ نوح و حضرت ظہور پذیر ہوگی اور بے شمار خزانے  
ذلیل و خوار کافروں (مسلمانوں) کے شہروں سے لے کر ریاستے تلخ تک  
نیک لوگوں کے قبضہ میں آجائیں گے۔“

یا محمد خاں کے معتد و متوسل یعنی احمد خاں ابن لشکر خاں کے نام سید صاحب نے اپنے

مکتوب میں لکھا ہے :

”جب تک ان (مسلمانوں) کا لیا میٹ کرنا محقق نہ ہو اس وقت تک کافروں  
اور دشمنوں کے خلاف جہاد کی کوئی صورت نہیں اس بنا پر اس عاجز، خاکسار،  
وژہ بے مقدار نے چند نیک مہاجرین کے ساتھ بموجب حکم خداوندی یا ایہا

النسبى جاہد الكفار والمنافقين الخ جو قابلِ تعمیل ہے ہم نے کربانہ ولی ہے اور موضع پنجاب تک پہنچ گئے۔ اللہ نے چاہا تو اُس بادشاہ جبار اور مالک و قہار کے دبدبہ وقت سے ان تمام بدکردار منافقوں کی شان و شوکت آسانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں ناک میں مل جائے گی انشاء اللہ آپ اُس قادرِ مطلق کی قدرت کا تماشا ملاحظہ فرمائیں اور منافقوں کے ساتھ رواداری کو پروردگارِ عالم کی خاطر اور رضا جوئی پر قربان کر دیں۔ جو کچھ اِس زمانہ کے سردار و نیوی ٹائٹول کے حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں اُس سے دگنی توقع اُس شہنشاہِ حقیقی سے جو اِس جہان کا خالق ہے، توقع رکھنی چاہیے۔ بارگاہِ الہی سے قومی امید ہے کہ آپ دل جمعی کے ساتھ کیسے ہو کر دینِ متین کے معاونین میں منسلک ہو جائیں گے تو آپ کو دنیاوی فوائد بھی اِس قدر حاصل ہوں گے جو وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔

جہاں مقصود اعلیٰ کلمۃ الحق ہوتا ہے وہاں مادنی ترغیب و تمہیص کا ایسا سیاسی جال بچانے کی ہرگز کوشش نہیں کی جاتی۔ سید صاحب نے جس قسم کا جال مسلمانوں کے خلاف بچایا اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو قتل کروانے کی کوشش کرتے رہے اور اِس طرح ترغیب و تشویق دینا تے دنی سے اپنی حمایت کا دم بھرنے والوں کو مسلم کشی پر ابھارنے کی نظیر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ نجدی صاحب نے امیر عیینہ کو اپنی تحریک و ہابیت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا:

”اگر تم لا الہ الا اللہ کی امداد کے لیے آمادہ ہو جاؤ تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غالب کرے گا اور نجد اور اہل نجد کی باگ تھارے ہاتھ میں ہوگی۔“

اِسی طرح محمد بن سعود امیرِ درعیہ کو تحریک و ہابیت کا معاونِ کاربندے کی دعوت دی تو امیر

۱۔ سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۱۲۱

۲۔ مسعود عالم ندوی، محمد بن عبدالوہاب نجدی، ص ۲۲

مذکور نے دو شرطیں عائد کیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ فتح کے بعد آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑنا اور دوسری شرط یہ تھی کہ اہل درعیہ سے وہ فصل کے وقت کچھ محصول لیا کرتے تھے اُس سے نہ روکا جائے۔ ابن عبد الوہاب نے دونوں شرطیں منظور کیں۔ دوسری شرط کو اُس نے جن لفظوں میں منظور کیا اُن کا ترجمہ یوں منقول ہے:

”یہی دوسری شرط، سوانشا، اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائیگا کہ اُس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا“۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولیٰ محمد اسمعیل دہلوی کی یہ تحریک جہاد و اہ بیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسی کے زیر اثر شروع کی گئی تھی۔ ان حضرات نے بھی مسلمانوں کو مشرک اور منافق ٹھہرا کر اُنہیں مستحل الدم قرار دیا، اُن کے قتل و قتال سے لطف و لذت حاصل کرتے رہے۔ اُن کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر لوٹتے رہے، جس طرح ان سے پہلے محمد بن عبد الوہاب نجدی کرتا رہا تھا۔ اگر ان برطانوی مجاہدوں سے کوئی کہتا کہ آپ مسلمانوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں تو جواب یہی دیا جاتا کہ ہم تو مشرکوں اور منافقوں کو قتل کرتے ہیں، مسلمانوں کی جان و مال میں تو ہم ذرا بھی دست اندازی کرنا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے اُن کی مراد اُن کے ہم عقیدہ خارجی لوگ سمجھاؤ۔ حضرات جو اس جنگ جوفی میں اُن کے معاون و مددگار بن گئے تھے۔ ابن عبد الوہاب پر جب مسلم کشی کا الزام لگایا جاتا تھا، تو وہ بھی یہی جواب دیا کرتا تھا۔ نجدی پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ہندی و نجدی خوارج کے اس نسبتانہ طرزِ عمل کے بارے میں کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

”اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہیں؛ شاید لاکھوں میں صدودسے چند ہوں تو ہوں۔ صحیح ہے کہ تاریخ اسلام میں اس قسم کے بہت سے روت فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہلایا“۔

اے محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ منہری، مطبوعہ کراچی، ص ۱۱

مگر یہاں ذکر اُس شخص کا ہے جو پیغمبرؐ انہ آں بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرؐ صفات کو تلاش کیا جائے اور اُسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے خلاف آمادہٴ پیکار رہے مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے۔

ان برطانوی مجاہدوں کا منصوبہ یہی نہیں تھا کہ مسلمان خواتین و مردوں سے دوسرے مسلمانوں کی گردنیں کٹوائی جائیں اور اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے بلکہ یہ حضرات خود بھی پشاور اور اُس کے گرد و نواح کے اہل اسلام کو ختم کرنے کا عزم بالجرم کر چکے تھے، چنانچہ سید صاحب نے شہزادہ کامران کو خط لکھتے ہوئے وضاحت کر دی تھی کہ،

”چونکہ منافقوں اور فساد برپا کرنے والوں نے سرکش کفار کی حمایت پر مکر باندھ لی ہے اور مجاہدین سے دشمنی برت رہے ہیں، اس لیے اُن کی گوشمالی اور کفر و فساد کے خلاف جہاد کی مہم کا چلانا ضروری ہے، اسی بنا پر میں نے تمام مجاہدین کو منافقین کو کیفرِ کفار تک پہنچانے کی ترغیب دی ہے۔“

۱۲۲۲ھ کے مکتوب بنام ملک فیض اللہ خاں میں سید صاحب نے یوں وضاحت کی تھی:

”جناب والا جیسے روشن دعوت پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عزم نہانی کا اشارہ اس عاجز کی پشاور آمد کی طرف ہے تاکہ مجاہدین ہندوستان کو منافقین کے گرد و غبار سے اور دشمنوں اور شرعی صفت اشخاص کے روڑوں اور کانٹوں سے پاک صاف کر دیں اور یہ معاملہ تو ہرگز کوئی ایسا پوشیدہ راز نہیں ہے بلکہ میں نے تو اس کو طامیر عالم اخوندزادہ سردار سلطان محمد خاں کے وکیل کے دو بدو علی باعلیٰ

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواظظ منظرہ، مطبوعہ کراچی، ص ۳، ۴، ۵، ۶

۲۔ سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۵۶

کہا ہے اور اس معاملہ سے متعلق نہ تو کوئی بات پوشیدہ کہی اور نہ جناب کے مہربانی نادر کے جواب میں اشارتاً کچھ کہا۔ البتہ میں نے کوئی مدت مقرر نہیں کی ہے، یعنی یہ کہ کس وقت اس مہم کو سرانجام دیا جائے گا اور اس عبادت کی کس لمحہ اور گھڑی کوشش کی جائے گی، کیونکہ ہر کام کا تعلق اس قاعدہ مطلق کے ہاتھ ہے۔ بہر حال میں کچھ ایسا ہی ارادہ رکھتا ہوں، لے

سردار امیر عالم خاں باجوڑی کو مطلع کرتے ہوئے سید صاحب نے اپنے ایک مکتوب

میں یوں تحریر فرمایا تھا:

اب صورت یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ جہاد کرنا بحکم مقدمہ الواجب، ایک واجب معاملہ ہے۔ اس لیے خاکسار خٹے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قُرب و جوار سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاں گرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتارہک پہنچ گیا ہے اور اُس زبردست حاکم برحق کے فرمان عالی شان کے بموجب جس کا ذکر کلام حوثق یعنی کلام اللہ میں ہے کہ جاہد الکفار والمنافقین واعلظ علیہم۔ ہم نے کمر ہمت باندھ لی ہے..... شہر مذکور کی طرف چل پڑنے..... سرکش کفار، منافقین اور خسارہ اٹھانے والوں کے استیصال کی

حقی الوسع جد و جہد کریں گے! لے

اپنے ایک خط میں سید صاحب نے شاہ کاظم کو مسلم کشی کی اطلاع دیتے ہیں اور اُس صورت حال سے بے خبر حکمران کو اس عرصہ قبضہ میں طمولیت کی کیسے پُر اسرار انداز میں ترضیب و تشویق دیتے ہیں اور اُس کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی غرض سے یوں وضاحت کرتے ہیں،

”اس مختصر عرصہ میں ضلع سوات، نیر و مہمند، طلیل، علمجانی اور وڑائی کے تمام مسلمان اور پشاور کے رہنے والے اور اس شہر کے اُمراء کے تمام فوجی سپاہیوں

سے سخاوت مرزا: ترجمہ مذاہبات سید احمد شہید، ص ۱۰۳

۱۳۶، ۱۳۵ ص ایضاً

نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ پانڈہ قبیلے کی دولت اور ان کی شان و شوکت کو پامال کیے بغیر ہرگز ہرگز جہاد کا دروازہ کھلنے والا نہیں ہے۔ اُنھوں نے اس فقیر کو اسی بات کی ترغیب دی ہے کہ ماہِ رمضان المبارک گزر جانے کے بعد بدبخت منافقوں کے استیصال کی طرف توجہ کریں، یعنی شہرِ لٹاپور کو ان منافقوں کی گندگی سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ چنانچہ اس بات کو اس فقیر نے نیز تمام ایمان والوں نے بہت پسند کیا۔ لہذا رمضان شریف کے گزر جانے کے انتظار میں ہم سوات میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ جو نہی مبارک ماہ مذکور ختم ہو جائے گا تو غازیوں کی تیاری کا وقت پہنچ جائے گا۔ اس معاملہ میں بظاہر ملاقات جسمانی کے لیے فی الحال بعض اعتراضات مانع تھے لیکن ایک وجہ سے ملاقات کا سچا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اس فقیر کے پُر غلو ص دل کا منشاء تھا کہ آپ جیسے برادر عزیز کو بھی دونوں جہان کی دولت اور ہمیشہ کی سعادت میں اپنا شریکِ حال بناؤں اور آپ کو بھی طرح طرح کی ترغیب اور تحریص دلا کر اس عظیم الشان مہم کو انجام دینے کے لیے کشاں کشاں لے آؤں تاکہ اگر آپ اس عظیم مہم میں متغیر نہیں شریک ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر آپ کی کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ البتہ چار و ناچار آپ کو اس بات پر آمادہ کرنا ہوں گا اپنے لشکرِ ظفر پیکر سے تھوڑی فوج اور مجاہدین کے لیے اپنے حسب استطاعت کچھ مصارف اس عاجز کے پاس بجا دیں گے۔

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کیا کسی ہستی نے مصلح کا روپ دھا کر مسلمانوں کو ختم کرنے اور ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کی اتنی منظم کوشش کبھی کی تھی؟ یقیناً تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ مسلم کشی کی غرض سے اور مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے کی خاطر خود مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر کے، ایک کو غازی و مجاہد



اور دوسرے کو مشرک و منافق ٹھہرا کر، ان میں کشت و خون کرانے کا پارٹ اس انداز میں کسی اور نے بھی ادا کیا تھا؛ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اس میدان میں ان حضرات کا حریف کوئی نہیں لیکن جہاں مزارات کے منہدم کرنے اور قبہ شکنی میں ابن عبدالوہاب کا نظیر کوئی نہیں، اسی طرح مسلم کشی میں ان حضرات نے ایک نیا ہی عالمی ریکارڈ قائم کر دکھایا تھا۔ کاشش! مسلمانوں کو مشرک اور منافق قرار دے کر، اُنہیں یہ ستمل الدم ٹھہرانے والے، اُن کے جان و مال اور تنگ و ناموس سے کھیلنے والے کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے کہ:

بُت توڑنا تو فرض ہے، لیکن یہ شرط ہے

دل میں بھی جھانکنا، اس میں کوئی بُت چھپانا ہو

ان حضرات کے جہاد کی کہانی تو کچھ اسی قسم کی ہے لیکن گراہ سیاسی مصالح اور بعض ہستیوں کو اس باباً من دون اللہ بنا لینے کا، کہ بعض ایسے حضرات جو تحقیق کے علمبردار کہلاتے ہیں اور کسی بڑی سے بڑی ہستی کو تنقید سے بلا تر نہیں بگتے، جب وہ اپنے اکابر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو اُن کی ہر بوٹھی سے جو ٹڈی ادا، ہر گندہ سے گندہ اخیل، ہر بڑے سے بڑا عقیدہ، ہر ہفتے سے ہر اقدام بھی دل موٹ لیتے اور اقرار پاتا ہے۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تحریک جہاد کے بارے میں جناب ابوالاعلیٰ مودودی نے یوں لکھا ہے:

انہوں نے اپنے وسیع پیمانے پر جو ایسے ہی جہاد کی تیاری کی اور اسے جیسے برسرِ تیز لگانے میں جھنگل ہی نہیں جھکتا تھا، جہاد کی تیاری کی اور اسے تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبیر کے ساتھ آغاز کار کے لیے شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا، جو ظاہر ہے کہ جہاد کی سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے ہندوؤں میں خصلت ہو سکتا تھا۔ پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصول اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلے میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے اور اس طرح انہوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں دُورِ اسلامی کا مظاہرہ کر دیا۔ اُن کی جنگ، ملک و مال، یا قومی معصیت، یا کسی دنیوی غرض

کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ اُن کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا  
 نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو  
 خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ  
 رطے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیرہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت  
 کر کے تلوار اٹھائی، اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی  
 پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل اُن سے  
 سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوتے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوتے نہ کہ  
 مفسد کی حیثیت سے۔

موصوف کے یہ جملہ دعادی اُن کی اسمعیل پرستی کی بنا پر بغیر کسی تحقیق و ثبوت کے ہیں۔ سید صاحب  
 اور مولوی محمد اسمعیل دہلوی کا طرز عمل اور خود وہابی حضرات کی تاریخیں موصوف کے ان بیانات  
 کی تائید و تصدیق کرنے سے قاصر ہیں۔ ان حالات میں راقم الحروف انصاف کا اس طرح خون  
 کرنے والوں کے متعلق یہی کہہ سکتا ہے کہ:

بنے بچو نکر کہ ہے سب کار اُنٹا

ہم اُنٹے، بات اُلٹی، یار اُنٹا

یہاں تک بیان اس امر کا تھا کہ ان حضرات نے مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے اور انہیں  
 مستعمل الہم قرار دینے کی غرض سے کیسے کیسے غیر اسلامی اور چکیہ خانی بنانے تلاش کیے۔  
 اب ان لوگوں کی مسلم کشی کے چند واقعات پیش کرتا ہوں۔ قلعہ ہنڈ پر قبضہ کرنے اور خادی خاں کے  
 خون سے ہاتھ دھونے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی نے یوں تصریح کی ہے:

”اچھی صبح کی پوچھی تھی کہ آپ (مولانا محمد اسمعیل دہلوی) قلعہ ہنڈ کی دیواروں  
 کے نیچے جا پیچھے کیل ڈیڑھ سو آدمی ساتھ تھے اور باقی ماندہ (ساڑھے پانچسویں)  
 پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ نے خاموشی سے بارہ بندو قچیوں کو بھیج دیا کہ تم دروازہ

کے پاس اُس ٹیلہ کے پیچھے ٹھپ کے کھڑے ہو جاؤ۔ جونہی دروازہ کھول کر قلعہ میں سے لوگ نکلیں اور شہر کی طرف جانے لگیں، تم فوراً قلعہ میں گھس جانا اور اُنہیں گویاں مار دینا۔ بھاگتے ہوئے کو روکنا نہیں، مقابلہ کرنے والے کو تر تیخ کرنا۔ ابھی بہت روشنی نہ ہوئی تھی، نسیم سحری طفلانہ اٹکیلیاں کرتی ہوئی چل رہی تھی اور خادی خاں کو خبر دے رہی تھی کہ تیرا یہ خواب نوشیں زہرا لود ہے مگر وہ کچھ اپنے قلعہ کی مضبوطی میں ایسا منحور تھا کہ اُسے نسیم سحری کے جھوکوں کی اطلاع کی بھی ذرا خبر نہ تھی۔ جونہی مولانا شہید نے بندوقوں کی آواز سنی، آپ بھی فوراً بندوق چھتیاٹے ہوئے معہ ہراہیوں کے داخل قلعہ ہوئے، ہتھیار اٹھانے کی بھی فرصت نہ دی اور سب کو خوف دے کر باہر نکالی دیا۔ قلعہ کے دوسرے حصے میں خادی خاں سوتا تھا۔ ٹھائیں ٹھائیں بندوقوں کی آواز ہوئی اور لوگوں کا غل سٹانی دیا تو پہلے خبر ٹھیس پڑ بڑا کے اٹھا اور پریشان باہر نکل آیا۔ دیکھا تو گل ہی اور کھلا ہوا ہے۔ فوج کے سرداروں کو ڈراؤنی صدا میں پکارا۔ وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ پھر وہ اپنے کمرہ کے زینہ سے قلعہ کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے غل و شور مچانا شروع کیا۔ سراسیمہ ادھر ادھر بھاگا پھرتا تھا۔ خرابیک مسلمان کی گولی بنے اُسے تھل پڑے سے بٹھایا۔ لہ

یار محمد خاں حاکم پاکستان سے مصر کے آرائی کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یوں رقمطراز ہیں:

”مولانا شہید گھوڑے پر سوار تھے اور دو سو آدمی اور بھی آپ کے ساتھ قدم بستم علاوہ چار سو پیدلوں کے آپ سے تھے۔ مولانا شہید کی پہلی نظریں توپوں پر لگ رہی تھیں، آپ سب سے پہلے اُن ہی پر جا پڑے۔ گولہ انداز نے ستابی کو روشن کر کے چاہا کہ پہلے مولانا کو اڑا دوں کہ مولانا نے تلوار کا پھرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وہ دونوں توپیں ڈرائیوں کی طرف پھیر کے ڈیر کرنے شروع کیے۔ ایک

لہ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۳۲ء، ۲۲۳

وفادار ہندو، جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام) گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اُس نے اس قدر پھرتی سے گولہ اندازی کی کہ ڈرائیوں کے پیر اکھڑ گئے۔ اُدھر مولانا شہید اُن پر گر پڑے۔ تکبیروں کی آوازیں خوب زور شور سے بلند ہو رہی تھیں۔ بھلا اب ڈرائی کیونکر میدان میں ٹھہر سکتے تھے؛ اپنا کُل سامان چھوڑ کے بھاگے۔ جب وہ فرار ہو رہے تھے، سید صاحب بھی اُن پر آ پڑے۔ جتنے ڈرائی مارے گئے ان کی تعداد ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں، ہاں جن مُردوں کو وہ میدان میں چھوڑ گئے تھے، وہ چار سو سے زیادہ شمار میں تھے۔ مولانا شہید کی فوج کا ایک آدمی بھی زخمی نہ ہوا۔

یار محمد خاں کی فوج کے جتنے مال کو مالِ غنیمت قرار دے کر ان برطانوی مجاہدوں نے ہضم کیا، اس کی مکمل تفصیل تو کسی سوانح نگار نے بیان نہیں کی۔ بعض ایشیا کی فہرست جناب غلام رسول قہر کی زبانی ملاحظہ ہو:

”مولانا نے مالِ غنیمت جمع کر لیا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں۔ ایک ہاتھی، ساٹھ ستر اُونٹ، کچھ کمہین سوگھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاہینیں، تلواروں اور بندوقوں کا شمار نہ تھا۔ ملکی لوگ جو مال اٹھائے لیے جا رہے تھے اُسے حسنِ تمبیر سے واپس لیا۔ بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جوتے بھی چھوڑ گئے تھے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں۔ منوں خشک میوہ موجود تھا۔“

غلامی خاں اور یار محمد خاں کو ٹھکانے لگانے کے بعد مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے رازداری کے ساتھ مسلمانانِ ستہ کو بزورِ شمشیر زیر کرنے کا ایک پروگرام بنایا اور سید احمد صاحب سے منظوری لے کر اُس پر یوں عمل کیا گیا:

”پانندہ خاں سے مسالحت کی صورت پیدا ہو گئی تو قاضی سید محمد جان نے پیر

۱۔ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۷

۲۔ غلام رسول قہر: سید احمد شہید، ص ۵۲۷

تجویز پیش کی کہ علاقہ ہتمہ میں سرکشی کے آثار نمودار ہیں۔ جن لوگوں نے خود بخود  
ادائے عشر کا اقرار کیا تھا، وہ بھی بے پروا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کچھ لشکر  
میرے ہمراہ کر دیں تو میں غلط نصیحت سے سارے اہل ستہ کو حلقہ بگوش  
بنادوں۔ جو نہ مانیں انہیں بزور راضی کروں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اس  
لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیے جائیں، اس لیے کہ میں مقامی  
آدمی ہوں اور اپنے اہل وطن کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں، ایسا  
آدمی یہاں کوئی اور نہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل کو میرے ساتھ کر دیں تاکہ اگر  
مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسول کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو  
مولانا روک دیں۔ سید صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔

اس پروگرام کے مطابق سب سے پہلے موضع کھلاوٹ پر فوج کشی کی گئی۔ جناب غلام رسول مہر  
نے یہ کارنامہ یوں بیان کیا ہے:

کھلاوٹ سے ایک کس پر ناز نظر ادا کی۔ جب بستی پاؤ کو س پر رہ گئی تو  
قاضی صاحب نے حکم دیا کہ سب ٹھہر جائیں۔ پھر رسالدار عبدالحمید خان سے کہا  
کہ آپ یہاں تیار کھڑے ہیں، ہم پیادوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، جب  
ہماری طرف سے ہندوئی چلے تو فوراً باگیو اٹھا کر بستی کی جنوبی سمت سے  
حملہ کر دیں۔ قاضی صاحب نے شمالی سمت میں ایک ٹیلے پر زور رکھا کہ  
گوہ باری شروع کر دیں۔ اس اثنا میں رسالدار کے ایک سوار کو پنجاب کی  
حاجت ہوئی، وہ اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھا، گھوڑے کی باگ پاؤں  
کے نیچے دبا کر پنجاب کے لیے بیٹھ گیا۔ رفتہ گھوڑا پہاڑ کا اور اس کی باگ  
پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ رسالدار نے آواز دی کہ  
یہاں جانے نہ پاتے۔ دو دو چار چار سوار اس کے تعاقب میں نکلنے لگے

۱۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۵۹۶

قاضی صاحب نے سمجھا کہ سواروں نے ہڈ بول دیا، چنانچہ انہوں نے بھی گولہ باری چھوڑ کر حملہ کر دیا۔ اس طرح ایک معمولی سا واقعہ کامیاب یورش کی شکل اختیار کر گیا۔ پیادہ فوج بستی میں داخل ہو گئی۔ سرداروں کا مقابلہ صرف دو آدمیوں نے کیا اور دونوں مارے گئے۔ غازیوں میں سے کسی کے چرکہ بھی نہ لگا اور کھلابٹ فتح ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں مقابلے کے لیے پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔ لہ

اس کے بعد مرغز، ٹھنڈ کوٹی، کڈا اور پنج پیر پر جوش ملک گیری میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے گئے۔ ان سرگرمیوں کی کہانی دہلیوں کے مورخ نامدار، عالیجناب غلام رسول مہر کی زبانی ہی ملاحظہ فرمائیے :

”کھلابٹ کے اصلی خاں (یعنی سردار) ابراہیم خاں اور اسمعیل خاں تھے۔ قاضی صاحب نے ابراہیم خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا، چار سوار اس کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اسمعیل خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور مرغز پہنچے، جو کھلابٹ سے ایک میل پر تھا۔ مرغز کے لوگ مجاہدین کے آنے کی خبر سنتے ہی مطیع ہو گئے۔ وہاں جس غاصب نے خانی پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھاگ گیا۔ قاضی صاحب نے مرغز کو وہاں کے اصلی خاں، سرفراز خاں کے حوالے کر دیا۔ چار سوار اس کی حفاظت کے لیے بھی چھوڑے اور خود ٹھنڈ کوٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹھنڈ کوٹی اور اس کے بعد کڈا میں بھی مرغز کی سی صورت پیش آئی، یعنی دونوں بستیوں کے لوگوں نے بے چون و چرا فرمانبرواری کا عہد کر لیا۔ مغرب کی نماز قاضی صاحب نے زبیدہ اور کڈا کے درمیان ایک نالے پر ادا کی اور وہیں مع لشکر ٹھہر گئے۔ اسی جگہ پنج پیر کے خاں نے خود اگر اطاعت کا اقرار کیا۔ اس طرح ایک دن میں کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوٹی، کڈا اور پنج پیر زیر فرمان آ گئے۔ لہ

لہ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۵۹۸، ۵۹۹

لہ ایضاً: ص ۵۹۹

اب قلعہ ہند کی فتح کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :

”ہند وہاں سے قریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں اپنے سوار اور چار ضرب زبور لے کر ہند چلا جاؤں۔ اگر حالات سازگار دیکھوں گا تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ صبح کے وقت آپ بھی پیادوں کو لے کر آجائیں۔ اگر دیکھوں گا کہ ٹھہرنا مناسب نہیں تو چلا آؤں گا۔ دونوں اور قاضی صاحب دونوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا چنانچہ رسالدار بے توقف اُدھر روانہ ہو گیا۔ جب ہند ایک گولی کے فاصلے پر رہ گیا تو چند گھوڑے زور سے ہنہناتے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے چاروں بڑوں پر اتنی روشنی ہوئی کہ اردگرد کی ہر شے دُور دُور تک صاف نظر آنے لگی۔ رسالدار نے سواروں کو وہیں روک دیا پھر آہستہ آہستہ انھیں جنوبی سمت میں تالاب کے کنارے کی اوٹ میں پہنچا دیا۔ وہاں زبور لگا کر قلعے پر چار پانچ گولے پھینکے۔ بعد ازاں ہمارے سوار قاضی صاحب کے پاس لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔ صبح صادق نمودار ہوئی تو دو آدمیوں نے آکر یہ خوشخبری سنائی کہ ہند خالی پڑا ہے، آپ قلعے کے انتظام کے لیے وہاں تشریف لے چلیں، پھر ایک ملا آیا اور اس سے ہند کے تعلقے کی تصدیق ہو گئی۔“

اب ہوتی مردان کی فتح کی کہانی، جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنیں اور اس جہاد کا رنگ روپ دیکھیے :

”ہوتی مردان کے رئیس احمد خاں کو بھی بلایا گیا۔ اس کی طرف سے جواب آیا کہ آٹھویں روز ملاقات کروں گا۔ قاضی صاحب نے سمجھا کہ شاید اسے کوئی ضروری کام ہوگا۔ اس اثناء میں گوجر گڑھی کے ایک غازی اخوند خیر الدین آئے اور بتایا کہ احمد خاں اپنے بھائی رسول خاں کو نائب بنا کر خود ڈرائیوں سے

لے غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۵۹۹، ۶۰۰

فوجی مدد لینے کے لیے پشاور چلا گیا ہے۔ دو تین روز میں پئے درپے اس خبر کی تصدیق ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان حالات میں مردان کو بزور مسخر کر لینے کے سوا چارہ نہیں۔ چنانچہ سب کے مشورے سے مردان پر پیش قدمی کا فیصلہ ہو گیا۔

مردان پر حملے کے لیے تیاری کا حکم دینے کے بعد قاضی سید محمد جتان نے دو ملکی آدمیوں کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ خبر لاتے کہ ہوتی کی گڑھی میں بیس چکیں اور مردان کی گڑھی میں تیس چالیس آدمی ہوں گے۔ ہوشیار موجود ہے اور احمد خاں پشاور گیا ہوا ہے۔ حملے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا، اگر انتظار کیا جاتا تو درانیوں کا لشکر آ جاتا۔

رہبروں کو آگے بھیج دیا تاکہ وہ پورے حالات دیکھ کر مزید خبر لائیں اور بسم اللہ کہہ کر قدم آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ جب ہوتی آدھ کو کس پر رہ گیا تو مخبروں کا انتظار کرنے لگے۔ بستی میں نقارہ زور سے بج رہا تھا۔ لوگوں کا شور و غل بھی سنائی دیتا تھا۔ غازیوں کے گھوڑے بدستور ہنسنارہے تھے۔ اس اثنا میں مخبر خبر لاتے کہ ہوتی کی گڑھی سے گولی کی زد کے فاصلے پر بہمت جنوب کھلیان ہیں، وہاں چالیس پچاس آدمی بندوقین لیے بیٹھے ہیں۔ بستی کے دروازے پر بھی کافی جمعیت ہے۔ ابلتہ گڑھی سے مغربی سمت کا میدان خالی ہے اور شمالی سمت میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ قاضی صاحب نے مولوی منظر علی عظیم آبادی سے کہا کہ آپ حبش کو لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ سواروں کو لے کر مغربی جانب کے میدان میں پہنچ جائیں۔ جب کھلیانوں کی سمت سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہوئے بستی پر

۱۰ غلام رسول قہر، سید احمد شہید، ص ۹۰، ۹۱، ۹۲

۱۰ ایضاً: ص ۹۲



حملہ کر دیں۔ خود دروازے کا قصد کیا، جہاں دشمن کی بھاری جمعیت کی اطلاع ملی تھی۔ ملکيوں کو قاضی صاحب نے صفِ اول میں رکھا اور ہندوستانیوں کو صفِ دوم میں۔ دُعا کے بعد تینوں حبش اپنے اپنے مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔

”مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ چالیس پچاس سواروں کو بستی میں بھیج دیجیے۔ وہ گھوڑے چھوڑ دیں۔ شاہینیں لے کر پیدل چلیں اور شاہینوں کے گڑھی کے بڑوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ گڑھی مردان کے چھ برج تھے سب پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ دو شاہینیں صرف اُس برج کے خلاف لگائی گئیں جس کی گولیوں سے قاضی سید جبان اور دوسرے غازی شہید ہوئے تھے۔ بہر حال شاہینوں نے دشمن کا عزم مزاحمت مضحل کر کے رکھ دیا۔ گڑھی کے پانچ بڑوں پر خاموشی چھا گئی، صرف ایک باقی رہ گیا، جس سے گولیاں آ رہی تھیں۔ اس اثنا میں لعل محمد قندھاری اُس برج کے نیچے پہنچ گئے اور باواز بلند پشتو میں پکارے: ”اندر پائی راوڑا۔“ اندر پائی راوڑا۔ یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔ حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سن کر بڑج والوں پر ہراس طاری ہو گیا اور انہوں نے سواگی کی درخواست پیش کر دی۔ قرار داد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دیتے، پھر ایک ایک کر کے اتر آتے۔“

جنگِ دیار کے بعد بعض دُرائی بہتی مردان میں جمع ہو گئے تھے جن کی وجہ سے عارضی طور پر سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کا دباؤ سے قبضہ اٹھ گیا تھا۔ جلاہ جعفرات اپنے پیٹے جی کس طرح یہ صورتِ حال برداشت کر سکتے تھے؛ چنانچہ فوراً مسلمانوں پر فوج کشی کر کے اپنے جذبہ جہاد کو تسکین پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔ مثلاً،

”غرض مولانا ہوتی کے قریب پہنچے تو دباؤ کی گڑھی سے گولیاں آئیں۔ اس پر

لے غلام رسول تہر: سید احمد شہید، ص ۶۰۴، ۶۰۵

لے ایضاً، ص ۶۰۴

مولانا (محمد اسمعیل دہلوی) نے حکم دے دیا کہ ہر غازی اپنے چاروں طرف چار چار قدم کا فاصلہ چھوڑ کر چلے۔ پھر گڑھی کے جنوبی دروازے کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ مردان سے باہر مغربی سمت میں ایک باغ تھا، جس میں بڑے بڑے درخت تھے اور اُس کی زمین ذرا نشیبی تھی، اُس میں جا بیٹھے۔ گڑھی مردان کے برجوں سے گویاں آتے لگیں، لیکن مولانا نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ تجویز فرمائی تھی کہ کسی غازی کو نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ ایک گڑھی کے بعد گویاں مدھم پڑ گئیں اور چند ملاح صاحبان حاضر ہو کر مولانا کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ حکم ہو تو کھانا لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی غازیوں کو زہر آلود کھانا کھلا کر ختم کر دیں۔ خبردار ہو جاتیے، جو توپیں درانیوں سے غنیمت میں ملی ہیں، انھیں ابھی منگالینا ہوں۔ اُن کے آتے ہی گڑھی کو شمار کر ڈالوں گا۔ ملاؤں نے معذرت کی اور کہا کہ یہ احمد خاں کے آدمیوں کا کام ہے جو جاہل ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ لاسی ہوا کہ لڑائی کے بغیر گڑھی حوالے کر دی تو خان، نمک حوامی کا طعنہ دے گا۔ اُدھر مولانا نے سید صاحب کے پاس آدمی بھیج کر شاہین منگالیں۔ اُدھر جب بستی والوں کو معلوم ہوا کہ توپیں آرہی ہیں تو بے تابانہ صلح کے خواستگار ہوئے۔ احمد خاں کے بھائی رسول خاں نے پیغام بھیجا کہ میں فرمانبردار ہوں، البتہ درانیوں کی آمد کے باعث بے بس ہو گیا تھا۔

پانڈہ خاں رئیس آنب سے لڑائی کر کے اُس کا قلعہ چھینا اور مسلمانوں کا کشت و خون کیا گیا۔ یہاں فوج کشی کی ابتدا کیوں اور کس طرف سے ہوئی، یہ مولوی محمد جعفر تھا نیسری کی زبانی سنئے:

”ملکیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ پانڈی خاں اپنے ملک میں جنگ کی تیاری

لے غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۶۴۱

کر رہا ہے، اس واسطے سید صاحب کے لیے بھی لازم ہو گیا کہ ایک لشکرِ اسلام اس طرف روانہ کریں... اس مہم کا مولانا محمد اسماعیل صاحب کو امیر مقرر کر کے بجانب آئب روانہ کر دیا... یہ لشکر دو حصے ہو کر، ایک حصہ زیرِ حکم سید احمد علی ہمشیر زادہ سید صاحب کے عشرہ کو گیا اور ایک حصہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے ساتھ فردوسہ میں پہنچا اور خود سید صاحب بھی پنجاب سے روانہ ہو کر اسی نواح کے لوگوں کو لشکرِ اسلام کی تائید کے واسطے آمادہ کرتے تھے؛ لہ

جناب غلام رسول مہر نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی اس موقع کی جنگی سکیم کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

”آپ غور فرمائیں کہ مولانا کی جنگی سکیم کتنی عمدہ تھی، اگر پانڈہ خان عشرہ کی جانب بڑھتا تو مولانا گلنگڑی کے راستے امب پہنچ سکتے تھے۔ اگر وہ خود گلنگڑی کے راستے فردوسہ پر پیش قدمی کرتا تو ستخانہ کی فوج عشرہ اور امب پر قابض ہو جاتی۔ اگر وہ امب میں بیٹھا رہتا تو مولانا جنوب اور شمال مغرب دو سمتوں سے امب پر بڑھتے۔“ لہ

لیکن پانڈہ خاں نے ان لوگوں کی جنگی سکیم کو ناکام بنا دیا، جس پر مہر صاحب یوں نوحہ کناں ہوئے:

”پانڈہ خاں کو کنیرڈی پر غازیوں کے قبضے کی اطلاع ملی تو اسے معلوم ہو گیا کہ اب ان کی دوہری زد سے بچنا مشکل ہے۔ گھبرا کر اس نے صلح کا جال بچھایا۔... غرض پانڈہ خاں کے فریب و صلح کے باعث غازیوں کے ہر جیش کی ساری جنگی تمایر معطل ہو گئیں۔“ لہ

”پانڈہ خاں اب تک عشرہ میں تھا اور اپنے آدمیوں کو لکار لکار کر لڑائی کا

۱۔ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۵۰، ۲۵۱

۲۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵۳

۳۔ ایضاً، ص ۵۵۴

حوصلہ دلا رہا تھا۔ سواروں اور پیادوں کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی عشرہ کو چھوڑ کر  
امب کی جانب روانہ ہو گیا۔ لے

”شیخ ولی محمد کوٹلہ سے پہاڑ کے اوپر اوپر امب کے قریب پہنچ گئے۔ پابندہ  
خاں انھیں دیکھتے ہی امب کو چھوڑ کر چھتر بانی چلا گیا، جو چند میل شمال میں تھا۔  
شیخ ولی محمد گویوں کی آواز سن کر کنیر ٹری کی طرف آئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ  
صرف غازیان کنیر ٹری کو شدید نقص سے نجات ملی بلکہ عشرہ اور کوٹلہ پر بھی  
قبضہ ہو گیا۔ لے

چھتر بانی کی گڑھی پر جو معرکہ آرائی ہوئی وہ غلام رسول مہرنے اس طرح بیان کی ہے :  
”امب سے چھتر بانی کے دو راستے تھے : ایک زیریں راستہ جو دریا کے کنارے  
کنارے جاتا تھا، دوسرا پہاڑی راستہ۔ رسالدار عبدالحمید خاں پہاڑی  
راستے سے گئے۔ مولانا نے زیریں راستہ اختیار کیا۔ گڑھی سے ایک گولی  
کے فاصلے پر دروازے کے بالمقابل ٹھہر گئے اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی  
کے تینوں جانب مورچے بنائے۔ حکم دے دیا۔ چنانچہ جا بجا آٹھ مورچے  
بنائے گئے : تین شمال و مغربی کونے میں، تین جنوبی و مغربی کونے میں، دو  
جنوبی سمت میں جدھر گڑھی کا دروازہ تھا۔ محاصرہ اگرچہ بڑا سخت تھا لیکن  
گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ مولانا نے امب سے  
توپ منگا کر گولہ بادی بھی کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر یہ سارے حالات سید صاحب  
کو لکھ بھیجے کہ آپ امب پہنچ جائیں اور گڑھی کو مسخر کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔  
سید صاحب نے امب پہنچ کر فیصلہ کیا کہ چھتر بانی پر حملے کے لیے پنجتار  
سے توپیں منگا لینی چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے شیخ بلند سخت دیوبندی کو پچیس تپیں

لے غلام رسول مہر : سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵

لے ایضاً : ص ۵۵



اور شجاع اور پہلوان اُس دن مارے گئے۔ غازیوں کے صرف بیس آدمی شہید ہوئے اور اسی قدر مجروح ہوئے۔ میدان غازیوں کے ہاتھ رہا اور تڑپیں اور شاہین اور بندوقیں اور گھوڑے اور خیمے اور ظروف وغیرہ مال غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا۔ فتح کے بعد ظہر اور عصر کی نماز سید صاحب نے اُس میدان میں ادا کی اور مغرب کی نماز سے پہلے سید صاحب مال غنیمت کو ساتھ لے کر مظفر منصور موضع ہیار میں پہنچے اور وہیں شب بائش ہوئے۔

قارئین کرام! یہ تھا ان حضرات کے جہاد کا اصلی رُخ، اب ان کی اخلاقی حالت پیش کرنے سے پہلے جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا نظریہ اُن کی تحقیق کی روشنی میں پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے سید احمد صاحب کے رفقاء کو اُن کے کردار کی روشنی میں کیا کچھ پایا؛ چنانچہ موصوف رقمطراز ہیں:

”انہوں (سید احمد و محمد اسماعیل صاحبان) نے عاقبہ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بڑا اٹھایا اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے، وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابہ کرام کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔“

مودودی صاحب کی عقیدت کے ان مرکوزوں کا دین و ایمان کچھ اسی فصل کی گزشتہ سطور میں پیش کیا چکا ہے، کچھ چند صفحات کے بعد پیش کیا جائے گا، نیز اسی کتاب میں اکثر جگہ ان حضرات کے دین ہی کی تو اضع موجود ہے۔ معاملات کی صفائی، ان کی مسلم کشی اور انگریزوں سے عیاں ہے۔ رہا اخلاق والا معاملہ تو اُس کا بیان چند سطور میں پیش ہونے والا ہے۔ پہلے موصوف کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے۔ لکھتے ہیں:

”ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تصور اس موقع ملا۔ انہوں نے ٹھیک اُسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔“

۱۔ محمد جعفر تھامسیری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۶۸، ۲۶۹

۲۔ ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۵

وہی فقیرانہ امارت ، وہی مساوات ، وہی شوری ، وہی عدل ، وہی انصاف ،  
 وہی حدود شرعیہ ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا ،  
 وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو ، وہی  
 خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاقِ صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا۔ غرض ہر پہلو  
 میں انہوں نے اُس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا ، جو صدیق و فاروقؓ  
 نے کی تھی۔ لے

معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عالیجناب مودودی صاحب کی نظر میں کسی بہتر سے بہتر  
 حکومت و امارت میں جو اوصاف ہونے چاہیں وہ انہوں نے لکھ لیے ، ان کا ایک خوشنام  
 بار بنایا ، پھر اپنی عقیدت کے مندر میں تشریف لے گئے اور وہ بار اپنے بہل ( اسمعیل دہلوی )  
 کے گلے میں لٹکا دیا۔ اس چنگیز خانی و ہلاکو خانی کو صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقدس  
 دور جیسا بتانے کی جرأت بھی ویسا ہی شخص کر سکتا ہے ، جن کی بخشش کا سید احمد صاحب نے  
 اپنے خدا سے وعدہ لے لیا تھا۔ آئیے مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے عاشق زار و سوانح نگار  
 یعنی مرزا حیرت دہلوی سے پوچھتے ہیں کہ سید احمد صاحب کے ساتھی اور ان کے مقرر کردہ عمال  
 کیسے تھے ، موصوف بتاتے ہیں :

’مجاہدین میں سب طرح کے آدمی تھے ، بڑے بھی اور بھلے بھی۔ بلکہ یہ اندازہ کیا گیا  
 کہ بڑے زیادہ اور بھلے کم تھے۔ کبھی علانیہ طور پر سید صاحب کے کسی ساتھی کو  
 سزا نہیں دی گئی ، حالانکہ اکثر ناجائز افعال ان سے سرزد ہوا کرتے تھے۔ لے  
 ان حضرات کو چند سال تک جو ایک مختصر سے علاقے پر جہا نبانی و جہان داری کا موقع ملا ،  
 وہاں آئین سلطنت کیا تھا ، شانِ حکمرانی کیا تھی ، اس کا اندازہ مرزا حیرت دہلوی کے اس  
 حیرت انگیز بیان سے کیا جاسکتا ہے :

لے ابوالاعلیٰ مودودی ، مولوی ، تجدید و احیائے دین ، بارہم ، ص ۱۱۶ ، ۱۱۷

لے حیرت دہلوی مرزا : حیاتِ طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۲۲

ایک ایک چھوٹے ضلع، قصبہ، گاؤں میں ایک ایک عمال سید صاحب کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ وہ بیچارہ جہانذاری کیا خاک کر سکتا، اُلٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے نئے احکام بیچارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا اور وہ اُن نہ کر سکتے تھے۔ کھانا پینا، پیٹنا اٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب کچھ اُن پر حرام ہو گیا تھا۔ نہ کوئی منظم تھا، نہ کوئی داورس تھا۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہو جانا کچھ بات ہی نہ تھا۔۔۔۔۔ ذرا کسی کی لبیں بڑھی ہوئی دیکھیں، اُس کے لب کتر وادیے۔ ٹخنوں سے نیچے تہ بند دیکھی، ٹخنہ اڑ وادیا۔ تمام ملک پشاور پر آفت چھا رہی تھی۔ انتظام سلطنت اُن مسجد کے ملازموں کے ہاتھ میں تھا، جن کا جلس سوائے مسجد کے دیوار ورسن کے کبھی کچھ نہ رہا تھا اور اب اُن کو منظم امور سلطنت بنا دیا گیا تھا، اور پھر غنیمت یہ تھا کہ اُن پر کوئی حاکم مقرر نہ تھا کہ پبلک اُن کی اپیل اعلیٰ احکام کے آگے پیش کرے۔ ان ہی بے دماغوں کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے تھے اور تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُس میں کوئی بات بھی قابلِ تیسخ اور ترمیم نہیں ہے۔ کیسا ہی پیچیدہ مقدمہ ہوتا تھا، اُس کی گھڑی بھر بھی تحقیق نہ کی جاتی تھی، نہ اُس پر غور کیا جاتا تھا، بس ملاں جی کے سامنے گیا اور اُنھوں نے پھٹ سے فیصلہ دے دیا۔ کون جھک جھک کرے اور کون تحقیق کی تکلیف برداشت کرے؛ سید صاحب کی خدمت میں شکایتوں کی عرضیاں گزر رہی تھیں، مگر وہاں کچھ بھی پرسش نہ ہوتی تھی؛ لے

شاید عالیجناب ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر میں یہ صحابہ کرام کی یاد تازہ کی جا رہی تھی اور حضرت ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا انتظام سلطنت موصوف کی نظر میں ایسا ہی ہوگا؛ اطمینان اور دیوبندی حضرات تو اپنے اپنے روزِ اول سے ہی ان حضرات کو اس باباً من

لے حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۳



ذو اللہ بتائے ہوئے ہیں۔ وہ اگر ایسے بیانات داغتے رہے ہیں تو کیا جائے شکایت؟  
لیکن مورودی صاحب، جو محقق ہونے کے مدعی ہیں اور خود تحقیق کیے بغیر کسی بڑی ست بڑی  
بستی کے بھی فیصلے کو تسلیم کرنے کے عادی نہیں، جب راقم الحروف نے موصوف کی زبانی  
”تجدید و احیائے دین“ کتاب کے صفحات پر اس قسم کی اسمعیل پرستی دیکھی تو حیرت و استعجاب  
کی کوئی انتہا نہ رہی کہ بزرگ عظیم پاک و ہند میں ایک ایسا غیر مرئی ”ہبل“ بھی ہے جس کی عقیدت میں  
مثلاً ہوجانے کے بعد بڑے بڑے مدعیان تحقیق و تدقیق کو بھی یہ جرات نہیں ہوتی یا توفیق نہیں  
ملتی کہ وہ نظر اٹھا کر اتنا ہی دیکھ سکیں کہ جس کے حضور میں وہ جھکے ہوئے ہیں وہ عقیدتوں کا مرکز،  
محض ایک پتھر کی مورتی ہے یا کسی سامری وقت کے ہاتھوں کا گھڑا ہوا سنہری بھڑا؟

مورودی صاحب جیسے مدعی عبقریت و نابغہ عصر کہلانے والے کی بارگاہ میں اگر ہمارے  
جیسی ارضی مخلوق کو بھی اذن لب کشائی حاصل ہے تو یہ ناچیز عرض کرنے کی جسارت کرے گا کہ  
جناب والا! اگر طبع مبارک پر گراں نہ گزرنے تو ذرا اپنے ان بڑوں کے دین و دیانت اور تقویٰ و  
طہارت کی کہانی، خود اپنوں کی زبانی سن لیجیے:

”سید صاحب نے صد باغازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرع محمدی  
کے موافق عمل درآمد کریں، مگر ان کی بے اعتدالیوں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔  
وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ ان سے نکاح کر لیں اور بعض  
اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دو تین لڑکیاں جا رہی ہیں، جامدین  
میں سے کسی نے انھیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھالیا، لے

کیا فرماتے ہیں علمائے اہل بیت و مفتیان و اراکین العلوم و پرہیزگاروں پور اور محققین جماعت  
اسلامی اس بارے میں کہ راستہ چلتے ہوئے کسی کی نوجوان لڑکی کو زبردستی پکڑ کر نکاح کر لینے  
سے جبکہ اس لڑکی کی قطعاً رضامندی نہ ہو، اس کے ولی کی اجازت نہ ہو، بلکہ ولی کو خبر تک نہ ہو  
کیا ایسا جبری نکاح شرعاً جائز ہے یا زنا محض؟ ایسے نکاح سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کا

شرعی حکم کیا ہے؟ اس طرح مسلمانوں کی نوجوان لڑکیوں کو جبراً اپنے گھروں میں ڈال لینے والے ان کی عصمتوں پر ڈاکو ڈالنے والے، صحابہ کرام کی یاد تازہ کر رہے تھے یا بدکاری کا دنیا میں نرالا ریکارڈ قائم کر رہے تھے؟ یہ صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور کا نمونہ پیش کیا جا رہا تھا یا زید پلید سے لے کر آج تک کے مسلمان کہلانے والے جملہ بدچلن اور بدقماش حکمرانوں کے اگلے پھلے سب ریکارڈ توڑ کر بین الاقوامی چیمپئن شپ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی؟

خار کو گل اور گل کو خار جو چاہے کرے

تُو نے جو چاہا کیا، اسے یار جو چاہے کرے

اسی سلسلے میں تسکینِ خاطر و اطمینانِ قلب کی غرض سے ذرا یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمائی جائے:

ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی کہ میرا نکاح ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور سے

رہے ہیں، نہیں، ہونا چاہیے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالہ مجاہد

کرتے تھے اور ان کو کچھ چارہ نہ تھا! لہ

اگر مودودی صاحب اور دیگر دینی علماء کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو اس طرزِ عمل پر

مرزا حیرت دہلوی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے:

یہ محض تاکن تھا کہ نوجوان عورت رائے ہو کے عدت کی مدت گزر جانے پر بے خانہ

بیٹھی رہے۔ اس کا جبراً نکاح کیا جاتا تھا، خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ پشاور

میں بڑے بڑے سرداروں میں نکاح ثانی کی رسم نہ تھی اور اسے سخت حقارت

کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ مانا کہ نکاح ثانی قرآنی کلمہ ہے، مگر جس ناگوار طریقہ

سے وہ پلک کے آگے پیش کیا جاتا تھا، وہ ناقابلِ برداشت تھا! لہ

یہ بیانات کسی تعارف و تبصرہ کے محتاج نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دہلوی

لہ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۲

لہ ایضاً: ص ۲۲۲

حضرات کی خدمت میں اُن کے برطانوی صدیقیوں اور فاروقوں کا طرزِ عمل بھی اس سلسلے میں پیش کر دیا جائے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنے مَن مندر کے پروہتوں کو بچاتے ہوئے، لپٹا پوتی سے کام لینے ہوئے، اُن کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے:

”بہ قسمتی سے ایک نیا گل کھلا۔ گل کیا کھلا، گویا غازیوں یا مجاہدوں کی زندگی کے شیرازے کو اُس نے پراگندہ کر دیا۔ باہم یہاں کے گل عمال نے جن کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی، ایک فتویٰ مرتب کیا اور اُسے پوشیدہ مولوی عمیل کی خدمت میں بھیج دیا۔ فتویٰ کا مضمون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرس ہے یا نہیں؟ مولانا شہید کیا واقف تھے کہ ملک پشاور میں یہ آگ پھیل رہی ہے اور اس وقت اس فتویٰ کی اشاعت سخت غضبناک ہوگی۔ آپ نے سادہ طور پر، اُس پر اپنی مہر کر دی اور سید صاحب کی بھی اُس پر مہر ہو گئی اور پھر وہ فتویٰ قاضی شہر پشاور، سید مظہر علی صاحب غازی کو بھیج دیا گیا۔ اُنہوں نے اس فتویٰ کی اشاعت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصہ میں، ملک پشاور میں جتنی رائٹریں ہیں، سب کے نکاح جو جانے ضرور ہیں، ورنہ اگر کسی گھر میں بے نکاح رائڈرہ گئی، تو اس گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔“

سید احمد صاحب نے اپنے ساتھیوں کے پاس خاطر سے، صدیقی و فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور کی جناب ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر میں یاد تازہ کرنے کی غرض سے، کیسے کیسے کالے قانون رائج کیے۔ اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے مذکورہ فتویٰ ہی کون سا کم ہے لیکن مزید تسلی کی خاطر ان کے خانہ ساز امیر المومنین کا ایک اعلانِ عام پیش کرتے ہیں۔ کسی یورپین موبخ کا بیان ہے، جسے مرزا حیرت دہلوی نے اپنے لفظوں میں یوں نقل کیا ہے:

”آپ کے ساتھی غریب الوطن تھے اور اب اُنہیں جو رُودوں کی بھی خواہش تھی، تو آپ (سید صاحب) نے ایک فرمان جاری کیا کہ جتنی کنواری لڑکیاں ہیں وہ سب

لے حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۳، ۲۴۴

ہمارے لیفٹننٹ کی خدمت میں مجاہدین کے لیے حاضر کی جائیں گی، اگر ان کی شادی بارہ دن میں نہ کر دی گئی۔ قوم کی قوم اس اعلان سے بھرپور اٹھی، اُسے سرحد کے مسلمانوں نے طوعاً و کرہاً ان حضرات کے ہر ظلم کو برداشت کیا۔ مجبوراً ان کے جو دستم کی چکی میں پیتے رہے لیکن آئے دن ان کے ننگ و ناموس سے جو کھیلا جا رہا تھا یہ معاملہ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور کسی بھی مقام سے پھٹنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن پھٹنے کا موقع آیا تو زمین ہی کھل گئی۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا فتویٰ جاری ہو گیا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے۔ قاضی مظہر علی نے پورے ملک میں اس فتوے کو مشہور کر کے اعلان کر دیا کہ تین دن میں جملہ بیوگان کے نکاح ہو جانے ضروری ہیں ورنہ جس گھر میں کوئی بیوہ پائی گئی، اُس گھر کو آگ لگا دی جائے گی، خودستید صاحب یوں گرجے کہ علاقے کی ساری کنواری لڑکیاں مجاہدین کے لیے ہمارے پاس پہنچا دینی چاہئیں، بارہ روز کی مہلت ہے۔ یہ ہے ان حضرات کے دین و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی کہانی۔ معلوم نہیں مودودی صاحب اور دیگر جملہ واپسی علماء و مورت خین اپنے اس اینگلو انڈین بدچلن گروہ کے اخلاقیات کو کون سے پیمانے سے ناپ کر صحابہ کی یادگار بنا دیا کرتے ہیں؟ آخر قیامت ایک روز ضرور آ کر رہے گی۔ اگر حق و باطل کا فیصلہ کرنا یہاں منظور نہیں، بلکہ ان حضرات کو یہاں اس دھاندلی میں قائدہ نظر آتا ہے، مات کو دن اور دن کورات بتانے میں ہی کوئی منفعت دکھائی دیتی ہے، تو ان حضرات کی زبان اور قلم پر پہرہ کون بٹھا سکتا ہے؟ لیکن کیا بروز قیامت بھی یہ دھاندلی، یہ چمکیلے بیانات، یہ خوشنما اعلانات، یہ سمجھانے والوں پر بہتانات کچھ کام آسکیں گے؟ یہ چرب زبانی و رنگِ تقریر اور یزور قلم و سلیقہ و تحریر کیا بوقتِ حساب کچھ کام آجائے گا؟ نہیں آہرگز نہیں۔ اس طرزِ عمل نے، اس بے غیرتی و بداندیشی نے جو رنگ دکھانا تھا وہی سامنے آیا۔ جو خیال و خواب میں بھی نہیں تھا وہ دن دیکھنا پڑا۔ اقتدار کی بدستی میں ٹھکرانجام سے بے خبر ہو کر جو سیاہ کاریاں کی جا رہی تھیں وہ رنگ لائیں۔ دنیا میں ہی روزِ حساب آیا۔ وحی و عصمت اور

لے حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۶

کشف و کرامت کے سارے جھوٹے دعوے رفوچکر ہو گئے، خدا کی لاشھی بے آواز ہے، اُس کی پکڑ سے چھڑانے والا کون؟ ہوا کیا؟ ملاحظہ فرمائیے:

”اس اعلان کا شائع ہونا تھا تمام ملک مجاہدین کے خلاف قہر شدت ہو گیا۔ بہت دُھوم دُھام سے سازشیں ہونے لگیں اور ایک عام کھرام تمام ملک پشاور میں پھیل گیا۔ بڑے بڑے خواتین جو اپنی رائڈ لڑکیوں کا نکاح کرنا سخت عیب خیال کرتے تھے بڑے بڑے رافروختہ لہو بے اور انھوں نے باہم یہ مشورہ کیا کہ تین دن کی مدت میں ان سب کو یہیں تریخ کر ڈالو۔ مجاہدین نے بھی آخر وقت میں جا کے، جب سب سامان ہو چکا تھا، اُن کے تیور پہچانے اور اب وہ خائف ہو کر سید صاحب کو کھنے لگے کہ یہاں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ سید صاحب کچھ ایسے بے پروا ہو گئے تھے کہ انھوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا، نہ کجیوں کی خبروں پر کچھ توجہ کی، جو دم بدم یہ پوچھ گزار رہے تھے کہ آپ جلد فوج لے کر اس طرف روانہ ہوں، ورنہ خاتمہ ہی ہو اچھا تھا ہے۔ سید صاحب نے مطلق توجہ نہیں کی۔

آخر نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم اعلیٰ مولوی سید مظفر علی صاحب، جو اس آتش فشاں فتوے کے بانی مبنی اور اشاعت و ہندہ تھے اور جنہیں سید صاحب نے بڑے اعتبار اور بھروسہ سے مقرر کیا تھا، سلطان محمد حاکم پشاور کے دربار میں مع ساتھیوں کے بلاستہ گئے اور فوراً اُن کا سر قلم کیا گیا اور عام حکم دے دیا گیا کہ ایک ایک مجاہد قتل کیا جائے۔ ساری رات میں کئی مجاہدوں کی، جو بطور فتنم مختلف حصص میں متعین تھے، گردنیں اڑا دی گئیں اور نہایت بے کسی کی حالت میں، اُن میں سے اکثر سڑکوں پر بکروں کی طرح ٹٹا کر ذبح کیے گئے، لے

لڑکیوں کو زبردستی چھیننا، زبردستی نکاح کا ڈھونگ رچا کر اپنی شیطنت پالنا تو ایک طرف رہا جن مسلمانوں کو واجب القتل، مستحل الدم قرار دیا گیا، جنہیں اصل کافر اور اہل کتاب

ٹھہرایا گیا، جس کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر ٹوٹے رہے، جنہیں کلاب النار اور طعونین اشرار تک بتایا گیا، آخر ان سے اور کسی سلوک کی توقع کس بنا پر رکھی جاسکتی تھی؟ کشتی کو بھنور میں پھنسا کر آنکھیں بند کر لینے سے طوفان ٹل نہیں جاتا، ظلم و ستم کی آندھی جب چڑھتی ہے تو اُس کی ہولناکی کتنے ہی دلوں کو ہلا دیتی اور کئی ہرے بھرے اور تنومند درختوں کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتی ہے لیکن چند ساعتیں گزرنے کے بعد کہیں اُس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یہ حضرات مسلمانوں پر ظلم و ستم کی آندھی بن کر چھا تو گئے لیکن ساحرِ برطانیہ نے انہیں کس درجہ مسحور کیا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہی حقیقت کافی ہے، کہ انبیائے کرام سے بھی آگے بڑھ کر جو قدم قدم پر الہاموں کے دعوے کر رہے تھے، وہ اپنے افعال و کردار پر مطلع ہونے کے باوجود تازیتِ فوشتر و دیوارِ پڑھنے سے عاجز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عذابِ الہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو طاقت و جمعیت ہونے کے باوجود، ہمت جواب دے گئی، اوسانِ خطا ہو گئے، سارے وسائلِ حرفِ غلط کی طرح بے معنی نظر آنے لگ گئے۔ اُس وقت ان حضرات کی جو حالت تھی، اُس کی منظر کشی یوں کی گئی ہے:

”یہ خونِ خیر و خشتناک آگ کی طرح، چختار میں سید صاحب کے گوشِ حقیقت  
نیوش میں بھی پہنچی۔ آپ۔۔۔ یہ خبر گوش گزار فرما کے خون کے آنسو روئے اور  
ایسا صدمہ ہوا کہ گلِ ارادے پست ہو گئے اور ایسی مایوسی چھائی کہ انتقام کی  
بھی ہمت نہ رہی۔ پیارے شہید کا دل سب سے زیادہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ  
سخت حرمانی کی بھری ہوئی نظروں سے چاروں طرف تکتے لگے۔ اب کیا تھا،  
گر ٹوٹ چکی تھی اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ کئی برس  
خونِ پسینہ ایک کر کے پنجاب کے بڑے حصہ پر سکتے بٹھایا تھا اور وہ ہٹا جانا میں  
یوں خیر باد ہو گیا۔ بیشیر التعداد و مجاہدین کا مارا جانا بھی قہرناک تھا اور پشاور کا  
ٹک چھین جانا تو سب سے ہی زیادہ خونی اثر پیدا کرنے والا تھا۔ ان تمام  
ناگفتہ بہ غمناک صورتوں نے مولانا شہید کو بٹھا دیا اور پھر اس شیر میں بھی یہ  
اولوالعزمی نہ رہی کہ وہ اپنے دوستوں کا عوض لیتا۔ اب اُس نے اپنی شکستہ ولی

اور سخت مایوسی کی حالت میں اپنے کو بالکل اپنے محترم پیر کے حوالہ کر دیا کہ جو کچھ  
یہ چاہے، جو کچھ یہ کرے، اس کا ساتھ دو۔ خود کوئی بات سوچنا اور مشورہ دینے کا کام  
نہیں ہے۔ سید صاحب، مولانا شہید سے بھی زیادہ شکستہ خاطر تھے۔ آپ نے یہی  
بہتر جانا کہ اس ملک پنجاب کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہر چند لوگوں نے سمجھایا مگر آپ نے  
نہ مانا اور کہا، جہاں میرا خدا لے جائے گا، میں چلا جاؤں گا۔ جب آپ پنجاب سے  
ہمیشہ کے لیے ہجرت کی تیاری کر رہے تھے تو روانہ ہونے سے دو دن پہلے جمعہ  
کے دن اپنے کل ساتھیوں کو باواؤں بلند اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی اذن  
دے دیا، جو شخص اپنے وطن چاہتا ہے، بخوشی جاتے اُس سے میں ناراض  
نہیں ہوں۔

گویا سید صاحب نے سکھوں سے جہاد کرنے اور پنجاب میں رہنے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا تھا۔  
اب یہی حالات محمد جعفر تھانیسی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

جب سید صاحب کو جگہ جگہ سے مجاہدین تحصیل دارانِ عشور کے قتل کی خبر پہنچی،  
آپ بہت غمگین ہوئے اور فرمایا کہ اس تک و الوں پر برسوں چند نصیحت کی  
مگر اُس کا آج تک ان پر اثر نہ ہوا بلکہ جانتے اصلاحِ حالی خود انہوں نے  
تمر اور سرکشی سے اُن مسلمان دین داروں کو، جنہاں بلب اپنے اپنے ملک اور  
دیار کے تھے، بڑے ظلم سے رہی اور وہاں سے قتل کر ڈالا اب میں نے اس  
انتقام کو خدا پر چھوڑا نہ وہ منعم حقیقی خود اُن سے دینا اور آخرت میں ایس کا بدلہ  
لے گا۔ اب میں اس ملک میں نہ رہوں گا، بکہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسرے  
ملک میں چلا جاؤں گا۔ آپ نے اپنی روانگی سے پہلے، ملک سندھ کو جہاں  
آپ کی دو بیویاں مقیم تھیں، اس ملک سے اپنی ہجرت کرنے کی اطلاع لکھ کر  
روانہ کر دی اور پھر سب غازیوں کو جمع کر کے بطور وعظ یہ فرمایا کہ اے مسلمانو!

لے ہجرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۲، ۲۲۵

اللہ تعالیٰ نے تم کو اس عبادتِ جہاد میں میرا شریک فرمایا اور گرم دوسرو اور رنج و راحت اور فوج و شکست میں محض باری تعالیٰ کی مرضی کے لیے تم آج تک میرے شریک رہے اور سعی، نصرت اور شراکت کا حق پورا ادا کیا۔ اب میں اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ملک دُور دراز میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور یہ بھی نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ مجھے کہاں لے جائے گا.... جو شخص ایسی تکالیف جسمانی و نفسانی پر صبر نہ کر سکے اُسے اختیار ہے جہاں چاہے جائے۔ مگر عرب کے علاوہ اس وقت کوئی جگہ امن کی نظر نہیں آتی؛ لے

جناب غلام رسول مہرنے اُس وقت کے حالات اور سید صاحب کے تاثرات یوں بیان کیے ہیں :

پانچ چھ روز کے بعد اخوندزادہ قابل، ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر واپس آیا اور سارے حالات سید صاحب کی خدمت میں عرض کیے تو آپ کے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ فرمایا: کچھ اور چار برس ہم ان لوگوں کی اصلاح میں لگے رہے، وعظ و نصیحت کی، ان کے دین اور دنیا کی بھلائی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا، لیکن یہ لوگ اتنے سخت دل اور ہدایت سے بے بہرہ ہیں کہ کچھ اثر نہ ہوا۔ اب ہم کس کس سے بدلہ لیں؟ بہتر یہی ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کریں۔ وہ منعم حقیقی جس طرح چاہتے انتقام لے۔ سلطان محمد خاں پر حیف ہے کہ اُس نے خود سب کچھ نہیں بتایا اور عذر کیا کہ غلطی ہوئی، معاف کر دیجیے۔ بعد ازاں اُسی بہتان نامے کو دستاویز بنا کر صد ہا مسلمانوں کا ناحق خون کرایا۔ اس سے تو اس کا بھائی دوست محمد خاں ہی اب تک اچھا رہا کہ نہ ہم سے بھلائی کی اور نہ بُرائی۔ اب ان دگوں میں رہنا اچھا نہیں رہا کہ ہجرت کر کے جدھر اللہ چاہے گا، چلے جائیں گے؛ لے

۱۔ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷۸، ۲۷۹

۲۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۷۰۰



انسان اپنی یا کسی کی غلطی کو محسوس کرے تو اس سے بچنا ممکن رہتا ہے لیکن جب غلطی کی صحت پر اسے اصرار ہو تو یہ اصلاح کے مسدود و مفقود ہو جانے کا مقام ہوتا ہے اور ایسے جہل مرکب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمد جعفر تھانوی اور خصوصاً مہر صاحب کی نظر میں سراسر قصور وار ہیں تو مسلمانانِ ستہ اور خاص طور پر سلطان محمد خاں۔ چنانچہ جناب غلام رسول مہر تو اپنی مورت خانہ اور ادیبانہ شان کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ یَا بَیِّ ذَنْبٍ قَتَلْتُ یعنی یہ جماعت کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی؟ لیکن اگر موصوف سے کوئی سوال کرتا کہ ہزاروں مسلمانوں کو ان حضرات نے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا تھا اور انھیں جھوٹے الزاموں کا سہارا لے کر مسلمانوں کا امیر المؤمنین بن بیٹھنے اور بیعت سے انکار کرنے پر انھیں واجب اقتل ٹھہرانے کا حق کون سی شریعت نے دیا تھا؟ تو یہ حمایتی حضرات اس جہان میں یا خدا کی بارگاہ میں کیا جواب دیں گے؟ اس بارے میں اپنی عقیدت کو برقرار رکھنے کی خاطر سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کو زور قلم بچاتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی نے یوں حقیقت بیان کی ہے:

مولانا شہید نے تو اس محنت اور جان نثاری سے ملک پنجاب کے اتنے بڑے حصہ کو مسلمانوں کے لیے صاف کر دیا تھا اور نا تجربہ کاروں نے چند بے اعتدالیوں سے اپنی جانیں بھی کھوئیں اور مفتوحہ ملک چھڑا دیا، ایسا کہ تسمہ تک لگا ہوا باقی نہ چھوڑا۔ وہ عظیم الشان بہادر جس نے رعیت سگھ جیسے شیر پنجاب کے خونخوار پنجوں سے آنا بڑا ملک چھین لیا تھا۔ خرد باغ ملاؤں نے اس آسانی سے اپنی جانوں کے ساتھ اسے بھی کھو دیا۔

موصوف نے ان حضرات کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ان غفلتوں میں بھی تبصرہ کیا ہے:

حقیقت میں یہ صحیح ہے کہ نا تجربہ کاروں کی ہر اسی ایک مدبّر اعلیٰ کی لائق تدابیر کو بد نما لباس پہنا دیتی ہے۔ جو کچھ پیارے شہید نے کیا، اس کے کاموں کا بہت سا حصہ ہر عیب و خطا سے پاک ہے، ہاں بعض بعض امور ملکی میں اسے

سخت غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن پھر بھی اُن غلطیوں کا اثر اُسی کی ذات تک رہا، دوسرے اُس کے ساتھ جھگڑا۔ مگر حقیقت صدحیث، اُس کے ہمراہیوں نے تو لڈائڈ نلسن اور اپنی خود ماضی سے لٹیا ہی ڈبو دی اور ایسا ستیا ناس کر دیا کہ اُسے ملک پنجاب چھوڑتے ہی بن پڑا۔“ ۱

مرزا حیرت دہلوی نے اہم حدیث ہونے کی بنا پر اپنے مدد و حین کی خارجیت اور اُن کے نئے مذہب کا تو ذکر نہیں کیا لیکن جن سیاسی امور کا تذکرہ کیا ہے، اُن میں اس جماعت کے غلط طرز عمل کا حقیقت پسندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کیونکہ یہی چیز تو تھی جو ان کی تباہی کا باعث بنی، جبکہ غلام رسول مہرنے محض سخن سازی کے ذریعے حقیقت کو غمخیز کر دینے کی کوشش ہی کی ہے۔ قارئین کرام سے التماس کروں گا کہ اس کتاب میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد صاحب کے بارے میں راقم الحروف کی گزارشات کو سامنے رکھیں، جو دلائل اُن کی تصانیف یا اُن کے بارے میں دیگر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں، وہ مد نظر رہیں اور پھر حاکم پشاور، سلطان محمد خاں کے اس بیان کو پڑھیں جو اُس نے سید احمد صاحب کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر کیا تھا:

”جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں۔ تم لوگوں کا عقیدہ بُرا اور نیت فاسدہ ہے۔

بظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہو سس ہے۔ ہم نے خدا کے نام پر کمر باندھ لی ہے کہ تمہیں قتل کریں، تاکہ زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے۔“

جگہ بیاہ میں سلطان محمد خاں نے شکست کھائی، مصالحت ہونے پر حاکم پشاور نے بوقت

ملاقات سید صاحب کو ہندوستانی علماء کا ایک محضر بنا دیا۔ اُس میں کیا درج تھا؟ یہ جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنئے:

”اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے ایک فتویٰ یا محضر خریدنے سے نکال کر سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس پر بہت سی مہربانیاں ثبت تھیں۔ محضر

۱۔ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۷

۲۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۶۱۲

میں خواین سترہ سے خطاب تھا۔ مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر، مقوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ اُن کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیادین اُنہوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں ملتے، سب کو بُرا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اُنہیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ اُن کی باتوں میں نہ آنا۔ عجب نہیں تمہارا ملک چھوڑا دیں۔ جس طرح بھی ہو سکے، اُنہیں تباہ کرو۔ اگر اس باب میں غفلت اور سستی برتو گے تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔"

اس مضمون کی جو منہ صاحب کے لفظوں میں نقل کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ علمائے ہند نے سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے دعویٰ جہاد کو فریب کیوں بتایا؟

۲۔ اُن علمائے اس جماعت کا مذہب ہندوستانی اور سرحدی مسلمانوں کے مذہب کے خلاف بتایا۔

۳۔ ان جہاد کا دعویٰ کرنے والوں کے متعلق کہا کہ انہوں نے نیادین رائج کیا ہے۔

۴۔ سید احمد صاحب اور اُن کے رفقاء کو انگریزوں کے ایجنٹ قرار دیا۔

اگر یہ الزامات محض بے بنیاد تھے تو اس سے زیادہ سنگین الزام کسی مسلمان کھلانے والے

پر اور کیا لگایا جاسکتا ہے؟ چاہیے تھا کہ جناب غلام رسول مہر جیسا بال کی کھال نکالنے والا تاریخ دلائل کی روشنی میں ان دعویٰ کو بے بنیاد ثابت کر دکھاتا۔ لیکن موصوف نے اپنی ضخیم تصنیف میں بھان متی کا کتبہ جوڑنے اور اپنے مدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے توڑنے کی خوب کوشش کی لیکن ان الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے کے نام ہی سے دل دہنے لگتا ہوگا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہوگا۔ غیر جانے دیکھیے، یہ ہندوستانی علمائے خیالات تھے۔ علمائے پشاور کے سامنے ان حضرات کی گزشتہ تاریخ نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں کے سابقہ کردار

اور حالاتِ زندگی سے بے خبر تھے۔ پشاوری علماء نے ان حضرات کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ عین الیقین اور مشاہدات کی بنا پر قائم کی، علماء پشاور کے تاثرات ان حضرات کے بارے میں کیا تھے مہر صاحب کی زبانی سنئے۔

”شاہ اسماعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں جو پشاور کے دس علماء

کے نام بھیجے گئے۔ پہلا ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو دوسرا

۱۱ شوال ۱۲۴۵ھ (۱۱ اپریل ۱۸۳۰ء) کو۔ ان سے ظاہر ہے کہ ان علماء کی

طرف سے سید صاحب اور آپ کے رفقاء پر کئی الزام لگائے گئے تھے۔ مثلاً:

۱۔ سید صاحب اور آپ کے رفقاء الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی

مذہب و مسلک نہیں نقصانیت کے پیرو ہیں اور لذتِ جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم و تعدی کے خوگر ہیں۔

۳۔ بلاوجہ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۴۔ سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے۔ مولانا اسماعیل اور بعض

دوسرے لوگوں نے انھیں ہمدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے انھیں

مک سے نکال دیا۔

۵۔ وہ مکہ معظمہ پہنچے وہاں سے براہِ مسقط و بلوچستان قندھار گئے۔

۶۔ خادے خاں کو ملا عبد الغفور (اخوند سوات) کے ذریعے سے صلح کے

بہانے بلایا اور قتل کر دیا۔

۷۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً جدید الاسلام ہندوستانیوں کے حوالے

کرتے ہیں۔“

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مہر صاحب نے ان الزامات کو اپنے پسندیدہ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے تاکہ

وہ از خود ہی غلط نظر آنے لگ جائیں مثلاً۔ ”انگریزوں نے انھیں مک سے نکال دیا ہے۔“

یا مکہ معظمہ سے قندھار پہنچنا یا خادے خاں کو بلا کر قتل کرانا وغیرہ۔ موصوف نے ان الزامات کے

بارے میں اپنا فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے :

”ان الزامات کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ سراسر بے اصل ہیں  
مکن ہے یہ الزامات بھی اسی محضر سے ماخوذ ہوں، جو سلطان محمد خاں نے  
پیش کیا ہے“

اگر صاحب ذرا صاف گوئی سے کام لیتے اور الزامات کو پڑھ کر لڑھکا رہی نہ ہو جاتا،  
تو اس طرح بھی لکھ سکتے تھے کہ: ”علمائے سرحد کے الزامات کی تردید کرنے کی ہمارے کسی بڑے  
سے بڑے میں ہمت نہیں۔ اس لیے کہ الزامات حقیقت کے عین مطابق ہیں؛ اگر موصوف صرف  
اتنا لکھنے کی ہمت کر لیتے تو یہ ایک فقہ ان کی سولہ سالہ کاوش یعنی کتاب سید احمد شہید سے سولہ سو گنا  
بڑا کارنامہ ہوتا، لیکن مقدر نے یاوری نہ کی اور ۱۲۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں اپنے ناکِ حقیقی سے جا ملے۔  
موجودہ ولایتی علماء و مورخین علمائے سرحد کے الزامات پر حقائق کی روشنی میں غور و فکر کریں اور  
دیکھیں :“

اسپہ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالان  
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ غومی بنیم

جناب غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق سید احمد صاحب کی پیدائش  
 خوابِ نبوت تکبیرائے بریلی کے مشہور سادات خاندان میں، ۶ صفر ۱۲۰۱ھ / ۱۹ نومبر  
 ۱۷۸۶ء کو ہوئی۔ جب چار سال، چار ماہ، چار دن کے ہوئے تو پڑھنے کے لیے مکتب میں  
 بٹھائے گئے۔ ابتدائی تعلیمی حالت یہ تھی:

”کوششوں کے باوجود سید صاحب کی طبیعت تحصیلِ علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔  
 محزن احمدی کا بیان ہے کہ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے لیکن اس مدت  
 میں قرآنِ پاک کی چند سورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ  
 کے بڑے بھائی سید ابراہیم اور سید اسحاق بار بار لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے  
 رہتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اس تاکید کو بالکل بے سود سمجھ چکے تھے۔  
 چنانچہ وہ فرماتے ہیں: اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو، جو کچھ اس کے لیے مستحسن اور  
 اولیٰ ہوگا، ظہور میں آجائے گا۔ ظاہراً تاکید مفید نظر نہیں آتی۔“

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے آپ کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے:

”تین برس آپ مکتب میں رہے مگر سوائے قرآن کی چند سورتوں کے آپ کو کچھ

بھی یاد نہ ہوا۔“

مرزا میرتب دہلوی نے سید صاحب کی تحصیلِ علم کے بارے میں اپنی تحقیق یوں پیش کی ہے:

”یہ تعجب سے نظر کیا جاتا ہے کہ بزرگ سید بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ  
 سے پرلے درجے کا غبی مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا، اسے تعلیم دینا  
 بے سود ہے، کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں۔ میں ذہن کی بابت کوئی رائے  
 قائم نہیں کر سکتا، صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ سید کی بچپن میں کیا پوری  
 عنقریب جوانی میں بھی لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع نہ تھی۔“

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۶۱ ۲۔ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۵۲

۳۔ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۴

موصوف نے سید صاحب کے ذہن کے بارے میں اپنی کوئی رائے تو ظاہر نہیں کی لیکن سید صاحب کے علم سے کورسے رہنے اور ان کے ذہن کی کیفیت و تیزی ضرور بیان کر دی ہے۔ مثلاً وہ تصریح کرتے ہیں:

”یہ نہیں تھا کہ پیارا اور واجب الاحترام سید سبق کے یاد کرنے میں محنت نہ کرتا ہو اور شرارت سے ڈھیٹ بنا خاموش بیٹھا رہتا ہو۔ نہیں، وہ بخوبی محنت بھی کرتا تھا۔ میاں جی کے کہنے کے موافق مکتب کے وقت کی بھی پابندی کرتا تھا، اس پر بھی اُسے یاد نہ ہوتا تھا۔ اُس کے ذہن اور یادداشت کا یہ اتار چڑھاؤ دیکھ کے یہ خیال آتا تھا کہ جیسے چلتی گاڑی میں کوئی روڑا ٹکرا دیتا ہے اور پھر وہ سیلوں کی طاقت سے بھی نہیں چلتی، سوائے اس کے کہ اُس پر اٹھنا اور بھجے گا زور لگایا جائے تو پتہ دوچار اچھ زمین سے رگڑ کھاتا ہوا بمشکل آگے بڑھے گا۔ یہی کیفیت بعینہ بزرگ سید کی تھی۔ جب وہ ایک ایک سہلہ کرگھنٹوں جے جاتا تھا، تب کہیں کسی قدر یاد ہوتا تھا اور دوسرے دن تماشا یہ تھا کہ وہ بھی چپٹ۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو والدین اور میاں جی کی تعجب بڑھنے لگی اور گھر کی ہیرا کی، آنکھیں نکالنے سے گزر کے مارچٹ تک لوبت پہن گئی۔ اس سے بھی والدین کی آرزو پوری ہو ہوئی۔ جب اُنہوں نے یہ دیکھا کہ قدرتی طور پر اس کے دماغ میں قفل لگ گیا ہے اور یہ کسی طرح کی تہیہ سے بھی نہیں پڑھ سکتا تو ناچار ہو سکے پڑھنے سے اٹھایا اور زیادہ جبر کر کے معصوم جان کو گھٹانے نہ دیا جائے۔“

جناب غلام رسول مہر نے سید صاحب کی نوجوانی کے دور میں ذہنی اور تعلیمی حالت کے بارے میں جبکہ وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) کے پاس تھے یوں وضاحت کی ہے:

”مولوی عبدالقیوم کا بیان ہے، اثنائے تحصیل علم میں سید صاحب کی یہ کیفیت

لے حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۶

ہوئی کہ جب کتاب کو دیکھتے تو حروف ان کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی بیماری ہو گئی ہے۔ طبیعوں سے رجوع کیا گیا، مگر یہ کیفیت زائل نہ ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے فرمایا: جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر جماؤ اور دیکھو کہ وہ بھی نظروں سے غائب ہوتی ہیں یا نہیں؟ کوئی باریک سے باریک چیز غائب نہ ہوئی، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ جب کسی نیاز مند نے اس حکم کا سبب پوچھا تو فرمایا: اگر اور باریک چیزیں غائب نہیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ یہ مرض نہیں۔ ظاہر ایہ معلوم ہوتا ہے کہ علم ظاہری ان کی قسمت میں نہیں ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں مرزا حیرت دہلوی کا بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب بچپن تو کیا جوانی میں بھی علم کی دولت سے محروم رہے کیونکہ ان کے دماغ میں قفل لگا ہوا تھا۔ بائیس تیس سال کی عمر تک یہی تعلیمی کیفیت اور ذہنی حالت رہی۔ باقی عمر میں علم کے نزدیک تک جانے کی حمت ہی نہیں ملی۔ چونکہ حالت نیم مجذوبانہ تھی، اسی لیے ادعا سے نبوت کے لیے کسی کی نگاہوں میں چمک گئے۔ انگریزوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئی ہوں گی کہ نواب امیر خاں کی ملازمت کے دوران ہی الہامات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ادھر کسی انگریز حاکم کی طرف سے رازداری کی بات ہوتی، اُسے خدا کی طرف منسوب کر کے، الہام کے نام سے مشہر کرنا شروع کر دیا جاتا تھا۔ ادھر مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے مرادِ مستقیم کتاب لکھ کر موصوف کے اندر نبوت کے تمام اوصاف بدرجہ کمال بتا دیے بلکہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مثال ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا تھا۔ جب سوانح نگاروں اور عاشیہ برداروں کی باری آئی تو انہوں نے سید صاحب کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات میں ایسا رنگ بھرنا شروع کر دیا کہ اگر انہیں کوئی، بعد از خدا بزرگ توئی، کے منصب پر سرفراز نہ بھی سمجھے تو سرد کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برابر مانے بغیر تو چارہ نہ رہے۔ سید احمد صاحب ابھی

لے غلام رسول قہر: سید احمد شہید



شکم مادر میں تھے کہ اُس وقت بھی اُن کا وجود نورِ مصطفویٰ جیسا نظر آیا۔ چنانچہ یہی کچھ منوانے کی خاطر غلام رسول مہرنے وقائع احمدی کی ایک گھڑنت یوں مشتہر کی ہوئی ہے:

سید صاحب جب والدہ کے پیٹ میں تھے تو اُس محترم نے ایک روز خواب دیکھا کہ میرے خون سے ایک کاغذ نکلا گیا ہے جو تمام عالم میں اڑتا پھرتا ہے۔ اس پر مشوش ہوں۔ یہ خواب اُن کے داماد عبد السبحان نے سنا تو کہا کہ تشریش کی ضرورت نہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے پیٹ میں ہے، وہ دنیا میں بہت نامور ہوگا۔ ایامِ حمل تکمیل کے قریب پہنچے تو یکایک حمل کے ظاہری آثار میں کمی آگئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وضع کا زمانہ ابھی دور ہے۔ تھوڑے دن بعد سوکر اُٹھیں تو پھر پورے آثار نمودار ہو گئے۔ صفر کی چھٹی تاریخ کو سید صاحب پیدا ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کا خواب میں تو سید صاحب کو یہ حضرات کیسے پیچھے رہ جانے دیتے۔ لہذا خواب تیار کر لیا۔ لیکن یہ حضرات اگر فی تعبیر سے مس رکھتے تو اس خواب کو جس طرح فخریہ مشتہر کر رہے ہیں، اس سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتے، کیونکہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وارد ہونے والا کسبِ رزق کے بعض نہایت ذرائع کا مروج و موجد ہوگا، اس لیے کہ قرآن کریم میں جن چار اشیاء کی حرمت بجا مذکور ہے، اُن میں سے ایک (وَاللَّحْمَ) یعنی خون ہے۔ علاوہ بریں آنے والا يُفْسِدُ فِيهَا وَيُنْفِكُ الْدَّمَاءَ، یعنی فتنہ و فساد اور قتل و خوریزی میں شہرت و ناموری حاصل کرے گا۔ یہ ہے اس خواب کی تعبیر جس میں سے صرف شہرت و ناموری کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اب بیان مذکورہ کا دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ حقیقت محمدیہ چونکہ نور بکہ جان نور ہے۔ اسی وجہ سے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شکمِ مادر میں تھے تو ظاہری آثار کم ہی محسوس ہوئے اور ایامِ حمل کی تکالیف و ثقل وغیرہ میں سے کچھ نہ تھا۔ اگر سید صاحب کے بارے میں کوئی ایسی گھڑنت نہ کی جاتی تو غرر و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی مرتبے سے ان کا بناوٹی رتبہ کم رہ جاتا۔ اسی لئے

لے غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۶۰

قبل از وقت اس صفت و معجزے کا انتظام یوں کیا گیا:

بہر چند آپ (سید صاحب) کے استاد اور باپ بھائی، آپ کی تحصیل علم کے واسطے  
کوشش کرتے تھے مگر آپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ آثار اُمتیت، نبی اُمتی کے  
مثل، جو بطور میراث آپ کی جبلت میں امانت تھے روز بروز ظاہر ہونے لگے؛ لہ

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمتی ہونا، آپ کا معجزہ اور خصائص میں سے ہے۔ غیر انبیاء کا ان پڑھ  
رہنا نقص اور محرومی ہے۔ سید صاحب کی محرومی پر پروردگار نے ڈالنے کی غرض سے اُن کی اُمتیت کا ڈھونگ  
رچانا ایک بدترین جبارت ہے۔ اگر محبوب پروردگار سے اس طرح مشابہت قائم کی جانے لگے تو دنیا  
کے کون سے جاہل اجڈ کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نظیر منوانے کی کوشش نہ کی جاسکے گی؟  
کیا زید و عمر کو آپ جیسا بتانے کی قیامت برپا نہ ہونے لگے گی؟ محمد جعفر تھانیسری نے اُمتیت کا  
افسانہ خود نہیں لکھا بلکہ مولانا محمد اسمعیل دہلوی نے ہی اس طائفہ کو یہ سبق پڑھایا ہے:

از لیکہ نفس عالی حضرت ایٹاں برکمال	چونکہ آپ (سید صاحب) کی ذات
مشابہت جناب رسالتکتاب علیہ	والاصفات ابتدائے فطرت سے
افضل الصلوٰۃ والتسلیمات و بدو	جناب رسالتکتاب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات
فطرت مخلوق شدہ بنا علیہ لوح	کی کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی،
فطرت ایٹاں از نقوش علوم رسمید و	اس لیے آپ کی لوح فطرت، علوم
راہ دانشمندان کلام و تحریر و تفسیر	رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندان
مصنعی ماندہ بود۔ لہ	کی راہ و روش سے خالی تھی۔ لہ

سید صاحب ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۶ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے  
جب حضرت شاہ صاحب نے موصوف کو ابتدائی مشاغل کی تعلیم و تربیت دینی شروع کی اور

لہ محمد جعفر تھانیسری، مولانا: حیات سید احمد شہید، ص ۵۲

لہ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: صراط مستقیم، مطبع ضیائی، ۱۲۸۵ھ، ص ۴

لہ صراط مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۸۸

تصویر شیخ کی تعلیم فرمانے لگے تو سید صاحب کو آسمان پر بٹھانے کی غرض سے ان کے سر ایک عجیب و غریب واقعہ منظر دیا گیا۔ مثلاً محمد جعفر تھانیسری کیسی سیدھی سادی بات کا بنگلہ اور رانی کا پہاڑ بنا کر یوں دکھاتے ہیں:

”اس کے بعد شغلِ برزخ کہ جس میں تصویر شیخ کا مراقبہ کرتے ہیں، آپ کو تسلیم دینی چاہی، اُس وقت سید صاحب نے بہت ادب اور عاجزی سے مولانا سے عرض کیا کہ اس شغل میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اُس میں صورت سنگی یا قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صورت خیالی، جو تہہ دل میں جگہ پکڑتی ہے، تعظیم کی جاتی یا پوجی جاتی ہے۔ تب مولانا نے یہ شعر حافظ شیرازی کا پڑھا، سہ

بے سجاوہ رنگیں گن گرت پیرمغاں گوید  
کہ ساک بے خبر بود ز راہ و رسم منزلہا

تب سید صاحب نے عرض کیا کہ اگر حکم سے نوشی کا جو گناہ کبیرہ ہے، کیجیے تو اس کی تعمیل کو بھی حاضر ہوں مگر یہ عمل تصور تصویر شیخ کا، خصوصاً غیبت شیخ میں اُس تصویر سے توجہ اور استعانت چاہنا جو بعینہ بت پرستی اور شرکِ صریح ہے، منجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے جواز کے واسطے کوئی سند قرآن و حدیث یا اجماع امت کی موجود ہو تو بھی مضائقہ نہیں ہے۔ اس تقریر کے سننے اور سمجھنے کے بعد مولانا صاحب نے سید صاحب کو اپنی بغل میں لے کر اور آپ کے رخسار اور پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا کہ اسے فرزند و بلند اجرت حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و انعام سے ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء کی جو افضل ولایتوں کی ہے، تم کو عطا کی ہے۔ اُس وقت سید صاحب نے مولانا مدوح سے عرض کی کہ ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء میں فرق کیا ہے؟“

جناب غلام رسول مہرنے اس واقعے کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

لے جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۶۱۰

پھر شغل برزخ کا حکم ہوا، جس میں صورتِ شیخ کا تصور سو فیہ میں مروج تھا۔ تصور صورتِ شیخ کا حکم سنا تو سید صاحب نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت! اس شغل اور بت پرستی میں کیا فرق ہوا، منسل ارشاد ہو۔ شاہ عبدالعزیز نے جواب میں خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا: س

برے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغان گوید  
کہ ساکب بے خیر نبووز راہ در رسم منزلہا

سید صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہر حال فرماں بردار ہوں، اس لیے کہ کسب فیض کی غرض سے آیا ہوں، لیکن تصورِ شیخ تو صریح بت پرستی معلوم ہوتا ہے۔ اس خدشے کو زائل کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل پیش فرمادیں، ورنہ اس عاجز کو ایسے شغل سے معاف رکھیں۔ شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی سید صاحب کو سینے سے لگایا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا: اسے فرزندِ احمد! خداے برتر نے اپنے فضل و رحمت سے تجھے ولایتِ انبیاء عطا فرمائی ہے! ل

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے پروپیگنڈے کو مخزن احمدی اور وقائع احمدی میں محفوظ کیا گیا۔ وہابی علماء و مورخین نے ان بیانات کو وحی الہی سمجھ کر، راہِ طریقت سے نا آشنا ہونے کی بنا پر، بعینہ نقل کرنا، ماننا اور منواتا شروع کر دیا۔ ان تقریروں سے واضح ہو رہا ہے کہ سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے جملہ معتقدین، بیعت، شغل برزخ، کسب فیض، ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء کے معانی و مفہوم سے مطلقاً ناواقف ہیں اور جن حضرات کو اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہیں وہ اپنے بڑوں کی بے راہ روی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے رہتے ہیں۔ جہلا کہاں تصور اور کہاں یہ قیل و قال؟ وہاں تو کسی فتافی اللہ کے ہاتھ پر بکنا ہے بکنا نہیں۔ یہ مکالمہ محض اسی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ ان بزرگانِ دینی

لے غلام رسول قر: سید احمد شہید، ص ۶۹، ۸۰۔

اور خلاصہ روزگار ہستیوں سے سید صاحب کو ممتاز ثابت کیا جائے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ولایت، خاص قُربِ خداوندی کو کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو انبیائے کرام کو اعلانِ نبوت سے پہلے اور نبوت کے ساتھ حاصل ہے، اسے ولایتِ انبیاء کہتے ہیں اور دوسری جو غیر انبیاء کو حاصل ہوتی ہے، اسے ولایتِ اولیاء کہا جاتا ہے۔ سید صاحب کے لیے ولایتِ انبیاء ثابت کرنا اور وہ بھی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سچے دلاور است و زورے بکف چراغِ وارِد والا معاطر ہے۔ یہ محض اپنی بدعتی کے لیے حضرت شاہ صاحب کی آڑ لی گئی ہے۔

سب سے دل چھیننے والی ادا کہ تصورِ شیخ کو سید صاحب نے صریح شرک اور بت پرستی بتا کر گویا سارے خاندانِ عزیزی دہلوی کو، اُن کے مجاہد پیرانِ عظام کو، حتیٰ کہ حضراتِ مجددِ عالم تانی قدس سرہ ایک کو صریح مشرک و بت پرست ٹھہرا دیا، لیکن کسی سوانح نگار نے یہ تصفیہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اس گمراہی کے بعد جب حضرت شیخ مجددِ سرہندی سے لے کر شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم تک کو مشرک اور بت پرست ٹھہرایا جاتے یا سید احمد صاحب و مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے آج تک کے دنیا بیوں کو اکابرِ اہلسنت کا مخالف، ولی اللہی خاندان کو مشرک و بت پرست کہنے والے اور تصوف کی اہلکے بھی بے بہرہ مانا جائے، بہر حال جس شعلِ بدعت کا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۴ء) نے القول الجلیل میں کج خداوندی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا، اسی کے مانشیہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سب سے سیدھا راستہ بتایا، حضرت امام زبانی علیہ السلام نے بھی سرورِ ملتوی (۱۱۰۶ھ) نے اپنے ایک مرید کو اس کی مشق ہونے پر تحریر فرمایا تھا کہ یہ دو وقت خوش نصیب لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اسی کو اگر کوئی ازراہِ سبغری مشرک و بت پرستی بتاتا ہے تو ایسے حضرات سے سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ،

لُفِی مے تجھ سے کیا کہوں زاہد!  
ہاتے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں

غلام رسول مہرنے اس معاملے کو سلجھانے کی غرض سے کچھ سخن سازی سے کام لینے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن جس طرح ایک فلسفی جتنا عقلی دلائل سے ڈور کو سلجھانا چاہتا ہے اسی قدر الہیات کی ڈور اور الجھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ مہر صاحب کو ذرا پیش آیا، وہ سلجھانے بیٹھے لیکن سرِ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، دیا بل نہ سکا، اسی لیے ڈور کو مزید الجھاتے ہی گئے۔ مثلاً اس سلسلے میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ:

”لکن ہے اس سے کسی صاحب کو دوسو برس پیدا ہو کہ شاہ عبدالعزیز جیسا یگانہ

عالم دین اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ تصور صورت شیخ کے لیے قرآن و حدیث

میں کوئی سند موجود نہیں یا اس تصور کو عام صنم پرستی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

میں اس بارے میں تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیال یہ ہے کہ صوفیہ نے طائب کی

توجہ جمانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے، ان میں سے ایک طریقہ تصور صورت

شیخ کا بھی تھا، جس سے یہ بزرگ کام لیتے رہے۔ شید صاحب کی طبیعت اتنی

پاک و مزگی تھی کہ اسے قبول نہ کر سکی۔ شاہ صاحب چونکہ طبیب حاذق تھے،

اس لیے سمجھ گئے کہ یہ دوا سید کے مزاج کے لیے سازگار نہ ہوگی، لہذا اسے

چھوڑ دیا۔ جب یہ مقصود دوسرے طریقوں سے بزوجہ احسن حاصل ہو سکتا تھا

تو تصور شیخ پر اصرار کی ضرورت نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ جس

عمل کے لیے کتاب و سنت میں کوئی مبنی موجود نہ ہو، ہر مذہبی اسلام کے نزدیک

لازمًا ناقابل قبول ہونا چاہیے، کیونکہ دین کا ماخذ کتاب و سنت ہیں، نہ کہ کسی

طبع کا عمل۔“

قطع نظر اس کے کہ شعل برزخ کا ثبوت کتاب و سنت میں ہے یا نہیں، وہابی مدعیان کی تصریحات

کے مطابق اس صنم پرستی کی زد میں سب سے زیادہ امام ربانی حضرت مجدد العت ثانی قدس سرہ

آتے ہیں، جنہوں نے تصور شیخ کو باقاعدہ طور پر اپنی تعلیمات کا ایک جز بنا لیا اور اس میں مہارت

مٹے غلام رسول قہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۸۰

حاصل کر لینے والوں کو خوش نصیب بتاتے رہے۔ اس نشانے پر آتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے جلد مشایخ جن سے آپ نے یہ شغل سیکھا، اپنے مریدوں کو سکھایا اور اپنی کتاب "القول الجمیل" میں اسے قرب الہی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ٹھہرایا۔ اس کی زد میں آتے ہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو اسے قرب خداوندی حاصل کرنے کا سب سے سیدھا اور آسان راستہ بتاتے تھے اور عمر بھر اس کے عامل و مبلغ رہے۔ مہر صاحب بتاتے ہیں کہ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور مز کی تھی کہ شغل برزخ کو قبول نہ کر سکی۔ گویا حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم کی طبیعتیں ناپاک اور گندی تھیں کہ اس بت پرستی کو وہ حضرات قبول کرتے رہے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ حقیقت یہ ہے کہ وہابی حضرات خواہ مخواہ تصوف کے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھے ہیں جبکہ وہابیت اور تصوف دونوں متضاد چیزیں ہیں مہر صاحب نے اپنے بارے میں ذرا جرأت سے کام لے کر یوں اعتراف بھی کیا ہے:

"ان تمام امور یا شغل برزخ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ خود اس کچھ سے نابلد ہوں۔"

جلد حالات و کوائف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس سارے ڈرامے کی ابتدا مولوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۸ء) سے ہوئی۔ حقیقت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ویسے اس قسم کے سازشی معاملے کاموں سے ہی پہچانے جاتے ہیں ورنہ جعفر صادق کو کس نے انگریزوں سے معاہدہ کرتے دیکھا تھا اور کون سا تحریری ثبوت ان کی انگریز دوستی اور ملک و ملت فرودشی کا دیا جاسکتا ہے، موصوف سے سر ڈیوڈ انگریزوں وغیرہ نے تعلقات پیدا کر کے آمادہ کیا ہوگا۔ انہوں نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کو تیار کیا۔ موصوف نجد کے محمد بن عبدالوہاب اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی تحریکوں سے متاثر تھے یا متاثر ہو گئے۔ سید احمد صاحب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

طے غلام رسول تہرہ: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۷۹

کے دستِ حق پرست پر سبیت ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے ان کی نیم مجذوبانہ حالت دیکھی تو اس ڈرامے کا اہم ترین پارٹ ادا کرنے کے لیے وہ بڑے موزوں نظر آئے ہوں گے۔ مولوی عبدالحی و محمد اسماعیل صاحبان نے انہیں سرانگھوں پر جگہ دے کر رغبت دلائی ہوگی کہ وہ ایک اصلاحی تنظیم بنانا اور ہم چلانا چاہتے ہیں۔ موصوف کے رضامند ہونے پر تیلیٹ قائم ہو گئی۔

سید احمد صاحب چونکہ غیر معروف تھے لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے کچھ فیضیاب ہونے لگے ہوں گے کہ اس پیکر میں چھنس گئے۔ یار لوگوں نے حضرت شاہ صاحب کے فیضان کا نام کر کے اپنی مقصد برآری کے لیے سید صاحب کو آسمان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ ان کے ہر معمولی واقعے کو کرامت اور معجزہ بنا کر دکھایا جاتا۔ ان کی پاکی کے پیچھے پیچھے دوڑنا اپنی سعادت بتاتے، موصوف کے آگے خود دم نہ مارتے۔ جب علماء کو یہ کچھ کرتے دیکھا گیا تو بہت سے لوگ عقیدت کے جال میں پھنسنے لگے اور خاصی شہرت حاصل ہو گئی۔

سید احمد صاحب کو آسمان پر بٹھانے اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے تھلا بنے ملا کر جمعیت فراہم کرنے کی غرض سے ان کے طعوظات کا بہانہ کر کے مولوی عبدالحی و مولوی محمد اسماعیل صاحبان نے صراطِ مستقیم کتاب گھڑی اور اس میں بڑی رازداری کے ساتھ اپنے پیر کو انبیاء کرام کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ دعویٰ صرف امامت کا تھا لیکن صفات نبوت کی ثابت کی جا رہی تھیں۔ مثلاً ایک جبارت ملاحظہ ہو:

صدیق من وجہ انبیاء کا پیر و اور من وجہ	صدیق من وجہ مقلد انبیاء می باشند و
شرعیات کا محقق ہوتا ہے۔ پس اگر	من وجہ محقق در شراعیح - پس اگر
صدیق زکی القلب ہوگا تو وہ مخصوص	صدیق زکی القلب ست رحنا و
اقوال اور افعال میں خدا سے تعالیٰ	کراہیت حضرت حق در افعال و
کی خوشنودی اور نارضا مندی کو	اقوال مخصوص و صحت و بطلان در
اور مخصوص عقائد کے صحیح اور غلط ہونے	عقاید خاصہ و محمودیت و مذمومیت در
اور خاص لوگوں کے عادات اور استعداد	اخلاق و ملکات شخصہ بنور جبلی خود دریافت
کے بھلا بُرا ہونے... کو اپنی طبیعت	می نماید۔

سید احمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۳۸



ذرا آگے چل کر اسی امر کو تفصیل سے بیان کیا اور یوں دن دہاڑے قیامت ڈھائی ہوئی ہے :

پس احکام میں امور مذکورہ اور ابدو  
وجہ معلوم می شود ، یکے بشہادت  
قلب خود خصوصاً و دیگر بسبب اندراج  
اودر کلیات شرع عموماً ۔ و علم کہ بوجہ  
اؤل حاصل شدہ تحقیقست وثانی  
تعلیدی ۔ و اگر زکی العقل سنت نور  
جہلی اؤلبوسنے کلیات اؤرار مہمونی  
می فرماید ۔ پس علوم کلیہ شرعیہ و حکم  
و احکام قلت اؤرا شاگرد انبیاء ہم می  
توان گفت و ہم استاد انبیاء ہم  
و نیز طریق اخذ انہم مشعب الیت  
از شعب وحی کہ آن را در عرف  
شرع بنفت فی الردع تعبیر  
می فرمایند ذلیعنے اہل کمال  
آزا بوحی باطنی می نامند ۔

کے نور سے معلوم کر لیتا ہے ۔ لہ

پس این امور مذکورہ کے احکام ان کو  
دو وجہ سے معلوم ہوتے ہیں ۔ ایک  
تو دل کی شہادت سے جو خاص کر  
ان امور سے متعلق ہے ۔ دوم عام  
طور پر کلیات شرع میں ان کے  
مندرج ہونے کے سبب سے ۔  
اور جو علم کہ پہلے طریق سے اُس کو  
حاصل ہوا ہے وہ تحقیقی ہے اور جو  
علم کہ دوسرے طریق سے حاصل  
ہوا ہے وہ تعلیدی ہے ۔ اور وہ  
صدیق زکی العقل ہے تو اُس کے  
طبعی نور کی ان کلیات حقہ کی طرف  
رہنمائی کی جاتی ہے ۔۔۔۔ پس کلیات  
شرعیہ اور احکام دین میں اُس کو  
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا شاگرد  
بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کا ہم استاد  
بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اور نیز اُس کے  
اخذ کا طریق بھی وحی کی شاخوں میں  
سے ایک شاخ ہے ، جس کو

۱۔ صراط مستقیم اردو ، ص ۸۸

۲۔ محمد اسماعیل دہلوی ، مولوی : صراط مستقیم ، ص ۲۹

شریعت کی اصطلاح میں لغت فی  
الروح کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور  
بعض اہل کمال اس کو وحی باطنی  
کہتے ہیں۔

مذکورہ دونوں عباراتوں میں موصوف نے تصریح کر دی کہ ایسے افراد کو نبی کا متعلقہ اور انبیاء  
کی تقلید سے آزاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُسے اپنے نورِ جہتی سے کتاب و سنت کے بغیر خود بھی  
باری تعالیٰ کی رضامندی و ناراضگی اور عقاید و افعال و اقوال کا اچھا یا بُرا ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔  
چونکہ بعض علوم ان حضرات کو انبیاء کرام کی وساطت کے بغیر ہی اپنے قلب کی شہادت سے  
حاصل ہو جاتے ہیں اسی لیے جہاں انھیں انبیاء کرام کا شاگرد کہا جاسکتا ہے وہاں انبیاء  
کرام استناد بھی کہہ سکتے ہیں۔ براہِ راست شریعت حاصل کرنے کے اس شعبے کو لغت فی الروح  
اور وحی باطنی کہا جاتا ہے۔ موصوف کی یہ تصریحات عقاید اہلسنت و جماعت کے سراسر خلاف  
غیر انبیاء کو نبی بتانا اور دوافض کا مذہب قبول کرنا ہے۔ موصوف کی اصطلاح میں اخسند  
علوم شرعیہ کے اس طریقے کو حکمت کہتے ہیں اور اس مرتبے کو امامت و وصایت سے تعبیر کرتے ہیں۔  
چنانچہ آگے دیکھتے ہیں:

اس معنی کو امامت اور وصایت کے  
ساتھ تعبیر کیا کرتے ہیں اور ان کے  
علم کو جو بعینہ پیغمبروں کا علم ہے، لیکن  
ظاہری وحی سے حاصل نہیں ہوئے لہذا  
حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ہیں معنی را امامت و وصایت تعبیر  
می کنند علم ایشان را کہ بعینہ علم  
انبیاء است لیکن وحی ظاہری  
متعلق نشدہ بہ حکمت می نامند۔

۱۔ مراد مستقیم، اردو: ص ۸۹

۲۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: مراد مستقیم، ص ۸۰

۳۔ مراد مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۹۱

کیا فرماتے ہیں دیوبندی، اہلحدیث اور جماعت اسلامی کے مفتی صاحبان و محقق حضرات اور حقانیت کے علم بردار بننے والے! اگر مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی محبت آپ حضرات کے دلوں میں گوسالہ سامری کی طرح سما نہیں گئی ہے اور آپ حضرات نے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر دہلوی موصوف کے دین کو ترجیح نہیں دے دی ہے تو کیا مذکورہ بیانات و اعلانات کے خلاف اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ ہے؟ کیا یہ غیر انبیاء کو مقام نبوت پر فائز کرنا نہیں ہے؟ کیا روافض کے علاوہ کوئی گمراہ سے گمراہ فرقہ بھی ان تصریحات کی تائید کرے گا؟ یہ آپ کی دینداری کے امتحان کا موقع ہے کہ آپ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں یا اپنے نبوت بانٹنے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی ہی آپ کی نظر میں سب کچھ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ تو اس بارے میں یہ ہے:

بمعرفت احکام شرعیہ بدوں تو سبیط ..... احکام شرعیہ کا معلوم ہونا، نبی کی  
نبی ممکن نیست۔ لہ ..... وساطت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اہلسنت و جماعت کے مایہ ناز محقق علامہ عبدالغنی نابلسی علیہ الرحمہ یوں فرماتے ہیں:

هذا القول كقول لا محالة ..... یہ قول باجماع امت کئی طرح  
بالاجماع من وجوه منها دعوى ..... کفر ہے۔ ان میں سے ایک وجہ  
تلقى الاحکام الشریعیۃ من ..... یہ ہے کہ اس میں نبی کی وساطت  
اللہ تعالیٰ بلا واسطہ نبی ..... کے بغیر اللہ تعالیٰ سے شرعی احکام  
وذلك دعوى نبوة - ملخصاً ..... معلوم کر لینے کا ادعا ہے اور یہ نبوت  
کا دعویٰ کرنا ہے۔

دہلوی موصوف نے اسی پر پسی نہیں کی بلکہ اپنے مددعین کو انہوں نے وحی باطنی سے سرفراز کر کے پیغمبروں کی طرح معصوم بھی بنا دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے خود یوں وضاحت کی ہوئی ہے:

۱۔ عبدالعزیز محدث دہلوی، مجدد: تفسیر عزیزی، جلد اول، ص ۴۲۴

۲۔ عبدالغنی نابلسی، امام، حدیقہ ہدیہ، ص ۲۱۱

لابد اور ابحافظتے مثل محافظت انبیاء  
 کہ مسملی بہ عصمت است فائز کنند  
 پس وہ ضرور انبیاء کی اُس محافظت  
 جیسی گمبانی کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے  
 جس کو عصمت کہا جاتا ہے۔

اسی وحی باطنی اور انبیائے کرام جیسی عصمت کو پراسرار طریقے سے اپنے پیرو سید احمد صاحب  
 تک پہنچانے کی خاطر مولوی محمد اسمعیل دہلوی نے ایسے حضرات کی موجودگی کا یوں صراحت سے  
 بیان دیا تھا،

ندانی کہ اثبات وحی باطن و حکمت و  
 وجاہت و عصمت مرغیر انبیاء را  
 مخالف سنت و از جنس اختراع بدعت  
 است . . . . . و ندانی کہ ارباب  
 این کمال از عالم منقطع شدہ  
 اندر تہ  
 یہ نہ سمجھنا کہ باطنی وحی اور حکمت اور  
 وجاہت اور عصمت کو غیر انبیاء کے  
 واسطے ثابت کرنا خلاف سنت اور  
 اختراع بدعت کی جنس سے ہے  
 . . . . . اور یہ مت سمجھنا کہ اس کمال والے  
 لوگ جہان سے منقطع ہو چکے ہیں۔

مولوی محمد اسمعیل دہلوی نے اپنے پیر جی کے لیے وحی و عصمت وغیرہ نبوت کے تمام  
 لوازمات تو جمع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسی کرامتیں گھر گھر سنانی شروع کر دی تھیں کہ  
 معجزات کو بھی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھیں۔ ان حالات میں ایک خدشہ ضرور تنگ کرتا تھا کہ  
 اجنبی تک سارا معاملہ زبانی جمع خرچ حکم محدود تھا اور حقیقت کے میدان میں اُس کا کوئی شاہد  
 بھی نظر نہیں آسکتا تھا، وہیں حالات یہ تصور پریشان ضرور کرتا ہو گا کہ اگر کسی نے آجکل میں ایسی  
 کرامت کا مطالبہ کر دیا جس کی صحت کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جاسکے یا امیر سلطنت بننے  
 کے بعد جب نبوت کا دعویٰ کیا جائے گا تو اُس وقت معجزہ طلب کرنے والے کو طاقت استعمال  
 کرنے کے علاوہ اور کیا جواب دیا جاسکتا ہے، چنانچہ قبل از وقت اُس کی پیش بندی یوں

۱۔ محمد اسمعیل، مولوی، صراطِ مستقیم فارسی، ص ۴۱  
 ۲۔ محمد اسمعیل، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۴۲  
 ۳۔ صراطِ مستقیم اردو، ص ۹۳  
 ۴۔ صراطِ مستقیم اردو، ص ۹۴، ۹۵

فیضانِ غضب کے عالم میں فرمائی جاتی ہے،

اور جس شخص سے مجرہ و کرامت نہ ہو اس کو پیغمبر اور ولی نہ سمجھنا وغیرہ یہ ہزاروں زمین اور عادات میں سب یہود اور نصاریٰ اور مجوس اور منافقوں کی اور مکہ والے اگلے مشرکوں کی ہیں اور سوا اس کے اور ہزاروں رسمیں ہندوؤں کی ہیں کہ لوگوں نے اپنے یہاں رائج کر لیں کہ پیغمبر خدا ایسی باتوں کے مٹانے، ایسی ہی رسموں کے دفع کرنے کے لیے آئے اور قرآن نازل ہوا۔ پھر جو شخص ایسی رسمیں اور عادات اختیار کرے اور مسلمانوں میں جاری کرے تو وہ شخص اس حدیث کے بموجب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغضوب ہے، راندا گیا، خدا کے غضب میں گرفتار اور خدا کے دشمنوں میں شمار ہوتا ہے۔

اپنے امام کی اس ستم ظریفی پر وہابی حضرات دلا تو خوب دیتے ہوں گے کہ جس شخص سے کرامت ظاہر ہو اسے ولی اور جو مجرہ نہ دکھائے اسے نبی ماننے سے لوگ انکار کریں تو یہ منجملہ ان باتوں کے ہے جن سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بقول دہلوی صاحب منع فرمایا تھا۔ کیا وہابی حضرات ہمیں کس روئے کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی دکھانے کی زحمت گزارا کریں گے جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ میرے بعد جب کوئی نبی آئے اور وہ تمہیں مجرہ نہ دکھائے تو اس کی نبوت کا انکار کرنا اگر کوئی زمین کا کوئی وہابی، کوئی مولوی اسماعیل دہلوی کا عقیدت مند میں ایسی ایک ہی حدیث دکھا دے تو ہم اس کے پیغمبر ہونے کے قیاس نہ لے سکتے۔

مثلاً مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کی خاطر سیکڑوں جھوٹ بولنے پڑے ہیں۔ اس کی واضح مثال دہلوی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت بھی ہے، جس میں اذعانے نبوت کے فراڈ کو چھپانے کی خاطر بیسیوں جھوٹ بولنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو ایسی عادت بد سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)۔ معراج ہمارے آقا و مولیٰ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ

لے سلطان خاں، مولوی، تذکیر الاخوان اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۳، ۲۳۴

تعالیٰ علیہ وسلم کے عظیم معجزات سے ہے۔ معراج شریف میں جہاں تک آپ کی رسائی ہوئی وہاں تک کسی دوسرے نبی تو کیا کلیم و خلیل علیہا السلام جیسے جلیل القدر اور اللہ تعالیٰ کے لاڈلے پیغمبروں کو بھی نہ ہوئی۔ لیکن وہاں بیت ہی کیا ہوئی جو حبیبِ خدا سے اپنے پیغمبر کو بڑھا کر نہ دکھاتے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ لَيْكِنِ ابْنِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَفَرُوا بِالْحَقِّ فَنَسُوا حَظًّا فَمَا بُدِيَ لَهُمْ مِنْ عَذَابٍ إِلَّا جَهَنَّمَ كَانُوا فِيهَا يُرْسَبُونَ

نسبت پر خود تا اینکہ روزے حضرت	ایک دن حضرت حق جل و علا نے
جل و علا دست راست ایشان را	آپ کا داہنا ہاتھ خاص اپنے
بدرست قدرت خاص خود گرفته و چپے	دست قدرت میں پکڑ لیا اور کوئی چیز
را از امور قدسیہ کہ بس رفیع و بدیع	امور قدسیہ سے کہ نہایت رفیع اور
بود پیش روئے حضرت ایشان کرده	پر پیش تھی، آپ کے سامنے کر کے
فرمود کہ ترا ایمن چپیں داده ام و چپ ہائے	فرمایا کہ ہم نے تجھے ایسی چیز عنایت
دیگر خواہم داد۔ لے	کی ہے اور اور چیزیں بھی عطا کریں گے

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی ایسی گہرنت کو موصوف کے اولین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی میں بھی خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب کراچی سے حیات سیتا احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے، جس کا مقدمہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے۔ مذکورہ بیان اس کتاب مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ یہاں میں علمائے دین کہلائے ہوئے ان حضرات کی توجہ اس جہارت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو مولوی اسماعیل دہلوی کی محبت و عقیدت میں شرعی حدود کو توڑ کر بہت دور جا چکے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہ سے مصافحہ کرنا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر لین دین کا شرف خلاصہ نوع انسانی یعنی حضرات انبیائے کرام علیہم السلام میں سے بھی کسی کو حاصل

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۷۵

لے صراطِ مستقیم اردو: ص ۲۷۰

ہوا تھا، اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے، بصورت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام  
بلکہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سید احمد صاحب کا درجہ کونسی بیانت واری کے تحت  
بندوبالادکھایا جا رہا ہے؟ کیا روزِ محشر کسی فرضی قصے کہانی کا نام ہے؟ کیا باری تعالیٰ جہاں آفرین  
کی بارگاہ میں مرنے کے بعد ایک روزِ محضری اور باز پرس نہ ہوگی؟

سہ پند ہا داویم و حاصل شد فراغ  
مَاعَلَيْنَا يَا أَخِي إِذَ السَّبْلَاغِ

قرآن کریم میں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ جب  
تَرَدَنِي فَتَدَنِي فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ كِي وہ رفعت حاصل ہوئی جو کائنات میں سے  
کسی فرد کو حاصل ہوئی نہ حاصل ہو سکتی ہے تو دہلوی صاحب کو سرورِ کون و مہکلاں صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ انفرادیت ایک انکوہ بھائی اور اپنے نیم مجذوب پیر، سید احمد صاحب کا  
اللہ جل شانہ سے مصافحہ اور لہجہ دین جا کر واپس آنا اور حجبِ محبوب پر دروگاہ کو دہنی کی گودی  
میں لے کر فنا کے لنگر اٹھائے جا رہے تھے تو فناؤ حنی الی عبیدہ مَا أَوْحَىٰ كَا عِدِيمِ النَّظِيرِ  
منصبِ مرحمت ہوا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے سوچا کہ ساری کائنات میں سے یہ منصب  
اگرچہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا لیکن پیر جی کے لیے یہ مقام ثابت نہ کیا تو افراتو افر کی خوشین  
لارڈ وادن ہیٹنگ سے ملی ہے وہ اور کس کلام کہے گی؟ لہذا صاف لکھ دیا کہ  
مکالمہ و مسامرہ بیستہ می آید۔ لے ہم کلامی اور سرگوشی کے سر و پیا  
ما تھ آتے ہیں لے

دوسرے مقام پر حقیقی ہم کلامی کی موصوفت نے یوں تصریح کی ہوئی ہے اور وہ بھی ایک آدھ بادر  
نہیں بلکہ بار بار :

گا ہے کلام حقیقی ہم پیشود۔ لے اور کبھی کلام حقیقی بھی ہو جایا کرتا ہے لے

لے محمد اسماعیل، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۱۳ لے صراطِ مستقیم، اردو، ص ۲۶

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۱۵۲ لے صراطِ مستقیم، اردو، ص ۳۲۲

حالانکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ باتیں کسی غیر نبی کے لیے ثابت کرنا کفر ہیں جس پر اُمتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ ملتِ اسلامیہ کے اس اجماعی عقیدے کو محدث کبیر حضرت قاضی عیاض ماکی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

فذلك كفر باجماع المسلمين  
وكذلك من ادعى مجالسه  
الله تعالى والعروج اليه  
ومكالمته - ملخصاً  
یہ باجماعِ مسلمین کفر ہے اور اسی  
طرح جو اللہ تعالیٰ سے ہم نشینی، اُس  
یہم صعود و عروج اور اُس سے  
باتیں کرنے کا مدعی ہو (یہ باتیں بھی  
اُسی طرح کفر ہیں)

اگر مولوی محمد اسماعیل دہلوی اس مقام پر انہی سی وضاحت فرمانے کی زحمت، گوارا کر لیتے کہ پیر جی کا یہ مسافحہ ولین دین اور صعود و کلامِ حقیقی کے واقعات پروردگار عالم کی بارگاہ سے متعلق نہیں ہیں بلکہ یہ حالات تو ان کے مجازی خداوندِ نعمت یعنی لازو دارن ہیسفنز کی سرکار میں پیش آیا کرتے تھے، تو ان کی اس کرم نوازی سے پاک و ہند کے مسلمان اس دور کی ایک المناک اور پراسرار الجھن میں پھنسنے سے محفوظ رہ جاتے۔ لیکن بڑا ہوا اس حرص و ہوا کا جو کیسے کیسے خاندانوں کے افراد کو نہ صرف گمراہ کر دیتی ہے بلکہ گمراہ گری کی ایسی مشین بنا دیتی ہے جس میں مدتوں تک گتے ہی گمراہ ڈھلتے پلے جاتے ہیں۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا۔

تمام وہابیہ کا مستقیم عقیدہ ہے کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام کو غیب کا علم قطعاً نہیں ہوتا۔ دیوبندی حضرات تو سرورِ کون و مہکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترجمانی ان لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وَاللّٰهُ لَا اَدْرِي مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا يَكْفُرُ (الحديث)، اور شیخ عبدالحق (دائیت کرتے ہیں کہ مجھ کو دیوار کے پیچھے کاجی علم نہیں رہا اس عقیدہ کو ان حضرات کے امام علی الاطلاق، یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں تکیہ کلام سمیت یوں بیان کیا ہے:

لہ قاضی عیاض، محدث: کتاب الشفاء، ص ۳۶۰

لہ خلیل احمد انصاری، مولوی، براہین قاطعہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۵۵



کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں؛ لے

لیکن اس ستم ظریفی کی داد کون دے کہ جو دروازے موصوف نے اولیائے عظام بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام تک کے لیے بند کر دیے تھے، جن کا کسی کے لیے کھولنا عقیدہ توحید سے بغاوت اور کفر و شرک تھا، وہی دروازے موصوف نے بڑی فیاضی اور دلیری سے پیر جی کے لیے اس طرح کھول کر دکھا دیے کہ گویا تمام خزان الہیہ کے وزیر خزانہ بلکہ مجاز و مختار ہی مولوی محمد اسماعیل دہلوی تھے۔ چنانچہ آنجناب نے اس بارے میں لکھا ہے:

برائے انکشاف حالات سموات و

آسمانوں کے حالات کے انکشاف

ملاقات ارواح و ملائکہ و سیر جنت

اور ملاقات ارواح اور ملائکہ اور

ونار و اطلاع بر حقایق آن مقام

بہشت و دوزخ کی سیر اور اس

و دریافت اکثر آنجا و انکشاف

مقام کے حقایق پر اطلاع اور اس

امر سے از لوح محفوظ ذکر یا حتی یا قیوم

جگہ کے مکانوں کے دریاہٹ اور

است۔ لے

لوح محفوظ سے کسی امر کے انکشاف

کے لیے یا حتی یا قیوم کا ذکر

کیا جاتا ہے۔ لے

دوسرے مقام پر موصوف نے اپنی اس فیاضی کے دریاہٹوں پر لکھے ہیں:

کشف ارواح و ملائکہ اور ان کے مقامات

برائے کشف ارواح و ملائکہ و مقامات

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۵۴

۲۔ محمد اسماعیل، مولوی: صراط مستقیم، ص ۱۲۴

۳۔ ایضاً: ص ۲۶۱

آہنا و سیرا مکثہ زمین و آسمان و  
جنت و نار و اطلاع بر لوح محفوظ شغل  
دورہ کند و باستغانت ہماں شغل بہر  
مقائے کہ از زمین و آسمان و بہشت  
و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسراں تمام  
احوال آنجا دریافت کند و باہل آن  
مقام ملاقات سازور لہ

اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی  
سیر اور لوح محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے  
دورے کا شغل کرے۔۔۔۔۔ پس  
زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے  
جس مقام کی طرف متوجہ ہو، اسی شغل  
کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اس  
جگہ کے حالات دریافت کر کے وہاں  
کے رہنے والوں سے ملاقات کرے۔

معلوم نہیں وہابی حضرات اپنے اس دین و ایمان پر کتنے نازاں ہوں گے کہ ایک جانب  
وہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک میں لعلائے الہی ایسی کوئی طاقت تسلیم کرنے کے لیے  
قطعیاً تیار نہیں، جس کے ذریعے وہ حضرات چھپی ہوئی چیزوں (غیب) کو معلوم کر سکیں، لیکن دوسری  
جانب امام الوداع پر صاحب نے اپنے قبضین کو شغل دورہ کا ایسا پیٹنٹ نسخہ بتا دیا جس کے ذریعے  
جلد غیب، تمام چھپی ہوئی چیزوں کا خود بخود انکشاف ہوتا چلا جائے۔ اس کے ذریعے جس وہابی کا  
جب دل چاہے جنت اور دوزخ میں گشت کر آتے، زمین و آسمان میں جس جگہ چاہے جا دھکے،  
جب چاہے لوح محفوظ سے اپنا یا غیروں کا ریکارڈ ڈاؤن کر کے لے آئے۔ آخر یہ کیا شعبہ بازی  
ہے؟ یہ کیسی کو مشہور کاری ہے؟

کیا انصاف اور دین و دیانت اس کا نام ہے کہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو  
پس یولار سے لے کر بتلایا جاتے اور اپنے ملاؤں پر چہرہ ظہق روشن دکھائے جائیں۔ اگر عقیدہ یہی  
درست ہے مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کو ایسی طاقت نہیں ملی تو وہابی ملاؤں کو پوری  
کائنات کے مشاہد سے کی طاقت کہاں سے مل جاتی ہے؟ کیا آپ حضرات کے نزدیک

لے محمد اسمعیل، مولوی، صراط مستقیم، ص ۱۲۸

لے صراط مستقیم اردو، ص ۲۶۰

دورے کا شغل حصول کمال میں کوئی نبوت سے بھی بلند و بالا مقام ہے؛ آخر یہ اپنے ملاؤں کو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کونسی دیانت واری کے تحت بڑھایا گیا ہے؛ بصورت دیگر اگر واقعی ان ملاؤں کا مقام یہی ہے تو فخر و دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم تو آپ حضرات کی نصیحتات کے مطابق ان ملاؤں کے مقابلے پر نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتا ہے۔ کیا یہی ہے آپ کا رسول پر ایمان لانا؛ کیا امتی کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے؛ کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس درجہ شان گھٹانے والے امتی ہی کہلاتے اور جنت میں جانے کے واقعی حقدار رہ جاتے ہیں؛ افسوس! سید احمد صاحب کو نبی منوانے کی خاطر کیسے کیسے پراسرار طریقوں سے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یعنی گند ذہن ہونا، لکھنے پڑھنے سے رغبت نہ رکھنا، کما کر کھانے سے عاری ہونا، حقوق العباد سے بے اعتنائی برتنا، علوم شرعیہ سے کورے رہ کر جینا، تصوف کے اہل سے بھی ناواقف رہنا، یہ تمام امور ایسے ہیں جو ان کی ذات میں جمع ہو کر بزرگی کا ساز و سامان قرار پاتے ہیں۔ اگرچہ دوسروں کے حق میں ان کا عیب ہونا سب کے نزدیک مسئلہ ہے، لیکن سید احمد صاحب کی ذات میں ان باتوں کا پایا ہونا معلوم نہیں کس طرح ایسی ولایت کی سند ہے جو منصب نبوت کو بھی شر مار ہی ہے؛ آخر یہ شعبہ بازی کیا ہے کہ،

تھماری زلف میں آئی تو حسن کھلائی

وہی تیرگی جو میرے نام سے سیاہ میں ہے

جب آپ اپنا نظریہ یا کوئی مسئلہ بیان کریں تو اس کے دلائل کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خوابوں کا پورا باب ایسا ہے جس کا ثبوت کوئی نہیں ہوتا، ماسوائے اس کے کہ پتے خواب کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ غلط کار لوگوں نے جب بھی اپنی بزرگی کا جالی بچانا چاہا تو ہمیشہ فرضی خوابوں اور جھوٹے الہاموں کا ہمارا ہی حاصل کیا، کیونکہ ان کا قرآن و حدیث سے ثبوت پیش نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ قرآن کریم میں دکھا دیکھے کہ واقعی آپ نے یہ خواب دیکھا ہے؛ نیز یہ کوئی نہیں کہے گا کہ واقعی آپ کو یہ الہام ہوا ہے اس کا حدیث سے ثبوت پیش کیجئے۔ اسی لیے لصوص دین کی ساری بزرگی کا دار و مدار جھوٹے خوابوں اور فرضی الہاموں ہی کا رہنا ہوتا ہے۔ اب ہم سید احمد صاحب کی مخصوص بزرگی کے بارے

میں جہاں ایسے ہی خواب پیش کرنے کی جہارت کر کے انصاف پسند حضرات کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔  
مصروف کے اولین سوانح نگار مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

جب تھانی رات باقی رہ گئی تو اُس وقت دو آدمیوں نے آکر آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے خواب ہی میں دیکھا کہ آپ کے داہنے طرف رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور آپ سے فرما رہے ہیں کہ اے احمد! جلد اٹھ اور غسل کر سید صاحب ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر نہایت شرم کے ساتھ دوڑے ہوئے حوضِ مسجد کی طرف چلے گئے۔ اس کے باوجود کہ موسم سرما کی وجہ سے حوض کا پانی اُس وقت یخ ہو رہا تھا مگر اُس سرد پانی سے آپ غسل کرنے لگے اور اٹھائے غسل میں حضرت کو اور حضرت ابوبکرؓ کو اسی جگہ پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ آپ بہت جلد غسل سے فارغ ہو کر اُن حضرات کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اے فرزند! آج شہداء ہے، تو یادِ الہی میں مشغول ہو جا اور دعا و مناجات کرتا رہ۔ اس ارشاد اور تلقین کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔ ل

اُس رات سید احمد صاحب نے کیا دیکھا؛ یہ بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

صاحبِ مخزن لکھتے ہیں کہ سید صاحب بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اُس رات میں بنصلِ الہی وارداتِ عجیب اور وارداتِ غریب میرے دیکھنے میں آئے کہ تمامی درخت اور پتھر وغیرہ اشیا، دنیا کی سجدے میں سر رکھے ہوئے خمیدہ و تحلیل و تبیح میں مصروف تھے۔ مگر ظفر یہ کہ ان ظاہری آنکھوں سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی، مگر چشمِ قلب سے سجدے میں پڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اُس وقت میں بھی سجدے میں سر رکھ کر شکرِ الہی کا بجالایا اور دعا و

لہ محمد جعفر تھانیسری، مولوی حیات سید احمد شہید، ص ۹۲

مناسبات مناسب وقت کرنا شروع کیا۔ اُس وقت فناگلی اور استغراق کامل مجھے حاصل ہوا اور اسی حالت میں صبح تک سجدے میں پڑا رہا۔

قارئین کرام! ذرا یہ تصریح تہ نظر رہے کہ سید احمد صاحب کی باری آئی تو وہابی علماء و موزخ بڑی خوشی سے چشم قلب کا وجود بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور سید احمد صاحب کے لیے چشم قلب تو ایسی مینا تسلیم کی ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام دنیا کی اشیاء اور جملہ اشجار و اجمار کارات بھر معاینہ فرماتی رہی کہ یہ تمام چیزیں سجدے میں پڑی ہوئی ہیں اور موصوف کے لیے بڑی مسرت کے ساتھ ایسے کان بھی تسلیم کر لیے گئے جو دنیا کی تمام چیزوں کی حمید و تحلیل و تسبیح کو سنتے رہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ ان کی آواز بھی نہیں نکل رہی۔ گھر کی بات آئی تو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب تک دوری نزدیک کی کا سوال اٹھ گیا۔ دیکھنا اور سننا سب امر واقعہ ہو کر کمال بن گیا۔ لیکن اس ستم ظریفی کی کوئی حد بھی ہے کہ جو علم سید احمد صاحب ایڈکینی کے لیے ایسے علوم و اختیارات بڑی فیاضی کے ساتھ تقسیم کرتے نظر آتے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ ان کی تشبیہ کرتے ہیں لیکن جب غیروں کا تذکرہ آئے یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بارے میں نکھنا پڑے تو یہی قلم بکیر خشک ہو جاتے ہیں۔ ان سے فیاضی کی جگہ اس طرح بخیلی چمکنے لگتی ہے کہ دین و دیانت کا دن و ہاڑے خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ عقل و فہم پتلا سر پٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس بخیلی کا جائزہ لینے کی خاطر سارے وہابی پیرے کے ناخدا مولوی محمد اسمعیل دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے

نمبر چیز کی خبر بڑا ہر وقت رکھتی، دُور ہو یا دیکھت، چسپی ہو یا کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں، یاد آئے ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں ہے۔

یہ موصوف نے اپنا عقیدہ اور قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے جو سید احمد صاحب پر قطعاً لاگو ہوتا ہے نظر نہیں آ رہا۔ اب اس کلیہ کی روشنی میں تصویر کا دوسرا رخ یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کا

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۶۲

۲۔ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، تقریر الایمان، ص ۳۵

ذکر خیر نیسے، وہ لکھتے ہیں:

غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہیے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے، کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، جوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔

قارئین کرام! ابھی آپ نے صراطِ مستقیم کتاب سے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی وہ عبارتیں ملاحظہ فرمائی ہیں جن میں انھوں نے اپنے پیر جی کے بتائے ہوئے شغلِ دورہ کا ذکر کیا اور اُس کا اثر یہ بتایا تھا کہ اس شغل کی مدد سے جب چاہے کوئی بھی وہابی زمین و آسمان کی جس جگہ کے پاس ہے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ جنت و دوزخ کی سیر میسر آ سکتی ہے، فرشتوں اور روحوں سے ملاقات کی جا سکتی ہے، لوح محفوظ سے جس امر کو دریافت کرنا مطلوب ہو اُس کا بچشمِ خود مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی اور کیسا عقیدہ ہے کہ علم کے جو دروازے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے لیے قطعاً بند کیے ہوئے تھے اور انھیں خدا کے لیے خاص بتایا ہے، وہی دروازے ہر وہابی کے لیے چوڑے کھولے ہوئے ہیں۔ آخر یہ دین و مذہب کو باز چھوڑنے اطفال بنانے کے سوا اور کیا ہے؟ اس ستم ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے علمِ کلید دروازہ قطعاً بند بتایا گیا ہے۔ وہاں بھی چشمِ قلب کا کوئی تصور تک نہیں آتا جو پیر جی کے لیے مسلم ہے۔ چنانچہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے صاف صاف لکھ دیا،

چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ بعضی بات دریافت کرنے کی خواہش ہوئی اور وہ بات معلوم نہ ہوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو ایک آن میں بتا دی۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں منافقوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت کی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑا رنج ہوا کئی دن تک بہت تحقیق کیا پر کچھ حقیقت معلوم نہ ہوئی اور بہت فکر و غم میں رہے

لے محمد اسماعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۵۳، ۵۴

پھر حبیب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو بتا دیا کہ منافق جھوٹے ہیں اور عایشہؓ پاک ہیں۔  
 نکتہ نظر اس کے کہ امام ابو ہریرہ نے منافقین مدینہ کی ہمنوائی کرتے ہوئے واقعے کو قطعاً غلط رنگ  
 دیا ہے، ہم یہاں اپنے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ  
 تعالیٰ علیہ وسلم بھی ان زراے موصدوں کی نظر میں کسی بات کو معلوم نہیں کر سکتے تھے، بجز وحی کے،  
 کیونکہ نہ ان کے پاس سید احمد صاحب کی طرح چشم قلب تھی اور نہ انھیں وہابی کشتی کے ہر سوار  
 کی طرح دورے کا شغل آتا تھا، جس کی مدد سے عرش و فرش اور جنت و دوزخ تک کی خبریں معلوم  
 کر لیا کرتے یا لوح محفوظ سے پڑھ کر معلوم کر لیا کرتے۔ معلوم نہیں اس کے باوجود نبی آخر الزماں  
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو زبانی طور پر کس طرح ساری کائنات کا سروا اور بعد از خدا بزرگ توفیق  
 مختصر کا مصداق ٹھہراتے ہیں جبکہ وہابیوں کا ایک ملاحی بھی ان کے نزدیک علم و اختیار میں  
 سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بڑھا ہوا ہے اور سید احمد صاحب کی شان کا تو سنا ہی  
 کیا؟ وہابی حضرات کی تصریحات کے مطابق تو علم و اختیار کی رو سے سید صاحب ہی بعد از  
 خدا بزرگ نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ اسی ستم ظریفی کی مزید مدد کرتے ہوئے موصوف نے یہ بھی  
 لکھا ہے،

”کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلاں کے دل میں کیا ہے یا فلاں کی شادی کب  
 ہوگی یا فلاں نے درخت کے کتنے پتے ہیں یا آسمان میں کتنے تارے ہیں تو اس کے  
 جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ در رسول ہی جاننے۔ کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے“  
 رسول کو کیا خبر؟

ادھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کسی ایک درخت کے پتوں کی تعداد بتانے سے اور  
 آسمان کے تاروں کا شمار جاننے سے بے خبر بتایا پھر رہا ہے کہ معاطہ غیبوں کا ہے لیکن ادھر  
 سید احمد صاحب کو روئے زمین کی تمام اشیاء، دنیا کے سارے اشجار و اجار سے خبر دار

۱۔ محمد اسمعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۵۴

۲۔ محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۰۷

اور ان کی تسبیح و تہلیل و تہلیل و تہلیل کا سامع بتایا گیا ہے، کیونکہ یہ معاملہ اپنوں کا ہے۔ کیا وہابی حضرات اپنے امام علی الاطلاق کے بتائے ہوئے اس نظریہ پر کبھی نظر ثانی کی زحمت گوارا کریں گے کہ ایک درخت کے پتے باننے کو غیب دانی شمار کر کے دہلوی صاحب ان کی گنتی سے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بے خبر ٹھہراتے اور ان کے لیے اتنا سا علم ثابت کرنا بھی توحید کی جان پر چھری بتاتے ہیں، لیکن سید احمد صاحب کو دنیا و مافیہا سے خبردار ٹھہرانا کیوں شرک نہ ٹھہرا؟ اس طرح وہابی حضرات کی نظر میں سید احمد صاحب کی علمیت اور وقعت کم رہی یا زیادہ؟

ہو سکتا ہے کہ بعض وہابی مناظر یہ کہنے لگیں کہ دہلوی صاحب اس علم کو شرک ٹھہرا رہے ہیں جو ہمیشہ حاصل رہتا ہے جبکہ سید صاحب کا معاملہ صرف ایک رات کی بات ہے۔ تو ایسے حضرات کے اس موقف کا مطلب یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے کسی کو اپنا شریک نہیں بتاتا ہاں ایک رات کے لیے بنا لیا کرتا ہے۔ فعوذ باللہ من ذلک۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سید احمد صاحب کی کسی رازداری اور غیر محسوس طریقے پر جملہ مقررین بارگاہ النبی الانبیاء سیدنا وشفیعنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی زیادہ علوم و اختیارات والا دکھایا جا رہا ہے۔ اس کثوت سے نہ ان حضرات کے عقیدہ توحید میں فرق آتا ہے اور نہ اُمتی ہونے میں بہر حال ذکر تھا سید صاحب کا کہ رات بھر کائنات کی جملہ اشیاء کو ان کی باطنی حالت میں چشم قلب سے دیکھتے رہے اور جس خاموش زبان میں ہی تمام اشیاء تسبیح و تہلیل بیان کر رہی تھیں اُسے سید صاحب رات بھر سماعت فرماتے رہے اب اسی ڈرامے کا اگلا پارٹ بھی ملاحظہ ہو:

”جب بعد اداے اشراق بخدمت مولانا صاحب (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) کے حاضر ہو کر سلام علیک کہا تو بہت مسرور اور محظوظ ہو کر آپ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ آج کی شب اپنی مراد کو پہنچ گئے پس اُس روز کے بعد سے آنا فنا آثار ترقیات و علو درجات و معاملات عجیب و واروات غریب آپ پر ظاہر ہونے لگیں۔“

لے محمد جعفر تھانیسری، مولوی حیات سید احمد شہید، ص ۶۴



جانے تعجب ہے کہ جو دروازے انبیاء کرام علیہم السلام تک کے لیے وہابی حضرات کے امام علی الاطلاق نے بند پائے ہیں تو وہی دروازے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے انہوں نے کس طرح کھلا ہوا تسلیم کر لیا، آخر یہ عقیدہ کوئی تو حل کرتا کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کو کیسے معلوم ہوا کہ سید احمد صاحب آج اپنی مراد کو پہنچ گئے ہیں، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان حضرات نے اپنی ہی اصطلاح کے مطابق "بِذَاتِ الْحُدُودِ" بھی مان لیا اور اس کے باوجود نہ صرف شرک کی زد سے بچے رہے بلکہ توحید کے ٹھیکیدار بھی بن گئے۔ اب اسی المناک سلسلے کا ایک ایسا خواب بھی ملاحظہ فرمائیے جو مسلمانوں کے قلب و جگر کو چھلنی کر دیتا ہے۔ لکھا ہے:

"اس مناظرہ عجیبہ کے بعد صاحب مخزن نے بحوالہ صراط مستقیم لکھا ہے کہ ایک

خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چھوہارے اپنے دست مبارک سے

سید صاحب کے منہ میں ایک دوسرے کے بعد رکھ کر بہت پیارا اور محبت سے

کھلاتے اور جب آپ پیدا ہوتے تو ان چھوہاروں کی فیرنی آپ کے ظاہر و

باطن سے ہو پڑا تھی۔ اس کے بعد ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدہ

فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہما کو سید صاحب نے خواب میں دیکھا۔ اس رات

کو حضرت علی نے اپنے دست مبارک سے آپ کو ٹھلایا اور حضرت فاطمہ نے ایک

لباس اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنایا۔ ان واقعات کے بعد کمالات طریقت نبوت

کے غایت آب و تاب کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہونے لگے۔"

احقر کم از کم یہ نہیں سمجھ سکا کہ کسی چالیس سالہ جیتے جاگتے آدمی کو ٹھلانے کا مطلب کیا ہے، کاش!

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا قلم اس خواب کو گھڑ کر سپرد قلم کرنے سے پہلے خشک ہو گیا ہوتا۔

خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سید احمد صاحب کو اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے، خدا

ذکر سے کہ کوئی وہابی شرم و جیا کو اس درجہ گھول کر پھی گئے ہوں کہ انہیں ان لفظوں کے صریح

گالی تسلیم کر لینے میں کسی قسم کا تاثر ہو۔ تاثر کرنے والے سے، خواہ وہ بڑے سے بڑے

لے محمد جعفر نھانسیری، مولوی: حیات سید احمد شہید، ص ۶۲

علامہ زماں ہو، کہا جاسکتا ہے کہ حضور والا! آج رات جب میں غسل کر کے فارغ ہوا تو آنجناب کی والدہ محترمہ یا حضور والا کی بیگم صاحبہ یا حضرت جی کی صاحبزادی صاحبہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے تھے۔ اس کے بعد دیکھنا کہ علامہ صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔ مارے غصے کے آپ سے باہر ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیسے کیسے سانپ کی طرح بل کھائیں گے۔ آخر غصے کیوں نہ آئے کہ ان کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ لیکن یہی بات جب امام حسن و امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدہ محترمہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ مطہرہ اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لاڈلی صاحبزادی بلکہ جگر کے ٹکڑے کے لیے کہی جائے تو کیا یہ کھلی گالی نہیں ہے؟

۷ میں اس عارفانہ تجاہل کے صدقے

ہر ایک دل کو چھیدا مرا دل سبھ کے

جب سید احمد صاحب بیعت کا کاروبار شروع کرتے ہیں تو براہِ راست اپنے پروردگار سے اُس کی مرضی پوچھتے ہیں اور اُدھر سے جواب بھی مرحمت فرمایا جاتا ہے۔ اولین سوانح نگار کے لفظوں میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے اور مفہوم و معانی کے سمندر میں تعویۃ الایمان سامنے رکھ کر غوطہ لگایا جائے۔ وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ اپنے کفیل و شفیع المذنبین سید احمد صاحب کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

”پس اس معاملہ لغز بیعت میں تیزی کیا مرضی ہے؟ جناب باری سے حکم چو کہ جو کوئی تیرے ہاتھ پر بیعت کرنے گا، خواہ وہ لاکھوں ہوں، ہر ایک کی کفایت کروں گا؛“

بہر حال یہ تو سید احمد صاحب کی اُس شفیع المذنبین کا تذکرہ تھا جو وہابی حضرات کے نزدیک ہر طرح مستحکم ہے اگرچہ ان کے نزدیک سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ منصب حاصل نہیں کیونکہ یہاں بغیر استدعا کیے تمام مریدان سید صاحب کی مغفرت کا وعدہ ہو گیا۔ اسی سلسلے میں دوسرے مقام پر یوں لکھا ہے:

لے محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۶۵

”قصہ مجاہدین میں قیام کے دوران وہاں ایک عجیب واروات ظہور میں آئی۔ ایک روز حضرت سید صاحب بعد نماز فجر کے مراقب بیٹھے رہے۔۔۔۔۔ حمد و ثنا کے بعد آپ سجدے میں گر پڑے اور سجدے سے سر اٹھا کر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ آج ہاتھ غیب نے مجھے بشارت دی ہے کہ اس وقت تجھ کو اور تیرے نکل ہمارے ہیوں کو میں نے بخش دیا اور اس نذا کے بعد ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا۔ اُس ہاتھ نے اس مسجد کو جنت الماویٰ میں لے جا کر داخل کر دیا۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ اس مسجد میں جس قدر آدمی موجود ہیں ان سب کے نام ایک کاغذ پر لکھ لو اور ان کو اصحاب بدر کی طرح بارگاہ ایزدی کے مقبول و منظور تصور کرو۔“

جلا جیب مسلمانوں کو یہ یاد کرانے کی لگاتار کوشش کی جائے کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو اپنی صاحبزادی خاتمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھی نکاح نہیں آئیں گے۔ آپ اللہ کے یہاں اُن کی ذمہ داری اٹھانے، بخشش کروانے سے بھی جواب دہ نہ بیٹھے تھے لیکن سید احمد صاحب کے ساتھ لگنے سے بغیر کسی عرض معروض ہی کے مغزرت کی بشارت مل جاتی ہے تو اُدھر جانے کے بجائے کیوں نہ اُدھر آئیں گے کہ دنیا ہی میں بخشش سے نواز دیے جائیں۔ کیا تالیفِ طلب کے اس بال اور شعبہ ہمازی کے کمال کا کوئی جواب ہے؟ مسجد توجنت الماویٰ میں داخل ہو گئی لیکن بیٹھے بٹھائے سید صاحب کے ہمراہی اصحاب بدر کی طرح بارگاہ ایزدی کے مقبول و منظور کس طرح ہو گئے جبکہ یہ خصوصیت پوری امت محمدیہ میں سے دیگر صحابہ کرام تک کو حاصل نہ ہو سکی؟ آخر یہ سید احمد صاحب کو بعد از خدا بزرگ منہانے کا منصوبہ تھا یا اور کچھ؟ مزید لکھا ہے:

”اس بستی (فقیہ) میں جو نماز عصر کے بعد آپ مراقب بیٹھے تو نماز مغرب کے قریب سر اٹھا کر فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج اُس رب العزت نے تمام اولیاء مقبولین سلف سے مجھ کو ممتاز کر کے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی تیرے

ہاتھ پر بیعت کرے گا اُس کو تمام مکروہات دنیا و آخرت سے محفوظ رکھ کر اپنی رضا مندی اور انعام سے سرفراز کروں گا (اس بشارت میں آپ کے خلیفوں اور خلیفوں کے خلیفوں کی بیعت بھی شامل ہے)۔ اُس وقت میں نے عرض کیا کہ اسے کریم و رحیم! میرے آبا و اجداد کو بھی میری بیعت سے مشرف کر، تاکہ وہ بھی اس وعدہ مغفرت میں شامل ہو جائیں۔ کئی روز اس آخری دعا کی قبولیت میں توقع رہا۔ اس عرصہ میں سید صاحبِ وطن میں واپس پہنچ گئے۔ وطن میں پہنچ کر اس دعا کی قبولیت کے واسطے آپ بہت گڑگڑائے۔ آخر اُس کریم و رحیم نے اپنے نسلِ عمیم سے اس دعا کو قبول فرمایا اور حکم دیا کہ سید محمد (مولف مخزن احمدی) کو اپنے آبا و اجداد کی طرف سے وکیل کر کے اُن کی طرف سے ان سے بیعت لے لے۔

اس عبارت میں بھی سید احمد صاحب کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اُدنچا دکھانے کا جذبہ ہی کارفرما نظر آ رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے والدین کریمین کو زندہ کر کے اپنی اُمت میں شامل فرمایا تھا تو سید صاحب نے سارے آبا و اجداد کو اپنی بیعت سے مشرف کر کے وعدہ مغفرت میں شامل کروا لیا۔ بات کی ہوا تو باندھ دی لیکن سرور کون و مکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو اپنے والدین کریمین کو دوبارہ زندہ کر کے مشرف باسلام کیا تھا۔ یہ ایسا مرحلہ نظر آیا جہاں زبانی جمع خرچ سے کام چل نہیں سکتا تھا، لہذا مولف، مخزن احمدی کو وکیل قرار دینے کی راہ نکالی لی۔ وہ سید صاحب کے مرید تو وہ سلسلہ در سلسلہ اور نسلوں کی نسلیں بخشی جا رہی تھیں، تھوک کے حساب سے مغفرت لٹ رہی تھی جبکہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُمتی بننے سے پرچون کے حسابوں بھی وعدہ مغفرت کا وہابی حضرات قحط بتاتے رہتے ہیں۔ امام الوہاب نے خود لکھا ہے:

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان وزمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانیے اور اُس کو پکاریے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے، لے

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۱۲۶

۲۔ محمد اسمعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۱

انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا ماننا تو نفع نقصان سے خالی بتایا لیکن سید احمد صاحب کے ساتھ لگنا کتنا فائدہ مند کہ فوراً وعدہ مغفرت و اصحاب بدر کا درجہ حاصل کیا۔ کیا یہ مسلمانوں کا رُخ مقربین بارگاہ الہیہ کی طرف سے اپنے برطانوی امیر المومنین کی جانب پھیرنے کا لاف غوی منسوب نہیں تھا؟ دہلوی صاحب نے مزید لکھا ہے۔

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے گو یہی جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزویٰ حاصل ہوتی ہے، سودہ بھی مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر۔“

اگر بندگانِ خدا کسی کی قطعاً مدد نہیں کر سکتے تو سید احمد صاحب جو اپنے ساتھیوں کی حمایت ہر قدم پر کرتے اور انہیں نیت و مغفرت کی بشارتیں سناتے رہے انہیں کیوں دردِ غلو شمار نہ کیا؟ اگر بزرگوں کے سبب سے خدا کی نزویٰ حاصل نہیں ہوتی تو سید احمد صاحب کے پیچھے آنا بڑا لاؤ لشکر کیا سیر و تفریح کرنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے پیچھے وہاں بیان پاک و ہند کس خوشی میں لگے ہوئے ہیں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے۔

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر اپنے بتوں کو اُس کی جناب میں وکیل بھجوا کر کہتے تھے۔ اسی سے کافر ہو گئے۔ سوا ب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصیرت ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اُس کو مانے سو اُس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اُس کے مقابل کی طاقت اُس کو ثابت نہ کرے۔“

قطع نظر اس کے کہ بتوں کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا وکیل سمجھنے کے باعث مشرکین تکہ کافر ہوئے تھے یا اس کی اور بھی بے شمار وجوہات تھیں۔ عرض یہ کہنا ہے کہ انبیائے کرام اور

اویسے عظام کو تصرف ثابت کرنا اور وکیل ماننا شرک سہی لیکن امام الوہاب پیہ کی اس شانہ ساز  
 شریعت کے احکام کا سید احمد صاحب پر کیوں اطلاق نہیں ہوتا؟ سید صاحب کے لیے تصرف  
 قدم قدم پر ثابت کیا جا رہا ہے، انھیں وکیل اور حمایتی مانا جا رہا ہے لیکن کوئی وہابی یہ نہیں کہتا  
 کہ ہم شرک کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ انبیاء و اولیاء کے خلاف محاذ بنا کر سید احمد صاحب  
 ایند کمپنی کو آرزبائاقین دُونَ اللہ بنا رہے ہیں۔ ذرا مولوی محمد اسمعیل دہلوی کی یہ البیسی تصریح  
 بھی ملاحظہ ہو:

”اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو حکم کیا کہ لوگوں کو سنا دیوں کہ میں تمہارے نفع و  
 نقصان کا کچھ مانک نہیں اور تم جو مجھ پر ایمان لائے اور میری امت میں داخل ہوئے  
 سو اس پر مغرور ہو کر حد سے مت بڑھنا کہ ہمارا پاپ بڑا مضبوط ہے اور ہمارا وکیل  
 زبردست اور ہمارا شفیع بڑا محبوب ہے۔ ہم جو چاہیں سو کریں۔ وہ ہم کو اللہ  
 سے بچالے گا۔ کیونکہ یہ بات محض غلط ہے، اس واسطے کہ میں آپ ہی ڈرتا  
 ہوں اور اللہ سے دوسے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسروں کو کیا بچاؤں؟“

چلیے یونہی سہی! گویا پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو خود ہی ڈرتے رہتے اور انھیں بچاؤ  
 کے لیے کوئی جگہ نہ مل سکی لہذا دوسرے کا بچاؤ ان حالات میں وہ کر بھی کیا سکیں گے؟ لیکن  
 خیر سے آپ کے سید احمد صاحب تو نہ صرف دنیا میں ہی مغفرت سے نوازے گئے بلکہ ان کے  
 ساتھیوں کو بخش دیا گیا تھا بلکہ جو ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء سے بیعت ہو جائے وہ بھی  
 بخشا گیا تھا۔ ان حالات میں صلف نظر نہ رہا ہے کہ سید احمد صاحب پر اللہ تعالیٰ کی جتنی  
 نظرِ کرم ہے اتنی تو اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی نہیں۔ ان حالات میں وہابی  
 حضرات کیا ہیں بھی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ انھوں نے محبوبیت میں نبی کریم  
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سید احمد صاحب کو بڑھا کر اپنے برطانوی امیر المؤمنین کو مقام  
 ربوبیت پر بٹھایا تھا یا سید احمد صاحب سے علوم و اختیارات میں سرور کون و مکان صلی اللہ

لہ محمد اسمعیل، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۴

تعالیٰ علیہ وسلم کو کم ہٹا کر سبب پروردگار، شافع روز شمار کے خلاف پراسرار محاذ بنایا ہوا ہے؟  
کیونکہ جن کاموں کی مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے زبان رسالت سے نفی کر دائی سب ان سارے  
کاموں کو سرانجام دیتے ہوئے سید احمد صاحب کو دکھایا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیسا دین ہے؟  
یہ کیا تماشہ ہے؟

خیر یہ تو باتیں تھیں سید احمد صاحب کی بین الافواہی ولایت کی، جس کے باعث وہ کار ساز  
منسکل کشا، شافع المذنبین اور کیا کچھ نظر نہیں آتے تھے۔ اب سید صاحب کے کسب فیض و  
حصول منسوب کے بارے میں جہالت آیزو مضحکہ خیز بیان مولوی محمد جعفر تھانوی کی زبانی  
ملاحظہ فرمائیے:

”اس کے بعد ایک روز ادواح مقدس، جناب غوث الثقلین سید عبدالقادر  
گیلانیؒ و حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ متوجہ حال سید صاحب ہوئیں اور  
قریب ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان دونوں رُوحوں کے درمیان رہا۔ ہر ایک  
رُوح ان دونوں رُوحوں میں سے سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔  
آخر بعد انقضائے ایام تنازعہ کے دونوں رُوحوں کی بالاشتراک جذب کرنے  
پر صلح ہو گئی۔ اب دونوں ادواح مفسر سہ نے بالاشتراک آپ پر جلوہ گر ہو کر  
ایک ہتھکید نفس نفیس مجتوجہ قوی اور تامل پذیر ذرا اور فرمائی کہ اُس ایک پہر میں  
نسبت ان دونوں خانہ انوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔“

اسی قسم کا ایک مضحکہ خیز بیان اور پیش کیا جاتا ہے جس سے ان حضرات کی سلوک و تصوف سے  
ناواقفیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے اور صاحب فہم و فراست پر ان کی درونگونی اور  
کذب بیانی پورے طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیجیے وہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

”اس کے بعد ایک روز سید صاحب حضرت خواجہ خواجگان خواجہ بختیار کالی  
قدس سترہ کے مرقد مبارک پر مراقبہ میں بیٹھے تھے اور اُس وقت رُوح پُرفتوح

سید محمد جعفر تھانوی، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۶۵

خواجہ صاحب مرحوم سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اس مقدس روح نے آپ کے اوپر  
توجہ فرمائی۔ اسی وقت نسبت خانہ ان چشتیہ کی بھی حاصل ہو گئی اور اس کے بعد  
نسبت مجددیہ، شاذلیہ وغیرہ غرض کل مشہور خانہ انوں کی نسبت خود بخود آپ کو  
حاصل ہو گئی۔

بعد تکمیل ان دونوں سلوکوں کے ایک روز عالم مراقبہ میں آپ کی  
ملاقات روح پر فتوح بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی۔ اس وقت سید صاحب نے  
دیکھا کہ ایک پتھر نور مقدس کا خواجہ صاحب مدوح کے سر پر سایہ کر رہا ہے۔ پھر اسی  
وقت یہ بھی آپ کو دکھائی دیا کہ آپ کے سر پر دو پتھر نور مقدس کے سایہ کر رہے ہیں۔  
چونکہ سید صاحب اپنے کو کترین مریدان خواجہ سے شمار کرتے تھے۔ یہ معاملہ معکوس  
دیکھ کر آپ کو بہت شرم آئی اور فوراً رقبہ سے باہر آ کر رزاں و ترساں مولانا شاہ  
عبد العزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت خوف اور شرمندگی سے اس  
کو مولانا صاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت مولانا صاحب نے نہایت فرحان  
و خنداں اس کے جواب میں فرمایا، اسے فرزند! جائے تعجب نہیں ہے۔ ولایت  
نبوت کے ایسے ہی آثار ہوتے ہیں۔ اسے عزیز! ابھی تو اس کی ابتداء ہے  
اور مشتے از خردار اور ایک قطرہ از بحر ناپیدا کنار تم پر ظاہر ہوا ہے۔ آئندہ اس  
سے بڑھ چڑھ کر ہزار ہا اس قسم کی باتیں تم پر ظاہر ہوا کریں گی۔

ولایت نبوت تو اسے کہتے ہیں جو نبی کو اعلان نبوت سے قبل حاصل ہوا کرتی ہے لیکن سید صاحب  
کے لیے سیرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اس کا اعلان کر دانا ظاہر رہا ہے  
کہ اندرون خانہ اعلان نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی جس کی خاطر وحی و عصمت کے دعوے  
کیے جا رہے تھے اور وقت آنے پر سید صاحب کی مہر اسمہ احمد مقرر ہوئی تھی۔  
تمام باتوں سے قطع نظر ان مذکورہ بالا دونوں بیانات کو پھر ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے واقعے

لے محمد جعفر خاں میری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۶۵



میں حضور سیدنا خاتم النبیین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق غوث الثقلین کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی جنوں اور انسانوں کی فریاد کو پہنچنے والے۔ کیا یہ تقویۃ الایمانی دوسرے میں ٹھیٹھ شرک و کفر نہیں ہے؟ یا تقویۃ الایمان کے ایٹمی ٹکڑے صرف مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی نزنس سے گھڑے گئے تھے؟ یہ بزرگوں میں جھگڑا دکھانا، بیٹھے بٹائے نسبتوں کا حاصل ہو جانا، رُنبے میں سلطان الہند خراسیہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے اونچے بننا، کیا اس میں حقیقت کا کسی عاقل کو ادنیٰ سا شبہ بھی نظر آتا ہے؟ اب وصایا وزیری کے حوالے سے یہ واقعہ بھی ملاحظہ ہو:

ایک روز اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے سید صاحب کے خیال مبارک میں گزرا کہ نامعلوم اس جہاں کے قطب الاقطاب جہاں کون بزرگ ہیں؟ یہ خیال کر کے جناب باری تعالیٰ میں دعا کی کہ اُس بزرگ کا مجھ پر حال کھول دیں اور اُن کی زیارت سے مجھ کو مشرف کر۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اسی دم اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے ہوا کو حکم دیا کہ آپ کو معتبّر آنا فانا اُس بزرگ قطب الاقطاب کے مسکن پر پہنچا دے۔ چنانچہ آپ بہت سے ممالک اور پہاڑوں اور جنگلوں کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک دم میں ملک شام میں پہنچ گئے۔ آپ نے اُس بزرگ سے کہا کہ مجھ کو تمہاری ملاقات سے حصولِ رضامندی باری تعالیٰ کے باوجود اور کچھ مقصود نہیں ہے۔ مگر اِس کے باوجود بھی وہ بزرگ کچھ متوجہ نہ ہوئے۔۔۔۔۔ اِس گھڑی چالیس اشخاص غیبی منزل کی حیثیت سے، دنیا کی نظروں سے پوشیدہ اور آپ کے سامنے عیاں، آپ کی خدمت میں تعینات ہو گئے اور یہ اشخاص غیبی اِس شخص کے ساتھ تعینات رہتے ہیں جس کو مرتبہ قطب الاقطاب کا عنایت ہوتا ہے۔ خیر اِس العام تازہ کے بعد جس طرح رب العزت آپ کو وہاں لے گیا تھا اسی طرح واپس لے آیا۔۔۔۔۔ جب اِس وقوعہ کے چند سال بعد سید صاحب ملک خراسان کو تشریف لے گئے تو اُن پہاڑوں اور میدانوں کو دیکھ کر آپ فرمایا کرتے تھے کہ اِہیں پہاڑوں اور میدانوں کے اوپر سے اِس ملک شام میں میرا سفر ہوا تھا۔

لے محمد جعفر تھامسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۸۳

جن خوش نصیب حضرات نے نسوٹ سے تھوڑا بہت حصہ بھی پایا ہو وہ بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ واقعہ محض گھڑنت اور فضاؤں میں محل تعمیر کرنے والوں کا تیار کردہ عقلی ڈھکوسلا ہے۔ عبارت کا ہر فقرہ اس شعبہ بازی کی زبانِ حال سے گواہی دے رہا ہے جیسے سید صاحب کو زبانی جمع خرچ سے قطب الاقطاب تو بنا لیا، لہذا کیسے ممکن ہے کہ اپنے پیرو مشد سے اُونچے ہونے کا اعلان نہ کرتے۔ اس سلسلے میں پہلے یہ بیان ملاحظہ ہو:

مولانا (مرضیٰ خاں صاحب) لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مجھ سے اپنا ایک روز کا حال اس طرح بیان کیا کہ میں ایک دن مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اُس وقت آپ کے پاس مولوی رشید الدین صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بہت دیر انتظارِ تخلیہ، دالان میں ٹھٹھا رہا کہ جب یہ صاحب تشریف لے جائیں تو میں مولانا سے کچھ عرض کروں۔ اس ٹھٹھنے کی حالت میں مجھ کو یہ الہام ہوا کہ اگر تو بندوں کی طرف التجا کرے گا تو ہم تیری دستگیری نہ کریں گے؛ لے

واقعہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو وہاں کسی انگریز نے دیکھ لیا ہو گا۔ اُسے یقیناً یہ بات ناگوار گزری ہوگی اور صاف کہہ دیا ہو گا کہ اگر تم نے شاہ صاحب سے رابطہ رکھا تو ہمارا تمہارا نیچاؤ نہیں ہو گا اور ہماری نظرِ گرم تمہاری جانب سے ہٹ جائے گی۔ بہر حال اس واقعے کو مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام کا رنگ دے کر بزرگی کی سند بنا دیا گیا۔ اب اس واقعے کے متن پر بار لوگوں کی عا شید آرائی بھی دیدنی ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ قصہ لکھنے کے بعد مولوی مرضیٰ خاں صاحب اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے یہ لکھتے ہیں کہ اس الہام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن ایام میں سید صاحب کا واقعہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھا ہوا تھا۔ جامع لکھتا ہے کہ یہ بات تو میں نے بہت لوگوں سے سنی ہے کہ جب سید صاحب حج کو تشریف لے گئے تو اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کو سید صاحب کی علوم مرتبت کا حال

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۱۶۱

غیب سے معلوم ہوا۔ اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب کی واپسی کے بعد میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کر کے، وہ شرفِ جس کا وعدہ ہے، ضرور حاصل کروں گا۔ مگر افسوس کہ مولانا کی اُمید برباد آئی کیونکہ سید صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے پہلے مولانا صاحب کا وصال ہو گیا تھا۔

جس ذہن نے یہ واقعات گھڑے اور جس قلم نے کاغذ کے سینے پر انہیں جڑا، اُس کی ستم ظریفی کا اندازہ سبلا کون کر سکتا ہے، جس نے اس شعبہ بازی کو ایسا خوشنما رنگ دے دیا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا۔ وہ جال کی خوشنمائی تو دیکھتے ہیں لیکن جال کی حقیقت کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ ایسے پراسرار چکر کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

چوں قلم در دستِ غدار سے بود  
لاجرم منصور بر وارے بود

ابھی سید احمد صاحب کی البیلی ولایت جو منصبِ نبوت کو بھی شرمناک ہے، اُس کا ایک پہلو قارئینِ کرام اور ملاحظہ فرمائیں کہ اگر سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذاقِ مینِ استنِ خانہ رویا تھا تو سید احمد صاحب کو وہابی حضرات کس طرح کم رہ جانے دیتے؟ اس کمی کو انہوں نے یوں پورا کیا ہے:

”جس فجر کو آپ روانہ بریلی ہونے والے تھے، اُس رات کے آپ کے تنے مکان کی رُوح بہیشتِ انسانی ظاہر ہوئی اور آپ کی جذباتی میں بہت رنج و ملال ظاہر کے ایک دوسری مخلوقِ الہی سے، جو وہاں حاضر تھی، مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ کل بھارا آقائے نامدار ہم کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یہ کہہ کر ایسا زار و قطار رونا شروع کیا، اس گریہ وزاری کا اثر سید صاحب پر بھی ہو گیا اور آپ بھی رونے لگے اور چونکہ اُس وقت سید صاحب کو خود کچھ حضوریِ الہی ہو رہی تھی،

لے محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۷۱

آپ نے اللہ رب العزت سے عرض کیا کہ یہ سب تیرا فضل و کرم ہے، اس روح کی یہ اُلفت تیرے ہی انعام کے سبب سے ہے ورنہ میرے جیسے ہزار ہا آدمی اپنے اپنے مکانات کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کبھی کوئی مکان اُس کے واسطے رنج و ملال نہیں کرتا۔ سوا سے رب! تو ہی اپنے فضل سے اس مکان کو تسکین دے اُمی وقت جناب باری سے حکم پرا کر اس مکان کو بھی ہم جنت میں داخل کریں گے۔ یہ خطاب اُس روح مکان نے خود بھی سنا اور میں نے بھی بہ میل حکم الہی اُس کو یہ بات سنا دی تب اس مکان نے خوش خرم ہو کر تسلی پائی۔

ایک جانب سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سیدنا احمد صاحب کو تہ مقابل دکھانا اور دوسری طرف اللہ جل شانہ سے بالمشافہ کلام کرنے کا دعویٰ کرنا جبکہ یہ خصوصیت موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کو بھی حاصل نہ ہوئی لیکن یار لوگوں نے تم ظریفی سے سید صاحب کو زبان زوری سے اُسی منصب پر فائز کر دیا۔ اسی قسم کا ایک حیرت انگیز واقعہ اور ملاحظہ فرمایا جائے۔ لکھا ہے،

”یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا اور وہ یہ کہ سمندر کی دو عاصمتیں ایک ہی جگہ ٹاک صورت بن کر حضرت کے سامنے آئی اور بہت غرور اور تکبر سے بولی کہ تو اپنی جان سے سیر ہو کر، ایسی جنسارت کر کے، میرے اندر ہلاک ہونے کو کیوں آیا ہے؟ تو نہیں جانتا کہ میں سمندر ہوں، جس نے ایک لمحہ میں غرور کو ہلاک کر ڈالا تھا اور میں وہ ہوں کہ ہزاروں جہاز اور کشتیاں ہر سال میرے سامنے تباہ ہوتی ہیں اور میں وہ بحر محیط ہوں کہ ساری زمین کو مع ساکنانِ زمین کے گھیرے ہوئے ہوں۔ اگر میں چاہوں تو ایک لمحہ میں سارے ساکنانِ زمین کو غرقِ آب کر دوں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی جان سے بیزار ہو گیا ہے،“

گرا اپنے ساتھ اتنی خلقت کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟

سید صاحب نے جب یہ کلمات نوحوت آمیز سمندر سے سنے تو اُسی

وقت آپ کو یہ الہام ہوا کہ تو سمندر سے کہہ دے کہ تو کیسی غرور اور تکبر کی بات کرتا ہے، میں اور تو وہ دونوں غلامانِ غلام اُس جبار و قہار کے ہیں، تو اللہ سے ڈر اور میرے زور و اس قدر سخی نہ بگھار۔ نیز کیا اختیار ہے کہ تو کسی کو غرق کرے؟ اہل علم و دانش پر بخوبی آشکا ہے کہ یہ واقعہ محض گھڑنت اور اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے، جس نے عقل و فہم سے کام لینے کا موقع بھی نہ دیا۔ مقربینِ بارگاہِ الہیہ کے حضور سرکشوں کے سوا کون ہے جو دم مارے؟ سمندر یا اُس جیسی کس چیز کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں سے اس طرح کی گفتگو کرے؟ لیکن جعلی ولایت کے لیے اصلی کرامتیں کہاں سے آئیں؟ اسی طرح فرضی قصے کہانیوں کو کرامت کا رنگ دے کر بھان متی کا کئیہ چوڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک فرضی قصہ تیمارداری کے سلسلے میں ملاحظہ فرمائیے:

اس رات کو اٹھائے راہ میں سید صاحب نے رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضرت بعیت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت خاتونِ جنت اور حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے آپ کی عبادت کے واسطے تشریف لائے اور ہر ایک بزرگ نے حضرت سید صاحب کے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھ کر تسلی و تشفی کی اور آپ کو بہت سی بشارتیں دیں۔

جب پانچوں حضرات کی تشریف آوری کلڑ کے گھر تک پہنچا کہ ہر ایک بزرگ نے سید صاحب کے سینے پر ہاتھ رکھا تو مطلب یہی تھا کہ حضرت خاتونِ جنت، جگر گوشتِ رسول، زہو بتول رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی سید صاحب کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا ہو گا۔ وہابی صاحبوا کیا قیامت نہیں آئے گی؟ با زپر کس بزرگی ہی پر کس کی والدہ، کس کی زوجہ مطہرہ، کس کی نختِ جگر کو پار سے میں یہ بیورو الفاظ پر و قلم کے ہیں، کیا اپنے ملاؤں کی سامری کے بچرٹ کی طرح پرستش کرنا اور بزرگوں کے ننگ و ناموس سے کھینا ہی آپ حضرات کے دین کارکنِ اعظم

لے محمد جعفر تھانیسی: حیات سید احمد شہید، ص ۱۲۶

کے ایضاً: ص ۱۰۰

اور توحید کی سند ہو کر رہ گیا ہے؛ آخر یہ کیا قیامت ہے؛

طر شرم تم کو مگر نہیں آتی

سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو وصال کے روزے رکھنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا؛ ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی۔ یعنی میں اپنے رب کے حضور رات گزارتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ بلکہ شمع رسالت نے اپنے ان بے مثل پروانوں سے فرمادیا تھا کہ؛ آیتکم مشیٰ یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے؛ صحابہ کرام تو اپنے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اُس سرکار سے مشیت کا تصور بھی نہیں لاسکتے تھے لیکن وہابیوں نے اپنے تیز صبا کو کھینچ کھینچ کر خرد و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بالمقابل کھرا کر ہی دیا، کیونکہ جب ناپختہ ہی کو نکلے تو گھونگھٹ کیسا؛ چنانچہ لکھا ہے؛

”آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا، وہ سب تہجد کی نماز کی برکت سے ہوا۔ اور تیر نے کی بھی آپ کو ایسی مشق تھی کہ آپ غوطہ مار کر تہہ دریا میں دو رکعت نفل پڑھ لیتے تھے اور بایں تن و توشش و شجاعت کے آپ کھانا بہت کم کھاتے تھے، بلکہ ایک روز آپ نے فرمایا کہ جہاں پر اہمیت سمجھو کہ میری حیات کا باعث کھانا پینا ہے بلکہ ایسا بگڑ نہیں ہے میری حیات کا سبب فقط یاد الہی ہے۔ اگر یاد الہی سے ذرا بھی غافل ہو جاؤں تو میرا دم نکل جائے“

جب سید صاحب غوطہ مار کر تہہ دریا میں دو نفل پڑھ لیا کرتے تھے تو معرکہ بالا کوٹ کے اندر دلدل میں چھلانگیں لگاتے وقت تو زمین پر دوبارہ قدم لگنے سے پہلے فضاؤں میں ہی پانچ سات نفل تو ضرور پڑھ لیا کرتے ہوں گے؛ معلوم نہیں ان خدا کے بندوں نے دین و دیانت کے ساتھ ہی عقل و دانش سے بھی کیوں دشمنی کا بیج ڈالی؛ چند روزہ زندگی کے آرام و راحت کی خاطر ایسے پراسرار ڈھونگ؛ اس پر بھی تابعین حضرات آج تک خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے اور ان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے پلاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ وہابی حضرات کی غایت کوشش یہی نظر آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ

۱۱۷  
۱۱۸  
۱۱۹  
۱۲۰  
۱۲۱  
۱۲۲  
۱۲۳  
۱۲۴  
۱۲۵  
۱۲۶  
۱۲۷  
۱۲۸  
۱۲۹  
۱۳۰  
۱۳۱  
۱۳۲  
۱۳۳  
۱۳۴  
۱۳۵  
۱۳۶  
۱۳۷  
۱۳۸  
۱۳۹  
۱۴۰  
۱۴۱  
۱۴۲  
۱۴۳  
۱۴۴  
۱۴۵  
۱۴۶  
۱۴۷  
۱۴۸  
۱۴۹  
۱۵۰  
۱۵۱  
۱۵۲  
۱۵۳  
۱۵۴  
۱۵۵  
۱۵۶  
۱۵۷  
۱۵۸  
۱۵۹  
۱۶۰  
۱۶۱  
۱۶۲  
۱۶۳  
۱۶۴  
۱۶۵  
۱۶۶  
۱۶۷  
۱۶۸  
۱۶۹  
۱۷۰  
۱۷۱  
۱۷۲  
۱۷۳  
۱۷۴  
۱۷۵  
۱۷۶  
۱۷۷  
۱۷۸  
۱۷۹  
۱۸۰  
۱۸۱  
۱۸۲  
۱۸۳  
۱۸۴  
۱۸۵  
۱۸۶  
۱۸۷  
۱۸۸  
۱۸۹  
۱۹۰  
۱۹۱  
۱۹۲  
۱۹۳  
۱۹۴  
۱۹۵  
۱۹۶  
۱۹۷  
۱۹۸  
۱۹۹  
۲۰۰  
۲۰۱  
۲۰۲  
۲۰۳  
۲۰۴  
۲۰۵  
۲۰۶  
۲۰۷  
۲۰۸  
۲۰۹  
۲۱۰  
۲۱۱  
۲۱۲  
۲۱۳  
۲۱۴  
۲۱۵  
۲۱۶  
۲۱۷  
۲۱۸  
۲۱۹  
۲۲۰  
۲۲۱  
۲۲۲  
۲۲۳  
۲۲۴  
۲۲۵  
۲۲۶  
۲۲۷  
۲۲۸  
۲۲۹  
۲۳۰  
۲۳۱  
۲۳۲  
۲۳۳  
۲۳۴  
۲۳۵  
۲۳۶  
۲۳۷  
۲۳۸  
۲۳۹  
۲۴۰  
۲۴۱  
۲۴۲  
۲۴۳  
۲۴۴  
۲۴۵  
۲۴۶  
۲۴۷  
۲۴۸  
۲۴۹  
۲۵۰  
۲۵۱  
۲۵۲  
۲۵۳  
۲۵۴  
۲۵۵  
۲۵۶  
۲۵۷  
۲۵۸  
۲۵۹  
۲۶۰  
۲۶۱  
۲۶۲  
۲۶۳  
۲۶۴  
۲۶۵  
۲۶۶  
۲۶۷  
۲۶۸  
۲۶۹  
۲۷۰  
۲۷۱  
۲۷۲  
۲۷۳  
۲۷۴  
۲۷۵  
۲۷۶  
۲۷۷  
۲۷۸  
۲۷۹  
۲۸۰  
۲۸۱  
۲۸۲  
۲۸۳  
۲۸۴  
۲۸۵  
۲۸۶  
۲۸۷  
۲۸۸  
۲۸۹  
۲۹۰  
۲۹۱  
۲۹۲  
۲۹۳  
۲۹۴  
۲۹۵  
۲۹۶  
۲۹۷  
۲۹۸  
۲۹۹  
۳۰۰  
۳۰۱  
۳۰۲  
۳۰۳  
۳۰۴  
۳۰۵  
۳۰۶  
۳۰۷  
۳۰۸  
۳۰۹  
۳۱۰  
۳۱۱  
۳۱۲  
۳۱۳  
۳۱۴  
۳۱۵  
۳۱۶  
۳۱۷  
۳۱۸  
۳۱۹  
۳۲۰  
۳۲۱  
۳۲۲  
۳۲۳  
۳۲۴  
۳۲۵  
۳۲۶  
۳۲۷  
۳۲۸  
۳۲۹  
۳۳۰  
۳۳۱  
۳۳۲  
۳۳۳  
۳۳۴  
۳۳۵  
۳۳۶  
۳۳۷  
۳۳۸  
۳۳۹  
۳۴۰  
۳۴۱  
۳۴۲  
۳۴۳  
۳۴۴  
۳۴۵  
۳۴۶  
۳۴۷  
۳۴۸  
۳۴۹  
۳۵۰  
۳۵۱  
۳۵۲  
۳۵۳  
۳۵۴  
۳۵۵  
۳۵۶  
۳۵۷  
۳۵۸  
۳۵۹  
۳۶۰  
۳۶۱  
۳۶۲  
۳۶۳  
۳۶۴  
۳۶۵  
۳۶۶  
۳۶۷  
۳۶۸  
۳۶۹  
۳۷۰  
۳۷۱  
۳۷۲  
۳۷۳  
۳۷۴  
۳۷۵  
۳۷۶  
۳۷۷  
۳۷۸  
۳۷۹  
۳۸۰  
۳۸۱  
۳۸۲  
۳۸۳  
۳۸۴  
۳۸۵  
۳۸۶  
۳۸۷  
۳۸۸  
۳۸۹  
۳۹۰  
۳۹۱  
۳۹۲  
۳۹۳  
۳۹۴  
۳۹۵  
۳۹۶  
۳۹۷  
۳۹۸  
۳۹۹  
۴۰۰  
۴۰۱  
۴۰۲  
۴۰۳  
۴۰۴  
۴۰۵  
۴۰۶  
۴۰۷  
۴۰۸  
۴۰۹  
۴۱۰  
۴۱۱  
۴۱۲  
۴۱۳  
۴۱۴  
۴۱۵  
۴۱۶  
۴۱۷  
۴۱۸  
۴۱۹  
۴۲۰  
۴۲۱  
۴۲۲  
۴۲۳  
۴۲۴  
۴۲۵  
۴۲۶  
۴۲۷  
۴۲۸  
۴۲۹  
۴۳۰  
۴۳۱  
۴۳۲  
۴۳۳  
۴۳۴  
۴۳۵  
۴۳۶  
۴۳۷  
۴۳۸  
۴۳۹  
۴۴۰  
۴۴۱  
۴۴۲  
۴۴۳  
۴۴۴  
۴۴۵  
۴۴۶  
۴۴۷  
۴۴۸  
۴۴۹  
۴۵۰  
۴۵۱  
۴۵۲  
۴۵۳  
۴۵۴  
۴۵۵  
۴۵۶  
۴۵۷  
۴۵۸  
۴۵۹  
۴۶۰  
۴۶۱  
۴۶۲  
۴۶۳  
۴۶۴  
۴۶۵  
۴۶۶  
۴۶۷  
۴۶۸  
۴۶۹  
۴۷۰  
۴۷۱  
۴۷۲  
۴۷۳  
۴۷۴  
۴۷۵  
۴۷۶  
۴۷۷  
۴۷۸  
۴۷۹  
۴۸۰  
۴۸۱  
۴۸۲  
۴۸۳  
۴۸۴  
۴۸۵  
۴۸۶  
۴۸۷  
۴۸۸  
۴۸۹  
۴۹۰  
۴۹۱  
۴۹۲  
۴۹۳  
۴۹۴  
۴۹۵  
۴۹۶  
۴۹۷  
۴۹۸  
۴۹۹  
۵۰۰  
۵۰۱  
۵۰۲  
۵۰۳  
۵۰۴  
۵۰۵  
۵۰۶  
۵۰۷  
۵۰۸  
۵۰۹  
۵۱۰  
۵۱۱  
۵۱۲  
۵۱۳  
۵۱۴  
۵۱۵  
۵۱۶  
۵۱۷  
۵۱۸  
۵۱۹  
۵۲۰  
۵۲۱  
۵۲۲  
۵۲۳  
۵۲۴  
۵۲۵  
۵۲۶  
۵۲۷  
۵۲۸  
۵۲۹  
۵۳۰  
۵۳۱  
۵۳۲  
۵۳۳  
۵۳۴  
۵۳۵  
۵۳۶  
۵۳۷  
۵۳۸  
۵۳۹  
۵۴۰  
۵۴۱  
۵۴۲  
۵۴۳  
۵۴۴  
۵۴۵  
۵۴۶  
۵۴۷  
۵۴۸  
۵۴۹  
۵۵۰  
۵۵۱  
۵۵۲  
۵۵۳  
۵۵۴  
۵۵۵  
۵۵۶  
۵۵۷  
۵۵۸  
۵۵۹  
۵۶۰  
۵۶۱  
۵۶۲  
۵۶۳  
۵۶۴  
۵۶۵  
۵۶۶  
۵۶۷  
۵۶۸  
۵۶۹  
۵۷۰  
۵۷۱  
۵۷۲  
۵۷۳  
۵۷۴  
۵۷۵  
۵۷۶  
۵۷۷  
۵۷۸  
۵۷۹  
۵۸۰  
۵۸۱  
۵۸۲  
۵۸۳  
۵۸۴  
۵۸۵  
۵۸۶  
۵۸۷  
۵۸۸  
۵۸۹  
۵۹۰  
۵۹۱  
۵۹۲  
۵۹۳  
۵۹۴  
۵۹۵  
۵۹۶  
۵۹۷  
۵۹۸  
۵۹۹  
۶۰۰  
۶۰۱  
۶۰۲  
۶۰۳  
۶۰۴  
۶۰۵  
۶۰۶  
۶۰۷  
۶۰۸  
۶۰۹  
۶۱۰  
۶۱۱  
۶۱۲  
۶۱۳  
۶۱۴  
۶۱۵  
۶۱۶  
۶۱۷  
۶۱۸  
۶۱۹  
۶۲۰  
۶۲۱  
۶۲۲  
۶۲۳  
۶۲۴  
۶۲۵  
۶۲۶  
۶۲۷  
۶۲۸  
۶۲۹  
۶۳۰  
۶۳۱  
۶۳۲  
۶۳۳  
۶۳۴  
۶۳۵  
۶۳۶  
۶۳۷  
۶۳۸  
۶۳۹  
۶۴۰  
۶۴۱  
۶۴۲  
۶۴۳  
۶۴۴  
۶۴۵  
۶۴۶  
۶۴۷  
۶۴۸  
۶۴۹  
۶۵۰  
۶۵۱  
۶۵۲  
۶۵۳  
۶۵۴  
۶۵۵  
۶۵۶  
۶۵۷  
۶۵۸  
۶۵۹  
۶۶۰  
۶۶۱  
۶۶۲  
۶۶۳  
۶۶۴  
۶۶۵  
۶۶۶  
۶۶۷  
۶۶۸  
۶۶۹  
۶۷۰  
۶۷۱  
۶۷۲  
۶۷۳  
۶۷۴  
۶۷۵  
۶۷۶  
۶۷۷  
۶۷۸  
۶۷۹  
۶۸۰  
۶۸۱  
۶۸۲  
۶۸۳  
۶۸۴  
۶۸۵  
۶۸۶  
۶۸۷  
۶۸۸  
۶۸۹  
۶۹۰  
۶۹۱  
۶۹۲  
۶۹۳  
۶۹۴  
۶۹۵  
۶۹۶  
۶۹۷  
۶۹۸  
۶۹۹  
۷۰۰  
۷۰۱  
۷۰۲  
۷۰۳  
۷۰۴  
۷۰۵  
۷۰۶  
۷۰۷  
۷۰۸  
۷۰۹  
۷۱۰  
۷۱۱  
۷۱۲  
۷۱۳  
۷۱۴  
۷۱۵  
۷۱۶  
۷۱۷  
۷۱۸  
۷۱۹  
۷۲۰  
۷۲۱  
۷۲۲  
۷۲۳  
۷۲۴  
۷۲۵  
۷۲۶  
۷۲۷  
۷۲۸  
۷۲۹  
۷۳۰  
۷۳۱  
۷۳۲  
۷۳۳  
۷۳۴  
۷۳۵  
۷۳۶  
۷۳۷  
۷۳۸  
۷۳۹  
۷۴۰  
۷۴۱  
۷۴۲  
۷۴۳  
۷۴۴  
۷۴۵  
۷۴۶  
۷۴۷  
۷۴۸  
۷۴۹  
۷۵۰  
۷۵۱  
۷۵۲  
۷۵۳  
۷۵۴  
۷۵۵  
۷۵۶  
۷۵۷  
۷۵۸  
۷۵۹  
۷۶۰  
۷۶۱  
۷۶۲  
۷۶۳  
۷۶۴  
۷۶۵  
۷۶۶  
۷۶۷  
۷۶۸  
۷۶۹  
۷۷۰  
۷۷۱  
۷۷۲  
۷۷۳  
۷۷۴  
۷۷۵  
۷۷۶  
۷۷۷  
۷۷۸  
۷۷۹  
۷۸۰  
۷۸۱  
۷۸۲  
۷۸۳  
۷۸۴  
۷۸۵  
۷۸۶  
۷۸۷  
۷۸۸  
۷۸۹  
۷۹۰  
۷۹۱  
۷۹۲  
۷۹۳  
۷۹۴  
۷۹۵  
۷۹۶  
۷۹۷  
۷۹۸  
۷۹۹  
۸۰۰  
۸۰۱  
۸۰۲  
۸۰۳  
۸۰۴  
۸۰۵  
۸۰۶  
۸۰۷  
۸۰۸  
۸۰۹  
۸۱۰  
۸۱۱  
۸۱۲  
۸۱۳  
۸۱۴  
۸۱۵  
۸۱۶  
۸۱۷  
۸۱۸  
۸۱۹  
۸۲۰  
۸۲۱  
۸۲۲  
۸۲۳  
۸۲۴  
۸۲۵  
۸۲۶  
۸۲۷  
۸۲۸  
۸۲۹  
۸۳۰  
۸۳۱  
۸۳۲  
۸۳۳  
۸۳۴  
۸۳۵  
۸۳۶  
۸۳۷  
۸۳۸  
۸۳۹  
۸۴۰  
۸۴۱  
۸۴۲  
۸۴۳  
۸۴۴  
۸۴۵  
۸۴۶  
۸۴۷  
۸۴۸  
۸۴۹  
۸۵۰  
۸۵۱  
۸۵۲  
۸۵۳  
۸۵۴  
۸۵۵  
۸۵۶  
۸۵۷  
۸۵۸  
۸۵۹  
۸۶۰  
۸۶۱  
۸۶۲  
۸۶۳  
۸۶۴  
۸۶۵  
۸۶۶  
۸۶۷  
۸۶۸  
۸۶۹  
۸۷۰  
۸۷۱  
۸۷۲  
۸۷۳  
۸۷۴  
۸۷۵  
۸۷۶  
۸۷۷  
۸۷۸  
۸۷۹  
۸۸۰  
۸۸۱  
۸۸۲  
۸۸۳  
۸۸۴  
۸۸۵  
۸۸۶  
۸۸۷  
۸۸۸  
۸۸۹  
۸۹۰  
۸۹۱  
۸۹۲  
۸۹۳  
۸۹۴  
۸۹۵  
۸۹۶  
۸۹۷  
۸۹۸  
۸۹۹  
۹۰۰  
۹۰۱  
۹۰۲  
۹۰۳  
۹۰۴  
۹۰۵  
۹۰۶  
۹۰۷  
۹۰۸  
۹۰۹  
۹۱۰  
۹۱۱  
۹۱۲  
۹۱۳  
۹۱۴  
۹۱۵  
۹۱۶  
۹۱۷  
۹۱۸  
۹۱۹  
۹۲۰  
۹۲۱  
۹۲۲  
۹۲۳  
۹۲۴  
۹۲۵  
۹۲۶  
۹۲۷  
۹۲۸  
۹۲۹  
۹۳۰  
۹۳۱  
۹۳۲  
۹۳۳  
۹۳۴  
۹۳۵  
۹۳۶  
۹۳۷  
۹۳۸  
۹۳۹  
۹۴۰  
۹۴۱  
۹۴۲  
۹۴۳  
۹۴۴  
۹۴۵  
۹۴۶  
۹۴۷  
۹۴۸  
۹۴۹  
۹۵۰  
۹۵۱  
۹۵۲  
۹۵۳  
۹۵۴  
۹۵۵  
۹۵۶  
۹۵۷  
۹۵۸  
۹۵۹  
۹۶۰  
۹۶۱  
۹۶۲  
۹۶۳  
۹۶۴  
۹۶۵  
۹۶۶  
۹۶۷  
۹۶۸  
۹۶۹  
۹۷۰  
۹۷۱  
۹۷۲  
۹۷۳  
۹۷۴  
۹۷۵  
۹۷۶  
۹۷۷  
۹۷۸  
۹۷۹  
۹۸۰  
۹۸۱  
۹۸۲  
۹۸۳  
۹۸۴  
۹۸۵  
۹۸۶  
۹۸۷  
۹۸۸  
۹۸۹  
۹۹۰  
۹۹۱  
۹۹۲  
۹۹۳  
۹۹۴  
۹۹۵  
۹۹۶  
۹۹۷  
۹۹۸  
۹۹۹  
۱۰۰۰

میر و سلم کو جو فضائل و کمالات اور خصوصیات حاصل ہیں وہ سید احمد صاحب میں ضرور دکھائی جائیں  
تاکہ آسانی سے مسلمانوں کا دل رخ اُدھر سے اُدھر پھیرا جاسکے۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی  
خدمت میں جنات حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا کرتے تھے جس پر قرآن کریم کی سورۃ جنت بھی  
شاہد ہے۔ اب سید احمد صاحب کے بارے میں وہابی علماء و مورخین کے خیالات ملاحظہ فرمائیے:

”معتبر راویوں کا بیان ہے کہ اس سفرِ لا زوالہ (مکئی از جدہ) میں بہت سے جنوں  
اور شاہ جنات کو مثل اپنے جدِ امجد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے  
ہدایت کی اور لاکھوں جن جن آپ کی بیعت سے فیضیاب ہوئے، ان

اویسے کرام کے دشمن جب اپنے پیر و مرشد کو ولی کامل بتانے پر آئے تو کسی قسم کی کمی کیوں  
بہنے دیتے، اب سید احمد صاحب سے فیضیاب ہونے والے جنات کا عالم الغیب ہونا اور  
سارے وہابیوں کا دل پر صدقِ دل سے ایمان رکھنا اور اسے سید صاحب کے کمالات میں گننا  
ملاحظہ ہو۔ مکتبے میں:

”اوپر بھی آپ (سید احمد صاحب) فرمایا کرتے تھے کہ اس جماعتِ قدسیہ  
درجال الغیب و ازواج و جنات کا دورِ حال یہ ہے کہ ہمارے مقام کے  
وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے قورٹے قاضیے پر آگئی ہے اور جب ارادہ الہی  
ہمارے کسی طرف کو چلنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اس طرف کو چلنے لگ  
جاتی ہے، تب ان کی روانگی کو دیکھ کر میں بھی خود بخود اس طرف کو چل رہا ہوں  
اور یہی وجہ تھی کہ آپ بعض جگہ بیٹوں تک ٹھہرے رہتے تھے اور پھر ایک  
پل دیتے تھے، ان

یہ سید تروانی حضرات ہی کو معلوم ہو گا کہ سید صاحب کی جماعتِ قدسیہ کو ارادہ الہی  
کس طرح معلوم ہو جاتا تھا، انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے علمِ غیب کا انکار کرنے والے

۱۔ محمد جعفر تھامیری: حیات سید احمد شہید، ص ۱۹۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۷۲

جنوں کی غیب دانی پر ایمان معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت لے آئے؛ اور اس سے ان حضرات کی ساختہ توحید کے علمبردار ہونے پر کوئی حرج تو نہیں آیا؛ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حائل اپنے سید صاحب کو دکھانے کی خاطر یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا تھا، چنانچہ اپنے اسی قلبی راز کا اظہار متعدد جگہ پر وہابی قلم کاروں نے کیا ہوا بھی ہے۔ ایک مقام پر لکھا ہے:

سید صاحب کی تعلیمات بھی مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سیدھی سادی تھیں، جن سے عالم و جاہل دونوں برابر مستفید ہوتے تھے؛

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سید صاحب مبلغ اسلام نہیں تھے بلکہ انہوں نے خود ایک مذہب وضع کیا اور اسی کی نشر و اشاعت مقصود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب کی دینی تعلیمات بھی وہابی حضرات کے نزدیک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرح سیدھی سادی تھیں۔ مسلمانوں کے فقہی لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چار مذاہب ہیں اور بلحاظ طریقت بھی چار مشہور سلسلے نقشبندی، قادری، چشتی اور سہروردی ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اہلسنت و جماعت سے علیحدہ اپنی جماعت تشکیل دی اور اُس کا نام محمدی گروہ رکھا۔ سید صاحب نے چاروں مشہور سلسلے سے الگ اپنا محمدی طریقہ وضع کیا، جس میں فرضی کرامتوں کے افسانے تو ضرور تھے لیکن تصوف سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے مسلمانوں کے چاروں فقہی مذاہب اور طریقت کے چاروں سلسلے کے بارے میں یہ تاثرات پھیلائے تھے:

یہ چاروں فقہاء کے مذاہب میں کون سا مذہب آپ کو پسند ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی مجھ کو پسند نہیں ہے اور فرمایا کہ ان میں کوئی مذہب میرے طور اور طریقے پر نہیں ہے، سب سے افراط و تفریط ہو گئی ہے۔

آپ نے عرض کیا کہ ان مشہور طریق اولیاء اللہ میں کوئی سا طریقہ حضور کے طور پر ہے؟ جناب امیر نے فرمایا کہ ان میں بھی کوئی طریقہ میرے طور پر نہیں ہے۔

لے محمد جعفر تھانیسری؛ حیات سید احمد شہید، ص ۱۷۷



ہر طریقے میں کچھ کچھ چیزیں میری مرضی کے خلاف لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں اور اس  
وجہ سے سب کے سب ہمارے طور اور طریقے سے دُور جا پڑے ہیں۔ ۱۷

یہیے صاحب! مجتہدین عظام کے فقہی مذاہب افراط و تفریط کا شکار، اکابر اولیاء اللہ  
کے چاروں سلاسل بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طور طریقے سے دُور کہ اُن میں لوگوں کی  
ایجادات شامل ہو گئیں۔ مسلمانوں کی جگہ تو محمد ہی گروہ (وہابی) مقبول بارگاہِ خداوندی ہو گیا،  
فقہی مذاہب کی جگہ خارجیت کو شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا اور طُرُقِ اکابرِ طریقہِ محمدیہ کے سامنے  
حرفِ غلط ہو گئے کیونکہ برٹش گورنمنٹ نے منصب و مقام ہی ایسا پاک صاف اور بلند و بالا  
مرحمت فرمایا تھا کہ اُس کے مقابلے پر دوسری کسی بڑی سے بڑی ہستی کا وزن ہی کچھ نہ رہا تھا؛  
بہتر ہو گا کہ سید احمد صاحب کا اس بارے میں اپنا نظریہ اور معمول بھی ملاحظہ فرمایا جائے۔

لکھا ہے:

آپ کا دستہ تھا کہ باواز بلند طریقہ حقیقتیہ اور قادریہ و نقشبندیہ و مجددیہ میں  
اول بیعت لے کر پھر طریقہِ مجددیہ میں بیعت لیتے تھے۔۔۔ اس سے معلوم  
ہوتا ہے کہ ہر چار مشہور طریقہ طریقت میں آپ کا اول بیعت لینا اور توجہ  
دینا محض بطور حکمتِ خلافت کو ترجیح کرنے کے لیے تھی ورنہ آپ کی اصل تعلیم  
اور دلی دعوت طرفِ طریقہِ مجددیہ کے تھی، جس کی سب سے آخر میں آپ بیعت  
لیتے تھے۔ ۱۸

اگر وہابی حضرات کی بارگاہوں میں ہمیں بھی اذنِ لب کشائی ہے تو ہم صرف اتنا ہی عرض  
کرنا چاہتے ہیں کہ حضرات! آپ کے امیر المؤمنین کا راج فرمودہ طریقہ تصوف بنام طریقہ  
محمدیہ آج کہاں ہے؟ کیا اس وسیع دنیا کے کسی گوشے میں اُس کا کہیں نام و نشان موجود  
ہے؟ قرآنی اور ایمانی فیصلہ تو یہی ہے کہ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل

۱۷ محمد جعفر تھانیسی، حیات سید احمد شہید، ص ۱۵۳، ۱۵۴

۱۸ ایضاً: ص ۸۷

کان ذہوقاً۔ جب حق آتا ہے تو باطل مٹ جاتا ہے کیونکہ باطل ٹٹنے کے لیے ہے۔ اگر طریقہ محمدیہ حق تھا اور مسلمانوں کے چاروں طریقے باطل تھے تو طریقہ محمدیہ کو باقی رہنا تھا اور مسلمانوں کے چاروں طرق کو مٹ جانا چاہیے تھا۔ لیکن معاملہ برعکس سامنے آیا کہ مسلمانوں کے چاروں طریقے پوری آب و تاب سے موجود ہیں لیکن طریقہ محمدیہ کاروٹے زمین سے حوت غلط کی طرح نام و نشان مٹ چکا ہے۔ وہابی حضرات ذرا تھوڑی دیر کے لیے غصے کو تھوک دین، دلوں پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ طریقہ محمدیہ کا ٹٹنا ان کے نزدیک حق کا ٹٹنا ہے یا باطل کا؟ یہ حضرات جو چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن آنا یاد رہے کہ یہی فیصلہ قبر میں بھی ان کے ساتھ کیا جائے گا، حشر و نشر میں ان کے ساتھ رہے گا اور ان کے نامہ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ اگر ہم سے پوچھنا چاہیں تو مجدد مآثرہ حاضرہ امام احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ نے اس کا قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے:

مٹ گئے، ٹٹتے ہیں، مٹ جائیں گے اعدائے

مٹنا ہے نہ مٹنے کا کبھی حشر چاقیرا

وہابی علماء و مورخین نے بتایا کہ سید احمد صاحب کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسی سیدھی سادھی، سید صاحب کے سامنے اصحاب بدر کی طرح مقبول بارگاہ خداوندی، لیکن جو حضرات اس پر اسرار برطانوی گلاڑی کو چلانے میں پھینوں کا کام دے رہے تھے، انھیں اپنے پروردگاروں کی جانب سے کیا منصب ملا تھا؟ اس بارے میں لکھا ہے:

آپ کے بڑے ساتھیوں میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی عبدالحمی صاحب ہیں۔

یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے آپ کے

خلفائے راشدین سے تھے۔ مولوی عبدالحمی صاحب کا مزاج بوجہ بردباری

اور وقار حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اور حضرت مولانا شہید کی طبیعت بوجہ آشنائے

علی الکفار و فجار حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ تر مشابہ تھی۔

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی احمد مستقیم، ص ۴

یہ حضرات تو سید احمد صاحب کے خلفائے راشدین تھے اور حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشابہ لیکن خود سید صاحب اپنی تمام تر علمی بے مائیگی یعنی ناخواندگی کے باوجود، جیسا کہ خود ان کے سوانح نگاروں نے بتایا ہے، کس کے مشابہ تھے، اس کا مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے یوں جواب دیا ہے:

از بسکہ نفس عالی حضرت ایشان بر  
کمال مشابہت جناب رسالت آب  
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در  
بد و فطرت مخلوق مشدہ بناء علیہ  
لوح فطرت ایشان از نقوش  
علوم رسمیه و راہ دانشندان کلام و  
و تحریر و تقریر مصنفی مانده بود؛<sup>۱</sup>  
چونکہ آپ کی ذات والا صفات ابتدا  
فطرت سے جناب رسالت آب  
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی  
کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی،  
اس لیے آپ کی لوح فطرت علوم  
رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشندان  
کی راہ و روش سے خالی تھی۔<sup>۲</sup>

اس ستم ظریفی کا جواب تو مل رہا ہو گا کہ سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسی  
ہونا تو معجزہ ہے لیکن عوام کا علم سے گورار ہونا کمالی نہیں بلکہ نقص ہے۔ اس نقص کو  
اُس کمال کے برابر دہرہ دینا اور دونوں کو مشابہ ٹھہرانا وہ جراتِ باغیانہ ہے جس کا ایک  
اُمتی کہلانے والا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آخر یہ ساری کارگزاری سید احمد صاحب کو منصب نبوت  
پر بٹانے کے لیے نہیں تھی تو اور کس غرض سے تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ دعویٰ  
نبوت کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی، جس کی خاطر ابھی امامت اور ہدایت کے دعوے  
بیک ہی پہنچے تھے جیسا کہ مشہور دیوبندی عالم مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۱۲ھ)  
کا بیان منقول ہے:

مولانا سندھی نے ایک دفعہ بڑے دکھ سے فرمایا، حضرت سید احمد شہید

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۴

۲۔ صراطِ مستقیم اردو، ص ۱۶

کتنے بڑے بزرگ تھے لیکن دیکھو! وہ بھی اسی دو میں بہہ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ افغان نمائندوں پر مشتمل ایک جہوری نمائندہ حکومت بناتے، وہ خود امام اور مہدی بن گئے اور اس طرح سارا معاملہ غتر بود ہو گیا۔<sup>۱</sup> یہی مولوی عبید اللہ سندھی دوسرے مقام پر سید صاحب کی مہدیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

سید صاحب جیسی خوبیوں کا آدمی ملنا مشکل ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے امام و مہدی بننے سے اتنی اچھی تحریک کس طرح تباہ ہوئی۔<sup>۲</sup>

جامعہ تیسرا اسلام آباد دہلی کے سابق استاد جناب محمد سرور صاحب نے سید احمد صاحب کی امامت و مہدیت کے دعاوی اور ان کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اپنے تاثرات کو ان لفظوں میں قلمبند کیا ہے:

”مولانا کے نزدیک سید احمد شہید کی جماعت نے سرحد میں جو شکل اختیار کی وہ نشانے حقیقی کے خلاف تھی۔ ان کی حکومت موقتہ (یعنی عارضی اور -PROVISI-ONAL) تھی۔ اصل مرکز دہلی تھا۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ سید صاحب نے امامت اور مہدیت کے دعوے کو دیکھ کر اس سے خواہ مخواہ سرحد کے امراء و خوانین میں بد مزگی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف امامت اور مہدیت کے بعد جماعتی فیصلوں کی اہمیت نہ رہی۔ اس سے عوام پٹھان بھی بگڑ گئے نتیجہ یہ نکلا کہ سید صاحب شہید ہو گئے۔ طبعاً مہدی اور امام کی شہادت سے ان کے قبیحین کے دل ٹوٹ گئے اور ان سے منتسب تحریک، اہلحدیثت رفع یدین تک محدود ہو کر رہ گئی۔“<sup>۳</sup>

سید احمد صاحب کی مہدیت تو بالاکوٹ میں دفن ہو گئی یا بقول ان کے قبیحین غائب ہو گئی لیکن یہی بڑا دعویٰ مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے راستہ صاف کر گیا۔ اس سے معلوم

<sup>۱</sup> محمد سرور: افادات و طفوفات سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اول، ۱۹۰۲ء، ص ۱۶۶

<sup>۲</sup>، ۳ ایضاً: ص ۳۴۹

ہوتا ہے کہ مرزا غلام احمد والے جلد مراحل سید احمد صاحب ہی نے طے کرنے ہوں گے لیکن  
 بخت نے یاوری نہ کی اور موت نے مہلت نہ دی جس کے باعث لعنت کا اتنا بڑا طوق مرزائے  
 قادیان کو زیب گلو کرنا پڑا۔ سندھی صاحب نے خود فرمایا تھا:

اس قسم کے روایاتی ماحول اور امام مہدی کے انتظار کی فضا میں مرزا غلام احمد  
 نے مہدی کے آنے اور نزولِ مسیح کے عقیدے پر بحث کی۔ اب بجائے اس کے  
 کہ وہ سرسید کی طرح ان روایات کو موضوع قرار دیتے، جیسی کہ وہ ہیں، وہ خود  
 مہدی اور مسیح بن گئے اور اس طرح ایک لغویت کی جگہ دوسری لغویت پیدا ہو گئی۔

جو لغویت بالاکوٹ میں دفن ہو جانے کے باوجود پشش گورنمنٹ نے پھر قادیان سے پیدا  
 کر دکھائی تھی، اس خشتِ اول کے بارے میں سید احمد صاحب کے ایک عاشقِ زار یعنی  
 پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب ندوی اور ہندی وہابیت کا نقطہ اختلاف  
 بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرہٴ تشبیہ ایک مرتبے پر مہدوی تحریک سے  
 اس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے تصور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے  
 کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اس کے بعد سید احمد صاحب نے راجستھان کی

مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل میں بھی رونما ہوا۔

سید احمد صاحب کی اس تحریکِ مہدویت کے بارے میں اسی نام نہاد جماعتِ مجاہدین کے  
 ایک سرگرم کارکن اور مشہور غیر مقلد عالمِ علم لونی عیالیت احمد انٹری وٹریر آبادی نے لیکچر عجیب و غریب  
 انکشاف کیا ہے۔ قارئینِ کرام ذرا انصاف کی رُو سے حالات کی تہ میں جھانکنے اور حقیقت  
 تک پہنچنے کی سعی فرمائیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

ادائل میں ایک دفعہ میں نے سید احمد صاحب کو شہید بتایا تو آپ

لے محمد سرور: افادات و ملفوظاتِ سندھی، ص ۳۵۱

لے محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی، ص ۵۷

(مولوی فضل الہی صاحب) سخت ناراض ہوئے اور مجھے دھکا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور فرمایا کہ وہ زندہ اور غائب ہیں، عنقریب ظاہر ہوں گے۔ نیز آپ نے اُس جماعت کا شایع کردہ رسالہ بنام خلاصہ مجھے دکھایا، جس میں یہ حدیث تھی:

اذ مضت الف ومائتان واربعون سنة بعث الله المهدي فيبايع على يده خلق كثير ثم يعيد به الله تعالى فترتدون الى دين اباؤهم الا من اتبع كتاب الله وسنة بيته۔ مگر یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں بھی نہیں بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے، یہ روایت اُس میں بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے اور ایک روایت یوں بھی بیان کی ہے:

فيقاتل كفرة لاهور۔ اور اس قسم کے بے سرو پا حکایات وقتے سوانح احمدی (جو کراچی سے حیات سید احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے) میں بھی درج ہیں، مگر تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحب مرکز چمر قند سے اپنے وطن میں واپس تشریف لاتے تو میرے روبرو کئی بار آپ نے سید صاحب کو شہید بتایا اور میری مارمفت میں ٹھہری۔ اچھا خیر استادوں کی مار بھی دراصل پیار اور عمر سدا رہے!

مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی صاحب کے پیش کردہ مذکورہ حوالے اور اُس میں درج شدہ دونوں جعلی و وضعی روایات سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب نے اپنے مہدی ہونے کا بڑی شد و مد سے دعویٰ کر رکھا تھا۔ جو اُن کی تحریک کوناکامی کے گڑھے میں پھینکنے کا باعث بنی۔ اس کے ساتھ ہی جس قسم کی کرامتوں اور الہاموں کی تشہیر کی گئی، جن کا حقیقت سے قطعاً کوئی رابطہ ثابت نہیں ہوتا نیز وحی و عصمت کے جو دعاوی کیے گئے اُن سے صاف ظاہر یہی ہوتا ہے کہ موصوف کی منزل مقصود وہی تھی جہاں مرزا غلام احمد قادیانی

نے پہنچ کر دم لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب کی عمر نے ساتھ نہ دیا اور وہ اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف بصدِ حسرت و یاس یہ کہتے ہوئے سدھار گئے ہوں گے: ۵

قسمت تو دیکھیے کہاں پہ ٹوٹی ہے کسند

دوچار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

قاریبینِ کرام نے سید احمد صاحب کے کشف و کرامت سے متعلقہ کتنے ہی واقعات پڑھے، ان کی وحی و عصمت کے بارے میں بیانات ملاحظہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہابی حضرات پر ہمارے تاثرات شاق گزریں اور ان کی طبع نازک ہمارے بے لاگ اور خیر خواہانہ تبصرے کی تحمل نہ ہو سکے تو ہم مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سوانح نگار اور میدانِ ولایت کے شہسوار جناب مرزا حیرت دہلوی کے تاثرات پیش کر دیتے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے:

چند سوانح نویسوں نے افسوس ہے کہ سید صاحب کی وہ باتیں بیان کی ہیں جن سے

ان کی اصلہ شان بھی مٹ گئی۔ ان کے سوانح کا دیکھنے والا کبھی کسی انسان صفت

پر خیال نہیں جاسکتا۔ کہیں تو اس پارسائیک مرد کو تعویذ مانگتی بنا دیا ہے کہیں

اس کی تمام حرکات و سکنات کو مافوق الفطرت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کہیں ان

میں وہ قوت بخشی گئی ہے جو ایک دیوی میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کہیں ان کے بول سے

ایک عظیم الشان کھیت کو جلایا گیا ہے۔ کہیں ان کے لیے آسمانوں سے طوف

کا طباق اتر دیا گیا ہے۔ کہیں میلہ ہنرد میں لے جا کے انہیں بیوش کیا گیا ہے۔

اگر خود سوانح نویس خیال کر لیتے اور دین اسلام کے واجب الاعتسام بانی کے

انہیں سوانح عمری یاد ہوتے تو وہ کبھی ایسی مضحکہ خیز اور طفلانہ باتیں اس

بزرگ سید پر عاید کر کے اس کی اصلی ذاتی لیاقت اور اصلی جوہر کو نہ مٹا دیتے۔

موصوف نے اس ستم ظریفی کے پیش نظر سید صاحب کے سوانح نگاروں اور ان کے تحریر کردہ حالات و واقعات پر یقین رکھنے والوں کے غیروں کو دوسری مرتبہ یوں جھنجھوڑا ہے:

۱۔ مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۱، ۳۵۲

”میں کہتا ہوں کہ سید احمد صاحب کے سوانح عمری میں صرف اُن مذکورۃ المصادر  
باتوں کا تذکرہ ہو جن سے نبی آخر الزماں کی ذاتِ مقدس بہت مستعبد تھی، تو  
پڑھنے والا سید احمد صاحب کو کیسا سمجھے؟ کیا خیال کرے؟ آیا انہیں قطب  
سمجھے، غوث جانے یا نبی کہے؟“ ل

اگے موصوف مرزا نے مذکورہ واقعات کے بارے میں اپنی واضح رائے یوں ظاہر فرمائی ہے:  
”اُن کے سوانح نویسوں اور بعض ساوہ لوح ساتھیوں نے ناحق بزرگ سید کی ذات  
پر یہ گھڑی ہوئی باتیں عائد کیں اور بے فائدہ اپنی تراشی ہوئی گتیں اُس کے  
سر چسپیں۔“ ل

جہاں تک سید احمد صاحب کی بزرگی کے واقعات کے بارے میں بیانات کا گھڑی ہوئی باتیں  
اور گتیں ہونے کا تعلق ہے تو مرزا حیرت دہلوی کی اس رائے سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں لیکن  
اسے سوانح نویسوں اور ساوہ لوح ساتھیوں کے سر توپنا کسی مرحلے پر بھی حقیقت قرار نہیں  
پاسکتا کیونکہ اول سے آخر تک یہ ساری کاغذ لابی خود سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی  
نے سرانجام دی۔ سید صاحب کے مکتوبات اور صحرا طہ مستقیم کتاب اس بات پر شاہد ہیں، جن  
سے کتنے ہی بیانات اور اقتباسات پیچھے مذکور ہوئے اور بعض عبارتیں آگے ملاحظہ فرمائی  
جاسکتی ہیں۔ سوانح نگاروں نے تو کبیر کے فقیر بن کر کتھی پر کتھی ماری ہے اور برٹش گورنمنٹ کی  
تیار کردہ سازش کو کاسیابی سے ہمکنار کر دیا ہے اور حضرات کا اٹنا ہاتھ بٹایا ہے کہ سازش کو  
مٹنے اور ظاہر نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ اُس کی سرپرستی کا بار گراں مرزا غلام احمد قادیانی نے  
اٹھایا۔ امید ہے کہ وہابی حضرات ہماری حق گوئی سے نادمین ہوتے وقت مرزا حیرت دہلوی  
جیسے حضرات کا خیال ضرور دکھائیں گے۔

یوں نظر دوڑنے پر برچی تمان کہ

اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

لے مرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ، ص ۲۵۲

لے ایضاً، ص ۲۵۳



سید احمد صاحب اور ان کے دستِ راست یعنی مولوی محمد اسمعیل دہلوی  
 مسئلہ غیبوبیت جب بالاکوٹ میں کھیت رہے۔ وحی و عصمت کے تمام دعوے  
 جھوٹے ثابت گئے۔ پیشگوئیاں فراڈ ثابت ہو کر رہیں تو موصوف کے خلفانے یہ شوشہ  
 چھوڑ دیا کہ ہمارے امیر المؤمنین مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ سلامت ہیں اور انھیں اب اللہ تعالیٰ کی  
 طرف سے غائب رہنے کا حکم ملا ہے۔ کبھی مناسب وقت پر دوبارہ تشریف فرما ہو کر اپنے  
 کیے ہوئے وعدوں، سنائے ہوئے الہاموں کو سچا ثابت کر کے دکھائیں گے۔ غرضیکہ اسی  
 طرح جھوٹ بولتے اور دنیا کو بہکاتے ہوئے قریباً ڈیڑھ صدی گزرنے والی ہے لیکن وہابی حضرات  
 ہیں کہ اپنے اکابر کی روغلوئی کا سیدھی طرح اعتراف کرنے کی جانب آتے ہی نہیں۔ بہر حال  
 غیبوبیت کے بارے میں محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

”میدان صاف کرنے کے بعد سید صاحب مثل شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے  
 تھے کہ ایک بیک آپ نظروں سے غائب ہو گئے۔ مولوی جعفر علی نقوی جو آپ کا  
 باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا لکھتا ہے کہ جناب حضرت  
 امیر المؤمنین درجہ جماعت لاند نظر میں غائب شدند۔ یہ واقعہ جگر سوزیم ہذا بعد  
 ۶/۱۲/۱۹۰۶ء کو واقع ہوا۔ اس وقت آپ نے کھٹا غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے

لشکرِ اسلام میں بل پل سی پچ گئی۔“

اس واقعہ کے ساٹھ سال بعد تک لوگوں کی رائے غیبوبیت کے بارے میں کیا رہی اور اس  
 سلسلے میں بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری جنہوں نے وہابی حضرات کی دوا کا تذکرہ کر دیا ہے،  
 ”ایسی جی بہت سی دوائیاں ہیں کہ اس واقعہ بالاکوٹ کے بعد متعدد لوگوں  
 نے سید صاحب اور ان کے رفیقوں کو دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ  
 کی شہادت اور غیبوبیت میں روزِ اول سے اختلاف ہے، مگر اب ساٹھ  
 برس سے بھی زیادہ زمانہ گزر جانے کے بعد خیالِ غیبوبیت خود بخود لوگوں کے

۱۰ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۸۸

دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے۔ سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ، جن سے معرکہ بالاکوٹ سے سید صاحب نے اپنی غیوبیت کی پیشگوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اقرباء اور اہل تافلہ آپ کی غیوبیت کے قائل تھے۔

موصوف کا یہ بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ جو جعفر علی نقوی غیوبیت کے ڈھنڈورچی تھے اور سید صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے تھے، وہی از نظر من غائب شدند کہنے والے کا بیان یہاں برعکس ہے۔ علاوہ بریں اس عبارت میں سید صاحب کے دو ساتھیوں کا غائب ہونا بھی دکھایا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے:

”مولوی جعفر علی نقوی یہ بھی بکھتے ہیں کہ بعد میں لوگوں کی زبانی اس امر کی تصدیق ہوئی ہے کہ سید احمد صاحب کی ٹانگ پر ایک گولی کا زخم بھی لگاتھا۔ اس زخم کے لگنے کے بعد آپ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے رو قبیلہ دعانانگ رہے تھے کہ اسی پتھر سے غائب ہو گئے۔“

یہ بھی اسی مولف کا بیان ہے کہ موضع شمالی میں پہنچ کر ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سید صاحب موضع مٹی کوٹ میں (جو گجروں کا گاؤں میدان جنگ بالاکوٹ سے ملا ہوا تھا) گجروں کے گھر میں زندہ موجود ہیں اور اس پتھر پر سے جہاں آپ دعانانگ رہے تھے، گجروں کو آپ کو اٹھا کر اپنے گاؤں میں لے گئے تھے اور بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مولوی نظام الدین حقیقی کاندھلوی جو بخارا اور کشمیر اور کافغان کے سفیر ہو کر گئے تھے اور مولوی عبدالنہ صاحب دولوی شخص میدان جنگ سے سید صاحب کے ساتھ ہی غائب ہو کر آپ کے رفیق غیوبیت ہو گئے۔

مولوی جعفر علی نقوی پلا شہادت کو غلبہ دیتے ہیں۔

اب اسی غیوبیت کے طلسم کی کہانی مشہور و بابی مؤرخ اور سید صاحب کے سوانح نگار،

۱۔ محمد جعفر تھامیری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۹۰

۲۔ ایضاً: ۲۸۹

غلام رسول مہر (المتوفی ۱۳۹۱ھ / ۱۹۱۱ء) کی زبانی سننے کہ وہ وہابی علماء و مورخین کے فراڈ کاروں کا کس طرح روتے ہیں، انہوں نے لکھا ہے:

سید صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے ان کی غیبت کا مسئلہ کھڑا دیا اور مدت تک اس عقیدے کی اشاعت پورے اہتمام سے جاری رکھی۔ عوام کے ایسے معتقدات بحث و نظر کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ کسی واقعے کے قبول و پذیرائی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے، جب تک اسے باعتبار وقت مروجہ اصول و ہنار سے صریح منحرف نہ پائیں۔ لیکن حیرت ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خلفائے بھی اسے قبول کیا۔ نہ محض قبول کیا بلکہ اسے مدت تک دعوت اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔

سید صاحب کے تربیت یافتہ اور ان کے خاص متوسلین کی غیبت کے بارے میں جھوٹی شہادتیں، عوام الناس کو چھلنے اور پیٹ پرستی کی خاطر جھوٹے بیانات جناب غلام رسول مہر کی زبانی سن لیجیے:

”سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے مثلاً بھنگول کے اخوند محمد ارم، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، مولوی خیر الدین شیر کوئی اور مولوی محمد قاسم پالی تہی چند افراد کے ہمراہ اسی بناء پر بھنگول میں ٹھہر گئے کہ انہیں سید صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔“

اب سید صاحب کے ان خلفاء کا نظریہ ملاحظہ فرمائیے جو صادق پوری تھے اور جنہوں نے سید صاحب کی اس نام نہاد تحریک جہاد کو پیٹ پرستی کا جھوٹے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر کاروبار بنایا تھا۔ جناب غلام رسول مہر نے آپ کے خلفاء کی کتاب رسائل السنہ کے صفحہ ۶۶،

۶۷ کے حوالے سے مولوی ولایت علی خلیفہ سید احمد صاحب کا بیان بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ  
مہر صاحب نے بڑے تعجب کے ساتھ لکھا ہے:

حد درجہ تعجب اس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقہ خاص میں سے اہل صادق پور  
نے عقیدہ غیبت کو پورے کاروبار جہاد کا مدار و محور بنایا۔ مولانا ولایت علی مرحوم نے  
دعوت کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ بالاکوٹ میں  
شکست اس لیے ہوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا میل جننے نہ پائے۔  
شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو چٹہ گزاری اور دعا و زاری کے لیے پہاڑوں  
پر بلایا۔ پچ ہے خلوت بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت یونس مچھلی کے  
پیٹ میں رہے، حضرت موسیٰ کوہ طور پر، حضرت عیسیٰ کو آسمانوں پر اٹھایا۔ ہمارے  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی روز غار ثور میں چھپایا۔ سید صاحب کی شہادت  
کی خیر شیطان نے جھوٹی مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ (سید صاحب) بھی تو اُن  
لوگوں (انبیائے کرام) کے پیرو ہیں۔ اُن کی سنتوں سے کیونکر محروم رہیں...  
اور ہمارے حضرت (سید صاحب) کی خلوت کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ  
سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں اُن کے عرصہ بعید گزرے گا۔  
یہاں تو اکثر لوگ جب پابتے ہیں تھوڑی سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے  
مشرف ہو جاتے ہیں اور انشاء اللہ عرصہ قریب میں مثل نور شہید درختاں کے  
ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوار ہدایت سے منور فرمائیں گے؛ لے

جناب غلام رسول مہر کی زبانی اس کذب و افتراء کی کہانی کے بارے میں مزید سنیں۔ وہ لکھتے ہیں:  
سید صاحب کی جماعت کو اراکین دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں  
انبالہ میں چلا تھا، جسے انگریزوں کی اصطلاح میں وباہیوں کا بڑا مقدمہ کہا جاتا ہے  
اس میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی جعفر

سید احمد شہید، ص ۸۱۳

تھانیسری اور بعض دوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اس مقدمے میں کئی اصحاب نے گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے، انھیں باقاعدہ تلقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے، وہ امام وقت ہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے مقام ظہور (یعنی سرحد) پر پہنچ جائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحب تواریخ عجیبہ بھی سید صاحب کو زندہ مانتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ دو مرتبہ زیارت جہانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور حضرت کے زندہ ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب سے دس باتیں سنی تھیں، نو پوری ہو چکی ہیں، ایک باقی ہے یعنی غیبت کے بعد ظہور۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری، غلام رسول مہر اور غیبیت کے دوسرے قائلین، جن کے بیانات پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی نامور عالم دین نہیں، ہاں بعض حضرات کو ان کے حلقوں میں اُونچے پائے کا تار بیخ دان شمار کیا جاتا ہے اب ہم وہابی علماء کے بیانات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی اور ان کے استاد مولوی فضل الہی صاحب کے بیانات گزر چکے۔ مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم مولوی عاشق الہی میرٹھی لکھتے ہیں:

جب لاشیں سنبھالی گئیں تو سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کا پتہ نہ لگا۔ لوگ تلاش میں نکلے اور ادھر ادھر جستجو کرنے لگے۔ چند چند آدمی مختلف دیہات اور پہاڑوں میں جا کر ڈھونڈا کرتے تھے اور کسی کو نہ ملے تھے۔ گاؤں میں برابر پتہ چلتا جاتا تھا کہ یہاں تھے، وہاں تھے۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ مجھے سخت بخار تھا۔ اسی حالت میں میں نے تینوں شخصوں، باتے دیکھا، جن میں ایک سید صاحب تھے۔ میں نے غل مچایا کہ حضرت آپ ہم کو کہاں چھوڑ گئے اور کیوں ہم

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۸۱۴

علیہ ہو گئے؛ سب لوگ آپ کے روبرو ہیں۔ میرے غل چانے پر حضرت سید صاحب نے منہ پھیر کر مجھے دیکھا، کچھ جواب نہ دیا اور چلے گئے۔ میں بوجہ سخت بیماری کے اٹھ نہ سکا، غل چمایا کیا۔

دوسرے شخص نے بیان کیا کہ ہم اُنہیں دنوں سید صاحب کو ایک پہاڑ میں تلاش کر رہے تھے۔ دفعتاً کچھ فاصلے پر گڑ بڑاٹ سنا۔ میں وہاں گیا تو دیکھوں کیا سید صاحب اور اُن کے دو ہمراہی بیٹھے ہیں۔ میں نے سلام و مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت کیوں غائب ہو گئے؛ سب لوگ بغیر آپ کے پریشان ہیں۔ مجبور ہو کر ہم نے فلاں شخص کو اپنا خلیفہ بنا لیا ہے اور اُن سے بیعت کی ہے۔ آپ نے اس پر تحسین کی اور فرمایا: ہم کو اب غائب رہنے کا حکم ہوا ہے، اس لیے ہم نہیں آسکتے۔ اتنا فرما کر قافلہ والوں کی خیریت اور حالات پوچھے اور پھر روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی ہمراہ ہونے کے لیے عرض کیا تو منع فرمایا اور پھر کوشش کر کے جو میں نے پیچھے چلنا چاہا تو میرے ہاتھ پاؤں وزنی ہو گئے۔ میں تو کھڑا کھڑا رہ گیا۔ حیران اور بے یاس تھا کہ یا اللہ! کیسے چلوں؟ اور حضرت سید صاحب مع ہمراہیوں کے نظر سے غائب ہو گئے۔

تیسرے ایک اور شخص نے بیان کیا کہ سید صاحب کو ڈھونڈتے ہم ایک گاؤں میں ایک بگڑا ترے، وہاں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ قبر جو طبعی ہوتی تازہ پڑی ہے، اس کو سید صاحب ابھی ڈھوا کر گئے ہیں، کیوں کہ اونچی تھی۔ ادھر ادھر دیکھا تو کہیں پتہ نہ لگا۔

فشی محمد ابراہیم صاحب نے کہا کہ سید صاحب تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے تھے اور اب ۳۱۸ھ میں ممکن ہے کہ حیات ہوں۔ انہوں نے جب لفظ ممکن کہا تو حضرت امام ربانی (یعنی مولوی رشید احمد گنگوہی) نے ارشاد فرمایا، بلکہ ممکن اور فرمایا کہ سید صاحب انبیٹھ میں بھی تشریف لائے، یہ

لے عاشق الہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۲۶۰، ۲۶۱

پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ اور سید احمد صاحب کے عاشق زار جناب ڈاکٹر قیام الدین احمد نے  
مسئلہ غیبت پر عجیب فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات پیش کر کے صورت حال کو غتر بود کرنے کی  
حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن اتنے عظیم فراڈ کے باعث وہاں بیان ہند کے مسقف پر جو کلنگ کا  
ٹیکہ لگا ہوا ہے اسے صحیح ثابت کرنے کے راستے مسدود پا کر اظہار برأت کی توفیق بھی نہیں پائی۔  
چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

سب سے آخر میں اُن (سید صاحب) کو ایک گھمسان دست بدست موکر میں  
لڑتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئے کسی نے اُن کو گرتے ہوئے اپنی  
آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہابیوں کے ایک طبقے میں یہ خیال پکڑ لگاتا رہا  
کہ سید احمد شہید نہیں غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے۔  
منطق اور عقل کی روشنی میں سید احمد قطعاً اسی جگہ میں شہید ہو گئے مگر بالاکوٹ  
کے باقی ماندہ لوگ اُن کے بہت سے رفقاء و قبعین کے لیے یہ ناگمانی  
شہید ضرب ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے ایک مقصد عالی کے حصول کے لیے  
اپنی تمام مادی اٹلاک قربان کر دی تھی اور سید احمدؒ کے ساتھ ناقابل قیاس دُکھ  
بھیلتے، لیکن اب قسمت کی ہوشربا ناگمانی گشتگی سے سب میٹ رہا تھا۔  
غیبت کے نظریے کا پس منظر یہی ہے۔ حاصل یہ ایک ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اُن  
کے مادی حرکات و سکنات کے منظر سے اُن کے مجاہد سردار و رہنما کے یکسای  
اُٹھ جانے اور مر جانے پر یقین کرنا اُن کے لیے دُشوار تھا۔ یہ نظریہ اُن کے اس  
راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سید احمدؒ جیسا فی طور پر فنا ہو گئے ہوں  
تو ہو گئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔ اے

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب کو کم از کم اب تو یقین ہو چکا ہو گا کہ سید احمد صاحب کا مشن اب  
مکمل طور پر فنا ہو چکا اور اُس کا ثانیہ ہمک باقی نہیں رہا۔ رہا یہ کہ نظریہ غیبت کون سے راسخ

عقیدے کا سایہ ہے، اس حقیقت کے چہرے پر وہابی علماء و مورخین نے جتنے بھی تہہ بر تہہ پرے ڈالے ہوئے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اسی عنوان کے تحت آئندہ سطور میں ہم نے ان تمام پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کا دوسرا فلسفہ ملاحظہ ہو:

”ہٹلر اور سبجاش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ ان کی موتیں بھی پردہ راز میں مخفی تھیں۔ اول الذکر کی موت کے متعلق حکومت ہند کی مسلسل تحقیقات کے باوجود ان دونوں لیڈروں کے ہم وطنوں کے ایک طبقے میں ان کی زندگی کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لیے ایسی محکم و قناداری و جانثاری ہو سکتی ہے تو ایسے شخص کے لیے جو صرف سیاسی لیڈر نہیں بلکہ حسانت و خیرات کا کامل نمونہ تھا، اُس کے قبضے میں جو گرجوشی اور سرشاری محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہوگی، قیاس کی جا سکتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کے حکم سے قیاس تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن سید صاحب کی پیگمٹیاں کدھر جائیں گی؟ غیبت کے بعد جو سید صاحب کے خلفاء اور تبعین ان سے ملاقات و گفتگو کرنے کے دعوے فرماتے رہے کیا ایسے بیانات کو محبت و عقیدت ہی پر قیاس کیا جائے یا ایسی باتوں کا دروغ گوئی اور جلسازی سے بھی کوئی رشتہ ناطہ ہے؟ شیعہ حضرات کا اپنے امام مہدی کو غائب ماننا اور وہابی حضرات کا سید احمد صاحب کو مہدی بنانا اور غائب ماننا، کیا دونوں جماعتوں کا یہ نظریہ درست ہے؟ اگر ایک جماعت کا بوجہ محبت و عقیدت ہے تو کیا دوسری جماعت کا بوجہ بغض و عداوت ہے؟ اگر دونوں جگہ ایک ہی جذبہ کار فرما ہے تو دونوں کا حکم مختلف کیوں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے:

”صاوقپور کے ارکان خاندان خصوصاً ولایت علی پر انگریز اور ہندوستانی مصنفین نے سید احمد کے ظہور ثانی عقیدہ کی اشاعت پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ ان پر اس عقیدے کی اشاعت میں دانستہ بے ایمانی کا الزام عاید کیا گیا ہے کہ ولایت علی نے اس مقصد سے یہ قدم اٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو پھر اُبھارا



جاسکے اور اس جدوجہد میں اپنی سرکاری بحال رکھی جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ عقیدہ ایک وقتی ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اس پر سختی سے نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کی خدمت جو ولایت علی اور ان کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی ٹھوس تھیں کہ اتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔

پہلے وہابی حضرات کے اس عقیدے پر ہم بھی سختی سے نظر نہیں کرتے اور یہی باور کر لیتے ہیں کہ تحریک اس عقیدے کا فائدہ کمزور اور موہوم تھا، لیکن وہابی حضرات ٹھنڈے دل و دماغ سے کبھی یہ بتانے کی زحمت بھی گوارا فرمائیں گے کہ رسالے تسمیر میں جو مولوی ولایت علی صاحب کا رسالہ بنام دعوت شامل ہے، اس رسالے میں مولوی ولایت علی صاحب نے سید صاحب کی مہبتِ غیرت اور ظہور ثانی وغیرہ کے متعلق جو دو حدیثیں اپنے دماغ سے گھڑ کر شامل رسالہ کی ہوئی ہیں، آخر اس جھلسازی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی، اگر یہ وضاحت بھی فرمادی جائے کہ حدیثیں گھڑنے والے کو شریعتِ مطہرہ کس نظر سے دیکھتی ہے، تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہر کسی کے لیے انتہائی آسان ہو جائے۔ کیا وہابی علماء ہماری درخواست پر اتنی سی تکلیف اٹھالیں گے؟

مولوی وین میں کہہ جیاگ خدا لگتی کچھ

دعویٰ لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

آئیے ہم بتاتے ہیں کہ سید احمد صاحب کے خلفاء اور قبیحین کو ان کی غیبت اور ظہور ثانی کا عقیدہ کیوں اختیار کرنا پڑا، اس سلسلے میں ہم اپنی جانب سے کچھ کہیں، اس سے پہلے سید احمد صاحب کے چند ذاتی بیانات پیش کرنے مناسب ہیں تاکہ فیصلہ قارئین خود کر سکیں۔ چنانچہ سید صاحب نے عازمِ سرحد ہوتے وقت ایک سریشگوئی فرمائی تھی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

لے محمد مسلم عظیم آبادی: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۱۱۱

سید محمد یعقوب آپ کے بہانے سے روایت ہے کہ بروقت روانگی خراسان آپ اپنی ہمشیر یعنی والدہ سیدہ محمدیہ سے زینت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اسے میری بہن میں سے موندنا سے پرہیز کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہندو کا شرک اور ایران کا رقص اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا، تو تم اس کے قول پر برگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے بے بنی مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔ آپ کے سفر جہاد سے پہلے لٹا ہوا سفر جہاد میں، آپ کو یہ الہام ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندوستان کے رشک افزے چین ہو جائے گا، پنا نچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر ایک مرید واقف تھا۔

جلد وہابی حضرات اور قادیان میں حضرات سے گزارش ہے کہ خوفِ خدا اللہ خطرہ روز جزا کو سامنے رکھ کر، قَطُّوا هُمْ اِنَّهُمْ مَسْتُوْنُوْنَ کے جگر رزادینے والے منظر کو سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ سید صاحب نے ہندو کا شرک، ایران کا رقص، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق اپنی زندگی میں منادیا تھا، کیا ہر مردہ سنت اُن کے ہاتھوں زندہ ہو گئی تھی؟ کیا واقعی انہوں نے اپنے نشر کردہ الہام کے مطابق پشاور سے ستلج تک پنجاب کو فتح کر لیا تھا؟ اگر ان میں سے جیسا کہ ظاہر ہے، سید صاحب کوئی ایک کام بھی ہو کر سکے تو خود فیصلہ فرمائیے کہ موصوف کے یہ جملہ دعویٰ اور الہامات ربانی تھے یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ جملہ الہامات محض شیطانی تھے؟ کیا برٹش گورنمنٹ کی ہدایت پر کمال رازداری سے الہام کا لیبیل تو نہیں لگایا جاتا تھا؟ را اور نظر غائر سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی فرمایا کہ سید صاحب کا پشاور سے ستلج

محمد جعفر تھانی سیری: حیات سید احمد شہید، ص ۱۰۱، ۱۰۲

ہمک پنجاب کو فتح کرنے کا مقصد اس علاقے کو بھی اسی قسم کا رشک افزا سچن بنانا تھا، جیسا کہ ہندوستان برٹش گورنمنٹ کی غلامی سے بن چکا تھا۔ اس بیان کی روشنی میں ذرا یہ سمجھنے اور سمجھانے کی سعی زمانی جاتے کر سید صاحب اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے یا ان کی ساری ہمہ و دو انگریزی راج کی حدود کو وسیع کرنا تھا؟ اس امر کا فیصلہ کرتے وقت اگر محمد جعفر تھانیسری کے درج ذیل بیان کو بھی پیش نظر رکھا جاتے تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا بڑی حد تک آسان ہو جائے گا۔ موصوف نے ان الہامات کی تاویل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

”بملاحظہ مکتوبات احمدی، جن میں سید صاحب کا اصل مافی الضمیر بڑی مراحت کے ساتھ بیسیوں مختلف واقعات پر ظاہر کیا گیا ہے اور اکثر مکتوبات کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ وعدہ فتح پنجاب کے الہام کا آپ کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اس کو سر اسر صادق اور جس نے والی بات سمجھ کر بار بار فرمایا کرتے تھے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں دو سونہ شیطانی اور شائبہ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب فرودینے بلکہ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت دے آئے گی۔“

لیکن واقعہ بالاکوٹ خوار شہادت ہو خواہ غیبی بیت، بظاہر اس یقینی الہام کے سر اسر خلافت ہو یا یہ اس کا جواب یہی ہے کہ از روئے اصول شریعت محمدی کے الہام ایک نئی چیز ہے اور اس کی تاویلوں وغیرہ میں سو طرح کی غلطیاں کا گمان ہوتا ہے، تو ضرور ہوا کہ اس وقوعہ کے پندرہ برس بعد سلطنت پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور للذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی کہ جس کو ہم مسلمان اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی، جو ظہور میں آئی۔“

لے محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۹۱

قارئین کرام نے تھانیسری صاحب کی تاویل تو ملاحظہ فرمائی اب فیصلہ کرنا باقی ہے کہ سید صاحب کا مقصد اس تحریک جہاد سے برٹش گورنمنٹ کی حدود کو وسیع کرنا ہی تھا یا کچھ اور؟ نیز ان کے الہامات ربانی تھے یا شیطانی؟ یہ فیصلے ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑ کر اس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ جعفر تھانیسری صاحب نے بتایا ہے کہ فتح پنجاب کے الہام کا تذکرہ سید صاحب نے اپنے مکتوبات میں سبیل سے زیادہ مقامات پر تصریحاً کیا ہے۔ ہم اتنے تو نہیں ہاں چند مقامات کی نشان دہی کر دیتے ہیں تاکہ کوئی صاحب اسے تھانیسری صاحب کا افتراء بتا کر غلام رسول مہر صاحب کی طرح گلو خلاصی کرانے کی کوشش نہ کرتے پھریں۔ چنانچہ سید صاحب نے یار محمد خاں حاکم یاغستان کے نام خط لکھتے ہوئے تصریح فرمائی جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

یہ فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اس بشر کی اس بشارت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اس الہام ربانی میں نہیں ہے۔

فقیر محمد خاں لکنوی کے نام خط لکھتے ہوئے سکھوں کے استیصال کرنے یعنی پنجاب پر قابض ہونے کے الہام کا ذکر جن لفظوں میں کیا، ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

”اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردہ غیب سے کفار یعنی لائے بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ رحمانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو ان پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔“

رئیس قلات خان خانانا خلجائی کے نام جو مکتوب بھیجا گیا، اس میں سید احمد صاحب نے فتح پنجاب کے الہام کا جن لفظوں میں تذکرہ کیا ان کا ترجمہ بقرض سہولت پیش خدمت ہے:

”اس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اس فقیر کو بارہا پردہ غیب سے وارد ہونے والی

لے سخاوت مرزا: مکتوبات سید احمد شہید، ص ۴۱

کے ایضاً: ص ۴۲، ۴۴

روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعے جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے  
دفعہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و  
کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے۔

مکتوب بنام شاہ بخارا میں سید صاحب نے اسی بات کو یوں دہرایا ہے:  
”قیام جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے رفع و دفع کرنے کے لیے الہام اور روحانی  
مکالمہ کے ذریعے غیبی امامت سے اس فقیر کو مشرف فرمایا اور ہم کو فتح و نصرت  
کے متعلق ایسی بشارتوں کا تجربہ اور اس پروردگارِ عالم کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے  
موثر کارروائی کے لیے اور سید المرسلین کی سنت کے احیاء اور سرکش کافروں کی  
بیخ کنی اور بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مامور فرمایا ہے اور اپنے پتے و عدد  
کے بموجب مظهر و منصور کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔“

اپنے درجہ امامت سے ہر خاص و عام و پابی اور نام نہاد مجاہدین کے ہر فرد کو مطلع کرنے  
کی غرض سے سید صاحب نے ایک سرگرمی ہاشمیت ہار عام مشترک روایا جس میں یہ تصریح بھی  
فرمائی گئی:

”اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اُس مالکِ حقیقی اور بادشاہِ حقیقی نے اس  
گوشہ نشین فقیر عاجز اور خاکسار کو پہلے تو غیبی اشاروں اور اپنے الہامات کے  
ذریعے، جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، خلافت کا اہل ہونے کی  
بشارت دی۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص و عام کی  
تالیفِ قلوب کے لیے مرتبہ امامت سے مجھ کو مشرف فرمایا۔ چنانچہ بتاریخ  
۱۲ جمادی الثانی روز پنجشنبہ ۱۲۴۲ھ ساواتِ کرام، علماء و مشاہیر اور بڑے  
بڑے مشائخ اور باعظمت صاحبزادوں اور بلند مرتبت خواتین نے موہ تمام

لے سخاوت مرزا، مکتوبات سید احمد شہید، ص ۵۰

کے ایضاً: ص ۸۸

خاص و عام مسلمانوں کے میرے ہاتھ پر بیعت کر کے، مجھ کو اپنا امام قرار دیا اور میری امامت اور حکومت کو تسلیم کر کے میری اطاعت پر تسلیم خم کر دیا اور اُس روز سے اب تک یہ بیعت اس فقیر کے ہاتھ پر جاری ہے اور تمام مسلمانوں میں اس کا چرچا ہے۔“

سلطان محمد خاں والی پشاور کے مشیر و وزیر جناب فیض اللہ خاں مہمند کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے انہیں اسی الہام کا قائل بنانے اور اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی خاطر یوں سیاست لڑائی تھی :

”آپ کے ذہن و دماغ پر اس خاکسار کا معاملہ آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر و باہر ہے کہ میں قوم سکھ جیسے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مامور ہوں اور فتح و نصرت کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اُس بادشاہِ مٹان کے وعدوں کے خلاف یہ سب وہم و گمان، کافروں اور کفر اہوں کے وسوسے ہیں نہ کہ دینداروں اور اور ایمان والوں کی سمجھ بوجھ ہے۔“

سید صاحب کا اس الہام کی بار بار تشریح کرنا کہ پنجاب میرے ہاتھ پر ضرور فتح ہوگا نیز یہ پیشگوئی کرنا کہ میرے ہاتھوں جیت تک ہندوستان کا شرک، چین کا کفر، ایران کا رنض اور افغانستان کا نفاق نہ مٹ جائے گا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ مجھے موت نہیں دے گا اور اگر میری موت کی کوئی حلیفہ شہادت بھی دے پھر بھی اُسے سچا نہ جانتا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہوں نے موصوف کے خلفاء اور تابعین کو مجبور کیا کہ سید صاحب کی موت کا انکار کر کے غیوبیت کا مسئلہ کھڑا کر دیں تاکہ لوگ اُن کے الہامات کو محض ایک فراڈ نہ سمجھنے لگیں اور انہیں حقیقت نفس الامری کا پتہ نہ لگ جائے۔ اگر وہابی حضرات سید صاحب کی غیوبیت کا افسانہ نہ گھڑتے تو وہابی صاحبوں کو سید صاحب کو بزرگ بتانے کی قطعاً گنجائش باقی نہ رہی تھی بلکہ انہیں

۱۱۹

۳۷۳

شروع سے مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کا پیشرو اور قائد جاننے لگ جاتے، اُن کے اہلہاموں کی حقیقت سے واقف ہو جاتے اور ہندوستان سے جو ان نام نہاد مجاہدین کے لیے ایلاد پینچ رہی تھی اُس کا سلسلہ قطعاً بند ہو جاتا۔ یہ تین ضرورتیں تھیں جنہوں نے اُن کے خلفاء کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ پراسرار ڈرامہ پیش کر دیں جو تاریخ کا المناک سانحہ اور دہا بید کی افسوسناک شرارت کے سوا اور کچھ نہیں۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشُّرُورِ الْاَنْفُسِيَا۔

شہرِ مصطفیٰ کی نسل منقطع سزینِ پاک و ہند میں ہزاروں اولیائے کرام آرام فرما ہیں، جنہوں نے اپنی زندگیوں کا اعلائے کلمۃ الحق کے لیے وقت کر رکھی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نے بے شمار غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، جس کے باعث آج بھی وہ مرجعِ خلافت ہیں اور مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے خود کو پیکرِ تسلیم و رضا بنا کر رکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل اُن کی جانب جھکا دیے۔ مزاراتِ بزرگانِ دین اُن حضرات کی مقبولیت اور مرجعِ خلافت ہونے کے زندہ ثبوت ہیں لیکن اس کے باوجود وہابی حضرات کی خواہش ہے کہ اولیاء اللہ کی جانب سے مسلمانوں کی توجہ پھیر کر اپنے اَرَبًا بَاتِنًا دُونِ اللّٰهِ کی جانب مبذول نہ کریں، اسی مقصد کی خاطر مشہور وہابی عالم مولوی محمد جعفر تھانی سیری نے لکھا تھا:

”مولوی عبداللہ صاحب معرفت جندوڑی سے دو ایک اولیاءِ کامل صاحب کشفِ مغان میں تھے کسی نے پوچھا کہ بند کے اولیاء اللہ میں سے سب سے برتر مقبول خدا ولی کون سا بزرگ ہے، انہوں نے جواب دیا کہ عالم ادواح کی سیر میں، میں نے دیکھا ہے کہ سب سے بڑا درجہ اولیائے ہند میں مولوی محمد اسماعیل شہید کا ہے، کیونکہ میں نے مولانا شہید کو جنت میں ایک چھپر کھٹ پر لیٹے ہوئے اور کتاب صراطِ المستقیم کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا ہے“

لے محمد جعفر تھانی سیری: حیات سید احمد شہید، ص ۳۰۱، ۳۰۲

قطع نظر اس کے کہ مولوی اسماعیل دہلوی کے نزدیک کشف کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے اور  
 مکار ہیں، جیسا کہ تقویۃ الایمان میں لکھا ہے اور قطع نظر اس کے کہ چھپر کھٹ پر لیٹنے والا اولیاء  
 سے بزرگس طرح ہو گیا اور قطع نظر اس کے کہ قرآن و حدیث کی جگہ صراط المستقیم نامی کتاب کا  
 پڑھنے والا کیونکر سرتاج اولیاء ہو گیا؛ کیا و اتا گنج بخش علی بھویری، خواجہ معین الدین اجمیری،  
 خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت فرید الدین شکر گنج، حضرت نظام الدین اولیا اور  
 حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم جیسی بستیاں مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے  
 کمتر تھیں؛ خدا کے بندو! اگر جھوٹ بولتے ہوئے مخلوق سے شرم نہیں آتی تو کم از کم خالق کے  
 توڑنا چاہیے۔ اور نہ سہی تو دہلوی صاحب کی قبر کہاں تک مرجع خلایق ہے، اسی کی جانب  
 توجہ کر کے کوئی عقل کی بات کہہ دیا کیجیے۔ موصوف کی قبر کے بارے میں تھانیسری صاحب  
 رقمطراز ہیں،

”افسوس ہے کہ ایسے شخص کفر و شرک کے قاطع کی قبر پر اب وہاں کے لوگ  
 نسوار چڑھا کر فتنیں اور مرادیں آپ سے مانگتے ہیں؛“

تھانیسری صاحب شکوہ تو کرنے بیٹھ گئے لیکن اس میں رونے کی کون سی بات ہے؛  
 جناب والا! جیسے وہ بزرگ تھے ویسے ہی ان پر چڑھاوئے چڑھ رہے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ ہمت  
 اور توفیق دے تو کبھی اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر بھی دیکھ لیجیے کہ مخلوق خدا کیسے والہانہ انداز  
 میں ان کی جانب دوڑتی چلی جاتی ہے۔ ہر وقت پھیر لگی رہتی ہے۔ فیض کے دریا رواں ہیں  
 اور پیاسے جھوم جھوم کر ان کی جانب دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سعادت مند ان حضرات کی  
 بدولت فیوض و برکات سے خوب میراب ہوتے اور عنایات سے مالامال ہوتے رہتے ہیں۔  
 لیکن دہلوی صاحب کی قبر پر اگر نسوار چڑھانی جاتی تو اور کیا چیز چڑھانی چاہیے تھی۔ کاش!  
 موصوف کے قبعین و معتقدین کبھی اس جانب بھی توجہ فرمائیں کہ نسل منقطع تو دشمنان رسول  
 کی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ** اور جس کی

لے محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۲۱۶



زندہ مثال یہ بھی ہے کہ یزید جیسے دشمنِ اہل بیت کی اولاد سے آج ایک فرد بھی دنیا میں موجود نہیں لیکن ساداتِ کرام کا کوئی شمار نہیں۔ اسی طرح توہین و تنقیصِ شانِ رسالت کے باعث موصوفہ اپنے سارے خاندان ہی کو لے ڈوبے، جیسا کہ تھانیسری صاحب نے بھی لکھا ہے،

”مولوی محمد عمر صاحب آپ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں وہ بھی لاؤ لدا اس جہان سے رخصت ہو گئے اور اس دنیا سے ناپا تبار کی حقیقت پر بڑا افسوس ہے کہ اس خاندانِ عالی، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ میں، جس میں بیسیوں عالمِ فاضل موجود تھے، اب ایک شخص بھی نہیں رہا۔ بالکل خاندانِ بھر کا خاتمہ ہو گیا۔“

اگر اپنے مولویوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے والے حضرات کبھی حقیقت کو بھی سامنے رکھ لیا کریں، کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہہ دیا کریں تو اس میں قباحت ہرگز نہیں بلکہ جو حضرات اس غلط پروپیگنڈے کے باعث گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ گمراہی سے بچ جائیں اور غتر بوند کرنے والوں کے سروں پر کم از کم دوسروں کو گمراہ کرنے کا وبال تو نہ پڑے۔

حے کاش ترے دل میں اتر جائے مری با

وہابی علماء و مورخ ایک عرصہ سے کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مماثلت یہی شور مچاتے آرہے ہیں کہ ہمارے مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی جب اپنے قاضی سمیت ۱۲۳۸ھ میں حج بیت اللہ کی غرض سے گئے تھے تو ان کی اصحاب محمد بن عبد الوہاب نجدی سے قطعاً ملاقات نہیں ہوئی تھی اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کا ۱۲۰۶ھ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس سے وہ حضرات بھولے بھالے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مولوی اسماعیل دہلوی پر وہابیت کا یسٹ لگانا انصاف کے بعد اور برطانوی سازش ہے۔ وہابیت کی نسبت سے وہ حضرات فوراً سیخ پا ہو جاتے ہیں اور تحریر و تقریر میں اس نسبت کو برٹش گورنمنٹ کی شرارت قرار دینا ہی کافی و شافی جواب گردانتے ہیں:

لے محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ مستبد احمد شہید، ص ۳۱۶

ہیں سرِ درست اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ دہلوی صاحب اینڈ کمپنی کی قاضی شوکانی سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں؛ اس بات سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ لفظ وہابیت کے استعمال میں برٹش گورنمنٹ کی منشاء کو دخل ہے یا نہیں؛ ہمیں صرف یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے عقاید و نظریات میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے یا نہیں؛ اس امر کا جائزہ لینے کی خاطر ہم نجدی امام الوہابیت کی کتاب التوحید صغیر کی بعض عبارتیں حضرت مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) کی تصنیف لطیف سیف الجبار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور ان کے بالمقابل مولوی اسمعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان سے عبارتیں پیش کرتے جائیں گے۔ ایسا کرنے سے ہماری غرض صرف یہی ہے کہ قارئین کرام خود فیصلہ فرمائیں کہ نجدی و ہندی وہابیت کے مذہبی خیالات اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے یا پوری پوری مطابقت ہے؛

خیال رہے کہ کتاب التوحید صغیر وہی تصنیف ہے جسے نجدی امام الوہابیت نے علمائے حرمین کی خدمت میں بھیجا تھا اور ان بزرگوں نے اس خرافات کے پلندے کا وہی جواب دیا تھا جو دین کے خادموں اور علم پمیر کے وارثوں کو دینا چاہیے تھا۔ اب قارئین کرام دونوں کتابوں کی عبارتیں اور ان کے تیور ملاحظہ فرمائیں؛

(۱)

### تقویۃ الایمان

### کتاب التوحید صغیر

سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت  
پھیل رہا ہے اور اصل توحید  
نایاب لیکن اکثر لوگ شرک اور توحید  
کے معنی نہیں سمجھتے.... سچ فرمایا  
اللہ صاحب نے سورۃ یوسف میں  
وما یومن اکثرہم باللہ

اعلموا ان الشکر قد شاع  
فی هذا الزمان وذاع والامر  
قد ال الی ما وعد اللہ  
وقال وما یومن اکثرہم  
باللہ الا وہم مشرکون۔

الاوهم مشرکون۔ لہ

(۲)

و ظهر ما قال رسول الله لا تقوم الساعة حتى تلتحق قبائل من امتي بالمشركين وحتى تعبد قبائل من امتي الا وثمان رواه الترمذي وعن عائشة قالت سمعت رسول الله يقول لا يذهب الليل والنهار حتى تعبد اللات والعزى فقلت يا رسول الله انى كنت لا ظن حين انزل الله هو الذى ارسل رسوله بالهدى ودين الحق يظهره على الدين كله ولو كره المشركون ان ذلك سيكون باتا قال انه سيكون ما شاء الله ثم يبعث الله رجا طيبة فتوفى من كان فى قلبه حبة من خردل من ايمان فيبقى من لا خيري فيه فيرجعون الى دين اباؤهم رواه مسلم

اللہ صاحب نے سورہ براءۃ میں فرمایا ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے بدایت اور سچا دین دے کر کہ اس کو غالب کرے سب دینوں پر، اگرچہ مشرک لوگ بہتر اہی برامانیں۔ سو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے سمجھا کہ اس سچے دین کا زور قیامت تک رہے گا سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا زور تو مقرر ہو گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی ایک باؤ (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے بندے جن کے دل میں تھوڑا سا بھی ایمان ہو گا، مرجائیں گے اور وہی لوگ رہ جائیں گے جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ یعنی نہ اللہ کی تعظیم، نہ رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ باپ دادوں کی رسموں کی سنڈکڑنے لگیں گے۔ سو اس طرح شرک میں

سہ اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۹، ۳۰

فانا نرى عامة مومنى هذا  
الزمان مشركاً۔

پڑ جائیں گے، کیونکہ اکثر پرانے باپ  
ہاؤسے جاہل مشرک گزرے ہیں جو کوئی  
اُن کی راہ و رسم کی سند پکڑے، آپ بھی  
مشرک ہو جاؤسے۔

— (۳) —

فقد ثبت بالنصوص القرآنية  
ان من اعتقد النبى وغيره  
وليتيه فهو ابو جهل في  
الشرك سوا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب  
نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت  
نہیں دی.... مگر یہی پکارنا، بتیں ماننی،  
نذر و نیاز کرنی، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی  
سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی  
کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اس کو اللہ کا  
بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابو جهل اور وہ  
شرک میں برابر ہیں۔

— (۴) —

والشرك الاكبر هو الاشرار  
فيما خصمه الله تعالى لنفسه  
وهو كشركتنا نذكر شيئا  
منه ليقاس عليه غيره فنقول  
هو اربعة اقسام۔ الاول الاشرار  
في العلم اعنى اثبات مثل  
علم الله لغيره بكونه حاضراً

اب یہ بات تحقیق کی چاہیے کہ اللہ صاحب  
نے کون کونسی چیزیں اپنے واسطے خاص  
کر رکھی ہیں کہ اُن میں کسی کو شریک نہ  
کیا چاہیے۔ سو وہ باتیں بہت ساری  
ہیں مگر کئی باتوں کا ذکر کر دینا اور اُن کو  
قرآن و حدیث سے ثابت کرنا ضرور ہے  
تا اور باقی باتیں اُن سے لوگ سمجھ لیں۔

۱۔ اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۸۷۔ ۲۔ ایضاً: ص ۳۲، ۳۳۔

وناظراً فی کل مکان ومطلقاً علی کل شیء وفی کل ان بعیداً کان او قریباً خفیاً کان او جلیباً فمن اعتقد انه اذ ذکر اسم نبی فیطلم هو علیہ لصار مشرکاً وهذا الاعتقاد شرک سوا ما کان مع نسبی ہو ولی او ملک او جنتی او صم ووشن وئتواء کان یعتقد حصر له له بذاتہ او باعلام الله تعالی بائی طریق صکان یصیر مشرکاً۔

سوا اول بات یہ ہے کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا اور ہر چیز کی خبر برابر ہر وقت رکھنی، دور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں..... یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔ سو جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھے لیا کرے، دور و نزدیک سے پکارا کرے... اور یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے... تو وہیں اُس کو خبر ہو جاتی ہے، اُس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی... سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے... خواہ یہ عقیدہ انبیاء و اولیاء سے رکھے، خواہ پیر و شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ بھوت اور پری سے۔ پھر خواہوں کجے کہ یہ بات اُن کو اپنی ذات سے ہے، خواہ اللہ کے دینے سے ہو جن اس عقیدے سے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

(۵)

دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادے سے تعریف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا۔

والمشائی الاشرک فی التصرف  
اعنی اثبات مثل تصرف الله

کاسا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے  
پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت  
ان کو خود بخود ہے خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے  
ان کو ایسی طاقت بخشی ہے، ہر طرح شرک  
ثابت ہوتا ہے۔

لغيره سواء اعتقد ان قدره  
التصرف له بذاته تعالى  
او باعطاء الله تعالى۔

(۶)

تیسری بات یہ ہے کہ بعضے کلام تعظیم  
کے اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ  
ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ اور رکوع  
اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے  
نام پر مال خرچ کرنا، اُس کے نام کا روزہ  
رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے  
قصد کر کے سفر کرنا..... اور رستے میں  
اُس ٹانگ کا نام پکارنا، نام مقول باتیں کرنے  
اور شکار سے بچنا اور اسی قید سے جا کر  
طواف کرنا، اُس گھر کی طرف سجدہ کرنا،  
اُس کی طرف جانور لے جانے، وہاں تئیں  
ماننی، اُس پر خلافت ڈالنا، اُس کی چوکت  
کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی۔۔۔  
اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجاور  
بن کر اُس کی خدمت میں مشغول رہنا.....

والثالث الاشراك في العبادة  
اي تعظيم غير الله كتعظيم اعني  
الاعمال التي خصها الله  
تعالى لتعظيمه مثل السجود و  
الركوع والتشيل قائما يقف  
عند احدكم كما يقف في الصلاة  
له والسنوم له وشذ الرحل  
الى بيته والتشيل الخاص  
بالاحرام والطواف والنداء  
من الله ههنا والتقبيل والقاء  
المرج والمجاورة والتبرك  
بالماء والرجعة القهقري  
وتعظيم حرمة وامثال ذلك  
فمن فعل بنبى اودى او غيره  
واشارة او مشاهدہ و ما

لہ اسمعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۹

يتعلق به شيئاً من السجود  
والركوع وبذل المال  
له والصلوة له والصوم  
له والتمثل قاسماً وقصداً  
لسفراليه والتقبيل و  
الرجعة القهقري وقت التوديع  
وضرب الخباء وارضاء  
الستارة والستر بالشوب  
والدعاء من الله ههنا و  
المجاورة والتعظيم حواله  
واعتماد صكون ذكر غير  
الله عبادة وتذكرة فب  
الشدايد ودعاءه بخوبيا  
محتديا عبداً القادر يا  
هداد يا مهيمن فقد صار  
شركاً كافرًا بنفس هذه  
الاعمال سواء اعتقد  
استحقاقه لهذا التعظيم  
بذاته اولاً -

اس کے کنویں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا ،  
بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے  
واسطے لے جانا، رخصت ہوتے وقت اٹے  
پاؤں چلانا۔۔۔۔۔ پھر جو کوئی کسی پر پیغمبر کو یا  
صورت پر ہی کو یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو یا  
کسی کے تھان کو۔۔۔۔۔ سجدہ کرے یا گرج  
کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ  
باندھ کر کھڑا ہو یا جانور چڑھائے یا ایسے  
مکان میں دُور دُور سے قصد کر کے جائے  
۔۔۔۔۔ چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر  
التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے  
رخصت ہوتے وقت اٹے پاؤں چلے، وہاں  
کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی  
قسم کی باتیں کرے، سو اُس پر شرک ثابت  
ہوتا ہے۔ اس کو اشراک فی العبادہ کہتے  
ہیں، یعنی اللہ کی سی کسی کی تعظیم کرنی۔ پھر  
خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اس تعظیم کے  
لائق ہیں یا یوں سمجھے کہ ان کی اس طرح کی  
تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور  
اس تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول  
دیتا ہے۔ ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

(۷)

الرابع الاشرار في العادة اعني  
تعظيم الغير في افعال عادة  
بما يجب لله تعالى مثل الحلف  
باسم الله تعالى والتسمية  
بعبد الله و اخلاص المنذور  
والصدقات لله و امثال  
ذلك فمن حلف بغير الله  
اوسمى ولده عبد الرسول او  
عبد النبي او نذر لغير  
الله او تصدق لغير الله او  
قال نذر الله ورسوله و  
صدقة الى الله ورسوله  
فقد صار مشركاً كافراً  
وها انا اذكر الاقسام الاربعة  
واثبت ما ذكرت كلها بالايات  
والاحاديث في الفصول الاربعة.

چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے  
بندوں کو سکھایا ہے کہ اپنے دنیا کے کاموں  
میں اللہ کو یاد رکھیں اور اسی کی تعظیم کرتے  
رہیں تاکہ ایمان بھی درست ہو اور ان کاموں  
میں بھی برکت ہو جیسے آڑے کام پر اللہ کی  
نذر ماننی، مشکل کے وقت اُسے پکارنا،  
ہر کام کا شروع اُس کے نام سے کرنا۔۔۔  
پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں،  
شہیدوں کی، محبوبت پر ہی کی اس قسم کی  
تعظیم کرے جیسے آڑے وقت پر ان کی نذر  
مانے، مشکل کے وقت ان کو پکارے۔۔۔  
اپنی اولاد کا نام عبد النبی، امام بخش، پیر بخش  
رکھے۔۔۔۔۔ سو ان سب باتوں سے شرک  
ثابت ہوتا ہے اور اس کو الشکر في العادة  
کہتے ہیں۔ یعنی اپنی عادت کے کاموں میں  
جو اللہ کی تعظیم کرنی چاہیے، سو غیر کی کرے۔

(۸)

الفصل الثاني في ردة الاشرار  
في العلم۔  
اس فصل میں ان آیتوں اور حدیثوں  
کا ذکر ہے جن سے اشراک في العلم کی  
برائی ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ اسمعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۸، ۳۹ ۲۔ ایضاً: ص ۵۳



( ۹ )

فمن اثبتہ لغيرہ نبياً كان  
او ولياً صنفاً او وثناً ملڪاً او  
جنياً فقد اشرك بالله۔  
اور جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جہی اور  
فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور  
شہید کو یا نجومی اور رمال کو..... یا مجتہد  
اور پری کو ایسا جانے اور اس کے حق  
میں یہ عقیدہ رکھے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے۔

( ۱۰ )

وعن عائشة قالت من اخبر  
لشان محمدًا يعلم الخمس  
التي قال تعالى ان الله عنده  
علم الساعة الاية فقد اعظم  
الافرية۔  
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:  
جو کوئی خبر دے تجھ کو کہ حضرت پیغمبر خدا  
صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے وہ پانچ  
باتیں کہ اللہ نے مذکور کی ہیں ان اللہ عنده  
علم الساعة (الایة) سو بے شک  
اُس نے بڑا طوفان باندھا۔

( ۱۱ )

الفصل الثالث في سادة الاشرار  
في التصرف۔  
اس فصل میں ان آیتوں اور حدیثوں کا ذکر  
ہے جن سے اشرار کی تصرف کی برائی ثابت  
ہوتی ہے۔

( ۱۲ )

والانبياء اذا يامرهم الله  
بشيء يخافون ولا يستطيعون  
اُس کے دربار میں ان کا تو یہ حال ہے کہ  
جب وہ حکم فرماتا ہے، یہ سب رعب میں

۳ ایضاً: ص ۶۱

۴ اسمعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۴

۵ ایضاً: ص ۶۳

التفتيش في حكم السؤال  
عنه ثانياً -  
آکر بے حواس ہو جاتے ہیں۔ ادب اور  
دہشت کے مارے دوسری بار اُس بات  
کی تحقیق اُس سے نہیں کر سکتے۔ لے

(۱۳)

فانما لا تصكون الآبات  
يكون الشفيع وجيها  
فيخاف الشفوع اليه من  
عدم قبول شفاعته  
فوات مطالب مهمة برجوها  
من الشفيع لصونه ظهيراً  
ومعاوناً -  
مگر اُس امیر سے وہ ب کر اُس کی سفارش  
مان لیتا اور چور کی تعمیر معاف کر دیتا ہے  
کیونکہ وہ امیر نہیں کی سلطنت کا بڑا رکن ہے  
اور اُس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے  
رہا ہے۔ سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک  
جگہ اپنے غصہ کو تمام لیتا اور ایک چور سے  
درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے  
بڑے امیر کو ناخوش کر دیجے کہ بڑے بڑے  
کام خراب ہو جائیں اور سلطنت کی رونق  
گھٹ جاوے۔ لے

(۱۴)

واما ان يصكون الشفيع  
محبوباً فيتألم من عدم  
رضاه وهذا ان يتحيلان  
في شأنه تعالى عما يصنفون -  
دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہ اور  
میں سے یا بیگمات میں سے یا کوئی  
بادشاہ کا معشوق اُس چور کا سفارشی  
ہو کر کھڑا ہو جائے اور چور کی سزا نہ  
دینے دے۔ بادشاہ اس کی محبت سے

لے اسمعیل دہلوی، تقویۃ الایمان : ص ۶۶  
لے ایضاً : ص ۶۷

لاچار ہو کر اُس چور کی تعصیر معاف کر دے،  
 تو اُس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں۔ یعنی  
 بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش  
 قبول کر لی اور وہ یہ بات سمجھا کہ ایک بار  
 غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا  
 بہتر ہے اُس رنج سے کہ جو اُس محبوب  
 کے روٹھ جانے سے بچ کر ہو گا۔ ل

### (۱۵)

واما الشفاعة بالاذن التي كلا  
 شفاعة وهو المذكور في  
 القرآن والحديث فعالمها  
 انها لا تكون لاهل الكباشر  
 الذين ماتوا بلا توبة ولا  
 للصغرين ..... وكيفية  
 الشفاعة ان الحكيم العدل  
 لما يرى من عبده توبة و  
 ندامة وانا بة اليه لا الى  
 غيره يرحم عليه ولكن  
 حكمه وفعله كله عدل ولا  
 يشوبه جور وظلم فلا يستطيع  
 العفو بلا سبب وان عفا عنه

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری تو ثابت  
 ہو گئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں... مگر  
 نفس کی شامت سے قصور ہو گیا۔ سو  
 اُس پر شرمندہ ہے۔ رات دن ڈرتا ہے  
 ..... بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر وزیر  
 کی پناہ نہیں ڈھونڈتا..... رات دن اُس  
 کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھے میرے حق  
 میں کیا حکم فرمائے۔ سو اُس کا یہ حال  
 دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اُس پر ترس  
 آتا ہے، مگر آئین بادشاہت کا خیال  
 کر کے بے سبب درگزر نہیں کرتا کہ  
 کہیں لوگوں کے دلوں میں اُس کے  
 آئین کی قدر گھٹ نہ جائے۔ سو کوئی امیر وزیر

وغفر له بلا سبب اختل قاعدة العدل وانتقص شان حكمه في اعين الناظرين ويحاجونه في اذن لمن يشاء ان يشفع له فيشفع فيعفوا في الحقيقة برحمته وفي الظاهر باسم شفاعته الشفيع حفظاً لقاعدة -

اُس کی مرضی پا کر اس تقصیر وار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اُس امیر کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اُس کی سفارش کا نام کر کے اُس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے..... سو اللہ کی جناب میں اس قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اُس کے معنی یہی ہیں۔ لہ

## (۱۶)

الى ان قال يا فاطمة انقذي نفسك من النار سليني من مالي ما شئت فاني لا اغني عنك من الله شيئا انظروا قنط النسبي قرابته حتى ابنته من نفعه لهم عند الله فقال هؤلاء المجانين يرحبون شفاعته لهم عند الله -

سو انھوں نے سب کو، اپنی بیٹی تک کو کھول کر سنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اُسی چیز میں ہو سکتا ہے کہ اپنے اختیار میں ہو، سو یہ میرا مال موجود ہے، اس میں مجھ سے کچھ بخل نہیں۔ اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔ سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا درست کرے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرے۔ لہ

## (۱۷)

الفصل الرابع في سادة الاشرار

سو اس فصل میں مذکور ہے کہ قرآن و

حدیث میں اللہ کی تعظیم کے لوگوں کو کون کون سے کام بتائے ہیں تاکہ اور کسی کے لیے وہ کام نہ کیجیے کہ شرک لازم آئے۔ لہ

(۱۸)

ولا یفترسجدۃ الملائکۃ لآدم  
و یعقوب لیوسف کما یقولہ  
الجاہل فانتہ صار منسوخاً  
کالنکاح مع الاخت۔

جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی کسی مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی محبتیں لاسنے والے اپنی بہنوں سے نکاح کر لیں۔ لہ

(۱۹)

فثبت بھذہ الآیۃ ان الصفر  
الی قبر محمد و مشاہدہ  
و مساجدہ و اثارہ و قبر  
نبی و ولی و سائر الاوشان  
و کذا طوافہ و تعظیم حرمہ  
و ترک الصيد و التحزر عن

سوا کسی قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کیلئے نہ کیا جائیں۔ کسی کی قبر پر یا چلنے پر یا کسی کے تھان پر دُور سے قصد کرنا سفر کی رنج و تکلیف اٹھا کر، میلے پھیلے ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانور چرانا، فتنیں پوری کرنی، کسی قبر یا مکان کا طواف کرنا

لہ ایضاً، ص ۸،

لہ اسمعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۷،

قطع الشجر و غیرہ اشْرک  
اصبر فان الله تعالى خصص  
هذه الامور لذاته وانزل  
هذه الآية لبيانہ۔  
اس کے گرد پیش کے جنگل کا ادب کرنا  
یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا،  
گھاس نہ اکھاڑنا اور اسی قسم کے کام  
کرنے اور ان سے کچھ دین و دنیا کے  
فائدہ کی توقع رکھنا، یہ سب شرک کی باتیں  
ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔ لہ

—(۲۰)—

الفصل الخامس في ردة الاشرار  
في العادة۔  
اس فصل میں ان آیتوں اور حدیثوں کا ذکر  
ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی  
اپنے دنیا کے کاموں میں جیسا معاملہ  
سے رکھتا ہے اُس کی تعظیم طرح طرح سے  
کرتا ہے ویسا ہی معاملہ اور کسی سے  
نہ کرے۔ لہ

—(۲۱)—

عن قيس ابن سعد قال اتيت  
الحيرة فرأيتهم يسجدون  
لمرربان لهم فقلت يا رسول الله  
انت احق ان يسجد لك  
قال امرأيت لو مردت بقبري  
أكنت تسجد له فقلت لا فقال  
ابوداؤد نے ذکر کیا کہ قیس بن سعد نے  
نعل کیا کہ گیا میں ایک شہر میں جس کا نام  
حیرہ ہے۔ سو دیکھا میں نے وہاں کے  
لوگوں کو کہ سجدہ کرتے تھے اپنے راجہ کو۔  
سو کہا میں نے البتہ پیغمبر خدا صلی اللہ  
علیہ وسلم زیادہ لائق ہیں کہ سجدہ کیجیے ان کو۔

شہ اسمعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۸۰

۲۱ ایضاً: ص ۹۱

لا تفعلوا اخرجہ البوداؤد انظروا  
اعتذر النسبی صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وآلہ وسلم بمنع  
السجود لکونہ سامة فی قبرہ۔

پھر آیا میں سفیرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے  
پاس۔ پھر کہا میں نے، گیا تھا میں حیرہ کو،  
سو دیکھا میں نے اُن لوگوں کو کہ سجدہ کرتے  
تھے اپنے راجہ کو، سو بہت لایق ہو کہ  
سجدہ کریں ہم آپ کو۔ تو فرمایا مجھ کو، بجلا  
خیال تو کر جو تو گزرے میری قبر پر کیا  
تو سجدہ کرے اُس کو؟ میں نے کہا نہیں۔  
فرمایا تو مت کر ایسا۔ یعنی میں بھی ایک  
دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ  
کے لایق ہوں۔ ل

یہ چند عبارتیں بطور نمونہ بالمقابل پیش کر دی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کتاب التوجید  
اور تقویۃ الایمان کے نقطہ نظر میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ہندی امام الوہاب یہ نے نجدی امام الوہاب یہ  
کے عقاید و نظریات ہی کو پیش کیا ہے اور تقویۃ الایمان حقیقت میں کتاب التوجید صغیر ہی کا  
ترجمہ اور شرح ہے جیسا کہ مذکورہ عبارتوں سے واضح ہے۔ علاوہ بریں تقویۃ الایمان کے باب  
فصل اور جملہ آیات و احادیث وہی ہیں جو کتاب التوجید صغیر میں ہیں۔ ان حالات میں مولوی  
محمد اسمعیل دہلوی کہ مذہب اہلسنت و جماعت کا پیروکار اور اپنے خاندانی بزرگوں مثل  
شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی  
(المتوفی ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ /  
۱۸۲۳ء)، شاہ عبدالقادر دہلوی (المتوفی ۱۲۲۲ھ / ۱۸۲۷ء) اور شاہ رفیع الدین  
دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کا قبیح سمجھا جائے یا محمد بن  
عبدالوہاب نجدی کی خارجیت و وہابیت کا مبلغ مانا جائے، حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسمعیل

دہلوی کا مذہب اہلسنت وجماعت کو ترک کرنا ایک اہل حقیقت سے جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور  
 اُن کا مبلغِ خارجیت و دہائیت ہونا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ان حالات میں  
 قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی نے فریادِ المسلمین کے صفحہ ۹۰ سے فخرِ خاندانِ دہلی  
 شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو بیان متعلقہ مولوی محمد اسمعیل صاحب نے نقل فرمایا ہے  
 وہ مبنی برحقیقت معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب موصوف نقل کرتے ہیں:

”میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراڈ کو کہ جو کتاب (کتاب التوحید) بمبئی سے  
 آتی ہے، میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے، اُس کے عقائد صحیح نہیں ہیں بلکہ وہ  
 بے ادبی، بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔ میں آجکل بیمار ہوں۔ اگر صحت  
 ہو گئی تو میں کتاب التوحید کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم (مولوی محمد اسمعیل)  
 ابھی نوجوان بچے ہو، ناحق شور و شر برپا نہ کرو!“

چونکہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان ایک ہی چیز یا ایک ہی مضمون کے دو نام ہیں،  
 لہذا جو کچھ شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ نے کتاب التوحید کے بارے میں فرمایا یہی آپ کا نظریہ  
 تقویۃ الایمان کے بارے میں ہونا چاہیے، یعنی:

۱۔ تقویۃ الایمان کے عقاید بھی صحیح نہیں ہیں۔

۲۔ تقویۃ الایمان بے ادبی اور بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔

۳۔ اگر آپ صحت مند ہو جاتے تو کتاب التوحید کی طرح تقویۃ الایمان کے رد کا ارادہ  
 ظاہر فرماتے۔

۴۔ تقویۃ الایمانی عقاید و نظریات کی نشر و اشاعت کرنا حقیقت میں ناحق شور و شر  
 برپا کرنا ہے۔ والیماذ بانہ تعالیٰ۔

امام الوہاب بیہ کا اقرارِ کفر  
 مولوی محمد اسمعیل دہلوی نے مشکوٰۃ شریف کے باب  
 لا تقوم الساعة الا على اشرار الناس سے ایک

۱۔ قاضی فضل احمد، انوار آفتاب صداقت، جلد اول، ص ۵۱۶



حدیث نقل کی جس کا ترجمہ موصوف کے لفظوں میں یہ ہے :

”مسلم نے ذکر کیا کہ نعل کیا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہ: سنا میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے: نہیں تمام ہونے کے رات اور دن یعنی قیامت نہ آئے گی یہاں تک کہ پڑھیں لات اور عزی کو۔ سو کہا میں نے اے پیغمبر خدا! بیشک میں جانتی تھی کہ جب اتاری اللہ نے یہ آیت هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ الخ کہ بیشک یوں ہی رہے گا آخر تک۔ فرمایا : بے شک ہوگا اسی طرح جب تک چاہے گا اللہ، پھر بھیجے گا اللہ ایک باؤ اچھی، جان نکال لے گی جس کے دل میں ہوگا ایک رانی کے دانہ بھر ایمان، سورہ جائیں گے وہی لوگ کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ سو پھر جاویں گے اپنے باپ دادوں کے دین پر لے لے۔ اس حدیث پر موصوف نے جو فائدہ بڑا ہے اس کا درج ذیل حصہ قلمین لغور ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اس کی تہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ موصوف نے لکھا ہے:

”سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا زور تو مقرر ہوگا، جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی ایک باؤ (جو ایسی بھیجے گا کہ سب اچھے بندے جن کے دل میں تمہارا سا بھی ایمان ہوگا، مر جاویں گے اور وہی لوگ رہ جائیں گے کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ یعنی نہ اللہ کی تعظیم، نہ رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ باپ دادوں کی رسموں کی منہ پکڑنے لگیں گے۔ سو اس طرح شرک میں پڑ جائیں گے۔ کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں۔ جو کوئی ان کی راہ و رسم کی منہ پکڑے، آپ بھی مشرک ہو جاوے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخر زمانہ میں قدیم شرک بھی رائج ہوگا۔ سو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق ہوا۔“

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی: تعویذ الایمان، ص ۸۶، ۸۷

۲۔ ایضاً، ص ۸۷، ۸۸

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر سامنے آتے ہیں:

- ۱- پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مذکورہ ہوا بیل چکی ہے۔
- ۲- جن کے دل میں تمغڑا سا ایمان بھی تھا وہ سارے مرچکے ہیں۔
- ۳- اب صرف وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جن میں بھلائی کا نشان بھی نہیں۔
- ۴- اب مسلمان کہلانے والے بھی شرک میں پڑ چکے ہیں۔
- ۵- باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے کے باعث مسلمانوں میں قدیم شرک بھی رائج ہو گیا ہے۔

موصوف کی اس تصریح و تشریح کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو خود مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور ان کے سارے قبیحین کو بھی مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی تحقیق یہی ہے کہ جن کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان تھا وہ مر گئے اور مشرک ہی مشرک باقی رہ گئے ہیں۔

دیں حالات یہ دہلوی صاحب کا اقراری کفر قرار پاتا ہے پس مولوی اسماعیل صاحب کو سچا ماننے کی صورت میں سارے وہابیوں کو امام الہوا یہ سمیت مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر انہیں مشرک نہ کہا جائے تو مصنف تعویۃ الایمان کو جھوٹا، دروغ گو اور مکفر المسلمین ماننا لازم آئے گا۔ یہ وہابی حضرات کی اپنی پسند ہے کہ دونوں میں سے وہ کس راستے کو پسند کرتے ہیں؟

کاشش! دہلوی صاحب کے قبیحین کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ وہ اور ان کے امام صاحب اس زمین کے پردے کے علاوہ تحت الثریٰ میں تو بستے نہیں تھے نہ اب اور کہیں رہتے ہیں کہ شرک کے اس عالمگیر فتوے کی زد سے بچ جائیں۔ لامحالہ یہ خود اپنے مشرک ہونے کا اقرار ہے۔ مسلمانوں کو بات بات پر بلا وجہ مشرک ٹھہرانے کی قدرت نے دنیا میں یہ سزا دی کہ موصوف نے خود اپنا اور اپنے قبیحین کا مشرک ہونا تسلیم کیا، جو آج تک برابر شہر ہوتا آ رہا ہے۔ کذلک العذاب ولعذاب الآخرة اکبر لو کانوا يعلمون ۵

## ۲۔ فرقہ اہلحدیث کی تخریب کاری

مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے محمدی گروہ نے جب حالات کے تحت تین قسم کی ٹولیاں بنالیں تو موصوف کی اصل جماعت کچھ عرصہ موحد کہلاتی رہی لیکن بعد میں اہلحدیث کے نام سے مشہور ہونا شروع کر دیا۔ وہابیوں کی تینوں میں سے اس اولین جماعت کی باقاعدہ سرپرستی اور گروہی تنظیم میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) نے کی۔ مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) اُن کے سیاسی اور مذہبی دست راست تھے۔ اس جماعت کے افراد کا انگلیوں پر گنا جانا وہابیت کے پاک و ہند میں غیر مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے، جس کے باعث دیگر پراسرار وہابی جماعتیں کھڑی کی گئیں۔

مولوی محمد اسمعیل دہلوی بانی وہابیت نے اپنی جماعت کا نام محمدی گروہ رکھا تھا۔ مسلمانوں نے کتنا شروع کر دیا کہ جماعت کا اہلحدیث نام واقعی یہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکار ہونے کے باعث محمدی ہی تو ہیں۔ وہابی حضرات نے اس نسبت کو چھپانے کی غرض سے خود کو موحدین کہنا شروع کر دیا۔ مسلمانان اہلسنت و جماعت کہتے کہ واقعی یہ مکینِ شانِ رسالت ہونے کے باعث سکھوں کی طرح بڑے موحد ہی تو ہیں۔ جب نسبت یہاں تک پہنچی تو میاں نذیر حسین دہلوی کی سرکردگی میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنی مہربان سرکار سے درخواست کی کہ مسلمانان ہند آپ کے اس خود کاشتہ نجدی پودے کو وہابی کہتے ہیں۔ انہیں قانونی طور پر اس نام سے روکا جائے اور ہماری جماعت کا نام سرکاری طور پر اہل حدیث رکھ دیا جائے۔ گورنمنٹ نے جو جواب دیا وہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”انہوں (مولوی محمد حسین بٹالوی) نے ارکانِ جماعتِ اہلحدیث کی ایک دستخطی درخواست لیٹیننٹ گورنر پنجاب کے ذریعے سے وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی۔ اس درخواست پر سر فرسٹ شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی

تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسب ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے اہلحدیث کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے اس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اس طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۱۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۹ اور گورنمنٹ یو۔ پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی۔ پی۔ کی طرف سے ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۲۲، اس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین کو ملی۔

یہ ہے ان حضرات کے اہل حدیث ہونے کی کل کائنات۔ یہ چر و دروازہ مسلمانوں کو دو طرح دھوکا دینے کی خاطر ایجاد فرمایا گیا تھا۔ اولاً اس لیے کہ مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ لوگ حدیث سے بہت ہی لگاؤ رکھنے کے باعث خود کو اہل حدیث کہتے ہیں۔ ثانیاً اس غرض سے کہ محدثین حضرات کے لیے تصانیف علمائے کرام میں لفظ اہل حدیث بھی عام استعمال ہوتا رہا ہے، لہذا اس سے مسلمانوں کو دھوکا دینا آسان ہو جائے گا کہ صاحبو! ہماری جماعت کوئی نوزائیدہ فرقہ یا انگریز کا خود کاشتہ پودا تو نہیں بلکہ ہمارے گروہ کا نام تو بڑے بڑے علمائے اعلام کی تصانیف عالیہ میں بھی اوائل زمانہ ہی سے مذکور ہوتا آ رہا ہے۔ یہ ہے ان حضرات کے چل میں بل۔

دیکھو تو دلعنسیبی انداز نقش پا

موجِ ختام یار بھی کیا نکل کتر شمشیر

یہ جماعت چونکہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے تابعین و معتقدین کی پہلی جماعت ہے اس لیے موصوف کے تمام عقاید و نظریات امتیازی نشانات

۱۔ محمد ارباب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، ص ۲۶

اور مخصوص افعال پر بڑی شدت سے کاربند ہے۔ اپنے پیشوا کے فیصلے کو قرآن و حدیث کے سرخ خلاف دیکھتے ہوئے بھی برگزائے غلط یا قابلِ ترمیم تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے بلکہ آیات و احادیث کے مفہوم و مطالب میں ہزار کھینچا تانی کر کے اُس کے موافق دکھانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے مذہب کا اصل ماخذ تقویۃ الایمان ہے۔ قرآن و حدیث کو دوسرا اور تیسرا درجہ حاصل ہے، جنہیں تقویۃ الایمانی نظریات کی تائید میں پیش کر کے مسلمانوں سے اپنی حقانیت کا اعتراف کروانے میں شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنی تقویۃ الایمان میں جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کسی بات کا غلط تسلیم کرنا تو ہزاروں منزل دور کی بات ہے، کسی بات کو قابلِ ترمیم اور کمزور مان لینا بھی گوارا نہیں، خواہ قرآن و حدیث کے کتنے ہی واضح نصوص اُس کے خلاف کیوں نہ پیش کر دیئے جائیں۔ بعینہ یہود کے اندر شخصیت پرستی کی یہی مثالیں موجود تھیں، جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ  
أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ - لہ

انہوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں  
کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔

موصوف کو رب کا درجہ دینے کے شرک میں مبتلا ہونے کے باعث ان حضرات کو جملہ مسلمان مشرک ہی نظر آتے ہیں جیسے ساون کے اندھے کو ہر اسی سوجھتا ہے۔ جن طرح سامری کے بچپڑے کی محبت سے بعض یہود کے قلوب لبریز ہو گئے تھے، اسی طرح دہلوی صاحب موصوف کی عقیدت کا سمندر بہر وہابی صاحب کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے اس انتہائی وابستگی کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کے کسی نظریے کے خلاف پچاس آیتیں یا سو حدیثیں پیش کر کے کسی وہابی عالم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے تو آیات و احادیث کے مفہوم و معانی میں وہ تاویلیں کرنے اور تقویۃ الایمانی نظریہ کے مطابق دکھانے پر تو اڑی چوٹی تک کا زور لگا دے گا لیکن امام الوہابیہ کے اُس نظریہ کے قابلِ ترمیم

ہونے کا تصور اُس کے دماغ کے کسی بھی گوشے میں پیدا نہیں ہوگا۔ دہلوی صاحب کے نظریات کے اٹل ہونے پر ان کے نزدیک نہ آیات و احادیث اثر انداز ہو سکتی ہیں نہ کوئی اور چیز۔ یہ ہے ان حضرات کے دلوں کا وہ مرض ہے جو انہیں مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے مفاہمت کرنے اور اختلاف کو مٹانے پر کسی بھی وقت آمادہ نہیں ہونے دیتا۔

یہ حضرات اپنے امام علی الاطلاق یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی بتائی ہوئی وہابی توحید اسی خارجی توحید کو طرہ امتیاز بناٹے ہوئے ہیں، جس کی مخالفت کے باعث خوارج نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کافر و مشرک ٹھہرایا تھا۔ زمانہ حال کے خارجیت زدہ حضرات کو سچے مسلمان بھی اسی طرح کافر و مشرک نظر آتے ہیں۔ امام الوہابیہ نے تو ایضاً الحق وغیرہ میں ایک دو جگہ تجسیم کا نظریہ پیش کیا تھا لیکن اہل حدیث کہلانے والے حضرات نے اُس سبوح و قدوس کو مجسم منوانا ڈنکے کی چوٹ جاری رکھا ہوا، چنانچہ وہابیہ کے مسئلہ عالم مولوی وحید الزمان خاں حیدرآبادی نے اپنے ترجمہ قرآن میں آیہ کریمہ وَبِسْمِ كُرْسِيِّهٖ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے حاشیے پر ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں لکھا ہے:

جب کرسی پر بیٹھا ہے تو چار انگلی بھی بڑی نہیں رہتی ہے اور اُس کے بوجھ سے چوڑھو کرتی ہے۔ ۱

یہی مولوی وحید الزمان خاں صاحب بعض آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں،

ثُمَّ اسْتَوٰی رَآئِ السَّمَاوٰتِ فَسَوَّھُنَّ  
مَبْنَعِ سَمٰوٰتٍ۔ ۱

پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا اور  
سات آسمان ہموار کیے۔ ۱

۱۔ وحید الزمان خاں، مولوی، محشی و مترجم قرآن مجید، ص ۲۰

۱۔ پ ۱، سورہ البقرہ، آیت ۲۹

۱۔ وحید الزمان خاں، مولوی، تبویب القرآن، ص ۲

الترخمن على العرش استوى له وہ بڑے رحم والا تخت پر چڑھا۔ ۴

ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ - ۴ پھر تخت پر جا بیٹھا۔ ۴

یہ کرسی پر بیٹھا اور کرسی کا اُس کے بوجھ سے چوڑا کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات اللہ رب العزت کو مجتہم مانتے ہیں جس کا وزن چھ اور اُس کے بوجھ کو کرسی اٹھا لیتی ہے، بلکہ چوڑا کرنے لگتی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک عرش پر چڑھتا اور بیٹھتا ہے۔ کاش یہ حضرات کبھی اتنا سوچنے کی رحمت گوارا کر لیتے کہ ہر مجتہم غلط ہوتا ہے اور حادث خدا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ حضرات توحید کے ٹھیکیدار بنتے ہوئے بھی شرعاً منکر الوہیت قرار پاتے ہیں۔ اگر یہ بھی غور فرمائیں کہ جو ذات کرسی و عرش میں سلجاتی ہے اس کا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّجِيبٌ ہونا کس طرح مانتے ہیں؟

حقیقت ہے کہ غار بیت و عبا بیت عقیدہ رسالت کے خلاف ایک عقیدہ رسالت کھلا ہوا چیلنج ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بد قسمتی سے تو یہ رسالت

کا نام توحید ہے۔ وہابیہ کا مخصوص میدان تقیصِ شان رسالت ہے۔ ان حالات میں دیگر انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی توہین کرنا ضمنی معاملہ ہے کیونکہ جو صفات بیلکرسین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں تسلیم نہیں کرتے تو ان کا حصول باقی مقربین بارگاہ الہیہ کے لیے کس طرح مان لیں؟ یہ حقیقت ہے کہ وہابی حضرات نے غرور و علم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی دیگر مذاہب والے غیر مسلموں کو بھی کبھی ہوا نہ ہوئی۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں شان رسالت کے خلاف جن انتہائی گستاخانہ نظریات کی تبلیغ کی ہے، ان حضرات کے دین کا ذکر اعظم یہی توہین مصلحتی ہے، جس پر ڈیڑھ سو سال سے ڈٹے ہوئے ہیں اور

۴۔ وجد الزمان خان، تبویب القرآن، ص ۴۷

۴۔ پ ۱۹، سورہ ظہ، آیت ۵

۵۔ وجد الزمان خان، تبویب القرآن، ص ۵۰

۵۔ پ ۱۸، سورہ الفرقان، آیت ۵۹

فہائش کا فریضہ ادا کرنے والے علمائے کرام سے آج تک برسرِ پیکار چلے آ رہے ہیں۔ دہلوی صاحب نے حدیث لا تشدوا للرجال سے اشاروں کنایوں میں روضۃ اطہر کی زیارت کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن غیر مقلدین حضرات نے کھل کر مسلمانوں کو اس ایمانی و روحانی سعادت سے محروم رکھنے کی مہم چلائی ہوئی ہے چنانچہ حافظ عبد اللہ غیر مقلد نے لکھا ہے:

”طلب علم اور دیگر ضروریات کے لیے سفر کا کوئی مہرج نہیں، صرف کسی جگہ کی طرف جس میں قبر نبوی بھی داخل ہے ثواب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں“ لہ

جناب صدیق حسن خاں قنوجی جو پالی کا اس سلسلے میں نوابی فیصلہ یہ ہے:

والسفر لمجتد والزیارة فیہ  
نزاع ومن سافر معجده وقبر  
فلو یذرنی ایزارة شرعیة بل  
بدعة۔ ۲

صرف زیارت کے واسطے سفر کرنے کے  
حکم میں اختلاف ہے اور جس نے محض  
کسی قبر کی جانب سفر کیا تو یہ شرعی زیارت  
نہیں بلکہ بدعت ہے۔

مولوی محمد بن اسمعیل عینی نے روضۃ النور کے بارے میں یہ ایمان سوز فیصلہ صادر کیا تھا،

فان قلت، هذا قبر رسول الله  
صلى الله عليه وسلم قد عمرت  
عليه قبه عظيمة افقت فيها  
الاموال قلت، هذا جمل  
عظیم بحقیقۃ الحال۔ ۳

اگر تو کہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کی قبر ہے، اس پر بہت سا مال خرچ  
کیا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حقیقت  
یہ بہت بڑی بھالت ہے۔

مولوی اسمعیل غزنوی نے اس سلسلے میں خارجیت کے نشے سے بدست ہو کر یوں لکھا ہے:

”آج کل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبے بنائے گئے ہیں وہی بطور ایک بت  
کے ہیں“ لہ

۲ لہ حافظ عبد اللہ، مولوی، مسئلہ سماع موٹی، ص ۱۱۹  
۳ لہ محمد بن اسمعیل عینی، مولوی، تظہیر الاعتقاد، ص ۲۶  
۴ لہ صدیق حسن خاں، مولوی، حلاۃ الصدیق، ص ۹  
۵ لہ اسمعیل غزنوی، مولوی، تحفہ دہلیہ، ص ۵۹



اسی مولوی اسماعیل غزنوی نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:

آستانوں کی زیارت کے لیے مشرّہ رجال  
اس میں کیا شان پرستاری اصرام نہیں

یہ ہے غیر مقلد و ہابیبہ کی نظر میں روضۃ اطہر اور روضۃ من تریاض الجنۃ کی قدر و  
قیمت۔ یہ ہے ان کی حبیب پروردگار اور شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عقیدت اور وابستگی۔  
اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ایسے خلاف رُوح ایمان نظریات سے محفوظ و مامون رکھے اور وہابیت کی  
بلا سے بچائے۔ آمین

مسئلہ تقلید ہی فرقہ سازی کے راستے میں سدِ سکندری کا کام دیتا تھا، لیکن جب سے  
انکارِ تقلید وہابیہ نے انکارِ تقلید کا فتہ اٹھایا ہے، اسی وقت سے فرقہ سازی و تفرقہ بازی کا  
سیلاب اُمنڈنا آ رہا ہے، جس نے ملتِ اسلامیہ کو مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔ اسی فتہ کے  
باعث ایک خدا کو ماننے والے، ایک ہی آخری رسول کے اُمتی کہلانے والے، ایک قرآن کو  
اپنا ضابطہ حیات و اساس دین گرداننے والے، ایک ہی قبلے کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے والے  
باہم دست و گریبان ہیں۔ جن کی سعی طبع غیر مسلموں کو مسلمان بنانے اور اسلام کا دفاع کرنے کے لیے  
وقف ہونی چاہیے تھی، انھیں آپس میں برسبریکار رہنا پڑ رہا ہے۔ اب ابجد خوان بھی اُٹھ کر  
فخرِ غزالی و رازی بن جاتا ہے اور تحقیق کے نام پر مقدس شجرِ اسلام کی اپنی عقل و دانش کے مطابق  
کاٹ چھانٹ شروع کر دیتا ہے۔ مٹھوٹ کاریگر ہونے کے باعث اصلاح کے نام پر فتنہ بازی اور  
ملتِ اسلامیہ سے غیر خواہی کے پردے میں اُسے اتنا نقصان پہنچا جاتا ہے جتنا غیر مسلم بھی  
نہیں پہنچا سکتے۔ جیسے غورنہ کے غزالی و رازی (رحمۃ اللہ علیہما) جیسے آسمانِ علم و عرفان کے ماہِ تمام  
اور جنید و بایزید نیز غوثِ اعظم و مجتہدِ دہلوی جیسے بحرِ معرفت کے شناور و میدانِ طریقت کے  
شہسوار تو تقلید سے مستثنیٰ نہ ہوتے، اُنھوں نے قطعاً انکار نہ کیا لیکن چودھویں صدی کے ان  
بکھاری، ترمی اور مسکات پڑھے ہوئے صاحبان کو تقلید سے آزاد ہونے اور ائمہ مجتہدین پر

لعن طعن کرنے کا خدائی پرمٹ مل گیا ہے؛ کیا یہ حضرات اُمتِ محمدیہ کے اُن لاکھوں اکابر سے علم و عرفان میں ممتاز ہیں جو ہر دور میں اسلام کی حقانیت کے زندہ ثبوت اور راہِ ہدایت کے بلند و بالا اور روشن مینار تھے؛ کاش! یہ محقق ہونے کا دعویٰ کرنے والے کبھی اُن اکابر کے علم و عرفان کو سامنے رکھ کر اپنے گریبانوں میں جھانکنے اور اُن بزرگوں کے حضور اپنی علیت و قابلیت کا عدو دار لہہ ناپنے کی زحمت گوارا فرمائیں، تو محقق کا سارا وزن چشمِ زدن میں ٹل جائے۔ بلند بانگ دعاوی کا پورا بھرم کھل جائے۔ واللہ یہ مدی من یشاء الیٰ صراطِ مستقیم۔

چونکہ ائمہ مجتہدین نے عرقِ ریزی کر کے قرآن و حدیث سے مسائل کا مجتہدینِ عظام پر طعن استنباط کیا اور اپنی عزیز عمریں فرقہ بازی و فرقہ سازی کے سبب میں خیمہ کر دیں تاکہ آئندہ نسلیں نابلوں کے پیچھے لگ کر اپنی عاقبت برباد کرنے سے بچ جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ائمہ دین کی تقلید پر قائم رہنے سے کوئی فرقہ بن ہی نہیں سکتا۔ ملتِ اسلامیہ کے ٹکڑے کیے ہی نہیں جاسکتے۔ وہابی حضرات نے فرقہ بازی کا دروازہ کھولنے کی خاطر اور فرقہ بازی کا بیج بونے کی غرض سے تقلید ہی کا انکار کر دیا اور جن بزرگوں کی تقلید پر اُمتِ محمدیہ متفق چلی آ رہی تھی اُن حضرات پر ہی زبانِ طعن دراز کرنی شروع کر دی۔ چونکہ مجتہدین حضرات میں سراجِ امتِ محمدیہ امامِ اعظم حضرت لیمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) کی شخصیت سب سے قد آور ہے، اس لیے جتدین حضرات نے حضرت امامِ اعظم قدس سرہ کو اپنا خصوصی ہدف بنایا۔ تقلید کے بارے میں غیر متقلدین حضرات کے سابق امیر مولوی محمد اسمعیل صاحب (المتوفی ۱۲۸۷ھ) نے لکھا ہے:

اس قسم کی سیکڑوں جزئیات مروجہ فقہ کے دفاتر میں موجود ہیں جو عقل و شعور کے دامن کو بڑے زور سے چھینچوڑتی ہیں۔ بجز تقلید اور عصبیت کے اُن کے قبول کے لیے ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔ ان گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ فقہ حنفیہ کے سارے مسائل سطحی اور عدم احتیاط پر مبنی ہیں بلکہ بعض مقامات میں انتہائی لائق اور گہرائی سے کام لیا گیا ہے اور بڑی محتاط روش اختیار فرمائی گئی ہے۔ اس لیے دور اندیش اور محقق علماء کی رائے ہے کہ ان مروجہ

مساک سے کسی مسک کے ساتھ کُلی والستگی نہیں رکھنی چاہیے۔ خذ ما صفاغ  
ماکد پر عمل ہونا چاہیے۔ ۱۷

اس عبارت سے یہ تاثر بھی سامنے آتا ہے کہ اخاف یا دوسرے مساک میں امیرالوہابیہ  
موصوف کے پائے کا ایک بھی عالم پیدا نہیں ہوا کہ موصوف کو سیکڑوں جزئیات فقہ کا صریح غلط  
ہونا نظر آگیا لیکن وہ حضرات انھیں دیکھنے سے قاصر رہے۔ اگر غیر مقلدین حضرات بڑا نہ منائیں تو  
ہم یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ ان حضرات کی تو خاک پا بھی آپ کے ان خانہ ساز محققین سے زیادہ  
عالم تھی، ہاں بعض مسائل میں آپ کو کچی یا کوتاہی جو نظر آتی ہے، اس کے لیے ذرا غور سے  
دیکھ لیجیے کہ یہ آپ حضرات کا اپنا ہی سبب ننگا پن کو نہیں ہے؛ علاوہ بریں غیر مقلد حضرات اگر ایسے  
ایک بھی مسلمہ محقق عالم دین کی نشان دہی نہ کر سکیں جس نے یہ کہا ہو کہ مروجہ مساک میں سے کسی  
ایک کے ساتھ کُلی والستگی نہیں رکھنی چاہیے خذ ما صفاغ ماکد پر عمل ہونا چاہیے، تو  
ہم صرف اتنی ہی گزارش کریں گے کہ فاتقوا الناس السی وقودھا الناس والحجامة یعنی  
اپنی جانوں پر تڑس کھاؤ اور اس آگ سے خود کو بچا لو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اب نمونے کے طور پر مرگدہ غیر مقلدین یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی عبدالعزیز  
محمدی رحیم آبادی دالمترنی ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء کاہ خراش تبصرہ اور چاند کی طرف متوجہ ملاحظہ ہو،  
بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ سے چونکہ حدیث کی روایت تداروسہ الا ماشاء اللہ  
اور یہ فن حدیث میں سبے مائیکلی اور نقصان اجتناب کی دلیل تھی لہذا المعانی لوگ اس کو  
یوں مٹانا چاہتے ہیں کہ امام صاحب کو شرط روایت میں شدت و احتیاط تھی۔  
بجلا امام صاحب کو روایت میں تو یہ احتیاط تھی لہذا قیاس میں احتیاط نہ ہوئی  
کہ شریعت محمدی میں بلاتامل اپنی عقل پر اعتماد کر کے حکم شرع لگا دیا اور علیٰ ہذا  
یہ کہنا کہ امام صاحب نے یہ اصول قائم کیے، یہ سب سبے سر دیا باتیں ہیں جن  
کا کوئی ثبوت نہیں اور علمائے مقبولین کی تصریحات اس کے خلاف موجود ہیں۔

۱۷ محمد اسماعیل، مولوی، مقدمہ حسن البیان، ص ۱۷

۱۸ عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی، حسن البیان مطبوعہ لاہور، بار سوم، ص ۸۲، ۸۳

اگر موصوف کی اس ذہرافشانی میں ذرا بھی صداقت تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُمتِ محمدیہ کے اکثر اکابر جو حضرت امام المسلمین قدس سرہ کی شان میں رطب اللسان رہتے ہیں اور ہمیشہ اُن کی علیت کو خراج عقیدت پیش کرتے آئے ہیں، اُن میں سے ایک بھی زیورِ علم اور تقویٰ و طہارت سے آراستہ نہیں تھا کہ علمِ حدیث سے ناواقف اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کو مسخ کرنے والے کی امامت پر متفق رہے۔ کاشش! یہ بتہ عین حضرات اس طرح اُمتِ مرجمہ کو اُمتِ طعوبہ ٹھہراتے وقت کبھی گریبانوں میں جھانک کر بھی دیکھ لیا کریں اور اُن بزرگوں کے حضور اپنی لیاقت کا اندازہ کر کے کچھ تو خوفِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا کو ملحوظ رکھا کریں۔ موصوف نے امام المسلمین قدس سرہ سے کہورت رکھنے کا یوں بھی اظہار کیا ہے:

”اُن (محدثین) کا استناد تو کتاب و سنت و آثارِ صحابہ ہی پر ہے البتہ جن لوگوں کے پاس قیاس کا ہتھکنڈہ موجود تھا انہوں نے طلبِ حدیث میں زحمتِ سفر و مشقت اٹھانے کی نہ ضرورت دیکھی نہ کی۔ جو مسئلہ پیش آیا اسی ہتھکنڈے (قیاس) سے فوراً جواب دے دیا۔ ایسے لوگ اُس وقت قیاس کہلاتے تھے، جیسا کہ صاحبِ سیرۃ النعمان نے صفحہ اول میں خود اقرار کیا ہے۔ علاوہ امام ابوحنیفہ کے مناظرے جو آپ نے نقل کیے ہیں، وہ بھی اسی کے سناہد ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے قیاس ہی سے جواب دے دئے اور شرعیہ کا وہاں نام بھی نہ تھا۔“

یہ ہے بتہ عینِ زمانہ کا چاند کی طرف تھوکتا اور ساری اُمتِ محمدیہ کو شریعتِ محمدیہ کا مخالف ٹھہرانا کہ جو شخص اولاً شرعیہ سے واقف ہی نہیں تھا، اُسے امام الائمہ اور سراجِ اُمتِ محمدیہ مانتے چلے آ رہے ہیں۔ بہر حال وہ اکابر جو اپنے اپنے دور میں سرمایہٴ روزگار تھے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں نذرانہٴ عقیدت پیش کرتے آئے، اُن کے مقابلے پر چند بتہ عینِ زمانہ کی غوغا آرائی کہاں قابلِ التفات ہے؟ علاوہ بریں جب ان حضرات نے توہین و تنقیصِ شانِ رسالت کو اپنا محبوب مشغلہ اور اپنے دین کا رکنِ اعظم بنایا ہوا ہے، تو امام المسلمین قدس سرہ

لے عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی جسس البیان، ص ۹۱

کی ایسے لوگوں کی زبان و قلم سے تنقیص ہونا کون سا عملِ تعجب یا زالی بات ہے؟ ان حضرات کی ایسی زیرِ افشانیوں کا جائزہ ہم نے ابک مقالے میں لیا ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ نئی آب و تاب سے منظرِ عام پر جلوہ گر ہونے والا ہے۔

چونکہ وہابی حضرات تقلید سے آزاد اور محقق بن کر شتر بے مہار کی طرح

غلاظت پسندی من مانی کرتے ہیں اس لیے شریعتِ محمدیہ کو ایک کھلونا یا بازیچہ اطفال بنا لیا ہے۔ منی کے بارے میں ان کے شیخ النکل یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

”بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منی پاک ہے“

یہ بڑے میاں کی تحقیق تھی اب ایک چھوٹے میاں کی زبانی سنیے اور ان کی طہارت پسندی کی داد دیجئے۔ انہوں نے بھی بڑی دھوم دھام سے اپنی تحقیقِ ائینق کے وہابیہ کی خاطر یوں انمول موتی بکھیرے ہیں:

”لیکن صحیح قول یہی ہے کہ منی پاک ہے“

”صواب یہ ہے کہ دونوں (مرد و عورت) کی منی پاک ہے“

ان حضرات کی طہارت پسندی کا اس سے بھی بڑا تمغہ ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف کہتے ہیں:

”جب چچ عورت کی فرج سے باہر نکلے اور اس پر فرج کی رطوبت ہو، تو وہ بھی پاک ہے“

”زیادہ تر صحیح قول یہ ہے کہ سگتے اور خنزیر کے سوا اور سب جانوروں کی منی

پاک ہے“

وہابی حضرات اپنی یا کسی اور کی یا سگتے اور خنزیر کے سوا کسی بھی جانور کی منی میں لٹھرے ہوئے ہوں تو ان کی پاکی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب وہ نماز کی تیاری کریں گے۔ وضو کے لیے کیسا پانی درکار ہے؟ چنانچہ کنویں کے

لے نذیر حسین دہلوی، مولوی، فتاویٰ نذیریہ، جلد اول، ص ۱۹، لے ابو الحسن، مولوی، فقہ محمدیہ کلاں، ص ۱۱

لے ایضاً: ص ۲۳

لے ایضاً: ص ۱۱

لے ایضاً: ص ۱۱

پانی کی پاکی ناپاکی کے سلسلے میں میاں تذیر حسین صاحب سے سوال ہوتا ہے جو مع جواب ملاحظہ ہو:

سوال: چہ فرمایند علمائے دین و دین مسئلہ کہ اگر سگ در چاہ افتاد چہ حکم است۔ پتہ نوا۔  
جواب: حکم چاہ مذکور آنست کہ اگر آب آن چاہ از افتادن سگ متغیر شدہ است  
بلکہ بر حال خود است آن چاہ طاهر است۔

اب مولوی عبدالستار دہلوی کی سن لیجیے کہ اس بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں:

کنویں میں چوہا وغیرہ گر جائے تو کنواں ناپاک نہ ہوگا کیونکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ  
میں مدینہ کے نواح میں بڑا بڑا تھا، جس میں حیض کے کپڑے، مردار کے گوشت  
کی ہڈیاں گرتی تھیں، لوگ اُس سے پانی پیتے تھے۔ آپ کو بھی اُس سے پانی دیا  
جاتا تھا۔ آپ سے اس مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: ان الماء طہور لا ینجسہ  
شئ۔ کہ پانی پاک ہے، اُس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔

اپنی غلاظت پسندی کی عادت کو پورا کرنے کی خاطر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی  
افراء کر دیا۔ سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیسی کیسی نجاستوں، غلاظتوں کے پلا  
دینے کا دعویٰ کر دیا، پھر پانی کے کسی صورت میں ناپاک نہ ہونے کا حکم بھی اُس سرکار کی جانب  
زیان زوری سے منسوب کر دیا۔ مزید ملاحظہ ہو:

سوال (۱۰۱): ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً دس بارہ سال تھی، کنویں میں گر کر  
مرگئی اور مردہ حالت میں باہر نکالی گئی، جس کا سر بالکل پھٹا ہوا تھا۔ کنویں کی  
گہرائی تقریباً ۲۵ گز سے ۴۰ گز ہے۔ اس میں تقریباً پانی آٹھ فوٹ موجود  
رہتا ہے۔ اس کی صفائی کا حکم کس طرح ہے؟ تقریباً اُس لڑکی کی لاش کنویں میں  
دو گھنٹہ رہی۔

جواب: صورت مسئلہ میں واضح ہو کہ پانی کا مزہ یا بو یا رنگت بدل گیا ہے

لے تذیر حسین دہلوی، مولوی، فتاویٰ تذیریہ، ج ۱، ص ۲۰۰

لے عبدالستار دہلوی، مولوی، فتاویٰ ستاریہ، ج ۴، ص ۱۶۷

تو تمام پانی نکالا جائے گا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ لقولہ علیہ السلام  
 الماء طہور لا ینجسہ شیء الا ما غلب مریحہ او طعمہ او لونہ  
 بنجسہ تحدث فیہ۔ نیز نبی علیہ السلام کا فرمان ہے، اذا کان الماء  
 قلتین لم یحمل الخبث۔ یعنی جبکہ دو قلعے پانی ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔  
 اب خواہ اس کو کوئی استعمال کرے یا نہیں کرے لیکن شرعاً وہ ناپاک نہیں۔  
 غیر متقلدین حضرات کے نزدیک قلتین یعنی دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جگہ موجود ہو تو وہ جاری پانی  
 کا حکم رکھتا ہے اور حبت تک اس کا رنگ، مزہ یا بو نہ بدلے کسی نجاست کے باعث اس پر  
 ناپاکی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ وہ پاک ہی قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ میاں نذیر حسین دہلوی نے  
 لکھا ہے،

نراد پانی سے یہاں پانی قلیل (دو بڑی مشکوں سے کم) ہے، اگر کثیر (دو بڑی  
 مشکوں کے برابر) ہو، حکم جاری کا رکھتا ہے اور نجس نہیں ہوتا پیشاب وغیرہ سے  
 یہ ہے غیر متقلدین حضرات کی شان تحقیق اور یہ ہے ان کی حدیث سے وابستگی جس کے بل بوتے پر  
 ائمہ دین کفر آتے اور بندگان دین کو قرآن و حدیث سے ناواقف ٹھہراتے ہیں لیکن خود  
 یہ عالم ہے کہ ابوسفیان ظریف بن شہاب بھی ضعیف و متروک راوی کی حدیث کے سہارے  
 سارے جہان کی پلیدی اپنے لیے پاک ٹھہرائی، حالانکہ محدثین نے حدیث قلتین کو مضطرب اور  
 بعض حضرات نے موضوع قرار دیا ہے۔ خود یہ حدیث پر عمل کہ صحیح احادیث کو چھوڑ کر مضطرب و  
 موضوع کو دین و مذہب بنائیں اور اسی بل بوتے پر ائمہ دین کی تحقیقات جلیلہ میں کڑے بتائیں۔  
 اللہ تعالیٰ عقل و دانش عطا فرمائے، آمین۔

کاش! غیر متقلدین حضرات کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا فرمائیں کہ اگر ان کے ایسے  
 مسائل سے غیر مسلم آگاہ ہو جائیں تو مسلمانوں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں وہ

۱۔ عبدالستار دہلوی: فتاویٰ ستاریہ، جلد چہارم، ص ۵۲، ۵۴

۲۔ نذیر حسین دہلوی: معیار الحق، ص ۱۳۲

کیا نظریہ قائم کریں گے؛ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کے نزدیک دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جوہر میں ہو اور اتنے سے پانی میں میٹاب، پائنڈیا مرا ہوا گناہ تہی، چوہا یا کوئی اور نجس چیز پڑی ہوئی ہو، تو یہ پانی غلاظتوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود یہ لوگ پاک سمجھتے ہیں۔ اس سے وضو و غسل کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسے بے دھڑک پی سکتے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ جس کنویں سے پانی پیتے تھے، اسی میں حیض کے لتھڑے کپڑے ڈالے جاتے، اسی میں مردہ جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں پھینک دیتے تھے اور بے دھڑک اسی پانی کو نہ صرف خود پیتے رہتے بلکہ اپنے نبی کو پلاتے اور مسلمانوں کا نبی انہیں اس حرکت سے روکنے کے بجائے ایسی حرکتوں پر اور اُبھارتا کہ خود اس پانی کو پی لیتا اور اُس کے پاک صاف ہونے کا حکم صادر فرما دیتا تھا۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ۔ اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے لیکن غیر مسلم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام میں پاکی ناپاکی کا معیار یہی ہے جو غیر مسلم پر پیش کرتے ہیں تو اس طرح اسلام میں پاکیزگی کا تصور تک نہیں پایا جاتا اور غلاظت پسندی کے باعث یہ ہرگز خدا کے پسندیدہ بندے نہیں ہو سکتے۔

امید ہے کہ یہ زائل تحقیق ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزارِی  
دہائی حضرات اگرچہ قطعاً پلید جوہر کے پانی سے وضو و غسل کر کے بے تکلف عبادات ادا کر سکتے

ہیں، لیکن انہیں اس سے بڑھ کر بھی سہولت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو کہ جنبی و محدث کا اذان پڑھنا صاف جائز قرار دیا ہوا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

”وَجائز است تاذین محدث اگرچہ بظہارت افضل است“

اب سجدہ تلاوت کے بارے میں ان حضرات کے سرگروہ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ موسوف نے لکھا ہے:

”پس اس حدیث سے جواز سجدہ تلاوت بے وضو نیز ثابت ہوتا ہے“

لے نور الحسن خاں، عرف الجادی، ص ۲۲

لے محمد ابوالحسن، مولوی: فقہ محمدیہ کلاں، ص ۹۷



اب ذرا ان حضرات کے غسل کی مزید کیفیت ملاحظہ فرمائی جائے۔ مولوی محمد ابوالحسن صاحب لکھتے ہیں:

”اگر سارا شہد غائب نہ ہو بلکہ بعض غائب ہو اور بعض باہر رہے تو اس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا۔ نہ اس پر غسل واجب ہوتا ہے نہ کوئی اور حکم اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔“

اب میاں تذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی محمد سعید صاحب کی عجیب و غریب تحقیق ملاحظہ ہو، جس سے غیر مقلد حضرات روزانہ فائدہ اٹھاتے اور مزے لٹتے ہوں گے۔ انہوں نے لکھا ہے:

جو اپنی بیوی سے جماع کرے اور انزال نہ ہو تو اس کی نماز بغیر غسل کے درست ہے۔

اب وہابی صاحب وضو کی جانب رجوع فرماتے ہیں۔ اس میں بھی حدت ملاحظہ ہو:

”کافی ہے مسح کرنا پگڑی پر۔“

دوسرے غیر مقلد صاحب کا جوش تحقیق اور شانِ محققانہ بھی قابلِ دیدنی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

”وضو میں بجائے پاؤں دھونے کے مسح فرض ہے۔“

وہابی مردوزن اکٹھے نماز پڑھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

”اسی طرح اگر عدت مردوں کے ساتھ کھڑی ہو جاوے تو جمہور علماء کے نزدیک

اس کی نماز بھی نہیں ٹوٹی اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر عورت مرد کے برابر کھڑی ہو جائے

تو مرد کی نماز ٹوٹ جاتی ہے اور عورت کی نہیں ٹوٹی، لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے۔“

بلکہ غیر متقدمین حضرات کے شیر پنجاب نے تو اس سے بھی جرأت مندانہ فیصلہ صادر فرمایا ہوا ہے۔

۱۔ محمد ابوالحسن، مولوی؛ فقہ محمدیہ کلاں، ص ۶۵

۲۔ محمد سعید، مولوی؛ ہدایت قلوب قاسمیہ، ص ۳۶

۳۔ صدیق حسن خاں، مولوی؛ فتح المنیث، ص ۶

۴۔ محمد ابراہیم، مولوی، قنادی ابراہیمیہ، مطبوعہ الہ آباد، ص ۲

۵۔ محمد ابوالحسن، مولوی؛ فقہ محمدی کلاں، ص ۱۵

سوال: کوئی شخص عورتوں کو عید گاہ میں لے جانے کی کوشش کرے تو اُس کی مخالفت کرنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہرگز مخالفت جائز نہیں! ل

خیر سے غیر مقلد حضرات اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر نماز میں مشغول ہو گئے اب مردوں اور عورتوں کی منی خارج ہونے لگتی ہے تو اُس صورت کے بارے میں انہیں یہ تلقین فرمائی گئی ہے: "اِسی طرح اگر منی اُتر کر ذکر کے درمیان آوے اور وہ شخص نماز کے اندر ہو، وہ اپنے ذکر کو کپڑے کے اوپر سے پکڑ رکھے اور منی باہر نہ نکلے، یہاں تک کہ سلام پھیرے تو اُس کی نماز درست ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ پاک ہے یہاں تک کہ منی باہر نکلے اور عورت کا حکم بھی مانند مرد کی ہے! ل

مندرجہ بالا سوالہ جات سے وہابی حضرات کی نماز کا نقشہ اُن کی محققانہ شان کے باعث یوں سامنے آتا ہے کہ غیر مقلد صاحب اپنی اہلیہ محترمہ سے صحبت کر رہے تھے کہ کسی مسجد سے اذان کی آواز سنئی، انزال ابھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں اُسی طرح لہتھڑے ہوئے نماز کی جانب دوڑے، دونوں نے اُس کنویں کے پانی سے وضو کیا جس میں گتہا گتہا لٹکی لٹکی گڑ گئی تھی اور اس کا سر بھی مچھوٹ گیا تھا یا گاؤں کے جوہڑ پر جا پہنچے جس میں گاؤں کی بھینسیں روزانہ پیشاب گوبر کرتی ہیں لیکن اُس میں پانچ دس بڑی مشکوں کے برابر پانی ہے۔ وضو کرتے ہوئے وہابی صاحب نے پگڑی پر مسح کیا حالانکہ اللہ جل مجدہ نے وَأَمْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ فرمایا ہے لیکن زوالے محققوں نے وَأَمْسَحُوا بِعُنُقِكُمْ بنا لیا ہے اور وہابین صاحب نے دوپٹے پر مسح کر لیا ہوگا۔ اتنی دیر میں ایک صاحب نے حالت جنابت میں اگر اذان پڑھ دی۔ مولوی صاحب حشفہ والا مذکورہ تماشاکر ہی رہے تھے کہ اذان کی آواز سن کر سابقہ وضو سے نماز پڑھانے

۱۔ ثناء اللہ امرت سری، مولوی: فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۳۳

۲۔ محمد ابوالحسن: فقہ محمدی کلاں، ص ۶۹

مصنوع پر کھڑے ہو گئے۔ انزال سے پہلے نماز کی جانب دوڑ آنے والا جوڑا، مولوی صاحب کی اہلیہ محترمہ اور موذن صاحب پیچھے کھڑے ہو گئے۔ سابقہ کرتوت کا خیال آتے ہی مذکورہ جوڑے اور مولوی صاحب و مولون صاحبہ کی منی خارج ہونے لگی۔ فوراً چاروں حضرات کے دائیں ہاتھ اپنے اپنے اُن مقاموں پر ہی پہنچ گئے جہاں پہنچانے کی اُن کے بڑوں نے تلقین فرمائی ہے۔ موذن صاحب نے جب راجہ اندر کے اکھاڑے کا یہ تماشا دیکھا تو اُن کے جذبات بھی بے قابو ہو گئے۔ مجبوراً انھیں بھی اپنا دایاں ہاتھ مقام خاص پر پہنچانا پڑا۔ پانچوں حضرات کا ایک ایک ہاتھ قیام ہو یا قعدہ، رکوع ہو یا سجدہ ہر حالت میں اُسی مقام پر ڈٹا ہوا ہے جہاں اُس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور جہاں پانچوں کی توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ رفع یدین کا مسئلہ بھی بگڑ کر رفع یدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ سلام پھیرتے ہی پانچوں بغیر دُعایا مانگے اُسی طرح ہاتھوں سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے جلد از جلد باہر دوڑ گئے۔ اگر دُعایا مانگتے تو ہاتھ ہٹانے پڑتے، جس سے مصلحہ خیر سیل رواں آجاتا۔ یہ تھی وہ محققانہ نماز جس سے پانچوں نے فرانت پائی۔ بجز غیر مقلد حضرات کے ایسی عبادت گزارا کس کے حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ جلد مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرماتے۔ آمین۔

غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے  
دہا بی و نجدی حضرات قبر مشکنی میں شہرہ آفاق ہیں  
مولوی محمد اسماعیل دہلوی تو اس مرحلے تک

پہننے سے پہلے ہی پٹھانوں کے ہاتھوں ذبح ہو چکے تھے۔ غیر مقلد حضرات کے ہاتھوں میں ہزار جتن کے باوجود صرف قلم ہے، جس سے وہ اکابر دشمنی کی بھر اس نکال لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد اسماعیل غزنوی نے لکھا ہے:

”آج کل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبے بنائے گئے ہیں، وہ بھی بطور ایک بت کے ہیں۔“

اب غیر مقلد حضرات کا دوسرا مشغلہ ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی عبدالستار دہلوی جو اب دیتے ہیں؛  
سوالے (۷۰) زید کتاب ہے کہ مسجد میں محراب بنانا جائز ہے اور غمسر و

کتا ہے کہ جائز ہے۔ جواب طلب امر یہ ہے کہ قولین میں سے کون سا قول صحیح اور قابل قبول ہے؟ (عبدالودود - قصبہ جہالو)

جواب: بے شک مساجد میں محراب مرقوبہ کا بنانا ناجائز اور بدعت ہے۔<sup>۱</sup> تیسرا مشغلہ کہ نوافل کی کثرت اور شب بیداری بھی ان حضرات کے نزدیک ممنوع و بدعت ہے۔ مولوی عبدالستار صاحب سے اس کے متعلق سوال ہوا جو مع جواب ملاحظہ فرمائیے؛

سوال (۸۱) شب برات یعنی ۲۴ تاریخ شعبان کو اکثر عورتیں مرد نفلیات رات بھر پڑھتے ہیں، اس کا ثبوت شریعتِ محمدیہ میں ہے یا نہیں؟

جواب: شب برات کو رات بھر نفلیات وغیرہ پڑھنا بدعت ہے اور اپنی جانب سے دین اکمل کے اندر زیادتی کرنی ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔<sup>۲</sup> چوتھا مشغلہ سالانہ ہے، جس پر یہ حضرات عید الاضحیٰ کو عمل پیرا ہوتے ہوں گے؛

سوال (۱۹۰) معروض آنکہ زمانہ حال میں چیزوں کی گرانی حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس وجہ سے امسال قربانی کا جانور پندرہ بیس روپے سے کم ملنا دشوار ہے۔ بندہ نے سنا تھا کہ پہلے کسی صحیفہ میں یہ مضمون نکل چکا ہے کہ مرغ کی قربانی بھی جائز ہے۔ فرمانِ نبوی الذین یُسْرُوا اور فسران الہی مَا جَعَلَ فِي السِّدِّينِ مِنْ حَرْجٍ كَمَا جَعَلَ فِي السِّدِّينِ اگر آپ مرغ کی قربانی جائز سمجھتے ہوں تو بندہ کی تحقیق کرا دیں۔ (از مولوی محمد ضلع فیروز پور)

جواب: شرعاً مرغ کی قربانی جائز ہے۔<sup>۳</sup>

پانچواں مشغلہ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کو مشرک و بدعتی سمجھنا اور ان سے مقاطعہ کرنا بھی ملاحظہ ہو:

<sup>۱</sup> عبدالستار، مولوی؛ فتاویٰ ستاریہ، جلد اول، ص ۶۳

<sup>۲</sup> ایضاً، ص ۶۷

<sup>۳</sup> فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۶۲

سوال: نام کا مسلمان، شریکہ افعال کرنے والے کا نکاح موعده عورت سے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: حرام ہے۔" ۱

سوال (۱۱۱): عند اللہ و عند الرسول نکاح کس بات سے ٹوٹ جاتا ہے؟  
جواب: عورت موعده مسلمہ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو اور خاوند مشرک، بدعتی، مولود پرست، گیارہویں پرست، تعزیر پرست وغیرہ یا تارک صوم و صلوٰۃ ہو وغیرہ یا اس کے برعکس، بس نکاح ٹوٹ گیا۔ لَاهُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ  
وَلَهُمْ بِحُلُوْنِ لَهُنَّ" ۲

اگر غیر مقلد حضرات کے ایسے فتووں کو شرعی حکم کے منظر سمجھ لیا جاتے تو کتنے فیصد نکاح آج درست قرار پاسکتے ہیں؟ غیر مقلد حضرات غرر تو فرماتیں کہ ان کے فتووں کی رو سے کتنے مدعیان اسلام بلکہ ان کے ہم مشرب بھی ولد الزنا قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیان اسلام کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔ اسی تصویر کا یہی افسوسناک رخ قارئین حضرات مزید ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ مرقوم ہے:

سوال (۳۵۴): اگر نام کا حنفی باپ ہو یا ماں ہی کیوں نہ ہو، ان کی دنیاوی خدمت بجالانی کیسی ہے اور ان کا جنازہ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟  
مخالفت اسلام ہونے کی وجہ سے ولی تو ان کی خدمت کو بھی نہیں چاہتا۔

جواب: والدین کی دنیاوی امور میں اطاعت خدمت کرنی چاہیے بقولہ تعالیٰ وصاحبہما فی الدنیا معروفاً (الایہ) اور اگر بے نماز مشرک ہیں تو نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے" ۳

۱۔ فتاویٰ ستاریہ، جلد اول، ص ۴۴

۲۔ ایضاً، ص ۷۸

۳۔ عبدالستار، مولوی: فتاویٰ ستاریہ، جلد سوم، ص ۳۸



جواب: حدیث شریف میں بطور دوائی استعمال کرنا جائز آیا ہے، جن کو نفرت ہو وہ نہ پئے، لیکن حلت کا اعتقاد رکھے۔ ایسا ہی گائے بکری کے بول کے متعلق بھی آیا ہے: لا بأس ببول ما یؤکل لحمہ ۱۱

اب غیر تقلیدین کے دوسرے مشروب مغرب کا ذکر ہو جانا چاہیے جس کی نہریں تقریباً ہر گھر میں رواں ہیں۔ کسی صاحب کے سوال پر ان حضرات کے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی کا جواب ملاحظہ ہو:

سوال: ایک شخص زوجہ اپنی سے ہم خلوت تھا اور غلیان شہوت بوقت مجامعت کے زوجہ اپنی سے مساس کرتے ہوئے پستان منہ میں لے گیا اور زوجہ اس کی طفل کیسا لڑو دودھ پلاتی تھی، اُس شخص کے حلق کے اندر ایک باریا کہ دو بار دودھ چلا گیا۔ آیا وہ شخص زوجہ اپنی کا فرزند رضاعی ہو گیا یا کہ شوہر رہا اور اس فعل کے باعث سے زوجہ اُس کے نکاح میں داخل رہی یا کہ نہ رہی؟

سوال: دیگر، یہ کہ مدت رضاعت کی آیا نو رسالی میں ہے یا کہ جوانی میں رہے گی اور عورت کا دودھ اگر کسی زخم میں یا کہ ذکر کے سوراخ میں یا کان میں بہت کتنے طیب کے ڈالا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بیوا تو جرد۔

الجواب: وہ شخص اپنی زوجہ کے دودھ پینے کی وجہ سے اپنی زوجہ کا فرزند رضاعی نہیں ہو گیا بلکہ وہ علی ما لہ شوہر رہا اور اس کی زوجہ اُس کے نکاح میں داخل رہی۔ اس وجہ سے کہ مدت رضاعت میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت

ہوتی ہے اور بعد مدت کے ثابت نہیں ہوتی اور مدت رضاعت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ڈھائی برس ہے صاحبین اور علماء جمہور کے نزدیک دو برس ہے اور کسی زخم یا سوراخ ذکر یا کان میں عورت کا دودھ ڈالنے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ حررہ سید شریف حسین  
یعنی عنہ۔ سید محمد نذیر حسین

۱۱۔ شفاء اللہ امرت سہری، مولوی: فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۵۵

۱۲۔ نذیر حسین دہلوی، مولوی: فتاویٰ نذیریہ، جلد دوم، ص ۳۹۶

marfat.com

Marfat.com

غیر مقلد حضرات نے اس مرحلے پر اپنی شانِ تحقیق سے ایک عجیب و غریب مسئلہ گھڑا اور عیاشی و نفس پرستی کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر کے بے راہ رو اور عیاشی جلتے سے خراجِ تحسین حاصل کر لیا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کو دودھ (اپنی پستان سے) پلا دے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اُس مرد کا دودھ پلانے والی عورت کو اور اُس عورت کا دودھ پینے والے مرد کو دیکھنا جائز ہو جائے گا۔ ناشر غیر مقلدیت، نواب آف جمپال جناب مولوی صدیق حسن خاں فتوحی صاحب رقمطراز ہیں:

وَيَجُوزُ اِرْضَاعُ الْكَبِيرِ وَلَوْ كَانَ ذَا الْحَيَاةِ لَتَجَوَّزَ النَّظَرُ ۱۷

دوسرے ناشر غیر مقلدیت مولوی وحید الزمان خاں حیدر آبادی یوں لکھتے ہیں:

وَيَجُوزُ اِرْضَاعُ الْكَبِيرِ وَلَوْ كَانَ ذَا الْحَيَاةِ لَتَجَوَّزَ النَّظَرُ خِلَافًا

لِلْجَمْعِ هُوَ ۱۸

یعنی بڑے آدمی کو دودھ پلانا جائز ہے خواہ وہ وارثی والا ہی کیوں نہ ہو اور یہ اس لیے ہے کہ اُس عورت کو دیکھنا جائز ہو جائے اگرچہ یہ نظریہ جمہور کے خلاف ہے۔

اب غیر مقلد حضرات کے خصوصی اور ناپسندیدہ ماکولات کا ذکر ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ

مولوی عبدالستار دہلوی نے گوہ کی حلت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے

”ضَبُّ يَعْنِي كَوْنَهُ حَلَالًا هُوَ“ ۱۹

موصوف نے اسی تفسیر کی کتاب کے اسی صفحے پر اپنی اس تحقیق سے بھی توازا ہے:

”كُجَّوْا عِلَالًا هُوَ“ ۲۰

پس نواب صاحب پر کسی گھوڑے نے دولتی جھاڑ دی ہوگی، لہذا یوں فتویٰ داغ دیا جاتا ہے:

۱۷ صدیق حسن خاں جمپالی، مولوی، روضۃ الندیہ، ص ۲۳۶

۱۸ وحید الزمان خاں، مولوی، نزل الابرار، جلد دوم، ص ۷۷

۱۹ عبدالستار، تفسیر ستاری، ص ۲۶۹

۲۰ عبدالستار، تفسیر ستاری، ص ۲۶۹



”گوشتِ اسپِ حلال است“ لہ

مولوی عبدالستار صاحب سے بچو کی حلت و حرمت کے بارے میں سوال ہوا۔ موصوف نے  
 قبیح حدیث بن کر جو جواب مرحمت فرمایا وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے:

سوال (۲۷۷): ایک شخص بنام فحشی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے بچو کے متعلق فرمایا ہے کہ بچو حلال ہے۔ جو شخص بچو کا کھانا حلال نہ جانے، وہ  
 منافق بے دین ہے۔ اس کی امامت ہرگز جائز نہیں۔ دوسرا شخص بنام محمد  
 کہتا ہے کہ بچو کا کھانا حلال نہیں، ہاں شکار جائز ہے اور بچو کے حلال نہ جاننے  
 والے کو منافق و بے دین کہنا جائز نہیں بلکہ تشدد ہے۔ دونوں میں سے کس کا  
 قول صحیح ہے؟ (سائل حاجی محمد صاحب بہاولپوری)

جواب: فحشی کا قول صحیح ہے اور موافق حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بچو  
 گوشتاً مکروہ منوع ہے مگر شرعاً منوع نہیں۔ لہ

یہاں تک تو ان حضرات کا ذکر ہے جن سے صرف ایک آدمی جانور ہی حلال ٹھہرایا جاسکا  
 لیکن جب غیر مقلدین کے بقیتہ السلط و عمدة الخلف مولوی ثناء اللہ امرت سہری کی باری آئی تو  
 انھوں نے شیر پنجاب بن کر وہ دلیری دکھائی کہ سانس، گلے، پیرے اور چینی بھی ہاتھ ملتے  
 رہ گئے۔ ان کے جملہ ماکولات غیر مقلدین نے اپنے لیے حلال ٹھہرایے۔ اب موصوف کا وہ فتاویٰ  
 ملاحظہ فرمائیے،

سوال: کچورا، کوکرا اور گھونگا حرام ہیں یا حلال؟ از روئے قرآن و حدیث  
 جواب ہو۔

جواب: قرآن و حدیث میں جو چیزیں حرام ہیں ان میں یہ تینوں نہیں اور حدیث شریف  
 میں آیا ہے ذرونی ما تو صکتہ۔ جب تک شرع بند نہ کرے، تم سوال نہ کیا کرو۔

لہ فور الحسن خاں، حوت الجادی، ص ۱۰

لہ عبدالستار، فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۲۱

ان تینوں سے شرع شریف نے بند نہیں کیا، لہذا حلال ہیں۔

وہابی حضرات ذرا ان اشیاء کی فہرست تو پیش کریں جن کو قرآن و حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔ تاکہ ہم ان کے حلال جانوروں کی فہرست میں بیش بہا اضافہ کر دیں۔ فہرست پیش کرنے پر غیر مقلد حضرات کہتی ہی ان چیزوں کو حلال ماننا پڑے گا جو حلال ہرگز نہیں ہیں یا انہیں بر ملا اعتراض کرنا پڑے گا کہ قرآن و حدیث نے حلال و حرام کے بارے میں کچھ اور ہی ضابطہ مقرر فرمایا ہے جسے یہ نام نہاد محققین عوام الناس سے چھپاتے ہیں تاکہ شریعت محمدیہ کا ہر طرف سے اپریشن کر سکیں۔

غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی کا کام ہے یا اس کی عطا سے حبیب خدا،

خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل تھا۔ اہل علم کا کام حلال کو حرام قرار دینا نہیں بلکہ اللہ و رسول رحمت جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکامات کو بیان کرنا ہے۔ غیر مقلدین حضرات نہ صرف محقق بن کر ائمہ مجتہدین کے مقام پر سینہ ندوی سے فائز ہونا چاہتے ہیں بلکہ اندرون خانہ اللہ اور رسول کا کام بھی خود ہی سنبھال کر حلال و حرام قرار دینے بیٹھ جاتے ہیں۔ مٹھوٹ کاریگر کی طرح اس میدان میں بھی ان حضرات نے اپنی تحقیق کے خوب ہی گل کھلائے اور مضحکہ خیز فتوے داغے ہیں، چنانچہ نواب آف جمپال، مولوی صدیق حسن خاں قنوجی کے فرزند مولوی نور الحسن خاں نے اپنے ہی نظفے کی لڑکی سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

و نیست و جہ از برائے منع نکاح اُس بیٹی سے ممانعتِ نکاح کی کوئی وجہ  
 با دختر کیہ این کس با مادرش زنا نہیں جس کی ماں سے اُس شخص نے زنا  
 کرد زیرا کہ تحریم محارم محرمانت کیا ہو، کیونکہ محرمات کا ذی محرم کے لیے  
 بشرع است و شرع تحریم بنت حرام ہونا شرع سے ہے اور شریعت میں  
 شرعی آمدہ و این دختر بنت شرعی شرعی بیٹی کی حرمت آئی ہے جبکہ نہ ترکی  
 نیست تا داخل باشد زیر قولہ شرعی بیٹی نہیں ہے کہ حکم ریائی بیٹیاں تھا

لے ثناء اللہ امرت سرنی، مولوی، فناء، سنائیہ، جلد اول، ص ۵۵

تعالیٰ وَبَنَاتِكُمْ وَتَوَّابٌ كَقَوْلِهِمْ كَقَوْلِهِمْ  
 کہ اسم بنت لاسحق مخلوقہ بملاد اوست  
 زیرا کہ این طوق اگر بشرع است  
 پس باطل است و اگر مراد آنست  
 کہ غیر شرعی است پس مضرانیت  
 چرا کہ مخلوق از آب اوست لیکن  
 این آب نہ آب است کہ بدان  
 طوق نسب ثابت شد بیکہ آب  
 است کہ صاحب اور اجز حجر  
 حاصل و گیر نیست۔" ل

لیے حرام ہیں کے حکم میں داخل ٹھہرے اور ہم  
 نہیں کہہ سکتے کہ بیٹی کا نام اس کے مخلوق پانی  
 کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ (بیٹی کہنا) اگر است  
 شرعی قرار دیں تو باطل ہے اور اگر اس سے  
 مراد یہ ہے کہ (بیٹی ہونا) غیر شرعی ہے۔ تو یہ  
 بات ہمارے لیے مضر نہیں ہے کیونکہ اگرچہ  
 یہ لڑکی اس کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے،  
 لیکن یہ نطفہ وہ نطفہ نہیں ہے جس سے نسب  
 ثابت ہو جاتے بلکہ ایسا نطفہ ہے جس سے  
 پتھر کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔

اب عالی جناب مولوی وحید الزمان خاں صاحب حیدرآبادی کی تحقیق انیق ملاحظہ ہو:

وَلَوْ زَنَّا بِمَا مُسَوِّغَاتُ لَعَلَّ لَنَا  
 اُمَّهَاءٌ وَمِثْلًا لَّهٗ

اور اگر کسی عورت سے زنا کیا تو اس آدمی  
 کے لیے مذکورہ عورت کی ماں اور بیٹی جائز ہے۔

یہی حیدرآبادی صاحب غیر متقلدین کے لیے مزید گنجائش یوں پیدا فرماتے ہیں:

ولو جامع احد زوجة ابیه  
 سوا مکان بالغا و غیر بالغ  
 صغیراً او مراہقا لم یحرم  
 علی ابیه لما قد منات  
 حرمة المصاهرة لا تثبت  
 بالزنا لہ

اگر کسی نے اپنے باپ کی زوجہ سے مجامعت  
 کی، خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ، چھوٹا ہو یا  
 بچہ بچہ۔ اس کے باپ پر وہ عورت حرام  
 نہیں ہوگی، جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں  
 کہ زنا سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں  
 ہوتی۔

لہ نور الحسن خاں، مولوی، ہفت الجاری، ص ۱۰۹

لہ وحید الزمان خاں، نزال الابار، ج ۲، ص ۱۱ لہ ایضاً، ص ۲۸

اب ذرا اسی تصویر کا رخ ملاحظہ فرما کر ان حضرات کی جرأت و جسارت کا اندازہ کیجیے کہ شریعتِ محمدیہ کو انگریز بہادر کے وظیفوں کی خاطر کس طرح نیچے کے ہاتھ کا کھلونا بنایا ہوا تھا، چنانچہ لکھا ہے:

وکلک لوجامع نروجة اسی طرح اگر کسی نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے  
ابنہ لا تحرم علی ابنہ۔ جماع کیا تو وہ عورت اُس کے بیٹے پر حرام  
لہ نہیں ہوگی۔

وہابی مذہب کیا ہوا، عیاشی کے مفت پرٹ تقسیم کرنے والوں کی منڈلی ہو گئی۔ اپنے نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز، بہو سے زنا کیا تو وہ لڑکے پر حرام نہ ہوئی، لڑکے نے باپ سے بدلہ لیا اور ستیلی ماں سے زنا کیا تو وہ باپ پر حرام نہیں ہوئی۔ جس سے زنا کیا اُس کی ماں اور بیٹی سے نکاح حلال۔ سارے مزے وہابیوں کے گھر میں جمع ہو گئے۔ خیر یہ چھوٹے میاؤں کے فتوے تھے ان پر بڑے میاں اور اُن کے شیخ النکل، مولوی نذیر حسین دہلوی کی فہر تصدیق دکھا دی جائے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ سوالِ جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے باعوانِ نفسی آثارہ ایک عورت سے زنا کیا۔ بعد اس کے مزنیہ کی لڑکی سے نکاح کیا اور بعد نکاح کے بھی دونوں سے وطی کی، تو نکاح درست ہوا یا نہیں؟ بر تقدیر عدم جواز صورتِ نباہ کی ہے یا نہیں؟ بنیوا تو جردار۔

الجواب: نکاح مذکور درست ہوا، اس لیے کہ یہ عورت اُن عورتوں میں سے نہیں جن سے نکاح حرام ہے۔ لہ

عیاشی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر چودھوی صدی کے محققین نے متعہ کی اباحت کا حکم بھی صادر فرمایا ہوا ہے تاکہ ضرورت مند حضرات مزے اڑائیں اور نرالی محققین کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ لکھا ہے:

لہ وجہ الزماں خاں: نزل الابرار، ج ۲، ص ۲۸

لہ نذیر حسین دہلوی: فتاویٰ نذیریہ، جلد دوم، ص ۱۰۶

وذلك بعض اصحابنا في  
 نكاح المتعة فجوزها لانه  
 كان ثابتاً جازاً في الشريعة  
 كما ذكره في كتابه فما  
 استمتعتم به منهن فاتوهن  
 اجورهن قرأه ابي بن كعب و  
 ابن مسعود فما استمتعتم به منهن  
 الى اجل مسمى يدل صراحة  
 على اباحة المتعة فالاباحة  
 قطعية لكونه قد وقع الاجماع  
 عليه والتحريم ظني له

اور اسی طرح ہمارے بعض اصحاب ( وہابی  
 علماء) نے نکاحِ متعہ کو جائز قرار دیا ہے  
 کیونکہ شریعت سے اس کا جائز ہونا ثابت  
 ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے فما  
 استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن ابن ابی  
 کعب اور عبداللہ بن مسعود کی قرأه فما  
 استمتعتم به منهن الى اجل مسمى  
 متعہ کی اباحت پر صراحتاً دلالت کرتی ہے۔  
 پس (متعہ کی) اباحت قطعی ہے کیونکہ اس پر  
 اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اس کی تحسیریم  
 ظنی ہے۔

ان محققین نے گھر کے اندر اور باہر چہا نشی کے پرمٹ تقسیم فرمادیں۔ خالص زنا پر اباحت و  
 جواز کی شرعی مہریں لگا دیں۔ بعدہ خیال آیا ہوگا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ گھر میں  
 کسی سے زنا کر سکیں نہ متعہ کی استطاعت رکھتے ہوں، ان کی سہولت کے پیش نظر مُشت زنی  
 کو مباح بلکہ واجب تک قرار دے دیا گیا، تاکہ وہابی شریعت کی بہتی گنگا میں وہ بھی ہاتھ  
 دھولیں اور محروم نہ رہیں۔ چنانچہ سبق پڑھایا ہے،

بالجدة استنزال منى بكهف و بجزیرے  
 از جمادات نزد وعائے حاجت  
 مباح است ولا یسا چون فاعل  
 ناشی از وقوع و رفقہ یا معصیت  
 کہ اقل احوالش نظر باز لیست

الغرض منی کا ہاتھ سے یا جمادات کی قسم سے  
 کسی چیز کے ساتھ خارج کر دینا بوقت  
 ضرورت مباح ہے، خاص طور پر جب  
 فاعل کو فتنہ یا معصیت میں پڑنے کا خطرہ  
 ہو، کہ اُس کی نگاہ نے اُسے مجبور کر دیا ہو

لہ وجہ الزمان خاں: نزل الابرار، جلد دوم، ص ۳

باشد کہ دریں عین مندوب است تو ایسے موقع پر (مشت زنی) مباح ہے  
بلکہ گاہے واجب گردرد۔ لے بلکہ کسی وقت واجب بھی ہو جاتی ہے۔

۵ کیا خیر تھی کہ لے کر چراغِ مُصطفوی

جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

موصوف نے اسی کتاب میں دوسرے مقام پر اس کا رد و لائق صد نفرین حرکت کو خوفِ خدا اور

خطرہ روز جزا سے عاری ہو کر صحابہ کرام علیہم السلام کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

بعض اہل علم نقل میں استثناء بعض اہل علم نے مشت زنی کو صحابہ سے

از صحابہ نزد غیبت از اہل خود نقل کیا ہے کہ جب کوئی اپنے اہل و عیال سے

کروہ اند و در مثل این کار حرجے دور ہو تو اس وقت اس کام کے کرنے

نیست بلکہ ہجو استخراج دیگر میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ جسم کے دوسرے

فضلات مؤذیر بدن است۔ لے نقصان پہنچانے والے فضلات کی طرح

خارج کرنا ضروری ہے۔

اگر غیر مسلم ان حضرات کی تعلیمات کو دیکھیں تو جائے غور ہے کہ وہ دین برحق کے بارے

میں کیا رائے قائم کریں گے؟ کیا یہی ہیں وہ اسلامی تعلیمات جن کے متعلق اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِي فرمایا گیا؟ کیا یہی ہیں وہ اخلاقِ حسنہ جن کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرورِ کون و

مکان صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحبِ خلقِ عظیم بنا کر مبعوث فرمایا تھا؟ ہاں افسوس! اپنے

ہاتھوں اپنے دین کی بیخ کنی۔ شاہین بچوں کو خاک بازی سکھانا اور عنادِ دل کو زاغ و بوم بنانا

کس کا غمزہ خوریز ہے؟ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

غیر مقلدین کی الہام بازی سید احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے تو

الہامات کے ڈھیر لگائے ہی تھے اور وحی و عصمت کے

لے نور الحسن خاں: عرف المجادی، ج ۲، ص ۲۰

لے ایضاً: ص ۲۰

دعوتے کرتے ہوئے مہذب کے دعوے تک ہی پہنچے تھے کہ یہ قند ہمیشہ کے لیے بالاکوٹ میں دفن ہو کر رہ گیا۔ پٹھانوں کے خنجر نے مسلمانوں کی بروقت دستگیری کی اور برٹش گورنمنٹ کے ایسے خود کاشتہ پودے بیج و بون سے اکھاڑ کر پھینک دیے گئے۔ جو بات سید احمد صاحب شروع ہو کر مرزا غلام احمد قادیانی کے یا انھوں پوری ہونی اسی کی درمیانی کڑیاں مولوی محمد فاضل خان تو ہی باقی مدرسہ دیوبند اور مولوی عبداللہ غزنوی غیر مقلد وغیرہ بھی ہیں۔ جب نبوت کا دعویٰ کرنے کی غزنوی مولوی صاحب تیاریاں کر رہے تھے تو ان کی جانب سے شب و روز الہامات کی بارش برسانی جا رہی تھی کہ مسلمان ان کی روحانیت اور مقام و منصب کے قائل ہو کر معتقد بن جائیں، تاکہ بوقت دعویٰ کچھ تو امانتاً و صدقاً کہنے والے مل جائیں۔ اب الہامات سنئے:

(۱)

جب میں الہام کو سمجھتا تھا اور توحید سے بخوبی واقف نہ تھا، ایک بار اپنے دادا محمد شریف کی قبر کے پاس جو اُس دیار میں مرجع اور مقبول نام ہے، گیا تو العار ہوا: لَا إِلَهَ غَيْرُكَ، لیکن اُس وقت میں نے غلطی کی اور میں نے خیالی کیا کہ یہ ورد مجھ کو وظیفہ کرنے کے لیے سکھایا گیا ہے۔ اب میں نے جان لیا کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام تھا کہ میرے سوا دوسروں کی طرف رجوع کرنا عبث اور استعانت میں شرک ہے۔ اکیلے اللہ کی طرف پوری توجہ چاہیے۔ قبروں پر اس نیت سے جانا کہ میرا قائلان مطلب حاصل ہو جائے توحید میں رخنہ ڈالنا ہے اور کلمہ شہادت یعنی اشہد ان لا اله الا الله محمد رسول الله کے معنی کے مخالف ہے۔

(۲)

بارگاہِ محمد کو الہام ہوا ہے: یا عبیدی هذا کتابی وهذا عبادی فاقرو کتابی علی عبادی۔ یعنی اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں، پس پڑھو میری کتاب میرے بندوں پر۔ اور یہ بھی الہام ہوتا ہے: ولئن اتبعتم اہواءہم بعد الذی جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر۔

۱۵ ص: ایضاً

۲ ص: سوانح مولیٰ عبداللہ غزنوی

سکندر پور کے باشندے ہیں، جو ہزارہ کے علاقے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فجر کی نماز کے بعد یہ القاء ہوا: ولا ترضوا لى الذین ظلموا فتمسکم النار۔ اور ظالم کی تعریف ان لفظوں سے معلوم کرائی: والظالمون هم الذین یغالفون عن امر ربهم شر لا یتوبون۔ یعنی ظالم وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادوں کی مخالفت کرنے میں اور باز نہیں آتے۔ اور جن لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے ان کو اس مضمون کے ساتھ آگاہ کیا: واصبر نفسك مع الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهہ۔ اور فرماتے تھے کہ الہام ہوا: فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ۔ یعنی جو کچھ الہام ہوتا ہے اُس کے لفظ یا درکھ اور اُس کا بیان کرنا اور تفسیر ہمارا ذمہ ہے اور فرماتے تھے الہام ہوا: واما من خاف مقام ربہ (الایة) یعنی وہ شخص کہ ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے۔ اور یہ الہام ہوا کہ ہمیشہ بدل خود مطالعہ کر رہے باش مبارکہ کہ دور تے از ما سوا بنشینید۔ یعنی ہمیشہ اپنے دل میں جھانکتے رہو، ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کہ دورت بیٹھ جاوے۔

اور شہر دہلی میں یہ الہام ہوا: ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ انرا واجامنہم ینہرة الحیوة الدنیا۔ اور مت پھیلا اپنی آنکھیں طرف ان کی کہ فائدہ دیا ہم نے ساتھ اُس کے بھانت بھانت لوگوں کو زندگانی دنیا کی تازگی سے۔ اور باش سکندر یہ میں یہ الہام ہوا: قل لا تراوا جک واولادک واتباعک قوموا للہ قانتین یعنی کہ دست اپنی پیلوں اور اولاد اور تابعداروں کو کہ کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے تابعدار ہو کر اور اس کے اخیر میں یہ الہام ہوا: انا جیبک وانیسک فلا تحزن۔ یعنی میں تیرا مددگار ہوں، تو غم نہ کھا اور یہ بھی الہام ہوا: ما اودعت فی قلبک فان مرویا المؤمن جزء من ستة اربعین جزءا من النسبة۔ یعنی جو تیرا اور تفکر قرآن کا تیرے دل میں ہم نے ڈال دیا ہے اُس کو مت بھول کیونکہ مومن کا خواب ایک حصہ ہے نبوت کے چھالیس حصوں میں سے۔

اور فرماتے تھے دہلی میں یہ الہام ہوا: ولا تطعم من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا



واتبع هواہ وکان امرہ فرطاً۔ اور فرمانبرداری نہ کر اُس شخص کی جو غافل کیا یہ نے اُس کے دل کو اپنی یاد سے اور پیچھے پڑا اپنی خواہش کے اور بے کام اُس کا حد سے بڑھا ہوا۔ یعنی غافلوں کی غفلت میں پیروی نہ کر۔ اور یہ بھی القاء ہوا: کن فی الناس کا حد من الناس۔ یعنی ہوتو لوگوں میں جیسے دوسرے لوگ ہیں۔ اور القاء ہوا: اگر وقت غفلت شد تدارک اُن وقت دیگر لازم است یعنی کسی وقت غفلت ہو جاوے تو دوسرے وقت میں اُس کا تدارک لازم ہے۔ لے

— (۴) —

فرماتے تھے، تین بار الہام ہوا: واللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً۔ اور واسطے اللہ کے ہے اوپر لوگوں کے حج کرنا بیت اللہ کا جو طاقت رکھے طرف اُس کی راہ کی۔ اور فرماتے تھے، الہام ہوا: ولسوف یعطیک ربک فترضنی۔ یعنی اور البتہ جلدی دے گا نچھ کو رب تیرا پھر تو خوش ہو جاوے گا۔ اور فرماتے تھے، الہام ہوا: الم نشرح لك صدرك۔ یعنی کیا نہیں کھولا ہم نے سینہ تیرا؟۔ لے

— (۵) —

جنگل کی کسی غار میں اکیلے جا کر چھپ : گئے اور کچھ مدت پوشیدہ رہے۔ اُن دنوں میں یہ الہام ہوا، فقط دابر القوم الذین ظلموا فالحمد لله رب العلمین۔

— (۶) —

مولوی عبدالرحمن بن شیخ محمد بارک اللہ (لکھوی) کہ وقت کے عالموں سے مشہور عالم ہیں اور زہد اور تقویٰ اور صلاحیت میں اپنے زمانے کے امام، آپ (مولوی عبداللہ غزنوی) کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے ملک غزنی تک، جو دو ماہ کی مسافت ہے گئے، راستے میں جو انھوں نے مخالفوں سے کچھ کلمات آنجناب

۱۔ عبد الجبار غزنوی، ص ۱۰۰۔ ۲۔ محمد بن عبد اللہ غزنوی، ص ۳۵۔ ۳۔ لے ایضاً، ص ۲۶

غزولوی صاحب کی نسبت نے تو حیران ہوئے۔ اسی رات اُن کو یہ الہام ہوا: فوراً ب السماء  
والارض انه لحق مثل ما انکم تنطقون۔ دوسری بار یہ الہام ہوا: وانہ لمن المرسلین  
الاجبار۔ تیسری بار یہ الہام ہوا: ان هو الا عبدنا علیہ! لہ

قارئین کرام! یہ ہم نے غیر مقلدوں کے مولوی عبداللہ غزولوی کے چھ عنوانات کے تحت صرف  
بائیس الہام پیش کیے ہیں جن میں سے تین الہام مولوی عبدالرحمن لکھوی کے بھی ہیں۔ مسلمانوں کو  
گمراہ کرنے اور اُن کے دین و ایمان پر دن دھاڑے ڈاکے ڈالنے کی خاطر جو یہ پُر اسرار جال بچھایا تھا  
اُس کا شیطانی ہونا خود واضح ہے جس کے لیے کسی خارجی دلیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ اللہ جل مجدہ  
پر اہتمام کے ساتھ افتراء پر دازی، کلام الہی کے ساتھ قدم قدم پر مذاق، نبی آخر الزماں صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وسلم سے برابری کہ ولسوف یُعطیک ربک فترضی اور اَللّٰہُ لَشَرِّحَ لَکَ صَدْرَکَ  
کو اپنے اوپر چسپاں کرنا۔ حالانکہ پوری کائنات ارضی و سماوی میں ایسی ذات صرف خسر و دو عالم  
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جس کی رضا پروردگار عالم کو مطلوب ہے ورنہ اور سب رضائے الہی  
کے طالب ہیں۔ یہ کس درجہ ستم ظریفی ہے کہ سرور کون و مکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مد مقابل  
کسی مولوی مٹلاں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دین و ایمان سے اس درجہ  
بغاوت کرنے والے حضرات کو بزرگ اور صاحب کشف و کرامت تسلیم کر کے بزرگ منوانے  
کی مہم چلائی جاتی ہے۔

غیر مقلد حضرات کی قرآن و حدیث میں تحریفیات، ائمہ دین پر بہتانات اور سہل پسندی  
کے تحت مسائل کی خانہ ساز ایجادات کے بارے میں مشعلِ راہ جلد دوم کا انتظار فرمائیے۔  
وہاں بفضلہ تعالیٰ مبرہن کر دکھایا ہے کہ مجدد مائتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ  
نصران حضرات کی تخریب کاری کا کس طرح محاسبہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی  
کر دکھایا تھا۔ تفصیل سے بچنے کی خاطر ہم نے یہاں اُن مسائل کا ذکر نہیں کیا جو غیر مقلدین  
حضرات نے شریعت سازی کے تحت اخلاقی بنا کر رکھ دیے ہیں۔ ہاں مشعلِ راہ  
جلد دوم میں ایسے بعض مسائل کا تفصیلی ذکر آئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بات مولوی عبداللہ غزولوی  
لے عبدالجبار، سوانحی عبداللہ غزولوی، ص ۹

نے الہامات کی ہود ہی تھی ذرا موصوف کے سوا نوح نگار مولوی عبدالجبار غزنوی کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔  
 جو الہام اور خواہیں آپ کو کتاب دست پر نہایت رہنے اور خلق اللہ کو  
 کتاب دست کی طرف بلانے اور تقویٰ اور نیک اور صبر اور خشیت اور زہد و  
 قناعت و ترک ماسوی اللہ اور انابت اور آپ کے مقام امانت میں پہنچنے اور  
 آپ کی حفظ اور نصرت اور مغفرت کے وعدہ پر جوئے ہیں۔ وہ سیکڑوں بلکہ  
 ہزاروں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے جمع کے لیے ایک بڑی کتاب چاہیے۔  
 یہ صرف ایک مولوی صاحب کی بات ہے۔ اسے صرف نمونہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر ہم دوسرے  
 غیر مقلد مولویوں کے الہامات اور کشف و کرامت پر مبنی بیانات لکھنے شروع کریں تو یقیناً  
 ہمیں بھی یہی کہنا پڑے گا کہ انھیں بیان کرنے کے لیے علیحدہ ایک بڑی سی کتاب چاہیے۔  
 بہر حال ماقول و کافی خیر متاکثر والہی۔ اللہ تعالیٰ امانتے زمانہ کو سچی ہدایت  
 نصیب فرماتے۔ آمین

### ۳۔ دیوبندی جماعت کی تخریب کاری

جب وہابیہ کی اولین جماعت، جس نے محمدی گروہ سے اہل حدیث تک کے اپنے  
 اوپر لیبیل لگاتے وہ مسلمانوں میں ذرا بھی مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور برٹش گورنمنٹ کا خواب  
 افراق بین المسلمین شرمندہ تعبیر ہونے سے مجبور ہو کر وہ گیا تو حکومت نے کتاب وہابیت کا  
 دوسرا ایڈیشن شایع کیا، جو آج دیوبندیت کے نام سے متعارف اور اہل حق کے لیے  
 مکمل درد سر کا باعث ہو کر رہ گیا ہے۔

غیر مقلد حضرات چونکہ اپنے بعض مخصوص افعال یعنی آمین بالجہر، سینے پر ہاتھ باندھ کر  
 نماز پڑھنا، رفع یدین کرنا اور آٹھ تراویح ایک وتر وغیرہ کے باعث پہچان لیے جاتے تھے  
 اور ایک جاہل مسلمان بھی ان کے پھندے میں نہیں پھنستا تھا۔ نہ مسلمانوں نے اس

سے عبدالجبار، مولوی، سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۲۰

نام کی کوئی جماعت دیکھی یا سنی تھی اور نہ یہ افعال اس طرح اُن کے مشاہدے یا علم میں آئے تھے اس لیے وہ چند سر پھرے بتدعین کی کوئی بات سُننا گوارا ہی نہیں کرتے تھے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کی خاطر وہابیوں کی دوسری جماعت ایسی تیار کی جو پُر اسرار طریقے پر وہابیت کی نشر و اشاعت کرے۔ دیوبندی حضرات نے منافقت اور عیاری کی انتہا کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ یہ حضرات دعویٰ سنی حنفی ہونے کا کرتے ہیں، پیری مریدی تک کا ڈھونگ رچاتے ہیں لیکن کام سارا وہابیت کا کرتے ہیں۔ یہ خوشنما لیل محض اس غرض سے لگاتے ہیں کہ مسلمانان اہلسنت و جماعت انھیں وہابی شمار نہ کریں بلکہ سنی حنفی جان کر برضا و رغبت ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں۔ جال بھی ان حضرات کے پاس ایسے خوشنما ہیں جو تالیفِ قلوب کے ساز و سامان سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اب ان حضرات کی چند خصوصیات پیش کی جاتی ہیں، وباللہ التوفیق۔

**اسمعیل پرستی** یہ جماعت بھی اہل حدیث اور دیگر وہابی حضرات کی طرح مولوی محمد اسمعیل دہلوی کو منصبِ الوہیت پر فائز کیے ہوئے ہے، جو قرآن کریم کی اصطلاح میں اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ بنا نا کہلاتا ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب میں تبدیلی کر لیں گے لیکن مولوی اسمعیل دہلوی کی کسی گندی سے گندی بات کو غلط تسلیم کر لیں، یہ ان حضرات سے بہت بعید ہے۔ مغلّان حضرات کے نزدیک دین کا اولین ماخذ رسوائے زمانہ تصنیف یعنی تقویۃ الایمان ہے۔ اس کتاب کے پیش کردہ غیر اسلامی عقاید، غلط مسائل اور مقربین بارگاہِ الہیہ کی شان میں جاری کیے ہوئے یہودہ کلمات و مغالطات کو غلط مان لینا دیگر وہابیہ کی طرح ان حضرات کے بس سے باہر ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تقویۃ الایمان کو پرکھنے کی ہرگز اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ہاں تقویۃ الایمانی مندرجات کی صحت ثابت کرنے کی غرض سے آیات و احادیث کو کھینچ تان کر اس کی تائید و حمایت میں پیش کرنے کی جسارت ضرور کرتے رہتے ہیں۔

تقویۃ الایمان کو اسلام کا پتھر ثابت کرنے کی خاطر آیات و احادیث میں معنوی تخریفات کرنا دیوبندیوں کے نزدیک قطعاً مجرم نہیں، گناہ نہیں، ہاں اس بات کو ضرور اپنے ساختہ دین و

مذہب سے بغاوت سمجھتے ہیں کہ تقویۃ الایمان کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر رکھا جائے اور آیات و احادیث کو ماخذ بنا کر تقویۃ الایمان کی غلط باتوں کو غلط کہا جائے۔ چنانچہ اس پر ہم اسی باب میں مکمل بحث کر چکے ہیں۔ اب دیوبندی حضرات کے بانی مبانی مولوی رشید احمد گنگوہی آنجنابی کا امام الوہابیہ اور تقویۃ الایمان کے بارے میں نقطہ نظر ملاحظہ ہو:

(۱)

سوال: وہابی کون لوگ ہیں اور عبد الوہاب نجدی کا کیا عقیدہ تھا اور کون مذہب تھا اور وہ کیا شخص تھا اور اہل نجد کے عقاید میں اور سنی حنفیوں کے عقاید میں کیا فرق ہے؟  
(مرسدہ مولوی شیخ محمد صاحب از ضلع فیروز پور پنجاب۔ ۱۳۱ھ)

جواب: محمد بن عبد الوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں۔ ان کے عقاید عمدہ تھے اور مذہب ان کا حنبلی تھا۔ البتہ ان کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں۔ مگر ماں جو حد سے بڑھ گئے ان میں فساد آ گیا ہے اور عقاید سب کے متحد ہیں، اعمال میں فرق حنفی شافعی مالکی حنبلی کا ہے۔ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

(۲)

سوال: وہابی مذہب یہ کون فرقہ ہے؟ مزدود ہے یا مقبول اور عقاید ان کے مذہب والوں کے مطابق اہلسنت و الجماعت ہیں یا مخالف؟ کسی امام کی تقلید کرتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اس وقت اور ان اطراف میں وہابی قبیح سنت کو دیندار کو کہتے ہیں اور باقی بندہ آپ کا دعا گو ہے۔ سب امور کے لیے دست بردار ہے۔ فقط والسلام

(۳)

سوال: کتاب تقویۃ الایمان کا حال دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسی کتاب ہے

شہ رشید احمد گنگوہی، مولوی، فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب، مطبع سعیدی کراچی، ص ۲۳۵  
کے ایضاً، ص ۹۶

اُس کو اچھا سمجھنا اور اُس کا درس کرنا اور اس پر عمل کرنا کیسا ہے اور مولانا محمد اسحاق صاحب کو بُرا سمجھنا اور اُن کو کافر و مردود بتانا اور حقیر سمجھنا کیسا ہے؟ مولوی صاحب اگر کسی ماں باپ نماز جماعت و عظ سننے کو منع کریں تو اُس کو چھوڑ دے یا اُن کے کہنے کو روک دے؛ مولوی صاحب اچھے عاجز کے واسطے دعا کیجیے۔ مجھ کو تعلیم فرمائیے جس کے ورد سے و سوا اس ہونا دور ہوں اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہو اور عشق حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصیب ہو۔ آپ سے اللہ واسطے عرض کرتا ہوں۔  
فقط والسلام۔ (مرسلہ و ماج احمد مراد آبادی)

جواب: کتاب تقویۃ الایمان نہایت عمدہ اور سچی کتاب اور موجب قوت و اصلاح ایمان کی ہے اور قرآن و حدیث کا مطلب پورا اس میں ہے۔ اس کا مولف ایک مقبول بندہ تھا اور مولانا محمد اسحاق دہلوی دلی کامل محدث فقیہ عمدہ مقبولین حق تعالیٰ کے تھے۔ جو کوئی ان دونوں کو کافر یا بد جانتا ہے وہ خود شیطان ملعون حق تعالیٰ کا ہے۔ فقط، اور اگر کسی کا باپ یا والدہ نماز جماعت سے منع کرے یا عظ سننے سے کسی عالم مقبول متدین کا منع کرے تو قول والدین کا ہرگز نہ مانے بلکہ ان کاموں کو کرتا رہے اور دفع و سوسہ شیطانی کے واسطے لاحول اور استغفار پڑھا کر۔  
فقط والسلام۔ رشید احمد عفی عنہ

(۴)

سوال: کیا فرماتے ہیں فقہاء و محدثین اس باب میں کہ جناب مولوی محمد اسماعیل صاحب مرحوم جو سیراہ جناب سید احمد صاحب علیہ الرحمۃ کے شہید ہوئے تھے، اُن کو مردود کہنا اور بے ایمان کافر کہنا درست ہے یا نہیں اور اگر نا درست ہے تو مردود اور بے ایمان کہنے والے کا کیا حکم ہے اور تقویۃ الایمان جو ایک کتاب تصنیف مولانا مرحوم کی ہے اُس کا مطالعہ کرنا اور پڑھنا اچھا ہے یا بُرا؟ (مرسلہ مرزا حفیظ اللہ بیگ مرحوم مراد آبادی)

جواب: مولوی محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم متقی اور پدعت کے اکھاڑنے والے اور سنت کے جاری کرنے والے اور قرآن و حدیث پر پورا عمل کرنے والے اور خلق اللہ

لے رشید احمد گلگوبی، مولوی: فتاویٰ رشیدیہ محبوب، ص ۲۰، ۲۱

کو ہدایت کرنے والے تھے اور تمام عمر اسی حالت میں رہے آخر کار فی سبیل اللہ جہاد میں کفار کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ پس جس کا ظاہر حال ایسا ہو وہ ولی اللہ اور شہید ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ان اولیاء الا المتقون اور کتاب تقویۃ الایمان نہایت عمدہ کتاب ہے اور درہ شرک بدعت میں لا جواب ہے۔ استدلال اس کے بالکل کتاب اللہ اور احادیث سے ہیں۔ اُس کا دکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام ہے اور موجب اجر کا ہے۔ اس کے رکھنے کو جو بڑا کتاب ہے وہ فاسق یا بدعتی ہے۔ اگر اپنے جہل سے کوئی اس کتاب کی خوبی نہ سمجھے تو اس کا تصور نام ہے کتاب اور ٹولٹ کتاب کی کیا تقصیر؛ بڑے بڑے عالم اہل حق اس کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی گمراہ نے اُس کو بڑا کہا تو وہ خود ضال و مضل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الراجی فقہ ربیر رشید احمد گلگویی معنی عنہ

(۵)

جواب: بندہ کے نزدیک سب مسائل اُس (تقویۃ الایمان) کے صحیح ہیں اگرچہ بعض مسائل میں بظاہر تشدد ہے اور تو بڑا کرنا ان کا بعض مسائل سے محض افتراء اہل بدعت کا ہے اور اگر اہل کو بزرگ نہ جانے، جو ٹے حالات ان کے سن کر، تو معذرت ہے اور اگر کتاب کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے تو وہ بتدریج فاسق ہے اور وہ فرماتے تھے کہ جب تک حدیث صحیحہ غیر منسوخ ہے، اُس پر عامل ہوں ورنہ ابوحنیفہ کی رائے کا مقلد ہوں اور سید صاحب کا بھی یہی مشرب تھا اور محمد بن عبد الوہاب کے عقاید کا مجھ کو مفصل حال معلوم نہیں اور نہ خلفا و سید صاحب کا۔ اور مولوی اسماعیل صاحب و عطا درتو بدعت میں معروف رہے پھر جہاد میں جا کر شہید ہو گئے۔

سلسلہ بیعت کا کہاں جاری کرتے اور تمام تلوخ الایمان پر عمل کر سے۔ فقط

رشید احمد گلگویی معنی عنہ

مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان کے بارے میں دیوبندی جماعت کے

مذہب رشید احمد گلگویی، مولوی، فتاویٰ رشیدیہ محبوب، ص ۱۴

مذہب ایضاً، ص ۴۴

سرخیل و سنگ بنیاد رکھنے والے مولوی رشید احمد گنگوہی کے خیالات فتاویٰ رشیدیہ سے بغیر کسی تنقید و تبصرہ کے پیش کر دیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے دیگر اکابر دیوبند کے اس بارے میں خیالات پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ لہذا ان پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

یہ خبیث عقیدہ جو کبھی مولوی محمد اسلمیل دہلوی نے گھڑا اور اپنے رسالہ **امکانِ کذب** یکروزہ کے ذریعے مشہور کیا تھا اور جو پوری شریعت مطہرہ کو باطل ٹھہرانے کے لیے کافی ہے، ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بلاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا۔ غیر متعلقہ حضرات نے اس باطل نظریہ سے دامن چھڑانے کی کوشش کی اور اپنی تصانیف میں اس کی جانب سے خاموشی برتی۔ اٹھاون سال بعد مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے اس مُردے کو دوبارہ زندہ کیا اور ہزار روڈ تردید کے باوجود جیتے جی اسے مرنے نہ دیا۔ شاید مولوی محمود حسن دیوبندی کے اس شعر سے

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا

اس مسیحائی کو دکھیں ذریٰ ابنِ مریم

کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ م ۱۳۰ء میں براہین قاطعہ کے اندر دوبارہ یہ مسئلہ چیل قدمی کرتا ہوا نظر آیا، جسے شاگرد مولوی خلیل احمد ابٹھوی کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس میں لکھا ہے:

امکانِ کذب کا مسئلہ تو اب جدید کسی نے نہیں نکالا بلکہ قدام میں اختلاف ہوا،

کہ خلف و عید آیا جا لڑا ہے کہ نہیں لڑا

اگلے صفحے پر موصوف نے اسی بات کو یوں ڈھرایا ہے:

امکانِ کذب کہ خلف و عید کی فرما ہے جو قدام میں مختلف قیہ ہو چکا ہے

مشعلِ براہ کی جلد دوم میں انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلے پر مفصل بحث ہوگی، اس لیے

ہم یہاں کسی قسم کی تنقید و تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ وہاں واضح کیا جائے گا کہ دیوبندی

ذیل خلیل احمد ابٹھوی، مولوی، براہین قاطعہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۶

۱۰۰ ایضاً: ص ۱۰۰



حضرات وقوع کذب تک کے قائل ہیں۔

سید احمد صاحب دعویٰ نبوت کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن مہدیت کے انکار ختم نبوت دعویٰ تک ہی پہنچے تھے کہ پٹھانوں کے خجروں نے بنا بنا یا کھیل بگاڑ دیا۔

ان کے بعد دارالعلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کو تیار کیا گیا۔ موصوف نے تحذیر الناس کتاب مکہ کے عقیدہ ختم نبوت پر پیشہ زنی کی اور خاتمیت مرتبی کے نام سے تقریباً تیرہ صدیوں کے بعد ایک خاتمیت گھڑی جس کے سننے سے مسلمانوں کے کان نا آشنا ہے تھے

یہ تھا دعویٰ نبوت کے لیے چرور و واہ تیار کرنا، لیکن عمر نے وفات کی اور کتاب کے منظر عام پر آنے کے چند سال بعد راہی ملک عدم ہو گئے اور موصوف کا کھولا ہوا دروازہ مرزا غلام احمد قادیانی کے کام آیا۔ اب ملاحظہ ہو کہ نانوتوی صاحب نے اُس عقیدہ ختم نبوت کو، جس کی تشریح خود

نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لَا نَبِيَّ بَعْدِي کے لفظوں میں فرمائی تھی، اسی خاتمیت کو موصوف نے بے وقوفوں کا خیال اور خلافت قرآن بتایا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

”عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء

کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہو گا کہ

تقدم یا تاخر زمانے میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ پھر مقام مدح میں و لکن

رسول اللہ وخاتم النبیین فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

ہاں اگر اس وصف کو اوصاف مدح میں سے نہ کہے اور اس مقام کو

مقام مدح نہ قرار دیکھے تو البتہ خاتمیت باعتبار تاخر زمانی صحیح ہو سکتی ہے، مگر میں

جانتا ہوں کہ اہل اسلام میں سے کسی کو یہ بات گوارا نہ ہوگی کہ اس میں ایک تو

خدا کی جانب تہود با اللہ زیادہ گوئی کا وہم ہے۔ آخر اس وصف میں اور قدومیت

و شکل و رنگ و حسب و نسب و سکونت وغیر اوصاف میں جن کو نبوت یا اور

فضائل میں کچھ دخل نہیں، کیا فرق ہے، جو اس کو ذکر کیا اوروں کو ذکر نہ کیا،

دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نقصان قدر کا احتمال، کیونکہ اہل کمال

کے کمالات ذکر کیا کرتے ہیں اور ایسے ویسے لوگوں کے اس قسم کے احوال

بیان کیا کرتے ہیں۔ اعتبار نہ ہو تو تاریخوں کو دیکھ لیجیے۔ باقی یہ احتمال یہودین آخری  
 دین تھا، اس لیے سید باب اتباع مدعیان نبوت کیا ہے جو کل جھوٹے دعویٰ کر کے  
 خلیق کو گمراہ کریں گے، البتہ فی حد ذاتہ قابل لحاظ ہے پر جملہ ماکان محمد ابا  
 احد من رجالکھ اور جملہ ولكن ترسل اللہ وخاتم النبیین میں کیا  
 تناسب تھا جو ایک کو دوسرے پر عطف کیا اور ایک مستدرک منہ اور دوسرے کو  
 استدرک قرار دیا اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی بے ربطی اور بے ارتباطی خدا کے کلام  
 معجز نظام میں متصور نہیں۔ اگر سید باب مذکورہ منقول تھا تو اس کے لیے اور بیسیوں  
 موقع تھے ۱۰

اب اس سے آگے موصوف یوں اپنے انہار مدعا کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں:  
 "تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موصوف بالعرض کا قصہ موصوف بالذات پر  
 ختم ہو جاتا ہے" ۱۱

اسی بات کو نانو تووی صاحب نے ذرا یوں کھل کر بیان کر دیا ہے:  
 "آپ موصوف بوصف نبوت بالذات ہیں اور سوا آپ کے اور نبی موصوف بوصف  
 نبوت بالعرض۔ اوروں کی نبوت آپ کا فیض ہے پر آپ کی نبوت کسی اور کا فیض  
 نہیں۔ آپ پر سلسلہ نبوت ختم ہو جاتا ہے" ۱۲

اب اس بات کو بالذات وبالعرض سے علیحدہ ہو کر خاتمیت مرتبی و خاتمیت زمانی کی اصطلاحوں  
 میں دیکھیے اور نانو تووی صاحب کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ موصوف نے لکھا ہے:  
 "ہاں اگر بطور اطلاق یا عموم مجاز اس خاتمیت کو زمانی اور مرتبی سے عام لے لیجئے  
 تو پھر دونوں طرح کا ختم مراد ہوگا پر ایک مراد ہو تو شایان شان محمدی صلعم خاتمیت  
 مرتبی ہے نہ زمانی" ۱۳

۱۰ لے محمد قاسم نانو تووی، مولوی، تحذیر الناس، مطبوعہ لاہور، ص ۳۰ لے ایضاً، ص ۴

۱۱ لے ایضاً، ص ۹

۱۲ لے ایضاً، ص ۴

اور موصوف کی زبانی ان کی گھڑی ہوئی خاتمیت مرتبی کا فائدہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے لکھا ہے:

”فرض اختتام اگر بایں معنی تجویز کیا جاتے جو میں نے عرض کیا تو آپ کا خاتم ہونا انبیاء گزشتہ ہی کی نسبت خاص نہ ہوگا بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔“

خاتمیت مرتبی کا نانو تووی صاحب نے دوسرا فائدہ یہ بتایا ہے:

”ہاں اگر خاتمیت بمعنی اتصاف ذاتی بوصف نبوت لیجیے جیسا کہ اس پیچیدہ ان نے عرض کیا ہے تو پھر سوا رسول اللہ صلعم اور کسی کو افراد مقصود بالخلق میں سے مماثل نبوی صلعم نہیں کہہ سکتے بلکہ اس صورت میں فقط انبیاء کی افراد خارجی ہی پر آپ کی افضلیت ثابت نہ ہوگی افراد مقدرہ پر بھی آپ کی افضلیت ثابت ہو جائے گی۔ بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا، چہ جائیکہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجیے اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔“

اگر کوئی کہے کہ اللہ و رسول نے تو خاتمیت سے مراد خاتمیت زمانی بتائی تھی، امت محمدیہ نے یہی سمجھی اور آسنے والوں کو تیرہ سو سال تک سچائی تھی۔ نانو تووی صاحب! آپ اس خاتمیت زمانی کا تو انکار بلکہ بیخ کنی کر رہے ہیں اور اس کی جگہ ایک خانہ ساز خاتمیت پیش کر رہے ہیں، جس کو خاتمیت مرتبی کا نام دیا ہے۔ کیا یہ بزرگوں کی توہین نہیں کہ انہیں ایسے ضروری عقیدہ سے جاہل ٹھہرایا جا رہا ہے ورنہ بصورت دیگر آپ دین میں ایک نیا عقیدہ پوری امت محمدیہ کے خلاف داخل کر کے داخلہ فی الدین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں نانو تووی صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

”باقی رہی یہ بات کہ بڑوں کی تاویل کو نہ مانیں تو ان کی تحقیر نعوذ باللہ لازم آئیگی،

۱۵ محمد قاسم نانو تووی، مولوی: تحذیر الناس، ص ۱۵

۱۶ ایضاً، ص ۳۲

یہ انہیں لوگوں کے خیال میں آسکتی ہے جو بڑوں کی بات فقط ازراہ بے ادبی نہیں  
 مانا کرتے۔ ایسے لوگ اگر ایسا سمجھیں تو بجا ہے۔ المرء یقیس علیٰ نفسہ۔  
 اپنا یہ دیکھ نہیں۔ نقصانِ شان اور چیز ہے اور خطا و نسیان اور چیز۔ اگر بوجہ  
 کم التفاتی بڑوں کا فہم کسی مضمون تک نہ پہنچا تو ان کی شان میں کیا نقصان آگیا؟  
 اور کسی طفلِ نادان نے کوئی ٹھکانے کی بات کہہ دی تو کیا اتنی بات سے وہ عظیم الشان  
 ہو گیا؟

گاہ باشد کہ کودکِ نادان

بغلط برہنت زند تیرے لے

ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ بانی دارالعلوم دیوبند ہی نے عقیدہ ختم نبوت پریشہ زنی کی لیکن  
 دیوبندی حضرات کے نزدیک اس سے نا تو تو ہی صاحب کی بزرگی میں بال برابر فرق نہ آیا۔ اس  
 کرتوت پر پردہ ڈالنے بلکہ بے خبر مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کی خاطر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ  
 میں علمائے دیوبند شروع ہی سے علمائے اہلسنت سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے  
 ہیں، حالانکہ حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا جائے تو صاف نظر آنے لگے کہ:

قائدِ مرزا انہیں کا صاحبِ تہذیب ہے

مولوی خلیل احمد انبٹھوی نے اپنی

تنقیص رسالت کی ناقابلِ فہم جہارت

رسوائے زمانہ کتاب براہین قاطعہ میں  
 مخرد عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیط زمین کے حصولِ علم سے انکار کرتے ہوئے صاف  
 لکھ دیا:

”الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیط زمین کا  
 فخر عالم کو خلاف نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاس فاسدہ سے ثابت کرنا  
 شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت

نص سے ثابت ہوئی۔ فخر عالم کی وسعت علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ تمام  
نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے؟

انبصوی صاحب نے جب علم محیط زمین مخلوق میں سے شیطان و ملک الموت کے لیے  
تسلیم کر لیا اور وہ بھی نصوص سے، تو ثابت ہوا کہ یہ ایسا علم ہے جو مخلوق کو حاصل ہو سکتا ہے  
اور باری تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر مذکورہ عبارت کے بارے  
میں چند سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں:

۱۔ فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیط زمین کے علم کا حصول شرک ٹھہرانا جو  
خاصہ باری تعالیٰ بھی نہیں، ایسی جبارت کا باعث شان رسالت سے بغض و  
عداوت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۲۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وسعت علم پر تو قرآن و حدیث کی سیکڑوں نصوص  
شاہد ہیں مگر انبصوی صاحبان کو چھٹے ہیں کہ، کون سی نص قطعی ہے کہیں  
يَخْتَلُوا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ  
غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ وَالْاِمَاعِلَةُ بِي تُوْنِيْسِي هِي۔

۳۔ جب اس علم کا رسول فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے ثابت کرنا  
شرک ہے تو شیطان و ملک الموت کے لیے ثابت ماننا کیوں شرک نہ ہوا؟ کیا  
ان دونوں کو خدا کا شریک بنانا جائز ہے؟

۴۔ جس علم کا مخلوق کے لیے ایسے اثبات شرک ہے، وہ قرآن و حدیث نے شیطان و  
ملک الموت کے لیے ثابت کر کے خود شرک کی تعلیم دی یا نہیں؟

عداوت و محبت کا رنگ اپنی اپنی جگہ زالا ہوتا ہے۔ جس طرح محبت کبھی محبوب کی خرابی  
سامنے نہیں آنے دیتی اسی طرح عداوت خوبیوں کو نگاہوں سے اوجھل رکھتی ہے۔ گنگو بی و  
انبصوی صاحبان حقیقت میں سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت میں اتنے

لے خلیل احمد انبصوی، مولوی: براہین قاطعہ، ص ۵۵

پختہ کار ہو چکے تھے کہ اولین و آخرین کے علوم کی جامع ہستی کا علم ان صاحبان کو نہ شیطان کے برابر نظر آتا تھا، نہ ملک الموت کے برابر، بلکہ ایک امتی کے برابر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ موصوف کے اسی زہر آلود و ایمان سوز قلم نے یہ بھی لکھا ہوا ہے:

ان اولیاء کو حتی تعالیٰ نے کشف کر دیا کہ ان کو یہ حضورِ علم حاصل ہو گیا۔ اگر اپنے فخرِ عالم علیہ السلام کو بھی لاکھ گونہ اس سے زیادہ عطا فرما دے مگر ہے، مگر ثبوتِ فعلی اس کا کہ عطا کیا ہے، کس نص سے ہے کہ اس پر عقیدہ کیا جائے؟

جہلا عقل کی اس نارسائی، بخت کی تیرگی اور نورِ ایمان سے محرومی کا رونا کہاں تک رو دیا جائے کہ جس سرکار کے غلاموں کے لیے بذریعہ کشف اس علم کا حصول خود تسلیم کر لیا، اسی آقائے کائنات کے بارے میں امد اور باہر کی سب آنکھیں بند ہو گئیں، قلم کی روشنائی اور زبان کی قوت گویائی وہی غلاموں خادموں جیسا علم تسلیم کرنے سے جواب دے گئی اور اس پر عقیدہ قائم کرنے کے لیے ایک نص بھی نظر نہ آئی یا بینائی نے ساتھ نہ دیا بلکہ ثبوتِ فعلی کا انکار کر کے کائناتِ ارضی و سماوی کی اس سب سے بڑی پارگاہ کے عقیدت مندوں، خادموں اور غلاموں کے قلب و جگر پر خنجر چلا تے ہوئے اسے ایسا شرک کھ دیا جس میں ایمان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

وہی انسان ہے کہ دین کر ہے کس کی جگہ اچھی

بنغل میں ان کی ہم، پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

اردھر مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) سے ایک طویل سوال ہوا۔

جس کے آخر میں سائل نے لکھا ہے: زید کا یہ استدلال اور عقیدہ و عمل کیسا ہے؟ تھانوی صاحب نے جواب میں یہ بھی لکھا:

آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافتِ طلب

یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب؟ اگر بعض علوم غیبیہ

مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید دعوہ و بلکہ سب سے

و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے شخص سے مخفی ہے۔ تو چاہیے کہ سب کو عالم الغیب کہا جائے۔ مگر اگر زید اس کا التزام کر لے کہ ہاں میں سب کو عالم الغیب کہوں گا تو پھر علم غیب کی منہ کمالات نبویہ شمار کیوں کیا جاتا ہے۔ جس امر میں مومن بلکہ انسان کی بنی سویت نہ ہو وہ کمالات نبوت سے کب ہو سکتا ہے اور التزام نہ کیا جاوے تو نبی و غیر نبی میں وجہ فرق بیان کرنا ضرور ہے اور اگر تمام علوم غیبیہ مراد ہیں، اس طرح کہ اس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی و عقلی سے ثابت ہے۔

اس عبارت میں تھانوی صاحب نے علم غیب کی دو قسمیں کی ہیں (۱) بعض غیب (۲) کل غیب۔  
 موزا الذکر کے بارے میں موصوف نے صاف لکھ دیا کہ: "اگر تمام علوم غیبیہ مراد ہیں، اس طرح کہ اس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی و عقلی سے ثابت ہے۔" اب باقی رہ گئی پہلی قسم یعنی بعض غیب۔ اس کے بارے میں موصوف نے بغیر کسی ہیر پھیر کے صاف لکھ دیا کہ: "اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے؟ ایسا علم غیب تو زید و عمر و بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔" اس ناپاک عبارت میں تھانوی صاحب نے علی الاعلان کہہ دیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسا علم غیب تو زید و عمر و بلکہ بچوں، پاگلوں اور جانوروں کو بھی حاصل ہے۔ (تعود بامسمن ذالک)۔ موصوف سے اس عبارت کو بدلنے اور اسلامی بنانے یا میدان مناظرہ میں اگر اسلامی ثابت کر دکھانے کا ہمیشہ مطالبہ رہا لیکن وہ اپنے کفریہ الفاظ کو بدلنے پر عمر بھر تیار نہ ہوتے نہ تقریر و تحریر کے میدان میں اسے اسلامی ثابت کر سکے، نہ موصوف کا کوئی حمایتی اس کفریہ عبارت کو ہرگز اسلامی ثابت کر سکتا ہے کیونکہ اس میں کسی اسلامی و ایمانی پہلو کی تاویل کے لیے گنجائش ہی نہیں ہے۔ موجودہ دیوبندی حضرات کو اللہ تعالیٰ راہ ہدایت و چشم بصیرت عطا فرمائے۔ آمین

لے اشرف علی تھانوی، مولوی: حفظ الایمان، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۱۶

دیوبندیوں کی پیرپستی اہلسنت کو اپنے بزرگوں سے عقیدت ہے اور ہونی چاہیے۔  
یہ رشتہ ان کی ظاہری زندگی میں جس طرح قائم رہتا ہے بعد  
وصال بھی اُس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عقیدت مندوں کی جانب سے مزارات پر حاضری اور  
بزرگوں کی جانب سے نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک  
جاری رہے گا۔ بتدعین زمانہ کے نزدیک اظہار عقیدت کے جملہ طریقے شرک قرار پاتے ہیں اور اپنی  
اسی خانہ ساز منطق کے تحت وہابی حضرات کو مسلمانان اہلسنت و جماعت مشرک اور پیر پست نظر  
آتے ہیں، حالانکہ سنیوں کے نزدیک بزرگان دین نہ خدا ہیں نہ خدائی میں حصہ دار۔ ہاں وہ خدا کے  
بندے ہیں لیکن اُس کے تابع اور مقرب بارگاہ ہیں۔ اب ہم قارئین کو دکھاتے ہیں کہ اہلسنت  
و جماعت کو پیر پست بتانے والے دیوبندی حضرات خود اپنے پیروں کو کیا سمجھتے ہیں۔ مولوی رشید احمد  
گنگوہی کی وفات پر ان کے مرید خلیفہ مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء)  
نے مثنوی لکھا، جس کا ایک شعر ہے:

جنید و شبلی و ثمانی ابو مسعود انصاری  
رشید ملت و دین، غوث اعظم، قلب تباری

اس شعر میں مولوی محمود الحسن صاحب نے اپنے پیر مولوی رشید احمد گنگوہی کو غوث اعظم  
بھی بتایا ہے۔ مسلمان اگر حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غوث اعظم  
کہتے ہیں تو وہابی حضرات کے نزدیک یہ صریح مشرک قرار پاتا ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک  
صرف اللہ رب العزت ہی غوث اعظم ہے بلکہ دیوبندیوں کے مولوی غلام احمد خاں صاحب  
(راولپنڈی) تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے غوث اعظم لکھ کر آگے جل جلالہ بھی رقم فرماتے ہیں۔  
معلوم نہیں اب وہ اپنے گمراہ غوث اعظم کو جل جلالہ سے یاد کریں گے یا نہیں؟ اگلا مرتبہ ملاحظہ ہو:

وہ تھے صدیق اور فاروق پھر کیسے عجب کیا ہے  
شہادت نے تہجد میں قدمبوسی کی گر ٹھانی

۱۔ مولوی محمود الحسن، مولوی، مثنوی گنگوہی، ص ۴  
۲۔ ایضاً: ص ۱۱



یہاں سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی بڑھا کر دکھا دیا۔ اسی پر بس نہیں، آگے چلیے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کس منصب پر فائز تھے تو جواب دیا گیا ہے: ۱۰

میسائے زماں پہنچا فلک پر، چھوڑ کر سب کو  
چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہِ کنعانی

یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب میسائے زماں اور ماہِ کنعانی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کیا اعجاز میں عیسیٰ علیہ السلام کے ہی برابر تھے تو اسے جواب دیا جا رہا ہے: ۱۰

مردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا  
اس میسائی کو دیکھیں درمی ابنِ مریمؑ

یہاں بتا دیا کہ گنگوہی صاحب کا مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام سے اعجاز میں بڑھ کر ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صرف مردے ہی زندہ کر سکتے تھے لیکن گنگوہی صاحب مردوں کو زندہ کر دینے کے ساتھ ہی زندوں کو مرنے نہیں دیا کرتے تھے۔ اسی لیے کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اگر حقیقی میسائی دیکھنا چاہتے ہیں تو گنگوہی صاحب کی میسائی کو آ کر دیکھیں۔ جب گنگوہی صاحب کو عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ کر صاحبِ اعجاز بتا دیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کا مرتبہ کون سے نبی کے برابر تھا۔ اس کا یہ جواب دیا ہے: ۱۰

زباں پر اہلِ اہوا کی ہے کیوں اُعلیٰ و اُہلِ شاید  
اٹھا عالم سے کوئی بانیِ اسلام کا ثانیؑ

یعنی ہوا پرست لوگ جو بتوں کی باتیں کرنے لگ گئے ہیں تو شاید یہ اسی وجہ سے ہے کہ بانیِ اسلام یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہمارے گنگوہی صاحب دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ علاوہ بریں دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی رشید احمد گنگوہی بعض کمالات میں فخر و دو عالم،

۱۰ محمود الحسن، مولوی، مرثیہ گنگوہی، ص ۶

۱۰ ایضاً، ص ۲۲

۱۰ ایضاً، ص ۲

سید عرب و عجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی بڑھ کر تھے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے استمداد کرنا، حاجت روائی چاہنا دیوبندیوں کے نزدیک شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کو خدا کا شریک ٹھہرائینے میں ان کے نزدیک کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ ان کے قبلہ حاجات تھے۔ چنانچہ اپنے اس ایسی شرک کو یوں شیر مادر سمجھ کر بغیر ڈکار ہضم کیا ہوا ہے، اسے

حاجت دین و دنیا کے کہاں لے جائیں ہم یارب  
گیا وہ قبلہ حاجاتِ روحانی و جسمانیؑ

اس ستم ظریفی کی بجلا کوئی حد ہے کہ خدا سے ہی سوال کیا ہے کہ اب ہم اپنی دین و دنیا کی حاجتیں کس سے پوری کروایا کریں گے کیونکہ ہمارا قبلہ حاجاتِ جسمانی و روحانی بجلا گیا ہے؛ اب نہ انہیں مخلوق میں کوئی اور قبلہ حاجات نظر آتا ہے نہ خالق ہی سے ایسی توقع۔ لہذا اسی حیرانی میں چیخ پکار مچائی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کے نزدیک گنگوہی صاحب کو دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ،

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں  
عبید سوڈ کا ان کے لقب ہے یوسفِ ثانیؑ

یعنی کسی کو عبید النبی، عبد الرسول کہو تو دیوبندی حضرات کے نزدیک شرک ہو گیا۔ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عبید ہونا ان کے نزدیک یقینی شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کا عبید ہونا قطعاً شرک نہیں کیونکہ گنگوہی صاحب کے عبید سوڈ یعنی کالے عبید بھی یوسف علیہ السلام کی طرح حسین و جمیل تھے۔ تیسری خصوصیت جو دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب کو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے،

خدا ان کا مرتبی، وہ مرتبی تھے خلایق کے  
مرے مولی، مرے ہادی تھے بیشک شیخِ ربانیؑ

مسلمانوں کا تربیتی عقیدہ ہے کہ اللہ جل شانہ ہی خلاق کا مرتبی ہے یعنی رب العالمین اسی کی ذات ہے لیکن دیوبندی حضرات بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین نہیں ہے بلکہ صرف گنگوہی صاحب کا مرتبی ہے اور جناب گنگوہی صاحب باقی ساری کائنات کے مرتبی ہیں۔  
چوتھی خصوصیت یہ بتائی ہے :

پھر نئے کعبہ میں بھی پوچھتے گنگوہی کا راستہ  
جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوق و شوق عرفانی

یعنی دیوبندی حضرات کو کعبے میں پہنچ کر بھی کوئی سرور نہیں ملتا بلکہ وہاں ایسے رشتے ہیں جیسے جیل خانے میں قیدی اور وہاں سے گنگوہی جانے کا راستہ پوچھتے رہتے ہیں۔ اگر گنگوہی صاحب کو سرور کون دکھایا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متاثر نہ سمجھا گیا ہوتا تو گنگوہی کے بجائے مدینہ منورہ کا راستہ پوچھتے۔  
پانچویں خصوصیت یہ بتائی ہے :

چھپائے تمامہ فانوس کیونکر شمع روشن کو  
تھی اس نور مجسم کے کفن میں وہ ہی عسبانی

دیوبندی حضرات کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جہانی لحاظ سے ہرگز نور نہیں ہیں لیکن گنگوہی صاحب نور مجسم یعنی سراپا نور تھے، جن کی شعاعیں کفن سے باہر بھی نکل رہی تھیں۔ یہاں اگر ایک سید سے سادے مسلمان کی حیرت کا پیمانہ بھی چھلک اٹھتا ہے کہ جو باتیں مخدو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے یثبات ماننا ان حضرات کے نزدیک کفر و شرک ہیں وہی باتیں گنگوہی صاحب سے منسوب ہونے پر کس طرح عین ایمان ہو گئیں؟ مسلمانوں کی اس حیرانی کو دور کرنے کی خاطر دیوبندیوں کے مطیع الہد صاحب نے صاف لکھ دیا ہے  
تمہاری تربیت انور کو دے کر طور سے تشبیہ  
کہوں تمہوں بار بار آری مری دیکھی بھی نادانی

گنگوہی صاحب کی قبر کو طور سے، خود کو موسیٰ علیہ السلام سے اور گنگوہی صاحب کو رب العالمین سے تشبیہ دے کر شیخ الہند صاحب بار بار کہہ رہے ہیں سَبِّتِ اِدْرِيْ اَنْظُرْ لِيْكَ - یعنی اے میرے رب! تو مجھے اپنی ذات دکھانا کہ میں تیرا دیدار کروں۔ معلوم ہوا کہ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گنگوہی صاحب کو بایں وجہ فوقیت دی جا رہی تھی کہ مولوی محمود احسن صاحب انہیں منصب الوہیت پر فائز کر چکے تھے۔ اب ایک دلخراش خواب ملاحظہ ہو:

”حضرت گنگوہی کے بیعت ہونے سے پیشتر حضرت حاجی صاحب نے خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر حضرت گنگوہی کا مرید ہونا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی بجاوج آپ کے مہانوں کا کھانا پکا رہی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بجاوج سے فرمایا: اٹھ تو اس قابل نہیں ہے کہ امداد اللہ کے مہانوں کا کھانا پکائے۔ اس کے مہان علماء ہیں، اس کے مہانوں کا کھانا میں پکاؤں گا۔“

کیا گنگوہی صاحب کے لیے فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس لیے کھانا پکانے تشریف لائے تھے کہ گنگوہی صاحب نے سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم کو علمِ شیطان سے کم بتانا تھا اور امتی کہلاتے ہوئے اُس سرکار کے خلاف دیوبندی فرقے کے نام سے ایک مستقل محاذ قائم کرنا تھا؛ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے گنگوہی پیر کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باورچی اس لیے دکھا رہے ہیں کہ کائنات میں گنگوہی صاحب کے مرتبے کی کوئی اور ہستی نظر ہی نہ آئی۔ یہی معنی صاحب اب گنگوہیت کا دیکھائیوں بجاتے ہیں:

حضرت قدس سرہ کے کمالات اور اوصاف کہاں تک بیان کیے جائیں۔ بس  
اس شعر پر آپ کا تذکرہ ختم کرتا ہوں:

حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری  
آنچہ خُوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

۴۵ ایضاً، ص ۱۳۹

۱۱۲ لے عزیز الرحمن نٹوروی، مفتی، تذکرہ مشایخ دیوبند، ص ۱۱۲

یعنی جو کمالات انفرادی طور پر انبیائے کرام کو ملے تھے ان سارے کمالات کی جامع سرکار  
گنگوہیت مآب مولوی رشید احمد صاحب کی ذات ہے۔ اب مولوی محمد یعقوب صاحب کا مقام  
ملاحظہ فرمائیے :

”جس زمانہ میں ملکہ کی تاجپوشی کا جلسہ ہوا، اُس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب  
دہلی میں تھے اور اکثر غائب رہا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت !  
آپ کہاں غائب رہتے ہیں؟ فرمایا، مجھے حکم ہوا ہے کہ دہلی میں جس جس جگہ  
تھمارا قدم جائے گا اُس جگہ کو آباد کر دیں گے۔ اس لیے شہر اور حوالی شہر میں  
گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران مقامات آباد ہو جائیں“۔

اب مولوی رفیع الدین صاحب دیوبندی اور ان کے بھائیوں کا مقام ملاحظہ ہو۔ چنانچہ  
لکھتے ہیں :

”مشہور ہے کہ رات کو اکثر لوگوں نے آپ (شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی)  
کی قبر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنی ہے۔ آپ کے چار بھائی اور تھے  
محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی، سید احمد۔ تینوں مؤرخانہ ذکر حضرات معرکہ  
بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ ان تینوں حضرات کے بارے میں مشہور ہے کہ  
مولانا فرید الدین صاحب (اپنے والد) کے انتقال کے وقت ان کے جنازہ  
میں شریک تھے اور بعد تدفین کے غائب ہو گئے۔“

مصنف تذکرہ مشایخ دیوبند کے استاد اور مدرسہ دیوبند کے مدرس کی زبانی مولوی محمود حسن  
دیوبندی کے بارے میں یہ عجیب و غریب افسانہ تراشا گیا اور ٹانڈوی صاحب اُس کے  
مصدق بن گئے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں :

”عجب میں بچہ تھا اور حضرت (مولوی محمود حسن صاحب) کے زمانہ خانے میں  
آتا جاتا تھا تو ایک دن میں نے حضرت کے کمرہ کے کواڑوں کے چھروکوں سے

۱۔ عزیز الرحمن نٹوڑوی، مفتی، تذکرہ مشایخ دیوبند، ص ۱۷۵ ۲۔ ایضاً، ص ۱۹۳

جھانک کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے جسم کے تمام اعضاء، نسر دھڑ  
علیحدہ علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ آیا اور باہر آ کر  
حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بیان کیا تو مولانا نے فرمایا، خاموش !  
کسی سے نہ کہنا، کوئی فکر کی بات نہیں ہے !

اب براہین قاطعہ جیسی رسوائے زمانہ اور ایمان سوز کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبٹھوی  
(المتوفی ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء) کی شان اُن کے تذکرہ نگار، مولوی عاشق الہی میرٹھی کے  
لفظوں میں ملاحظہ ہو:

حضرت (انبٹھوی صاحب) کے کمالات کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے  
کہ اُن کا ادراک مجھ جیسے ناکارہ کی تو کیا حقیقت، بڑوں کو بھی مشکل تھا !  
اب اسی ادراک سے باہر کمال کی حقیقت تذکرہ نگار موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:  
'جج پنجم میں حسین وقت حضرت مسجد الحرام میں طوافِ قدوم کے لیے تشریف لائے  
تو احقر مولانا محب الدین صاحب کے پاس دبوکہ اعلیٰ حضرت حاجی کے قافلہ  
میں تھے اور صاحب کشف مشہور تھے، بیٹھا تھا مولانا اُس وقت درود شریف  
کی کتاب کھولے اپنا درپڑ چڑھے تھے کہ دفعۃً میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے  
لگے، اس وقت حرم میں کون آگیا کہ دفعۃً سارا حرم انوار سے بھر گیا میں خاموش  
رہا کہ اتنے میں حضرات طواف سے فارغ ہو کر باب الصفا کی طرف سعی کے لیے  
چلے تو مولانا محب الدین صاحب کے پاس کو آئے کہ وہی جگہ مولانا کی نشست  
کی تھی۔ مولانا کھڑے ہو گئے اور نہیں کر فرمایا: میں بھی تو کون آج حرم میں  
کون آگیا۔ یہ کہہ کر مصافحہ و معانقہ ہوا اور حضرت سعی کے لیے آگے بڑھ گئے۔  
مولانا محب الدین صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا، میاں تفسر !

۱۔ عزیز الرحمن نٹھووی، مفتی، تذکرہ مشایخ دیوبند، ص ۲۳۲

۲۔ عاشق الہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الخلیل، ص ۳۵۸



دیوبندی حضرات کے نزدیک نانوتوی صاحب کا مقام انسانیت سے برتر تھا۔ چنانچہ خود لکھا ہے:

مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے تھے کہ میں پچیس برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور کبھی بلا وضو نہیں گیا۔ میں نے انسانیت سے بالا درجہ اُن کا دیکھا ہے۔ وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا، لے

کیا دیوبندی حضرات دوسروں کو بھی یہ وجہ بتا سکتے ہیں کہ بارگاہِ نانوتوی صاحب میں یہ متواتر پچیس سال تک با وضو حاضر ہونے کی پابندی اُن کی شریعت کے مطابق کیسی ہے؟ نیز یہ بھی کہ فرشتے کا مقام کیا انسانیت سے بالاتر ہے؟ افسوس!

سہ راہزن خضر راہ کی قبا چھین کر  
رہسنا بن گئے دیکتے دیکتے

اب دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب کا وہ منصب ملاحظہ فرمائیے جس پر وہ دیوبندی حضرات کے نزدیک فائز ہیں جبکہ موصوف کا مقصد حیات اور اُن کے کارناموں کا مرکزی نقطہ صرف گاندھی جیسے مشرک کی پیروی اور اُس کے ارشادات کو قرآن و حدیث کے مطابق قرار دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اُن کے بارے میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا گیا تھا:

ایک خاص نعمت جو اللہ تعالیٰ نے آپ (مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب) کو عطا فرمائی تھی، وہ تھی رُویا، اس پیکرِ عصمت کی زندگی نے سیدنا یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے جہاں تقدس و استقامت علی الحق، باطل کے مقابلے میں سینہ تان السجین احب الی متاید ہونے کا نوعِ بلند کرنے کا ترکہ پایا تھا، وہیں تاویل احادیث کے تمام شعبے بالخصوص تعبیر رُویا

ما لہ اشرف علی تھانوی، مولوی، حکایات اولیاء، ص ۲۸۶



حضرت یوسف علیہ السلام جیسے کمالات ایک گاندھی جیسے مشرک و بت پرست کے پیروکار میں ثابت کرنے کی جرأت وہ حضرات تو کر سکتے ہیں جن کے نزدیک کفر و ایمان میں کوئی فرق نہ ہو یا آخرت کی باز پرس جن کے نزدیک ایک فرضی قتلے کہانی سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہ رکھتی ہو اور اس پرستم ظریفی یہ گاندھی موصوت کو معصوم قرار دیتے ہوئے ان کے لیے پیکر عصمت کا لفظ لکھ دیا حالانکہ عصمت گروہ انبیاء و ملائکہ کا خاصہ ہے۔ اب قارئین کرام ذرا دیوبندی حقرات کی مٹا پرستی کا ایک المناک ڈرامہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام گویا کسی شہر میں جامع مسجد کے قریب ایک

حجرہ میں تشریف فرما ہیں اور متصل ایک دوسرے کمرے میں کتب خانہ ہے۔ حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے کتب خانے سے ایک جلد کتاب اٹھالی، جس میں دو کتابیں

تھیں، ایک کتاب کے ساتھ دوسری کتاب تھی، وہ خطبات جمعہ کا مجموعہ تھا جس

مجموعہ خطب میں وہ خطبہ نظر انور سے گزرا جو مولانا حسین احمد مدنی خطبہ جمعہ پڑھا

کرتے ہیں۔ جامع مسجد میں جو جو مصیبتوں کا مجمع بڑا ہے۔ مصیبتوں نے فقیر سے

فرمانش کی کہ تم حضرت خلیل اللہ سے سناؤ جس کو کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام مولانا مدنی کو جمعہ

پڑھانے کا ارشاد فرمائیں۔ غیرتہ جرأت کہہ کر چل گیا تو حضرت خلیل علیہ السلام نے

مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا حکم فرمایا۔ مولانا مدنی نے خطبہ پڑھا اور نماز جمعہ پڑھائی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مولانا مدنی کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا فرمائی۔ فقیر بھی

مقتدیوں میں شامل تھا۔ فالحمد لله علی ذلک حمداً کثیراً کثیراً۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام ضعیف العرتھے۔ ریش مبارک سفید تھی۔

یہ بات تو اپنے عرفانی ذوق، ایمانی حرارت اور عقل سلیم سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک نبی اور

وہ بھی خلیل حبیبی جلیل القدر ہستی کی اقتداء کے لیے کس کے دل میں تمنائیں مچلتی ہیں اور خلیل اللہ

کو نظر انداز کر کے اپنے ملاؤں کو امام بنانے بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کو ان کی اقتداء پر مجبور کرنے کی

جسارت کون لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا انبیائے کرام سے اس طرح اپنے علماء کو بڑھا کر دکھانا انہیں  
 اَنْبِیَاءًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنانے کی ایک کڑی تو نہیں ہے؟ خواب تو گھڑ لیا، ٹانڈوی صاحب کو  
 عرش پر بٹھا کر تو دکھا دیا لیکن اتنا خیال نہ آیا کہ اس طرح تمام نمازیوں کے ساتھ گاندھوی صاحب  
 کو بھی انبیائے کرام کا گستاخ مان لیا کہ لوگوں کی یہ غلط اور غیر اسلامی خواہش دیکھ کر بھی انہوں نے  
 یہ نہیں فرمایا کہ خلیل خدا کا مجھے امام بنا کر کیوں اپنے ساتھ میرے بھی دین و ایمان کا پیرہ غرق کرتے ہو؟  
 نہ ہی تو اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہماری سعادت اسی میں ہے کہ ہم انبیائے کرام کی اقتداء کریں۔ لیکن:

سہ رہ منزل میں سب گم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے

امیر کارواں بھی ہیں انہیں گم کردہ راہوں میں

اب مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب کا یہ منصب و مقام بھی تو ملاحظہ فرمائیے:

اب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ (مولوی حسین احمد صاحب) عالم نور میں رہتے ہیں۔ ان

کی آنکھوں میں بھی نور ہے، ان کے داہنے نور ہے، ان کے بائیں نور ہے،

ان کے چاروں طرف نور ہی نور ہے، وہ خود نور ہو گئے ہیں۔“

جب یہی الفاظ مسلمانان اہلسنت وجماعت کی زبان سے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو دیوبندی حضرات کفر و شرک کی توپوں سے دھواں دار

گولہ باری شروع کر دیتے ہیں اور اس عقیدے کو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے سدا امر

بغاوت قرار دیتے ہیں لیکن وہی عقیدہ اگر شیخ الاسلامین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بچے

گاندھوی صاحب سے متعلق کر دیا جائے تو عین ایمان ہو جاتا ہے۔ اب نہ کفر و شرک رہا،

نہ قرآن و حدیث کی تعلیمات سے بغاوت رہی۔ اس ستم ظریفی کا جواب کیا؟ اسلام کو اس

طرح بازیچہ اطفال بنانے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہ ہدایت دکھائے۔ آمین

جاموہ خانہ اکوڑہ شنگ کے مدرس مولوی سمیع الحق صاحب نے ٹانڈوی صاحب کے

بارے میں ان کے گاندھوی منصب کے پیش نظر اپنے تاثرات یوں قلمبند فرمائے ہیں:

میں کہا کرتا ہوں، حضرت مدنی کی نظیر نہیں ہے۔ ان جیسا جامع الصفات

لے شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۲

تمام عالم اسلام میں نہیں تھا! لے

نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کے مہتمم مولوی عبد الکریم دیوبندی نے ٹانڈوی صاحب کے بارے میں اسی بات کو یوں اپنا مشاہدہ بنا کر سپرد قلم کیا ہوا ہے:

میں بارہا متعظ گیا ہوں، اہل اللہ کے جھنڈے کے جھنڈے ہوتے ہیں، مگر میں نے حضرت مدنی کے مرتبہ کا کوئی ولی نہیں دیکھا! لے

جس کو چہ سے روحانیت و ولایت کا گزر بھی نہیں ہو سکتا، وہاں کے رہنے والوں کو نہ صرف زبان زوری سے ولی بتایا جاتا ہے بلکہ اولیاء اللہ سے بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں۔ کاش! ایسے قلم جو حضرات کبھی اتنا ہی غور فرمایا کرتے کہ اللہ و رسول (جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے دشمنوں اور گاندھی کے پیاریوں کا جلا ولایت سے رشتہ ناٹھ کیا: ابھی مولوی سمیع الحق صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے:

حضرت راستے پوری مدظلہ (مولوی عبد القادر صاحب) سے کہا گیا کہ حضرت مدنی کانگرس میں اکیلے ہیں۔ فرمایا ہم اُس اکیلے کے ساتھ ہیں۔ میں تیرے مرتبہ جاز گیا۔ حرمین الشریفین میں پوری دنیا کے اولیاء اللہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہیں بھی حضرت مدنی کی نظیر نہیں دیکھی! لے

اب ٹانڈوی صاحب کے بارے میں دیوبندی حضرات کا یہ فیصلہ بھی مد نظر رکھا جائے:

”مگر اب آہ میرے سچا اونیام میں تو اس وقت قیامت برپا ہے۔ اُمتِ مرحومہ کا تو ہی ایک سہارا تھا سو قیامت میں ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا!“ لے

اگر اولیائے کرام بلکہ خود سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا سہارا کہا جائے تو دیوبندی حضرات کے نزدیک یہ کفر و شرک ہے، قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ فوراً تقویۃ الایمان کے ساختہ قوانین سنانے شروع کر دیے جاتے ہیں کہ کوئی کسی کا وکیل اور

لے ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۷ لے ایضاً، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۲۲

لے ایضاً، ۱۳ اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۱۷ لے الجمعۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص ۹۷

سفاشی نہیں ہے۔ کوئی نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ بالفعل اُن کو کسی کام میں دخل ہے نہ اللہ کے دینے سے۔ جو انہیں خدا کے دینے سے بھی اختیار مانے وہ اور ابو جہل شرک میں برابر ہیں۔ لیکن اختیارات کی نسبت اگر دیوبندی حضرات کے دشمنوں یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بجائے دیوبندیوں کے اپنے مولویوں ملاؤں کی طرف ہو جائے تو چاہے ہزاروں گنا زیادہ اختیار ماننے چلے جائیں، اب نہ کفر و شرک، نہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف، بلکہ وہی عقیدہ اب عین دین و ایمان ہو جائے گا۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہتا ہے اور اس یقین کو پوری تقویت نہیں پہنچتی کہ وہاں بیت حقیقت میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام سے بغاوت کا نام ہے اور وہابی وہی ہے جس کے دل میں انبیاء و اولیاء کی عداوت کوٹ کوٹ بھری ہوئی ہوگی اگرچہ بظاہر کتنی ہی عقیدت کا اظہار کریں یا منافقانہ طور پر عشق رسول کا بلند بانگ دعویٰ بھی کرتے پھریں۔ اس زندہ حقیقت کا اگر خود معائنہ کرنا ہو تو بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے سوال کیجیے کہ فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، ظاہر ہے کہ دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا مفتی اعظم و قطب الارشاد کہلانے والے سے لے کر ایک جاہل مطلق تک ہر وہابی یہی جواب دے گا کہ وہ ہماری ہی طرح کے بشر تھے۔ اس سوال کا جواب دینے میں انہیں قطعاً کوئی وقت نہیں اٹھانی پڑے گی، نہ کوئی جھجک یا ندامت محسوس ہوگی، نہ اس میں کسی قسم کی سچپیدگی یا الجھن کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن جلیب کردگار کی جگہ اگر بات اُن لوگوں کی آجائے جن کی وہ غیر محسوس طریقے پر رات دن پرستش میں مصروف رہتے ہیں، جن کی بارگاہوں میں عقیدت کے سجدے لٹاتے رہتے ہیں، جن کی بندگی سے وہ کسی وقت تائب ہونے کے لیے تیار نہیں یعنی اُن کے مولویوں کے بارے میں پوچھا جائے تو یوں جھول بھلیتاں کی سیر کرنے لگ جاتے ہیں:

آپ (مانڈوی صاحب) کے فضائل علیہ اور کمالات باطنیہ کی صحیح اطلاع یا تو خداوند قدوس ہی کو ہو سکتی ہے (یعنی صرف امکان تسلیم کیا ہے) یا اُن اولیائے کرام اور علمائے ربانین کو ہو سکتی ہے جن کو مبداء فیاض نے چشم بصیرت عطا فرمائی ہے، ہم جلیبے کو چشم آپ کی ذات قدسی صفات کو

کیا پہچان سکتے ہیں؟

دیوبندیوں سے ٹانڈوی صاحب کا منصب و مقام کیوں نہیں پہچانا جاتا تھا، آخر گاندھی کی آندھی میں تنکے کی طرح اڑنے والے اور کانگریس کی در یوزہ گری کرنے والے مولوی صاحب کا مرتبہ جاننے میں کون سا پہاڑ حائل تھا، بات دراصل یہ ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے کھدڑ پوش ٹانڈوی صاحب کو منصب الوہیت پر فائز کر چکے تھے، جیسا کہ خود لکھا ہے:

”تم نے کبھی خدا کو بھی اپنے گلی کوچوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے، کبھی خدا کو بھی اُس کے عرشِ عظمت و جلال کے نیچے فانی انسانوں سے فروتنی کرتے دیکھا ہے، تم کبھی تصور بھی کر سکتے کہ رب العالمین اپنی کبریائیوں پر پر وہ ڈال کے تمہارے گھروں میں بھی آکر رہے گا؟“

اسی کبریائی کے باعث ٹانڈوی صاحب کو بڑے ذوق و شوق سے عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ بنا کر تشہیر کی ہے۔ مسلمان اگر دیوار کے پرے والی چیز سے سرور کون و مکان ہلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبردار مانیں تو مشرک اور دیوبندی حضرات اپنے کھدڑ پوش کبریا یعنی عالی جناب ٹانڈوی صاحب کو دلوں کے خطرات سے بھی واقف بتائیں تو عین ایمان اور ٹانڈوی صاحب کے کامل ہونے کی دلیل۔ چنانچہ جامعہ مدنیہ لاہور کے امیر حامد میاں صاحب جو ٹانڈوی صاحب کے خلیفہ مجاز بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد مولوی احمد علی لاہوری صاحب نے ٹانڈوی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ اُدھر سے جو جواب آیا اُسے لاہوری صاحب اپنے لیے ذریعہ نجات قرار دے کر محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا، وجہ مینے:

حضرت شیخ التفسیر (مولوی احمد علی لاہوری) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے خط میں ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا لیکن حضرت مدنی قدس سرہ کا مل تھے اس لیے میری قلبی کیفیت اُن پر منعکس ہوئی کہ میں نے اگرچہ الفاظ ایسے نہیں

کھے تھے لیکن کھتے وقت مجھ پر رقت کا عالم تھا۔ حضرت مدنی نے جواب میں میری قلبی کیفیت کا خیال فرمایا اور یہی شیخ کا کمال ہے، لے

مجھے کہنے دیجئے کہ قلوب پر مطلع ہونا اگر کامل ہونے کی دلیل ہے تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی علیت پر دیوبندی حضرات پہو بٹھانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ جتنا علم اپنے ٹانڈوی صاحب کے لیے تسلیم و مشہر کیا ہے کوئی دیوبندی مرتے دم تک بھی اتنا علم اس ہستی کے لیے تسلیم نہیں کرتا جو اولین و آخرین کے علوم کی جامع ہے۔ کیا یہ حبیب پروردگار کو ناقص ٹھرانے، فضل و کمال سے غالی بنانے اور غلامی کے پردے میں دل کی لگی بجانے کا پراسرار کاروبار نہیں ہے؟ ورنہ ٹانڈوی صاحب تو دلوں پر بھی مطلع اور سید الانبیا، دیوار کے پرے والی چیزوں سے ناواقف۔ کیا اس فیصلے میں محبت اور نفرت کے جذبات کی کارفرمائی نہیں ہے؟ نہ ان حضرات کے پاس ایک بھی دلیل کہ ٹانڈوی صاحب قلوب پر مطلع ہیں نہ ایسا کوئی ثبوت کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پس دیوار کی چیزوں سے ناواقف تھے۔ بات بس اتنی ہے کہ ٹانڈوی صاحب سے عقیدت ہے تو بغیر دلیل بھی عَلِيْهِمْ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ مان لیے گئے اور سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عداوت ہے تو دنیا و مافیہا سے واقف ہونے کے باوجود پس دیوار سے ناواقف ٹھہرا دیے گئے۔ قلب کی اس بیماری کا علاج سوائے اللہ رب العزت کے اور کسی کے پاس نہیں۔ تو شبہ اسی مرض کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو دین و ایمان کی اس ٹی بی سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔ ٹانڈوی صاحب کی شان میں کہے گئے اس شعر کے تیور بھی ذرا قارئین کرام بغور ملاحظہ فرمائیں، لے

آج اُس مشفق، مرتبی، شیخِ کامل کا ہے ساتھ

جس کی نظروں سے گداؤں کو شہنشاہی ملے

دیوبندی حضرات کے نزدیک فخرِ دو عالم، سیدِ عرب و عجم تک تو کسی کو نفع نقصان پہنچا نہیں

لے ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۱۳

سکتے تھے بلکہ اپنی صاحبزادی کے کام آنے تک سے مجبور و معذور تھے لیکن ٹانڈوی صاحب کو یہ کمال ان کے نزدیک ضرور حاصل تھا کہ یہ پاک جھپکنے میں خاک نشینوں کو تخت نشین اور بھکاریوں کو بادشاہ بنا دیا کرتے تھے۔ کیا یہ ایک شرمناک جسارت اور دیانت و انصاف کا نسر بازار خون نہیں کیا جا رہا ہے؟ اب مولوی حسین احمد گاندھوی کے عاشق زار اور لاہور میں دیوبندیت کے سابق علمبردار مولوی احمد علی لاہوری (المتوفی ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) کے بارے میں مولوی سعید احمد جالندھری لکھتے ہیں:

”میں اپنے علم و ایقان اور مطالعہ کی کسوٹی پر جب کبھی حضرت شیخ التفسیر علیہ الرحمۃ کو کس کر دیکھتا ہوں، بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ ادا ہو جاتا ہے، حضرت مولانا احمد علی یقیناً اس دور کے حسن بصری ہیں۔“

نوشہرہ چھاؤنی کے جناب احمد عبدالرحمن صدیقی نے اپنے پیر مولوی احمد علی لاہوری کو صدیق اکبر کے مقام پر فائز بتاتے ہوئے تصدیقاً لکھا اور دیوبندی حضرات نے اسے یوں شہتر کیا ہے:

”دسمبر ۱۹۵۶ء سوموار کے دن بیعت کی اور واپس نوشہرہ گیا تو چند ایام کے بعد خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ ہے اور لوگ بتلا رہے ہیں، یہ حضرت صدیق اکبر اور یہ بقیہ صحابہ کے مکانات ہیں۔ حضرت صدیق اکبر کے مکانات کے دروازے سبز تھے۔ میں نے دستک دی۔ اندر سے ایک بچہ نکلا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ حضرت صدیق اکبر کہاں ہیں؟ تو اس نے سامنے چو بارے کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سامنے در کس قرآن دے رہے ہیں۔ میں نے جب دیکھا تو وہ حضرت لاہوری تھے۔ اس کے بعد میں جاگ اٹھا اور اس معجزہ کو نہ سمجھ سکا۔ تب سمجھ میں آیا جب حضرت کے انتقال پر علامہ انور صابری صاحب ہندوستان سے بسلسلہ تعزیت تشریف لائے تو انھوں نے کہا کہ حضرت لاہوری مقام صدیقیت

لے خدام الدین، ۱۳۰، اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

پر فائز تھے۔ تب مجھے اپنے خواب کی تعبیر معلوم ہوئی، اے

دیوبندی حضرات جب اپنے مولویوں کے لیے کوئی مقام ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے لیے عموماً خواب گھڑتے اور گھڑے گھڑائے خوابوں کے سہارے اپنا خیالی شیش محل تعمیر کر لیا کرتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اسی باب کے اندر ہم دیوبندی حضرات کے ایسے خوابوں اور ان کے متضاد فتروں اور متضاد عقاید و بیانات کو دو مستقل عنوانات کے تحت ضبطِ تحریر میں لاتے لیکن ان دونوں عنوانات کی وسعت کے تحت بخلاف طوالت یہاں اُنہیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ احقر کا ارادہ ہے کہ جلد از جلد ان عنوانات پر مستقل کتابیں پیش کی جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہاں تو ذکر ہے مولوی احمد علی لاہوری کا۔ مولوی مناظر حسین نظر رکھتے ہیں کہ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جب احمد علی صاحب اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی ملتان حبیل میں تھے تو قاضی صاحب نے مولوی احمد علی صاحب لاہوری کو کس رنگ روپ میں دیکھایا مولوی مناظر صاحب کے قلم سے پوچھیے:

”قاضی صاحب کہتے ہیں کہ میں اُن (لاہوری صاحب) کی کوٹھری کے پاس

سے گزرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اللہ کا نور، اللہ کی بارگاہ میں سر بسجود ہے، اے

کیا اب بھی اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ وہ ابیت اصل میں انبیاء کرام و اولیاء عظام سے بغض و عناد ہی کا نام ہے۔ اگر کائناتِ ارضی و سماوی کی سب سے ممتاز ہستی اور بعد از خدا بزرگ توئی کے منصب پر فائز ہونے والے محبوب پروردگار کے لیے اللہ کا نور کیسے تو وہابیوں کا مفتی اعظم سے جاہل مطلق تک یہ پتہ یقین رکھتا ہے کہ ایسا کہنے والے نے کفر کیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدائے وحدۃ لا شریک کا شریک ٹھہرا دیا۔ لیکن اس بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑنے والے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہونے پاتی کہ اپنے مولویوں اور ملاؤں کے لیے اللہ کا نور کھ دیا جاتا ہے۔ آخر یہ دھاندلی ایک روز رنگ لائے گی۔ اِنَّ مَوْعِدَكُمْ الصُّبْحُ ط اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ۔

لے خدام الدین، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۳۶، ۳۷

لے خدام الدین، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۸



دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی عبدالقادر رائے پوری (المتوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) بڑے ولی کامل اور صاحب کشف و کرامت بزرگ ہو گزرے ہیں۔ موصوف کے خلیفہ مجاز مولوی جمیل احمد میواتی نے اپنے پیر کے عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ہونے کے بارے میں تحریر کیا ہے:

شام کا وقت تھا۔ مہمان چونکہ ابھی تھوڑے ہی تھے لہذا بڑے کمرے میں حضرت اقدس کے ساتھ ہی کھانا کھانے کی سعادت ملی۔ درمیان میں حضرت اقدس تکیہ سے ٹیک لگائے چار زانو بیٹھے ہوئے کھانا نوش فرما رہے تھے۔ دائیں بائیں دو قطاروں میں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں قطار کے سب سے آخر میں، میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت کو چار زانوں بیٹھے ہونے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ بھائی! ہم نے تو سنا تھا کہ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں، مگر کھانا تو ان تین طریقوں کے خلاف کھا رہے ہیں جو ہم کو جماعت میں بتائے گئے ہیں۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ، ساری دنیا جن کے کمالات بزرگی کی قائل ہے اور ان کا وہاں مانتی ہے اور جن کی کرامتوں میں سے سب سے بڑی کرامت یہی سمجھی جاتی ہے کہ ساری عمر حضرت نے اپنی کسی حرکت و سکون سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھ میں بھی کوئی کمال ہے، وہیں سے بیٹھے بیٹھے میرے دل میں سے گزرنے والے خطرہ کو اپنے کشف عالیہ کے ذریعے سے معلوم کرتے ہوئے میری اصلاح کی غرض سے فرمایا: بھائی! جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ ویسے ہی کھاؤں لیکن میں بوڑھا ہوں اور بیماری کے سبب معذور بھی ہو چکا ہوں۔

جب بات انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ہو تو وہابی حضرات کا ہر قلم دین و ایمان کے سینے پر نشتر زنی کا کام کرتا چلا جاتا ہے لیکن جب ان میں سے کسی قلم کا رخ اپنے ملاؤں کی

جانب ہوا، تو ابھی ابھی جب باتوں کو کفر و شرک قرار دیا تھا وہ عین ایمان اور قرآن و حدیث کی تعلیم کے بالکل مطابق قرار پائے گی۔ باطل کا ہمیشہ سے یہی خاصہ رہا ہے اور دیوبندی حضرات کے ایسے دو غلطیوں کے پیش نظر بے ساختہ کہنا پڑ جاتا ہے: **اللہ سے خود ساختہ قانون کا نیرنگ**

علمائے دیوبند کا تصوف **حدیث کی اصطلاح میں جسے احسان کہتے ہیں، اسی کا نام** تصوف کا سارا شعبہ ہی بدعت اور شجر ممنوعہ ہے جبکہ دیوبندی حضرات اس کے قائل ہی نہیں بلکہ اپنی فرضی پیری مریدی کا جال بچھا کر عوام الناس کو اپنے دام تزیور میں پھنساتے رہتے ہیں۔ گزشتہ عنوان کے تحت قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ دیوبندی حضرات نے شاید ہی اپنے کسی مولوی کو چھوڑا ہو جسے منصب الوہیت پر فائز نہ کر سکے ہوں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فضائل و کمالات میں بڑھ چڑھ کر دکھانا تو ان حضرات کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعے سے ایک بے خبر آدمی کو یہی محسوس ہو گا کہ دنیا میں اگر کہیں صاحب کمال پیدا ہوئے تو وہ علمائے دیوبند ہیں جبکہ اہل نظر پر واضح ہے کہ حقیقت اس کے سراسر برعکس ہے۔ یہ بزرگی کے دکھانے، یہ کرامتوں کے چرچے، یہ کشف و الہام کھینچنے محض دنیاوی کاروبار کو چمکانے اور خود کو اہلسنت و جماعت باور کروانے کی خاطر اختیار کر رکھے ہیں۔ آئیے دیوبندی حضرات نے جو تصوف و ردعائیت کا فلک بوس شیش محل تعمیر کیا ہوا ہے، اس کے اندر تو جھانک کر دیکھیں چنانچہ حافظ ضامن صاحب کے بارے میں مولوی عاشق الہی میرٹھی نے بروایت مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب لکھا ہے،

حضرت حافظ صاحب کے مزاج اور خوش مزاجی کے بہت قصبے بیان فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا: حافظ صاحب کو مچلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک بار ندی پر شکار کھیل رہے تھے، کسی نے کہا: حضرت! ہمیں آپ نے فرمایا: اب کے ماروں تیری؟ لے

لے عاشق الہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۲۷۰

یہ واقعہ حکایات اولیاء مرتبہ مولوی اشرف علی تھانوی، مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۲۴ پر بھی موجود ہے۔  
 اب مولوی رشید احمد گنگوہی کا ایک خواب مولوی عاشق الہی میرٹھی کی زبانی سنئے،  
 ”آپ (گنگوہی صاحب) ایک مرتبہ خواب بیان فرمانے لگے کہ مولوی محمد قاسم  
 کو میں نے دیکھا کہ دلہن بنے ہوئے ہیں اور میرا نکاح اُن کے ساتھ ہوا۔  
 پھر خود ہی تعبیر فرمائی کہ آخر اُن کے بچوں کی کفالت کرتا ہی ہوں۔“  
 اب دیکھنا یہ ہے کہ جو خواب مولوی محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد دیکھا گیا کیا وہ نانوتوی  
 صاحب کی زندگی میں کبھی اپنے اصلی رنگ روپ میں بھی دیکھا جاتا تھا یا نہیں؟ اس کا  
 جواب ملاحظہ ہو:

حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب و عم محترم مولانا حبیب الرحمن صاحب  
 رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ گنگوہی کی خانقاہ میں مجمع تھا۔ حضرت  
 گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے مرید و شاگرد سب جمع تھے اور یہ دونوں حضرات  
 بھی وہیں مجمع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت گنگوہی نے حضرت نانوتوی سے  
 محبت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ یہاں ذرا لیٹ جاؤ۔ حضرت نانوتوی کچھ شرما سے  
 گئے مگر حضرت نے پھر فرمایا تو بہت ادب کے ساتھ چپٹ لیٹ گئے۔ حضرت  
 (گنگوہی صاحب) بھی اسی چارپائی پر لیٹ گئے اور مولانا کی طرف کو کروٹ  
 لے کر اپنا ہاتھ اُن کے سینے پر رکھ دیا جیسے کوئی عاشق صادق اپنے قلب کو  
 تسکین دیا کرتا ہے۔ مولانا ہر چند فرماتے ہیں کہ یہاں کیا کر رہے ہو، یہ لوگ  
 کیا کہیں گے؟ حضرت نے فرمایا: لوگ کہیں گے کھنڈے دو۔“

دیوبندیوں کے نزدیک مولوی محمد قاسم نانوتوی بہت بڑے بزرگ اور حجۃ الاسلام تھے۔  
 موصوف کے بزرگانہ ارشادات کی ایک جھلک دیوبندی حضرات ہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

لے تذکرۃ الرشید، حصہ اول، ص ۲۴۵

لے اشرف علی تھانوی، مولوی، حکایات اولیاء، ص ۲۲۹

والد صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ چتے کی مسجد میں مولانا فیض الحسن صاحب  
استنبجے کے لیے لوٹا تلاش کر رہے تھے اور اتفاق سے سب لوٹوں کی  
ٹوٹیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ فرمانے لگے کہ تو بہ، سارے لوٹے مٹتوں ہی ہیں۔  
حضرت (نانوتوی صاحب) نے ہنس کر فرمایا، پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں  
کرنا ہے (گویا مٹتوں سے کیا ڈر ہے)۔ لے

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی حضرات کے نزدیک بہت بڑے بزرگ، بلکہ مجدد،  
بلکہ جامع المجتہدین تھے۔ موصوف نے اپنے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ  
مریدوں کو بتایا:

ایک روز ایسا ہوا کہ بھائی پیشاب کر رہے تھے، میں نے اُن کے سر پر  
پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ لے

اب حکیم الامت صاحب کی مہمان نوازی کا ایک بے نظیر واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے:  
ایک صاحب تھے سیکری کے، ہماری سوتیلی والدہ کے بھائی، بہت ہی نیک  
اور سادہ تھے۔ والد صاحب نے اُن کو ٹھیکے کے کام پر رگھو چھوڑا تھا۔ ایک  
مرتبہ کسٹریٹ سے گرمی میں جھوٹے پیاسے گھر آئے اور کھانا نکال کر کھانے  
میں مشغول ہوئے۔ گھر کے سامنے بازار ہے۔ میں نے رٹرک پر سے ایک  
سگتے کا پلا چھوٹا سا پکڑ کر، گھر لاکر، اُن کی وال کی رکابی میں رکھ دیا۔ بیچارے  
روٹی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ لے

موصوف گھر میں اور کس قسم کی کراہتیں دکھایا کرتے تھے۔ خود اُن کی زبانی ایک واقعہ سننے  
اور اندازہ کیجئے:

لے اشرف علی تھانوی، مولوی، حکایات اولیاء، ص ۲۸۷

لے الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۲

لے ایضاً، ص ۲۷۳

ہم لوگ والد صاحب کے پاس رہتے تھے۔ تین چار پائیاں برابر بچی ہوئی تھیں، والد صاحب اور ہم دونوں بجاٹیوں کی۔ میں نے رتی لے کر سب کے پائے ملا کر خوب کس کر بانڈھ دیے اور لیٹ کر سو گئے۔ پھر والد صاحب بھی اکر لیٹ گئے۔ اتفاق سے بارش آئی تو والد صاحب اٹھے اور..... اپنی چار پائی گھسیٹی۔ اب وہاں تینوں چار پائیاں ایک ساتھ چلی آرہی ہیں۔ سجدہ غصتے ہوئے اور فرمایا کہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔

اب ذرا یہ ملاحظہ ہو کہ تھانوی صاحب مسجدوں میں کیسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ موصوف نے اپنی ایک ایسی کرامت اپنے مریدوں کے سامنے یوں فخریہ بیان فرمائی اور اُس کی اشاعت کروائی گئی:

”ایک مرتبہ میرٹھ میں میاں الہی بخش صاحب مرحوم کی کوٹھی میں جو مسجد ہے (میں نے) سب نمازیوں کے جوتے جمع کر کے اُس کے شامیانے پر پھینک دیے۔ نمازیوں میں غل ہوا کرتے کیا ہوئے۔“

موصوف حکیمانہ مسجدیں بناتے اور ان میں نماز یا جماعت کا اہتمام بھی کر دیا کرتے تھے۔ اب دیوبندیوں کے حکیم الامت صاحب کی زبان سنئے کہ وہ مسجد اور امامت کیسی ہوتی تھی، ایک روز سب لڑکے اور لڑکیوں کے جوتے جمع کر کے اُن کو برابر رکھا اور ایک جوتے کو سب کے آگے رکھا، وہ گویا کہ امام تھا اور پلنگ کپڑے کر کے، اُس پر کپڑے کی چھت بنائی، وہ مسجد قرار دی۔

تھانوی صاحب اپنی ایسی حرکتوں کے باعث اپنے خاندان اور والد محترم کے لیے باعث تنگداری مشہور ہو چکے تھے۔ چنانچہ اِس امر کا اُنہوں نے اپنے مریدوں کے سامنے خور و نون اعتراض کیا تھا:

”جہاں اِس قسم کی کوئی بات شوخی کی ہوتی تھی۔ لوگ والد صاحب کا نام لے کر

کہتے کہ ان کے لڑکوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے! ل

دیوبندی حضرات یہ کہہ سکتے ہیں تھانوی صاحب کی یہ نازیبا حرکات اُس وقت کی ہیں جب وہ سن شعور کو نہیں پہنچے تھا۔ چلیے ایسا ہی ہو گا کہ جناب مولوی صاحب کو اُس وقت اپنے مریدوں اور معتقدوں میں ایسی بیہودہ باتوں کے تذکرے اور اُنھیں شایع کروانے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی، جب کہ اُن کی علامگی اور دیوبندی فرقے میں اُن کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت ہونے کے دُھول بجائے جا رہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ مریدوں کے سامنے ایسی نازیبا حرکتوں کا سرے سے تذکرہ ہی نہ کرتے۔ بہر حال اب تھانوی صاحب کی اُس دور کی تہذیب و شرافت ملاحظہ فرمائیے، جب اُن کی علامگی اور خانہ ساز بزرگی کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ قارئینِ کرام! ذرا دیوبندیوں کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت کہلانے والے کی طرزِ گفتگو، معیارِ شرافت اور مریدوں کی تربیت کا اندازہ ملاحظہ فرمائیں۔ تھانوی صاحب فرماتے ہیں:

ایک شخص نے مجھ سے شکایت کی کہ ذکر میں جو پہلے مزہ آتا تھا، اب نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ میاں مزہ تو مذی میں ہوتا ہے، یہاں کیا مزہ ڈھونڈتے پھر ہو؟

دیوبندیوں کی تہذیب و شرافت کا ایک نادر شہکار اور ملاحظہ ہو۔ مولوی لطف اللہ دیوبندی نے لکھا ہے:

مکتب کے لڑکوں نے حافظ جی کو نکاح کی ترغیب دی کہ حافظ جی نکاح کر لو، بڑا مزہ ہے۔ حافظ جی نے کوشش کر کے نکاح کیا اور رات بھر روٹی لگا لگا کر کھائی۔ مزہ کیا خاک آتا، صبح گولڑکوں پر خفا ہوتے ہوئے آئے کہ سسرے کہتے تھے کہ بڑا مزہ ہے، ہم نے روٹی لگا کر کھائی ہمیں تو نہ ٹمکین معلوم ہوئی، نہ مینٹھی، نہ کڑوی۔ لڑکوں نے کہا کہ حافظ جی! مارا کرتے ہیں۔ آئی شب، حافظ جی نے بیچاری کو خوب زد و کوب کیا۔ دے

لے الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۲

ذیقات الیومیہ، جلد اول، ص ۳۰۷

جڑتا، دسے جوتا، تمام محلہ جاگ اٹھا اور جمع ہو گیا اور حافظ جی کو بُرا بھلا کہا۔ پھر صبح آئے اور کہنے لگے کہ سسروں نے وق کر دیا۔ رات ہم نے مارا بھی کچھ مزہ نہ آیا اور سُوائی بھی ہوئی۔ تب لڑکوں نے کھول کر حقیقت بیان کی کہ مارنے سے یہ مراد ہے۔ اب جو شب آئی تب حافظ جی کو حقیقت منکشف ہوئی۔ صبح کو جو آئے تو مونچھوں کا ایک ایک بال کھل رہا تھا اور خوشی میں بھرے ہوئے تھے۔

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی حکیمانہ تعلیمات ملاحظہ ہوں جن کی مریدوں کو تلقین کرتے رہا کرتے تھے چنانچہ موصوف نے بغیر شرمائے ایک واقعہ اپنے مریدوں کے سامنے یوں بیان کیا جو ملفوظات کا حصہ قرار پایا،

”عوام کے عقیدہ کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے گدھے کا عضو مخصوص، بڑھے تو بڑھتا ہی چلا جائے اور جب غائب ہو تو بالکل پتہ ہی نہیں۔ واقعی عجیب مثال ہے!“

یہ عجیب مثال ہے تو تھانوی صاحب کی زبانی ذہانت کا کمال ملاحظہ ہو۔ انہوں نے فرمایا تھا، ”ایک شخص کسی مکان میں اندر سے کنڈھی لگا کر کسی عورت سے زنا کر رہا تھا۔ لوگوں نے دستک دی تو اب اندر سے کہتا ہے کہ میاں! یہاں جگہ کہاں؟ یہاں خود ہی آدمی پر آدمی پڑا ہے۔ یہ کیسا سچا آدمی تھا۔ جھوٹ نہیں بولا۔ کسی ذہانت کا جواب ہے!“

خیر یہ تو تھانوی صاحب نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں جھوٹ نہ بولنے کی تلقین فرمائی ہے اب بزرگی کے اظہار اور حقائق و معارف بیان کرنے کا طریقہ بھی جامع المجددین صاحب ہی سے معلوم کرنا چاہیے کیونکہ ان کے سوا اس شرافت سے بے ہوئے کو چہ کاشنا سا او

۱۔ لطف اللہ، مملوئی، علمائے حق، ص ۱۲

۲۔ الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۷

۳۔ الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۵۰

کون ہو سکتا ہے۔ موصوف نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

”ماموں صاحب بوسنے کہ میں بالکل ننگا ہو کر بازار میں ہو کر نکلوں۔ اس طرح ایک شخص تو آگے سے میرے عضو تناسل کو پکڑ کر کھینچے، ساتھ میں لڑکوں کی فوج ہو اور وہ یہ شور مچاتے جاویں، بھڑوا ہے، بھڑوا ہے اور اس وقت میں حقائق اور معارف بیان کروں!“

تھانوی صاحب کا یہ حکیمانہ مضمون گرامی بھی دیوبندیوں کی تربیت کے لیے مشہر کیا گیا ہوگا۔

چنانچہ لکھا ہے:

”قصبہ رامپور میں حضرت مولانا گنگوہی نے ایک واقعہ میں طلاق کے متعلق کوئی فتویٰ دیا تھا۔ کسی عورت نے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس کے خلاف یہ فتویٰ دے دیا کہ قرآن میں یہ لکھا ہے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بیان کیا۔ فرمایا وہ کیا جانے چڑھو کہیں گی!“

میرا خیال ہے کہ دیوبندی حضرات کے بقیۃ السلف و عمدة الخلف عالیجناب تھانوی صاحب کے لمقولات مذکورہ بالا ہی اس جماعت کی تہذیب و شرافت اور بزرگی کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ مآخذ و کتب کے تحت، طوالت سے بچنا اور ان پر ہی اکتفا کرنا مناسب ہے۔ قارئین کرام نے ان سے ہی بخوبی محسوس کر لیا ہوگا کہ:

ہیں ستارے کچھ، نظر آتے ہیں کچھ  
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

## ۴۔ بانی جماعت اسلامی کے کارنامے

یوں تو عالیجناب مودودی صاحب نے اپنی بلند قامت ہستی اور بین الاقوامی شہرت کی مالک شخصیت ہونے کے باعث ملت اسلامیہ پر کتنے ہی مخصوص احسانات فرمائے ہیں

۷۵ ایضاً: ص ۷۵

۷۶ الافاضات الیومیہ، جلد ہفتم، ص ۸۳



جو تاریخ کا ایک پراسرار اور المناک باب بن چکے ہیں، لیکن یہ احسانِ تاپنی جگہ پر زالی ہی شان رکھتا ہے کہ جو ملت پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اُس پر ایک تازہ فرقے کا بوجھ اور لا دویا۔ اللہ اور رسول نے فرقہ بازی سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والوں کے بارے میں سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں لیکن بین الاقوامی شخصیت ہونے کے باعث جناب مودودی صاحب نے اُن کی ذرا پروا نہ کی۔ وہا بیت کا تیسرا ایڈیشن مرتب کر کے شایع فرمادیا اور جماعتِ اسلامی کے خوشناما نام سے مسلمانوں کی فہرست میں ایک فرقہ اور شامل کر دیا۔ کاش! وہ ایسا وبال اپنے سر نہ لیتے اور اپنا زور قلم کھرے ہوئے مدعیانِ اسلام کو جوڑنے اور بہک جانے والوں کو راہِ راست پر لانے میں صرف کرتے۔ اگر راہِ راست سے اُنہیں چڑھتی اور وہا بیت پر جان چھڑکتا اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کرنا وہ ضروری خیال کرتے اور باعثِ نجات گردانتے تھے تو غیر مقلدوں یا دیوبندیوں میں شامل رہتے لیکن نیا فرقہ کھڑا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے پہلے پاک و ہند میں وہا بیت کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور محمد بن عبد الوہاب نجدی سے پہلے رُوئے زمین پر اس جماعت کا کہیں وجود نظر نہیں آتا تھا۔ اسی طرح مولوی رشید احمد گنگوہی سے پہلے دیوبندی عقاید و نظریات کی اس نام سے کوئی جماعت نہ تھی۔ سرسید احمد خاں علی گڑھی سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ چیریت کون سے درخت کا نام ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے پہلے مرزائی فرقہ، خواہ وہ قادیانی ہوں یا لاہوری، ہرگز نہ تھا۔ غلام احمد پرویز سے پہلے خود کو اہلِ قرآن بتانے والا پرویزی ٹولہ دنیا کے طبقے پر ناپید تھا اور مودودی صاحب دی گریٹ سے پہلے کوئی فرقہ جماعتِ اسلامی کے نام سے انسانوں میں متعارف نہیں تھا۔ موصوف الذکر دونوں فرقوں کے بانی تا حال بقیدِ حیات ہیں۔ کاش! اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو ہدایت بخشنے کہ فرقے بنانے کا جو وبال اپنے سر لیا ہے، اُس سے تائب ہو کر، راہِ ہدایت اختیار کر لیں۔ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ پر عمل کر لیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہماری ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا

سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی ہادیِ کُل اور ہدایت کا چشمہ ہیں۔ قیامت تک آنے والوں مدعیانِ اسلام میں سے راہِ ہدایت پر وہی شمار ہوگا جو اُس آقائے کائنات کے لائے ہوئے دین پر ثابت قدم رہے اور اُس میں کسی قسم کی کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلام صحابہ کرام نے سیکھا، اُن سے تابعین نے اُن سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اسی طرح ہر نئی نسل اپنے بزرگوں سے دین حاصل کرتی اور اُسے اگلی نسل تک پہنچاتی رہی۔ قیامت تک اسی طرح دین جاری رہے گا۔ اس حقیقت کی روشنی میں قارئین کرام غور تو فرمائیں کہ جو جماعتیں اور فرقے کل یا پوسوں کی پیداوار ہیں اگر اُن میں سے کسی کی حقانیت کا ڈھول پیٹا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقانیت انہیں بطور میراث ملی ہے یا اُن پر نازل ہوئی ہے؟ دونوں میں سے ہر شق محتاجِ ثبوت ہے۔ جن کی جماعتوں کا ماضی میں وجود ہی نہیں انہیں کس کی میراث ملتی؟ رہا نزول کا معاملہ تو مسیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کا فسوخ ہونا اور کسی دوسرے پر برحق دین کے نازل ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دریں حالات دینِ مصطفیٰ کے دشمنوں اور کُتِ اسلامیہ کے پرخواہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ مسیّد الانبیاء سے دین کی میراث پانے والوں کو غلط اور اہل باطل قرار دیا، اُن کی بعض کوتاہیوں اور کمزوریوں کو سامنے رکھ کر اصلاح کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے، جب بعض جملے بجالائے مسلمان اُن کی اصلاحی سرگرمی سے متاثر ہو کر ہنوائے تاپنا رنگ یوں دکھانا شروع کیا کہ مقدس شجرِ اسلام میں بعض خود ساختہ عقاید و نظریات کے پیوند لگا کر نیا اور تازہ بنا دین پیش کرنے لگ گئے۔ جہاں سے وقت جب اُن خود ساختہ ایجادات پر گرفت کرتے تو اپنا اصلاحی رنگ سامنے کر کے مسلمانوں کو بد غلطیوں کی دیکھیے یہی لوگ ہیں جو فلاں فلاں غلطیوں اور کوتاہیوں کے مروج ہیں اور اصلاح سے کس درجہ کانتہ اور دشمنی رکھتے ہیں۔ گمراہ گروں کا یہی دو غلط پن ہے جس کے باعث ہر تخریب کار اور فرقہ ساز اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتا رہا ہے۔ اس حقیقت کو خود جناب مودودی صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

”یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ براہی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اُسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعیِ شر کو خیر خواہ کے بھیس ہی

میں آنا پڑتا ہے! ۱

خالق کائنات جل جلالہ، تو ہر عیب و نقص سے پاک ہے  
 مودودی صاحب کا خدا لیکن مودودی صاحب کا خدا شاید ایسے امور و صفات کو  
 تکلفات گردانتا ہے کہ ان سے بچنا چنداں ضروری نہیں سمجھتا۔ چنانچہ عالی جناب مودودی صاحب  
 نے سورہ بقرہ کے الفاظ اللہ یستخزیٰ بعیم کا تعلیم خود ترجمہ یوں کیا ہے:

”اللہ اُن سے مذاق کر رہا ہے!“

سورۃ التوبہ کی آیت ۷۷ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اللہ اُن مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے!“

ہی مذاق عام طور پر جھگڑے فساد کی بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر مودودی صاحب یہ  
 بھی بتا دیتے کہ جب اُن کا پروردگار اکثر اوقات منافقین پرینہ سے مذاق کرتا رہتا تھا تو  
 کبھی ہانتا پانی یا جو تم پیزارت تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اگر معمول  
 میں فرق نہ آیا ہو تو عدالتی چارہ جوئی تک نوبت بھی پہنچی ہو۔ بہر حال اچھا ہوتا کہ بین الاقوامی  
 محقق صاحب مذکورہ بالا امد پر بھی روشنی ڈال دیتے۔ جناب مودودی صاحب نے اپنے  
 خدا کی شان، خود اُس کی زبانی یوں بھی بیان کی ہے:

”کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں!“

”میری چال کا کوئی توڑ نہیں!“

”اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے!“

”یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی اُنہیں خبر نہ تھی!“

۱۔ مودودی صاحب، مولوی، تقسیم القرآن، جلد دوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶

۲۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۲۱۹

۳۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۱۰۴

۴۔ ایضاً، جلد سوم، ص ۵۸۴

۵۔ ایضاً، جلد اول، ص ۵۴

۶۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۶۱

۷۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۱۴۱

لفظ چال ذو معنی ہے۔ اس میں ناقابل اعتراض مفہوم بھی موجود ہے اور قابل اعتراض اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مودودی صاحب جیسی بین الاقوامی شخصیت کو اپنے پروردگار کے بارے میں ایسا لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جو زیادہ تر قابل اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ لفظ سَاعِنَا ہرگز ذو معنی نہیں۔ اس میں کوئی قابل اعتراض مفہوم شامل نہیں، لیکن یہودی اپنے بغض و عناد کی آگ میں جلتے ہوئے دلوں کو کسی قدر ٹھنڈک پہنچانے کی خاطر اس لفظ سے ناجائز فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے یعنی بظاہر یوں معلوم ہوتا کہ وہ سَاعِنَا یا سَأُولُ اللّٰہِ کہہ رہے ہیں لیکن حقیقت میں سَاعِنَا اور سَأَعُوْنَا وغیرہ الفاظ ادا کیا کرتے تھے۔ اللہ جل مجدہ نے یہود کی شرارت کے پیش نظر صحابہ کرام جیسی قدسی جماعت اور عشقِ مصطفیٰ کی اُن منہ بولتی تصویروں کو بھی لفظ سَاعِنَا کے استعمال سے روک دیا۔ پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب اور برگزیدہ ترین بندے کی شان میں وہ لفظ استعمال کرنے سے روک دیا جس میں کوئی قابل اعتراض معنی نہیں لیکن معاذین اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر قرین و تنقیص کا پہلو پیدا کر دیتے تھے۔ کیا وہ خدائے ذوالجلال اپنے متعلق ایسا لفظ پسند فرمائے گا، جو زیادہ تر قابل اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ ناراض ہونے کی نسبت غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ وقار کا مسئلہ بنا کر اڑھانا فضول ہے کیونکہ ایمان جیسی متاعِ سنیز کا حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا حاصلِ زندگی ہے۔

مودودی صاحب کا قلم جب اپنے پروردگار کو نظر انداز انبیائے کرام پر تیر اندازی نہیں کر سکتا تو حضرات انبیائے کرام کو اپنی تیر افگنی کا ہدف بنائے بغیر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے سیدنا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کو داغدار کرتے ہوئے یوں اپنا تحقیقی رنگ دکھایا ہے،

’بعض لوگوں نے اُس میں عزم نہ پایا کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم نے اُس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا یعنی اُس نے جو کچھ کیا، نافرمانی کے عزم کی بناء پر نہیں کیا، لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَعْنَتُہُ لَہُ عَزْمًا

عَلَى الْعِصْيَانِ كَمَا جَاءَتْهُمُ نَجْدٌ لَمْ يَجِدُوا عَزْمًا. آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کا فقدان ہے نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔

انبیائے کرام کا معصوم ہونا ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ہمیشہ اتفاق رہا ہے لیکن جن حضرات کو شیطان اپنی نیابت میں اس مقدس گروہ کے خلاف کھڑا کرنا ہے وہ اپنے ملعون قائد کی طرح علی ساز و سامان سے لیس ہو کر محسوس یا غیر محسوس طریقے پر حفاظتِ توحید یا زورِ تحقیق کا بہانہ لے کر انبیائے کرام جیسی پاکیزہ ہستیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے رکاشش! مولودودی صاحب اتنا غور فرماتے کہ وہ اس آیت میں لَمْ يَجِدُوا عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان اس مجبوری کے تحت مراد نہیں لے سکے کہ اس آیت کے الفاظ لَمْ يَجِدُوا عَزْمًا عَلَى الْعِصْيَانِ نہیں ہیں تو اسی فقدانِ عزم سے اطاعتِ حکم کا فقدان مراد لینے کیلئے کیا انہیں اس آیت میں عَلَى الطَّاعَةِ بھی لکھا ہوا نظر آگیا ہے؟ مولودودی صاحب! اگر اس آیت میں عَلَى الْعِصْيَانِ نہیں تو عَلَى الطَّاعَةِ بھی نہیں ہے، اس صورت میں غم و طلب یہ امر ہے کہ انبیائے کرام کی عصمت پر یقین رکھنے والا آخر لَمْ يَجِدُوا عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان ہی مراد لے سکتا ہے اور ایک مسلمان کی روح میں اس بات کے تصور نہایت سے کانپنے لگے گی کہ وہ انبیائے کرام جیسی مقدس ترین ہستیوں میں اطاعتِ حکم کا فقدان بتائے اور ایسی بات کی تشہیر سے تو اہل کاہر عین شواہد باکر سے گناہ آگے ملاحظہ ہو کہ بین الاقوامی مفکر صاحب نے اپنی تحقیق کے دریا بہاتے ہوئے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی عظمت کو کس طرح داغدار کرنے اور مسلمانوں کے دلوں سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے کو نکال دینے کی کوشش کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیم

لے مولودودی صاحب، مولوی، تفسیر القرآن، جلد سوم، طبع سوم ۱۹۶۹ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۳۰

نے تارے کو دیکھ کر کہا، یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انہیں اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پر ہی سہی، وہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے! اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھہرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جو یاٹے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھہرنا بسلسلہ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ کہ ٹھہراؤ سو امی واستغما می ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ ایسا ہے۔ اور تحقیق سے اُس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اٹناٹے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھہرتا رہا، وہاں وہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔

مودودی صاحب نے کتنے ہی درپیشیوں بہانوں سے یزید ہر ملی دوانی مسلمانوں کے حلق سے، اُن کا خیر خواہ بن کر، اُنارے کی کوشش کی ہے کہ واقعی ابراہیم علیہ السلام تارے، چاند اور سورج کو اپنا رب کہتے رہے اور واقعی وہ کفر و شرک کا ارتکاب نہ کیا۔ عصمت اُن کے نزدیک تک چھٹکنے سے گریز کرتی رہی، فضل خداوندی ان کی دستگیری سے قاصر ہوتا رہا لیکن انہیں کفر و شرک میں مبتلا شمار نہ کیجئے کیونکہ یہ وقتی اور عارضی بات تھی۔ وہ تجربہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، جدھر وہ جا رہے ہیں اُس سمت پر اعتبار کیجئے۔ درمیان میں سو کفر یا پانچو شرک بھی کر لیں تو اُس کا کوئی اعتبار نہ کرنا، درمیانی کفریات و شرکیات کو کفر و شرک شمار نہ کرنا۔ مودودی صاحب کو تیرا گنی میں حیرت انگیز مہارت حاصل ہے کہ ایک ہی تیر میں بے شمار شکار کر لیتے ہیں۔ ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر

پیغمبر اور اللہ جل شانہ کے خلیل کی عظمت و عصمت کو اس درجہ داغدار کرنے کی کوشش کی کہ انہیں کافر و مشرک تک بنا کر رکھ دیا، دوسری جانب ہزاروں کافروں، مشرکوں اور گمراہوں بد مذہبوں کو برأت کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ جب ان پر گرفت کی جائے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہماری فریادی منزلیں ہیں ان کا کیوں اعتبار کرتے ہو، اعتبار ہماری اُس سمت کا کرو جو ہر ہمارا منہ ہے یا ہماری آخری منزل کا اعتبار کرنا۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے پورے دین اور اُس کے جملہ احکامات کو یکسر معطل اور حرف غلط کی طرح بیکار ٹھہرانے کی یہ جسارت کس خوشی میں فرمائی ہے؟ ستم بالائے ستم تو یہ کہ حبیب پروردگار، خلاصہ کائنات، سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا،

”نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور کے ذہن میں یہ تصور تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے، بلکہ آپ سرے سے کتب آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپ نہ شعوری طور پر اس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کی باتیں ماننی چاہئیں اور نہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتب الہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفار تک سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مگر مظلوم کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اُس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضور کی زبان سے کتاب الہی کا کوئی ذکر سنا ہو یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو غلاں غلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے، لے

جہاں تک کفار تک کا ایسی بات کہ سننے سے محروم رہنے کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے لیکن فخر و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اعلان نبوت سے پہلے جاہل محض ہونے کا حکم صادر کرنے

لے مودودی صاحب، مولوی، تفسیر القرآن، جلد چہارم، طبع سوم، ۱۹۷۰ء، مطبوعہ لاہور، ص ۵۱۸

سے پہلے کاش! مودودی صاحب کا بیباک قلم ٹوٹ گیا ہوتا۔ کاش! مودودی صاحب اپنے اس سراسر غیر اسلامی عقیدے پر نظر ثانی کر کے حیاتِ مستعار کے ان آخری لمحات میں ایمان جیسی متاعِ سنیز کو حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کر لیں۔ مجلہ انبیائے کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم نے یوں اپنا زور تحقیق دکھایا ہے،

”عصمت در اصل انبیاء کے لوازم ذات ہے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی ان سے منگ ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے مجہول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں۔“

معلوم نہیں جناب مودودیت مآب کو عصمتِ انبیاء سے کیا چڑ ہے؟ کیا منصبِ نبوت سے انہیں کوئی خاص پرغاش ہے یا خود اس کے طلبگار تھے اور محروم رہنے کے باعث انبیاء کرام کی عصمت سے ہکرنے اور ان ہستیوں پر کھوپڑ بازی کی مشق فرمانے لگے ہیں؟ حفاظت تسلیم کر کے گویا انبیاء کرام کو منصبِ ولایت پر توفیق نہ سمجھ لیا لیکن فوراً ہی موصوف کا بیباک قلم جو شوخی پر آیا تو طرار سے بھرتا ہوا سارے انبیاء کرام کو عام گنہگاروں کی صف میں کھڑا کر گیا۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم۔

یہ چند جبارتیں محض اس لیے پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب جیسے دین سازوں کو اَدْبَابًا مَاتَیْنِ دُونَ اللہ بنا کر جن حضرات نے اپنے دلوں اور دماغوں پر مسلط کر رکھا ہے وہ شاید غور و فکر کو کچھ کام میں لاسکیں اور یہ سوچنے کی توفیق پاسکیں کہ شریعتِ مطہرہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور صحابہ کرام کو اس کی عملی تصویریں بنا کر اللہ کے آخری

لے مودودی صاحب، مولوی، تہنیمات جلد دوم، ص ۲۳



پنیر نے تیار کیا تھا، اُن سے تابعین نے، اُن سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اسی طرح آج تک دین پہنچا لیکن یہ کیا ستم ہے کہ پچھلوں کا سمجھا ہوا دین بیکار ہو کر رہ گیا، چودہ سو سالہ دین فہمی حرفِ غلط قرار دے دی گئی اور دین صرف مودودی صاحب کے قلم ناسخ رقم کی رطب و یابس نگارشات کا نام ہو گیا، کاش! اُن کے معتقد لوگ یہ یقین کر لیں کہ مودودی صاحب ہرگز نبی نہیں ہیں کہ اُن کی تشریح حرفِ آخر قرار پائے۔ تصریحات وہی قابلِ تسلیم ہیں جو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے غلاموں یعنی ہمارے آقاؤں سے متقول ہیں، اُن کے خلاف ہر بات محض دھوکہ اصلاح کے نام پر فساد اور مقدس اسلام کی جگہ خانہ ساز اسلام پیش کرنے کی شرمناک سازش ہے۔ (لعوذ باللہ من شرور العسنا)

صحابہ کرام پر زالی کرم نوازی جب مودودی صاحب نے انبیائے کرام تک کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بنائے بغیر نہ چھوڑا تو صحابہ کرام کو جلا کیسے نظر انداز کر سکتے تھے؟ صحابہ کرام جیسے مقدس گروہ جس کو اللہ تعالیٰ نے فِائِضِ اَمْنٍ و اِمْتِنَانٍ مَّا اَمْنْتُمْ بِہِ فَمَا کَرَمِیَارِ حَقِّ قَرَارِ دِیَا۔ جس کو فخر و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اَصْحَابِیْ کَالنَّجْوَمِ بِاَیْمِہِمَّ رَاقِدَیْمٌ رَاقِدَیْمٌ کِی سُنْدِکِ ذَرِیْعَہٗ مِیَارِ حَقِّ مَوَاطِنِ کی منادی کر دائی، انبیائے کرام کے ہوا انسانوں کے باقی ہر گروہ سے اس زالی جماعت کو متاثر قرار دیا، اسی کے بارے میں بین الاقوامی مفکر صاحب یوں اپنے تفکرات پیش کرتے ہیں:

رسول خدا کے ہوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو اُس کو اسی درجے میں رکھے۔

اب اس مقدس گروہ یعنی حضرات صحابہ کرام کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب کا

دوسرا ایسی حکم ملاحظہ فرمایا جائے،

”مبیا ری مسلمان تو دراصل اُس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں اور جن کے رگ و پے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو“ لے  
موردی صاحب کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں ایک اندیشہ تھا۔ وہ اپنے متوقع جانشینوں کو اُس کے بارے میں سمجھاتے بھی رہے۔ نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ یہ موردی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

”حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اُن کے بعد عرب کی قبائلی معصیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور اُن کے نیچے یہ اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے مکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا، ”اگر میں ان کو اپنا جانشین مقرر کروں تو وہ بنی ابن مویض (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ ہی کریں گے اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شہر شہر پر پا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے“ لے

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد واقعی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی مقرر ہوئے۔ بیعتِ عین کے بین الاقوامی محقق صاحب نے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں عمال کے سلسلے میں یوں زہر افشانی کرتے ہوئے دین و دیانت کا سیر بازار خون کیا ہے،

لے موردی صاحب: تفہیمات، ج ۱، ص ۳۱۹

لے موردی صاحب: خلافت و ملوکیت، طبع پنجم، ۱۹۷۰ء، ص ۹۸، ۹۹

اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ اُنھوں نے اپنے درپے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کیے اور اُن کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہٹا اعتراض بن کر رہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کر کے اُنھوں نے کوفہ کی گورنری اپنے ماں جاسے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیطؓ کو مقرر فرمایا اور اُس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاصؓ کو دیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبد اللہ بن عامرؓ کو اُن کی جگہ مقرر کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہؓ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اُن کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے ماموں زاد بھائی مروان بن الحکمؓ کو اُنھوں نے اپنا سیکرٹری بنا لیا، جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے در و بست پر اُس کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔

اس مزعومہ طرز عمل پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے:

”فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آسکتی تھی کہ سلاطین اولین، جنھوں نے اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے جانیں قربانی تھیں اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا، ایسے بھانڈے بھانڈے جائیں اور اُن کی جگہ یہ لوگ اُس کے سرخیل ہو جائیں۔“

اب مروان بن الحکم کے باعث خلیفہ ثالث کی دوسری جرم فردیوں سُنائی جاتی ہے:

۱۔ مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، طبع پنجم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

مردان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اُس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ لوگ حضرت عثمانؓ کے اعتماد پر یہ تو مان سکتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی سفارش قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرمایا تھا، اس لیے اُسے واپس بلا لینا قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لیے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسی معتوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اُسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے خصوصاً جبکہ اُس کا وہ معتوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعے حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔

مذکورہ دونوں امور کے بارے میں عالی جناب مورودی صاحب کی عدالت سے خلیفہ رسول کے بارے میں یہ فیصلہ سنایا گیا،

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہر حال غلط ہے، خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اُس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خارجیت کا پیداکتلم کس طرح مجرم ٹھہرانا اور اُن کے جرائم کی فہرست مرتب کرتے ہوئے انہیں باغی جتانا، اسلام سے انحراف کرنے والے باور کرانا، جو ایوں زہر افشائی کرتا ہے، حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ، جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک طرف حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ وزبیر اور دوسری طرف حضرت

لے مورودی صاحب، خلافت و ملوکیت، ص ۱۱۰، ۱۱۱

۷۱ ایضاً: ص ۱۱۶

معاویہ۔ ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالتِ قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشن آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جاسکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر چوپا ہے اور جس طرح چاہے اٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اُس کو پورا کرانے کے لیے استعمال کرے۔ یہ ایک باقاعدہ حکومت تھی جس میں ہر دعوے کے لیے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا، جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور اُن پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانتہ ہی تساہل کر رہی تھی تو بلاشبہ دوسرے لوگ اُس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے، لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کون سا طریقہ ہے اور شریعت میں کہاں اِس کی نشان دہی ہو سکتی ہے کہ آپ سرے سے اُس حکومت کو جائز حکومت ہی اُس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اِس مطالبے کے مطابق عمل درآمد نہ کر دے۔ حضرت علیؑ اگر جائز خلیفہ تھے ہی نہیں تو پھر اُن سے اِس مطالبے کے آخر معنی کیا تھے کہ وہ مجرموں کو پکڑیں اور سزا دیں، کیا وہ کوئی قبائلی سردار تھے جو کسی قانون اختیار کے بغیر جسے چاہیں پکڑ لیں اور سزا دے ڈالیں؟

اس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریقہ کاری یہ تھا کہ پہلے فریق نے بجائے اِس کے کہ وہ دینے جا کر اپنا مطالبہ پیش کرنا، جہاں لاد مجرمین اور مقتولین کے ورثاء سب موجود تھے ان عدالتی کارروائی کی جاسکتی تھی، پھر سے کاٹ دیا گیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ شریعتِ الہی تو درکنار، دنیا کے کسی آئین و قانون کی رو سے بھی اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جاسکتا۔

۱۔ موردی صاحب، خلافت و ملکیت، ص ۱۲۴۔ ۱۲۵

یہ ہے محبوبہ سید المرسلین اور مقتدر صحابہ کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم  
 ناحق رقم کی وہ شتم ظریفی جس پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ قارئین کرام کے دین و دیانت پر ان کا  
 فیصلہ چھوڑتے ہوئے محض ایسی چند عبارتوں کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ اب سیدنا امیر معاویہ  
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں موصوف کی تحقیق ملاحظہ ہو :

اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرز عمل دوسرے فریق، یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا  
 جو معاویہ بن ابی سفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے  
 خون عثمان کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھے، مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا،  
 گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لیے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں  
 کیا کہ حضرت علیؓ قائلین عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر انھیں سزا دیں، بلکہ یہ کیا کہ وہ قائلین عثمانؓ  
 کو ان کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ خود انھیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دور اسلام کی  
 نظامی حکومت کے بجائے زمانہ قبل اسلام کی قبائلی بد نظمی سے اشبہ ہے۔  
 خون عثمانؓ کے مطالبے کا حق اول تو حضرت معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ  
 کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر حضرت معاویہؓ  
 اس مطالبہ کے مجاز بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہ کہ شام کے گورنر کی  
 حیثیت میں۔ حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا، معاویہ بن ابی سفیان سے تھا  
 شام کی گورنری ان کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس  
 مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا  
 مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے انھیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ  
 پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو ان کے زیر انتظام  
 صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی، اس کی اطاعت سے انکار  
 کر دیتے اور اپنے زیر انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے  
 میں استعمال کرتے اور ٹھیکہ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ  
 قتل کے مظلوموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعی قعاض کے حوالہ کر دیا جائے

تاکہ وہ خود اُن سے بدلے لے لے

مورودی صاحب کا قلعہ صحابہ کرام کی دشمنی سے اتنا لبریز ہے کہ اُنہوں نے رواقض کی تخصیص بھی ختم کر دی۔ برگزیدہ صحابی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اُنہوں نے تاریخ کے جھوٹے اور بے سرو پا واقعات کا سہارا لے کر وہ جھوٹے الزامات عاید کیے ہیں جن کی کوئی صاحب عقل و دانش مسلمان ہرگز ہرگز جسارت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سبائی رافضی ٹولے کو تقویت پہنچانے کی غرض سے اُنہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے،

ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے تمام گورنر، خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب دشمن کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسولؐ پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور اُن کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سننے لگتے تھے کسی کے مرنے کے بعد اُس کو گالیاں دینا، خیریت اور کنار، التسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گناہ و نامعنی تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایت کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سب علیؓ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی: **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ وَالْعَدْلَ وَإِطْلَاقَ**  
**وَأَيْتَاءَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَتْلَىٰ عَنِ الصُّفَرَاءِ وَالْمُسْكِرَ وَالْبَقِيَّ يُعْطِكُمْ فَكُلُوا**  
**تَدْكُرُونَ۔** داخلہ ۱۹۰ لے

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مورودی صاحب نے دین و دیانت سے غازی جو کر یہ گناہوں کا الزام بھی عائد کیا ہے،

لے مورودی صاحب: خلافت و طوہیت، ص ۱۲۵، ۱۲۶

لے ایضاً: ص ۱۷۴

مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اُس فوج میں تقسیم ہونے چاہیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن کے لیے الگ نکال لیا جاتے، پھر باقی مالِ شرعی قاعد کے مطابق تقسیم کیا جائے؛

مردو دی صاحب کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک سنگین الزام اور پیش کیا جاتا ہے جسے اُنہوں نے مختلف کمزور تاریخی روایات کے سہارے عائد کیا ہے پتا نہ چھوٹ سکتے ہیں؛ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور اُن کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اُس کو کنگر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اُس شخص کو گرفتار کرایا اور اُس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی ویت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا، مگر میرے عمل سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔ زیاد کہ جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کے ساتھ گونے کا بھی گورنر مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لیے گونے کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اُس پر کنگر پھینکے۔ اُس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کر دیے اور کنگر پھینکنے والے تمام لوگوں کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۱۰۰ تک بیلا کی جاتی ہے) گرفتار کر اسکا اسی وقت اُن کے ہاتھ کٹوا دیے۔ کوئی متقدم اُن پر نہ چلایا گیا۔ کسی عدالت میں وہ پیش نہ کیے گئے۔ کوئی باقاعدہ

۱۰ مردو دی صاحب، اخلافت و ملکیت، ص ۴۷



قانونی شہادت اُن کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطعید کی سزا دے ڈالی جس کے لیے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ مگر دوبارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بُسر بن ابی اِرطاة نے کیے جسے حضرت معاویہؓ نے پہلے جازورین کو حضرت علیؓ کے قبضے سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لیے مامور کیا تھا۔ اُس شخص نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عدوت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی، چیخ اُٹھی کہ "مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا، اب ان بچوں کو کس لیے قتل کر رہے ہو؟" نپتے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اسے ابن اِرطاة اچھوٹے بچوں اور بڑھوں کے قتل اور بے رحمی و براہ کشتی کے بغیر قایم نہ ہو سکتی ہو اُس سے بڑی کوئی حکومت نہیں ہے۔ اس کے بعد اسی ظالم شخص کو حضرت معاویہؓ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جو اُس وقت حضرت علیؓ کے قبضے میں تھا۔ وہاں اُس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمانوں کو تین پکڑی گئی تھیں، انہیں لوٹیاں بنا لیا۔ حالانکہ شریعت میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ سادہ کاری گویا اس بات کا عملاً اعلان تھی کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے۔ اور سیاسی معاملات میں وہ شریعت کی کہی حد کے پابند نہیں ہیں۔"

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اور الزام بڑے معصومانہ انداز میں غیر خواہ اور اسلام و مسلمین بن کر عاید کیا ہے:

"سراٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بھرتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا"

لے مورودی صاحب: خلافت و طو کیت، ص ۵۷ تا ۷۱

اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔

اب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعی دور حکومت کے بارے میں سرکارِ مودودیت مآب کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔

حضرت معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالاد رکھنے اور سیاسی اغراض کے لیے شریعت کی حدیں توڑنے کی جو ابتداء ہوئی تھی، اُن کے اپنے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی۔

صحابہ کرام کے بارے میں جناب مودودی صاحب کا نظریہ دکھانے کی خاطر یہ چند عبارتیں بغیر کسی تبصرے کے پیش کر دی ہیں۔ اہل علم اور اہل دین و ایمان اُن کی ایسی دل آزار عبارتوں اور موصوف کے مخصوص نظریات سے پہلے ہی نالایں ملیں جس کے باعث ہمیں تبصرہ کرنے یا کسی تفصیل میں جانے کی چنداں حاجت نہیں۔

مودودی صاحب کے اسلام اور مسلمانوں پر احساناتِ مخصوصہ قرآن و حدیث پر مہربانیاں کی فہرست تو بہت طویل ہے، سہر دست چند نوازشات کا تذکرہ ہی ماقلاً و کفً کے تحت کیا جا رہا ہے۔ دین کا اولین ماخذ چونکہ قرآن کریم ہے اور اس کے مفہوم و مطالب سے روشناس ہونے میں ہم اکابر کی تصریحات کے محتاج ہیں کیوں کہ صاحبِ قرآن سے صحابہ کرام نے، اُن سے تابعین عظام نے، غرضیکہ اسی طرح اگلی نسل کے اہل علم پھلی نسل کے بزرگوں سے سیکھتے اور اپنے والوں کو سکھاتے آئے ہیں۔ لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کے کلامِ معجز نظام میں معنوی تحریف کا دروازہ کھولا ہو اُسے قرآن سیکھنے والوں کا رابطہ اکابر سے توڑنا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ وہ اپنے مقصد میں ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اور ہرگز اپنی ذات کو فخر اکابر نہیں منوا سکتا اور نہ مرجعِ خلافت میں سکتا ہے۔ مودودی صاحب کا فہم ہمیشہ دور کی کوڑی لاتا ہے اور زیرک راستے ہیں کہ نہ ہر بھی ایسی سفیٹی گولیوں کی شکل میں کھلاتے ہیں:

۱۔ مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ۱۷۷

۲۔ ایضاً: ص ۱۷۹

ع کہ ہو نچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نچیری

اندرونی زہر سے ہلے نخرِ حضراتِ بیرونی پاشنی پر ایسے مست ہوتے ہیں کہ اُن کی زہریلی اور  
ہلک گولیاں کھانے کے لیے دیوانہ وار پھرنے لگتے ہیں۔ بزرگانِ دین جنہوں نے بلا واسطہ یا  
بلا واسطہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلامی تعلیمات حاصل کیں اُن سے مسلمانوں کا  
رابطہ توڑنے کی مودودی صاحب یوں تلقین فرماتے ہیں:

”قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پڑانے ذخیروں سے  
نہیں، اُن کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہئیں جو قرآن و سنت کے مغز کو  
پاچکے ہوں۔“

دوسرے مقام پر اسی بات کو بیان کرتے ہوئے یوں اکابر سے بغاوت کی تلقین فرمائی ہے،  
”جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل  
دکرتے گا اسلام کی رُوح کو نہ پا سکے گا، نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا،  
وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا۔“

موصوف کس طرح مسلمانوں کو قرآن سکھانا چاہتے ہیں؟ اس امر کی وضاحت میں یوں خام فرسائی  
کی ہے:

”قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے  
جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور  
سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔“

کچھ سمجھ کر سرکارِ مودودیت مآب کے دربار سے کیا حکم ملا یہی کہ تفسیر و حدیث کے پڑانے ذخیروں  
کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے، مترجموں اور شارحوں کا محتاج نہیں رہنا چاہیے، بزرگوں نے قرآن و  
حدیث کے مغز کو پایا ہی نہیں تھا، وہ قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو سمجھے بغیر ہی بزرگ

بن بیٹے تھے، قرآن کریم کو آج حقیقت میں وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے اور وہ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر ہی ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان مودودی صاحب کی اس تلقین پر عمل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائے، پچھلے تمام بزرگوں کو مودودی صاحب کی ہدایت کے مطابق ناقابلِ اعتماد گردان کر تفسیر و حدیث کے کسی پرانے ذخیرے کو ہاتھ بھی نہ لگانے۔ حدیث تو سرے سے اُس کے ہاتھ سے گئی کہ نیا ذخیرہ ایک بھی دنیا میں موجود نہیں، اگر کوئی بوجہی تو مواد سارا پُرانے ذخیروں کا، لہذا وہ بھی ناقابلِ اعتماد، اب صرف کلامِ الہی باقی رہ گیا جو بغیر کسی ترجمے اور تفسیر کی مدد کے سمجھنا ہے، مطلب اپنے ذہن سے کشید کرنا ہے، جو بھی عرق یا جوس کی صورت میں زید و عمرو کے دماغوں سے برآمد ہو یہ مودودی صاحب کے نزدیک قابلِ اعتماد اور جو بزرگانِ دین نے صاحبِ قرآن سے مفہوم و مطالب سیکھے وہ ناقابلِ تلقین کیا مودودی صاحب کی شریعتِ محمدیہ کے علمبرداروں سے بغاوت کرنے اور مسلمانوں کو بغاوت پر ڈنکے کی چوٹ اُجھارنے کا کوئی جواب ہے؟

چلیے مودودی صاحب کی تلقین کو عملی جامہ پہنانے والے کے ہاتھ میں ایک معتزلی قرآن کریم رہ گیا، یکسے یہ بھی تو ان ناقابلِ اعتماد ہستیوں کی وساطت ہی سے ملا ہے، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی۔ وہیں حالات اس امر کا کیا ثبوت ہوگا؟ اگر آئیہ کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ ..... پڑھ کر سنائی جاتے تو یہ آیت بھی تو اسی مجموعہ کلامِ الہی کی ہے جو ناقابلِ اعتماد حضرات کی معرفت بلا ہے، لہذا اس سے استناد تو اسی صورت میں ہو سکے گا جب اس مجموعہ (قرآن کریم) کی صحت کا ان ناقابلِ یقین ہستیوں کے علاوہ کوئی دوسرا یقینی ثبوت فراہم کر دیا جائے، جو اس کی صحت پر آفتابِ نیمروز کی طرح دلالت کر رہا ہو۔ مودودی صاحب اگر ہماری جسارت کو معاف فرمائیں تو ہم یہ عرض کرنے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ موصوف نے جن ہستیوں پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا ہے وہ ان بزرگوں کو نظر انداز کر کے قرآن و حدیث کی صحت کا کوئی ایک ثبوت قبر کی کوٹھری میں چھانے تک بھی پیش نہ کر سکیں گے۔

ثانیاً: مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کیوں لکھی؟ اس پر قوم کا لاکھوں روپیہ کیوں ضائع کیا جا رہا ہے؟ تلقین تو یہ فرمائی تھی کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ براہِ راست قرآن و

سنت کا علم حاصل کرے، کسی مترجم یا شارح کا محتاج نہ بنے، اپنے ترجمہ اور تفسیر کو پڑھنے سے مودودی صاحب مذکورہ تلقین کی روشنی میں منع کیوں نہیں فرماتے؟ منع نہ فرمانے سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ موصوف صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُمتِ محمدیہ اپنے جلیل القدر اکابر سے رابطہ ختم کر کے، یہ سمجھتے ہوئے مودودی صاحب کے قدموں سے لگ جائے کہ اگرچہ سو سالہ دور میں کسی نے حقیقت میں قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ ہستی صرف عالیجناب مودودیت مآب کی ہے۔

مثلاً: کیا ہم مودودی صاحب سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ موصوف نے جن ذخیروں سے دور رہنے کی مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے، خود زمانہ حال کے جانناز فرقہ ساز صاحب نے انہیں کیوں اکٹھا کیا ہوا ہے، ہر تہذیب کے اندر ان سے اعتقاد کس خوشی میں کیا جاتا ہے؟ یہ منکر دم شمار حذر بکنید والا معاملہ کہاں تک لائق تحسین و قابل ستائش ہے؟

رالغاً: تفسیر و حدیث کے تمام ذخائر کو ایک طرف رکھتے ہوئے مودودی صاحب کیا مسلمانوں کو بتا سکتے ہیں کہ کسی آیت کا حقیقی مفہوم متعین کرنے کی ان کے پاس کسوں کی کیا ہے؟ کیا اس طرح ہر شخص آیات قرآنیہ کے مفہوم و مطالب وہی نہ بتا لے پھرے گا چھ اُکس کے دماغ نے درست قرار دے لیا ہے جبکہ ایسے ہی دوسرے محقق کے نزدیک وہ بالکل غلط ہی ہو سکتا ہے اس حالت میں یہ فیصلہ کرنا کہ دونوں میں سے کس کی بات درست ہے؟ آخر اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا؟ کیا اس طرح ایسا ہر شخص ایک فرقہ زہین جائے گا اور یہ اُمتِ محمدیہ میں ایک زبردست فتنے کا دروازہ تو نہیں کھولا جا رہا؟ کیا اس صورت میں ایسے تمام محققین آپس میں دست و گریباں نہ ہوتے رہیں گے؟ کیا وہ رات دن مسلمانوں میں سر پھول نکالتے رہیں گے؟ کاش! مودودی صاحب اپنے ان نظریات کی مضرت کو محسوس کر کے آئندہ ملتِ اسلامیہ کے افراد کو فتنہ باز و فتنہ ساز بننے کی دعوت نہ دیں بلکہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی تلقین فرمایا کریں، جس کا تعین اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے ذریعے فرمایا گیا ہے۔

کھنے کو ان سے کہہ رہا ہوں حالِ دل مگر

دُربے کہ شانِ ناز پہ شکوہ گراں نہ ہو

ملتِ اسلامیہ جو پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجہ تلے دبی ہوئی تھی۔ ہر فرقہ اہل حق  
فرقہ سازی سے برسریکا رہتا، اس حالت میں موصوف نے اُمتِ محمدیہ پر کرمِ بالائے کرم  
کرتے ہوئے اُمتِ محمدیہ کو جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک تازہ فرقہ اور مرحمت فرما دیا۔ اس  
فرقے کی معجونِ مرکب کے سارے اجزاء وہابیت ہی کے جراثیم پر مشتمل ہیں لیکن اُسے مودودی صاحب  
نے اپنے انا کے قوام میں گوندھ کر تیار کیا ہے۔ سیاسی جماعت کے بطور یہ فرقہ منظرِ عام پر  
آیا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر گیا۔ مودودیت زدہ حضرات کی  
نظر میں اپنے پیشوا عالیجناب مودودی صاحب کا انا اتنا بلند و بالا ہے کہ ایسے حضرات ہر  
بزرگ پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ صحابہ کرام کو ہدفِ تنقید بنا ہوا خندہ پیشانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ مودودی  
صاحب کا قلم انبیائے کرام کی عصمت اور سید الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی عظمت کو  
واغدار کرنا چلا جائے تو ان کی پیشانی پر نل یا زبان پر ایک حرفِ شکایت تک نہیں آتا بلکہ مرحبا  
اور زندہ باد کے نعرے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن مودودی صاحب پر اگر کوئی تنقید  
کرے یا کسی طرح موصوف کا نام الف کے تلے آئے تو یہ حرکت مودودی صاحب اینڈ کمپنی  
کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے کیونکہ مودودی صاحب کو تو انبیائے کرام جیسے مقررین  
بانگاہِ الہیہ پر تنقید کرنے کا پرمٹ ملا ہوا ہے، وہ اس حرکتِ قبیحہ کا پیدائشی حق رکھتے ہیں لیکن  
کسی دوسرے کو بانیِ جماعتِ اسلامی کی کسی کو ہمالیہ سے بھی وزنی غلطی کو غلطی کہنے کا حق  
دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ یہی تو وہ افسوسناک صورت ہے جسے قرآن کریم میں  
اَتَّخَذُوا اٰخْبَارَهُمْ وَهُمْ هٰبِئَاتُهُمْ اَسْرَابًا بِاٰتِنِ دُوْنِ اللّٰهِ مَطْهَرًا يٰۤاٰلِیٰہِہٖہٗ۔ یہی ہے  
جماعتِ اسلامی کے سومنات کا وہ سب سے بڑا بُت جس کی پورے اہتمام سے پوجا پاٹ کا  
انتظام کیا ہوا ہے۔ اس جماعت کا ہر فرد اپنے اُس چلتے پھرتے بُت کے آگے جھکنا ہی  
ذریعہ نجات جانتے اور مسلمانوں کو بھی اس راستے پر گامزن ہونے کی دعوت دینے میں  
شبانہ روز مصروف رہتے ہیں۔

وہابیہ کے سابق دونوں فرقے (اہلحدیث و دیوبندی) یہی سلوک مولوی محمد اسماعیل دہلوی  
کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک راہِ ہدایت اور ذریعہ نجات یہی ہے، جس پر

گامزن ہونے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا اور اُس صراطِ مستقیم کا تعین فرماتے ہوئے کثرت سے یوں دُعا مانگنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا: **إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**۔ یعنی انعام یافتہ حضرات کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جو انبیاء، صدیق، شہداء اور صالحین میں، لیکن وہابیہ کی دونوں اولین جماعتوں نے تو اس فرمانِ الہی کو یوں بدلا ہوا ہے کہ **صِرَاطَ الَّذِينَ كَانُوا عَلَىٰ سَبِيلِ الْكُفْرِ** اور جماعتِ اسلامی کے قبیلے میں اس آیت کو یہ کوٹا بے صورت دی ہوئی ہے کہ **صِرَاطَ الَّذِينَ كَانُوا عَلَىٰ سَبِيلِ الْكُفْرِ**۔ اللہ تعالیٰ جلد مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

وہابیہ کی اولین جماعت کی عبرتناک ناکامی کے بعد برٹش گورنمنٹ نے کتابِ وہابیت کا دوسرا ایڈیشن دیوبندی جماعت کی صورت میں شائع کیا یہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو گمراہ کرنے کی خاطر سنی حنفی بن کر سامنے آئے۔ بعض غیر ضروری مسائل میں عوام الناس کو اصلاحی رنگ دکھایا اور اس طرح اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش میں معروف و سہے۔ خاطر خواہ کامیابی یوں بھی حاصل نہ ہوئی۔ ایک مرحلے پر انگریزی حکومت نے مولوی محمد الیاس کا مذہبی دیوبندی سے علاقہ میوات میں پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر تبلیغ کر داتی۔ رفتہ رفتہ تبلیغی سلسلہ دیوبندیت کا حصہ بن گیا۔ اب یہ جبال پورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ حضرات سروں پر بسترا ٹھاسنے کی مسجدوں میں ڈیڑھے بجائے برسے عام بل جاتے ہیں۔ یہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو اپنے جبال میں گرفتار کرنے، اپنا ساتھی بنا سنے محمد رسول اللہ کی اُمت کے زمرے سے نکال کر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں میں شامل کرنے کی خاطر تالیفِ قلوب کے ہر ساز و سامان سے لیس ہو کر آتے ہیں۔ دراز ریش، گٹھے ننگے، ہاتھ میں تسبیح، خاموشی کے مجھے، زبانوں پر ذکرِ الہی، نگاہیں نیچی، ایک امیر کے تابع، کوئی سخت کلائی سے پیش آتے تب بھی حقہ نزدیک نہیں آتے دیتے، عقیدہ پوچھو تو برگز نہیں بتاتے، کسی اختلافی مسئلے پر بولنا ان کے مشن سے خارج، ابتدائی مرحلہ کلہ اور نماز کی تلقین ہے، اگلی بات مسجد میں اہلسنت کو بلا کر انھیں مولوی محمد زکریا کا مذہبی دیوبندی کا تبلیغی نصاب سننا اور اس کے بعد اپنے جبال میں پھنسنے والوں سے چلت پھرت کے یہ تین، سات، دس یا اکتالیس دن وقف کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگانا اور خوشامد تک کرنا۔ اس عیاری کے باعث دیوبندی جماعت

گمراہ گری میں اتنی کامیابی ہوئی ہے جتنی ان کے علماء صدیوں میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔  
تبلیغی سسٹم کی کامیابی کو دیکھ کر مودودی صاحب نے سیاست کا جال بچھایا، اسلامی نوعے  
لگاتے، مسلمان لیڈروں کی بعض غلط حرکات اور کوتاہیوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سیاسی موضوعات  
کے ساتھ دینی عقاید و مسائل میں کتابیں لکھ کر اپنے جال میں پھنسنے والوں کے سامنے مقابلہ اپنالٹھ پچھ  
رکھا، ہر بڑی سے بڑی ہستی میں کیڑے دکھا کر اپنی پاکبازی کا لوہا متوایا۔ اپنوں کے ذہنوں میں  
بٹھادیا کہ ہر بڑی سے بڑی ہستی کم و بیش گناہ میں ضرور ملوث ہوئی، غلطی کر گئی، لہذا اُس پر  
تنقید کرنا بھی عیب نہیں بلکہ حقیقتِ نفسِ الامری کا اظہار ہے۔ اپنی ذات کو ہر غلطی سے مبرا اور تنقید  
سے بالاتر دکھایا، لہذا جماعتِ اسلامی کا کوئی فرد مودودی صاحب پر تنقید قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔  
غرضیکہ وہابی جس رنگ میں بھی مسلمانوں کے سامنے آئے ملتِ اسلامیہ کی بدخواہی ان کی  
منزلِ مقصود رہی۔ رہنمائی کے مجلس میں رہزنی ہی کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ہر وہابی جماعت کا  
مشن مسلمانوں کے ہاتھوں سے اللہ کی رشتی کو پھڑانا اور انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا گستاخ  
بن کر ان کی متاعِ ایمانی کو لوٹنا ہے۔ ان کی غایت درجہ کوشش یہی رہی ہے کہ مسلمانوں کا رخ  
حرم سے پھیر کر لندن، نیومنت، نجد اور واشنگٹن کی جانب پھیر دیا جائے۔ مسلمانانِ عالم  
کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب وہابیت کا ظہور ہے۔ خلافت سے لے کر  
ہر ملک کی اسلامی حکومت تک، جسے بھی غیر مسلم طاقتوں نے تاراج کیا، اُس کی تہہ میں وہابیوں  
کی فتنہ ستانی اور اسلام دشمنی کا رفرما ضرور رہی ہے۔ رانجیوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے دست  
بازوین کر مسلمانوں کے مفادات پر کلدی ضربیں لگائیں اور ملتِ اسلامیہ کے لیے مارا آستیں  
نماہت ہوتے۔ مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کروانے کے بعد ان کے خرم اتحاد میں آگ لگانے  
میں مصروف رہے اور کبھی مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دیا۔ خود فتنوں کا دروازہ کھولنا اور خود  
اُسے بند کرنے کے لیے، مجاہد و مصلح کہلانے کی خاطر ہم چلانا ان کی تکلیف رہی ہے تاکہ جو لے جائے  
مسلمان انہیں مصلح، ریفارمر اور ملتِ اسلامیہ کے ہمدرد جان کر ان کے پیچھے لگ جائیں اور اس  
طرح قبی و عدت کا جنازہ نکل جائے۔ دوسرے گمراہ فرقے جلد مٹ جایا کرتے تھے لیکن یہ وہابیت کا  
فتنہ غیر مسلم طاقتوں کی بدولت دو سو سال سے پھلتا چھولتا اور اپنی جڑیں وسیع کرتا ہی جا رہا ہے۔



مُخْبِرٌ صَادِقٌ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَّاجٌ كَأَيْهِ بِمَجِيئِهِ خَاصَّةً بِنَايَا تَحَاكُمُ يَقْتُلُونَ أَهْلَ الْإِسْلَامِ  
وَيَبْذُرُونَ أَهْلَ الْأَوْشَاقِ - اللهُ تَعَالَى مُسْلِمَانِ كَوْرَانِ كِي شَرِپَسِنْدِي اورد فتنہ انگیزی سے  
محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)

## ۵۔ باقی نچریت کے کارنامے

گاندھی نے ایک جانب انڈین نیشنل کانگریس بنا کر برٹش گورنمنٹ کے ہندوؤں کے  
بارے میں جو شکوک و شبہات تھے اُنھیں دور کرنا شروع کیا اور حکومت کی حمایت کا دم بھرنا  
کانگریسی لیڈروں کا شمار بنا دیا اور دوسری طرف ہندو قوم کے سامنے ایسے اصول رکھے کہ چند  
ہی سالوں میں دولت، تعلیم، خوشحالی اور ظاہری عزت ہندوؤں کے پاس جمع ہونی شروع  
ہوگئی۔ ہندو قوم ہر لحاظ سے اتنی مضبوط و مستحکم ہوگئی کہ وہ جب چاہتے تو حکومت وقت کی پولیس  
ہلا کر رکھ دیتے اور انگریز کی حکومت نہ ہوتی تو مسلمانوں کو علی الاعلان کچا چبا جاتے، کیونکہ حکومت  
کا مشینری کے بیشتر گل پُرزے ہندو تھے۔

اس صورت حال کے انتہائی تیرہ پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے پچھتے  
سر سید احمد خاں صاحب کو چن لیا، مسلمان قوم کو انگریزوں کے قریب لانے کی تلقین کی، تاکہ  
شابقہ اور موجودہ حاکم قوموں کے درمیان جو منالرت پیدا ہو چکی تھی وہ دور ہو جائے۔ یہ اسی صورت  
میں ممکن تھا کہ ملت اسلامیہ کو غیرت آتی سے عاری کر کے ایچنگلو انڈین مسلمان بنا دیا جائے، اُن  
کا رخ حرم سے لندن کی جانب پھیر دیا جائے نیز انگریزوں اور مسلمانوں میں مین ٹوشدم تو  
میں شدید والا معاملہ ہو۔ ایک انگریز اور مسلمان میں ماسوائے اسی کے اور کوئی فرق نہ ہو کہ  
وہ خود کو عیسائی اور یہ مسلمان کہتا رہے۔ سر سید احمد خاں صاحب اس بات پر آمادہ ہو گئے اور  
اُنھوں نے ایک جانب مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لانے کی کوشش شروع کر دی تو  
دوسری طرف اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

اسلام ہی ایک سچا دین ہے اور اس کے علاوہ جتنے بھی مذاہب ہیں سب جھوٹے اور  
باطل ہیں۔ اسلام ایسا کامل اور مکمل دین ہے جس میں کسی غیر اسلامی نظریئے کو شامل کرنے کی

تعلماً گنجائش نہیں ہے۔ جھوٹے مذاہب میں سے ایک مذہب والا اگر دوسرا مذہب اختیار کر لے یا دوسرے مذہب کے قریب ہو جائے تو اُس کا اُسی طرح کچھ نہیں بگڑتا جس طرح ایک نجاست میں دوسری طاوینتے سے پلیدی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اسلام میں باطل مذاہب کا ایک نظریہ شامل کر لینے سے وہی نتیجہ سامنے آتا ہے جو دوسرے کسی بھروسے ہوئے ٹیب میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈالنے سے برآمد ہوتا ہے کہ سارا دودھ پلید اور ناقابل استعمال۔ اسی طرح کسی مسلمان کھلانے والے کا ایک غیر اسلامی نظریہ اختیار کر لینا اُس کے اسلامی دعوے کو غلط بنا دیتا ہے اور شریعتِ مطہرہ ایسے کسی بھی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کی رو اور نہیں ہے۔

گاندھی اگر اپنی قوم کو انگریزوں اور عیسائیت کے قریب لے گیا تو اس سے ہندوؤں کی بد مذہبی میں کیا فرق آیا؛ لیکن عیسائیت کے نزدیک جانے والے مسلمانوں کے پتلے کیا رہ گیا؛ دین و ایمان سے ہاتھ دھونے کے بعد اگر دولت و وجاہت ہاتھ آتی تو یہ دنیاوی زینتِ آخرت میں کس کام آتے گی جبکہ ایمان عیسیٰ متلحٰ سنیز ہی گنوا دی جس پر اُخروی نجات کا وارو دار ہے۔

سر سید احمد خاں صاحب نے مسلمانوں کو لٹری گورنمنٹ کے قدموں میں جھکانے کی جو کوشش کی اُس کے بارے میں موصوف اور اُن کے حامیوں کے چند بیانات و بابہ چہارم میں پیش کیے جائیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ یہ ساری صرف نیرپلو اچھا لگنا ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو عیسائیت کے نزدیک جانے نیر اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی کہاں تک کوشش کی؛ ہمارے مذکورہ بالا خیالات کو سر سید احمد خاں صاحب کے ہستی راست یعنی خواجہ الطاف حسین صاحب عالی پانی پتی کے مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے:

سر سید نے غدر، ہمارے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبودی کے لیے ضروری سمجھا تھا، اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا ضروری تھا۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موائست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں

برابر سرگرم رہے مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے ان کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی صاحب بیہ فرمانے لگیں کہ مذکورہ بیان سے مغربی تعلیم کا حصول اور انگریزوں سے میل جول کی کوشش تو ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن اسے عیسائیت کے قریب لے جانا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ سرسید احمد خاں صاحب نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی، جس میں آیات قرآنیہ کے مفہوم و مطالب ساری اُمت محمدیہ کے برعکس اور ہی کچھ بتائے ہیں۔ حالی صاحب اس تفسیر کی توصیف میں یوں رقمطراز ہیں:

”الحمد للہ اس حق گو تفسیر کی بدولت روحانی مملکت بیاریوں کو آج غسلِ صحت ملا۔ مسلمانوں کے پاک دلوں میں دو گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کچھے میں بتاں۔ اب ان کا ایک بیک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے ہم اس احسان کے بدلے اپنی کمالی کی بڑتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرے کا معاوضہ ہو گا۔“

سرسید احمد خاں صاحب نے بائبل کی تفسیر بھی لکھی اور عیسائی حضرات کو اطمینان دلاتے ہوئے اپنا مسلح نظریوں بیان کیا:

”یقیناً میں بھی بائبل کا اٹھاسی طرف دار اور متقی ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنز و کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصوں میں، جب ان کا موقع آئے، جواب دونوں بات

مذکورہ تفسیر کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالی سننا چاہتے تھے تاثرات یوں سپردِ قلم کیے تھے: ”یہ تفسیر جو بائبل کو بجاتے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجبِ تعظیم بیان کرتی ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے، اس قابل ہے کہ

لے الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۲۰۱

لے ایضاً: ص ۶۰۰

لے ایضاً: ص ۱۷۲

اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہرزبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو گیا کہ مسلمانوں کے واسطے سے اس سے مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں جس نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے ہیں۔

جناب عالی صاحب کے آخری الفاظ بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہ گیا کہ مسلمانوں کو ایمان سے محروم کر کے نیم عیسائی بنانے کی یہ ایک پراسرار سازش تھی جس کا جال برٹش گورنمنٹ نے پھیلا یا اور سرسید احمد خاں صاحب نے حکومت کے اس منصوبے کو کامیابی سے ہٹا کر کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ موصوف نے اسی منصوبے کے تحت پورے دین میں ترمیم کی اور حکومت کے اشارے پر ایسا اسلام مرتب کیا، جس کے پروکار اور ایک کھلے غیر مسلم میں ماسوائے مسلم اور غیر مسلم کہلانے کے اور کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ سرسید احمد خاں صاحب نے مقدس اسلام میں جو کتر بیونت کی اس کا خلاصہ جناب عالی پانی پتی نے یوں پیش کیا ہے:

۱۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔

۲۔ قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔

۳۔ تقلید واجب نہیں ہے۔

۴۔ قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا

اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورہ بقرہ کی اس آیت سے کہ

ما ننسخ من آية او ننسخها۔ قرآن کی کسی آیت کا نسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد

نہیں ہے بلکہ اس کا بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد

۵۔ قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدیل واقع نہیں ہوا۔ وہ جس طرح اور جس قدر کمال

ہوا تھا اسی قدر زمانہ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن دو آیتوں سے زیادتی یا کمی

یا تغیر و تبدیل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا توارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب

موضوع، وہ مغتری ہیں۔

لے عالی پانی پتی، حیات جاوید، ص ۱۷۲

- ۶۔ صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو، جب تک اصولِ علمِ حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے، قابلِ وثوق نہیں سمجھنا چاہیے۔
- ۷۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے، بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امارہ یا قوتِ بہمیہ ہے، وہ مراد ہے۔
- ۸۔ طیبور منخنتہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو، مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے۔
- ۹۔ چونکہ خبر واحد میں احتمالِ صدق و کذب باقی رہتا ہے، اس لیے جو اعتراض اخبارِ احاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں، اسلام اُن کا جواب دہ نہیں ہے۔
- ۱۰۔ سوا اُن کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ، انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم من دیارکم و ظاہروا علی اخرجکم ان تووہم۔ تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے۔
- ۱۱۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں حریتِ عقلی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریتِ منوی ہوئی ہے، مگر اسی کے ساتھ اُن کا اول سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے۔
- ۱۲۔ ہر شخص اُن مسائل میں جو قرآن یا حدیثِ صحیح میں منصوص نہیں ہیں، آپ اپنا مجتہد ہے۔
- ۱۳۔ حضرت ہاجرہ جو اسمعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیون بادشاہِ مصر کی بیٹی تھیں۔ رقیون نے اُن کو صرف تربیت کیے حضرت سارہ کے ساتھ کر دیا تھا۔
- ۱۴۔ وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبیہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔
- ۱۵۔ قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا، جیسا کہ مشکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے، مقصدِ شارع کے برخلاف ہے، کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے، اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ آنحضرتؐ مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضبِ اکبر کر دیتے فرماتے کہ، اَبْهَذَا اَمْ تَسْتَدَامُّ بِهَذَا

اُتْرِ سَلْتُ۔

۱۶۔ موراج اور شق صدر دونوں رُویا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں، کیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور کیا مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک۔

۱۷۔ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فرد تر مخلوقات موجود ہے اسی طرح اُس سے بالاتر مخلوقات، جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو، لیکن ملائکہ یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے مختلف قوی اپنی قدرتِ کاملہ سے مادے میں ودیعت کیے ہیں جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع و امثال ذالک، اُنہیں کو ملائکہ یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعے کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرائے میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے، اُس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔

۱۹۔ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔

۲۰۔ قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے حوالہ ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۱۔ آیه، الذین اتینہم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناہم۔ میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے، وہ جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں، آنحضرت کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویل قبلہ کے معاملے کی طرف پھرتی ہے، جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ آیت میراث سے وصیت کا حکم، جو آیت وصیت میں والدین اور دیگر ورثاء کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا۔ پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے۔

۲۳۔ جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیه، وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علماء فدیہ کی

اجازت کو خاص کر معتز لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں مگر رسید کے نزدیک یہ حکم عموماً ان سب لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڑھے ہوں اور خواہ جوان۔ لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے ان کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۲۴۔ جس ربیع یعنی سو کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے، اس سے اسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں باری تھا اور جن کی مثال ہمارے ملک کے سو خواروں اور ریشیوں میں، جن کا پیشہ سو خوار ہی ہے، پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے اس منافع کی عزت جو پرامیٹری نروں پر یا جانا ہے ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے سوا کسی گورنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے، اس کو سو پورہ روپیہ دینا یا کسی جماعت کا رفاہ عام کے کام کے لیے چند جمع کرنے، اس روپیہ کا ٹوہ میں لگانا اور اس کے منافع سے رفاہ عام کے کام کرنا، یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔

۲۵۔ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہو۔

۲۶۔ شہداد کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ لکن کو کہو وہ زندہ ہیں فلاں سے ان کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابل تقلید پھوڑنا مراد ہے، دیکھو کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور ثقلی نندوں سے کھلاستہ پیتے ہیں۔

۲۷۔ صبر کا لفظ قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے جس سے فی الواقع کوئی جگہ مثل زندہ یا شکر یا تری یا قرآن کے علاوہ نہیں ہے بلکہ یہ محض استعمال ہے کہ جس طرح تری کا آواز پر شکر ہے جیسے ہم اس طرح خدا کی مشیت اور ارادے سے اجب و حشر واقع ہو گئے۔

۲۸۔ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے افعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہے اس سے وہ سب بطریق مجاز و استعمال و تشبیہ کے بیان ہوئے اور اس طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ بھی سب مجاز پر مشتمل ہے نہ حقیقت پر۔

۲۹۔ قرآن میں جہاں کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے، اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ

خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلقِ زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ۔ کیونکہ شارع کا مقصد حقائقِ اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہے بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہنشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے۔

۳۰۔ قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں بریاں اور بد اخلاقیوں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلہ سے، کسی کو پتھریوں اور دیگر وحشتوں کے مستط کرنے سے اور کسی کو کسی یا عدد کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک مادے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب ہوتے ہیں اور انہیں کرامت کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبور ہوئے ہیں اگر وہ خیالات معاصدِ نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ انہیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں۔

۳۱۔ خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں، نہ ان ظاہری آنکھوں سے لیکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے۔

۳۲۔ قرآن مجید میں جو جنگ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے اُن کڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا۔

۳۳۔ صناعتِ باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات اور نہ لاعین ولا غیر، جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے۔

۳۴۔ حضرت عیسیٰ کا بن پاپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔  
۳۵۔ کوئی امر عادتِ الہی اور قانونِ طبیعی کے خلاف نہیں وقوع میں نہیں آتا۔



۳۶۔ قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ تم کو اس کتاب کے میں عنید اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ۔ اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں، یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صوفیوں، بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

۳۷۔ نبوت کا گھڑی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اَلنَّبِيُّ نَبِيٌّ وَ لَوْ كَانَ فِي بَطْنِ امْتَا۔ وہ ماں کے پیٹ سے ہی ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قوی فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں، اسی طرح مکمل نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقصد ہوتا ہے اور جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے جو وحی اس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایسی یا مقصد و یعنی فرشتہ کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اس کے دل سے اُٹھتی ہے اور اسی پر گرتی ہے۔

۳۸۔ قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ثابت نہیں ہوتا۔

۳۹۔ انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، ان میں جس قدر باتیں بظاہر قانون فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہل اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے ان کے معانی ایسے بیان کیے ہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہیں۔

۴۰۔ طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اسی قوم اور اسی ملک میں محدود تھا، جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے۔

۴۱۔ حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارہ کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادتاً اولاد کا

ہونا غیر ممکن ہے۔ لہ

نوٹ، اس سے بھی بڑھ کر سر سید احمد خاں صاحب نے چند مسائل و نظریات کے ذریعے شریعت محمدیہ کو غتر بود کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ مسلمان اپنی ایمان جیسی متاع عزیز کو گنوا کر صرف اینگلو انڈین مسلمان بن جائیں۔ چنانچہ موصوف نے اُمت محمدیہ سے ایسے جتنے نظریات میں اختلاف کیا اُن کا خلاصہ حالی پانی پتی کے لفظوں میں گزشتہ ترتیب کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

۴۲۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے اور آیہ من و خدا جو سورہ محمد میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

۴۳۔ دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے الدعاء هو العبادۃ، پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس کا مطلب جس کے لیے دعا کی جاتی ہے، حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں، وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں۔

۴۴۔ آیت یا آیات پینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جا بجا آتے ہیں اُن سے وہ احکام یا مواظب و نواظب مراد ہیں، جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، ان کے معجزات، جیسا کہ علما نے اسلام نے بیان کیا ہے۔

۴۵۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ تم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا، یہ دونوں قول غلط ہیں بلکہ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں وما قتلوه وما صلبوه کے الفاظ واقع ہوئے ہیں، جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود تھی، وہ واقع نہیں ہوئی۔

۴۶۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکے گا، تو اُس کو ایک سے زیادہ

لہ عالی پانی پتی: حیات جاوید، ص ۶۰۴ تا ۶۱۰

جو روکی اجازت نہیں ہے۔

۴۷۔ سارق کے لیے قلع ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو قہماً اس کو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقوفہ بر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دی جاتی۔

۴۸۔ قرآن میں جن اور اجتناب کے الفاظ سے چھپے ہوئے پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں، نہ کہ وہ وہی مخلوق جو دیو اور جوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔

۴۹۔ سورہ فیل میں جن الفاظ سے اصحاب فیل پر ابابیل کا نکرہاں پھینکا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چمک سے استعارہ ہے، جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چمک عرب میں اسی سال نمودار ہوا جبکہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔

۵۰۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیائے سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات نظر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے یدریضا، عیسا کا اترنا، بن جانا، فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر بجلی کا ہونا، گوسالہ سادری

کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، متق و مسلوی کا اترنا، عیسیٰ کا گوارہ میں بولنا، نقل طبر، انڈوں اور

گوزیوں کو چمکا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مادہ کا نزول وغیرہ وغیرہ ان کی تشبیہ میں جو کچھ

سر سید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔

۵۱۔ قرآن مجید میں وہ طرح کا کلام لیا جاتا ہے ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ جیسے جو

کلام غیر مقصود ہے اس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً

کفار کے رحمت الہی سے محروم ہوتے کہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: **وَأَقْتَمُوا أَسْمَاءَ**

**أَبْوَابِ السَّمَاءِ** چونکہ اصل مقصود ان کے حرمان کا بیان ہے اور اس کو اس پر اسے میں

بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر

کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں، استدلال نہ ہو سکے گا۔

۵۲۔ شریعت اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں، ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی۔

جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں، جن میں حکم ایسا نہیں کہ قانون

فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے  
 نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں۔ پس ان کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانون فطرت  
 کے مطابق ہیں یا نہیں۔ لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے عملاً دونوں کا درجہ  
 برابر ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توحید الی اللہ ہے، باقی جس قدر احکام اس سے  
 متعلق ہیں مثل وضو و قیام و قعود و رکوع و سجود اور استہمال قبلہ وغیرہ یہ سب اس کے  
 محافظ ہیں بعد ہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توحید  
 الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔ لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجالانا  
 ضروری ہے۔

شہریت ملہر کو انگریز بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بازیچہ اطفال بنا کر یوں پیداوی  
 سے پامال کرنا جس شخص نے اپنا شعار بنا لیا اور مسلمانوں کو علی الاعلان ایسا ہی مسلم نام عیسائی  
 بننے کی دعوت دیتا رہا، پہلے تو یہی تھا کہ اسلام کی حقانیت پر یقین رکھنے والے اس سے  
 کٹاؤں کش رہتے اور اکثر حضرات نے ایسا ہی کیا لیکن برٹش گورنمنٹ کے چٹاپوں نے اس  
 دشمن دین و ایمان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے شروع کر دیے۔ چنانچہ خواجہ  
 اطفال حسین حالی نے لکھا ہے:

سرسید احمد خاں کے جہاں سے پر اور جہت سے اجناسا ہے ہیں، انہیں میں سے  
 ایک بہت بڑا احسان ہے جس سے ہمیں ملے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ  
 چھوڑ گئے ہیں، جس سے ہرگز ہم اپنی موجودہ حالت کے مطابق کوئی نمونہ قوم کی

تاریخ میں نہیں پاتے۔  
 خدا کا شکر ہے کہ سرسید احمد خاں صاحب کا جاری کردہ پیمبری فرقہ کبھی کا اپنی موت مر چکا ہے  
 لیکن اس کے ذہریے اثرات تاحال مسلمانوں کے خرمی دین و ایمان کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔

لے عالی پانی پتی: حیات جاوید، ص ۶۱ تا ۶۲

لے ایضاً: ص ۶۲

زیادہ تر اس نحوست کا شکار سکولوں اور کالوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا ہے اور دوسری جانب پرویزیت وہی سرسید احمد خاں کی صدائے بازگشت بنی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

سرسید احمد خاں بھی وہابی تھے۔ مولوی ملوک علی صاحب کی سرکردگی میں جو دہلی کالج سے حکومت اپنے مقصد کے لوگوں کی کھیپ تیار کر رہی تھی آنجناب بھی ان میں سے ایک تھے۔ دیوبندی اور نیچری فرقوں کا بیک وقت دیوبند اور علی گڑھ سے ظہور ہوا تھا۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں، اسی طرح ہر تخریب کار کی تصویر کے دونوں رخ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک جانب سے وہ بد صورت معلوم ہوتا ہے تو دوسری جانب سے حسین و جمیل۔ رادھر سے دیکھیں تو تخریب کار نظر آئے گا اور دوسری طرف سے مصلح و ریفارمر۔ اس سمت سے مکمل بدخواہ نظر آتا ہے تو اُدھر سے خیر خواہ۔ یہ دو ظلم پن ہی ایسے حضرات کو حتمی مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ان کا مقصد تخریب کاری اور اہل دین کی بدخواہی ہوتا ہے تاکہ کسی سے منہ مانگا انعام پاسکیں، لیکن جب اہل علم و دانش ان کی حرکتوں سے آگاہ ہو کر باز پرس کرتے اور عوام الناس کو ان کے شر سے محفوظ رہنے کی ہدایت کرتے ہیں، تو ایسے حضرات اپنی ذوقی تصویر کا دوسرا رخ سامنے کر دیتے ہیں کہ دیکھیے صاحب اِنَّ مَعَكُمْ طَرَانِمًا نَحْنُ مُصَلِّحُونَ ۝ لیکن علمائے کرام ان کے دعوے میں آنے والے کہاں؟ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ تھے بائسنس میں وہی پڑانے بہرو پیے آ رہے ہیں جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلَا اِنَّكُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَ لٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہمیشہ علمائے اہلسنت و جماعت سے وابستہ رہیں اور اسی دین و مذہب کو اپنا مقصد حیات بنائے رکھیں جس پر اللہ تعالیٰ کے جملہ مقبول بندے چل کر وہ نون جہانوں کی کامیابی حاصل کر گئے اور جی کا نام آج تک مطلق خدا کی زبانوں پر بصد عزت و احترام آتا ہے اور ہر صاحب عقل و دانش ان کی عقیدت کا دم بھرنے پر مجبور ہے۔ ان حضرات کے راستے کے علاوہ جو کسی اور راستے پر چلنے کی تلقین کرے یا اہلسنت و جماعت کے مذہب کو یا اُس کے بعض عقاید و نظریات کو اپنی تحقیق کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے عقلی ڈھکوسلوں کو قرآن و حدیث کا حاصل اور شریعت مظہرہ کا منشا بتائے وہ رہبر کے بھیس میں رہزن ہے۔ ایسے

جلد حضرات سے مسلمانوں کو ہر وقت خیر و ابرار رہنا چاہیے۔ یعنی: ۵  
 بخوبی جانچ کر لے جنس کی بازار ہستی میں  
 فریب ان جو فروشوں سے نہ کھا گندم نمائی کا

## ۶۔ بانی خاکسار پارٹی کے کارنامے

جناب عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء) اس تحریک کے بانی تھے۔  
 شروع میں خاکسار پارٹی ایک سیاسی جماعت کے بطور نمودار ہوئی۔ پیلچہ اُن کا علامتی نشان تھا۔  
 بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ان کا نصب العین ہے لیکن  
 حقیقت میں یہ بھی برٹش گورنمنٹ کی ایک پراسرار اور خوشنما چال تھی۔ مشرقی صاحب کے بارے  
 میں پیر زادہ بہاء الحق قاسمی امرت سہری نے مؤخر خلافت قاہرہ کے پیش نظر لکھا تھا:

”ناہنہاد مؤخر خلافت قاہرہ ممبر منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء میں جب ملحد عنایت اللہ  
 مشرقی ہندی مسلمانوں کا رر ساختہ نمائندہ بن کر شریک ہوا تو ہندوستان  
 اور ترکی و مصری اخبارات نے مشرقی کو برطانوی جاسوس قرار دیا۔ چنانچہ  
 عدنامہ ’زمیندار‘ لاہور نے، جو آجکل اپنی مخصوص مصلحتوں کے ماتحت اسی  
 جاسوس کی تحریک خاکساری کا بہت بڑا حامی ہے، ۴ جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت  
 کے صفحہ ۱ پر اخبار البلاغ مصر مجریہ ۵ جون ۱۹۲۶ء کے ایک مقالہ کا ترجمہ شایع  
 کیا، جس میں ترکی کے مشہور اخبار وقت کے حوالہ سے مشرقی کو برطانوی  
 جاسوس کہا گیا تھا۔ اس پر خود مدیر زمیندار نے جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت  
 کے صفحہ ۱ پر لکھا ہے:

”ہم نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ بعض حلقوں میں یہ شبہ کیا جا رہا ہے  
 کہ مشرقی صاحب کی حیثیت طوطی پس آئینہ کی ہے اور اُن کی یہ نقل و حرکت  
 اپنے استاذ ازل کے ایما و اشارہ کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے لکھا تھا  
 کہ اگر یہ شبہ غلط اور بے بنیاد ہے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ بے تعلق کا اعلان



(اطاعتِ نبوی) جسے وہ اطاعت (سیاسی) مراد ہے جس کے متعلق بالشاذ  
 رو برو ہو کر مسلمانوں کو تسلیم کر لینے کا، آپ حکم فرمایا کرتے تھے اور اہل حق و وقت  
 اطاعتِ رسول کا سوا اسے اس کے کوئی مطلب نہیں کہ اپنے امیر کی اطاعت کی  
 جانتے (یعنی مشرقی تمہارا امیر ہے اس کی اطاعت کرو) صفحہ ۷۲ میں بھی یہ  
 مضمون ہے۔

نیز ص ۷۱ میں ایک اور بات لکھی ہے (جسے مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے) کہ  
 مومن صالح صرف یورپین عیسائی ہیں اور یہی فلاح یافتہ ہیں۔ پھر ص ۷۲ میں لکھا ہے  
 کہ اہل یورپ ہی صرف قرآن ماننے والے ہیں کیونکہ وہی لوگ اسے سمجھتے ہیں اور وہی  
 اس پر عمل کر رہے ہیں۔ صفحہ ۷۹، ۸۰، ۸۱ پر بھی یہی مضمون ہے نیز اپنی تفسیر  
 کے صفحہ ۱۲۱ اور ۱۲۹ پر لکھا ہے کہ طر اطا مستقیم صرف دنیا میں غلبہ اور حکومت اور  
 سلطنت کا نام ہے اور انگریز ہی اس وقت (طرا) مستقیم پڑھنے کے حکم پر  
 عمل پیرا ہیں (انجلاوت اس کے) سلطان گمراہ اور مظلوم علیہم اور مخالفین ہیں  
 صفحہ ۱۲۳ میں لکھا ہے کہ مذہبِ اسلامی کی پیردہی کرنا شرک ہے صفحہ ۱۲۴  
 میں لکھا ہے کہ مظلوم علیہم اور مخالفین وہ مسلمان ہیں جن کو زمین کا ایک ٹکڑا بھی  
 نصیب نہیں ہو سکتا۔ صفحہ ۱۲۹ میں جو چیزنا ہے (جن کا مقرر خاکہ یہ ہے) کہ تارا  
 روزہ، رکوہ، حج اور کلمہ شہادت است غیرہ کے لیے صرف شناخت کا نشان ہیں  
 جن کے بغیر شناخت ہو سکتی ہے، در پیر پیرس اور اصل اسلام کی بنیاد نہیں  
 ہیں بلکہ اور دوسرے احکام ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے (مشرقی نسخے اس  
 مقام پر ان کا ذکر کیا ہے) اور اس کے بعد صفحہ ۱۳۰ میں مسلمانوں کی نماز  
 اور دیگر عبادات پر مذاق اڑایا ہے۔ صفحہ ۱۳۵ میں ائمہ مجتہدین پر پھینکی بارانی ہے۔  
 صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۷ میں لکھا ہے کہ ملائکہ (کیا ہیں) وہی فطری طاقتیں  
 (جن پر دنیا قائم ہے اور) دنیا میں (مہر جگہ موجود ہیں) اور اس وقت یہی  
 طاقتیں (بصورت ملائکہ) یورپین انگریزوں کو (بصورت آدم) سجدہ کر رہی ہیں



اور شیطان سے مراد وہ حیوانی طاقت ہے (جو انسان میں کھانے پینے کے لیے موجود ہے۔ اس کے بعد) اُس نے (اپنی خرافات کو جاری رکھتے ہوئے) وہ خیالات پیش کیے ہیں جن کو کوئی ایمان دار بلکہ عقلمند بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ پھر تعجب ہے (کہ ان خرافات کے متعلق زور سے لکھا ہے) کہ یہی حق اور اصل اسلام ہیں اور اُس کا دعویٰ ہے کہ میرے سوا قرآن مجید کو (کسی نے آج تک نہیں سمجھا) اور اُسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس وقت (مسلمانوں کا) امیر (اور خلیفۃ المؤمنین) میں ہی ہوں۔ پھر حکم دیتا ہے کہ زکوٰۃ مجھے دیا کرو (اور یہ بھی کہتا ہے کہ) میرا بیت المال ہی صدقات کا صحیح مصرف ہے۔

(علاوہ بریں) اپنے ہفتہ وار اخبار الاصلاح میں اور اپنے رسالہ مولوی کا غلط مذہب میں اور اپنی اردو تفسیر میں اور اپنی کتاب اشارات میں وہ خیالات پیش کیے ہیں جو امت محمدیہ کے عقاید کو پاش پاش اور اجماع امت کی بوٹی بوٹی کرتے ہیں اور قرآن مجید کی قطعی آیات اور متواتر احادیث نبویہ کے صریح خلاف ہیں۔ دیکھو مقدمہ عربیہ صفحات مندرجہ ذیل..... (تاکہ) اُس کی خرافات کا آئینہ (آپ کے سامنے آجائے)۔ غرضیکہ اُس کے یہ چند خیالات مشتتہ نہ از خردوارے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اور عجیب خرافات یہ بھی ہے اور بڑے دعوے سے کہتا ہے کہ علمائے اذہر نے مجھے علامہ کا خطاب دیا ہے اور میری تفسیر کی نہایت تعریف کی ہے۔ اب ان خرافات کے متعلق جناب کی رائے کیا ہے؟ اور اُس تفسیر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ جو ان امور پر مشتمل ہے اور اس شخص کے متعلق اور اس کے فہم قرآن کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟ (اور یہ بھی بتایا جائے کہ) کیا واقعی علمائے اذہر نے اس کتاب کو دیکھ کر اسے علامہ کا خطاب دیا ہے؟

المستفتی: عبد اللہ شاہ مبلغ اسلام پشاور۔ ہندوستان

لے سہاء الحق قاسمی، مولوی: ضرب کاری بر مذہب خاکساری، ص ۲ تا ۶

اس استفتاء کا جامعہ ازہر کے بزرگ ترین عالم علامہ یوسف الدجوی الماکی نے عربی میں طویل جواب لکھا اور ان کے فتوے پر چھ علمائے کرام کی تصدیق مع مہر و دستخط ہیں، جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

- ۱- شیخ مصطفیٰ حامی، شاہی خطیب، مسجد زینبی، قاہرہ، مصر۔
- ۲- علامہ محمد حبیب اللہ الشنقیطی، نائب پرنسپل، جامعہ ازہر، مصر۔
- ۳- شیخ عبد الرحمن الجزیری الشافعی، استاد جامعہ ازہر، مصر۔
- ۴- علامہ محمد زامہ الکوثری مشیخۃ الاسلام، وکیل دولت عثمانیہ، ترکیہ۔
- ۵- شیخ مصطفیٰ صبری، سابق شیخ الاسلام، ترکی۔
- ۶- شیخ خلیل خالدی حنفی، خطیب بیت المقدس۔

ذکورہ فتوے کے بارے میں ابوالغیا جناب پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی نے مشرقی حساب کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض ضروری امور کی وضاحت بھی فرمائی ہے۔ موصوف کا وہ بیان قارئین کرام کی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پیش خدمت ہے:

عنایت اللہ مشرقی کے پیش نظر کوئی تعمیری پروگرام قطعاً نہیں۔ اُس کا مقصد وحید تخریب اور صرف تخریب ہے۔ علمائے کرام کا وجود باوجود اُس کے تخریبی پروگرام کی تکمیل میں چونکہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے وہ ان حضرات کے خلاف مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے اعدائے اسلام کی طرح منافرت پھیلا کر اپنے ملحدانہ مقاصد کی اشاعت کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے ہندوستان کے علمائے کرام کو گالیاں دیں کیونکہ یہی حضرات اُس کے فریب سے آگاہ تھے اور انہیں سے اُس کو واسطہ پڑنا تھا۔ لیکن مصر کے علماء کی نسبت اُس نے یہ بے بنیاد اور سراسر جھوٹا پروپیگنڈا کیا کہ وہ تذکرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور کہ وہ صاحب تذکرہ کو علامہ کا خطاب دے چکے ہیں.....

مجلسِ علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت کی طرف سے جامعہ کے

فاضل مدرس مولانا سید محمد یوسف شاہ بنوری پشاور کی بعض ضخیم کتب فقہ کی طباعت اور علمائے ممالک اسلامیہ کے ساتھ روابط پیدا کرنے کے سلسلے میں مصر، بیت المقدس، ترکی اور حجاز مقدس کو تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں کے علمائے سامنے مشرقی کی کتاب تذکرہ کو پیش کر کے ان سے اس کی نسبت فتویٰ طلب کیا۔ چنانچہ مصر کے جلیل القدر عالم علامہ یوسف دعویٰ مالکی نے فتویٰ لکھا، جس کی تائید و تصدیق مصر کے دوسرے علمائے علاوہ ترکی، بیت المقدس اور مصر کے علمائے کرام نے فرمائی۔ یہ فتویٰ حکومت مصر کے سرکاری رسالہ الاسلام مجریہ، ارشوال، ۱۳۵۱ھ مطابق ۹ دسمبر ۱۹۳۸ء میں چھپ چکا ہے، اس لیے کسی اَلذَّالِخِصَام کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ یہ فتویٰ جعلی ہے۔ یہ فتویٰ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مشرقی کی تکفیر اور اس کے عقائد کی تغلیط و تکذیب میں علمائے ہند مشرور نہیں ہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے علماء بھی اس باب میں علمائے ہند کے ہمتوا ہیں۔ اب اس کے بعد مشرقی کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کہ یا تو اس کے عقائد کو تسلیم کر لیا جائے جو اس کے عقائد کفریہ سے توبہ کرے یا حسب عادت پوری دلیوری سے علمائے ہند کی طرح علمائے مصر وغیرہ کو بھی بے لطف گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے۔

دوسرا استفسار علمائے محکمہ مذہبی خدمت میں پیش کیا گیا، جس کا اہم مسجد حرام، جناب ابوالسبح نے ۱۳۵۸ھ کو جواب تحریر فرمایا اور اپنے فتویٰ میں مشرقی صاحب کے متعلق لکھا کہ، لا شک فی کفرہ و جہلہ۔ اس فتویٰ کی مسجد حرام کے ایک مدرس محمد سلطان انصاری نے تصدیق کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ انگریز بہادر کے چلے جانے کے بعد یہ فرقہ پاکستان کے اندر ایک عضو معطل بن گیا اور عالیجناب مشرقی صاحب کی وفات کے ساتھ

۱۰۰ بھاد الحق قاسمی، ضرب کاری بر مذہب خاکساری، ص ۲

ہی خاکساری فتنہ بھی زندہ درگور ہو گیا تھا۔ اب چند خاکساروں کا وجود اگر کہیں نظر آجاتا ہے تو ایسے حضرات اُس آندھی کے تنگے یا فتنے کی اُس گرم بازاری کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر فتنہ باز و فرقہ ساز کے شر سے بچاتے۔ آمین۔ برٹش گورنمنٹ نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام دشمنی سے سرشار ہو کر، مسلمانوں کے زمین دین و ایمان میں آگ لگانے کی خاطر، مصلحین کے روپ میں کیسے کیسے تخریب کار کھڑے کیے، جو قوم کے سامنے بڑے خوشنما رنگوں میں آئے اور رہبری کے بھیس میں رہزنی کرتے رہے۔ اتنے لصوص دین کھڑے کر دینے پر بھی انگریزی حکومت کی اسلام دشمنی کا جذبہ سرد ہونے میں نہ آیا۔ مسلمانوں کے خلاف اُس کی بھڑکی ہوئی آتشِ خبیثہ و غضب بھجنے کا نام نہ لیتی تھی جسے دیکھ کر ہر صاحبِ نظر بے ساختہ کہہ اٹھتا تھا: سہ

بسل تو ہوتے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر

ٹھنڈا میرے قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

## ۷۔ بانی پرویزیت مسٹر غلام احمد پرویز کی تخریب کاریاں

یہ فرقہ سرستید احمد خاں صاحب کی نیچریت کے سہارے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس معجون کے اکثر اجزاء نیچریت کے ہیں، کچھ کمیونزم اور سوشلزم کا مواد ہے اور باقی مسٹر غلام احمد پرویز صاحب کی اپنی ایجادات۔ مذکورہ تینوں قسم کے اجزاء سے پرویزیت کی معجون مرکب تیار کی گئی ہے۔ پرویزی حضرات خود کو اہل قرآن کہتے، قرآنِ فہمی کے ٹھیکیدار بتاتے ہیں اور پرویز صاحب کے متعلق اُن کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ رسولِ خدا کے بعد اگر اسلام کے اس چودہ سو سالہ دور میں کسی نے قرآنِ کریم کی آیات کے حقیقی مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ صرف اور صرف مسٹر غلام احمد پرویز کی ذات ہے۔ مسلمانوں میں یہ فرقہ پرویزی، منکرینِ حدیث اور منکرینِ سنت کے ناموں سے متعارف ہے۔ پرویز صاحب اور پرویزی حضرات کو اپنے اہل قرآن ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ مسلمانوں کے قرآنِ مجید کی تعلیمات سے دُور اور نفور رہنے کا دُھول بجاتے رہتے ہیں لیکن حقیقت میں اسلام کا دعویٰ کرتے ہوتے پرویز صاحب سے بڑا شاید ہی قرآنِ کریم کا کوئی مخالف پیدا ہوا ہو۔ موصوف نے قرآنی تعلیمات اور اُس کے مفہوم و مطالب میں تعریف کا وہ

دروازہ کھولا ہے کہ احکام خداوندی کی حقیقی صورت کو مسخ کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے۔ اگر یہ قرآن بھی ہے تو قرآن دشمنی کس درخت کا نام ہوگا؟ جو کسی کی کوئی لنگڑی عقل آیات قرآن کا مطلب بتاتی جانتے اگر آیات کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا تو اس طرح ہزاروں افراد، ہزاروں قسم کے مفہوم و مطالب نہ بتاتے پھریں گے؛ کیا وہ سب تعبیریں حقیقی اور درست ہوں گی؟ اگر نہیں اور ہرگز درست شمار نہیں ہوں گی تو مسٹر پرویز صاحب کی عقل کو قرآن کریم کی کون سی آیت نے حقانیت کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے کہ موصوف جو مفہوم بتاتے جاتیں آیات قرآن کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا؟ آخر قرآن کریم نے یہ کس جگہ تصریح کی ہے کہ کلام الہی کا حقیقی ترجمان مسٹر غلام احمد پرویز ہے؟ جو کچھ پرویز صاحب قرآن کریم کے بارے میں فرماتیں وہ درست اور دوسرے جو چاہیں کہتے پھریں وہ سب کچھ غلط۔ کیا پرویزی حضرات مسلمانوں کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ کلام الہی میں یہ تصریح کس جگہ فرمائی گئی ہے؟ پرویز صاحب مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ باور کرانے پر مہر ہیں کہ،

دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوام سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآن کریم میں مکمل کیا اور حضور نے اس قرآن کو امت کو دے دیا، لیکن حضور کی تشریف براری کے تھوڑے عرصے بعد مفاد پرست قوموں نے ابھرنے شروع کر دیا۔ اس دین پہلے طو کیت آئی، اس کے ساتھ سرمایہ داری اور ان دونوں نے اپنے تعلق کے لیے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا، جس طرح سابقہ انبیائے کرام کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا۔

اگر بقول مسٹر پرویز صاحب سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دین کو ان کے اصطلاحی مذہب میں بدل دیا گیا تو اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ اُس وقت سے لے کر اب تک جتنے مسلمان کہلانے والے ہوئے ہیں وہ سب بے دین اور

اسلام کے دشمن تھے۔ ان حالات میں کئی سوالات پر وہ ذہن پر اُبھرتے ہیں، لیکن ذہنی سوال میں جیت ہیں:

۱۔ جب اس تقریباً تیرہ سو سال کے درمیانی عرصے میں سارے مسلمان دین کے بدخواہ اور بے تبدیل کرنے والے ہی پیدا ہوتے رہے اور انہیں روکنے ٹوکنے والی کوئی طاقت نہ تھی تو انہوں نے قرآن کریم کے اندر معنوی تحریف کے ساتھ لفظی تحریف کرنے میں کون سی کسر اٹھا رکھی ہوگی؟ دریں حالات پرویز صاحب موجودہ قرآن کی صحت لفظی کس طرح ثابت کریں گے؟ اگر وہ آیت کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ..... سے استدلال کریں تو بالکل بے معنی بات ہوگی کہ اُمّتِ مروجہ کو اُمّتِ ملعونہ ٹھہرا دینے کے سبب تو قرآن کریم کی صحت مشکوک ہوئی کہ جو کتاب دشمنوں بدخواہوں کے ہاتھوں ملی، اُس کی صحت اور کمی بیشی سے محفوظ رہنے پر کس طرح یقین کیا جائے؟ ایسی حالت میں قرآن مجید کی کسی آیت یا آیات سے کس طرح استدلال صحیح ہو سکے گا کیونکہ یہ شک اپنی جگہ قائم رہے گا کہ ممکن ہے اس آیت یا ان آیات کو ان بدخواہوں نے گھڑ کر اپنی جانب سے شامل کر دیا ہو۔ لہذا ان حالات میں صداقت اُس وقت ثابت ہو سکے گی جب کوئی خارجی دلیل قائم کر دی جائے۔ لیکن پرویز صاحب مرتے دم تک ایسی دلیل قائم نہیں کر سکیں گے۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

۲۔ جب دین کو مٹنے اور مذہب کو اُس کی جگہ سنبھالنے اتنی صدیاں گزر گئیں۔ دین کو جاننے والا، اُس پر چلنے والا کوئی نہ رہا تو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد پرویز صاحب کو کس ذریعے سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کی یہ شکل و صورت بتائی تھی اور قرآنی آیات کے مفہوم و مطالب یہی بتائے تھے جو مسٹر پرویز بتا رہے ہیں؟ اگر پرویز صاحب اس کا کوئی تسلی بخش جواب مرحمت فرمادیں تو ان کا مسلمان قوم پر بڑا رحم ہوگا۔

پرویز صاحب نے قرآنی تعلیمات کو اس بیدردی سے بدلا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس آخری پیغام کو بچوں کا کھلونا یا مادری کا تماشنا بنا کر رکھ دیا ہے۔ بغیر کسی دلیل و حجت کے جو مذہب میں آتا ہے آیات کا مطلب بتاتے چلے جاتے ہیں۔ اسلام کی غربت اور کم پیری کا اس سے

المناک دور اور کب آیا ہوگا کہ قرآن کریم کے ایسے اشد ترین مخالف اور کلامِ الہی کے بے باک  
مخرف سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں کہ یہ کیا ضبط بے ربط پھیلا یا جا رہا ہے؟ کیوں رہنمائی کا  
دعویٰ کر کے رہزنی کی خوشیاں پھا رہے ہو؛ ہاتے غربتِ اسلام! داتے قرآنِ کریم تیری  
کس میپرسی! موصوف نے اپنی مخصوص ترنگ میں اللہ رب العزت کے اسم ذات اللہ کا  
مطلب یہ بتایا ہے:

”اس اہم نکتہ کو اگر تم سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود  
نکل آئے گا، یعنی ان مقامات میں اللہ کی جگہ اللہ کا قانون کہ دیا کرو، تو بات بالکل  
واضح ہو جائے گی، مثلاً اللہ یُحییٰ وَیُمیتُ..... اللہ کا قانون مارتا ہے  
اور وہی زندہ رکھتا ہے“ لے

اب حکمِ خداوندی اطیعوا اللہ یعنی احکاماتِ الہیہ کی اطاعت کا پرویزی مفہوم ملاحظہ ہو،  
”چونکہ خدا عبارت ہے اُن صفاتِ عالیہ سے جسے انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے۔  
اس لیے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی... اطاعت ہے  
کسی غیر کی نہیں“ لے

یہی پرویز صاحب کے لفظوں میں ایمان بالغیب کا جدید مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیجئے،  
”مستقبل کے مفاد کے لیے وہی کوشش کرے گا جسے اُن دیکھے نتائج پر  
پورا پورا یقین ہو۔ قرآن اسے ایمان بالغیب کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے“ لے  
موصوف نے قرآنِ کریم کو کھلونا بناتے ہوئے شرک کا مطلب یہ گھڑا ہے،  
”شرک کے معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون سامنے  
رکھے اور دوسرے دائرے میں کوئی اور“ لے

اب اسی انداز پر رئیس المحررین صاحب نے کفر کا مفہوم یہ بتایا ہے:

لے مشر پرویز: سلیم کے نام خطوط، ص ۱۵۶ لے مشر پرویز: معراج انسانیت، ص ۲۲۰  
لے مشر پرویز: اسباب زوالِ امت، ص ۲۰ لے ایضاً، ص ۵۲

”وہ لوگ جو اپنے حال ہی کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ اُنہیں۔۔۔۔۔ کفار کا گروہ کہ لیجیے یعنی مستقبل سے بکیر منکرہ“ ۱

قیامت یعنی روزِ جزا اور سزا موصوف جیسے مادیت پرست کی نگاہوں میں کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:

”ظہورِ نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے، اس لیے قرآن نے واضح کر دیا کہ یوم الذین۔۔۔۔۔ اس وقت بھی موجود ہے۔ یہ تو ملا کی قیامت ہے جس کا اس زندگی سے کوئی تعلق نہیں“ ۲

حیات بعد الممات کو مسٹر پرویز صاحب نے کس چابک دستی سے اسی زندگی میں سمویا ہے، موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”حیات بعد الممات ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جوڑے رواں ہے۔۔۔۔۔ اس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی میں انقطاع کا سوال پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کا موصوف کو مرتے دم بخوبی علم ہو جائے گا، اگرچہ آج گمراہ گری کا بازار گرم رکھتے ہوئے وہ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، کون زبان پکڑ سکتا ہے؟ میزان پر اعمال ٹٹلنے کی تصریح موصوف نے یوں کی ہے:

”قرآنی تصور کی رُو سے ہماری زندگی کی ایک ایک سالس میں حساب اور کتاب پوشیدہ ہے۔ کارگاہِ حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے، جس میں ہمارے اعمال ٹٹلتے ہیں اور ہمیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں“ ۳

متاعِ دُنیا اور متاعِ آخرت کا مفہوم جو پرویز صاحب نے گھڑا ہے، اُسے موصوف کی زبانی ہی سماعت فرمایا جاتے:

”قرآن۔۔۔۔۔ کہ نہ، ک متاعِ دُنیا سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لیے تلاش کرتا ہے اور سامانِ آخرت سے مقصود ہوتا ہے“

۱۔ مسٹر پرویز، بابِ زوالِ اُمت، ص ۲۱

۲۔ مسٹر پرویز، اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۲۹

۳۔ مسٹر پرویز، فردوسِ گم گشتہ، ص ۳۲۹



وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے۔" لہ

اب تقویٰ اور پرہیزگاری کا مطلب . جو پرویز صاحب کا خانہ ساز ہے ، ملاحظہ فرمایا جائے :

"قانونِ فطرت .... سے ہم آہنگی کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ - وقتی کے

معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اس طرح گھسنا کہ وہ ہموار ہو جائیں۔" لہ

زمین و آسمان یعنی ارض و سماء کا پرویز صاحب نے کیا معنی گھڑا ہے ، یہ بھی موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمائیے :

"قرآن نے معاشی زندگی کے لیے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے اور

آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں سماء کی اصطلاح سے تعبیر

کیا ہے۔" لہ

اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز قائم کرنے کے بارے میں موصوف کیا تحقیق جھاڑتے ہیں ، ان کے

ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو :

"مجوسیوں کے ہاں پرستش کی شکل کو نماز کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ انہی کا ہے ....

لذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی۔" لہ

"اب اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ کا صحیح مفہوم سامنے آ سکتا ہے ، یعنی

معاشرے میں ایسی فضا پیدا کر دی جاسے جس سے ہر فرد معاشرہ ان مستقل اقدار

کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، اپنے دل کی مرضی اور

روح کی خوشنودی سے دوسروں کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی فکر

میں لگ جاتے۔ قرآن نے اِقَامَةِ الصَّلٰوةِ کا لازمی نتیجہ یہی بتایا ہے۔" لہ

"جہنم والوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا ، جس کی وجہ سے تمہاری

لہ مشر پرویز ، اسبابِ زوالِ امت ، ص ۲۹ لہ ایضاً ، ص ۳۳

لہ ایضاً ، ص ۳۵ لہ مشر پرویز ، قرآنی فیصلے ، ص ۲۶

لہ مشر پرویز ، نظامِ ربوبیت ، ص ۱۶۰ ، ۱۶۱

یہ حالت ہوگئی؛ وہ کہیں گے ہم مصلتی نہیں بنے تھے (قَالَوَا لَمْ نَكُنْ  
 مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ ۳۳) یعنی ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہم ان لوگوں کے لیے  
 سامان پرورش نہیں فراہم کرتے تھے جو حرکت سے محروم ہو گئے تھے؛ لہٰذا  
 زکوٰۃ کا مفہوم بتاتے ہوئے موصوف نے ایک عجیب سوال بھی کر دیا ہے۔ دونوں باتیں خود  
 ان کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں:

”یہ حکم کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح اڑھائی فیصدی دو، قرآن  
 سے باہر۔ کیا۔۔۔ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا؛ لہٰذا  
 واقعی زکوٰۃ کی شرح قرآن سے باہر ہے اور اس کے بیان کر دینے سے قرآن کی ضخامت بڑھ  
 جانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا لیکن مشر پرویز نے ایمان اور توحید سے لے کر چھوٹے مسائل تک  
 قرآن کریم کی تمام اصطلاحوں کو جو من مانے مفہوم و مطالب کا جامہ پہنا دیا ہے، کیا ان کے متعلق  
 قرآن کریم کے اندر ذرا بھی کوئی اشارہ پایا جاتا ہے کہ واقعی فلاں اصطلاح کا یہی مفہوم ہے جو  
 پرویز صاحب بیان کر رہے ہیں۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اپنے بیان کردہ  
 مطالب کی تائید قرآن مجید سے ہرگز پیش نہ کر سکیں گے۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَئِن تَفْعَلُوا  
 فَالْتَقُوا النَّارَ أَلْتَقُوا وَفُودَهَا النَّاسُ وَالْمَجْبَاةَ ط اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ یہ کیا  
 قیامت ہے کہ کائنات کی سب سے بزرگ ترین ہستی، جس پر کلام الہی نازل ہوا وہ قرآن کریم  
 کی کسی اصطلاح کا مفہوم بتائیں تو پرویز صاحب کے نزدیک ناقابل قبول اور ناقابل اعتین  
 لیکن خود جو بھی انٹرنیشنل معانی گھڑ کر پیش کریں ان کی صحت و صداقت کو ایسے وثوق کے  
 ساتھ متواضعانہ کی ہم چلاتے ہیں جیسے اللہ رب العزت نے انہیں بتایا ہو کہ واقعی میری نازل کردہ  
 آیات کے حقیقی معانی یہی ہیں۔ موصوف نے کتنے دھڑکتے اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں سے  
 یہ سوال کیا ہے کہ:

”رسول اللہ سے بہتر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھتا لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن

۱۔ مشر پرویز، نظام ربوبیت، ص ۱۶۲ ۲۔ مشر پرویز، سلیم کے نام خطوط، ص ۷

کی جو تفسیر رسول اللہ نے فرمائی وہ آج ہے کہاں؟ لے

جو سوال پرویز صاحب مسلمانوں سے کر رہے ہیں اگر یہی کچھ مسلمان ان سے مطالبہ کریں کہ کیا آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ قرآنی تفسیر ہے؛ یقیناً پرویز صاحب کا جواب نفی میں ہوگا۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف آیات قرآنیہ کے جو مفہوم و مطالب بتا رہے ہیں ان کے بارے میں کیا ثبوت ہے کہ وہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ تفسیری بیانات کے بالکل مطابقت میں اور ان کے مخالف یا من گھڑت نہیں ہیں؛ موصوف نے بعض قرآنی الفاظ کے مفہوم و مطالب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”قیامت کے قرآنی مفہوم کے لیے مشعلِ راہ کی آخری جلد کا انتظار فرمائیے“

”قصہ آدم کے صحیح مفہوم کے لیے جلد دوم، باب آدم دیکھیے“ لے

”ثواب کے قرآنی مفہوم کے لیے دیکھو میرا مضمون نجات ص ۱۰۰ لے

”جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کے متعلق ... دیکھیے میرے مقالات نجات ص ۱۰۰ لے

”قرآن کے نظامِ صلوة کی تفصیل کے لیے مشعلِ راہ کی آٹھ جلد کا انتظار فرمائیے“ لے

پرویز صاحب نے مسلمانوں پر تو یہ حجت قائم کرنے کی کوشش فرمائی تھی کہ زکوٰۃ کی شرح بیان کر دینے سے کیا قرآن کا حجم بڑھ جاتا؛ مسلمان بھی ان سے یہی سوال کرتے ہیں کہ پرویز صاحب بتاتے تو یہی کہ قیامت، ثواب، جنت و دوزخ اور نظامِ صلوة وغیرہ قرآنی اصطلاحوں کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغام میں وہی کچھ بیان کر دیتا جو آپ بیان کر رہے ہیں تو کونسا حجم بڑھ جاتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیان کردہ مفہوم و مطالب قطعاً قرآن کریم میں بیان نہیں فرمائے تو آنجناب کس خوشی یا خوش فہمی میں کلامِ الہی کے اندر معنوی تحریف کر کے ادھر

لے مشعلِ پرویز، مقامِ حدیث، ص ۸

لے مشعلِ پرویز، مقامِ حدیث، ص ۸

لے ایضاً: ص ۱۰

لے ایضاً: ص ۲۸

لے ایضاً: ص ۱۱۰

لے ایضاً: ص ۱۰

غضبِ الہی خرید رہے ہیں اور ادھر جموں بھالے مسلمانوں کی بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں گمراہ کر رہے ہیں؟

اگر مسٹر پرویز کی طرح کسی سیاستدان کو تحقیق کا شوقی چراتے اور وہ قرآن دانی کا مدعی بن کر کہنے لگے کہ ایمان سے وزارت کا حصول، اقامتِ الصلوٰۃ سے پارٹی کا استحکام، ثواب سے دولت کا ملنا، جنت و دوزخ سے ہرجیت اور قیامت سے مراد وزارت سے معزول ہونا ہے۔ اسی طرح ایک امیر بنکار نے لگے کہ ایمان سے کارخانے ہونا، اقامتِ صلوٰۃ سے کوٹھیوں کا روں کا حصول، ثواب سے فارونی دولت، جنت و دوزخ سے مزدوروں کا خوش رہنا یا ہڑتال کر دینا اور قیامت کا مطلب کارخانوں کا قومی ملکیت میں چلے جانا ہے یا کوئی مزدور کہے کہ ایمان سے نوکری ملنا، اقامتِ صلوٰۃ سے مالک کا کام سے خوش ہونا، ثواب سے مزدوری کا بروقت مل جانا، جنت و دوزخ سے نوکری میں کمی بیشی اور قیامت سے مراد نوکری سے جواب مل جانا ہے تو ایسے حضرات کی زٹلوں، ٹمک بندیوں اور مسٹر پرویز کے سراسر عقلی ڈھکوسلوں میں آخر فرق کیا ہوگا؟

قرآن کریم کے مفہوم و مطالب میں مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ پرویز صاحب نے دوسرا میدانِ حدیث کی مخالفت کو بنایا، جس کے جواب میں علمائے کرام بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ تیسرا میدان تحریکِ پاکستان کا منتخب کیا ہوا ہے جس کو لے کر پاکستانی باشندوں کو مغالطے میں مبتلا کرنا سب سے موصوف کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے ایک پیروکار چودھری حبیب احمد صاحب نے بھی اپنی تصنیف تحریکِ پاکستان انڈیشنلسٹ علماء میں یہی تاثر پیش کیا ہے۔ دیندار طبقے سے اہل دین کو منفرد کرنے کی خاطر پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ:

”غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ اجاب کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز باہم گریستیزہ کار چل رہی ہے۔“

لے مسٹر پرویز: بہار نو، ص ۲۷۰

آگے موصوف نے مسلمانوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

”آپ نے غور فرمایا کہ تحریک پاکستان کی کشمکش کس طرح درحقیقت دینی و مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔ مذہبی طبقہ کی اس قدر مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی مخالفین کا یہ لشکر بھی ادھر اُمنڈ آیا۔ اب وہی کشمکش پندرہ سولہ برس سے یہاں بھی جاری ہے۔ اس طبقہ کی اگھائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پاتے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہاں مذہبی تھیاگریسی قائم ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکولر حکومت قائم ہو جائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پمستل لازم مذہبی پیشوا بیت کی تحویلا میں ہے۔

ان جبارتوں میں پرویز صاحب نے دل کھول کر دعا بدلی کی ہے نہ چدا ایک کی نشا و ہی کرتا ہوں؛

اولاً: دین اور مذہب کی من مانی تعبیریں کو کے خود کو دین کا پیر و کار اور مسلمانوں کو دین سے متنفر اور مذہب کے پرستار قرار دے دیا۔ حالانکہ نہ دین و مذہب میں کوئی تفریق، نہ پرویز صاحب کو دین سے کوئی سروکار، نہ مسلمانوں میں کوئی دین سے بیزار اور کسی دوسرے مذہب کا پیر و کار۔

ثانیاً: سب مسلمانوں کو تحریک پاکستان کا مخالف قرار دے دیا، یہ ہمالیہ پہاڑ سے بھی بڑا مغالطہ ہے۔ تحریک پاکستان کی مخالفت صرف ان علاقے کی تھی جو گاندھی کے پرستار تھے یعنی نیشنلسٹ علماء، جن میں سمیعہ المصلا سے جہد اور ۴ حزاری وغیرہ حضرات شامل تھے۔ یہ ملت اسلامیہ کے لیے مسٹر پرویز کی طرح ہمیشہ مارا آئین ہی رہے تھے۔ مسلمانوں کے سوا د اعظم یعنی اہلسنت و جماعت نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ یہی حضرات اس تحریک کا علم بلند کرنے والے اور یہی اسے ساحل مراد تک پہنچانے والے تھے، جنہیں گراہ گرو نے بریلوی فرقہ کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے حالانکہ یہ وہی قدیم جماعت ہے جسے اللہ تعالیٰ

۱۔ مسٹر پرویز، بہار نو، ص ۲۶۱

نے اپنے آخری پیغام میں جڑبُذ اللہ اور اُمتِ وسطیٰ کہا ہے اور فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس کی ما انا علیہ و اصحابی کے لفظوں سے تخصیص فرمائی اور اَتَّبِعُوا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ سے جس کی پہچان بتائی ہے۔ جس کے علی و علی اور تبلیغی و مجاہدانہ کارناموں سے دنیا جگمگا رہی ہے اور خدا کا آخری پیغام دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا اور جو ہمیشہ کفر کا غرور توڑتے آئے اور طاغوتی طاقتوں کے مقابلے پر ایسی مضبوط چٹان ثابت ہوتے رہے کہ ان کے سائے میں مارِ آستین مت ہونے والے گمراہ گروں کو بھی آرام سے بیٹھنا نصیب ہوتا رہا ورنہ دنیا کے کفر کے مقابلے پر اُلحدیت، دیوبندی، نیچری، پرویزی اور شیعہ وغیرہ حضرات نے اپنی پوری تاریخ میں کون کون سے ملکوں میں اسلام پھیلایا؟ کفر کی طاقتوں سے کتنی دفعہ لکڑی؟ جواب صفر۔ اہلسنت و جماعت کو ایک جانب رکھ دینے کے بعد باقی سارے فرقے دیکھیں کہ کافروں، غیر مسلموں کے مقابلے پر ان کی جمعیت و طاقت کیا ہے؟ کیا کافروں کے حقے میں ان کی ایک ایک بوٹی بھی آتی ہے؟ اہلسنت کا سایہ ہٹتے ہی کیا کچے نہ چپا لے جائیں گے؟

پرویز صاحب! اسی اہلسنت و جماعت کے پانچ ہزار مشایخ و علماء سنی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ اپریل میں بنارس کے مقام پر اکٹھے ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد سنی مسلمانوں کی موجودگی میں تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا تاریخی اعلان فرمایا۔ علی الاعلان کہہ دیا کہ برطانیہ کے سارے خودکاشتہ پودے یعنی تمام فرقے پاکستان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تو مذکورہ کانفرنس کے خطبہ صدارت میں متفقہ اعلان کیا گیا کہ سنی مسلمان پاکستان بنا کر رہیں گے اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک پاکستان معرض وجود میں نہ آجائے۔ سنی کہ پیر مانگی شریف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مسلمانان اہلسنت و جماعت پاکستان بنانے پر کمر بستہ نہ ہوتے تو مسٹر جناح کے ساتھ تھا کون؟ کون مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھاتا اور کہاں اس کا دفتر قائم ہوتا، بلکہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ مسٹر جناح بھی اگر مطالبہ پاکستان سے دست بردار ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں لیکن سنی مسلمان پاکستان بنا کر ہی دم لیں گے۔ غرضیکہ تمام علماء اور مشایخ نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پیرانِ عظام نے اپنے ہزاروں اور لاکھوں مریدوں کو

مطالبہ پاکستان کا منہ بولنا اشتہار بنا دیا۔ کیلئے حضرت امیر ملت، پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے چالیس لاکھ مریدوں سمیت حمایت پر کمر بستہ تھے اور تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی خاطر دن رات ایک کر دیے۔ کیا مسٹر پرویز اینڈ کمپنی ان بزرگوں میں سے کسی ایک بزرگ کے برابر پاکستان کی تحریک میں اپنا حصہ ثابت کر سکتے ہیں؟ جانے دیجئے، پاکستان کی بنیاد پر جو الیکشن ہوا اور مسلم لیگ نے سو فیصد کامیابی حاصل کی، کیا مسٹر پرویز ثابت کر سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک ممبر بھی ایسا ہے جو پرویزی حضرات کے ووٹوں سے کامیاب ہوا ہو؟ مسٹر پرویز اور پرویزی حضرات ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اہلسنت و جماعت کے مقابلہ پر پاکستان کے لیے ان کی قربانیوں کا تناسب کیا ہے؟ سوائے اس کے وہ اور کیا کارنامہ دکھائیں گے کہ نیشنلسٹ علماء کے خلاف لکھے ہوئے چند بیانات دکھادیں گے، حالانکہ وہ علماء بھی امت محمدیہ کے لیے ہمیشہ اپنی تاریخ میں پرویز صاحب کی طرح مارا آستین ہی بن کر رہے ہیں۔ اپنے چند صنمات لکھنے کی یہ قدر و قیمت اور ملت اسلامیہ کے اتنے عظیم الشان کارنامے، بے شمار جانی اور مالی قربانیوں سے کیوں آنکھیں بند بکھ و دشمن دین و ملت قرار دینے کے پابند،

شرم تم کو مگر نہیں آتی

ثالثاً: پرویزی حضرات نے کس روز انگریزوں یا ہندوؤں سے مقابلہ کیا۔ اگر آپ حضرات کی جانب سے ایسا ایک لفظ بھی منہ سے نکلتا تو اس پورے ٹولے کو برٹش گورنمنٹ یا ہندو اکثریت ایک پرکاش یا کسی مکتھی اور پتھر کے برابر بھی تو اہمیت نہ دیتی۔ لیکن یہ ٹولہ پاکستان کی تحریک اور دین کا علم بردار بنتا ہے جو دین کے ابجد سے بھی واقف نہیں اور مسلمانوں کے سوا اہل علم کو دین و دیانت سے پچھا چھڑا کر، آنکھیں بند کر کے تحریک پاکستان کا مخالف بتا رہا، کیا پرویز صاحب یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ ان سے تحریک پاکستان یا مملکت پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ دین سے بغاوت کرنے والے چند سر پھرے ملک و ملت کا کیا سجلا کر سکتے ہیں؟

رابعاً: موصوف کا لکھنا کہ: "اس طبقہ کی انتہائی کوشش ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے" ایسے عالم آشکار میں قطعاً سفید جھوٹ اور زری گپ ہے۔ مسلمان تو دل و جان سے

چاہتے ہیں کہ یہاں قرآن کریم کی حکومت ہو جائے، قرآن و سنت کا آئین رائج ہو جائے، نظام مصطفیٰ رائج ہو جائے، خلافت راشدہ کے قوانین نافذ ہو جائیں۔ اگر قرآن کی حکمرانی سے پرویز صاحب کی مراد اپنے ذاتی خیالات ہیں تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب جیسے دشمن قرآن کریم کے خیالات ملت اسلامیہ پر لاگو ہوں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ:

ع  
 این خیال است و محال است و جنوں

پرویز صاحب نے علامہ اقبال کو اپنے خیالات کا داعیِ اول، اپنی غیر اسلامی تحریک کا علمبردار وغیرہ ٹھہرا کر، ان کی عقیدت کا دامن سنبھالا ہوا ہے۔ یہ پرویز صاحب کی دھوکے بازی کا چوتھا میدان کیونکہ شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال، سنی مسلمان اور ایک عظیم مفکر تھے۔ پرویزیت سے موصوف کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کفر ذار ہند کے قلب میں بیٹھ کر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والے سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شاعر مشرق نے کہا تھا:

ع  
 چشتی نے جس چمن میں پیغامِ حق سنایا

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا تھا:

ع  
 وہ ہند میں سرمایہٴ ملت کا نگہبان

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مولانا جلال الدین رومی صاحب ثنوی کو علامہ اقبال نے اپنا پیر قرار دے کر پیر رومی اور اپنے لیے مرید ہندی کہا اور مولانا روم سے ڈاکٹر اقبال اتنے متاثر تھے کہ بعد حضرت ویاس کہا کرتے تھے:

ع  
 نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

علامہ اقبال تو بزرگانِ دین کو پیغامِ حق سنانے والے اور سرمایہٴ ملت کے نگہبان قرار دے رہے ہیں ان جیسے اور پیدا ہونے کی دعائیں کرتے تھے لیکن پرویز صاحب ایسے علامہ اقبال کے عاشق ہیں کہ علامہ کے مدد و حین کو دین کے دشمن اور مذہب کے پرستار بتا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین و دیانت نصیب فرمائے۔ (آمین)



## ۸۔ شیعہ حضرات

شیعہ فرقے کا ظہور ایک یہودی سازش ہے۔ عبد اللہ بن سبا یہودی نے ۲۵ھ میں اسلام کی عداوت سے سرشار ہو کر ازراہ منافقت مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں سے دھتکارے جانے کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وافر عقیدت کا دم بھرنے لگا۔ اس لحاظ سے شیعان علی نے سرانگھوں پر جگہ دی۔ اپنے مخصوص حلقے میں پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کا شوشہ چھوڑا اور اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب و شتم کا دروازہ کھولا۔ جب ان دونوں قسم کے خیالات بعض حضرات نے قبول کر لیے اور اس کا ایک حلقہ قائم ہو گیا تو اصحابِ ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر زبانِ طعن و راز کرنی شروع کر دی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ خلافت بلا فصل درحقیقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا، جن لوگوں نے اُنہیں اس حق سے محروم کیا وہ غاصب، اہل بیت کے دشمن اور مسلمانوں کے بدخواہ ہیں۔

اُس بد بخت عبد اللہ بن سبا کے اس پروپیگنڈے سے بعض لوگ ایسے متاثر ہوئے کہ ان ظالموں نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خون ناحق اپنے سر لے کر دایرین کی رو سیاہی خریدی۔ اس حادثہ فاجعہ سے خلافت کی آب و تاب باقی رہی اور ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ کچھ اس طرح منتشر ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے زیرک ترین اور قابلِ فخر و عظیم الشان مدبر کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکا، حتیٰ کہ ایسے ہی حالات میں ایک بد بخت سبائی ابنِ بجم کے قاتلانہ حملے سے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جنت الفردوس میں تشریف فرما ہوئے۔

عبد اللہ بن سبا کے پروپیگنڈے نے شیعانِ علی کو عجیب موڑ پر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں زبان کھولنے کا تعلق ہے تو اس کی مقتدر صحابہ کرام کیلئے اُس وقت گنجائش موجود تھی لیکن اصحابِ ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات سے بدظنی اور سب و شتم بجلا کوئی مسلمان کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ اکثر مسلمان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت و حمایت پر متفق ہیں لیکن شیعانِ علی کی مذکورہ کروت سے نالاں تھے۔ یوں خلیفہ چہارم حضرت علیؑ

شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حامیوں کو اُسے ملکار یہودی کی سازشوں نے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دیا، جس کے باعث وہ اپنے مخالفین پر جنہیں اسی سازش نے خلیفہ وقت کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا، کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ شیعیان علی کی اسی سازش سے تنگ آ کر حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسئلہ خلافت پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سمجھوتا کر لیا۔ اسی صورت حال کی بدولت شاہ گلگوں قبا، سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے خاندان سے پرشیعیان علی کے ہاتھوں میدانِ کربلا میں قیامت گزر گئی۔ یہ ہیں اس ٹولے کی اہل بیت و ائمہ اطہار سے عقیدت کے عدم نظیر کارنامے۔ اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات اُس نہج البلاغہ کتاب سے پیش کیے جاتے ہیں جو شیعوں حضرات کے نزدیک اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ ایک مکتوب گرامی میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، جس کا قارئین کی سہولت کے پیش نظر صرف ترجمہ پیش کرتا ہوں، عربی کے شائق اصل کتاب کی جانب رجوع کریں:

”میں خدا سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس گروہ سے جلدی دور کر دے۔ خدا کی قسم اگر دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے شہادت کی جانب رغبت نہ ہوتی اور اپنی جان کو جانِ آفریں کے سپرد کر دینے کے لیے ہر وقت تیار نہ رہتا، تو میری آرزو یہ ہے کہ ایک روز بھی اس گروہ کے ساتھ نہ رہوں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملوں۔“

اپنے ایک خطبے میں حضرت امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے شیعہ گروہ کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا:

خدا کی قسم جو دلوں کو مردہ کر دیتا ہے اور عقل و فہم کو کھینچ لیتا ہے، میں ان کا باطل پر اجتماع اور تمہادی حق پر اگندگی دیکھتا ہوں۔ خدا تمہیں ذلیل و رسوا کرے کہ تم اندھو تیروں کا نشانہ بن گئے۔ لوگ تمہیں غارت کرتے ہیں اور تم سے کچھ نہیں بن پڑتا، لوگ تم پر جہاد کرتے ہیں لیکن تم جہاد سے عاری ہو گئے اور خدا کی نافرمانی تمہیں خوش کرتی ہے۔ جب میں ان پر لیغا کرنے کے لیے تم سے گرمی میں کہتا ہوں تو گرمی کی شدت کا غدر پیش کر دیتے ہو اور موسم گرما نکلنے تک

لے حضرت علی، خلیفہ چہارم، نہج البلاغہ بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۲

مہلت مانگتے ہو۔ جب سردی میں تم سے جہاد کرنے کو کہتا ہوں تو سردی کی شدت کا بہانہ بنا کر سردیاں گزرنے تک کی مہلت طلب کرتے ہو۔ یہ تمہارا سردی گرمی سے بھاگنا ہے تو خدا کی راہ میں تلوار اٹھانے سے تو امکان بھر بھاگو گے۔ تم مردوں کی شکل میں نامرد، بچوں جیسی عقل والے اور زبور پہننے والی عورتوں کی مانند ہو۔ میری انتہائی کوشش یہی ہے کہ تمہاری شکل بھی نہ دیکھوں اور تم میرے لیے انجانوں کی طرح ہو جاؤ۔

اسی خطبے میں مولا مشکل کشا، شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تاثرات کا یوں بھی اظہار فرمایا،  
 تمہیں خدا ہلاک کرے بے شک تم نے میرے دل کو پیپ سے اور میرے سینے کو غصے سے بھر دیا ہے۔ تم نے مجھے پے در پے رنج و غم کے جام پلائے۔ تم نے ترکِ رفاقت اور حکمِ عدولی کے ذریعے میری تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا، یہاں تک کہ قریش یہ کہنے لگے کہ بیشک ابوطالب کا بیٹا جوی اور جاننا باز ضرور ہے لیکن فوجوں کو لڑانے کے قواعد سے نااہل ہے کہ مخالفین پر قابو پاتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت میدانِ جنگ کا بھج سے بڑھ کر آڑ سودہ کار کون ہے؟ جب میں نے عمر کی بیس منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں اُس وقت سے میدانِ ضربِ حرب میں قدم رکھا ہے حالانکہ اب میری عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ لیکن جس امیر کا حکم نہ چلے اُس کی تدابیر کیا رنگ دکھائیں؟

دوسرے خطبے میں صاحبِ ذوالفقار، شہِ دلدل سوار نے اپنے ساتھیوں کی جوانمردیوں کا تذکرہ یوں فرمایا:

”میں کہاں تک تمہاری حفاظت اس طرح کروں جیسے نازک بدن، ناکتخدا عورتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ کہاں تک تمہیں پرانے کپڑے کی طرح سنبھالوں

۱۔ حضرت علی، خلیفہ چہارم: نبی البلاغت بکوال تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۳

۲۔ ایضاً: ص ۱۸۳، ۱۸۴

جسے ایک طرف سے سیا جاتا ہے تو دوسری جانب سے پھٹ جاتا ہے۔ جب سردارانِ شام سے کوئی سردار تم پر یغادر کرتا ہے تو تم اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہو اور اپنے گھروں میں اس طرح گھس جاتے ہو جیسے گواہ اپنے سوراخ میں گھس جاتی ہے یا بجوا اپنے بھٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ ہے ان حضرات کی ائمہ اطہار سے عقیدت کہ زندگی میں تو سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت کا دم نہ بھرا، جھوٹے دعوے کر کے عقیدت کا ڈھول بجاتے رہے، وقت آنے پر انجان بن جاتے، شیعہ حضرات کی اس منافقت نے شیر خدا کو ایک دن بھی آرام سے کارِ خلافت انجام دینے کی مہلت نہ دی اور ان جھوٹے عقیدت مندوں کی دعوے بازی سے اسلام کا بڑا بطل جلیل اور خدا کا عظیم نظیر شیر، خلیفہ وقت ہونے کے باوجود اپنے ہی ایک صوبے پر تازلیت قابو نہ پاسکا۔ لیکن ان کی وفات سے لے کر آج تک اُنہیں بلا فصل خلافت دلائے اور وصی رسول بنانے کی مہم چلائے ہوئے ہیں، جیسے سب کو پیچھے دھکیل کر آج اُنہیں تختِ خلافت پر بٹھا کر ہی دم لیں گے۔ وقت گزرنے پر حمایت کی بانڈی میں ایسا اُبال اور دورِ خلافت میں حمایت وغیرت کا اس درجہ کال۔ جب حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت کرنے، جانبازی دکھانے کا وقت تھا تو روپوشی میں کاہل ہو گئے۔ شیر خدا کا وصال ہوا تو یہی حضرات اُگلی کٹا کر حمایتی شہیدوں میں شامل ہوئے۔ بعداً امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حمایت کا یقین دلا کر خلافت پر آمادہ کر لیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقابلہ کرنے ایک لشکرِ جزا نکل کھڑا ہوا۔ امام عالی مقام کے سامنے ان حمایتیوں کا دو غلہ پن اپنے اصلی رنگ روپ میں موجود تھا۔ اپنے والدِ محترم کے ساتھ ان کا سلوک دیکھ چکے تھے، لہذا ان کی حمایت پر امیر معاویہ سے صلح کرنے اور خلافت اُن کے سپرد کر دینے کو ترجیح دی۔ گویا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی جھوٹی حمایت کے دعووں کو پاتے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کی حمایت کے بلند بانگ دعاوی کو ذرا سی اہمیت

۱۔ حضرت علی، خلیفہ چہارم: بیچ البلاغت بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۵، ۱۸۶

دے دی، امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کرنے والوں کو اپنا حمایتی سمجھ لیا، تو ان  
 حمایتی حضرات کے ہاتھوں گلستانِ مرتضیٰ کے ہر گل بوٹے اور چمنستانِ زہرا کی بے کھلی کلیوں پر بھی میدان  
 کربلا میں جو قیامت گزر گئی وہ شیعانِ علی کے ماتھے پر ایسا انمٹ داغ ہے جو قیامت تک ان کے  
 ماتم کرنے، ٹسو سے بہانے اور حمایتِ اہل بیت کے فرضی ڈھول پیٹنے سے مٹ نہیں سکتا۔ دستِ مسلم  
 پر بیعت کرنے والوں کے گھروں میں امام مسلم اور ان کے بچوں کو پناہ تک نہ مل سکی، ان بے گناہوں  
 کے لاشے ان حمایتیوں کے سامنے ٹرپ ٹرپ کر ٹھنڈے ہو گئے لیکن حمایتی اس درجہ سنگدل  
 بلکہ سیاہ دل بلکہ دوستی کے پردے میں دشمنی سے بھر پور تھے کہ کسی پھوٹی آنکھ میں آنسو نہ آیا،  
 حالانکہ اب ماتم کرتے پھرتے ہیں، کسی بد بخت کی زبان سے ہمدردی کا ایک کلمہ نہ نکلا حالانکہ وقت  
 گزرنے کے بعد حمایت میں گلے چھاڑ چھاڑ کر چلاتے آرہے ہیں۔ کربلا میں قیامت گزر رہی تھی  
 لیکن حیدر کزار کا دار الخلاقہ خاموش ہی نہیں تھا بلکہ شہیدانِ کربلا کے خلاف صفت آراہ تھا۔ وقت آنے  
 پر شیعانِ علی نے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بچوں کو تہ تیغ کرنا،  
 یزید، ابن زیاد اور شمر کا ساتھ دے کر کشتِ زہرا کو پامال کرنا ہی اہل بیت کی محبت کا تقاضا سمجھا۔

بجلائے پہ بھی قصہ خمد ماضی

بجلائے نہ جائے گام سے، نہ ہم سے

شیخہ حضرات کے متقدمین و متاخرین قرآن کریم کی صحت کے منکر اور اسے

انکار قرآن مجید تعریف شدہ نسخہ باتے نیز بیاض عثمانی ٹھراتے ہیں۔ چنانچہ ان  
 حضرات کی مشہور و معروف کتاب اصول کافی، جو صحاح اربعہ میں شمار کی جاتی ہے، اُس کی یہ  
 روایت ملاحظہ ہو:

عن جابر قال سمعت ابا جعفر

يقول ما ادعى احد من الناس

انه جمع القرآن كله كما انزل الا

كذاب وما حفظه كما نزل الله

الا على ابن طالب والائمة من بعده

جابر سے روایت ہے کہ میں نے امام محمد باقر سے سنا کہ

لوگوں میں کذاب کے سوا کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ جتنا قرآن

نازل ہوا اتنا وہ سب جمع کر لیا گیا ہے۔ قرآن کو علی بن ابی طالب

اور ان کے بعد والے ائمہ کے سوا کسی نے اس طرح جمع اور محفوظ

نہیں کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا۔

جمعہ محمد بن یعقوب کلینی، اصول کافی، مطبوعہ نو کوشور، ۱۹۰۲ء، ص ۳۹

شیعہ حضرات کے نزدیک جو قرآن مکمل اور معتبر ہے اُس کی آیات کی تعداد کے بارے میں یہ روایت  
ملاحظہ ہو:

عن هشام بن سالم عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ان القرآن الذی جاء به جبرائیل علیہ السلام الی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سبعة عشر الف آية - ۱۷	ہشام بن سالم ، امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ، جس قرآن کو جبرائیل علیہ السلام ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر آئے تھے ، اُس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔
---	--

شیعہ حضرات کے بلند پایہ مفسر ، علامہ محسن کاشی نے تفسیر عیاشی کے حوالے سے تحریف قرآن کے متعلق  
لکھا ہے:

فی تفسیر العیاشی عن ابی جعفر قال لولا انه نزل فی کتاب اللہ ونقص ما خفی حقنا علی ذی حجی ولو قد قام قائمنا صدقہ القرآن وفیہ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام لو قرئ القرآن کما انزل الغینافیہ مسینا - ۱۷	تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اگر قرآن میں کمی بیشی نہ کی ہوتی تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ رہتا اور اگر ہمارے امام قائم علیہ السلام ظاہر ہو کر بولیں تو قرآن ان کی تصدیق کرے اور اسی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے کہ اگر قرآن وہ پڑھا جائے جو نازل ہوا تو اُس میں ہمارا ذکر نام بنام نہ ملے۔
---	---

مختار شیعہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے۔ چنانچہ اسی تفسیر صافی میں تصریحاً  
لکھا ہے:

اما اعتقاد مشائخنا رحمہم اللہ ہمارے مشائخ رحمہم اللہ کا اعتقاد اس بارے میں

۱۷ محمد بن یعقوب کلینی ، اصول کافی ، کتاب فضل القرآن ، ص ۶۷

۱۸ محسن کاشی ، تفسیر صافی ، ص ۱۱

فی ذالک فالظاهر من ثقہ الاسلام  
 محمد بن یعقوب الكلینی طاب ثراه  
 انه كان یعتقد التحریف والتقصا  
 فی القرآن لانه روی روایات فی  
 هذا المعنی فی کتابه الكافی  
 ولم یعرض لقدم فیها مع انه  
 ذکری اول الكتاب انه یشق  
 بما رواه فیہ وکذا لك استاذہ  
 علی بن ابراهیم القمی فان تفسیرہ  
 مملو منه ولم یغلو فیہ وکذا لك  
 الشیخ احمد بن ابی طالب  
 الطبرسی قدس سرہ  
 ایضاً نسبہم علی منوالهما  
 فی کتاب الاحتجاج - لہ

یہ ہے کہ ثقہ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی طاب ثراه  
 کی نسبت یہ واضح ہے کہ وہ قرآن میں تحریف و  
 نقصان کے قائل تھے کیونکہ انہوں نے اس  
 مضمون کی کتنی ہی روایتیں اپنی کتاب کافی میں  
 نقل کی ہیں اور ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں  
 کیا، بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں لکھ دیا کہ  
 اس کتاب میں جو حدیثیں نقل ہوں گی ہمیں ان کی  
 صحت پر وثوق ہے اور اسی طرح ان کے استاد  
 علی بن ابراہیم قمی بھی تحریف پر یقین رکھتے تھے کیونکہ  
 ان کی تفسیر تو ایسی روایتوں سے پڑ ہے اور ان  
 کو اس عقیدے میں غلو نہیں ہے اور اسی طرح  
 شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی قدس سرہ بھی  
 تحریف کے قائل تھے کیونکہ اپنی کتاب الاحتجاج میں  
 وہ بھی ان دونوں حضرات کے نقوش قدم پر  
 چلے ہیں۔

شیعہ حضرات نے تمام مسلمانوں کو غیر مسلم ٹھہرانے کی خاطر بڑے شد و دس سے یہ دعویٰ تو کر دیا کہ  
 موجودہ قرآن کریم تحریف شدہ ہے اور اپنے مقصد کی تائید میں حدیثیں بھی گھڑ کر اپنی کتابوں میں  
 شامل کر لیں لیکن اس سے شیعہ حضرات کو کون سی حقانیت کی سند مل گئی؟ اگر بقول ان کے  
 دوسروں کے پاس محرف کلام الہی ہے تو درافض کے پاس کیا ہے؟ ان کے پاس تو میرے سے  
 کچھ بھی نہیں۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے مسلمان کہنے کی بنیاد کس چیز پر ہے؟  
 ان کے دین کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں روافض کا مضحکہ خیز موقف ملاحظہ ہو:

لہ محسن کاشی: تفسیر حنفی، ص ۱۲

قال يا ابا محمد فان عندنا الجامعة وما يدريهم ما الجامعة قال قلت فذاك وما الجامعة قال صحيفه طولها سبعون ذراعاً - ۱

فرمایا: امام جعفر صادق نے، اسے ابو محمد! بیشک ہمارے پاس ایک جامعہ ہے اور وہ کیا جانیں کہ جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا، میں آپ پر قربان، ارشاد فرمائیں کہ وہ جامعہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ستر گز لمبا قرآن ہے۔

معلوم نہیں شیعہ حضرات نے اتنا لمبا چوڑا قرآن رکھا ہوا کہاں ہے؟ اُسے اٹھانا اور پڑھنا کون ہے؟ کیا یہ ایسے عالم آشکار میں سفید جھوٹ اور نری گپ نہیں؟ اسے علی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کتنا پامیسا اور کچھ؟ اگر شیعہ حضرات ایسا قرآن نہ دکھا سکیں تو ان کے دعویٰ اسلام کا ثبوت اور مسلمان کہلانے کی دلیل کیا؟ اسی طرح کا حضرات شیعہ نے ایک قرآن اور گھڑا ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:

وانا عندنا المصحف فاطمة عليها السلام وما يدريهم ما مصحف فاطمة قال مصحف فيه مثل قرآنك هذا ثلاث مرات والله ما فيه من قرآنك هذا حرف واحد - ۲

امام نے فرمایا، اور ہمارے پاس مصحفِ فاطمہ علیہا السلام ہے اور لوگ کیا جانیں کہ مصحفِ فاطمہ کیا ہے؟ فرمایا وہ ایسا مصحف (قرآن) ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے۔ خدا کی قسم، تمہارے قرآن کا اُس میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

قرآنِ کریم عربی زبان میں ہے اور عربی کے اٹھائیس حروفِ تہجی ہیں جبکہ مصحفِ فاطمہ کے اندر ان میں سے کوئی حرفِ تہجی حسبِ روایت بالا استعمال نہیں ہوا، تو اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مصحفِ فاطمہ یقیناً عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہے۔ شیعہ علماء کو چاہیے کہ وہ اپنے مذکورہ قرآنوں کی تلاوت کیا کریں اور شیعہ عوام کو اپنے علماء سے ان قرآنوں کی زیارت کا ضرور مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ دین کا ماتخذ قرآن ہے، جب قرآن سے علم بھر محروم رہے تو دین و



ایمان کیسا؟

تحریر قرآن کے بارے میں شیخہ حضرات کا تفصیلی عقیدہ مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے:

المستفاد من مجموع ہذا  
 الاخبار وغیرھا من الروایات من  
 طریق اہل البیت علیہم السلام  
 ان القرآن الذی بین اظہرنا  
 لیس بتمامہ کما انزل علی محمد  
 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بل  
 منہ ما ہو خلاف ما انزل اللہ  
 ومنہ ما ہو مفیر محرف وانہ  
 قد حذف عنہ اشیاء کثیرة منها  
 اسر علی علیہ السلام فی کثیر  
 من المواضع ومنها لفظة آل  
 محمد غیر مرة ومنها اسماء  
 المناقبین فی مواضعها ومنها  
 غیر ذلک وانہ لیس ایضاً  
 علی الترتیب المرضی عند اللہ  
 وعند رسولہ وبہ قال علی

بن عبد البر عظیم - ۱

یہ شیخہ حضرات کا قرآن کریم کے بارے میں واضح عقیدہ۔ ان حضرات کے معتمد زمرہ اکابر سے

ان تمام حدیثوں اور ان کے علاوہ جس قدر روایات  
 اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں، ان سے  
 مستفاد ہے کہ جو قرآن ہمارے سامنے موجود ہے  
 وہ سارا اُس طرح نہیں ہے جیسے حضرت محمد صلی  
 اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بلکہ اس  
 میں بعض باتیں ما انزل اللہ کے خلاف ہیں اور  
 بعض ہیں تغیر و تبدل کر دیا گیا ہے اور بے شک  
 کتنی ہی باتیں اس سے حذف کر دی گئی ہیں جیسے  
 کتنے ہی مقامات سے حضرت علی علیہ السلام کا  
 نام اور کئی جگہ سے آل محمد کا لفظ اور متعدد جگہ سے  
 مناقب کے نام اور ان کے علاوہ کئی چیزیں  
 علاوہ بریں اس کی ترتیب اللہ اور رسول کی پسند  
 ترتیب کے مطابق نہیں۔ یہی خیالات  
 علی بن ابراہیم کے ہیں۔

صرف چار حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اکابر اور اپنی جماعت کے برخلاف عقیدہ تحریریت پر  
عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابی جعفر محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی الملقب بالصدوق (المتوفی ۳۸۱ھ)

۲۔ شیخ مفید، سید مرتضیٰ، علم الہدی (المتوفی ۴۳۶ھ)

۳۔ شیخ الطائفہ، ابو جعفر محمد بن حسن بن طوسی (المتوفی ۴۶۰ھ)

۴۔ ابو علی طبرسی (المتوفی ۵۲۸ھ)

گویا چھ صدیوں میں شیعہ حضرات کے اندر ان چار کے علاوہ کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا،  
جس کا قرآن کریم کے معرفت ہونے پر عقیدہ نہ ہو۔ حالانکہ ان چاروں حضرات کی سارے شیعہ اکابر  
کے روبرو حیثیت کیا اور دیگر اکابر شیعہ نے جو تحریریت قرآن کے بارے میں احادیث اپنی ان مایہ ناز  
تصانیف میں شامل کی ہوئی ہیں جن پر ان کے مذہب کا دار و مدار ہے نیز اکابر اہل بیت و ائمہ دین کے  
تحریریت قرآن کے متعلق بیانات نقل کیے ہوئے ہیں، ان کے بالمقابل ان چاروں حضرات کے، بغیر  
کسی دلیل کے، ذاتی اقوال و نظریات کی وقعت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ راہ ہدایت  
نصیب فرمائے۔ آمین

علاوہ بریں یہ چاروں حضرات بھی ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ موجودہ قرآن کریم وہی ہے  
جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر نازل فرمایا تھا، بلکہ اب کا عقیدہ  
بھی یہ ہے کہ اصل قرآن تو واقعی سترہ ہزار آیات کا یا ستر گز لمبا ہی تھا، اس میں سے کتنی ہی  
سورتیں، آیتیں اور بعض آیتوں کے الفاظ صحابہ کرام نے حذف کر دیے تھے، اس طرح موجودہ  
قرآن ہے تو اسی قرآن منزل من اللہ کا حصہ لیکن یہ پورا اور مکمل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی  
یہ چاروں حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ قرآن کریم کے الفاظ وہی ہیں جو اصل قرآن کے  
تھے، اس میں اضافہ قطعاً نہیں ہوا ہے، ہاں کمی بہت کچھ کر دی گئی ہے۔ اسی لیے ان چاروں  
نے شیعہ حضرات کو یہ تلقین بھی کی کہ وہ بے کھٹکے اپنی نمازوں میں اس قرآن مجید کی تلاوت  
کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں کسی بشر کا کلام شامل نہیں ہے۔

ان چاروں حضرات نے اپنی مزعومہ احادیث، ائمہ کی جانب گھڑتے ہوئے نظریات اور

اپنے اکابر کی تصریحات کے خلاف اس قرآن کریم کی صحت پر کیوں زور دیا، بات اصل میں یہ ہے کہ شیعہ حضرات اپنے مخالفین کے روبرو حدیث نقلین کو بڑی شد و مد سے پیش کرتے آئے ہیں تاکہ اہلبیت اطہار کی عقیدت کے خود کو علی بردار مٹا سکیں، لیکن اہلبیت تو نقل دوم ہیں جبکہ نقل اول قرآن مجید ہے۔ یہ حدیث پیش کرتے ہوئے رافضی مناظرین کو یہ دقت پیش آتی تھی کہ موجودہ قرآن کریم کو تحریف شدہ ماننے کے بعد شیعہ حضرات کو مسلمان ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ دین کا اولین ماخذ تو یہی کلام الہی ہے، جن کے مذہب کا مدار قرآن مجید پر نہیں اس کے پاس دین کہاں؟

**صحابہ کرام سے دشمنی** قرآن کریم کو معرفت ثابت کرنے کی غرض سے شیعہ حضرات کو عبداللہ بن سبا کے اتہام میں بغض صحابہ سے سرشار ہونا پڑا اور صحابہ کرام تک کے خلاف حدیثیں گھڑ کر، فرضی الزامات قائم کر لیے اور ان پاکباز ہستیوں کو داغدار دکھانے پر ایڑھی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اصولی کافی میں ہے:

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قول اللہ عزوجل ان الذین امنوا ثم کفروا امنوا ثم کفروا ..... قال نزلت فی فلان وفلان وفلان امنوا بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی اول الامر وکفروا حیث عرضت علیہم الولاہت حبین قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من کنت مولاہ فعلی مولاہ ثم امنوا بالبیعة لامیر المؤمنین علیہ السلام تو کفروا حیث مضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلم یقر و بالبیعة ثم ازدادوا

ارشاد باری تعالیٰ: ان الذین امنوا ثم کفروا امنوا ثم کفروا ..... کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت فلان، فلان اور فلان کے حق میں نازل ہوئی، جو پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے اور جب ان پر ولایت اولیٰ علیؑ پیش کی گئی تو کافر ہو گئے جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس کا آقا میں ہوں پس علیؑ ہی اس کا آقا ہے۔ پھر امیر المؤمنین علیہ السلام کی بیعت پر ایمان لائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کافر ہو گئے۔

کفرًا باخذهم من بايعه بالبيعة  
 لهم فهو لاء لم يبق فيهم من الايمان  
 شيء - له

انہوں نے بیعت کا اقرار نہ کیا ، پھر  
 امیر المؤمنین کی بیعت کا اقرار کرنے والوں  
 سے اپنی بیعت لے کر کفر میں اور بڑھ گئے  
 یہ وہ ہیں جن میں ایمان کا کوئی ذرہ باقی  
 نہ رہا۔

اصول کافی کی تفسیر صافی میں ہے کہ فلاں اور فلاں سے مراد حضرت ابوبکر ، حضرت عمر اور  
 حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اسی اصول کافی میں متصلاً یہ حدیث بھی ہے :

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام  
 فی قول اللہ تعالیٰ ان الذین  
 ارتدوا علی ادبارہم من بعد ما تبیین  
 لهم المرشدی کی تفسیر میں امام  
 جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے  
 کہ مراد فلاں و فلاں و فلاں ہیں جو امیر المؤمنین  
 علیہ السلام کی ولایت کو ترک کرنے کے  
 باعث ایمان سے پھر گئے (مرتد ہو گئے)  
 التلام۔ له

ارشاد باری تعالیٰ : ان الذین ارتدوا  
 علی ادبارہم من بعد ما تبیین  
 لهم المرشدی کی تفسیر میں امام  
 جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے  
 کہ مراد فلاں و فلاں و فلاں ہیں جو امیر المؤمنین  
 علیہ السلام کی ولایت کو ترک کرنے کے  
 باعث ایمان سے پھر گئے (مرتد ہو گئے)  
 تھے۔

تفسیر صافی والے نے فلاں و فلاں کی نشان دہی کرتے اور باقی جملہ صحابہ کرام کو منافق ٹھہراتے  
 ہوئے لکھا ہے کہ: "مراد عثمان و ابوسفیان و معاویہ است۔ برگشتہ از ایمان در مجلس منافقان  
 بسبب ترک ولایت امیر المؤمنین۔ ان حضرات نے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ  
 افراد یعنی صحابہ کرام حبیبی عدیم النظر جماعت کو اپنی مشن ستم کا نشانہ بناتے ہوئے مسلمانوں کی دلازاری  
 کا یہاں تک اتہام روا رکھا،

عن حمران بن اعین قال قلت  
 حمران بن اعین کہتے ہیں کہ میں نے امام

ابن محمد بن یعقوب کلینی ، اصول کافی ، کتاب الحج ، ص ۲۶۵ ، ۲۶۵

محمد باقر علیہ السلام سے عرض کی، میں  
آپ پر قربان ہو جاؤں، ہم تمہارا میں  
کتنے کم ہیں کہ اگر کسی دسترخوان پر ایک  
بکری کھانے کے لیے جمع ہوں، تو ساری  
بکری نہیں کھا سکتے۔ آپ نے فرمایا، کیا  
میں تجھے اس سے بھی عجیب بات نہ  
بتاؤں۔ ماجرین و انصار سے حضور  
کے بعد، سب مرتد ہو گئے ماسوائے  
تین کے جو ہاتھ کے اشارے سے بتلایا۔

لابی جعفر علیہ السلام جعلت  
فداک ما اقلنا لو اجتمعنا  
على شاة ما افینناھا فقال  
الا حدثک باعجب من  
ذالك الماحجرون و  
الانصار ذهبوا الا  
واشار بيده ثلاثة له

مذکورہ تین حضرات کی نشان دہی فروع کافی میں یوں کی گئی ہے:

امام محمد باقر سے روایت ہے۔ انہوں  
نے فرمایا کہ نبی مکرم کی وفات کے بعد  
تین کے علاوہ باقی سب مرتد ہو گئے تھے۔  
میں نے پوچھا، وہ تین کون ہیں؟ فرمایا،  
مقدادی الاسود، ابوذر غفاری اور  
سلطان فارسی۔

عن ابی جعفر قال کان الناس  
اهل سرده بعد النبی  
الا ثلاثة فقلت و من  
الثلاثة فقال المقداد  
ابن الاسود و ابوذر  
غفاری و سلمان الفارسی۔

ستم ظریفی تو لحاظ ہو کہ یہاں سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے  
بعد جن تین حضرات کا اسلام پر قائم رہنا بیان ہوا ہے اس کی رو سے سارے اہلبیت بلکہ  
ستیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اسلام سے پھر جانے والوں میں شامل کر دیا۔ ان  
حالات میں ناطقہ سر بگیاں ہے اور پڑھنے والے سرگرداں رہ جاتے ہیں کہ یا الہی! یہ لوگ جو  
اہلبیت کی محبت کا ڈھول پوری طاقت سے بجاتے پھر رہے ہیں، ان کے اس خوشگمانے سے

۳۵۶ لے محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، کتاب الحج، ص ۴۹، ۵۰ سے فروع کافی، جلد سوم، جوار آفتاب ہدایت: ص ۳۵۶

کی حقیقت کیا ہے؟ دوسری جانب قرآن کریم کو محرف اور اہل بیت کو مظلوم دکھانے کی غرض سے صحابہ کرام کو منافق و مرتد دکھانے اور باور کرانے کا وبال اپنے سر لیا۔ مخالفت صحابہ پر اپنے تابعین کو آمادہ کر لینا حقیقت میں عبد اللہ بن سبا جیسے مسلم نمایاں ہودی کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت کے درمیان سے اُس مضبوط ترین واسطے کو نکال دیا جو گروہ صحابہ کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور و معروف ہے۔ جن حضرات نے اس عظیم الشان واسطے کو ناقابل یقین تسلیم کر لیا، اُن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین حاصل کرنے کا آخر ذریعہ کیا ہے؟ کاش ایہ حضرات اب بھی عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے اگر اس سراسر غیر اسلامی روش کو ترک کر دیں، اُن مقدس ہستیوں پر تبرا بازی کر کے اُس شمع رسالت کی دل آزی نہ کریں جس کی وہ کر نہیں تھے اور ملت اسلامیہ کو روحانی اذیت نہ پہنچایا کریں تو اس میں خود اُن کا بھی بھلا ہے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے افکار و مسائل جو مختلف جماعتوں کے درمیان بُعد اور منافرت کا سبب ہیں، اُن پر ٹھنڈے دل و دماغ سے نظر ثانی کر کے اتفاق و اتحاد کی جانب قدم اٹھایا جائے ورنہ وہ دن دور نہیں کہ غیر اسلامی نظریات اور دین سے بغاوت کا جو سیلاب پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے وہ اتنی شدت اختیار کر جائے گا کہ کس بھی تنہا جماعت کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے گا۔ ہمیں امید و اثق ہے کہ یہ حضرات غصے میں آئے اور جھنجلائے کے بجائے عقل سے کام لیتے ہوئے بہتری کا راستہ اختیار کریں گے وَمَا ذَا لِكَ عَلَى اللّٰهِ بَعْرِزٌ۔

یہ حقیقت ہے کہ اصحاب ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں انتہائی محبت اور عقیدت تھی و احترام کے رشتے پوری طرح استوار تھے۔ اُن میں سے ہر بزرگ ایک دوسرے کو اپنی جان سے عزیز سمجھتا تھا اور خصوصاً اہل بیت اطہار سے تو جمیع صحابہ کرام کو جو آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قرب کی بدولت محبت و عقیدت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھوں پر برضا و رغبت بیعت کی۔ ہمیشہ اُن کے مشیر خاص اور دست و بازو بن کر رہے۔ یہ چاروں بزرگ فخر و دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد اُمتِ محمدیہ کے سرپرست تھے اور ان حضرات کی تمام تر توانیاں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے وقف تھیں۔ ذاتی غرض یا

دنیاوی منفعت کا سایہ تک ان میں سے کسی بزرگ کے نزدیک سے نہ گزر سکا۔ سارے ہی الفکر فکری کا نمونہ اور ہادی دو جہاں کے نقوش قدم کو مشعل راہ بنائے ہوئے تھا۔

براہونفسانیت کا کہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا کی مازش سے بعض مدعیان اسلام نے ان حضرات کے رشتہ محبت و اخوت کو بغض و عداوت بتانا شروع کر دیا۔ یہ دیرینہ سازش آج تک اپنے قدم جمائے ہوئے ہے اور مسلمان ہلانے والوں میں آٹے دن سر پھٹول کا سبب بن جاتی ہے۔ جب ان حضرات سے کہا جاتا ہے کہ ن بندگان میں آپ عداوت و نفرت بتاتے ہیں ان کے بارے میں تو فریقین کی تصانیف یہ بتا رہی ہیں۔ کمال محبت تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان بزرگوں کے ہاتھوں پر نجوشی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ تازلیست محبت و الفت رہی۔ اس کے جواب میں شیعہ حضرات یشکوفہ چھوڑتے ہیں کہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات خلفائے ثلاثہ کے ماہین انتہائی عداوت اور نفرت تھی لیکن شیر خدا نے جو ان کے ہاتھوں پر بیعت کی، تازلیست ان کے دست و بازو بنے رہے اور ان حضرات کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے تو یہ سب کچھ بر بات تقیہ تھا۔ چنانچہ اس بنائے فاسد کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خاطر یہ حضرات حسب منشا احادیث و آثار گھڑنے اور اپنی تصانیف میں شامل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب یہ منسوب کیا،

قال ابو جعفر علیہ السلام التقیۃ

من دینی و دین ابائی و لا ایمان

لمن لا تقیۃ لہ۔

امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب تقیہ جیسے صریح کذب، منافقت اور ٹھیسٹ خباثت کو درست ثابت کرنے کی خاطر، کمال جبارت سے یہ الفاظ منسوب کر دیے:

قال ابو عبد اللہ علیہ السلام

یا ابا عمران تسعة اعشار الدین

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ  
اسے ابو عمران! دین کے نو حصے تقیہ میں ہیں

لہ محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، ص ۴۴۴

فی التقیة ولا دین لمن لا  
تقیة له۔ ۱

اور جو تقیہ نہ کرے اس کا کوئی دین نہیں  
ہے۔

نیز امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اسلام کے بطل جلیل کی جانب یہ قول بھی منسوب کیا ہوا ہے:

یا سلیمان انکر علی دین من  
کتہ اعز الله و من  
اذا عہ اذله الله۔ ۲

اے سلیمان! تم ایسے دین پر ہو کہ جو اسے  
چھپائے اللہ تعالیٰ اس کو عزت دے گا  
اور جو اسے ظاہر کرے خدا اسے ذلیل  
کرے گا۔

بلکہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب گھڑا ہوا یہ حکم بھی نشر کرتے رہتے ہیں:

من اذاع علینا شیئاً من  
امرنا کمن قتلنا عمداً  
ولم یقتلنا خطاءً۔ ۳

جس نے ہمارے دین میں سے کسی چیز کو  
ظاہر کیا، وہ اس شخص کی مانند ہے جس  
نے غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر ہمیں  
قتل کیا۔

شیعہ حضرات کی خدمت میں ہماری عاجزانہ التماس ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
سے مذکورہ ارشاد پر وہ حضرات عمل فرمائیں اور خلفائے اربعہ کے ماہی جو انہوں نے بغض و عداوت  
کی کہانیاں گھڑی ہوئی ہیں، انہیں ازراہ تقیہ ہی سہی، نشر کرنے سے باز رہا کریں۔ آخر جب  
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فرضی عداوت کا کسی مرحلے پر تازلیت اظہار نہ کیا، حضرت  
امامین عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کبھی یہ نہ کہا کہ ہمارے گھرانے اور حضرات خلفائے ثلاثہ  
میں کسی قسم کی شکر رنجی تھی، اگر شیعہ حضرات کے نزدیک یہ سب کچھ تقیہ کے باعث تھا، تو یہ  
حضرات بھی ایسا ہی تقیہ اختیار کر لیں اور ان بزرگوں کی طرح عداوت و نفرت کے شگونے نہ چھوڑا  
کریں اور بقول حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے دین بننے اور خود کو اہل بیت اطہار کا

۱۔ محمد یعقوب کلینی، اصول کافی، ص ۲۸۶ . ۲۔ ایضاً: ص ۲۸۵

۳۔ ایضاً: ص ۵۵۲



قاتل دکھانے سے اجتناب کریں۔ اگر واقعی اس باب میں اکابر اہلبیت تقیہ فرماتے رہے تو شیعوں  
حضرات کیوں کس تقیہ پر عمل پیرا نہیں ہوتے؟

س نے فروعت محکم و نے از اصول  
شرم بادت از خدا و از رسول

شیعوں نے ایک جانب دین کو حرفِ غلط ٹھہرانے کی مہم چلائی کہ قرآن کریم کو  
متنوع تہلیل شدہ اور صحابہ کرام کو اسلام سے پھر جانے والے باور کروانے پر ایڑی چوٹی کا  
زور لگایا ہوا ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کے اخلاق و کردار کا جنازہ نکال دینے کی خاطر  
متنوع کو قیامت تک کے لیے جاری بتایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ کرامت ہمد  
میں ایک مدت تک یہ مباح رہا اور اس کے بعد قیامت تک کے لیے اسے حرام قرار دے دیا گیا۔  
شیعوں نے نہ صرف حرام کو حلال ٹھہرانا اپنا مشور بنالیا بلکہ جو امر کسی وقت مباح تھا اسے  
اپنے دین کا ایسا ضروری جزو اور لازمی رکن قرار دے لیا کہ عقل انسانی انگشت بندان رہ جاتی ہے۔  
اس حرکتِ قلبیہ کے احادیث و آثار گھر گھر وہ فضائل بیان کیے ہیں کہ ان کی صداقت پر یقین رکھنے والے  
خواہ نماز روزے کے نزدیک نہ جائیں لیکن متنوع کے ذریعے جنت الفردوس کا ٹکٹ ضرور  
حاصل کریں گے چنانچہ علامہ علی حائری لاہوری کے والد مسید ابو القاسم نے لکھا ہے:

قال ابو عبد الله عليه السلام	امام جعفر صادق عليه السلام نے فرمایا، کوئی
ما من رجل تمتع ثم اغتسل	شخص ایسا نہیں کہ وہ متنوع کرنے کے
الا حلق الله من كل	بعد غسل کرے مگر اللہ تعالیٰ ہر اس
قطرة قطر منه	قطرے کے بدلے جو اس سے گر تھے
سبعين مائة يستغفرون الى	ستر ہفتے پیکار تھے جو قیامت تک
يوم القيامة له	استغفار کرتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور روایت شیعوں نے حضرت کی معتبر تفسیر منہج الصادقین سے ملاحظہ ہو،

۱۰ سبب التمام، باب التور، مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور، ص ۵۰

قال النبي صلى الله عليه وسلم  
 من تمتع مرةً آمن مسخط  
 الله الجبار ومن تمتع  
 مرتين حرمم الابواب و  
 من تمتع ثلاث مرات  
 صاحبني في الجنان - ۱

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا،  
 جو ایک مرتبہ متعہ کرے وہ خدا کے جبار کے  
 قہر سے نجات پا گیا اور جو دو مرتبہ کرے  
 اس کا شرنیک لوگوں کے ساتھ ہوگا  
 اور جو تین دفعہ متعہ کرے تو جنت میں  
 میرا ساتھی ہوگا۔

اس سے بھی اعلیٰ فضائل بتانے والی، شیخہ حضرات کی گھڑی ہوئی یہ حدیث بھی قابل غور ہے،

قال النبي صلى الله تعالى عليه  
 وسلم من تمتع مرةً درجته  
 كدرجة الحسن ومن  
 تمتع مرتين درجته كدرجة  
 الحسين ومن تمتع ثلاث مرات  
 درجته كدرجة علي ومن تمتع اربع  
 مرات درجته كدرجة علي - ۲

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا،  
 جو ایک دفعہ متعہ کرے اس کا مرتبہ حسن  
 جیسا ہے اور جو دو مرتبہ متعہ کرے تو  
 حسین کا درجہ پائے اور جس نے تین  
 دفعہ متعہ کیا اس کا درجہ علی جیسا ہے  
 اور جو چار مرتبہ متعہ کرے تو اس کا مقام  
 میرے جیسا ہے۔

ان اعاديشكى صحت پر یقین رکھنے والوں کو کیا پڑی ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیوں سے  
 بچنے کی مصیبت میں پھینتے پھریں۔ کیوں نہ منزے سے متو کرتے جائیں اور ایسے درجے حاصل  
 کرتے جائیں جی کا کوئی نیکو کار تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے سے انسانی اخلاق و کردار پر  
 کیا اثر پڑ رہا ہے، کاشش! مجوزین متعہ کبھی اس پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے  
 کی زحمت گوارا فرمائیں۔ شیخہ حضرات نے مسائل سے قطع نظر کتنے ہی ایسے نظریات کو اسلامی  
 عقاید منوانے کی مہم چلائی ہوئی ہے جو قرآن و حدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ مثلاً،  
 ۱۔ شیخہ حضرات بارہ اماموں کو انبیائے کرام کی طرح معصوم قرار دیتے ہیں۔

۲۔ ائمہ کا مرتبہ انبیائے کرام کے برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔  
 ۳۔ ائمہ کو خدائی میں دخیل اور بالکل مانگ و مختار ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مرتے بھی اپنے اختیار سے ہیں۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتبہ جملہ انبیائے کرام سے بھی بلند ٹھہراتے ہیں۔  
 ۵۔ روافض کے بعض فرقے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو الوہیت کا حامل بتاتے ہیں۔  
 ۶۔ حضرت امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غار سرمن رائے میں چھپا ہوا بتاتے ہیں۔  
 ۷۔ دعویٰ کرتے ہیں کہ پورا اور اصلی قرآن امام مہدی کے پاس ہے جو بوقت ظہور لے کر آئیں گے۔

۸۔ حدیثیں گھڑنے میں انتہائی جبری ہیں اور اپنے مذہب کی بنیاد اسی گھڑنت پر رکھی ہوئی ہے۔  
 ۹۔ باغ فدک کو چھیننے اور یار غار رسول کو ناحق بدنام کرنا اپنا مشن بناٹے ہوئے ہیں۔  
 ۱۰۔ حدیث قرطاس کو ناحق بہانہ بنا کر فاروق اعظم جیسی جلیل القدر ہستی کو خواہ مخواہ ملعون کرتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ نجم غدیر کے واقعے کو بغیر کسی ادنیٰ قرینے کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بلا فصل کی دلیل بناتے ہیں۔

۱۲۔ اسلامی کلمہ پر محض سینہ زوری سے اضافہ کر کے اپنا مسلمانوں سے علیحدہ کلمہ گھڑا ہوا ہے۔  
 حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بانیِ رفض یعنی عبد اللہ بن سبا کو تکبہ بدر کر دیا تھا لیکن شیعہ حضرات اس مسلم نمایاں ہودی کے خیالات کو اپنے دلوں سے نکالتے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی عبد اللہ بن سبا کے بارے میں رجال کشی کے حوالے سے شیعہ حضرات کے ایک نامور مجتہد استرآبادی نے لکھا ہے:

فانظروا الی عبارۃ الکشی ذکر	عبارت کشی ملاحظہ ہو، بعض اہل علم نے
بعض اہل العلم ات عبد اللہ	ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن سبا حقیقت
ابن سبا کان یہودیاً واسلم	میں یہودی تھا۔ وہ مسلمان (بظاہر) ہوا
والی علیتا وکان یقول وهو	اور حضرت علی کی محبت کا علم بلند کرنے لگا

علی یہودیتہ فی یوشع وصی  
 بالغلو فقال بعد اسلامہ بعد  
 وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم فی علی مثل ذالک فکان  
 من اشهر بالقول بغرض  
 امامتہ علی علیہ السلام  
 البراءة من اعدائہ وکاشف  
 مخالفیہ واکفرہم فمن ہہنا قال من  
 خالف الشیعۃ اهل التشیع والرفض  
 من الیہودیت - لہ  
 جب وہ یہودی تھا تو حضرت یوشع کے  
 وصی ہونے میں غلو کرتا تھا اور مسلمان ہونے  
 پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالہ  
 کے بعد اسی طرح حضرت علی کے بارے  
 میں کہنے لگا۔ یہی ہے جس نے امامت علی  
 کی فرضیت کا دھول بجایا ، ان کے  
 مخالفین پر تبرا کیا ، فرضی مخالفین گمراہ  
 اور ان کی تکفیر کی۔ بایں وجہ مخالفین شیعہ  
 کہتے ہیں کہ اہل تشیع اور رفض کی اصل  
 یہودیت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جس  
 طرح خارجیت ایک شجر ممنوعہ ثابت ہوتی ہے اسی طرح رفض بھی ایسی نادان دوستی کا مظاہرہ  
 جو دشمنی سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ شرف صرف اور صرف اہلسنت وجماعت ہی کو حاصل ہے کہ  
 ہر قابل احترام ہستی کا احترام ملحوظ رکھتے اور خفیہ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ یہاں نہ افراط ہے نہ  
 تفریط۔ اپنے صحبین و مخالفین کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

سبک فی صنفان محب مفراط  
 تذهب بہ الحب الی  
 غیر الحق و میغض میفراط  
 تذهب بہ البغض الی  
 غیر الحق و تحیر  
 الناس فی حالاً  
 عنقریب میرے بارے میں دو فریق ہلاک  
 ہوں گے۔ محب دوستی میں افراط کرنے  
 والے ہوں گے اور بغض دوستی کو حق سے دور لے  
 جانے والے گا اور دشمن کو دشمنی میں افراط سے  
 دشمنی کو حق سے دور لے جانے والا بہترین  
 انسان میرے بارے میں وہ ہے جو

میان روی اختیار کرے۔ تم سب سے بڑی  
جماعت کے اتباع کو لازم جانو، کیونکہ  
اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ فرقہ بازی سے  
بچ کر رہنا کیونکہ جماعت سے علیحدہ رہنے  
فالا انسان شیطان کا شکار ہے جیسے  
ریوڑ سے جدا ہونے والی بکری بیڑیٹے  
کا شکار ہوتی ہے۔ غیر دار جو تمہیں  
جماعت سے علیحدگی کی دعوت دے اُسے  
قتل کر دو خواہ وہ میری اس دستار کے  
نیچے ہی کیوں نہ ہو۔

النمط الاوسط فالزمو  
السواد الاعظم فان يبد الله  
على الجماعة و اياكم و  
الفرقة فان الشاذ  
من الناس للشيطان كما ان  
الشاذ من الغنم للذئب  
الامن دعالي هذا  
الشعار فاقتلوه ولو  
صغان تحت عامتي -

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد و گرامی سنہری حروف میں کہنے کے قابل اور  
مسلمانوں کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔ جنت کے افراد کی شیعہ حضرات اور عداوت کے انزلا  
کی خارجی حضرات مثلاً بولتی تصویریں ہیں۔ فضلہ تعالیٰ اہلسنت و جماعت ہی میان روی اختیار کیے  
ہوتے اور مسلمانوں کا سوا و اعظم (سب سے بڑی جماعت) ہیں، اسی کے ساتھ رہنے کی حضرت  
مولا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تاکید فرمائی اور جس سے جدا ہونے والے کو قتل کرنے کا حکم  
ملتا فرمایا ہے۔ والحمد لله على ذلك۔

مسلمانوں سے شیعہ حضرات کی دشمنی اظہر من الشمس ہے۔  
مسلمانوں سے بغض و عداوت  
زمدوں سے دوستی یا دشمنی پھر اور بات ہے  
لیکن ملت اسلامیہ سے ان کی عداوت کسی مسلمان کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔  
ان کے نزدیک مسلمانان اہلسنت و جماعت ہر حالت میں غیر مسلم اور قابل لعنت ہیں۔ چنانچہ  
لکھا ہے کہ کسی کستی کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر کسی غیر شیعہ کی نماز جنازہ پڑھنی پڑ جائے تو  
چوتھی ہجرت سے پہلے یوں بد دعا کرے،

لے نبع ابوغت، مطبوعہ شہزادہ شہزادہ

اللهم اخز عبدك في عبادك  
 اللهم اصله حتر نارك  
 اللهم اذقه اشد  
 عذابك - ۱۰

اے اللہ! اس بندے کو اپنے بندوں  
 اور شہروں میں ذلیل کر، اے اللہ! اسے  
 نارِ جہنم میں ڈال۔ اے اللہ! اسے سخت  
 عذاب پہنچا۔

بسل تو ہونے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر

ٹھنڈا میرا قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

مسلمانوں کو شیوہ حضرت کی اس حرکتِ قبیلہ کا کہاں تک افسوس ہو جبکہ ان حضرات نے  
 اپنی فرضی محبت کے مرکز و محور یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات والا صفات کو  
 اپنی مشقِ ستم سے نہ بچنے دیا۔ چنانچہ خود ان کی جانب یہ فرضی قول فسوب کیا ہوا ہے،

ان علیا علیہ السلام قال علی  
 منیر کوفہ یا ایہا الناس  
 مستدعون الی شیئی  
 فسبقونی - ۱۱

بے شک حضرت علی علیہ السلام نے  
 کوفہ کے منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا،  
 اے لوگو! تمہیں ایک چیز د میری سب سے  
 شتم کی جانب بلا یا جائے گا، تو مجھے

گایاں دے لینا۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

## ۹۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کارنامے

مرزا غلام احمد قادیانی کی حتمی تاریخ پیدائش تو کسی کو معلوم نہیں، ہاں مرزا صاحب نے  
 کتاب البریہ میں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء بتائی ہے لیکن تریاق العلوب میں ۱۸۴۵ء لکھی ہے۔  
 اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور انگریزی میں اجد خواں تھے۔ سیالکوٹ پھری میں

۱۰ تحفۃ العوام، جلد اول، ص ۱۳۸  
 ۱۱ محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، ص ۴۸۴

بشاہرہ پنڈرہ روپے ماہوار چار سال تک محترم رہے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آباؤ اجداد سکھوں اور انگریزوں کے وفادار اور ملازم رہتے آئے تھے۔ والد کا نام مرزا غلام مرتضیٰ تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے قانونی مختار کاری کا امتحان بھی دیا لیکن فیل ہونے پر تعلیم سے دل اُپاٹ ہو گیا۔ ضعفِ دل و دماغ تمام عمر جولانی پر رہا۔ قوتِ مردمی سے اکثر اوقات محروم رہے۔ تشنجِ قلب، اسہال، دردِ سر، دورانِ کسر، مایوٹریا اور ذیابیطس وغیرہ امراضِ موصوف کی زندگی کے ساتھی تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں موصوف کا شدتِ اسہال یا ہیضہ سے انتقال ہوا تھا۔ بعد وفات اُن کے منہ سے پانخانہ نکلنے ہوئے دیکھا گیا جو حاضرین کی عبرت کا باعث ہوا۔ مرزا صاحب کے خلفاء اس صورتِ حال کی تردید کرتے رہے۔ والعلم عند اللہ۔

۱۸۸۶ء سے مرزا صاحب نے اپنی نبوت کی بنیاد رکھنی شروع کی، لیکن ایسے گول مول لفظوں میں جو صرف کشف و الہام وغیرہ پر مبنی تھے اور براہین احمدیہ میں اہل گٹھ پھر رہے ہیں۔ قادیان سے براہین احمدیہ اور مدرسہ دیوبند سے تحذیر اتنا س بیک وقت نکلی گئی۔ علی گڑھ کالج کا اجراء، مدرسہ دیوبند کی تاسیس اور براہین احمدیہ کی تصنیف کا زلزلہ ایک ہے، گیارہ برس گورنمنٹ نے ملتِ اسلامیہ کے خلاف بیک وقت چار فتویٰ دیے، علی گڑھ، دیوبند اور قادیان سے کھڑے کر دیے۔ چاروں فتویٰ اپنے اپنے رنگ میں نرالے، انتہائی پُر اسرار اور مسلمانوں کے غریب دین و ایمان میں آگ لگانے والے تھے۔ افسوس! ان فتویٰ کی کما حقہ مغفرت سے مسلمانوں کی اکثریت تا حال باخبر نہیں ہو سکی ہے۔ اگر حقیقت کی تمہیں محاکب کو دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا ہے کہ انگریزی حکومت اپنے اسلام دشمن مقاصد میں انتہائی کاجیب زنی مہی۔ لاسٹ ایہم ابھی ان فتویٰ کی مغفرت کو سمجھنے لگے ہاتھیں۔ وہی سے کشتی مثل کی کواڑ، علی گڑھ سے تخریب کا ظہور، دیوبند سے براہین قاطعہ اور فتاویٰ گنگوہی متعلقہ و قریح کذب باری اور قادیان سے فتح اسلام، ترویج مرام اور از اللہ اور مرام کی اشاعت ان فتویٰ کی دوسری کڑیاں ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جلد تخریب کاروں سے بڑھ کر وبال اپنے سر لیا کہ نبوت کا دعویٰ کر کے دجالوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اپنی دنیا سنبھالنے کی خاطر کروڑوں مسلمانوں کی عاقبت برباد کر گئے۔ اب یہ موصوف کے چند مخصوص کارنامے ہم بڑے اختصار کے ساتھ

خود مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف سے پیش کرتے ہیں۔ موصوف پرنٹس گورنمنٹ کی مخالفت کو سخت بد ذاتی اور گتہ سمجھتے تھے۔ اب باقی کارگزاری کی ٹھیک ملاحظہ ہو۔

تخریب کاری کے چاروں مراکز یعنی دہلی، علی گڑھ، مدرسہ دیوبند اور قادیان  
مخالفت جہاد میں دو باتیں مشترک تھیں:  
۱۔ حکومت کی تائید و حمایت

۲۔ جہاد کی مخالفت

لیکن قادیانی مکران میدانوں میں اپنے حلیوں سے گوٹے سبقت لے گیا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے اس بارے میں فرمایا ہے:

”دوسرا امر قابل گزارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشید کی سچی محبت اور خیر خواہی اور حسد رسی کی طرف پھیول اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں، جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں، تم

مرزا صاحب نے ممانعت جہاد کے سلسلے میں جو کارنامہ دکھایا اس کا یوں فخریہ ذکر کیا ہے،  
”میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر صد سال اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس لاکھ روپے ان سے بھر سکتی ہیں۔“

طوق استغاب مغرب خود کیا زیب گلو

اور گولہ اس پوہیں مرزا کی پچاس لاکھ روپے

ظلی بروز می شہوت کا دعویٰ  
۱۸۸۶ء میں کشف والہام کے دعاوی کرنے کے بعد  
۱۸۸۹ء میں مرزا صاحب نے کہنا شروع کر دیا کہ

۱۔ غلام احمد قادیانی، تریاق القلوب، ص ۱۶۔ ۲۔ ایضاً، تبلیغ رسالت، ج ۱، ص ۱۰

۳۔ ایضاً، تریاق القلوب، ص ۲۵



میں مسیح موعود اور عیسیٰ بن مریم ہوں۔ چنانچہ موصوف نے خود لکھا ہے :

مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفع کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حائل  
 ٹھہرا دیا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اس  
 الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابنِ مریم ٹھہرا گیا  
 اپنے مسیح موعود ہونے کے دعوے کو مرزا صاحب نے ان لفظوں میں بھی بیان کیا ہے،  
 ”میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی  
 تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا،“  
 دوسری جگہ موصوف نے اپنے اسی دعویٰ کو ان لفظوں میں دہرایا ہے :

”جس آنے والے مسیح موعود کا پیشگوئی سے بہت لگتا ہے، اُس کا اُن ہی حدیثوں  
 سے یہ نشان دیا گیا ہے کہ وہ نبی ہوگا اور امتی بھی،“

اس سے آگے موصوف نے خود کو عیسیٰ علیہ السلام سے افضل بتانے کی ہم شروع کر دی ،  
 چنانچہ لکھا ہے :

خدا نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا جو اس پچھلے مسیح سے اپنی تمام نشان  
 میں بہت بڑھ کر ہے۔ لیکن قسم ہے اُن کی ولایت کی جس کے ماتحت میں میری جان ہے  
 کہ اگر مسیح ابنِ مریم میرے زمانے میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں وہ  
 ہرگز نہ کر سکتا اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں، وہ ہرگز نہ دکھلا سکتا۔  
 مرزا صاحب نے اپنے اس شیطانی دعوے کی دلیل ان مضحکہ خیز لفظوں میں پیش کی ہے :  
 ”جب خدا نے اور اُس کے رسول نے اہتمام فیوں گئے زمانہ کے مسیح کو  
 اُس کے کارناموں کی وجہ سے افضل قرار دیا ہے پھر تو یہ شیطانی دعوہ ہے  
 کہ یہ کہا جاتے کہ کیوں تم مسیح ابنِ مریم سے اپنے تئیں افضل قرار

۱۔ غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۴۴      ۲۔ غلام احمد قادیانی: تھذیب لٹریچر، ص ۱۹۵  
 ۳۔ ایضاً: حقیقۃ الوحی، ص ۲۶      ۴۔ ایضاً: ص ۱۴۸

دیتے ہوئے لے

مرزا صاحب نے مسیح موعود کے ساتھ آدم ہونے اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بروز ہونے کو منطقی انداز میں، ان لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے:

”لا جرم خدا نے محمد کو آدم بنایا اور محمد کو وہ سب چیزیں بخشیں اور محمد کو خاتم النبیین اور سید المرسلین کا بروز بنایا اور مجید اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ فرمایا تھا کہ اُس آدم کو پیدا کرے گا جو آخری زمانہ میں خاتم الخلفاء ہوگا جیسا کہ زمانہ کے شروع میں آدم کو پیدا کیا جو اُس کا پہلا خلیفہ تھا اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ فطرت کا دائرہ گول ہو جاتے“ لے

مرزا صاحب نے بروزی ظلی کے معاملے کو بڑھاتے ہوتے خود کو تمام انبیاء سے بنی اسرائیل کا ظل ان لفظوں میں بتایا ہے:

”یہ خدا تعالیٰ پر بظنی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی بدی کا تو حقہ دار ٹھہرا دیا ہے، یہاں تک کہ ان کا نام یہود بھی رکھ دیا مگر ان کے رسولوں اور نبیوں کے مرتب میں سے اِس امت کو کوئی حقہ نہ دیا۔ پھر یہ اُمت خیر الامم کس وجہ سے ہوئی، بلکہ شر الامم ہوئی کہ ہر ایک نمونہ شر کا ان کو بلا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا۔ کیا ضرور نہیں کہ اِس امت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں منظر آدے جو بنی اسرائیل کے تمام نبیوں کا وارث اور ان کا ظل ہوئے لے

موصوف نے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بروز ہونے کا خطبہ الہامیہ میں جو دعویٰ کیا تھا، اُسے اور آگے بڑھاتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ہوں، مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

”خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات معتدبہ کے اظہار و اثبات کے لیے کسی شخص کو آنجناب کی پیروی اور متابعت

لے غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۱۵۵ لے ایضاً: خطبہ الہامیہ، ص ۱۶۷

لے ایضاً: کشتی نوح، ص ۴۴

کی وجہ سے وہ مرتبہ کثرت مکالمات اور مخاطبات الیہ بننے لگا جو اس کے وجود میں  
عکسی طور پر نبوت کا رنگ پیدا کر دے۔ سو اس طرح سے خدا نے میرا نام نبی رکھا  
یعنی نبوت محمدیہ میرے آئینہ نفس میں منعکس ہو گئی اور ظلی طور پر نہ اصلی طور پر مجھے  
یہ نام دیا گیا، بلکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ٹھہروں۔  
موصوف نے اپنی بروزی منطق کا ہیر پھیر لفظوں کی چکر بازی میں یوں بھی دکھایا ہے،  
”چونکہ میں اس کا رسول یعنی فرستادہ ہوں مگر بغیر کسی نئی شریعت اور نئے دعوے  
اور نئے نام کے بلکہ اسی نبی کریم، خاتم الانبیاء کا نام پا کر اور اسی میں ہو کر اور اسی کا  
مظہر بن کر آیا ہوں۔“

اسی بات کو موصوف نے اگلے صفحے پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے،

”اس نکتہ کو یاد رکھو کہ میں رسول اور نبی نہیں ہوں یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے  
دعوے اور نئے نام کے اور میں رسول اور نبی ہوں۔ یعنی باعتبار ظہور طہ کے۔  
میں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے اور میں  
کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد  
اور مصطفیٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا۔“

حقیقی نبوت کا دعویٰ  
ابتداء میں مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ نبوت کے ظلی بروزی وغیرہ  
پر دوں میں طغوت رکھا لیکن ان کا قدم وقت کے ساتھ ساتھ  
آگے ہی بڑھا جا رہا تھا۔ اواخر انیسویں صدی عیسوی ختم ہوئی اور اواخر مرزا صاحب نے  
اپنے پچھلے دعاوی کو چھوڑتے ہوئے ۱۹۰۱ء میں حقیقی نبوت کا دعویٰ کر دیا یعنی کمال شعبہ بازی  
دکھاتے رہے اور لفظوں کا ہیر پھیر آخری دم تک سلامت رکھا۔ مثلاً لکھتے ہیں،  
”ہلاک ہو گئے وہ جنہوں نے ایک برگزیدہ رسول (یعنی مرزا صاحب) کو قبول

۱۔ غلام احمد قادیانی، حاشیہ چشمہ معرفت، ص ۲۲۲۔ ۲۔ ایضاً، نزول المسیح، ص ۲  
۳۔ ایضاً، ص ۴

نہ کیا۔ مبارک دُوح جس نے مجھ کو پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور اُس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بد قسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے۔

مرزا صاحب کی جیسی شیطانی نبوت تھی اسی کے مطابق وحی بھی نقدی کی صورت میں ہوتی تھی جس کی خاطر موصوف نے یہ سارا شیطانی ڈرامہ مستحیج کہا تھا۔ چنانچہ ٹیچی ٹیچی فرشتے کی ایک آمد کا موصوف نے یوں تذکرہ کیا ہے:

”ایک دفعہ مارچ ۱۹۰۵ء کے مہینے میں بوقتِ قلت آمدنی لنگر خانہ کے مصارف میں بہت دقت ہوئی کیونکہ کثرت سے مہانوں کی آمد تھی اور اُس کے مقابل پر روپیہ کی آمدنی کم، اس لیے دُعا کی گئی۔ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جو فرشتہ معلوم ہوتا تھا میرے سامنے آیا اور اُس نے بہت سا روپیہ میرے دامن میں ڈال دیا۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ اُس نے کہا، نام کچھ نہیں۔ میں نے کہا، آخر کچھ تو نام ہو گا، اُس نے کہا، میرا نام ہے ٹیچی ٹیچی۔ پنجابی زبان میں وقت مقررہ کو کہتے ہیں یعنی ضرورت کے وقت آنے والا تب میری آنکھ کھل گئی۔ بعد اس کے خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا ڈاک کے ذریعے سے اور کیا براہِ راست لوگوں کے ہاتھوں سے اس قدر مالی فتوحات ہوئیں جن کا وہم و گمان نہ تھا اور کئی ہزار روپیہ آگیا۔ چنانچہ جو شخص اُس کی تصدیق کے لیے صرف ڈاکخانے کے رجسٹری ۵ مارچ ۱۹۰۵ء سے آخر سال تک دیکھے اُس کو معلوم ہو گا کہ کس قدر روپیہ آیا تھا۔“

جو طاقت اس خوشحال ملک کی دولت کو لوٹ رہی تھی وہ اگر اپنے کسی خودکاشتر پودے پر دس پین ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتی رہے تو کون سا اُسے اپنے کنگال ملک سے لانا پڑتا تھا۔ آخر وہ وقت مقررہ پر پہنچنے والے ٹیچی ٹیچی جو ہوئے۔ ضرورت خود معلوم کرتے رہتے تھے اور ادھر سے

لے غلام احمد قادیانی، کشتی نوح، ص ۵۶      لے ایضاً: حقیقۃ الوحی، ص ۳۲۲

مطلبے بھی پہنچتے ہوں گے، جنہیں الہام کا نام دے کر مرزا صاحب رقمطراز ہیں،  
 یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے یہ عادت ہے کہ اکثر جو نقد روپیہ آسنے والا ہو یا اور  
 چیزیں تحائف کے طور پر ہوں ان کی خبر قبل از وقت بند لیر الہام یا خواب کے  
 مجھ کو دے دیتا ہے اور اس قسم کے نشان پچاس ہزار سے کچھ زیادہ ہوں گے  
 بہر حال یہ تو دعویٰ نبوت کے سلسلے میں مرزا صاحب اور ان کی مرتبی حکومت کا معاملہ تھا۔ یہاں  
 دعویٰ نبوت کے سلسلے میں موصوف کی چند عبارتیں پیش کرنا تکرار ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے بڑے  
 مطراق سے تحریر کیا ہے:

خدا کا کلام اس قدر مجھ پر نازل ہوا ہے کہ اگر وہ تمام کھا جائے تو میں جزو سے  
 کم نہیں ہو گا۔

موصوف نے اپنے تئیں حضرت نوح علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہوئے صاف لکھا ہے:  
 خدا تعالیٰ میرے لیے اس کثرت سے نشان دکھلا رہا ہے کہ اگر کوح کے زبان میں  
 وہ نشان دکھلائے جاتے تو وہ لوگ غرق نہ ہوتے۔ مگر میں ان کو کس سے مثال  
 دوں، وہ اس غیر طبع انسان کی طرح ہیں جو روز روشن کو دیکھ کر پھر بھی اس  
 بات پر ضد کرتا ہے کہ رات ہے دن نہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خود کو افضل بتاتے ہوئے موصوف نے تحریر کیا ہے،  
 ”اس امت کا یوسف یعنی یہ عاجز اسرائیلی یوسف سے بڑا کون ہے کیونکہ یہ  
 عاجز قید کی دعا کر کے بھی قید سے بچا گیا مگر یوسف بن یعقوب قید میں ڈالا گیا  
 اس امت کے یوسف کی بریت کے لیے ہمیں برس پھلے ہی خدا نے آپ گواہی  
 دے دی اور بھی نشان دکھلائے مگر یوسف بن یعقوب اپنی بریت کے لیے  
 انسانی گواہی کا محتاج ہوا۔“

۷۱ ایضاً: ص ۲۹۱

۷۱ غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی ص ۲۲۲

۷۱ ایضاً، براہین احمدیہ، حصہ پنجم، ص ۷۱

۷۱ ایضاً، ص ۲۹۱

مرزا صاحب نے اپنی ذات کو تمام انبیائے کرام کے کمالات کی جامع بتاتے ہوئے صاف لکھا ہے،

دنیا میں کوئی نبی نہیں گزرا جس کا نام مجھے نہیں دیا گیا۔ سو جیسا کہ براہین احمدیہ میں خدا نے فرمایا ہے کہ میں آدم ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحاق ہوں، میں یعقوب ہوں، میں اسمعیل ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یعنی بروزی طور پر، جیسا کہ خدا نے اسی کتاب میں یہ سب نام مجھے دیے اور میری نسبت جسری اللہ فی حلال الانبیاء فرمایا، یعنی خدا کا رسول، نبیوں کا پیر ہوں۔ سو ضرور ہے کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جائے۔

مرزا صاحب اپنے متعلق بشارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کتنے فخریہ انداز میں انبیائے کرام کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز بن بیٹھے۔ چنانچہ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

اے عزیزو! تم نے وہ وقت پایا ہے جس کی بشارت تمام نبیوں نے دی ہے اور اس شخص کو تم نے دیکھ لیا، جس کے دیکھنے کے لیے بہت سے پیغمبروں نے بھی خواہش کی تھی۔ اس لیے اب اپنے ایمانوں کو خوب مضبوط کرو اور اپنی راہیں درست کرو!

موصوف نے اپنے فرضی معجزات کی کثرت کے پیش نظر انبیائے کرام کی توہین کا یہ اہتمام بھی کیا تھا:

اُس (خدا) نے میرا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے اس قدر معجزات دکھائے ہیں کہ بہت ہی کم نبی ایسے آئے ہیں جنہوں نے اس قدر معجزات دکھائے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے اس قدر معجزات کا دریا رواں کر دیا ہے کہ باستثناء ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام انبیاء علیہم السلام میں ان کا ثبوت اس کثرت

کے ساتھ قطعی اور یقینی طور پر محال ہے اور خدا نے اپنی محبت پوری کر دی ہے، اب چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔

مرزا صاحب نے اپنے فرضی معجزات کی تعداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے،  
 "میری تائید میں اُس نے وہ نشان ظاہر فرمائے ہیں کہ.... اگر میں اُن کو فرداً فرداً  
 شمار کروں تو میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تین لاکھ سے بھی زیادہ ہیں۔"  
 لیکن اپنے اسی قلم ناحق رقم سے سرور کون وہ کہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی تعداد  
 بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"تین ہزار معجزات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے۔"  
 بہر حال موصوف کو اپنے معجزات وغیرہ کا پورا مزہ مل رہا ہو گا۔ برطانوی نبوت خوب رنگ دکھا  
 رہی ہو گی۔ موصوف نے اپنی اسی مخصوص حرکت میں اپنے معجزات کی کثرت کا یہ فرضی افسانہ اور  
 شیطانی قصہ بھی سنایا تھا،

خدا تعالیٰ نے اس بات کے ثبوت کو لے سکے لیے کہ میں اُس کی طرف سے ہوں،  
 اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبی پر تقسیم کیے جائیں تو ان کی بھی ان سے  
 نبوت ثابت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ یہ آخری نماز تھا اور شیطان کا مع اپنی تمام  
 ذریت کے آخری حملہ تھا، اس لیے خدا نے شیطان کو شکست دینے کے لیے ہزار  
 نشان ایک جگہ جمع کر دیے لیکن پھر بھی جو لوگ افسانوں میں سے شیطان ہیں، وہ نہیں  
 مانتے۔"

مرزا صاحب نے جملہ انبیائے کرام پر اپنی افضلیت بتاتے ہوئے فارسی میں یہ تین شعر بھی  
 لاپے تھے،

انبیاء گرچہ بودند بے من  
 بعرفان و کترم ز کے

۱۳۶ ص ۱۲۶

۱۳۶ ص ۱۲۶

۱۳۶ ص ۱۲۶

۱۳۶ ص ۱۲۶

آنچه دادست ہر نبی را جام داد آں جام را مرا بہ تمام  
 کم نیم زان ہمہ برشے لعین ہر کہ گوید دروغ ہست لعین  
 مرزا صاحب نے یوں تو کہتے ہی بزرگوں کی  
 مقدس بارگاہوں میں دریدہ دہتی تو میں و تنقیص کی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علی نبیہا  
 و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں تو ایسے ایسے یہودہ کلمات کہے اور شایع کیے ہیں جن کی  
 ایک مسلمان ہرگز جہارت نہیں کر سکتا۔ موصوف نے لکھا ہے:

تعرض حسین کو نبیوں پر فضیلت دینا یہودہ خیالی ہے۔ بلایا پتہ ہے کہ وہ بھی خدا  
 کے راست باز بندوں میں سے تھے، لیکن ایسے بندے تو کروڑ ہا دنیا میں گزر  
 چکے ہیں اور خدا جاننے آگے کسی قدم ہوں گے۔ پس بلاوجہ اُن کو تمام انبیاء کا  
 سردار بنا دیا خدا کے پاک رسولوں کی سخت ہتک کرنا ہے۔ ایسا ہی خدا نے اور  
 اُس کے پاک رسول نے بھی مسیح موعود کا نام نبی اور رسول رکھا ہے اور تمام  
 خدا تعالیٰ کے نبیوں نے اُس کی تعریف کی ہے اور اُس کو تمام انبیاء کے صفات کاملہ  
 کا مظہر ٹھہرایا ہے۔ اب سوچنے کے لائق ہے کہ امام حسین کو اُس سے کیا نسبت  
 ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اُن اور اجدادِ پیش اور تمام نبیوں کی شہادت  
 سے مسیح موعود حسین سے افضل ہے اور جامع کمالیت متفرق ہے۔ پھر اگر  
 درحقیقت میں ہی مسیح موعود ہوں تو خود سوچ لو کہ حسین کے مقابل مجھے کیا وجہ  
 دینا چاہیے اور اگر میں وہ نہیں ہوں تو خدا نے صدرا نشان کیوں دکھلائے اور  
 کیوں وہ ہر دم میری تائید میں ہے؟

دوسرے مقام پر مرزا صاحب شیعہ حضرات کو مخاطب کر کے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ  
 تعالیٰ عنہ کی یوں کسر شان کرتے ہیں۔

اے قوم شیعہ! اس پر اصرار مت کرو کہ حسین تمہارا منجی ہے کیونکہ میں سچ پتہ



کتابوں کے کچھ تم میں ایک ہے کہ اس حسی سے بڑھ کر ہے۔

کربلائیت سیر ہر آنم  
صد حسین است در گریبانم

کنواری بتول حضرت مریم علیہا السلام پر نکاح کرنے کی تحت لگا کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعین کرتے ہوئے مرزا صاحب نے یوں اپنے کذاب ہونے کا ثبوت دیا ہے:

مریم کی وہ شان ہے جس نے ایک وقت تک اپنے تئیں نکاح سے روکا، پھر بزرگان قوم کے نہایت اصرار سے بوجہ عمل کے نکاح کر لیا۔ گو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ رنلاں تعلیم توریت عیسیٰ میں کیوں کیا گیا اور بتول ہونے کے بعد کو کیوں نامن توڑا گیا اور تعداد ازواج کی کیوں بنیاد ڈالی گئی یعنی باجوہ ریست نجار کی پہلی بیوی کے ہونے کے مریم کیوں راضی ہوئی کہ ریست نجار کے نکاح میں آوے، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سب مجبوریاں تھیں جو پیش آ گئیں، نہ

فرضی ریست نجار کو مرزا صاحب نے اپنی نعلت سے مجبور ہو کر عیسیٰ علیہ السلام کا والد بھی لکھا ہے۔  
شلاً،

حضرت مسیح ابن مریم اپنے باپ ریست کے ساتھ بائیس برس تک نجاری کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظاہر و باہر معجزات کے بارے میں مرزا صاحب یوں لکھتے ہیں  
دُھول جھونکتے ہیں:

”جیسا یوں نے بہت سے آپ کے معجزات لکھے ہیں مگر حق بات یہ ہے کہ آپ سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا اور اُس دن سے کہ آپ نے معجزہ مانگنے والوں کو گندی نکالیاں دیں اور اُن کو حرام کار اور حرام کی اولاد ٹھہرایا، اُسی روز سے شریفوں نے

۱۔ غلام احمد قادیانی: درشمین، ص ۲۸۷

۲۔ غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۱۶ ۳۔ غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، ص ۳۰۳

آپ سے کنارہ کیا؟

دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار اور پیشگوئیوں کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے لکھا ہے،

”اگر مسیح کے اصلی کاموں کو ان حواشی سے الگ کر کے دیکھا جائے جو بعض افراد کے طور پر یا غلط فہمی کی وجہ سے گھڑے گئے ہوں، تو کوئی عجوبہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مسیح کے معجزات اور پیشگوئیوں پر جس قدر اعتراض اور شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی لادینی کے خوارق یا پیش خبریوں میں کسی ایسے شہادت پیدا ہوتے ہوں۔ کیا تالاب کا قفقہ کسی معجزات کی رونق دہن نہیں کرتا اور پیشگوئیوں کا حال اس سے بھی زیادہ تر اتر ہے۔ کیا یہ بھی کچھ پیش گوئیاں ہیں کہ زلزلے آئیں گے، مری پڑے گی، لڑائیاں ہوں گی، قحط پڑیں گے؟“

فری تالاب کا بہاؤ بنا کر مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ خلق طیر کے بارے میں تحریر کیا ہے:

”یہ اعتقاد بالکل غلط اور فاسد اور مشرکانہ خیال ہے کہ مسیح مٹی کے پرندے بنا کر اور ان میں چھوٹک کر انھیں پچ کے جانور بنا دیتا تھا۔ نہیں بلکہ صرف عمل ترب (مسموم) تھا جو روح کی قوت سے ترقی پذیر ہو گیا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مسیح ایسے کام کے لیے اس تالاب کی مٹی لاتا تھا، جس میں روح القدس کی تاثیر رکھی گئی تھی۔ بہر حال یہ معجزہ صرف کھیل کی قسم میں سے تھا اور مٹی درحقیقت ایک مٹی ہی رہتی تھی جیسے سامری کا گوسالہ؟“

اسی معجزے کے بارے میں مرزا صاحب نے اپنے خیالات کا اس طرح بھی اظہار کیا ہے:

حضرت مسیح کا معجزہ پرندے بنا کر ان میں چھوٹک مار کر اڑانا، حضرت سلیمان کے معجزہ کی طرح صرف عقلی تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان دنوں ایسے امور کی طرف

لے غلام احمد قادیانی: ازالہ اوہام، ص ۲۰۲

لے ایضاً، ص،

لوگوں کے خیالات بھکے ہوئے تھے کہ جو شعبہ بازی کی قسم میں سے دراصل بے سود اور حرام کو فریفتہ کرنے والے تھے۔

مرزا صاحب نے مذکورہ تالاب کو سراہتے ہوئے اعجاز عیسوی کے بارے میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر یوں دریدہ دہنی کی ہے:

”اگر آپ سے کوئی معجزہ بھی ظاہر ہوا ہو، تو وہ آپ کا نہیں بلکہ اسی تالاب کا معجزہ ہے اور آپ کے ہاتھ میں سوا تے کرو فریب کے اور کچھ نہ تھا۔“

معجزات کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر مرزا صاحب کا براہ راست جارحانہ حملہ ملاحظہ ہو:

”یہود عیسیٰ کے بارے میں ایسے قوی اعتراض رکھتے ہیں کہ ہم بھی جواب میں حیران ہیں، بغیر اس کے کہ یہ کہہ دیں کہ ضرور عیسیٰ نبی ہے کیونکہ قرآن نے اس کو نبی قرار دیا، اور کوئی دلیل ان کی نبوت پر قائم نہیں ہو سکتی بلکہ ابطال نبوت پر کئی دلائل قائم ہیں۔“

اب عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر منیر زنادِ مجال کے اس وصال کے ظالمانہ اور جارحانہ حملے ملاحظہ ہوں:

”مسیح کی راست بازی اپنے زمانے میں دوسرے راست بازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی بلکہ عیسیٰ کو اس پر ایک فضیلت ہے کیونکہ وہ شراب نہ پیتا تھا اور کبھی دستنا کہ کسی فحشہ عورت نے اپنی کلنی کے مال سے اس کے سر پر عطر ملا تھا یا ہاتھوں اور اپنے سر کے بالوں سے اس کے بدن کو چھوا تھا یا کوئی بے تعلق جوان عورت اس کی خدمت کرتی تھی۔ اسی وجہ سے خدا نے قرآن میں یحییٰ کا نام حضور رکھا مگر مسیح کا نہ رکھا کیونکہ ایسے قہقہے اس نام کے رکھنے سے مانع تھے۔“

اسی روش کو جاری رکھتے ہوئے مرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:

لب غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، ص ۲۰۲      لے ایضاً: حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم، ص ۷  
لے ایضاً: اعجاز احمدی، ص ۱۳      لے ایضاً: دافع البلاد، ٹائٹل پیج، ص ۳

”آپ کا کنجریوں سے میلان اور صحبت بھی شاید اسی وجہ سے ہو کہ جہدی مناسبت درمیان ہے ورنہ کوئی پرہیزگار انسان ایک جوان کنجری کو یہ موقع نہیں دے سکتا کہ وہ اُس کے سر پر اپنے ناپاک ہاتھ لگا دے اور زنا کاری کی کمانی کا پلیڈر اس کے سر پر لے اور اپنے بالوں کو اُس کے پیروں پر لے۔ سمجھنے والے انسان سمجھ لیں کہ ایسا انسان کس سہلن کا آدمی ہو سکتا ہے؟“

موصوف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اقرار کیا کہ اُن کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

”یسوع تومیسع، میں اُس کے چاروں بھائیوں کی بھی عزت کرتا ہوں۔ یسوع کی دونوں بہنیں اور کو بھی مقدس سمجھتا ہوں۔“

عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریح آوری کے بارے میں مرزا صاحب کے تاثرات یہ ہیں:

”خدا ایسے شخص کو کسی طرح دوبارہ دنیا میں نہیں لاسکتا جس کے پہلے فتنے نے ہی دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔“

مرزا صاحب اپنی دریدہ دہنی اور فتنہ پردازی کی خود سزا بھگت رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سارے مدعیانِ اسلام کو ایسے دجالوں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے اور ہمیں انبیائے کرام و اولیاءِ عظام کا سچا غلام اور وارث بنائے۔ آمین

مرزا صاحب نے جب تمام انبیائے کرام سے افضل اور باکمال ابن اللہ ہونے کا دعویٰ ہونے کے دعوے کو خوب تہر کر دیا۔ انبیائے کرام کی دل کھول کر توہین و تعنیص کر چکے تو ابن اللہ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

”میں نے تجھ سے ایک خرید و فروخت کی ہے یعنی ایک چیز میری تھی جس کا تو مالک بنایا گیا اور ایک چیز تیری تھی جس کا میں مالک بن گیا۔ تو بھی اس خرید و فروخت کا

۱۔ غلام احمد قادیانی، ضمیر انجام آتم، ص ۷۔ ۲۔ ایضاً: کشتی نوح، ص ۱۶۔

۳۔ ایضاً: دافع البلاء، ص ۱۵۔

اقرار کر اور کہہ دے کہ خدا نے مجھ سے خرید و فروخت کی۔ تو مجھے ایسا ہے جیسا کہ اولاد۔  
تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔ لے  
دوسرے مقام پر لکھا ہے؛

انت منی بمنزلة ولدی۔ لے یعنی تو مجھ سے بجزا میرے فرزند کے ہے۔  
نبوت سے ابی اللہ اور ابن اللہ سے خود اللہ ہونے کا مرزا صاحب نے  
دعویٰ الہییت بقلم خود اعلان مشہور و مشہر کیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے عربی زبان  
میں تحریر فرمایا ہے؛

رأيتني في المنام عین اللہ  
وتيقنت انني هو فخلقت  
السُّوت والارض و قلت  
انا ربنا السماء الدنيا  
جما بیح۔ لے  
میں نے نیند میں اپنے آپ کو ہو ہو اللہ  
دیکھا اور میں نے یقین کر لیا کہ میں وہی  
اللہ ہوں۔ پھر میں نے آسمان اور  
زمین بنائے اور کہا کہ ہم نے آسمان کو  
ستاروں کے ساتھ سجایا ہے۔

مرزا صاحب نے ایک طرف تو نبوت کا دعویٰ ڈنکے کی چوٹ کیسا ہے لیکن دوسری  
اقبالی دگری جانب استلالی بروزی یا غیر تشویشی وغیرہ کے پردوں میں چھپانے اور آسانی  
سے یہ دہر مسلمانوں کے حلق سے پیچے امانے کی کوشش کی ہے لیکن خدا کی قدرت کہ موصوف نے  
ادعا تے نبوت کر فرمایا ہے، مثلاً جامع مسجد دہلی میں مرزا صاحب نے یہ اعلان کیا،  
ان تمام امور میں میرا وہی ہے جو درگاہ اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔  
اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار اس  
خانہ خدا (جامع مسجد دہلی) میں کرتا ہوں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم  
کا ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اس کو بے دین اور

لے غلام احمد قادیانی، دافع البلاد، ص ۸ لے غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۸۶  
لے ایضاً، آئینہ کمالات اسلام، ص ۵۶۴، ۵۶۵

دائرۃ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔

دوسرے مقام پر مرزا صاحب نے مدعیان نبوت کے بارے میں یوں حکم شرع بیان کیا ہے،

”سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے

مدعی نبوت اور رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں۔“

حکومت پاکستان نے بھی ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء کو یہی فیصلہ سنایا تھا کہ جو مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی

کی نبوت و رسالت کا قائل ہے یا کم از کم ایسے دجال و کذاب کو مسلمان شمار کرتا ہے وہ کافر و

مرتد اور دائرۃ اسلام سے خارج ہے۔ کذاب العذاب و لعذاب الاخرة اکبر و لو کانوا

یعلمون ۰

مرزا صاحب کے نزدیک غیر احمدی ہرگز مسلمان نہیں تھے۔  
مسلمانوں سے علیحدگی چنانچہ موصوف نے لکھا ہے،

”جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف

رہے گا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔“

موصوف کے خلیفہ مرزا محمد محمود قادیانی نے اس دائرے کو اور بھی وسیع کرتے ہوئے صاف لکھ دیا،

”گل جو مسلمان حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انھوں نے

حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرۃ اسلام سے خارج ہیں۔“

خود مرزا غلام احمد قادیانی نے اس معاملے کو اپنی دو لوک گفتگوں میں صاف کرتے ہوئے لکھا ہے،

”جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا۔“

احمدی حضرات کتنی غیر احمدی کے جواز سے کی نثار پڑنا ہائز شمار نہیں کرتے۔ مثلاً،

”حضرت مرزا صاحب نے اپنے مرحوم (فضل احمد صاحب) کا جنازہ محض اس لیے

۱۷ غلام احمد قادیانی: تبلیغ رسالت، جلد دوم، ص ۲۲ ۱۸ ایضاً: ص ۲۲

۱۹ ایضاً، جلد نم، ص ۱۱ ۲۰ مرزا محمود احمد خلیفہ: تبلیغ رسالت، ص ۲۵

۲۱ غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۱۶۲

نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا۔

احمدی حضرات کے نزدیک غیر احمدی کو لڑکی دینا قطعاً ممنوع اور ناقابلِ معافی جرم ہے، مثلاً، حضرت مسیح موعود نے اُس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اُس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اُس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اول حکیم نور الدین نے اُس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جامعہ سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی، باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔

مرزا صاحب نے اپنے پیروکاروں کو غیر احمدی حضرات کے پیچھے نماز پڑھنے سے قطعی طور پر منع کر دیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے غیر احمدیوں کی تین قسمیں بنا کر تینوں کے بارے میں یوں خدا کی طرف منسوب کر کے حکم سنایا تھا:

پس یاد رکھو کہ جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور کذاب یا متردّد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ اسی کی طرح حدیث بخاری کے ایک پہلو میں اشارہ ہے کہ امام مکہ منکر یعنی جب مسیح نازل ہوگا تو تمہیں دوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں، بجلی ترک کرنا پڑے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ پس تم ایسا ہی کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا الزام تمہارے سر پر ہو اور تمہارے عمل ضبط ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو؟

خلیفہ قادیان، میاں محمود احمد صاحب نے احمدی اور غیر احمدی کے مسئلے کا فیصلہ یوں سنایا

لے اخبار الفضل قادیان، ۵ ارب ستمبر ۱۹۳۱ء لے خلیفہ مرزا محمود احمد، انوارِ خلافت، ص ۹۳

لے غلام احمد قادیانی، اربعین ۳، ص ۲۴

ہمارا یہ فرض ہے کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں  
کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔ یہ دین کا  
معاملہ ہے۔ اس میں کسی کا اپنا اختیار نہیں کہ کچھ کر سکے، لے

مرزا صاحب نے اپنے مریدوں کو سبق پڑھایا تھا کہ احمدیوں کو غیر احمدی حضرات سے تعلقات  
منقطع رکھنے چاہیں، موصوف کے نزدیک مرزائی کارآمد اور مسلمان بیکار شے تھے۔ چنانچہ  
ان کا ایک فیصلہ یوں منقول ہے :

یہ جو ہم نے دوسرے مدعیان اسلام سے قطع تعلق کیا ہے اول تو یہ خدا تعالیٰ  
کے حکم سے تھا، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح  
کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور ان لوگوں کو ان کی ایسی حالت کے ساتھ  
اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا ان سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور  
تازہ دودھ میں بگڑا بھوا دودھ ڈال دیں، جو سڑ گیا ہے اور اس میں کیرے پڑ گئے  
ہیں۔ اس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح ان سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور  
نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے۔ لے

یہاں اشقر نے بڑے اختصار کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی کے مخصوص نظریات اور  
دعاویٰ چند عنوانات کے تحت بغیر کسی خاص تبصرہ اور تردید کے پیش کر دیے ہیں تاکہ مسلمانوں کو  
ان حضرات کی مفرت، اسلام دشمنی اور خارج عن الاسلام ہونے کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔  
اسی طرح گزشتہ سطور میں اشقر نے رئیس المبتدعین مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے لے کر  
مودودی صاحب اور پرویز صاحب تک کے مخصوص نظریات اختصار کے ساتھ پیش کر دیے ہیں۔  
خدا شاہد ہے کہ میرا مقصد ان کے متبعین کی خیر خواہی اور مسلمانوں کو ان کے سراسر غیر اسلامی

لے میاں محمد احمد خلیفہ، انوارِ خلافت، ص ۹۰

لے غلام احمد قادیانی، رسالہ تشہید الاذہان، جلد ۶، نمبر ۸، ص ۳۶



اور منافقانہ انداز فکر سے مطلع کرنا ہے۔ خدا کرے کہ یہ پراگندہ سطور کتنے ہی حضرات کی ہدایت کی  
 باعث بن جائیں اور جوستی مسلمان صلح کلیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور فریسی اتحاد  
 رواداری کا جھنڈا ہیفند ہو گیا ہے، ممکن ہے یہ سُرمران کی چشم بھیرت کے لیے مفید ثابت  
 ہو جائے۔ ان امرید الا اصلاح ما استطعت و ما توفیتی الا باللہ و علیہ  
 توکلت و الیہ اُنیب و وصلى الله تعالى على حبيبہ سيدنا و مولانا محمد  
 الہ و صحبہ اجمعین۔

خاکپائے علماء، محمد عبدالحکیم خاں مجددی مظہری  
 المعروف بہ اختر شاہ جہانپوری  
 دار المصنفین لاہور

باب چہارم

marfat.com

Marfat.com

شیاطین ملوکیہ کی آنکھوں میں ہے وہ چادو  
کہ ہو نچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نچیری  
(اقبال)

# انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبانی

قارئین کرام! گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ انگریزوں نے بعض علماء کو کس طرح خرید کر اپنے تخریبی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اسلام کا حلیہ بدلنے اور مسلمانوں کی مختلف ٹولیاں بنانے میں کس طرح ان حضرات نے اسلام دشمن حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ انگریزوں کے ساتھ اس تخریب کاری میں متفق راستے ہونے والے بعض علماء کی گزشتہ صفحات میں نشان دہی کی جا چکی ہے۔

بعض مبتدعین کے علماء و مورخین بغض معاویہ میں یا اپنے اکابر کی انگریز دوستی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے علمائے اہلسنت کے بارے میں عوام کو پھیلنے اور جہلاء میں اپنا بھرم بنانے رکھنے کی غرض سے مفروضات کا سہارا لے کر لکھ مارتے ہیں کہ اگر فلاں عالم انگریزوں کا ایجنٹ نہیں تھا تو اس نے ہمارے فلاں فلاں بزرگ کی تکفیر کیوں کی؟ یا چونکہ فلاں عالم نے تحریک خلافت یا فلاں گاندھی منسوبے کی حمایت نہیں کی تھی لہذا ثابت ہوا کہ وہ مولوی انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ ایسے انصاف دشمن اور اسلامی تعلیمات سے نا آشنا حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح خلاف دیانت بھناؤ و غلط تاثرات پھیلانا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ آخر خدا کے ولیوں اور مقبول بندوں سے بغض و عداوت رکھ کر، اللہ تعالیٰ سے لڑائی مول لینے میں دارین کی کون سی بھلائی کاراڑہاں ہے؟

ایسے حاسدین اور انصاف کا خون کرنے والے محققین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت اور اصلیت کے میدان میں یہ اگر، مگر اور چونکہ، چنانچہ کے سہارے بے معنی اور فضول ہوا کرتے ہیں۔ کیا کسی پر اتنا بڑا الزام صرف مفروضات کی بنا پر عائد کیا جاسکتا ہے؟ کیا فرضی مغالطوں میں بھی عقلاء کے نزدیک کوئی وزن ہوا کرتا ہے؟ اگر مخالفین اہلسنت اور مبتدعین زمانہ کے پاس علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کا ایک بھی ٹھوس اور یقینی ثبوت ہے تو بڑے شوق سے اسے پیش کریں۔ لیکن یہ مد نظر رہے کہ قَانَ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَالْقَوْلُ الشَّرَّاءُ الَّتِي وَقُودُهَا

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ اگر ایک ثبوت بھی نہ لاسکو اور ہم کہہ دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی امد پتھر ہیں، وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

برٹش گورنمنٹ کے پروردہ علماء نے شریعت اسلامیہ کو غتر برد کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، تاریخ گزشتہ باب میں ملاحظہ فرما چکے۔ ان حضرات کی انگریز دوستی کے اگرچہ سیکڑوں بیانات پیش نظر ہیں لیکن نجوم طوالت ماقلاً وکفائی کے تحت چند حوالے پیش خدمت ہیں۔  
وَاللّٰهُ التَّوَفِیْقُ۔

### ۱۔ سید احمد صاحب بریلوی

سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا جب مولوی محمد اسمعیل دہلوی سے معاملہ طے ہوا تو آپ نواب امیر خاں پنڈاری کے ہاں جا کر ملازم ہو گئے۔ وہاں ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء تک تقریباً سات سال رہے۔ ان ایام میں نواب امیر خاں کی پوزیشن کیا تھی؟ اس بارے میں غلام رسول مہر یوں لکھتے ہیں:

”غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جانبار جمع ہو گئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں۔ اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلب ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، لیکن انھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں، اس لیے کہ جانتے تھے، من چلا آدمی ہے، مقابلہ پر ڈٹ جاتے گا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی جو بظاہر دب گئی تھیں، ابھر آئیں اور ہمیں بستر بوریہ سنبھال کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وہ امیر خاں سے ٹکراتے نہیں، لیکن جو عناصر اس کے لیے لگک ویاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے انھیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے یہاں تک کہ اس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دو انیاں خاصی پھیل گئی۔“

۱۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۹۱۔ ۹۲

جب نواب امیر خاں انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا تو دیوں کو دیوں سے راہ ہوتی ہے، اُن دنوں سید صاحب کو بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام ہو رہا تھا۔ کس بات کا الہام ہو رہا تھا؟ مہر صاحب بتاتے ہیں :

”خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بنا پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔ واقع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا: ”قصہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مرادہ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آکر ملازمت نواب صاحب مدوح کی حاصل کی۔“

نیز منظورہ صفحہ ۲۳۲ کے حوالے سے موصوف یوں رقمطراز ہیں :

”از زمانیکے حضرت امیر المؤمنین — بنا بر الہامیکہ در باب اقامت جہاد می شد، راہگزارتے لشکر ظفر اثر — امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند“ جس زمانے میں حضرت امیر المؤمنین اقامت جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بنا پر امیر الدولہ نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ ہوئے؟ شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے سید صاحب نے نواب موصوف کی فوج میں ہجرتی ہونے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ وہ پیر و مرشد تھے۔ جناب غلام رسول مہر اس خیال کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کی تحقیق یہی ہے کہ شاہ صاحب کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

”جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اُس سے صاف آشکارا ہے کہ سید صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا، شاہ صاحب کے امر و حکم کو اس اقدام سے کوئی تعلق

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۸۷

۲۔ ایضاً: ص ۸۷

نہ تھا۔ انھیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہوا کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔

نواب کی فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یوں رقمطراز ہیں،  
 ”جب سید صاحب نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خاں کے آگے پیش کیے گئے۔ وہ دیکھ کے بہت خوش ہوا اور اس نے یہ کہا، اگر اپنی جان کھپا کے محنت کی اور اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار فوج کا افسر بنا دوں گا۔“

سید صاحب نے الہام کی ہدایات کے مطابق خوب اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تاکہ نواب کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ ساتھ ہی نواب موصوف کی خیر خواہی کا پوری طرح دم بھرتے رہے۔ آخر کار منزل مقصود ہاتھ آگئی۔ یعنی:

”جب پلے درپلے یہ باتیں سید احمد صاحب سے ظہور پذیر ہوئیں، پھر تو امیر خاں نے اپنا مشیر مقرر کر لیا اور کوئی کام بغیر آپ کے مشورہ نہ کرتا تھا۔ ساتھ ہی ان کا مایوسیوں کے جو سید صاحب کو حاصل ہوئیں، یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے اس ترقی پر بھی اپنے فرائض کے انجام دینے سے (جو الہام کے ذریعے تفویض ہوئے تھے) پہلو تہی نہ کی۔“

سید صاحب نے نواب کے پاس کس قسم کے اکلِ علال سے ولایتِ انبیاء کی منازل طے کی تھیں۔ اس حقیقت کے چہرے سے مرزا حیرت دہلوی نے یوں نواب اٹھارہ حقیقت کو واضح کیا ہوا ہے:

”امیر خاں کے لشکر کی کوئی باقا عدہ تنخواہ نہ تھی۔ کسی ریاست پر چھاپہ مارا،

۱۔ غلام رسول تہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۹۲

۲۔ مرزا حیرت دہلوی، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۹

۳۔ ایضاً: ص ۳۵۹

اگر وہاں سے کچھ ہاتھ لگا گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے، ٹیروں کی سی کیفیت تھی۔ کبھی بچے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جو دھ پور پر جا دوڑا وہاں ایک حکم مچا دی..... امیر خاں کے سپاہیوں کی زندگی جس قدر خطرناک تھی اسی قدر چاق و چست اور شمشیر زنی میں بسر ہوتی تھی، جو سپاہیانہ قالب کی سچی روح ہے! لے

”سید احمد صاحب تقریباً سات برس تک امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ کو بارہا مختلف جنگوں میں جانے اور توپ و بندوق و تلوار سے کام لینے کا موقع پڑا ہوگا۔ کہیں کسی کے ساتھ آپ نے حملہ کیا ہوگا تو کہیں سرکش گاؤں کو لوٹا کھسوتا ہوگا۔ غرض ساری ہی باتیں جن سے جنگ و غارت تعبیر ہو سکتی ہے عمل میں آئی ہوں گی۔“ لے

سید احمد صاحب کو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور اُس کی فوج میں بھرتی ہونے کا الہام کیوں ہوا تھا اور کس کی طرف سے ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب موصوف کی کارگزاری میں ہی مل سکتا ہے کہ اُن کا مشن کیا تھا، اور کب انہوں نے اپنے فرض منصبی کو پورا کر کے نواب کو خیرباد کہا۔ مولوی محمد جعفر اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

”ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اُس وقت سید صاحب اپنے نیچے میں تشریف رکھتے تھے، آپ نے اپنا گھوڑا تیار کر دیا اور اُس پر سوار ہو کر مثل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔ پس وہاں سے اُس سپہ سالار کو ساتھ لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے



اپنے نیچے تک چلے آئے۔ یہاں اگر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالار مذکور نے عہد کر لیا کہ میں اسی دم اپنے لشکر کو مقابلہ نواب امیر خاں سے واپس لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا، بلکہ جہاں تک ممکن ہو گا اپنی سرکار کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیر خاں سے صلح کر لے۔ اس واقعہ کے بعد پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صلح کی بات چیت اور رسل و رسائل شروع ہو گئے اور لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کی گئی۔

یہ تھا سید احمد صاحب کا مشن کہ نواب امیر خاں کا اعتماد پورے طور پر حاصل کر کے انگریزوں کے حق میں نصحاء ہموار کرتے اور نواب کی جڑیں کاٹتے رہے۔ عین مقابلہ کے وقت ظاہر ہوئے کہ انگریزی فوج میں بھی صحیح خاصہ کی طرح دندان بستے پھر رہے تھے اور کسی نے روکنے ٹوکنے کی ضرورت تک نہ سمجھی۔ امیر خاں کی آنکھیں کھلیں لیکن اس وقت جب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ مجبوراً صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔ تھانیسری صاحب آگے یوں تصریح کرتے ہیں:

’ابھی صلح کی بات چیت طے نہیں ہوئی تھی کہ سید صاحب سات برس کے قیام کے بعد پھر لشکر نواب امیر خاں سے لڑنا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے گئے..... اپنے چلنے کے وقت آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی، جس کو نواب وزیر الدولہ مرحوم (ابن نواب امیر خاں) اپنے وصایا و زیری میں اس طرح لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مولوی نذر محمد صاحب سے کہ وہ بھی اس لشکر میں موجود تھے اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ ’اب جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقہ سرکار انگریزی نواب صاحب کو دے دے گی اور ایک زمانہ دراز گزرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ میں بھی ایک لشکر مجاہدین کا ساتھ لے کر نشانوں کے پھر سے اڑاتا ہوا نواب

امیر خاں صاحب کے ملک سے گزروں گا۔ اس پیشین گوئی کے ذکر کرنے کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ "موافق اس پیشین گوئی کے جو جو شہر اور خاک آپ نے بلائے تھے ٹھیک وہی سرکار انگریزی نے ہم کو دئے اور صلح ہو گئی۔"

موصوف کا بیان چونکہ نواب وزیر الدولہ ابن نواب امیر خاں کی کتاب "دصایا وزیری" کے حوالے سے ماخوذ اور مدلل ہے لہذا قابل تقسیم ہونے میں کیا شک و شبہ رہا بہ مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سید احمد صاحب جو پیشگوئیاں کر رہے تھے اور موصوف پر جو المامات کی بارش ہو رہی تھی اس کا معدن و مصدر برٹش گورنمنٹ ہی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ حوالوں کی روشنی میں ہر منصف مزاج نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے مرزا حیرت دہلوی کی تصدیق بھی قابل غور ہے موصوف لکھتے ہیں:

"آخر کار ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کر لیا، جیسے بے پورے ٹونک دلویا اور جوپال سے سروج، اسی طرح مختلف پرگنوں مختلف ریاستوں سے بڑی قبیل و قال کے بعد انگریزوں نے دلوا کے بھرے ہوئے شیر کو اس حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا۔"

اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی نے بھی لکھی رکھے بغیر صورت حال بیان کی۔ مذکورہ حوالہ میں بعض جگہ چونکہ اجمال سے کام لیا گیا ہے لہذا ان باتوں کی تفصیل کے لیے موصوف کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا:

"۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے، مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دئے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے دیکھنے پائے تھے۔ لاڈ ہیسٹنگس سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے

لے محمد جعفر قاضی، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۱۷

حیرت دہلوی مرزا حیات طبر، مطبوعہ

بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اُس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا، امیر خاں، لارڈ ہیڈنگٹ اور سید احمد صاحب۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا۔ آپ نے اُسے یقین دلایا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑانا اگر تمہارے لیے بڑا نہیں ہے تو تمہاری اولاد کے لیے تم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت و ن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے در پے تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابلے میں کون میدان جنگ میں لاسکے جمائے گا، یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آگئی تھیں اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کے لیے کچھ ٹکڑے دے دیا جائے تو میں با آرام بیٹھوں۔“

سید صاحب کو جو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور وہاں اپنی کارگزاری دکھانے کا الہام ہوا تھا۔ موصوف نے اُس پر عمل کرنے کی غرض سے لوٹ مار، قتل و قتال اور فساد و دہشت انگیزی وغیرہ سی چیزیں بھی وہاں قابلِ نفرت نہ سمجھا اور یہ لوٹ مار اور سپردِ استبداد سے حاصل کیے گئے مال کو اکل حلال کے درجے سے ذرا بھی گرا ہوا نہ گردانا کیونکہ اُن دنوں سید صاحب اُن کے معتقدوں اور سوانح نگاروں کے مقدر سے ولایتِ انبیاء کی منازل کو سبک رفتاری سے طے کر رہے تھے۔ جب سات سال محنتِ شاقہ اور سعیِ پیہم کے باعث سید صاحب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے، نواب امیر خاں کو شیشہ میں اتار لیا، اُس پھر نے جوئے خیمہ کو انگریزوں کے پنجے میں بند کروا دیا اور اس طرح اپنے کلمہ (لارڈ ہیڈنگٹ) کو اپنی اس بے نظیر کارگزاری سے خوب خوش کر لیا تو موصوف انتہائی احترام کے مستحق قرار پا گئے۔ چنانچہ خاندانِ سید صاحب کے چشم و چراغ، مولوی سید ابوالحسن مدوی لکھتے ہیں کہ:

”قلعہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سو کی تعداد میں تھے اُنہوں نے انگریز قلعہ دار کی اجازت سے حضرت (سید صاحب) کو

قلعہ میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہر نشین پر جو سلاطین سابق کی تخت گاہ تھی،  
آپ کو بٹھایا اور بڑے خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت کی۔ اے

چونکہ سید صاحب سکھوں سے لڑنے کی تیاریاں کرنے والے تھے۔ اس لیے بطور شکریہ انگریزوں  
نے بھی موصوف کے راستوں میں دیدہ و دل فرس راہ کیے ہوئے تھے۔ سید صاحب بھی  
انگریزوں کی اس عقیدت کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور حتی الامکان کسی عام انگریز کو بھی  
مایوس نہیں کرتے تھے مثلاً:

”جہاں آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد  
نے دعوت کی اور سیکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک  
انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اُس کی  
دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اُس کی  
دعوت نہ مانیں لیکن میری دعوت قبول کر لینے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے  
انگریز کی دعوت قبول کر لی۔“

انگریزوں کے اسی ہڈیے لشکر کی کہانی جناب غلام رسول مہر کی زبانی مزید پیش خدمت ہے:  
”صبح کو ڈوڈاگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں  
باندھیں، جہاں اُس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین  
دور دور تک اِس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اِس اثنا  
میں کالی گھٹا اٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ انشانی شروع ہو گئی۔ سب نے سمجھ  
لیا کہ رات کھانے بغیر گزارنی ہوگی۔ اچانک دُور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ  
کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آرہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیل کے انگریز تاجر  
نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاس خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود  
گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔“

۱۔ ابراہیم علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ۱۹۶

۲۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰

۳۔ ایضاً: ۱۸۹

جب دعوتوں کا تذکرہ ہی شروع ہو گیا تو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی بھی ایک عقیدت مندی کی اس سے بھی عظیم الشان دعوت کا بیان سن لیا جائے۔ چنانچہ موصوف یوں وضاحت فرماتے ہیں:

”جب وہ مشعلیں کنارے کے نزدیک پہنچیں تو دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار مختلف قسم کا بہت سا کھانا ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ اُس نے کشتی کے نزدیک آکر پوچھا: پادری صاحب کہاں ہیں؟ جب حضرت نے کشتی میں سے جواب دیا تو وہ گھوڑے سے اتر کر اور اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بہت ادب سے حضرت کے سامنے کشتی میں آیا۔ بعد سلام و مزاج پرسی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے حضور کی تشریف آوری کی خبر لانے کے لیے نوکر اس طرف متعین کر رکھے تھے، سو آج اُنھوں نے مجھ کو خبر دی، لہذا یہ حاضر، حضور اور کل قافلے کے لیے تیار کر کے لایا ہوں، براہ بندہ نوازی اس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کر دو۔ تقریباً دو گھنٹی تک وہ انگریز حضور میں حاضر رہا، پھر رخصت لے کر مع اپنے آدمیوں کے واپس چلا گیا۔“

دعوتوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ سید احمد صاحب اس تیاری جنگ کے سلسلے میں جب تک ہندوستان میں رہے تو انگریزوں کو قاتلاً وقتاً اس قسم کی ناز برداری کرتے رہے اور جب اپنی جمعیت کو لے کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں خبرگیری کا بھی حکومت نے انتظام کیا ہوا تھا۔ اس قافلے کی مذکورہ ضیافت کے واقعے کو سید ابوالحسن علی ندوی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

”اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریز گھوڑے پر سوار چند پاکیزوں میں کھانا رکھے کشتی کے قریب آیا اور پوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے کشتی پر سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ انگریز گھوڑے پر سے اتر کر اور ٹوپی ہاتھ میں

یہ کشتی پر پہنچا اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ تین روز سے میں نے اپنے ملازم یہاں کھڑے کر دیئے تھے کہ آپ کی اطلاع کریں۔ آج انہوں نے اطلاع کی کہ اغلب یہ ہے کہ حضرت قافلہ کے ساتھ تمہارے مکان کے سامنے پہنچیں۔ یہ اطلاع پا کر غروب آفتاب تک میں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کرانے کے بعد لایا ہوں۔ سید صاحب نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کر لیا جائے۔ کھانا لے کر قافلے میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز دو تین گھنٹہ ٹھیکر چلا گیا۔

جب انفرادی دعوت سے کھانے کی بھری ہوئی چند پالکیوں اور پلاؤں سے دستے تکسبات آگئی تو اب پورے قافلے کی اُن عظیم الشان دعوتوں کا تذکرہ بھی کیوں نہ کر ہی دیا جائے جن کی نظیر چشم فلک گہن نے اُس وقت سے پہلے یا اُس وقت سے لے کر اب تک، بڑھتی چلی اور ہند کی زمین پر نہ دیکھی ہوگی۔ ضیافت اور دعوت پر ہی کیا منحصر، معلوم یہی ہوتا ہے کہ اسی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور بظاہر تو منظم فلاں ابن فلاں نظر آ رہے تھے لیکن اندرون خانہ حکومت ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ خوب کھلا پلا کر، ہر طرح آراستہ و پیراستہ کر کے، قربانی کے بکرے بنا کر، اپنے اقتدار کی بلائیں اتارنے کے لیے بالاکوٹ میں بھینٹ چڑھانے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ یہ حضرات ان ناز برداریوں میں ایسے مست ہوئے کہ جاموں میں پھولے نہ مانتے۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پر شاد ہے  
صیاد مطمئن ہے کہ کاٹا ننگل گئی

سید صاحب کے اس قافلے کی الہ آباد میں کس طرح ضیافتیں ہوئیں، کس قدر سامان امداد کے طور پر دیا گیا، یہ موصوف کے نامور سوانح نگار جناب غلام رسول مہر کی زبانی پیش خدمت ہے:

شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیامِ الہ آباد میں کوئی صاحب سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا جائے۔

ہاں اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذریں پیش کریں، کھانا نہ کھلائیں۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الہ آباد میں ٹھہرے رہے پورے قافلے کی مہمان داری شیخ غلام علی نے فرمائی اور کس شان و اہتمام کے ساتھ، آج اُس کی تفصیلات سن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے۔ حالانکہ شیخ صاحب نے تو اوضاع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اُس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والی بنارس کے ممتاز تھے۔ انھوں نے سید صاحب کو ایک کونٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لیے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کا کھانا قیام گاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا؛ ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں مثلاً قورمہ، پلاؤ، زروہ، شیرمال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اُس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی لیکن شیخ صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اُنس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں بچید ازراں تھیں۔

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے۔ ایک مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب۔ دونوں مرتبہ پیش بہانہ تھیں ساتھ لائے مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں، بعض اوقات نقد روپے لے آتے۔ نعت کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب سے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بحیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی.....

اسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے تیار کرائے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک

جوڑی تئے جڑتے، مردوں کو دو روپا جاسے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں او  
ایک ایک چادر۔ مستورات کو دو روپا جاسے، دو دو کُرتے اور دو دو روپے ڈیئے۔  
سب کو سیر عام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقرباء کی خدمت میں  
دس دس روپے فی کس پیش کیے۔ علماء کی خدمت میں اُن کی حیثیت و مرتبہ  
کے مطابق نذریں گزرائیں۔

سید صاحب کے لیے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ  
لے کر آتے۔ دونوں وقت کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔  
ایک روز سید صاحب کی دونوں بیٹیوں کو اسی اسی روپے دیئے گئے۔  
لُطفت یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تھی دستی کا اظہار  
فرماتے۔

رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ  
بیس بچیس کشتیوں میں لگا ہوا تھا۔ اُس میں مشروع، کھواب، پشمینے، یینو،  
ڈھا کے کی ٹمل، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری  
شال بھی۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوبصورت  
مُطلا اور مذہب قرآن مجید نذر کیے۔ ایک مکہ معظمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ  
کے لیے۔ تمام اہل قافلہ کے لیے نو نو دس دس ہاتھ لہے جا بہ ہائے اجرام تھے،  
جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہوتے۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے ان  
کے علاوہ تھے، تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔

اس کے بعد قیامِ کلکتہ کے دوران منشی امین الدین نے اس قافلے کی جو خاطر و مدارات کی یا ان کے  
ذریعے کسی نے کروائی اُس کا تذکرہ پہلے مولوی محمد جعفر تھانہ سیری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے،  
وہ لکھتے ہیں:

لہ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰-۱۹۲



”اُس وقت منشی امین الدین صاحب وکیل سرکاری جو کلکتہ کے مسلم روڈ میں تھے مع بہت سے عمائد ساکنانِ کلکتہ کے خدمت شریف میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کلکتہ میں قیام تک اس خاکسار کے غریب خانہ میں مقیم رہیں اور جو نان و نمک میسر ہوں قبول فرمائیں۔ حضرت نے اُن کی درخواست کو قبول کر لیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اور بہت سے شریف و نجیب کلکتہ کے وہاں پہنچے اور حضرت کو اپنے اپنے مکانات کو لے جانا چاہا۔ مگر چونکہ حضرت نے منشی امین الدین سے وعدہ کر لیا تھا، اس واسطے اُن کی درخواست کو منظور فرمایا۔ نماز مغرب کے بعد اول حضرت بہ سواری پاکلی منشی امین الدین کے مکان کو تشریف لے گئے اور پھر منشی صاحب نے ہر قسم کی سواریاں بھیج کر آدھی رات تک سارے قافلے کو اپنے مکان میں پہنچا دیا۔

ایک عمدہ باغ میں قافلے کا ڈیرہ کرایا گیا۔ رات کو نہایت عمدہ اور پر تکلف کھانا منشی صاحب کے پہاں سے آیا اور با فراغت سارے قافلے نے سیر ہو کر کھایا۔ صبح کو منشی صاحب نے سارے قافلے کے واسطے جوتے خرید کر ہر ایک کو تقسیم کر دئے۔ جس کے پاس کپڑا نہ رہا تھا اُس کو کپڑا بنا دیا۔ لیکن اس تاریخ سے سید صاحب کو اس مکان میں اتار کر جو منشی امین الدین صاحب رخصت ہوئے پھر اُنہوں نے کبھی مُنہ نہ دکھلایا، اگرچہ دونوں وقت اُن کے یہاں سے سارے قافلے کو کھانا آتا تھا اور اُن کے آدمی ہر وقت خدمت کے واسطے موجود رہتے تھے، مگر وہ خود کبھی نہ آئے۔ اسی طرح تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔“

پرنس گورنمنٹ کے اس سرکاری وکیل یعنی منشی امین الدین نے سید احمد صاحب اور اُن کے قافلے کی جس طرح خاطر مدارات کی اُس کا نقشہ جناب غلام رسول مہرنے اپنی ٹوڑ خانہ شان

کے ساتھ یوں کھینچا ہے :

”منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری بچھوادی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بخت منگالی تھیں مثلاً پنیس، ڈولیاں، گھیاں، کراچیاں، ہوا دار وغیرہ۔ بار برداری کے لیے چھکڑے موجود تھے۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا۔ پھر مرد سوار ہوئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔ منشی صاحب سید صاحب کو پنیس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے، پھر قیام گاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمزرفرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھہرنے کی درخواست کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقراء ہو چکا ہے اس لیے معذور ہوں، البتہ دعوت قبول کروں گا۔ تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پرتکلف کھانے آتے رہے، مثلاً قورمہ، شیرمال، باقر خاںیاں، ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، کئی قسم کے مرتے اور اچار، کئی قسم کے میٹھے، سید صاحب کے لیے جو کھانا آتا اس میں اور بھی کئی قسمیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے صرف ایک قسم کا کھانا آتے، انواع و اقسام کے کھانے کو اہل قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلفات کو اچھا بھی نہیں سمجھتے۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا اس لیے تکلفات میں مزید اہتمام و اضافہ کر دیا۔“

موصوف نے منشی امین الدین صاحب کی فیاضی یا ان کے حاکموں کی ذرہ نوازی کو مزید یوں بیان کیا ہے:

لے غلام رسول قہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ۲۰۶

”منشی صاحب نے پورا بانٹ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اُس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انجیر، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگور کی بلیں بھی تھیں، انناس بھی تھے۔ سید صاحب کے رفیقوں کی تقویٰ شعائر کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا ایک طرف، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے انہیں بھی کوئی نہ اٹھاتا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہو جاتے آپ پورے قافلے میں تقسیم فرمادیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوتے ٹوٹ گئے تھے ”مخزن احمدی“ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے۔“

یہ منشی امین الدین کون تھے اور ان کا کاروبار کیا تھا؟ ان کا انگریزوں سے کوئی تعلق دور یا نزدیک کا تھا یا نہیں؟ ان جملہ امور کی وضاحت سید احمد صاحب کے عاشق زار اور وہابی بیڑے کے مورخ نامدار عالی جناب غلام رسول مہرنے یوں دادِ تحقیق دیتے ہوئے فرمائی ہے:

اُس مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں جسے پنیش کہتے تھے ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا، امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز ایروں میں گئے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انہیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر نہ تھی، لیکن حق وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحب ”مخزن احمدی“ کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر

اے غلام رسول تہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۸

## لڈکران کے گھر پہنچتی تھیں : ۱

کیا یہ امر جانے غور ہے یا نہیں کہ سید احمد صاحب کی صحبت سے منشی امین الدین احمد ابھی فیضیاب بھی نہیں ہوئے بلکہ زیارت کا شرف تک نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود سید صاحب جو ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہیں کہ انھیں پنیں میں لے جانے کے لیے منشی امین الدین کس طرح اور کیوں آئے؟ کیا انھیں الہام ہو گیا تھا کہ فلاں صاحب آرہے ہیں انھیں اپنے پاس لے آؤ۔ بغیر کچھ دیکھے جانے، انھیں سید صاحب سے عقیدت کس طرح ہو گئی؟ کیا یہ رازداری کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارنامہ تو نہ تھا؟ شاید پورے ہندوستان میں یہ صاحب کی اتنی اوجھلت اور عقیدت کا اہتمام نہ ہوا ہو جیسا انگریزوں کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ میں ہوا، حالانکہ کلکتہ ان دنوں انگریزوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آخر ان لوگوں کو انگریزوں کے علاوہ اس ڈرامے کے پارٹ ادا کرنے پر اور کس نے مائل کیا تھا؟ قبل ازیں خود منشی امین الدین احمد بھی ایسی عقیدت سے نا آشنا اور بقول غلام رسول مہر، ہدایت سے محروم تھے۔ موصوف نے وضاحت کی ہے:

”جن لوگوں نے سید صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی ان میں خود منشی امین الدین احمد

کا ذکر بھی ضروری ہے : ۲

اگر منشی امین الدین احمد نے سید صاحب سے ہدایت پائی تھی تو جب سید صاحب کے قدم بھی کلکتہ میں نہیں پہنچے تھے اور وہ ابھی راستے میں ہی تھے اس وقت قبل از ہدایت یہی منشی امین الدین احمد کیوں سید صاحب کو لینے کے لیے پہنچ گئے تھے؟ کیا یہ اس قافلے کے لیے رازداری کے ساتھ خود برٹش گورنمنٹ کا انتظام نہیں تھا؟ انگریزوں کی اس بستی میں، انگریزوں کی حوصلہ افزائی کے سہارے اتنی اونچی پرواز اڑنے لگے کہ پیشگوئی کے مزدے دیتے رہے اور انگریزوں کے خفیہ انتظامات کو اپنی کرامت سمجھتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

”سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا تھا کہ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں لیکن خدا کے فضل سے اُمید ہے کہ کمپنی کی مہربانی سے“ کہنا

۱۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۵  
۲۔ ایضاً، ص ۲۰۹

زیادہ موزوں ہوتا، اس شہر میں بابِ ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور اس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۸۷۲ء میں سید صاحب کلکتہ آئے اور مسلم آبادی بہت بڑی تعداد میں اُن کی پیروی بن گئی۔ شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سید صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اُس سرزمین میں خاص دینی رونق پیدا ہو گئی۔

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں، آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ سید صاحب کو آرام کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ سب لوگ نیرینی لاتے اور زیادہ تر تباہیے ہوتے۔ لوگوں کے پاس خاطر سے سید صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چکھتے، اس طرح زبان مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔ بیعت کا سلسلہ دو اڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ عورتیں بھی بکثرت آتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمر بھر جاتا۔ بہت سے غیر مسلم سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ کلکتہ اصلاً انگریزی بستی تھی، وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں، شراب بکثرت پنی جاتی۔ سید صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج چھوڑا اور شراب کی دکانیں بے رونق ہو گئیں۔

انگریزوں کی اس آبادی یعنی کلکتہ میں سید صاحب کو عینی آمدنی ہوئی اُس کے بارے میں مہر صاحب یوں لکھتے ہیں:

”کلکتہ والوں کے تحائف وہ آیا کہ بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا اُس کی سرسری کیفیت یہ ہے:

۱۔ غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۹

۱۔ غشی امین الدین احمد: پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ملل وغیرہ۔ دوسری میں سو سی اور چھینٹ کے تھان، باقی گھڑیوں میں موٹا کپڑا۔ دو نہایت خوبصورت گھڑیاں۔ پانچ ہزار روپے اس غرض سے (مزید) پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقاء کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانچ سو احرام دتے۔

۲۔ امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سعید اور چھینٹ کے۔ دو شیشیاں عطر کی، جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔ ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے باصرار واپس کر دیا۔

۳۔ غلام حسین تاجر، چار جہاز پورے نذر کیے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو چکا تھا، اس لیے سید صاحب نے یہ نذر بشکر یہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقین ہے بڑی رقم بھی دی ہوگی، اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی جو سید صاحب نے اسے واپس دے دی۔ مراجعت پر سید صاحب اسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔

۴۔ شیخ رضانی: سعد الدین ناخدا، غشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکا ہیں عمرہ کے لیے باندھے جائیں، ہمارے احرام حج کے لیے استعمال کیے جائیں۔

۵۔ جس پیرزادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لیے پگڑیاں بچھائی تھیں، اس نے سو روپے پیش کیے۔ اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو، اُسے تین جوڑے نئے بنوا دیے جائیں۔ باقی لوگوں کے لیے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک سو کے لیے دو دو جوڑے سلاوا دیے گئے؛ لے

سید صاحب نے اس دورِ حج کے سلسلے میں کتنے ہی شہروں کا دورہ کیا، اُن کے ساتھ تقریباً ساڑھے سات سو آدمی جمع ہو گئے تھے جنہیں حج کے لیے ساتھ لے جانا منظور ہو گیا تھا۔ خود تو وہ بیچارے خالی ہاتھ تھے لیکن اس دورے میں کمپنی، مادر کی نظرِ عنایت سے مسلمان رئیسوں کا نام رکھ کر انھیں از شہروں کی وہ بارش ہوئی کہ جس کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے الہ آباد اور کلکتہ کے دورِ رئیسوں یعنی شیخ غلام علی اور منشی امین الدین احمد کی امداد کا ذکر کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک رہا۔ بھولے بھالے مسلمان تو اپنے پاس سے مذریں پیش کرتے کیونکہ حج کے لیے ایسا جلوس اُنھوں نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کانوں سے سنا ہوگا۔ لیکن بڑے بڑے رئیسوں نے جو ان مقصدات پر امداد کی اُس میں برٹش گورنمنٹ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم یہاں لکھ رہے ہیں۔ یہ سب پر مجبور ہیں اُن کا ذکر ہر واقعے کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ حاشا وکلا ہمیں کسی سے خواہ مخواہ لی وقت نہیں اور نہ ہم کسی پر الزام تراشی ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حقیقت کو اُس کے اصحاب تک میں پیش کیا جائے۔

سید صاحب جب اس قافلے سمیت حج سے فارغ ہو کر ہندوستان وارد ہوئے تو غلام رسول صاحب کی تحقیق کے مطابق ۶ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکتہ پہنچ گئے۔ مختلف شہروں میں آپ کو مدعو کیا گیا، کافی کافی عرصہ وہاں قیام رہا۔ باقی ماندہ قافلے کے ساتھ ضیافتیں ہوتی رہیں۔ تحفے تحائف اور نذرانے وصول کرتے ہوئے بریلی پہنچ گئے۔ یہ ۲۹-۳۰/۱۲۳۸ھ کی فتوحات کا ذکر ہے۔

اب قارئین کی توجہ سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں معتقدین کا موقف یہ ہے کہ مسکھوں کے مظالم کی بنا پر سید صاحب نے اُن سے جنگ کرنے کی ٹھانی تھی۔

سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۵

ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ نے گشت کی۔ آپ کے رفقاء یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ) کے جگہ جگہ ترغیب جہاد پر وعظ ہوئے۔ کتنے ہی مسلمان جان اور مال سے آپ کے ساتھی بن گئے۔ یہ ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۶ء میں دورہ کیا گیا۔ جب سید صاحب پوری طرح لیس ہو گئے، ساتھیوں کی بھڑنگ گئی تو عازم پنجاب ہوئے لیکن اس روانگی سے پہلے اور دوسرے کے شروع سے ہی اس الہام کا سُنا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا، جو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا اہم الہام بار بار کیا جا رہا تھا۔ وہ الہام یہ تھا:

”آپ کے سفر جہاد سے پہلے، بارہا آپ کو یہ الہام رہا ہے جو اتنا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے تادریائے ستلج (یعنی سکھوں کا علاقہ) مثل ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر مرید واقف تھا؛ لہ

سید صاحب کی نظر میں جتنے ہندوستان پر انگریزی تسلط تھا، وہ رشک افزائے چمن تھا اور ستلج سے پشاور تک کے علاقے کو بھی، جو سکھوں کے قبضے میں تھا، آپ انگریزی عملداری میں شامل کر کے، رشک افزائے چمن بنانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگانے پر تیار ہو گئے تھے، کیونکہ دوسری طرف سے بار بار الہام ہو رہا تھا۔ موصوف نے اس الہام اور متواتر وعدہ ہائے فتح کے نام سے خوب جمعیت اکٹھی کی۔ بے شمار امداد ہوئی حتیٰ کہ ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۶ھ تک کے خطوط میں بھی آپ اس الہام اور ان وعدہ ہائے فتح کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ کاشس! ان کا ضمیر بیدار ہو جاتا اور قوم کو ایسے عجیب پتھر میں پھنسا کر نہ جاتے، کیونکہ:

اپنے لائق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک

اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا، دارا و جم

سید احمد صاحب نے یار محمد خاں حاکم یاغستان کو خط لکھتے ہوئے اپنے دوسرے الہام کا خود یوں اظہار فرمایا:

سید محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۱۷۲



فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اس بشر کی اس بشارت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شاہد اس الہامِ رحمانی میں شامل نہیں ہے۔ عامل کلام یہ کہ فقیر کو حکیم الہی کی تعمیل تہِ دل سے منظور ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کامل اعتماد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ کس طرح ظہور پذیر ہو گا؟ اس بندے کو جس کا شعار بندگی ہے کیا طاقت ہے کہ وہ اپنے مالک سے یہ پوچھے کہ تو اپنا وعدہ کس طرح پورا کرے گا؟ ایسا سوال آداب اور قانونِ عبودیت کے خلاف ہے۔ غرض میں ایسی چنان و چین کی باتوں سے بیزار ہوں اور محض اس کی بندگی کے دسترخوان کا ریزہ چین ہوں۔

فقیر دریں باب بشاراتِ غیبی مامور است و بہ بشاراتِ لاریبی بشر، ہرگز ہرگز شبہ و وسوسہ شیطانی و شاہد ہوتے نفسانی بایں الہامِ رحمانی مترج نیست، بالجملہ فقیر امتثالِ حکمِ الہی از تہِ دل مقصود است و اعتماد بوعده الہیہ بکلی حاصل، و اما این کہ بوعده الہیہ بچہ طریق ظاہر گردد پس بندہ عبودیت شعار را چہ یارا کہ از مالک خود بر پرسد کہ وعدہ خود را بچہ طور ایفا خواہی کرد، کہ این سوال خارج از قانون آداب عبودیت است، بالجملہ از گفتگو و چون و چہرا بیزارم و از ماندہ اطاعت محض ذلہ بردار!

فقیر محو خاں کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے یہ مژدہ اُنہیں ان لفظوں میں سنایا تھا:

اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردہ غیب سے کفار یعنی لانسے بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک و شبہ کی گنجائش

آتا بیان الہام، پس فقیر از پردہ غیب بہ بشاراتِ ربانی باستیصال کفار و راز مویاں (یعنی قوم سکھ) مامور است و از کمن لاریب بشارت

روحانی بخلہ مجاہدین ابرار بشرؑ نہیں۔ روحانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار  
مجاہدین کو ان پر غلبہ پانے کی بشارت دینے  
والا مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۰

شاہِ بخارا کے نام سید احمد صاحب نے جو طویل خط لکھا اس کی دو عبارتیں متعلقہ الہام حسب ذیل ہیں:

در مقدمہ اقامت جہاد و ازالہ کفر  
و فساد بطریق الہام ربّانی و کلام  
روحانی بہ اشارتِ غیبی در باب  
امامت مشرف ساختند و بہ بشارت  
لاریبی در باب فتح و ظفر مبشر...  
ہرگز ہرگز شعبہ و سوسہ شیطانی  
و شائبہ ہواتے نفسانی باین داعیہ  
روحانی و الہام ربّانی مخلوط نہ گردید۔  
وَاللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُولُ وَكِیْلٌ۔

قیام جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے  
رفع و دفع کرنے کے لیے الہام اور روحانی  
مکالمہ کے ذریعہ غیبی امامت سے اس  
فقیر کو مشرف فرمایا۔ اور ہم کو فتح و نصرت کے  
متعلق ایسی بشارتوں کا منجربہ نامور فرمایا ہے  
ہرگز ہرگز کوئی شیطانی و سوسہ اور نفسانی  
خواہشات کا کوئی شائبہ بھی اس ٹٹھی  
دعوت اور الہام ربّانی میں داخل نہیں ہے  
وَاللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُولُ وَكِیْلٌ۔

سید صاحب کے مذکورہ بالا بیانات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

- ۱۔ سید صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا، بار بار الہام ہوا کہ پنجاب تمہارے  
ہاتھ پر فتح ہوگا۔
- ۲۔ سید صاحب کو بذریعہ الہام بتایا گیا کہ تمہیں سکھوں کے استیصال کے لیے پیدا  
کیا گیا ہے۔
- ۳۔ پنجاب کی فتح و نصرت کا مژدہ سنا نے پر سید صاحب کو من جانب اللہ نامور کیا گیا تھا۔
- ۴۔ موصوف کو نہ صرف بذریعہ الہام بلکہ روحانی مکالمے کے ذریعے درجہ امامت پر فائز  
کیا گیا تھا۔

۱۰ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲  
۱۱ مکتوبات کی عبارتوں کا ترجمہ اسی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا تھا۔  
۱۲ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۸۱، ۸۰

۵۔ پنجاب کی فتح اور سکھوں کے استیصال کا جو سہرا بذریعہ الہام سید احمد صاحب کے سر پر بامدھا گیا تھا۔ اس الہام کی صداقت میں موصوف کے نزدیک شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

۶۔ ان دونوں مزدوروں کو بشارتِ رحمانی اور الہامِ ربانی کے ذریعے پہنچایا گیا تھا۔  
۷۔ اس ربانی الہام اور رحمانی بشارت کا مرکز بہرگز خلاف نہیں ہوگا کیونکہ ان میں شیطانی دوسرے یا نفسانی خواہشات کا شائبہ تھوڑا ہی تھا، جو ان کا خلاف واقع ہو جائے۔

۸۔ سید صاحب اپنے الہام کی صداقت پر خدا کو گواہ رکھتے تھے۔  
۹۔ موصوف خدا سے یہ پوچھ تو سکتے تھے کہ پنجاب کیسے فتح ہوگا اور سکھوں کا استیصال کن طریقوں اور کتنی تیاری سے کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سوال ان کے نزدیک شعارِ بندگی اور قانونِ عبودیت کے خلاف تھا۔

۱۰۔ موصوف کو قیامِ جہاد اور دفعِ فساد پر بذریعہ الہام مامور کیا گیا تھا۔ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ۔ اس موضوع پر ہیں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سید صاحب کے بیانات کی روشنی میں ان کے معتقدین سوچیں اور فیصلہ کریں کہ یہ الہامِ رحمانی تھا یا شیطانی؟ بشارتِ رحمانی تھی یا خواہشِ نفسانی؟ کیا سید صاحب نے واقعی الہام کے مطابق پنجاب کو فتح کر لیا تھا اور سکھوں کا استیصال کر دیا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کے علاوہ چارہ کار بھی کوئی نہیں، تو فیصلہ کرنے میں دشواری کیا باقی رہ گئی؟ خدا کرے کسی کی اندھی عقیدت راستے میں حائل نہ ہو جائے ورنہ معاملہ تو صاف ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو نہ سہی، کل خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ آخر دنیاٹے دنی کا یہ اندھیرا چھٹے گا، صبحِ قیامت نمودار ہوگی۔

أَلَيْسَ الْقَسْبُ بِقَرِيبٍ ۚ کیا صبحِ قیامت قریب نہیں ہے؟ کہو گے تو سہی، ہاں

یہ عذرا امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا

میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

اگر اب بھی کوئی کسرا باقی رہ گئی ہے تو سید صاحب کا اس سے بھی کئی گنا الہامی مزدورہ سماعت فرمائیے اور اس کی روشنی میں ہی فیصلہ کر کے خار کو خار اور گل کو گل کا مقام دے لینا۔ ہمارا

کام بفضلِ تعالیٰ سمجھا دینا ہے، دلوں کا پھیرنا اور ہدایت دینا باری تعالیٰ شانہ کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ وہ الہامی بیان پیش خدمت ہے :

”سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقت روانگی خراسان آپ اپنی ہمشیر والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ ”اے میری بہن! میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رخص اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت زندہ ہو جاتے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے دُور و مرگیا یا مارا گیا تو تم اُس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔“

اچھا ہوتا کہ سید صاحب اتنی سی وضاحت اور فرمادیتے کہ اُن کے رب یا ارباب نے یہ وعدہ اُن سے کہاں بیٹھ کر کیا تھا؛ بہر حال سید صاحب کے اس بیان کی روشنی میں کہ جینک مذکورہ چاروں ملکوں کو میں پاک صاف نہ کر دوں اُس سے پہلے اگر کوئی حلفیہ بھی میری موت کی خبر دے تو وہ جھوٹا ہے۔ ہم خیر اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ موصوف سے ہند کا شرک، ایران کا رخص، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق آج تک نہیں مٹایا جاسکا، لہذا موصوف اپنے بیان کی روشنی میں کہیں جیتے جاگتے ہی پھر رہے ہوں گے۔ اُن کے رب نے تو ان کاموں سے پہلے نہ اٹھانے کا وعدہ کر ہی لیا تھا؛ لہذا ہو سکتا ہے کہ موصوف پہلے ان چاروں ملکوں میں مُردہ سُنتوں کو زندہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ویسے اس کا فیصلہ تو سید صاحب کے معتقدین ہی کر سکتے ہیں کہ سید صاحب اب زندہ ہیں یا نہیں؛ اگر وہ آنجہاں ہی ہو چکے تو اپنے اس بیان کی روشنی میں اُنہیں سچا سمجھا جاتے گا یا جھوٹا؛ کوئی کچھ بھی فیصلہ کرے یہ اُس کی اپنی مرضی ہے۔

ہاں قارئین کی معلومات کے لیے اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ خود سید صاحب کے اولین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سبھی تسلیم کیا ہے کہ وعدہ فتح پنجاب کے الہام کا خلاف واقع ہوا۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

”وعدہ فتح پنجاب کا آپ (سید صاحب) کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اس کو سراسر صادق اور ہونہار سمجھ کر بار بار فرماتے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں دوسرے شیطانی اور شائیرہ نسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ ہوگی۔ لیکن معاملہ بالاکوٹ، خواہ شہادت جو یا غیبت بظاہر سراسر اس یقینی الہام کے خلاف ہوا۔“

تھانیسری صاحب نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سید صاحب کے الہام کے خلاف ہوا، انصاف کے دامن کو جھٹک دیا کیونکہ آگے صاف کہنا پڑ جاتا کہ اگر الہام کے خلاف واقع ہوا تو وہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی الہام تھا جسے دوسرے شیطانی کہتے ہیں، اس صورت میں سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے الہاموں میں شرعی لحاظ سے فرق بتانا مشکل ہو جاتا، لہذا انھوں نے فیصلے کی اس شاہراہ کو چھوڑ کر یوں تاویل کی پگھلندی پر چلنا شروع کر دیا:

”اس وقوعہ (معرکہ بالاکوٹ) کے پندرہ برس کے بعد سلطنت پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے پگھلی کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لادعوی قوم کے ہاتھ میں آگئی جس کو ہم مسلمان (دولتی صاحبان) اپنے ہاتھ پر فستح جو نا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظلو میں آئی۔“

تھانیسری صاحب تو خیر اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایسی جہاں فی سورت خین ہی بتا دیں کہ سید صاحب کا

ذکر جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۹۱

۷۱۱ ایضاً، ص ۲۹۱

مذکورہ الہام ربانی تھا یا شیطانی، اگر وہ بھی اس فیصلے سے کترا کر تھانیسری صاحبؒ کی تاویل کا  
 دامن تھامتے ہیں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ سوہانہ التماس پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اسے انصاف کا  
 خون کرنے والو! اس تاویل کا مفاد یہی تو ہے کہ برٹش گورنمنٹ یا سید احمد صاحب، ایک ہی  
 تصویر کے دو رخ تھے "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ تھا۔ سید صاحب فتح کر لیتے یا  
 انگریزوں نے پنجاب فتح کر لیا۔ انگریز خود سکھوں سے لڑتے یا سید صاحب کو بھڑا دیا، ایک ہی  
 بات ہے۔ مانا کہ غالب دو تھے لیکن جان تو دونوں طرف ایک تھی۔ بظاہر دونوں کے راستے الگ الگ  
 نظر آتے تھے لیکن منزل مقصود دونوں کی ایک تھی۔ یعنی انگریزی عملداری کی حدود کو اور وسیع کرنا  
 جسے سید صاحب اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے، نیز اس عملداری کے راستوں کی رکاوٹوں کو  
 دور کر کے اسے مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔ یہی تھی اُن کی منزل مقصود اور یہی ہے اُن کے جہاد کی  
 غرض و غایت۔ لہذا،

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بہر حال سید احمد صاحب اپنے جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، جمعیت کو لے کر گاؤں گاؤں  
 قصبہ قصبہ اور شہر شہر پھرے، جہاد کے نام سے بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا، کتنے  
 ہی مسلمانوں نے جہاد کے نام سے دھوکا کھا کر ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کی۔ انگریز اس  
 تیاری پر مانع نہیں ہوئے اور مانع کیوں ہوتے جبکہ یہ سارا منصوبہ ہی انگریزوں کا اپنا تھا۔  
 سکھوں سے نہ لڑنے کا انگریز معاہدہ کر چکے تھے، دیپاتے ستلج کو سرحد قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن  
 انگریزوں نے جب قلب ہند کے اپنے طاقتور دشمن کو بڑی حکمت عملی سے پھرے میں بند کر لیا تو  
 اب سکو جیسی جنگ آزماقوم کو زیر کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اس مقصد کے لیے برٹش گورنمنٹ کو  
 سید احمد صاحب سے موزوں اور کون مل سکتا تھا، جنہوں نے جعفر بنگال اور صادق دکن کی سنت  
 ملعونہ کو تازہ کرنے کی غرض سے ایک مسلمان فرمانروا یعنی نواب امیر خاں مرحوم کو انگریزوں کے  
 پنجے میں پھنسا کر بے دست و پا کروا دیا تھا۔ سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کرنے کا کام  
 بھی سید احمد صاحب کے ہی سپرد کیا گیا۔ افروں خانہ انگریز ہر طرح امدادی تھے، فریقین میں

مکمل اتحاد و اتفاق تھا، لیکن پردہ رکھنے کی غرض سے جہاد کرنے کی برٹش گورنمنٹ سے یوں اجازت حاصل کی جاتی ہے:

”اس وقت ہر شہر، قصبہ و گاؤں، برٹش انڈیا میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ ہوتا تھا مگر براہِ دور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم اللہ آباد کے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ جس کے جواب میں صاحب مدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔“

اسی اجازت کے واقعے کو مرزا حیرت دہلوی نے ذرا اور کھل کر یوں بیان کیا ہے:

”سید احمد صاحب نے مولانا شہید (مولوی محمد اسماعیل دہلوی) کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس اللہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر مالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کی تیاری کرنے کو ہیں، سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے؛ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عملداری کے امن میں خلل نہ پڑے، ہمیں کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔ یہ تمام ہیں بین ثبوت صاف صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں ہی کے لیے مخصوص تھا، سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مخالفت نہ تھی۔“

اعلیٰ حکام نے اس وقت اپنے ماتحت افسروں کو مطلع کر دیا تھا کہ سید صاحب اینڈ کمپنی سے ہرگز مخالفت نہ کرنا، یہ ہمارے مخالف نہیں ہیں۔ اس امر کی واضح تصریح مرزا حیرت دہلوی کے وٹیکراف لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

لے محمد جعفر تھانوی، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۸

لے حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۰۰

جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اس سے چوکنے ہوئے اور انھیں خوف معلوم ہوا، کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ امن میں تو کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا۔ اس نظر سے ضلع کے حکام نے حکام اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں سے صاف جواب آگیا۔ ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو، ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ سکتھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔ بھلا مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلش سے کیوں روکا ہونے لگا تھا؟ جہاں وہ اپنے دین کے ارکان بخوبی ادا کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔ انہیں تو لبریشن (مذہبی آزادی) بخوبی حاصل تھی۔ وہ صرف دشمن دین و ایماں سکتھوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ صرف سکتھوں ہی سے اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینا تھا، جن کے قابلِ رحم مظالم کا بیان مہم مولانا شہید کی سوانح عمری میں بیان کر چکے ہیں ۱۰

بات اصل میں یہ ہے کہ حکام اعلیٰ سید احمد صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے کیونکہ وہ بیچارے انگریزوں کی مخالفت کیا کرتے جبکہ ساری زندگی ہی صرف انگریزی مفادات کے حصول و تحفظ میں گزار دی تھی۔ جن حضرات کو موصوف کی برٹش نوازی بلکہ ایجنٹ ہونے کا پتہ نہیں تھا انہوں نے اس تیاری اور پہل پہل کے وقت عظیم آباد اور کلکتہ میں حکام اعلیٰ سے اس تیاری کی شکایت کی، نقص امن کا خطرہ سمجھایا، لیکن حکام کے سامنے چونکہ اصل حقیقت موجود تھی وہ شکایتوں پر کیے کان دھرتے اور بے خبر ہمدردوں کو کیوں منہ لگاتے؟ مہر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

”بعض مشیو حضرات نے (قیامِ عظیم آباد کے دوران) انگریز حاکم کے پاس شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں اور ہم لوگ انہیں خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن حاکم نے اس شکایت کو فرقہ وارانہ رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا“ ۱۱

۱۰ حیرت دہلی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۶۹، ۳۷۰

۱۱ غلام رسول قہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، برسوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۲



بعض حاسدوں نے (قیامِ کلکتہ کے دوران) انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سید احمد پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا، نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔ نواب امیر خاں کو انگریزوں کے پجرے میں بند کروانا اور سکھوں سے لڑ کر پنجاب کو انگریزی مقبوضات میں شامل کرنے کی کوشش کرنا، یہ سید احمد صاحب کے وہ کارنامے ہیں جو بڑی رازداری سے پایہ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اپنے منہ سے آج تک کون سے غدار نے اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے دین اور اپنی ملت کے فلاں بدخواہ کا آلہ کار ہوں، اس طرح تو میر جعفر اور میر صادق وغیرہ نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ وہ بھی اپنے ان سیاہ کار ناموں پر پردہ ڈالی کرنازاں تھے۔ غداروں کا اندازہ بعض حالات و قرائن سے ہی لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا سببان مل جائے کہ کسی ایجنٹ نے دشمن سے اپنی دوستی کا دم بھرا ہو یا اس کی تعریف کی ہو، تو میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ قابل اعتماد ثبوت کسی کی ایجنسی کا آج تک تحریری طور پر نہ مل سکا ہوگا۔ آئیے اب ہم سید احمد صاحب کے بارے میں ان کی گھریلو تصانیف سے ایسے بیانات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دُور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جانتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک و مددگار ہو جائیں گے، کیونکہ سیکڑوں کو اس سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امرِ محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

لے غلام رسول قہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۱۱

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لینا ہی ہمارا مقصد ہے، بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے براؤرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گنہگارِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عباداتِ لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظمتتے اور ترویج مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الہی اور اچھے سنن سید المرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکارِ انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصول مذہب کے خلاف بلاوجہ طرفین کا خون گرا دیں؟

یہی تھانپیری صاحب اس بارے میں سید احمد صاحب کے مکتوبات اور حالاتِ زندگی کو مد نظر رکھ کر سب کی روشنی میں اپنے امیر المؤمنین کی انگریز دوستی کو واضح کرنے کی غرض سے یوں رقمطراز ہیں:

”اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا برگزرا وہ نہ تھا، وہ اس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکارِ انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔“

لے محمد جعفر تھانپیری، مولیٰ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱

لے ایضاً: ص ۲۹۳

دیوبندیوں کے نام نہاد مناظر مولوی محمد منظور نعمانی بھی سید صاحب کی انگریز دوستی کو غلط ثابت کرنے سے عاجز ہو کر ان کی اصل پوزیشن کو تسلیم کرتے ہیں مگر کس طرح پہلو بدل کر چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

”مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب اینڈ کمپنی) نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔“

چونکہ مولوی محمد منظور دیوبندی نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ انگریزوں نے بعض مواقع پر سید احمد صاحب کی امداد بھی کی تھی، لہذا ہم اس امداد کے واقعات کو مدلل طور پر تھوڑی سی وضاحت سے پیش کرنا چاہتے۔ جب سید احمد صاحب لڑائیوں میں مصروف تھے۔ معتقدین کی نظر میں جہاد کر رہے تھے اور حقیقت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ تو انگریزوں نے مصروف کے لیے باقاعدہ وہاں بھی امداد بھیجا جاری رکھا۔ دہلی اور دوسرے مراکز کی معرفت بھیجتے رہے اور بعض نوابوں کو بھی ترغیب دی۔ مثلاً:

”نواب ٹونک نے بھی دس بیس ہزار روپے شاہ اسحاق کی معرفت بھیجے۔“

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کی معرفت بھی رقم جایا کرتی تھی اور حکومت اُس کی نگران و محافظ تھی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ مولوی محمد جعفر تھانویسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

”اس (لیفٹیننٹ گورنر سے اجازت) کے بعد سید صاحب ملک یاغستان میں

پہنچ کر سکھوں سے جہاد میں مصروف تھے۔ اُس وقت ایک ہنڈی سات ہزار

روپے کی بذریعہ ساہوکارانِ دہلی مرسلہ مولوی محمد اسحاق صاحب بنام سید صاحب

روانہ ہوئی تھی۔ ملک پنجاب میں وصول نہ ہونے پر اس سات ہزار روپے کی

واپسی کا دعویٰ عدالت دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوئی اور پھر ہنگام اپیل عدالت

۱۔ ماہنامہ ”الفرقان“ کھنڈ، شہید نمبر، ۱۳۵۵ء، ص ۶۶

۲۔ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۷۷

عالیہ دیوانی (ہائی کورٹ) آگرہ میں بھی حکم ڈگری بجتی مدعی بحال رہا۔ لہ  
مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے :

”جب سید صاحب یاغستان میں تھے تو مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی  
نے کچھ اوپر سات ہزار روپیہ سید احمد صاحب کو بذریعہ ہنڈی روانہ کیا تھا۔  
وہ کسی باعث سے نہیں پہنچا تھا۔ اُس پر نالش کی گئی تھی اور پھر روپیہ وصول  
کر کے دوبارہ سید صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا“ لہ

فارتین کرام! یہ تھے سید احمد صاحب کے بارے میں اُن کے سوانح نگاروں اور معتقدوں کے  
بیانات جن کے پیش نظر ہم نے ان سوانح نگاروں، سید صاحب کے اکثر معتقدوں اور دیگر  
غیر جانب دار مورخوں کے ساتھ ہمنوائی کی اور سید صاحب کو ان جملہ حضرات کی طرح برٹش نواز کہا  
اور لکھا۔ ہمارے علمائے اہلسنت موصوف کی اس روش پر گرفت بھی کرتے آئے ہیں۔ مبتدعین  
حضرات کے پاس کوئی دلیل حقیقت میں ایسی نہیں تھی جس سے وہ ذرا بھی صفائی پیش کر سکیں۔  
دوسری مشکل انھیں یہ تھی کہ جلد وہابی مورخ ہمارے دعویٰ کی اپنی اپنی تصانیف میں تائید کر گئے تھے  
اور انھوں نے سید صاحب کو خود فخریہ طور پر برٹش گورنمنٹ کا خیر خواہ بتایا ہے۔ ان جملہ حالات  
کے برخلاف جناب غلام رسول مہر اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنا مورخانہ زور صرف کیا اور  
بڑی شد و مد سے سید صاحب کو انگریزوں کا دشمن منوانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اور  
اپنے اکابر یعنی سید صاحب کے سابقہ سوانح نگاروں پر بھی الزام تراشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔  
مہر صاحب مولوی محمد جعفر تھانیسری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

”اس کتاب (تواریخ عجیبہ) نے سید صاحب کے متعلق دو نہایت افسوسناک

لہ محمد جعفر تھانیسری : حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۸

لہ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۷۲

لہ تواریخ عجیبہ مصنفہ محمد جعفر تھانیسری کے دوسرے ایڈیشن کا نام ”سوانح احمدی“ رکھا گیا۔ موجودہ ایڈیشن جو  
کراچی سے ”نفس اکیڈمی“ والوں نے شائع کیا ہے انھوں نے پہلے حصے کا نام ”حیات سید احمد شہید“ اور  
دوسرے کا ”کتوبات سید احمد شہید“ رکھا ہے۔

غلط بیانیوں کو عام کیا۔ اول یہ کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں سے لڑانی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔

اس سلسلے میں دادِ تحقیق دیتے ہوئے موصوف اپنے دعوے کو یوں موکد کرتے ہیں:

”جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ چھپی تھی تو سید نے اس کی تہمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلہ مضامین ”پایونیر“ میں چھپوا دیا تھا۔ جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ ان جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہارِ برأت کر دیا تھا۔ سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہوگا۔ مولوی محمد جعفر تھانوی سیڑھی مرحوم نے اسے پھیلا کر پیش کیا۔“

یہی غلام رسول مہر اپنے موقف کو مضبوط کرنے کی غرض سے یوں انتہائی اقدام کر کے حقائق پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے اور سید صاحب کو انگریزوں کا مخالف دکھانے کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں:

”سید صاحب کے متعلق قلبی ذخیروں تک چند افراد کے سوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی۔ ”تواریخ عجیبہ“ (سوانح احمدی) چھپی تو اس میں سید صاحب کے مقاصد جہاد کا علیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اسے مستند شے سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس طرح اس پاک نفس مجاہدِ کبریٰ کے مقاصد ایک نہایت افسوسناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہوں کہ جس زمانے میں ”تواریخ عجیبہ“

لکھی گئی، سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے عتاب کا مورد بنی ہوئی تھی۔ لیکن مولوی محمد جعفر صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے، انہیں تحریف شدہ شکل میں شائع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آگئی تھی؟ اور یہ حرکت ان لوگوں سے سرزد ہوئی جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے۔“ ل

جناب غلام رسول مہر کی اس بارے میں ”ہاں میں ہاں ملانے“ کا شرف اگر کسی صاحب کو علمی انداز میں آج کل حاصل ہے تو وہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے ہیں۔ مورخانہ انداز میں موصوف نے اس میدان میں کافی کام کیا ہے۔ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کی حمایت اور ان کے مخالفین کو غلط ثابت کرنے میں آپ نے اپنی صلاحیتیں وقف کی ہوئی ہیں۔ اپنے محبوب ہیرو، جناب سید احمد صاحب کی تحریک جہاد کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

”واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی خود اپنوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کی غرض سے چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سر سید احمد خاں (ف ۲۱۸۹۸) نے ”اوزانڈین مسلمانس“ پر تبصرہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔ پھر اس تحریک کے خاص رکن مولوی محمد جعفر تھانوی نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کی بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور اس کو مشہور کیا۔ بعض کوتاہ فہم یا پست ذہنیت رکھنے والے اشخاص تحریک مجاہدین کی اہمیت کم کرنے کے لیے اس قسم کے غیر معیاری رسالے کبھی کبھی چھاپتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس گروپے ہی سے نابلد ہیں، وہ تحریک مجاہدین کو کیا سمجھیں؟“ ل

پروفیسر صاحب موصوف نے بھی جناب غلام رسول مہر کی تقلید میں مولوی محمد جعفر تھانوی کو مورد الزام ٹھہرانے اور اسی تحریک جہاد کے رازدار و سرگرم کارکن کو بدنام کرنے میں کسی قسم کی

لے غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۰

لے محمد ایوب قادری، پروفیسر: مقدمہ حیات سید احمد، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸، ص ۲۹

بھجک محسوس نہیں کی۔ ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادے کا کوئی بڑے سے بڑا، خواہ دین و دیانت سے کورامانا پڑے تو مان لیں گے لیکن سید احمد صاحب کی بگڑی کو بنانے میں کوئی دقیقہ فرورگذاشت نہ کریں گے۔ چنانچہ موصوف مزید لکھتے ہیں،

”اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ مولف (محمد جعفر تھانیسری)

نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اول تا آخر

سکھوں کے خلاف تھی۔ انگریزوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور سید احمد

شہید کی جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرخاش

نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری جماعت کے خاص رازدار

تھے۔ جس کے غیور میں انھوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار ٹھایا، ہزاروں

کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے محروم ہوتے، بیوی بچے چھوٹے، عزت و

دولت سے محروم ہوتے، زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگوں اور پہاڑوں

(جزائر اندمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ جب کالے پانی سے رہا

ہو کر آتے تو پولیس کی پابندیوں اور نگہانیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ان حالات

و مصائب و آلام کا یہ رد عمل ہوا کہ انھوں نے اس موقع میں مصلحت کے

قلم سے نقش و نگار کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں موصوف نے اپنا تاریخی بھرم رکھنے کی غرض سے غلام رسول مہر صاحب

کی ”ہاں میں ہاں“ طمانے کا فرض ہی ادا کیا ہے۔ چنانچہ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی غرض سے

پروفیسر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

”حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سید احمد شہید کے بعض

مکاتیب کی عبارتیں تک بدل دی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معرکہ بالاراً

تصنیف ”سید احمد شہید“ میں اس کا انکشاف کیا ہے۔ (ص ۱۶۲ تا ۱۸۹)۔

سید محمد ایوب قادری، تعارف مصنف جیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۵

لاہور ۱۹۵۲ء - ل

سید احمد صاحب کو انگریزوں کا مخالف منوانے کی خاطر وہابیوں کے نامور مورخ یعنی غلام رسول مہر اور ان کے اتباع میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا اپنی سو سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی جرأت و جسارت کرنا، ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین و ملت کی کوئی اہم خدمت یا سعادت و آئین کا ذریعہ ہو، لیکن انصاف پسند اہل علم حضرات کے نزدیک اس طرح تحقیق کے پردے میں تحریفیں کرنا دیانت داری سے بعید ہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ ملت پر ظلم اور تاریخ سے مذاق ہے۔

جب مصنف "تواریخ عجیبہ" مولوی محمد جعفر تھانیسری کو سید احمد صاحب کی تحریک کا سرگرم کارکن اور رازدار مان لیا، نیز یہ تسلیم کر لیا کہ انہوں نے اعانتِ تحریک کی پاداش میں کاہلے پانی کی سزا پائی، اٹھارہ سال جزیرہ انڈیمان میں مقید رہے، جائداد ضبط ہوئی اور خوفناک تکلیفیں اٹھائیں دہیں حالات، سید صاحب کے ایسے صبر آزما پیروکار پر خود سید صاحب ہی کی تاریخ کو بدلنے اور ان کے مکتوبات میں تحریف کرنے کا الزام لگانا کیسی خوفناک جسارت ہے۔

جناب غلام رسول مہر تو، ۱۹۶۱ء میں آنجنمانی ہو چکے، حقیقت حال ان کی نگاہوں کے سننے آگتی ہوگی۔ علاوہ بریں ان کا معاملہ چونکہ خود ہی سپردِ خدا ہے، اس لیے ان کی طرف روٹے سخن کرنا مناسب ہی نہیں۔ راقم الحروف بصد ادب، جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے اور پروفیسر فیروز الدین روجی سے مخاطب ہو کر مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کا طلبگار ہے:

۱۔ کیا ذاب امیر خاں کے پاس جانے کے وقت (۱۸۱۰ء) سے معرکہ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) تک سید صاحب نے اکیس سال کے اندر کوئی ایسا بیان نبضِ نفیس دیا، جس میں صاف صریح طور پر فرمایا ہو کہ ہم انگریزوں سے بھی جہاد کریں گے؟ ایسا بیان مطبوعہ ہونا چاہیے۔

۲۔ اگر سید احمد صاحب کا کوئی ایسا بیان نہ ہو تو کم از کم ان کے دستِ راست مولوی محمد اسلمبیل دہلوی ہی کا کوئی ایسا مطبوعہ بیان آنجناب کے پیشِ نظر ہے؟

سید احمد ایوب قادری: تعارفِ مصنفِ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۵



۳۔ یہ بھی نہ سہی، وہ کون کون سے مورخ ہیں جنہوں نے سید احمد صاحب کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۹۴۱ء تک کے ایک سو سولہ سالہ عرصے میں وضاحت کی ہو کہ سید صاحب کا ارادہ انگریزوں سے لڑنے کا تھا؛

۴۔ آپ حضرات ماشاء اللہ تاریخ دان بلکہ اسکالر کہلاتے ہیں، ۱۶۲۶ھ / ۱۸۳۱ء کے بعد سید صاحب کے بعض خلفاء جو انگریزوں سے لڑے تھے اُن واقعات کو اصل تحریک کے نظریات کا جزو قرار نہ دے لینا۔ ۱۸۴۵ء میں سکھ نہیں بلکہ انگریز پنجاب کے حکمران بن گئے تھے۔ اُس وقت انگریزوں نے اپنے ان خانہ زادوں کی گوشمالی ضروری سمجھی ہوگی کیونکہ اب سرحد میں اُن کا وجود انگریزی مفادات کے خلاف ہو کر رہ گیا تھا۔ سکھوں کے عہد حکومت میں تو برٹش گورنمنٹ نے دلی خواہش کے ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنے ان جانثاروں کو بھیجا تھا۔ اب انگریزوں کا مقصد پورا ہو چکا تھا، لہذا جو سلوک جعفر و صادق کے ساتھ کیا تھا وہ بھلا ان کے ساتھ کیوں نہ کرتے؛

راقم الحروف نے یہاں جو کچھ لکھا ہے کہ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے انہیں بھیجا تھا، اس جملے میں مسلمانوں کا لفظ شاید آپ حضرات کے جذبہ حقیقت کو ٹھیس پہنچاتا ہو اور اس وجہ سے طبع نازک پر گراں گزرنا ہو تو گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں۔ ہاں مجبوراً ایسا لکھنا پڑا ہے کیونکہ سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگاروں نے ان بانی مجاہدوں کا سب سے بڑا کارنامہ جو رنگ برنگ تلویہوں کے سہارے فخریہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ مسلم کشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

۵۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں سے خوفناک اذیتیں اٹھانے کے بعد مولوی محمد جعفر تھانویسری کا ہم گئے ہوں، اُنہوں نے قلم پر احتیاط کے پیرے بٹھالیے ہوں۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ مُنڈ سے کچھ نہ کہتے، ڈر کے مارے خاموش رہتے، قلم کو بھی حرکت میں نہ لاتے اور باقی زندگی خاموشی میں گزار کر راہی ملکِ عدم ہو جاتے۔ لیکن موجودہ مورخین حضرات جس مصلحت کا تھانویسری صاحب پر نبوت سوار کر رہے ہیں، اُنہوں نے اس کے برعکس اُسی تحریک کے بانی کی سوانح حیات لکھ ڈالی، جس کے سرگرم کارکن ہونے کی

بنا پر وہ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ عتاب رہے تھے۔ ایسا کیوں کیا؟

۶۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں انھیں انگریزوں سے کسی قسم کے خطرے یا نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، اسی لیے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔

اگر سید صاحب انگریزوں کے مخالف ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ تھانیسری صاحب ان کی سوانح حیات لکھنے کا خیال تک بھی نہ لاتے۔ بصورتِ دیگر اگر پھر بھی لکھنے پر آمادہ ہوتے تو سید صاحب کو ۱۲۹۵ھ میں انگریزوں کا مخالف لکھ دیتے تھے انھیں اندیشہ کس بات

کا تھا، جبکہ ۱۲۴۶ھ میں وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ دریں حالات مولوی محمد جعفر تھانیسری کو تحریکِ جہاد کا رخ موڑنے اور کتابت میں تحریرت کر لے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟

۷۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو اگر خطرہ لاحق ہو سکتا تھا تو صرف اسی صورت میں کہ وہ خود کو انگریزوں کا دشمن لکھتے یا ظاہر کرتے۔ کسی پچاس سال پیشتر کی ہستی یا تحریک کو انگریزوں نے لکھنے سے محنت پر کون سی دفعہ عائد ہو سکتی تھی؟ دریں حالات اپنے بزرگ سید صاحب

کے اولین سوانح نگار کی قبر پر محبتِ علی میں نہیں بلکہ بغضِ معاویہ میں، دعائے خیر کے پھولوں کے بجائے بہتانات کے کانٹوں کی چادر کس مجرم کی پاداش میں چڑھائی جا رہی ہے؟

۸۔ آپ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف نہ پھیر کر تھانیسری صاحب نے تحریک کا صلہ بگاڑ دیا۔ گویا "تواریخ عجیبہ" کی ایک یہ حرکت اور دوسرا مسئلہ غیبت آپ کو کھٹکتا ہے اور ان کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔ حالانکہ اسی "تواریخ عجیبہ"

بے سید صاحب کے معجزات و کرامات کا ڈھیر اور الہاموں کا اندھیرا اپنے اندر اس طرح محفوظ کیا ہے کہ سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مراتب میں ما سوائے اس کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ اُنھیں اپنے لیے نبی کہنے اور کہلانے کی قدرت نے ہمت ہی نہیں دی اور ان کے اس مظلوم کو مرزا صاحب کے ذریعے پورا کیا گیا۔

موجودہ مؤرخین حضرات نے اس جانب سے کیوں منہ پھیرا ہوا ہے؟ آخر اس کی وضاحت بھی تو کرنی چاہیے تھی؟

۹۔ سر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری نے جس وقت علی الاعلان اس تحریکِ جہاد کو

صرف سکھوں کے ساتھ مخصوص کرنا شروع کیا تھا تو سید احمد صاحب کے معتقدین جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے پڑے تھے، اُن میں سے کتنے حضرات نے اس ادعا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی؟

۱۰۔ صدائے احتجاج بلند کرنا یا اس دعوے کو افرقی ٹھہرنا تو دور کی بات ہے، ہم تو یہی دیکھتے ہیں، کہ اُن کے اکثر معتقدین نے سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری کے اُن بیانات پر مہر تصدیق ہی ثبت کی تھی۔ یہ درست ہے یا نہیں؟

۱۱۔ اگر ان دونوں حضرات نے تحریک کا علیہ بگاڑا تھا تو اُن اہل علم اور صورت حال سے واقف حضرات نے اس بداندیشی کا سدباب کیوں نہ کیا جو اس تحریک سے خود منسلک تھے اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کی طرح اس کے سرگرم کارکن اور رازدار تھے؟

۱۲۔ سید صاحب کے اُن معتقدین کے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لیے ہم تیار ہیں جنہوں نے موصوف کا انگریز دشمن ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ کیا ایسے جملہ حضرات کو آپ سید صاحب کے بدخواہ اور تحریف پسند کہنے اور ماننے کے لیے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۱۳۔ اگر بقول مہر صاحب، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سید صاحب کے مکتوبات تک میں تحریف کر دی تھی تو، ۱۹۴۴ء سے پہلے وہاہوں کے علماء اور مورخ کہاں سوئے پڑے تھے؟ اُنہوں نے اصل اور نقل کے فرق کو واضح کر کے، اس تحریف کے سلسلے میں اپنا فرض کیوں ادا نہیں کیا تھا؟

۱۴۔ نہ سہی، جن حضرات کے قبضے میں وہ مکتوبات تھے کم از کم انہیں تو اپنے وحی و عصمت والے اور خدا سے مصافحہ و ملاقات کرنے والے، بکباری تعالیٰ شانہ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف ہونے والے دادا پیر کی حمایت میں انماض سے کام لے کر بدخواہوں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہیے تھا، آخر وہ سب کے سب کیوں چُپ ساڑھے پڑے رہے؟

۱۵۔ غلام رسول مہر کی تازہ تحقیق پر توجہ نواب قادری صاحب ایمان لے آئے کہ مکتوبات کی

اصل عبارتیں یوں نہیں بلکہ یوں ہیں۔ لیکن موصوف نے اس طائفہ کی تاریخ کو شاید وہابیت کی عینک اتار کر دیکھنے کا شرف کبھی حاصل ہی نہیں کیا ورنہ انہیں صاف نظر آجاتا کہ اس جماعت کے اونچی چوٹی کے علماء بھی اتنے جرمی اور بیباک ہیں کہ خود باری تعالیٰ شانہ اور اس کے سب سے برگزیدہ رسول پر بہتانات باندھتے ہوئے بھی کبھی نہیں ڈرے، عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفویٰ کی ناپ تول کرتے رہنا ان حضرات کا دائمی مشغلہ ہے، قرآن کریم کی کتنی ہی آیات کے چودہ سو سالہ متواتر معانی و مطالب سے انحراف کر کے انہیں اپنے پسندیدہ اور خود ساختہ معانی کا لباس پہناتے رہنا، احادیث میں جہاں چاہا متن یا شرح میں ہاتھ کی صفائی دکھانا ورنہ فی رجال کی بحث چھیڑ کر شعبہ بازی کا کمال پیش کرنا، ایمان اور کفر، توحید اور شرک کی حدود میں ایسی دھاندلی مچانا کہ عوام ان کو عجیب پریشانی میں مبتلا کر دینا اور ایک ایسے چکر میں پھنسا دینا جس سے نکلنے کا انہیں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

تصانیفِ اکابر سے وکتبِ ائمہ سے عبارتیں نقل کرتے وقت من مانی عبارتیں بنا لینا، اول یا آخر کا جملہ اڑا دینا، عبارت کے درمیان سے اپنے خلاف الفاظ کو ایسے انداز سے ہضم کر جانا گویا یہاں کوئی لفظ تھا ہی نہیں، اپنی طرف سے الفاظ گھڑ کر کسی بزرگ کی عبارت سے ملا کر سب کچھ ان کے سرخوپ دینا، طرہ یہ کہ اپنے ذہن سے کتابیں گھڑ لینا، ان کے مطابق، صفحے اور عبارتیں تک اپنے ہی ذہن کی مشین سے ایجاد کر کے علمائے اہلسنت کو چیلنج کرتے رہنا کہ دیکھو جناب! تم ایسا کہتے ہو حالانکہ تمہارے فلاں فلاں بزرگ نے اپنی فلاں فلاں تصنیف کے فلاں فلاں صفحے پر تمہارے خلاف یوں لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں کا دنیا کے پردے پر کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، کسی کتاب میں ان کا ذکر تک نہیں، ذکر کہاں سے ہو جبکہ یہ مصنوعات ہی گھڑنت ساز فیکٹری کی ہیں۔ ان حضرات نے اپنی انتہائی ہنرمندی اور کوشش سے رواقض کے کان بھی کاٹ رکھے ہیں۔

اسی طائفہ سے ایک ایسی آواز اُسٹے جو اس کی پوری تاریخ کے علماء و مورخین کی تصریحات کے خلاف ہو، کیا ایسی آواز انصاف کی رُوس سے قابلِ سماعت ہے؟

”مینٹھی مینٹھی سپ، کڑوی کڑوی تھو“ والی بات دوسری ہے ورنہ اس طرح کس فرد یا جماعت کی تاریخ کو نہیں بدلا جاسکتا بہ کون سے ولی کو شیطان اور کون سے شیطان کو ولی ثابت کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی، لیکن سوال تو یہی ہے کہ ایسا کرنے سے کیا حقیقت بھی بدل جایا کرتی ہے، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد اتنی تکلیف اٹھانے، اپنوں کو مطعون کرنے اور اپنی ہی تاریخ کو بدلتے کا آخر فائدہ کیا، افسوس!

سے ستارح دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی  
یہ کس کا فراد اکا غرہ غوں دیر ہے ساقی

۱۶۔ جامع مسجد دہلی والا تاریخی مباحثہ تو پیش نظر ہوگا جو ریح الثانی ۱۲۴۰ھ میں ہوا تھا کیا

غور نہیں کیا کہ ایک طرف ولی الہی خاندان، تیرہویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خوش چہین علمائے کرام اور اکثر علمائے دہلی ہیں تو دوسری طرف

مذہب اہلسنت و جماعت سے بغاوت کرنے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور

مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔ اول الذکر جو متحدہ ہندوستان میں خارجیت و وہابیت کے

بانی قرار پائے تھے، ان سے مطالب کیا گیا تھا کہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کر دیجیے، اگر

جناب کا ساختہ مذہب ہی اسلام کی صحیح تصویر ہے تو اپنے خاندانی اکابر مثل شاہ عبدالقادر

شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کو کس طرح بزرگی بلکہ

مسلمان بھی مانا جاسکتا ہے؟ کیونکہ آپ کے نزدیک مسلمان کا مذہب کفر و شرک بلکہ بت پرستی

تک کو اپنے اندر سمونے ہونے لگے۔ موصوفوں نے جو اب کی گنجائش نہ پا کر زادِ قرار

اختیار کرنے میں ہی غیریت سمجھی تھی۔ مولوی عبدالحی صاحب نے مجبور ہو کر گفتگو تو کی لیکن

ہر مسئلے میں معمولی سی قیل و قال کے بعد اہلسنت کا موقف تسلیم کرتے چلے گئے حتیٰ کہ دستخط

و مہرت بھی گریز نہ کیا یہ محض دفع الوقتی تھی ورنہ خارجیت سے ان حضرات نے سر مو کنار

تین یہ تھا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے مسکب اہلسنت اور اپنے خاندانی مذہب سے

رُوگردانی کرنے کے باعث اپنے خاندانی علماء یعنی شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ

پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کو بھی منہ دکھانا بند کر دیا، اس طرح

دینی حلقوں کے اس مرکز (خانہ ان عزیزی) سے موصوف کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ یہ سب کچھ منظور لیکن مذہب اہلسنت اختیار کرنا ساری عمر نا منظور ہی رہا۔ معلوم نہیں سید صاحب کے اس نامہ دار مرید نے جو اندرون خانہ سید صاحب کے رہبر اور اس سارے ڈرامے کو سٹیج کرنے والے تھے، انہوں نے یہ ساری کارگزاری انگریز دشمنی میں ہی دکھائی تھی؟

۱۷۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے خلاف ہوتے تو انہیں مسلمانوں سے کٹ کر، اپنے اکابر کے مسلک کو چھوڑ کر، مذہب اہلسنت و جماعت سے منہ موڑ کر، علیحدہ اپنا محمدی گروہ بنانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اگر یہ اقدام حکومت کی مشورہ پر نہیں تھا تو اور کس ضرورت کے تحت تھا؟ اس طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرکز سے رشتہ ٹوٹا، مسلمانان اہلسنت و جماعت کا ساتھ چھوٹا، جامع مسجد دہلی کے سب سے پہلے حنفی و بابی مباحثہ و مناظرہ کے ذریعے بھی راہِ راست پر نہ آتے، پنجاب میں صد ہا علماء و مشائخ نے انہیں بد مذہب ثابت کر کے مذہب اہلسنت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن نا منظور ہوئی، جس کے باعث سرحد و پنجاب کے اکثر مسلمانوں نے جو حُسنِ ظن کے تحت سنا تھی یہ گئے تھے، ان سے کنارہ کشی اختیار کرنی۔ انہوں نے سرحدی مسلمانوں کو کلاب النار اور طعونین اشراؓر ٹھہرا کر مستحل الدم قرار دے کر ان کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کی، ان کے اموال کو غنیمت سمجھ کر ہنرم کرنا شروع کیا، ان کے تنگ و ناموس پر ڈاکے ڈالے تو ان غیور مسلمانوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونا قبول کر لیا لیکن اپنی سیاہ کاریوں اور بد مذہبی سے باز آنا کسی بھی مرحلے پر قبول نہ کیا۔ کیا سید صاحب اینڈ کمپنی کی یہ ایبلی ادائیں، بات کی جھٹائیں، انگریز دشمنی کا کرشمہ تھیں؟

۱۸۔ کرم کوشیاں ہیں، مستم کاریاں ہیں

بس اک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں

۱۸۔ سید احمد صاحب کے مذہبی رہنما یعنی مولوی محمد اسمعیل دہلوی نے کمال اطاعت شعاری سے انگریزی منصوبے کے مطابق پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ہوئے دین میں تحریف کرنے اور شجر اسلام میں توحید کی آڑ لے کر غیر اسلامی عقائد و نظریات

کی قلمیں لگاتے وقت خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا کا قطعاً خیال نہیں رکھتا تھا۔ کیا اسی برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کا خیال تک بھی سید صاحب اینڈ کمپنی کے قریب پھٹک سکتا تھا؟

۱۹۔ انصاف پسند حضرات سے التجا ہے کہ وہ سید صاحب کے ملفوظات، جنہیں مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی نے "صراطِ مستقیم" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا تھا، اُس کی روشنی میں سید صاحب کی تصویر دیکھیں۔ بھلا جب تک مرزا غلام احمد قادیانی نے صریحاً دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے متعلق مجدد، مصلح، مہدی اور مسیح موعود وغیرہ ہونے کے دعوے کر رہا تھا اور پے درپے الہامات سن رہا تھا، مرزا نے قادیان کے اُس دور اور سید احمد صاحب کے سارے کرانائی و طلسماتی دور میں فرق کیا ہے؟ دعویٰ نبوت کی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ وحی و عصمت تک کونسی صفتِ نبوت ہے جو سید صاحب نے اپنی ذات میں نہیں بتائی یا اس متن پر حاشیہ چڑھانے والوں نے اُن کے گلے میں نہ لٹکانی؟ باری تعالیٰ شانہ! تک صغیر، دیدارِ الہی، مصافحہ، مکالمہ، لین دین، عہد معاہدے، کلامِ حقیقی وغیرہ تک کے دعاوی سب موجود، چونکہ ان میں سے بعض چیزیں کتنے ہی انبیاء کو بھی حاصل نہیں تھیں لہذا دعویٰ کر دیا کہ سید صاحب سرورِ کوی و مہکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مشابہت پر پیدا ہوئے ہیں۔ اے انصاف! گے شیمانیاں! اے کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! کیا یہ سارے مراحل انگریز دشمنی میں طے کیے جا رہے تھے؟

۵ بھلا دیتی ہیں سب رنج و آلم حیرانیاں میری

ترہی تمکین بے حد کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

۲۰۔ پروفیسر صاحبانو! خدا کو حاضر و ناظر جان کر ایک صاحب صراطِ مستقیم کتاب پکڑ لیں اور دوسرے صاحب تقویۃ الایمان کو سنبھال کر بالقابل بیٹھ جائیں۔ مضامین کا موازنہ کر کے دیکھ لیں، جو بات ایک میں جزوِ ایمان دوسری میں وہی بات کفر و شرک کا سامان، جو شخص اس کے نزدیک ولی دوسری کے نزدیک شیطان، اسی طرح اگر ایک کتاب دوسری کا رد نہ کر دے تو ہمارا ذمہ نہ کیسے! اس سے زیادہ وضوح حق اور اتمامِ حجت

اور کیا ہو سکتی ہے، حقیقت تو واقعی عیاں ہے لیکن اُن نازک مزاج مہربانوں کا کیا علاج جو حقیقت کو مان لینے سے پہلے ہی نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں سوچیے تو سہی یہ کفر و ایمان کو شیر و شکر کرنے کی کارگزاری کیا انگریزوں سے ٹکرانے کی خاطر سرانجام دی جا رہی تھی، کہیں حکومت ہی کی شہ پر اپنا اور مسلمانوں کا دین و ایمان تباہ و برباد کرنے کے لیے تو ایسا نہیں کیا جا رہا تھا؟

۵ قادری دین میں کہ جھاگ خدا لگتی کچھ

مدعی لاکھ پر بھاری ہے گواہی تیری

۲۱۔ اچھا جانے دیجیے ہر قسم کے بیانات کو، جاتے غور ہے کہ انگریز حبیبی دور اندیش، باریک بینی اور عیار قوم جس نے اپنے روزِ اول سے ہی مسلمانانِ ہند کو خاص طور پر اپنے تسکینے میں کس رکھا تھا اور گرفت کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا تھا، اگر اُسے سید صاحب اینڈ کمپنی سے ایک فیصد بھی اپنی مخالفت یا اپنے نقصان کا اندیشہ ہوتا تو انگریز اپنی مملکت میں انھیں کھلے بندوں ہر قسم کی قوت جمع کرنے کی کیا ایک منٹ کے لیے بھی مہلت یا اجازت دینے کے روادار ہو سکتے تھے، کیا انگریز اتنے بیوقوف تھے کہ خود اپنی آستین میں بھد شوق سانپ پال لیتے یا سید صاحب کے پاس اتنی طاقت کہیں سے اچانک آگئی تھی کہ انگریزوں میں انھیں روکنے ٹوکنے کی طاقت و جرات ہی نہ تھی؟

۲۲۔ زیادہ لکھنا، لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خود ان حضرات کے نزدیک، ان کے جملہ موثر خوں کے نزدیک، یہ سارا خانوادہ، اس کی تمام ذیلی شاخیں، سب کا وجود تک انگریز کی ہنرمندی کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے سید صاحب ہوں یا اُن کا سارا محمدی گروہ، بعد میں اسی ڈگر پر چلائے جاتے تھے شمس العلماء، قسم کے حضرات ہوں یا مصلح و ریفارمر وغیرہ، یہ سب اور ان کی ساری جماعتیں، سب کے سب برٹش گورنمنٹ کے وفادار، اطاعت شعار بلکہ آلہ کار ہیں کہ رہے اور اس بدوش پرنازاں تھے، فخر یہ اس کا چرچا کرتے اور گورنمنٹ کی مزید عنایات



کے حقدار بننے رہتے، مخالفین پر زبانِ طعن و راز کرتے، اُن کی زبان بندی کرواتے اور  
 ”سبیاں بھٹے کو نزال اب ڈر کا ہے کا“ کے مصداق خوب مزے لوٹتے تھے۔ ماسوائے  
 اُن حضرات کے جو تحریکِ خلافت کے زمانہ سے گاندھی کو اپنا امام اور پیشوا بنا بیٹھے تھے۔  
 باقی حضرات کی ۱۹۴۷ء تک یہی کیفیت رہی۔ اُس وقت اس دوستی کا ظاہر کرنا باعثِ  
 عنایات تھا لیکن جب انگریز دور گئے، وہ چشمِ گرم ہی نہ رہی جس سے عنایتوں کی بارش  
 ہوا کرتی تھی، بلکہ اب انگریز دوستی کے اظہار میں محض رسوائی کے سوا اور کچھ نہ تھا،  
 اسی لیے یار لوگوں نے انگریزوں کے دورِ جانے کے بعد اُلٹی گنگا بہانی شروع  
 کر دی کہ صاحبو! کیسی دوستی اور کہاں کی دوستی؟ انگریز سے ہمیں محبت نہیں تھی، ہمارے  
 بعض بزرگوں کا جو انگریزوں کی بارگاہ میں آنا جانا اور فیضیاب ہوتے رہنا تھا وہ کوئی  
 آلہ کار بننے کے لیے تھوڑا ہی تھا بلکہ صرف تفریحِ طبع کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ رہا یہ کہ  
 ڈیڑھ سو سال سے ہمارے علماء اور مورخین کہتے آ رہے ہیں کہ ہماری اور ہمارے  
 چھوٹے بڑوں کی انگریز دوستی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے تو اس قسم کی باتوں کا  
 وہی لوگ یقین کرتے ہیں جنہیں انگریزوں سے کچھ بھی سیکھنے کا موقع نہیں ملا اور نہ جب انگریز  
 نہ رہے تو ہماری انگریز دوستی ہی کہاں رہ گئی؟ دریں حالات جب ہم انگریزوں کے دوست  
 نہ رہے تو اپنے بزرگوں کے ہاتھ پر یہ کھنگنڈا کا ٹیکہ کیوں باقی رہنے دیں۔ یقین جانیے  
 اگر ہمارے وہ علماء اور مورخین زندہ ہوتے جو انگریز دوستی کے بیانات دیتے آ رہے  
 تھے تو ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہی روز وہ حضرات بھی کچھ  
 کہنا مانتے جو آج ہم کہہ رہے ہیں اور فوراً اپنی اپنی تصانیف کے شروع میں ”اعتذار“  
 کی ایک ایک چٹ شامل کر دیتے، جس میں لکھا ہوا ہوتا کہ ”اس کتاب کے فلاں فلاں  
 صفحے پر کتاب کی غلطی سے جو انگریز دوستی لکھا گیا ہے، قارئینِ کرام اُسے انگریز دشمنی  
 پڑھیں، ہم اپنی کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں، اگلے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے گی  
 انشاء اللہ۔ لیکن :۔“

مچھلانے پہ بھی قصہ ربطِ ماضی  
 مچھلایا نہ جائے گا، ہم سے نہ تم سے

۲۳۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اپنی ساری تاریخ کو بدلنے کا ٹھیکہ لینے والے جناب غلام رسول مہر کی مندرجہ ذیل شہادت، خود ان کے اپنے لفظوں میں کافی رہے گی:

”اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سید صاحب کس کے خلاف جہاد کی دعوت دے رہے تھے؟ آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے اور وہ بھی محض اس بناء پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی تھی؛ لہٰذا موصوف اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی سعادت حاصل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ حقیقت موصوف کے جذبہ عقیدت پر گراں گزرتی تھی۔ ثبوت میں اُس خط کے دو اقتباس پیش کیے ہیں جو سید احمد صاحب نے شاہ بخارا کو بھیجا تھا نیز والی بہرات کے نام لکھے گئے خط کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ ان میں سید صاحب نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ موصوف کے کچھ مغالطے ہیں کیونکہ صوبہ سرحد میں سید صاحب اینڈ مچھنی کو بد مذہب اور انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ وہ اگر دوچار لفظ انگریزوں کے خلاف نہ کہتے تو اور کیا یوں کھد دیتے کہ واقعی مابعد دولت برٹش گورنمنٹ کے آلہ کار ہیں۔ بدنامی کا داغ مٹانے اور مسلمانوں کو ساتھ ملاسنے کی غرض سے انگریزوں کے خلاف دو لفظ مصلحتاً کہنے کا کلف فرمایا گیا تھا ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔“

## ۲۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء) اور سید احمد صاحب ایک ہی گاڑی کے دو پیسے، ایک جان اور دو قالب یا بمنزلہ روح اور جسم تھے، اسی لیے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دریں حالات گزشتہ سطور میں جو کچھ سید صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے اُسے ان دونوں حضرات کے بارے میں سمجھا جائے کیونکہ اگرچہ بظاہر سید صاحب ہی مرشد یا امیر المؤمنین کی پوزیشن میں جماعت کے سرگروہ نظر آتے ہیں، لیکن اندرون خانہ

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بارسوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۹

اس سارے ڈرامے کو ترتیب دے کر پیش کرنے والے اور اس نوزائیدہ محمدی گروہ کے قافلہ سالار اور رُوح رواں، یہی مولوی محمد اسماعیل دہلوی تھے۔

موصوف نے جب جامع مسجد دہلی کی میٹھیوں پر وعظ کتنا شروع کیا اور اپنے بعض غیر اسلامی اور خلاف مذہب عقائد و نظریات کی تبلیغ شروع کی تو دہلی کے عوام و خواص میں اور خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ ن دہاڑ یہ کیا ہونے لگا؛ جس گلشن کی آبیاری یہ خاندان بڑھ چڑھ کر کرتا آیا ہے اسی خاندان کا ایک عالم اپنے آباء و اجداد کے مذہب کو، عالم اسلام کے مذہب کو، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی آنکھیں بند ہوتے ہی، قربانی کا بکرا بنا کر خارجیت کے بُت کی نذر کر رہا ہے۔ عوام و خواص نے دنگا فساد کی بجائے قانونی راستہ اختیار کیا۔ پندرہ سو مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ ریڈیڈنٹ کی خدمت میں اس وعظ کے خلاف درخواست پیش کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ریڈیڈنٹ کو حکام اعلیٰ نے اُس وقت تک موصوف کے بارے میں کوئی خصوصی ہدایت نہ بھیجی ہو، یہی وجہ ہے کہ لاطلی میں پندرہ سو مسلمانوں کا پاس لحاظ کرتے ہوئے نیز امن و امان بحال رکھنے کی خاطر موصوف کا وعظ ممنوع قرار دے دیا اور بذریعہ کو تو ال تحریری حکم بھیج دیا گیا۔

موصوف نے اعلیٰ حکام کو اس پابندی سے مطلع کیا ہوگا، اعلیٰ حکام نے ریڈیڈنٹ کو صورت حال بتائی ہوگی اور خصوصی ہدایات سے نوازا ہوگا، جس کی اطلاع موصوف کو مل گئی ہوگی، لہذا انہوں نے اپنے معاونین یعنی برادرانِ دینی و یقینی کو ساتھ لے کر ریڈیڈنٹ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے تیور ملاحظہ ہوں :

”آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت طے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے، میدے کو کھٹی پر پہنچے، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا غشی ہیرالال تھا اور ایک خدمتگارت تھا پہلے آپ نے جا کر اطلاع کرائی، جوں ہی ریڈیڈنٹ نے سنا کہ شاہ اسماعیل آتے ہیں فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آکر لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا کہ آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا (یہ عقیدت!) معمولی مزاج پر

کے بعد ریڈیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب، ہمارے سررشتہ دار (علامہ فضل حق خیر آبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔  
جائے غور ہے، جہاں عوام کا احتجاج بے کار ہو کر نہ جائے، سررشتہ دار کی رپورٹ بیکار ثابت ہو جائے جس ریڈیڈنٹ نے حکماً وعظ بند کیا تھا وہ اٹا مولوی محمد اسمعیل دہلوی کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جائے اور فوراً وعظ جاری کرنے کا حکم نافذ کرے کیا مسلمانوں نے صورتِ حال کو سمجھ نہ لیا ہوگا؟ کیا کمپنی کی اس سازش کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ گئے ہوں گے؟ لیکن جہاں منغل بادشاہ (اکبر شاہ) بھی بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہا ہو وہاں عوام الناس کیا کر سکتے تھے؟ بیچارے صرف خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے اور بامرِ مجبوری دین کی بیخ کنی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بصدِ حسرت و یاس جو ریمارک دیا وہ پورے حالات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

”جب یہ لوگ (مسلمانانِ دہلی) مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیر آبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ اسمعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیجئے بغیر نہیں رہنے کا۔ یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو انھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔“

موصوف کے بارے میں اس سلسلے کی ضروری معلومات کا تذکرہ ہم گزشتہ ابواب میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں، اعادے کی ضرورت نہیں۔ اب ان کے بیانات اپنی تحریکِ جہاد کے متعلق ملاحظہ ہوں:

”یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیامِ کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسمعیل صاحب

۱۔ حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۶۳

۲۔ ایضاً، ص ۵۰

وعظ فرما رہے تھے، ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریزی پر جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے رُویا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔  
 مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

”کلکتہ میں جب مولانا اسمعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکتوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، اُن پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو اُن کی رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے، ہمیں اُن کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ اگر اُن پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اُس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آئینہ آنے دیں۔“

پجری فرقیے کے بانی جناب سر سید احمد خاں نے اپنے لفظوں میں یہ قصہ یوں سپرد قلم کیا تھا:

ایک مرتبہ وہ (مولوی محمد اسمعیل دہلوی) کلکتہ میں سکتوں پر جہاد کا وعظ فرما رہے تھے۔ اُنہوں نے وعظ میں کسی شخص سے اُن سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کرتے؟ وہ بھی تو کافر ہیں۔ اس کے جواب میں مولوی محمد اسمعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رُوستے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔“

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، سوانح احمدی، ص ۷۳

۲۔ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۴

۳۔ سر سید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۹

اپنے اکابر کی انگریز دوستی کا داغ مٹانے سے اپنے کو مجبور دیکھ کر اپنے امام مذہب مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے عاشق زار یعنی مولوی محمد منظور نعمانی سنبھلی کو ان الفاظ میں اعتراف کیا۔ بغیر کوئی راستہ نظر نہ آیا:

”مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی ہے“ لے

مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ فیصلہ کن بیان دیا ہے:

”سرستید نے اس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید، انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سرستید کے اس بیان کی تائید بعد کے متعدد مؤرخوں نے بھی کی ہے، چنانچہ ذاب صدیقی حسن نے ترجمانِ واپہ مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۲۱، ۸۸ پر، نیز سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری میں بس مقامات پر، اسی طرح حضرت شاہ اسماعیل کی سوانح موصوم حیات طیبہ کے صفحہ ۱۸۹، ۲۹۲، ۱۹۴ پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر حال میں بعض اصحاب نے ان حقائق کے برخلاف یہ کھنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے حضرت کا یہ بیان واقعات کے مطابق نہیں اور نہ اس دعوے کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے“ لے

لے ماہنامہ ”الفرقان“ لکھنؤ، شہید نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۷۶

لے محمد اسماعیل پانی پتی، مولوی: مقالات سرستید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۰

### ۳۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے، داماد اور جانشین تھے۔ چونکہ مولوی محمد اسمعیل جو حضرت کے بھتیجے اور مولوی عبدالحی بڈھانوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء) جو شاہ صاحب کے داماد تھے یہ خاندان عزیزی کے مسلک سے بغاوت کر چکے تھے اس لیے آپ نے اپنے وصال سے قبل ہی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ یہ کیوں بدسے؟ پس منظر ملاحظہ ہو۔

حالات کے بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی سید احمد صاحب کے نامور خلیفہ اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن مولوی محبوب علی صاحب کسی زمانے میں مسلمانانِ سرحد کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرما رہے تھے:

”سکھوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔“

جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے مجاہدین سکھوں کا نام لے کر مسلمانوں کو تیرتیغ کر رہے ہیں۔ ان کی جانوں اور اموال کو اپنے لیے حلال ٹھہرایا ہوا ہے اور ان کے تنگ و ناموس سے کھسیل رہے ہیں۔ تو ان کا ضمیر کچھ بیدار ہوا یا اسلامی غیرت نے کچھ رنگ دکھایا یا کلمہ گوئی کا کچھ پاس لحاظ سامنے آیا، کہ بر ملا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے:

”تمہارے اوپر زوجہ، بچوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم ان سب حقداروں کے حقوق تلف کر کے یہاں بیٹھے ہو۔ جب لوگوں نے کہا جہاد کے واسطے بیٹھے ہیں، تو مولوی صاحب نے کہا کہ جہاد کہاں ہے اور کس دن تم نے کون سے کافر کو قتل کیا ہے اور کون سے ملک میں تمہارا غل دخل ہے؟ صبح سے شام تک کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو، جہاد کا نام لینا ایک دیوانہ پن ہے۔ بعض لوگ اس جیلے سے یہاں عیش کرتے ہیں اور تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں۔“

۱۔ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۳

۲۔ محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۵

مولوی محبوب علی نے جب ساتھیوں کو یوں لاجواب کیا حتیٰ کہ سید صاحب پر بھی اعتراضات کیے اور وطن واپس لوٹ آئے تو اس تحریک کو بہت نقصان پہنچا، کیونکہ چندے کی فراہمی اور دہلی وغیرہ مراکز سے چندہ پہنچانے میں آپ نمایاں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی اس موقع پر ظاہر ہو گئے کہ اس تحریک سے موصوف بھی کسی قدر وابستہ ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس امر کی یوں تصریح کی ہے:

مولوی محبوب علی کے اغوا سے جو کاروبار جہاد کو صدر پہنچا، ویسا صدر اس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا، اکثر معاوین جہاد سُست ہو گئے۔ جب بہت سے خطوط مولوی محبوب علی کی تکذیب میں لشکر مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب مدتوں کے بعد مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب معاوین جہاد کی سعی سے یہ فتنہ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔ ۱

موصوف اس دوران میں چونکہ تقویۃ الایمانی خیالات کے زیر اثر آچکے تھے اور دوسری طرف تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا شرف بھی حاصل تھا، ان حالات میں فریقین کو خوش رکھنے کے لیے گول مول فتوے دیا کرتے تھے۔ جو باتیں تقویۃ الایمان میں کفر و شرک بتائی گئی ہیں، ان میں سے بعض کو ناجائز، بعض کو مکروہ وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن موصوف اپنی اس روش سے کسی فریق کو بھی خوش نہ کر سکے۔ جنت عین نے تو ان کی اس روش کو بھی غنیمت سمجھا لیکن اہلسنت کے زمرے میں جب موصوف کی ساکھ زیادہ گرنے لگے، اکثر اہل علم ان کی اس روش سے آگاہ ہونے لگے تو آپ نے اپنی پوزیشن کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی غرض سے ہجرت کو مناسب سمجھا، چنانچہ موصوف معرکہ بالا کوٹ کے دس سال بعد یعنی ۱۲۵ھ / ۱۸۴۱ء میں مقدس سرزمین حجاز کو ہجرت کر گئے اور باقی وقت وہیں

۱۔ محمد جنت تھانیسری، غشی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۸



گزارا۔ چونکہ اس اہلسنت سے علیحدہ ہونے والوں کے گروہ کی قیادت آپ کے سپرد تھی لہذا جاتے وقت مختلف حضرات پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے، جو اس نوزائیدہ محمدی گروہ کا سرپرست بنایا گیا۔

## ۴۔ مولوی محبوب علی

یہ سید احمد صاحب کے مرید و خلیفہ اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن تھے۔ آخر میں اپنے پیر کے جہاد کو فریاد یا فساد سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے تھے، جیسا کہ پیچھے مذکور ہوا۔ انگریز دوستی کے سلسلے میں اپنے مرشد اور اپنی جماعت کی طرح ثابت قدم رہے۔ موصوف کے بارے میں سرسید احمد خاں نے یوں لکھا ہے:

”شاید اس مضمون کے پڑھنے والے اس عجیب بات کے سننے سے بھی خوش ہوں کہ مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو، ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے سرغنہ بخت خان نے عین ہنگامہ غدر میں طلب کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ آپ اس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت ایک فتویٰ پر اپنے دستخط کریں۔ مگر مولوی محبوب علی نے صاف انکار کیا اور بخت خان سے کہا کہ ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں، ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور طرزہ بیرونی یہ ہوا کہ جو ایذا بخت خان اور اس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میمنوں اور بچوں کو دی تھی اس کی بابت بخت خان کو سخت لعنت ملاست کی۔“

## ۵۔ مولوی کرامت علی جون پوری

مذکورہ علمائے ہند کے مرتب پر وفیسر محمد ایوب قادری نے موصوف کے بارے میں یوں

لے سرسید احمد خاں: ہنٹ پر ہنٹ، مطبوعہ لاہور، بار اول، ۱۹۲۹ء، ص ۳۲

تصریح کی ہے :

”جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ احمد علی چریا کوٹی، مولانا احمد اللہ انامی اور مولانا قدرت اللہ رودولوی سے تحصیل علم کی۔ علم قرأت و تجوید سید ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ سید احمد شہید کے مرید ہوئے۔ بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔ مولوی شریعت اللہ کی تحریک کاشتت سے رڈ کیا۔ انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔“

انگریز مہدی مسٹر ولیم ہنٹر نے ان کی انگریز نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے :  
”یہ بڑا ہی مبارک واقعہ ہے کہ جس ضلع (جون پور) سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ (اکبر) کے خلاف بغاوت کا فتویٰ شائع ہوا تھا، اسی نے ایک ایسا عالم بھی پیدا کر دیا جس کا فتویٰ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔“

مولوی کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء) کی انگریز دوستی کے بارے میں مولوی مسعود عالم ندوی یوں تصریح کرتے ہیں :

”مجاہدین اور اتباع سید احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار، مسٹر جیمز اوکلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مزید اور وہابیوں کے پتے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۱۳ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا، جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ ۱۹۱۳ء میں درج کرایا تھا۔  
(وہ خوب صورت اور نظر زیب پفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے، مشہور ادیب، مولوی عبدالاقول صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اس کے علاوہ راقم

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: حاشیہ تذکرہ علماء ہند اردو، مطبوعہ کراچی، بار اول، ۱۹۶۱ء، ص ۳۹۶

۲۔ ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۷۳

بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحابِ خاص کی روش سے بالکل الگ تھے؛ لہ

## ۶۔ مولوی ملوک العلی نانوٹوی اینڈ کمپنی

مولوی ملوک العلی نانوٹوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۱ء) ہی کو مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) نے سرزمینِ حجاز کی طرف ہجرت کرنے وقت تشکیل کردہ بورڈ کا سرپرست بنایا تھا۔ موصوف نے انتہائی خاموشی سے انگریزی مقاصد و مفادات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دہلی کالج سے اینگلو انڈین علماء کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی، کہ ان کے ذریعے مسلمانوں کا تعلیمی نظام کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف ان تیار کردہ علماء نے انگریزوں کی موافقت میں فضا کو ہموار کرنے کا کام بڑی رازداری سے جاری رکھا۔ مولوی ملوک العلی کے بارے میں انگریزوں کی رائے کیا تھی، ملاحظہ فرمائیے:

”دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتقد تھے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا ملوک العلی پر بہت اعتقاد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقع پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا ملوک العلی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۵، ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا ملوک العلی مدرس اول کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا؛ لہ

مولوی ملوک العلی کے شاگردوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مدرسہ دیوبند کے بانیوں اور چلانوالوں میں تھے، جیسے مولوی محمود الحسن دیوبندی کے والد مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی شبیر احمد

۱۔ مسعود عالم ندوی، مولوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۴۷

۲۔ محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد حسن نانوٹوی، مطبوعہ کراچی، بار اول، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۶

عثمانی کے والد فضل الرحمن دیوبندی وغیرہ اس کھیپ کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں وضاحت کی ہے:

”مولانا ملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے وہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً آگے بڑھیں اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے نئے نظام تعلیم میں منسک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدرس)، مولانا فضل الرحمن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدرس) تو خاص ان (مولوی ملوک العلی) کے اعرہ واقارب ہیں۔“

ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں جو اسی وہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حسن صلہ سے نوازا۔“

## ۷۔ مولوی سمیع اللہ دہلوی

مولوی سمیع اللہ دہلوی کے بارے میں مولوی عبدالحق قدوسی نے یوں تصریح کی ہے:

”آپ (مولوی ملوک العلی نانوٹی) کے تلامذہ میں سے مولوی سمیع اللہ دہلوی

۱۔ محمد ایوب قادری پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوٹی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۷

بڑی شہرت کے مالک اور گورنمنٹ کے معتد علیہ آدمی تھے۔

مولوی ملوک العلی صاحب کے دوسرے شاگرد مولوی ذکاؤ اللہ دہلوی نے موصوف کی سوانح عمری لکھی اور ۱۹۰۹ء میں مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن سے شائع کروائی۔ اس کا ایک اقتباس پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کر کے نہ صرف موصوف کی انگریز دوستی کا، بلکہ برٹش گورنمنٹ کے ادارے کا رہنے والے کارکنوں کا فاش کیا ہے:

۱۶ دسمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے ساتھ استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مہر گئے اور وہاں انہوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک (جو برطانوی استعمار کے خلاف تھی) کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔

## ۸۔ مولوی ڈی پی نذیر احمد دہلوی

موصوف بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کے کارناموں کے پیش نظر شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے منصوبوں کو پاپائے تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے ساری عمر قلم سے کام لیتے رہے اور مزے سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی عنایات سے خوب فیضیاب ہوتے۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا، مقصد یہی تھا کہ کلام الہی کی تعلیمات کو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق ثابت کر کے دکھائیں، جیسا کہ سر سید احمد خان، مزاہیرت دہلوی اور کئی دوسرے حضرات نے بھی اس دور میں کیا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا حکمران ہو کر ہندوستان کے باشندوں کو جبراً غلام بنا لینا موصوف کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی تھی اور اس انعام خداوندی کا شکریہ ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

منہ ہفت روزہ "الاعتماد" لاہور، ۱۲ اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۶

مہ محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۸۴

”خدا کی بے انتہا مہربانی اس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے!“ لے  
 ”ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اس کو  
 ابد الابد تک سلامت رکھے!“ لے

موصوف کو مسلمانوں کے حکمران رہنے سے بھی وہ آرام نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا انگریزوں نے  
 پہنچایا۔ ڈپٹی صاحب کا یہ بیان ان کے سوانح نگار نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے:  
 ”شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عملداری میں ہم کو اپنی (مسلمانوں  
 کی) سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے!“ لے

## ۹۔ مولوی محمد احسن نانوتوی

مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء)، مولوی محمد مظہر نانوتوی اور مولوی

محمد میر نانوتوی کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ جملہ حضرات دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلی  
 کے شاگرد اور قریبی عزیز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں موصوف بریلی کالج میں مدرس تھے۔ جنگ آزادی  
 کے وقت یوں اپنا رنگ دکھایا:

”۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد  
 نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے  
 بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔ نواب بہادر خاں کمشنر بریلی مسٹر ایگزیکٹو کے  
 بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد تھا۔ اس سلسلہ  
 میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے: ”پچھلی صدی کے . . . . . محافظ حافظ  
 دھت خاں کے پوتے خاں بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پوری پوری  
 تائید کی اور کالج (بریلی کالج) سے فلسفہ ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے

لے اقتدار عالم بلگرامی: حیاتِ تدبیر، مطبوعہ شمسی پریس دہلی، ص ۱۳۷

لے ایضاً، ص ۱۳۷

لے ایضاً، ص ۱۳۷

مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔  
 موصوف نے انگریزوں کا حق نمک ادا کرتے ہوئے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو خلافِ شرع  
 بتایا تھا، ان کی یہ تقریر گویا مسلمانانِ بریلی کی ایمانی غیرت اور ہڈ بڑھتیت کے لیے ایک چیلنج تھی۔  
 جب سارے شہر میں ان کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور جان کا خطرہ تک پیدا ہو گیا، تو  
 موصوف نے بریلی کو چھوڑنا گوارا کر لیا لیکن انگریز دوستی کو اپنے اکابر کی طرح چھوڑنا منظور نہ ہوا۔  
 قارئین کرام درج ذیل اقتباس پر غور فرمائیں،

”اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی  
 کے خلاف ہو گئے۔ اگر کو تو الٰہ شہر شیخ بدر الدین کی فمائش پر مولانا بریلی نہ  
 چھوڑتے تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔“

## ۱۰۔ مولوی عبدالاحد

موصوف کون تھے؟ اس کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے،  
 ”مولانا محمد احسن نانوتوی کے دو بیویاں تھیں۔۔۔۔۔ دوسری بیوی بنارس  
 والی تھیں، ان کو والدہ عبدالاحد کہتے تھے۔۔۔۔۔ مولانا محمد احسن اپنی  
 سوتیلی اولاد مولوی عبدالاحد اور زینب بی کی ضروریات کا بہت خیال رکھا کرتے  
 تھے۔“

اب موصوف کے لفظوں میں ہی مولوی عبدالاحد کا تفصیلی تعارف کروایا جاتا ہے،  
 ”مولوی صاحب مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب تھے اور وہ ۱۸۵۰ء  
 میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالاحد کی تمام تربیت مولانا محمد احسن

۱۔ محمد ایوب قادری، نمبر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۵۰

۲۔ ایضاً: ص ۵۱

۳۔ ایضاً: ۱۱۸، ۱۱۹

سنے کی.... مولوی عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظِ قرآنِ کریم سے فارغ ہوئے۔  
 مولانا محمد احسن سے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹرنس  
 پاس کیا۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔۔۔۔  
 ۱۸۷۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا،  
 اسی سال انبارہ میں "رسالہ نمبر ۱۵ بنگال" کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء  
 میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔

۱۸۸۶ء میں مولوی عبدالاحد نے فشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع  
 مجتبائی دہلی پانچ سو روپے میں خریدا کیونکہ فشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔  
 مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع  
 ان کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا۔ پہلے یہ ایک معمولی سا  
 مطبع تھا، مولوی صاحب مرحوم نے اس کو بہت ترقی دی اور حبلہ ہی  
 یہ مطبع بڑھ گیا پاک و ہند کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر  
 ہوا کہ آج تک اس کی ساکھ قائم ہے "۱۷

موصوف نے مولوی بشیر الدین احمد (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی تصنیف "واقعات دارالحکومت  
 دہلی" جلد دوم، مطبوعہ شمس پریس آگرہ ۱۹۱۹ء کے صفحہ ۱۹۱ سے مولوی عبدالاحد کے بارے  
 میں ایک اقتباس یوں نقل کیا ہے:

"دہلی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے۔ قومی کاموں میں بہت  
 دل چسپی لیتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اسی سال  
 (۱۹۱۸ء) میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم  
 کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں۔ دل کھول کر قومی کاموں میں  
 جان و مال سے شرکت کرتے ہیں۔ جامع مسجد، مسجد فتحپوری، عرب اسکول،

لے محمد ایوب قادری پروفیسر مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۴۰، ۱۴۲



یتیم خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں۔<sup>۱</sup>

موصوف کی اسی دریا دلی کے بارے میں یوسف بخاری کی کتاب "یہ دتی ہے" کے صفحہ ۱۱۳ سے جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء سید احمد صاحب کا ایک بیان پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کیا ہے جو موصوف نے ۳ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ / ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دیا تھا۔ اُس بیان کا آخری حصہ ہرگز قارئین ہے:

"قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں اُنھوں نے بڑی فراخ دلی سے چندے دیے۔ علی گڑھ کالج، عربک دہلی کالج اور انجمن ٹوید الاسلام کے بے حد ولدادہ تھے اور ہمیشہ ان کی مالی امداد کرتے رہے۔ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں شاندار خدمات ان سے انجام پاتیں۔ حکیم صاحب اُن کا عمر بھرا اعتراف کرتے رہے۔"<sup>۲</sup>

ان جملہ مشاغل کے ساتھ موصوف کا برٹش گورنمنٹ کے ساتھ کیا رویہ تھا؟ انگریزی حکومت اور عام مسلمانوں نے آپ کو کس نظر سے دیکھا؟ ان تینوں سوالوں کا جواب مندرجہ ذیل عبارت میں تلاش کیجیے:

"پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۵ء میں مولوی عبدالاحد نے حکومتِ برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ اُنھوں نے دارفند میں دل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرضہ جنگ میں دیا۔ اُنھوں نے سٹی ریکورڈنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔"

۲۔ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوا۔ اُس زمانے میں

<sup>۱</sup> محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نازووی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۳، ۱۶۴

<sup>۲</sup> ایضاً، ص ۱۶۴، ۱۶۵

خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، لہذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔

## ۱۱۔ میاں نذیر حسین دہلوی

میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) موضع بلیتھوا مضافات سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں بقول مصنف الحیاء بعد المماتہ "۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ موضع بلیتھوا سیتوں کی بستی تھی لیکن جس طرح مولوی محمد اسماعیل دہلوی متحدہ ہندوستان کے شہر آفاق علمی و روحانی خاندان یعنی خاندان عزیززی کو لے ڈوبے اور ایک بھی قابل ذکر فرد کا نشان باقی نہ رہا۔ اسی طرح میاں صاحب کی بستی میں سیتوں کا ایک بھی گھر باقی نہ رہا بلکہ موصوف کے سوانح نگار کی تصریح کے مطابق وہاں صرف جولاہے آباد ہیں۔ موصوف کا ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔ شاہ اسحاق دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، جس کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں:

"مولوی نذیر حسین ولد جو اد علی سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا۔ ۱۱۳۷ھ / ۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پنچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۲۳ھ / ۱۸۲۹ء میں دہلی میں پنچے۔ پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے۔ مولوی عبدالخالق دہلوی، اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی، مولوی محمد بخش، مولوی عبدالقادر رامپوری (المتوفی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری سے جملہ علوم حاصل کیے۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق

لے محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۵

دہلوی (دف ۱۲۶۲ھ/۴۶-۲۵-۱۸۶۱) سے حاصل کی۔ نواب مولوی حبیب الرحمن  
 خاں شروانی، عبدالرحمن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ:۔ جس روز  
 شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوتے تو اس روز نذیر حسین  
 اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اوقیبت کی ایک ایک حدیث  
 پڑھی اور کُل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے  
 کاغذ پر یہی واقعہ لکھ دیا۔ اس سے پہلے مدرسہ میں کبھی پڑھنے کو نہیں آتے تھے۔

سند حاصل کرنے کے اس واقعے کو میاں صاحب کے سوانح نگار، مولوی فضل حسین بہاری  
 نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور واقعے کو غلط ملط کرتے ہوئے اصلیت کا صرف اتنا اعتراف  
 کیا ہے:

”مولانا محمد اسحاق نے ۱۲۵۸ ہجری میں ہجرت کی اور اسی سنہ میں بروقت

رخصت میاں صاحب کو اُن سے سند و اجازت تحریری حاصل ہوئی۔“

موصوف کی سند پر اکثر علماء و معترضین ہوا کرتے تھے کہ پتے تو ہلدی کی ذرا سی گانٹھ ہے لیکن  
 پنساری بنے بیٹھے ہیں۔ کہاں باقاعدہ سند و تدریس سے محروم اور کہاں شیخ الکل ہونے کا  
 پروسیگنڈا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعے کا تذکرہ میاں صاحب کے سوانح نگار نے یوں  
 کیا ہے:

”ایک روز مولوی احمد علی صاحب مرحوم سہارن پوری کو میاں صاحب نے

خفا کر کے فرمایا، میں چڑا اس نہیں دکھاتا ہوں۔ تم بیٹھو میں صحاح پڑھاتا ہوں،

دیکھو روش محمد ثانیہ رکھتا ہوں یا نہیں، اکثر ایسے موقع پر شوخی طبع سے

سند کو چڑا اس کے لفظ سے تعبیر کرتے رہتے۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، تذکرہ رجال حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳

۲۔ فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد المات، مطبوعہ ضیا پریس کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۵۹

۳۔ ایضاً: ص ۶۸

میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی۔ ساڑھے تین مہینے اُسے اپنے مکان پر رکھنے کے بعد انگریزوں کے کیپ میں پہنچا دیا تھا۔ خصوصاً اس واقعے کے بعد اُن کی نگاہوں میں بزنس گورنمنٹ اور حکومت کی نظر میں میاں صاحب کی مانند ؛ یہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

” ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی۔ ساڑھے تین مہینے تک رکھا، جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپیہ انعام اور خوشنودی سرکار کا سٹریٹیکٹ بلا جس زمانہ میں (۱۸۶۲-۶۵) واپس (غیر مقلد وہابیوں) پر مقدمے چل رہے تھے میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں منظر بند رکھا گیا تھا مگر بقول مولف الحیوة بعد الماتة وفادار گورنمنٹ ثابت ہوئے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا جب میاں نذیر حسین جج کو گئے تو کوشش دہلی کا خط ساتھ لے گئے۔ گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔“ لے

خطاب ملنے کے واقعے کو موصوف کے سوانح نگار نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

” گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ روزِ شنبہ کو ملا۔ جن لوگوں کو شیخ کے دیکھنے اور کچھ دنوں بھی ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً خطاب پانے والے خطاب کے لیے جو کچھ کرتے ہیں آپ کی طبیعت میں بالفطرۃ اُس کا مادہ ہی نہ تھا۔ وہ تدین، زہد، تقویٰ اور درویشی میں جس طرح ثابت قدم اور مستقیم الحال تھے ویسے ہی ان امور کی جانب سے نہایت ہی لڑا بالی اور بے پروا تھے۔ معلوم ہوا کہ جس وقت کوشش دہلی نے بگم لینڈنٹ گورنمنٹ گورنمنٹ کی طرف سے اس خطاب کی خبر آپ کو دی۔ اس سے ایک منٹ آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ

لے محمد ایوب قادری: مکملہ تذکرہ علماء ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۹۵

بات نہیں آئی تھی کہ میں اس عام لقب سے ملقب ہوں گا اور جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے؟ خلعت خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے۔ ہم کو دنیا لامل ہے۔ بعد اس گفت و شنود کے آپ نے اسی قدر فرمایا: اچھا آپ حاکم ہو، جو چاہو کوئی لے

جب میاں نذیر حسین صاحب کے وفادار حکومت ثابت ہونے کی بات چل نکلی ہے تو کیوں نہ اس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار ہی سے پوچھا جائے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ میاں صاحب بھی گورنمنٹ انگریزوں کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر، ۱۸۵۷ء میں جب کہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ، میاں وہ ہلڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا، حشرات الارض خانہ براندازوں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائط امارت و جہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اس فتوے پر دستخط نہیں کیا، مہر کیا کرتے اور کیا کہتے، مفتی صدر الدین خاں صاحب چکر میں آگئے۔ بہادر شاہ کو بھی سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے مگر وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے، کرتے تو کیا کرتے؟ لے

مولوی محمد اسماعیل نے جس داؤد ظاہری واسلے فتنے کا سنگ بنیاد بھی رکھا تھا، اسی ترک تقلید کی میاں نذیر حسین دہلوی نے موصوف کے بعد کھل کر سرپرستی کی اور اس طرح غیر مقلدین کا ایک علیحدہ فرقہ معرض وجود میں آگیا۔ علمائے اسلام نے سمجھانے بھانے اور رد و تردید کے

۱۔ فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الحیات، ص ۱۸۰، ۱۸۱

۲۔ ایضاً: ص ۱۲۵

ذریعے خوب اپنا فریضہ ادا کیا لیکن موصوف پر کوئی اثر نہ ہوا اور حکومت کی سرپرستی میں بے فہار ہی دوڑتے بھاگتے رہے۔ ۱۲۰۰ھ میں میاں صاحب نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جانے سے پہلے موصوف نے اپنے خداوندِ نعمت، کشنزدہلی سے چٹھی حاصل کی جو الحیات بعد المات کے صفحہ ۱۳۹ پر انگریزی میں درج ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں، جنہوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔ وہ اپنے فرضِ زیارتِ کعبہ کے ادا کرنے کو کھتے جاتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی وہ مدد چاہیں گے وہ ان کو مدد دے گا کیونکہ وہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں۔“

دستخط ہے۔ ڈی۔ ٹریملٹ بنگال

سرورس کشنزدہلی و سپرنٹنڈنٹ

۱۰ اگست ۱۸۸۳ء لے

موصوف نے دوسری چٹھی اس انگریز افسر سے حاصل کی تھی، جس کی بیوی کو میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ساڑھے تین ماہ اپنے گھر میں رکھا اور اس کی جان بچائی تھی۔ چنانچہ سوانح نگار نے لکھا ہے:

”دوسری چٹھی مسٹر لیسنس نے بنام کونسل مقیم جدہ کے دی، جس میں آپ کی خیر خواہی زمانہ غدر کا مفصل بیان تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے مخالفین بھی بہت ہیں اور ان میں سے بعض مکہ معظمہ میں یہاں سے بھاگ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ مسٹر لیسنس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ برٹش گورنمنٹ کانسول کا فرض ہے کہ ان کو ان کے مخالفین کے شر و فساد سے بچاتے۔ یہ چٹھی برٹش کانسول مقیم جدہ (مکتوب الیہ) نے اپنے پاس رکھ لی۔“ لے

لے فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد المات، ص ۱۴۰

لے ایضاً: ص ۱۴۰، ۱۴۱

میاں صاحب سے مکہ مکرمہ میں باز پرس ہوئی، تو حاکم مکہ معظمہ کے سامنے موصوف نے یہ بیان دیا:

”ہندوستان میں اس وقت انگریزی حکومت ہے۔ وہاں ہر مذہب والا آزادی کے ساتھ اپنے شعار مذہب کے ادا کرنے کا مجاز ہے۔ کوئی مسلمان نہ جمعہ سے روکا جاتا ہے نہ جماعت سے اور یہاں اسلامی سرزمین اور مسلمانوں کی حکومت میں ہم لوگ طواف کعبہ اور حجہ و جماعت سے مجبور ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ کہنے سے معذور سمجھے جاتیں کہ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں (دوہا بیوں) کے لیے خدا کی رحمت ہے!“

میاں صاحب اپنے غیر مقلد گروہ کے سرپرست اور شیخ اہل تھے۔ موصوف کے دست راست اور فعال کارکن مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں لکھا ہے:

مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلماء، شیخ اہل میاں نذیر حسین مدد و معاون بلکہ سرپرست و سرخیل رہے اور صادق پور کے بجائے مرکز قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہو گیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس وجود میں آئی، جس کے سبب فعال کارکن مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہلحدیث کانفرنس کی پالیسی بھی کم و بیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔“

ضروری ہوا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا انداز معلوم کیا جائے تاکہ اس جماعت کے سرپرست میاں نذیر حسین دہلوی کا حکومت کے بارے میں اور بھی واضح نظریہ سامنے آجائے۔

۱۔ فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد المات، ص ۱۶۱، ۱۶۲

۲۔ محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۸

## ۱۲۔ مولوی محمد حسین بٹالوی

مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) حقیقت میں اُس جماعت کی پالیسی کے علمبردار ہیں جس کا سنگ بنیاد مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے رکھا تھا۔ وہاں بیت کی اپنے روزِ اول سے ۱۹۲۰ء تک وہی پالیسی رہی جو مولوی محمد حسین بٹالوی نے اختیار کی۔ چنانچہ غیر مقلد حضرات کے سرگروہ، نواب صدیق حسن خاں قنوجی جو پالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

”۱۸۷۵ء میں مولوی محمد حسین سرگروہ موحدین لاہور، بھواب و سوال و مسئلہ اور اُس فتوے کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانان ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد جنگ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا بمقابلہ اُس حاکم کے کہ جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے اور از روئے شریعت اسلام عموماً خلاف و ممنوع ہے اور وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادی مذہب دی ہے، ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔“

پھر مولوی محمد حسین نے اپنے اس دعویٰ اور جواب کی تصدیق میں کُل علماء ملک پنجاب و اطراف ہند کے پاس اپنے فتویٰ جوابی کو بھیج دیا اور اچھی طرح سے مشترک کیا اور کُل علماء ہند و ملک پنجاب سے اس بات کی تصدیق میں اقرار مہری اور دستخطی کرایا کہ عموماً مسلمانان ہند کو ہتھیار اٹھانا اور جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کرنا خلاف مسئلہ سنت و ایمان موحدین ہے۔

اور نیز کُل علمائے ملک پنجاب و ہند نے تائیدِ قول مولوی محمد حسین کی کی اور اپنے اپنے دستخط و مہر کے مولوی محمد حسین کو اس فتویٰ میں بہت سچا اور پتھا کہا ہے اور سب نے اپنی اپنی راستے اسلامی و ایمانی سے اس فتوے کو قبول کیا ہے اور جانا اور مانا ہے کہ بمقابلہ گورنمنٹ ہند فرقہ موحدین کو ہتھیار اٹھانا



خلافت اسلام و ایمان کے ہے۔

پھر مولوی محمد حسین نے اس بات کی استدعا کی تھی کہ وہ ایمان ملک ہزارہ کے نزدیک ایک عام ایچی بذریعہ مسلمانان ہند کے بھیجا جائے اور وہ مع اس فتویٰ کے جا کر اس نا سمجھ کو مطلع کر دے کہ جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کے منوع ہے اور نیز ان کو آگاہ کر دے کہ ان کی اس نا فہمی کے خوزیزی و قتال جہاد پر سخت گناہ ثابت ہے اور سب کا گناہ ان کے سر پر وارد شرعی ہے اور چونکہ از روئے شریعت اسلام، برٹش گورنمنٹ ہند سے جہاد کرنا، خلافت طریقہ اسلام و شریعت حقہ کے ہے، اس لیے ان کو خیر خواہی و گورنمنٹ ہند میں برابر مستعد رہنا چاہیے۔

مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے فتوے میں انگریزوں کے خلافت جہاد کرنے کو ایمان اور اسلام کے خلافت قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے نہ صرف موصوف کے نزدیک بلکہ مولوی محمد حسین بٹالوی اور میاں نذیر حسین دہلوی کی تصدیق و تائید کرنے والے علمائے اہلحدیث کے نزدیک باغی اور مستوجب سزا ہیں۔ بسبیل تذکرہ یہاں جناب غلام رسول مہر کی تحقیق پر ایمان لانے والوں کی خدمت میں ایک گزارش ہی پیش کر دی جاتی ہے۔ وہ گزارش یہ ہے کہ تمام غیر مقلدین علماء کے اس متفقہ فتویٰ کی روشنی میں سوچے تو سہی! اگر آپ مہر صاحب کی پیروی میں سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا دُخ انگریزوں کی طرف بھی کرنا چاہتے ہیں تو بخوشی کیجیے لکنی اس صورت میں جملہ دیوبانی علماء کے نزدیک وہ حضرات باغی اور مستحق سزا بنتے ہیں اور ان کا یہ اقدام اسلام اور ایمان کے خلافت قرار پاتا ہے۔ اگر اس فتوے کو ناقابل اعتبار سمجھا جائے تو ایسا کرنا غیر مقلد حضرات کی ساری کوشش کے مقابلے اعتبار ٹھہرانے کے مترادف ہوگا۔

اب قارئین کرام، مہر صاحب کی تحقیق پر ایمان لا کر سید احمد صاحب کے جہاد کا دُخ انگریزوں کی طرف کرنے والے حضرات اور علمائے اہلحدیث، یہ سارے حضرات اس امر کا

فیصلہ فرمائیں کہ:

۱۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا رخ حقیقتاً انگریزوں کی طرف تھا۔

۲۔ علمائے اہلحدیث فرماتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اسلام اور ایمان کے خلاف اور ایسا کرنے والا سزا کا حقدار اور باغی ہے۔

تینوں قسم کے حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ ان فریقین میں سے کون سا فریق قابل اعتبار نظر آتا ہے اور کون سا ناقابل اعتماد؟ ہماری اس سلسلے میں عاجزانہ التماس یہی اتنی سی ہے کہ جس فریق کو بھی ناقابل اعتبار ٹھہرایا جائے اُس سے ازراہ کرم ہمیں بھی مطلع کر دینا، تاکہ ہم اُن سے محتاط رہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے مذکورہ فتوے کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کی تحقیق

یہ ہے:

”مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی فسوخی پر ایک مستقل رسالہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔ انگریزی اور عربی زبانوں میں اُس کے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سرچارلس ایچکس اور سمویل لائل گورڈن پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔ مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے راستے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعت السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطور ترمیم شائع کیا، پھر مزید مشورہ اور تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔“

موصوف کے مذکورہ فتوے کے متعلق جناب مسعود عالم ندوی کی راستے کچھ اس طرح ہے:

”معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے رخصتیں جاگیر بھی ملی تھی۔ اس رسالے کا پہلا حصہ پیش نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف

لے محمد ایوب قادری: مقدر حیات سید احمد شہید، ملبورہ کراچی، ص ۲۵

تدلیں کا عجیب و غریب نمونہ ہے“ لے

مولوی محمد حسین بٹالوی اپنے اس فتوے پر بے حد نازاں تھے اور اس کے ذریعے وہ اپنی ذات کو اور اپنی جماعت کو برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہوں میں سب سے ممتاز دکھانے اور ثابت کرنے پر اڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ موصوف کے رسالہ "اشاعت السنہ لاہور، جلد ۸ کے صفحہ ۲۶۱، ۲۶۲ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے اُن کا اسی فتوے کے سلسلے میں ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

"اگرچہ اس مضمون (فلسوفی جہاد) کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے خیر خواہوں نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اس رسالے میں ہے وہ آج تک کسی تالیف میں پائی نہیں جاتی۔ وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف موافقت کا خیال نہیں رہا، اس گروہ کے عوام و خواص نے... اس کو پسند کیا اور اس سے اپنے آراء کا توافقی ظاہر کیا۔ اس توافقی راستے کو حاصل کرنے کے لیے مؤلف (محمد حسین بٹالوی) نے عظیم آباد پلٹنے تک ایک سفر کیا تھا، جس میں لوگوں کو یہ رسالہ سنا کر اتفاق حاصل کیا اور جہاں خود نہیں پہنچا وہاں اس رسالے کی متعدد کاپیاں ارسال کر کے توافقی حاصل کیا۔" لے

یوں تو کتنے ہی علماء برٹش گورنمنٹ کے آلہ کار بن کر خفیہ یا اعلانیہ حمایت کا دم بھرتے اور انگریزوں کے تخریبی منصوبوں کو پائیہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی پوری پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لارہے تھے لیکن انگریز کی علی الاعلان، ڈنکے کی چوٹ موافقت کرنے، جہاد کو غسوخ قرار دینے، انگریز کے مخالفوں سے ٹکر لینے میں مولوی محمد حسین بٹالوی، مرزا غلام احمد قادیانی اور سرتیڈ احمد خاں علی گڑھی سب سے ممتاز ہیں۔ یہ تینوں حضرات آپس میں تو ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن کسی بھی چوتھی ہستی کو، اس میدان میں، ان حضرات کا بدمقابل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ثبوت کے طور پر موصوف کا ایک بیان ملاحظہ ہو، جسے پروفیسر محمد ایوب قادری نے "اشاعت السنہ لاہور

لے مسعود عالم ندوی، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۲۹

لے محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

جلد ۸، شمارہ ۹ کے صفحہ ۲۶۲ سے نقل کیا ہے،

”اس گروہ اہل حدیث کے خیر خواہ و وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قومی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس امر کو اپنے قومی وکیل، اشاعت السنہ کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱، جلد ۶ میں اس امر کا بیان ہوا ہے (اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں، جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے اس کے ظاہر ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔“

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت (غیر مقلد و باپی) اپنے روزِ اول ہی سے برٹش گورنمنٹ کی خیر خواہ اور وفادار تھی لیکن انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد سید صاحب کے بعض کاروباری قسم کے مجاہد خلفاء کا انگریزوں سے ٹکراؤ ہوا، ان کی تحریک کو مٹایا گیا، مقدمے چلے، نزائیں دیں۔ ان حالات میں حکومت سے ناراضگی قدرتی امر تھا لیکن ایک طرف گورنمنٹ کا آہنی پنجہ تھا تو دوسری طرف مولوی محمد حسین بٹالوی کی فہمائش۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پوری جماعت برٹش گورنمنٹ کی وفادار و خیر خواہ بن کر اس کے استحکام و قیام کو اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ گرداننے لگے۔ اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی یوں منغمہ سخن ہیں:

”گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کسی قدر تسلیم کیا ہے اور اس کے کیسے فرمانبردار، مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں۔ ان پر کیا، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی ان کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷

۲۔ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۶۷

مولوی محمد حسین بٹالوی نے ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جوبلی پر برٹش گورنمنٹ کی بارگاہ میں اپنا نذرانہ عقیدت نچھاور کرنے کی غرض سے جو ایڈریس پیش کیا تھا اس کا ایک اقتباس "اشاعۃ السنہ" لاہور، جلد ۹، شمارہ ۷، کے صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں نقل کیا ہے،

"یہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاص کر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کہ ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی یہ آزادی حاصل ہے، اس خصوصیت سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام و استحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے بارگاہِ باد کی صدائیں زیادہ زور کے ساتھ نعرہ زن ہیں" لے

اسی سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

"اسی طرح لارڈ ڈفرن والٹسرا تے ہند کی سبکدوشی پر جماعت اہل حدیث نے ایک خوشامدانہ ایجنڈا لیس دیا، جس پر سب سے پہلے شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط ہیں۔ اس کے بعد ابو سعید محمد حسین وکیل اہل حدیث، مولوی احمد اللہ واعظ میونسپل کٹنر امرتسر، مولوی قطب الدین پٹیوائے اہل حدیث روپڑ، مولوی حافظ عبداللہ غازی پوری، مولوی محمد سعید بنارس، مولوی محمد ابراہیم آراہ اور مولوی نظام الدین پٹیوائے اہل حدیث بدراس کے دستخط ہیں" لے

مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد صاحب نے اپنی اس نوزائیدہ جماعت کا نام "محمدی گروہ" رکھا تھا۔ خلفاء کا دور آیا تو اپنے لیے "موتدین" اور مسلمانوں کو مشرکین بتانے لگے لیکن محمد بن عبد الوہاب کے نقش قدم پر چلنے کی بنا پر متحدہ ہندوستان کے مسلمان بھی انہیں اہل عرب کی طرح "وہابی" ہی کہا کرتے تھے۔ جب مقدمہ انبالہ کے تحت انگریزوں نے اپنے خانہ زادوں کی لاکھوشالی شروع کی، جو اب انگریزوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ اس پکڑ دھکڑ سے وہابی

لے محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷

لے ایضاً، ص ۲۷

حضرات گھبرا اٹھے۔ اس موقع پر مولوی محمد حسین بٹالوی کام آئے۔ ایک طرف انہوں نے حکومت کے غصے کی آگ اپنی خوشامداندہ روش اور کاسہ لیبسی کے پانی سے سرسید احمد خاں کی طرح بجھانی شروع کی اور دوسری طرف اپنی پوری جماعت کو حکومت کا وفادار بنا دیا۔ اس جماعت کے ہاتھ پر جو مسلمانوں نے وہابیت کی چٹ بگا رکھی تھی، اُسے اہل حدیث حضرات کے وکیل مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے سرپرستوں کے ذریعے قانونی طور پر ہٹانے کی کوشش کی اور اپنی جماعت کا نام جس طرح منکرین حدیث نے "اہل قرآن" تجویز کیا ہے، اسی طرح ان منکرین فقہ و تقلید ائمہ نے اپنی جماعت کو "اہل حدیث" کا نام دیا۔ مثلاً،

"انہوں نے ارکان جماعت اہل حدیث کی ایک دستخطی درخواست لیفٹننٹ گورنر پنجاب کے ذریعہ سے والسرا تے ہند کی خدمت میں روانہ کی، اُس درخواست پر سر فہرست شمس العلماء، میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسب ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے "اہل حدیث" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے اس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۳ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۶، اور گورنمنٹ یو۔ پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی۔ بی کی طرف سے ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۳ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲، اس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین بٹالوی کو ملی۔"

موصوف کے مذکورہ بالا بیان کا ماخذ رسالہ "اشاعت السنہ" لاہور ہے۔ اس کی تائید میں سیرت شنائی مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۳۶۲ سے مولوی عبدالمجید خادم سوہدری کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

”مولوی محمد حسین بٹالوی) نے اشاعت السنہ کے ذریعہ اہل حدیث کی بہت محنت کی۔ لفظ ”وہابی“ آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا۔۔۔ (آپ نے) حکومت کی خدمت بھی کی اور انعام میں جاگیر پائی۔“

### ۱۳۔ مولوی نواب صدیق حسن خاں قنوجی

آپ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ / ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو اپنی ننہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ محترمہ قنوج چلی گئیں جو موصوف کا آبائی وطن تھا۔ درسی علوم مفتی صدر الدین دہلوی سے حاصل کیے، تفسیر و حدیث وغیرہ علوم قاضی حسین انصاری، شیخ عبدالحق ہندی اور مولوی محمد یعقوب دہلوی سے حاصل کیے۔ پہلے بھوپال میں ملازمت کی بعد ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱-۷۲ء میں رئیس بھوپال کی شوہرنی دنیا بت کا شرف بھی مل گیا۔ ذابنی اور خان بہادری کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کے ہم مسک و ہم مشرب تھے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے اور شانِ نوابیت کے بل بوتے پر اپنی جماعت کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ انگریز دوستی میں بڑھ چڑھ کر حقہ دار رہے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو نواب صاحب شرعی نقطہ نظر سے کیا درجہ دیتے تھے، خود موصوف کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

”چنانچہ غدر یعنی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں جو چند لوگ نادان، عوام الناس، فتنہ و فساد پر آمادہ ہو کر جہاد کا جھوٹا موٹ نام لینے لگے اور عورتوں اور بچوں کو ظلم و تعدی سے مارنے لگے اور ٹوٹ مار پر ہاتھ دراز کیا اور ہوالِ رعایا اور پرایا پر غصباً قابض و متصرف ہوئے انھوں نے خطائے فاحش کی اور قصور ظاہر، اس لیے کہ قرآن و حدیث کے موافق کہیں شرطیں جہاد کی موجود نہ تھیں، سوائے

لہ محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶

سودائے خام اور خیالی پلاؤ حکومت رانی اور ملک ستانی کے اُن کے دلوں میں اور  
مغزوں میں سمائے ہوئے تھے ہم نہیں جانتے کہ اُن میں سے کسی جماعت اور  
شکر میں خلوص نیت اور پاکی طینت اور انصاف واجبی اور تبعیت مذہب  
اسلام ہوئے۔

موصوف کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سراسر ایک فتنہ و فساد تھا۔ چنانچہ تصریح کرتے ہیں کہ:  
”آج کل عام مسلمان جن کو علم و فہم سے بہرہ نہیں بلکہ اکثر اربابِ دُول و حکومت جنہیں  
اسلام کی خوبیوں سے اور ایمان کی باتوں سے بالکل واقفیت نہیں، جس کو  
جہادِ بھروسے ہیں، وہ حقیقت میں فتنہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔“  
اسی سلسلے میں موصوف یوں اپنا عقیدہ ظاہر کرتے ہیں:

”جس کا جی چاہا اور اُس کو سوسٹہ سرداری نے گھیرا، وہی سرکار سے باغی  
ہو کر لڑنے کو کھڑا ہو گیا اور اس لڑائی کو جہادِ ٹھہرایا، حالانکہ وہ جہاد نہ تھا،  
سراسر فتنہ تھا۔“

اسی جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء کے بارے میں موصوف نے یوں نوابی فیصلہ صادر فرمایا ہے:  
”بغاوت جو ہندوستان میں بزمانہ نذر ہوئی، اُس کا نام جہاد رکھنا اُن لوگوں کا  
کام ہے جو اصل دینِ اسلام سے آگاہ نہیں اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن اٹھانا  
چاہتے ہیں۔“

جن مسلمانوں نے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا، جو انگریزوں کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں  
سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے اور جو اپنے ملک کو غاصب انگریزوں کے پنجے سے چھڑا کر  
آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے، وہ تھے کون، اس سوال کا جواب نواب صدیق حسن خان

علی صدیق حسن خان قنوجی، نواب، ترجمانِ دہلیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۲۴

۱۷ ایضاً : ص ۲۸

۱۸ ایضاً : ص ۳۰

۱۹ ایضاً : ص ۱۰۷



صاحب نے یوں دیا ہے:

”جتنے لوگوں نے غدر میں شرفساد کیا اور حکام انگلشیہ سے برسرِ عناد ہوئے  
وہ سب کے سب مقلدانِ مذہبِ حنفی تھے، نہ متبعانِ حدیثِ نبوی۔ مگر  
مگر اور زور کی راہ سے فتنہ پردازی کی تہمت دوسروں پر باندھ دی اور اہلِ غدر کو  
دیباہی ٹھہرا دیا“ لے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمانوں کا نواب صاحب کی نظر میں جرمِ کیا تھا، ان  
پر کوئی دفعہ عائد ہوتی تھی؟ اس سلسلے میں شریعتِ محمدی کے ٹھیکیدار بننے والے نواب صاحب  
کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

”وہ لوگ جو بتقابلہ برٹش گورنمنٹ ہندیا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادیِ مذہب  
دی ہے ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں  
اور مستحقِ سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں“ لے

اب آخر میں ملاحظہ ہو کہ غیر مقلدانِ ہند کی نظر میں انگریز جیسی عیار، ظالم اور اسلام دشمن قوم کیسی تھی؟  
پہلے باب کے اندر جس کے عیار ان قبضے، ظالمانہ روپتے اور اسلام دشمن منصوبے کا اجمالی ذکر  
کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں نواب صاحب کی قصیدہ خوانی ہو سکتا ہے تک حلالی کا ثبوت ہو  
لیکن مسلمانوں کی ایمانی غیرت کے لیے چیلنج ہے۔

”غرض ان (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ درستگی ملک اور  
صفائی راہ اور رفاہِ عوام اور امنِ خلافت اور امانِ مخلوق اور راحتِ رسانی  
رعیت اور آرامِ دہی بریت میں حکامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اس وقت میں  
بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے ملا اور مفتی خوشامد کی راہ سے  
باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں مگر میری نظر میں جو راج اور صحیح

لے صدیق حسن خاں قنوجی ۲ نواب، ترجمانِ دیباہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۷۴

لے ایضاً: ص ۱۲۰

معلوم ہوا، وہ لکھ گیا۔ قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔“ لے  
 ۵ گرچہ ہے دلکش بہت حسنِ فرنگ کی بہار  
 طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گزر

## ۱۴۔ سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔  
 تعلیم حاصل کی لیکن بے توجہی سے اور بہت کم۔ ابتدائی زندگی رنگارنگ قسم کی ہے۔ حالی پانی پتی  
 نے اس کی یوں تصویر کشی کی ہے :

”سرسید کا عنقوانِ شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔  
 وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہاتھوں کی سیر کو دوستوں کے  
 ساتھ جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں  
 کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے  
 آغاز میں درگاہوں میں ہوتے تھے، وہاں جاتے تھے۔ خود ان کے نانا فرید  
 کی قبر پر چونسٹھ کھجے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور  
 بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے“ لے

سرسید احمد خاں اپنی سوانح حیات خود یوں بیان کرتے تھے :

”اول اول تو جب کبھی سرسید کے سامنے اور ان کی لائف لکھنے کا ارادہ  
 ظاہر کیا جاتا تھا، تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ : میری لائف میں سوا  
 اس کے کہ لڑکپن میں خوب کھڑیاں کھیلیں، گنگوٹے اڑاتے، کبوتر پالے،  
 ناچ مجھے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلاوٹے اور رکھا

لے صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی : ترجمانِ دہلیہ ، مطبوعہ امرتسر، ص ۳۴

لے الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید ، ص ۱۰۴

ہی کیا ہے؟ لہ

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی نے سرسید احمد خاں کا تعارف یوں کر دیا ہے،  
 ”اس گنبد میں ایک شخص سرسید احمد خاں صاحب بہادر بھی پیدا ہوئے۔ یہ  
 شخص ابتداء میں مولوی مخصوص اللہ صاحب نبیرہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی  
 خدمت میں آکر کسی قدر صرف و نحو سے آشنا ہوتے اور تعویذ گنڈے بھی سیکھے،  
 لیکن جب یہ نسو نہ چلا تو گورنمنٹ برٹش کی طرف رجوع کیا اور اپنی لیاقتِ خدا داد  
 سے کوئی اچھا عمدہ بھی پایا، پھر تو پکتے دہا بی قیس مولوی اسماعیل صاحب ہو گئے  
 ..... اس عرصہ میں غدر ہو گیا اور سرسید صاحب اپنی خیر خواہی اور حکامِ رسی  
 سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں  
 بڑے فاضل یا فلاسفر با وقار مانے گئے اور سی۔ ایس۔ آئی کا لقب حاصل کیا  
 اور کچھ عجب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش، ۱۸۵۷ء کے فساد سے پُر حذر ہو اور سید صاحب  
 نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا بلکہ خیالات مذہبیہ  
 کے گرانے کا بھی بیڑہ اٹھایا ہو۔“ لہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرسید احمد خاں صاحب نے اپنی قوم کے خلاف اور اپنے ملی  
 مفادات کے خلاف دل کھول کر انگریزوں کی مدد کی۔ موصوف کے اس کارنامے کو انگریزوں نے  
 بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور انھیں خوب مالامال کیا۔ سرسید احمد خاں صاحب کی  
 ان کارگزاریوں کے لیے دفتر چاہیں تفصیلی حالات کے لیے اُن کی تصنیف ”تاریخ سرسیدی بجنور“  
 بھی کافی ہے یہاں محض ایک جھلک دکھانے کی غرض سے اُن کے سوانح نگار یعنی خواجہ  
 الطاف حسین حالی کا ایک بیان ہدیہ انظارِ ناظرین ہے:

”جو شخص سرسید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا، وہ اس بات کو

لہ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۱۱

لہ عبدالحق حقانی، مولوی: تفسیر حقانی، جلد اول، ص ۱۱۲

بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری  
 اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ  
 بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں ان سے کوئی  
 امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ مگر  
 گورنمنٹ نے خود اپنی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی  
 ایک ہزار روپے کا اور دو سو روپے ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دونوں تک  
 مقرر کی۔

موصوف کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کیا اور کیسی تھی؟ خواجہ الطاف حسین حالی نے اُن کا ایک  
 بیان یوں نقل کیا ہے:

”الہی تیرا بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور  
 منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک تو نے اپنے ان بندوں کو،  
 جن کو تو نے خطہ ہندوستان میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح عادل اور منصف  
 حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے ان  
 حاکموں کے ہماری شامت اعمال ہمارے پیش آئی، اب تو نے اُس کا عوض  
 کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان  
 کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں، تو اپنے فضل سے اس کو قبول کر۔“

سید احمد خاں آخر برٹش گورنمنٹ کے اتنے خیر خواہ کیوں بنتے تھے؟ اس کی وجہ خود موصوف  
 کی زبانی سنئے:

”انہوں (سید احمد) نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا کہ میں ہندوستان میں  
 انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور اُن کی ہوا خواہی کی نظر سے

۱۔ الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۱۳۸

۲۔ ایضاً: ص ۱۵۱

نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ (مسلمان) اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔

موصوف کے نزدیک انگریز مسلمانوں کے ہمدرد اور ہی خواہ تھے۔ اس خوش فہمی میں وہ دانستہ مبتلا ہونے پر مجبور تھے اور پوری قوم کو بھی اس خوش فہمی کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ اس دعوے کی دلیل سرسید کے پاس وہ چند قوم فروش بلکہ دین فروش تھے جنہیں حکومت نے فکر دنیا سے آزاد کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو موصوف جس قسم کی تلقین کیا کرتے تھے وہ خود سرسید احمد خاں صاحب کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے :

ہم (سرسید احمد خاں) جو یہ لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے، اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر دان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت و آبرو کی، انعام و اکرام اور پشنٹ جاگیر سے نہال کر دیا ہے۔ ترقی عہدہ اور افزونی مراتب سے سرفراز کیا ہے۔ پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور اپنی گورنمنٹ کے شکر گزار اور شاخاں رہیں؟

پھل نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پر شاد ہے  
خصیتِ اذمطن ہے کہ گانا نکل گئی

کاسہ لسی کا اولین زیکار ڈیکھنا ہو تو انگلش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی سرسید احمد خاں صاحب کی زبانی سنیے اور مسٹر غلام احمد پرویز کو بھی سنائیے کیونکہ موصوف کی نظروں میں پاکستان کا حقیقی بانی سرسید تھا۔ انگریز کی چھو گیری پر مسلمانوں کو مجبور کرنے والا، مسلمانوں کا دینی وجود ختم کر کے انہیں زبانی مسلمان اور انگریزوں کا سائیس، کلرک اور دربان بنا رہا تھا یا پاکستان؟

۱۔ الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۶۸۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۵۷

خیراب منطقی قصیدہ ملاحظہ ہو :

”اُن (سرسید) کی نہایت نچتر رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت پر زور حاصل کیا اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔“

کشتیِ دل کی الہی بحرِ ہستی میں ہو خیر  
نا خدا ملتے ہیں بسیکن با خدا ملتا نہیں

میں حیران ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کی چاپلوسی اور ملتِ فروشی میں سرسید احمد خاں کو اول نمبر قرار دوں یا مولوی محمد حسین بٹالوی کو؟ لیکن میں فیصلہ کرنے والا کون؟ اس امر کا فیصلہ تو خود قارئینِ کرام نے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں کیوں نہ موصوف کا ایک سستی فتویٰ بھی پیش کر دیا جاتے :

”مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور متما من ہیں اور اپنے فرائض مذہبی و بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں۔ وہ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں، نہ بغاوت، نہ کسی قسم کا فساد۔“

چونکہ متحدہ ہندوستان میں وہابیت کو نجد سے درآمد کرنا، خود انگریزی حکومت کا کارنامہ تھا اور وہی اس کی سرپرست تھی۔ سرسید احمد خاں صاحب اس نوازش کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں :

لے الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید، ص ۶۸۲

لے ایضاً : ص ۲۳۳

”وہابی جس آزادی مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں رہتے ہیں، دوسری جگہ ان کو میسر نہیں ہے۔ ہندوستان ان وہابیوں کے لیے دارالامن ہے۔“

اسی سلسلے میں موصوف کا اس سے بھی واضح ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے، ”انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اس فرقہ کے لیے جو وہابی کہلاتا ہے، ایک رحمت ہے (جو ۱۹۴۷ء میں وہابیوں کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اختر) جس طرح ہندوستان میں کل مذہب کے لوگوں کو کامل آزادی ہے، جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں، ان میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادی مذہب ملنا مشکل بگہ ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری میں وہابی کا رہنا مشکل ہے۔“

کیوں صاحبو! چودہ طبق روشن ہوئے یا نہیں؛ مسلمان بادشاہ کی حکومت میں آخر وہابی کا رہنا مشکل کیوں ہے اور یہ حضرات انگریزی عملداری کو اپنے لیے رحمت اور دارالامن سمجھنے اور لکھنے پر کیوں مجبور ہیں؛ کہیں یہ سب کچھ برٹش گورنمنٹ ہی کے دم قدم کی بہار تو نہیں ہے؛ اس کے باوجود اسلام کے ٹھیکیدار بننا، اپنے لیے موجد ہونے کا دعویٰ کرنا اور پتے مسلمانوں کو مشرک، بدعتی اور بریلوی فرقہ گننا، یہ کیا ستم ہے؛

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی  
میں کیا باتوں رات بچھے کس کے گھر طے

موصوف نے وہاں بیان ہند کا برٹش گورنمنٹ کے متعلق نظریہ اور ان کی انگریز دوستی کو واضح لفظوں میں بیان کرتے ہوئے اس امر کی کوشش کی ہے کہ جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں حق لینے کی وہابیوں پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ نری الزام تراشی ہے۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں :

لے محمد اسمعیل پانی پتی، مقالات سرسید، حقہ نم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۲  
کے ایضاً : ص ۲۱۲

دوبابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو اور اُس کا اسلام ہو لے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ درپور وہ تخریب سلطنت کی فکر میں چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے، محض تہمت ہے اور ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ اُن سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں، بایں ہمہ وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر دوبابی کہتے ہیں۔ سرکار نے بے سوچے سمجھے اُن کو معتمد نہیں گردانا۔ بلکہ غدر کے زمانے میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی، اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح تایا گیا اور وہ خیر خواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا دعوہ دے سکتے ہوتے اور بغاوت وہاں بیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا، یہ کیونکر ظہور میں آتا؟ لے

شاید اکبر الہ آبادی نے اسی روش کو دیکھ کر یہ شہرِ قُت کیا تھا:

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں  
مجھے حیرت تو اُن پر ہے، جو اس ٹٹنے پر مٹتے ہیں

سرستید احمد خاں صاحب پر حکومت کو بڑا اعتماد تھا، بڑے سے بڑا انگریز اُنھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، کسی وقت بھی اُن کی جعفر بنگال اور صادق دکن سے کم عزت نہیں کی جاتی تھی۔ اس کامیابی اور اثر و رسوخ کو کس طرح حاصل کیا گیا تھا؟ موصوف کے سوانح نگار خواجہ الطاف حسین حالی کی زبانی سنئے:

”لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرستید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا، تو بھی اصل سبب اُن کی راست بازی اور سچائی ٹھیرے گی، کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹیو (NATIVE) کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا، جب تک اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر

لے الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۲۳۳



تایا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں ہے۔

سرستید احمد خاں صاحب لندن گئے۔ کس کس سے ملے اور کون کون سی ہستیاں ان سے آکر ملیں، ملاحظہ فرمائیے:

”الغرض سرستید بھتی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور میکین برگ اسکواڑ میں ایک مکان کرایے پر لے کر ٹھہرے اور اپنے دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروت اور خلق سے ان کے ساتھ پیش آئے۔ وہ ہندوستان میں سرستید اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ (لارڈ لارنس) اکثر ان (سرستید) کو اپنے گھر ڈز پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ ان سے ملنے کو آتے تھے۔ انہوں نے ہی سرستید کو لندن کے اکثر امرا و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹینلی آف ایڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے، وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرستید سے ملنے رہتے تھے۔ برجان ولیم کے انڈر سیکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرستید کو خصوصیت ہو گئی تھی۔ جیمس معظلم کے سدھی ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے اور سائمنٹی فکس سوسائٹی علی گڑھ کے پیٹرن بھی تھے، وہ بھی سرستید سے بڑے اخلاق اور تپاک سے ملنے رہتے اور اپنے بیٹے مارکوس آف لارنس سے بھی، جو ملک معظلم کے داماد ہیں، ان کو بلایا۔“

اسی دورہ لندن کے مزید حالات و کمالات ملاحظہ ہوں:

”سرستید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز ان کاموں میں جی کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، مصروف رہے۔ بایں ہمہ ان کو اکثر خاص خاص تقریروں میں بلایا جاتا تھا اور ان کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو

لہ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۶۶۳ لہ ایضاً، ص ۲۰۶

وہ لارڈ ڈلارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈیز پر جلائے گئے اور ۱۳ جولائی کو سمٹو نہیں  
 سوسائٹی آف سول انجینئرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں اور اس کے بعد  
 جو اسی کے متعلق گریچ میں ڈیز ہوا، اُس میں شریک ہوئے۔

اس جلسے کی کیفیت ڈیلی نیوز (DAILY NEWS) مورخہ ۲۱ جولائی میں  
 مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پرن نے جو سوسائٹی ڈیز کے پریسیڈنٹ  
 تھے سرسید کو اُس جلسے میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ  
 وقت معین پر میرے اسٹیمر میں، جو پازلیمنٹ ہاؤس کے سامنے موجود ہوگا، آئیں  
 مگر خود لارڈ ڈلارنس سرسید کے مکان پر آتے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کر کے  
 لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جا کر عاضری کھائی اور  
 اسٹیمر کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے، پھر خاص اجازت سے  
 ایک جنگی جہاز اور اُس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے  
 گریچ میں جا کر ڈیز کھایا۔ اس ڈیز میں کئی ڈیک اور بہت سے لارڈ اور  
 بڑے بڑے انجینئرز شریک ہوئے۔ کھانے میں طرفہ بات کہ ڈیز مذکور کی مینیو میں  
 مندرج ہے، یہ تھی کہ تین طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی  
 جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے (وہ دریائی جانور حلال ہیں یا حرام) خشکی  
 کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجینئروں نے جو اس جلسے میں شریک  
 تھے، کھانے کے بعد اسپین دیں، اور سال گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو  
 انجینئرنگ میں ہونے کا ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے اسپچ دی اور آخر  
 میں لارڈ ڈلارنس اور سرسید کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔ لے

۵ گردن ریفارمر کی ہر اک سمت تن گئی  
 بگڑی ہے قوم و ملک کی، ان کی تو بن گئی

لے الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۲۰۷

سرستید انگریزوں کی نظر میں کیا تھے۔ یہ قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ صرف برٹش گورنمنٹ ہند کے اراکین و عمائد ہی انہیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ حکومت برطانیہ کی عظیم ہستیاں بھی انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتی تھیں، آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب خود تلاش کریں۔

اس ضمن میں احقر اتنا عرض ضرور کرے گا کہ غلام ہزار دفعہ یہ کہے کہ میں اپنے آقا کا دل و جان سے خیر خواہ اور وفادار ہوں اور اپنے قول کی عملاً ساری عمر تصدیق بھی کرتا رہے، یہ اس کی انتہائی فرماں برداری اور نمک حلال غلام ہونے کی دلیل ضرور ہے لیکن اگر آقا اپنے غلام کی اطاعت شعاری، فرماں برداری و جاں نثاری کا اعتراف کرے، خود اس غلام کی شناختی کرنے لگ جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی اطاعت شعاری کی دلیل ہی نہیں بلکہ فرمانبرداری کے نام پر پرستش کی حدود تک یہ جذبہ عقیدت و وابستگی، اُسے لے گیا ہوتا ہے۔ موصوف کے بارے میں ایک بیان ایسا بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ پیشل کمشنر اورنج، مسٹر کری کرافٹ وین نے سرستید احمد خاں صاحب کے کارناموں کے پیش نظر شہر میرٹھ (یو۔ پی) میں موصوف کو مخاطب کر کے واشگاف الفاظ میں علی رؤس الاشهاد کہا تھا:

”تم (سرستید) ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت (۱۸۵۷ء) میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا..... سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع بجنور کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہاپست کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔“

سے بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں  
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دوں

لے عالی پانی پتی، حیات جاوید، ص ۱۳۳

## ۱۵۔ علامہ شبلی نعمانی

شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) سولہ سال علی گڑھ کالج میں رہے۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں موصوف کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ان کے متعلق شیخ محمد اکرام کی یہ تصریح موصوف کو سمجھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوگی:

”شبلی قریباً سولہ سال علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں انھوں نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی اور یہیں سرسید کی بااثر شخصیت نے ان کی قلبِ ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کاپاپلٹ مذاق تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوتے سرسید کے دامنِ تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا، وہ آج بھی ان کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے“۔

برٹش گورنمنٹ کے بارے میں شبلی نعمانی کے نظریات کیا تھے، موصوف کے لفظوں میں یہی ملاحظہ فرمائیے:

”میں (شبلی) مدتِ العمر کبھی انگریز گورنمنٹ کا پتلا نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے (یعنی ہندوستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدتِ دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں، میں نے ”الندوہ“ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً

لے محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، مطبوعہ لاہور، بارہمہتم ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۱، ۲۲۲

فرمن ہے: ” لے

شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے پہلے ایک طویل عرضداشت، عبدالماجد دریابادی سے لکھوا کر حکومت صوبجات متحدہ آگرہ واودھ (یو۔ پی) کے چیف سیکرٹری کی خدمت میں پیش کی تھی، مذکورہ بالا عبارت اسی عرضداشت کا ایک اقتباس ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی نامہ کے علاوہ اپنی مشہور و معروف تصنیف ”موجِ کوثر“ میں بھی یہ اقتباس نقل کیا ہے، لیکن موجِ کوثر میں اس عبارت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

”اور اسی سال (۱۹۰۸ء) ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا (برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہنے کا) ایک ریزولیشن بھی پاس کروایا، پھر معاملہ مولوی عبدالکریم میں، محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ (برٹش گورنمنٹ کے خلاف) مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گایاں سُنا پڑیں۔“

## ۱۶۔ الطاف حسین حالی

موصوف، ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازمت مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک نواب مصطفیٰ خان شینہ کے بچوں کو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر کے ریٹرنس یعنی پیار سے لال اشرف کی سفارش پر گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو، لاہور میں مترجم کتابوں کی اردو عبارت درست کرنے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ایگلہ عریب سکول دہلی میں بھی ملازمت کی۔ ۱۸۸۸ء سے سرسید احمد خاں کی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار وظیفہ ملا شروع ہو گیا، جو بعد میں سو روپے ماہوار کر دیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں

۱۔ محمد اکرام شیخ: شبلی نامہ، ص ۲۲۵

۲۔ محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۲۲

گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب بخش دیا۔ ۱۹۱۴ء میں موصوف کا انتقال ہوا۔  
 موصوف بھی نیچریت کے حامی اور سرسید احمد خاں کی برطانوی گاڑی کو ہانکنے میں مددگار تھے۔  
 اپنی شاعری کے ذریعے نیچری مذہب کو پھیلانے، مسلمانان ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کا دفا دار اور  
 بندہ بے دام و ثنا خواں بنانے میں پورا زور لگاتے رہے۔ انگریز قوم اور مغربی تعلیم و تہذیب کی صفت  
 و ثناء بیان کرتے ہوئے موصوف کی عمر دراز بھی انتہائی مختصر ثابت ہوئی ورنہ شاید معاملہ کہاں سے  
 کہاں جا پہنچتا۔ سرسید احمد خاں کے حکم سے آپ نے ایک معرکے کی نظم لکھی جو ”مسدس حالی“ کے  
 نام سے مشہور اور ان کے مرشد جسے مرایہ افتخار شمار کیا کرتے تھے۔  
 خواجہ الطاف حسین حالی نے اس مسدس میں انگریزوں کو نوع انسان سے زالی مخلوق، دیوتا،  
 معجز نما ہستیاں، مالک خزان، غیب دان اور بہت کچھ مانا اور دوسروں کو ایسا ہی ماننے کی  
 یوں ترغیب دی ہے،

جنہوں نے بنایا اسے اپنا یاد رہے کہ اک راہ میں اس کو ٹھہرایا رہبر  
 یہ قول آجکل صادق آتا ہے ان پر کہ اک نوع ہے نوع انساں بہتر

انگ سب سے کام ان کے اور طور ہیں کچھ  
 اگر سب ہیں انساں، تو وہ اور ہیں کچھ

بہت ان کو معجز نما جانتے ہیں بہت دیوتا ان کو گردانتے ہیں  
 یہ جو ٹھیک ٹھیک ان کو پہچانتے ہیں وہ اتنا مقدر نہیں مانتے ہیں

کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کماٹی  
 وہ سب جزو و شکل ان کے حصہ میں آئی

کیا علم نے ان کو برفن میں یکتا نہ ہسر رہا کوئی ان کا نہ ہمتا  
 ہر اک چیز ان کی، ہر اک کام ان کا سمجھ بوجھ سے ہے زمانہ کی بالا

صنائع کو سب ان کی تکتے ہیں ایسے  
 عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

دستے علم نے کھول ان پر خزانے چھپے اور ظاہر، نئے اور پرانے

دکھائے اُنھیں غیب کے کُل خزانے بتاتے فتوحات کے سب ٹھکانے

ہوا جیسے چھائی ہے سب بحر و بر پر

وہ یوں چھا گئے خیبر و باخترا پر

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی، اُن کے دین میں تخریب کاری کی، اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، دولت و عزت سب کچھ اُن سے چھین لیا اور ہزار کروڑ اور جبر و استبداد سے اُنھیں اپنا غلام بنا لیا۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح ان غیر ملکی ڈاکوؤں کی غلامی کا جو اتار کر پھینک دیں، آزادی کی فضا میں سانس لیں اور جلد از جلد غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کر لیں۔ لیکن انگریزوں کے زر خرید حضرات مسلمانوں کو یہی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ یہ غلامی تو ہماری اپنی غلامی ہے، ہم غلام کہاں ہیں؟ ہمیں تو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے، ہمیں ہر طرح کا آرام نصیب ہے اور ہمیں ترقی کرنے کے حکومت نے پورے پورے مواقع فراہم کیے ہوتے ہیں، لہذا خاموشی اور شکرگزاری کے ساتھ اُن مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گورنمنٹ کی بدخواہی کا دل میں خیال بھی نہیں لانا چاہیے۔ حالی نے بھی یوں تلقین کی ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا سے پر جاتک سب تکھی ہیں

تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا

نہیں بند رستہ کسی تکارواں کا

نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی نہ دشمن حدیث اور قرآن کا کوئی

نہ ناقص ہے ملت کے ارکان کا کوئی نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی

نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں

اذا میں دھڑا کے سے دو مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں      نہیں بند صنعت کی، حرفت کی راہیں  
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں      تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں

نہ گھر میں غنیم اور نہ دشمن کا کھٹکا

نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں      گھروں سے سوا چھپی ہے منزلوں میں

ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں      شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں

سفر جو کبھی تھا نمونہ سستہ کا

وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا

پہنچتی ہیں ملکوں میں دم دم کی خبریں      چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں

عیاں ہیں ہر اک بڑا عظم کی خبریں      کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں

نہیں واقعہ کوئی پہناں کہیں کا

ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

کہ و قدر اس امن و آزادگی کی      کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی

ہر اک راہِ رو کا زمانہ ہے ساتھی      یہ ہر سو سے آوازِ پیہم ہے آتی

کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہن کا ڈر ہے

نکل جاؤ رستہ ابھی بے خبر ہے

مسلمانوں کو از روئے احادیث کفار کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اسلامی غیرت کا تقاضا یہی

ہے کہ وہ اپنے روش پر پتکے ہیں اور خدا کے دشمنوں کے کسی طرح بھی مشابہ ہونے کی کوشش نہ

کریں۔ انگریز دوستی میں اس فحاشیت کا شاعر نچر پیت اور قوم کی غمخواری کا دم بھرنے والے نے

یوں مذاق اڑایا ہے:

ہیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے      کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے

لہ الطاف حسین حالی، مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۶۶، ۶۷



مخالف کی ریس اُس میں کرنی بُری ہے      نشاں غیرتِ دینِ حق کا یہی ہے

نہ ٹھیک اُن کی ہرگز کوئی بات سمجھو

وہ دن کو کسے دن تو تم رات سمجھو

قدم گرہِ راست پر اُن کا پاؤ      تو تم سیدھے رستہ سے کترا کے جاؤ

پڑیں اُس میں جو وقتیں وہ اٹھاؤ      لگیں ٹھو کریں جس قدر اُس میں کھاؤ

جو نکلے جہاز اُن کا بچ کر جنور سے

تو تم ڈال دو ناؤ اندر جنور کے

اگر مسخ ہو جائے صورت تمہاری      بہائم میں بدل جائے ریت تمہاری

بدل جائے بالکل طبیعت تمہاری      سراسر بگاڑ جائے حالت تمہاری

تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی

ہے اک جلوہ نورِ ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو      نہ اخلاق میں تم سے بسلطت کسی کو

نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو      نہ پیدا یہ پوشش نہ زینت کسی کو

تعمیرِ فضل ہر علم میں بر ملا ہے

تمہاری جہالت میں بھی اک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بُری تم      رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم

حمایت میں ہو جبکہ اسلام کی تم      تو ہو ہر بدی اور گنہ سے بُری تم

بدی سے نہیں مومنوں کو مضرت

تمہارے گناہ اور اوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجے      تو ذکر اُس کا ذلت سے خواری کیجے

کبھی بھول کر طرح اُس کو نہ دیکھے      قیامت کو دیکھو گے اس کے نتیجے

گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرا

مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا

سائنس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن حقیقی علم اسی کو ٹھہرانا اور اسے سرمایہ فخر انسان بنانا، ان حضرات کا کام تو ہو سکتا ہے جنہیں آخرت پر یقین ہی نہ ہو یا جو آخرت کی حقیقی زندگی پر اس چند روزہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دینا ہی بہتر سمجھتے ہوں۔ سائنس کے بارے میں موصوف کے نظریات ملاحظہ ہوں:

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب بیاں کہ ہے علم سرمایہ فخر انسان  
عرب اور عجم، ہند اور مصر و یونان رہا اتفاق اس پر قوموں کا یکساں

یہ دعویٰ تھا اک جس پر حجت نہ تھی کچھ  
کھلی اس پر اب تک شہادت نہ تھی کچھ

جو اہر تھے اک سب کی نظروں میں بھاری پر کھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری  
فضائل تھے سب علم کے اعتباری نہ تھیں طاقتیں اس کی معلوم ساری

یہ اب بھر و بردے رہے ہیں گواہی  
کہ تھا علم میں زور دستِ الہی

کیا کہ ہزاروں کو مہیا اس نے بنایا سمندر کو بازار اس نے  
زمینوں کو منوایا دوار اس نے ثوابت کو ٹھہرایا ستیاری اس نے

لیا جاپ سے کام لشکر کشی کا  
دیا پتلوں کو سکت آدمی کا

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا  
صدائوں کو سانچے میں ڈھلوانے والا زمین کے خزانے اگلوانے والا

یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا

یہی آدمی کو ہے بے پر اڑاتا

تمدن کے ایوان کا معمار ہے یہ ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ  
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ کہیں جنگجوؤں کا ہتھیار ہے یہ

دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اس نے  
بنایا ہے روباہ شیروں کو اس نے

اسی کی ہے اب چار سو حکمرانی عی کے اس نے زیر ارمتی اور یمانی  
ہوتے رام دیوان ماژند رانی گئے زاہلی مجول سب پہلوانی

ہوا اس کی طاقت سے تسخیر عالم

پڑے سامنے اس کے چرخس نہ ویلم لے

حالی صاحب انگریزوں پر ایسے ایمان لائے تھے کہ ان کی ہر چیز سے پیار اور والہانہ نگاہ  
ہو گیا تھا موصوف کے نزدیک مغربی علوم و فنون ہی حق کا جلوہ ہیں، گویا دوسرے باطل کا اندھیرا  
ہوتے، چنانچہ فرماتے ہیں:

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے

تصعب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پڑے کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے

جی جی دنوں میں ارسطو کی رائیں

جواب وحی اترنے تو ایساں نہ لائیں لے

## ۱۷۔ مولوی رشید احمد گنگوہی

آپ ۱۲۲۴ھ/۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرستوں اور حاجی

امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں سے تھے۔ وہابیوں کی جماعت میں سے جب شاہ

محمد اسحاق دہلوی خلیفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے گول مول اور مخصوص خیالات

سے اتفاق رکھنے والوں کی جماعت بنی اور دیوبندی مکتب فکر کے نام سے روشناس ہوئی،

تو اس قافلے کے مولوی رشید احمد گنگوہی ہی قافلہ سالار قرار پائے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر

مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر نامور خلفائے گنگوہی صاحب اور ان کے ہم خیال علمائے دیوبند کا

تعاقب کیا کہ یہ حضرات اپنے اکابر اور پیرومرشد کے طریقے کے خلاف جا رہے تھے۔

لے الطاف حسین حالی، مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۸۸، ۸۹

۷۷ ایضاً، ص ۵۷

جب اس قضیہ کی خبر حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمتہ اللہ علیہ کو ملی تو اپنے متعلقین کو سمجھانے کی غرض سے، جن مسائل میں ان حضرات کا نزاع تھا، ان کے بارے میں اپنے نظریات و معمولات لکھ کر "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے نام سے موصوف کے پاس اُس کی کاپیاں بھیج دیں۔ گنگوہی صاحب نے اپنے پیر کے فیصلے کی یہ قدر کی کہ اپنے ایک شاگرد (خواجہ حسن نظامی دہلوی) کو ان تمام کاپیوں کو جلانے کا حکم صادر فرمایا۔

فقہ حنفی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود موصوف نے اپنے حکم سے اس میں ایسی تراش خراش فرمائی اور خواجہ زمانہ کے نظریات داخل کیے کہ ابنائے زمانہ کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تقدیس باری تعالیٰ شانہ کو داغدار ٹھہرانے کی غرض سے امکان کذب کے ناپاک عقیدے کو وقوع کذب تک بڑھا دیا۔ شیطان لعین کو فخر و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی اعلم و اوسع علماً ٹھہرا دیا اور علمبردارِ خارجیت، امام الوہاب بیہ مولوی اسماعیل دہلوی کے تمام غیر اسلامی عقائد و نظریات کی کھل کر تصدیق و تائید کرتے رہے۔ ان کا وصال ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں ہوا۔

موصوف نے اپنے اکابر سے رشتہ توڑا، اپنے پیرو مشد سے تعلق چھوڑا، آخر ایسا کیوں کیا؟ کہیں یہ حکومت کی شہ پر توڑا مار نہ کھیلا گیا ہو، جس کی تخریب کاری کی مشین اندرون خانہ بڑی عیاری اور رازداری سے چل رہی تھی، کہیں مولوی ہایت احمد گنگوہی کے فرزند اور حاجی امداد اللہ تھانوی علیہ الرحمہ کے مرید، مولوی رشید احمد گنگوہی ساحرین برطانیہ کے جادو کا شکار تو نہیں ہو گئے تھے۔ آئیے واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہو چکی ہے۔ موصوف کے ہم خیال علماء نے اپنا ایک جتنا منظم کر لیا ہے۔ ہتھیار لگا کر باہر پھرتے ہیں۔ کسی سے لڑنے کے لیے پھرتے تھے؛ ہمیں کیا معلوم جبکہ قریباً سو سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آئیے موصوف کے سوانح نگار، ان کے عاشق زار، مولوی عاشق الہی میرٹھی سے پوچھتے ہیں:

\* ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولوی محمد قاسم نانوتوی) اور طبیب روحانی

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے اور بند و قچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جتنا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لیے اہل پہاڑ کی طرح پراجا کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جانثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ سے شجاعت و جواہروی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جاتے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بند و قچیوں کے سامنے ایسے جھے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ (گنگوہی صاحب) پرفیری ہوئی اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ذی ریافت گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔

اب معلوم ہو گیا۔ مولوی عاشق الہی میرٹھی نے راز بتا دیا کہ گنگوہی صاحب نے اپنے اکابر اور اپنے پیر سے قلبی رشتہ کیوں توڑ لیا تھا؟ اس لیے کہ برٹش گورنمنٹ سے جانثاری و وفاداری کا عہد و پیمان جوڑا گیا تھا۔ یہ بات بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے، جس پر کسی عاشقہ آرائی کی ضرورت نہیں، ادھوری عبارت یا سیاق و سباق سے توڑنے مروڑنے کی تہمت نہیں، خود گنگوہی صاحب کے مسلخ نگار اور نامور دیوبندی عالم کی شہادت ہے، مخالفانہ بیان بھی اسے نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ یہ بیان دینے والا عالم اہلسنت نہیں۔ یہ ناچیز اس امر کے فیصلے کا حق قارئین کے سپرد کرتا ہے کہ مذکورہ حوالے کی روشنی میں مولوی رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے مخالف ثابت ہوتے ہیں یا برٹش گورنمنٹ کے دل و جان سے وفادار بلکہ جانثار نظر آ رہے ہیں؟

پروفیسر محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند اور دو مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۵۶۰ پر بلکہ متعدد کتب و رسائل میں اور ان کی دیکھا دیکھی موجودہ علمائے دیوبند نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ نے، ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی، لہذا اکابر علمائے دیوبند مہارین جنگل زادی

لے عاشق الہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۴۷

اور انگریزوں کے مخالف ہیں۔ یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تو علمائے دیوبند ماسوائے گاندھوی علمائے کے باقی سب انگریزوں کے نہ صرف خیر خواہ و وفادار بن کر رہے بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آڈکار بن کر ملت اسلامیہ سے کٹ کر ایک نئے فرقے کا اضافہ اور کر بیٹھے نیز اسلامی عقائد میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوند کاری کرتے رہے۔ اگر یہ حضرات انگریزوں کے آڈکار نہ بن گئے ہوتے تو یہ سوادِ اعظم اہلسنت و جماعت سے کٹ کر اپنا فرقہ الگ کیوں بناتے نیز اہلسنت و جماعت کے متواتر مذہب کا اپریشن کیوں کرتے؛ لیکن اُدھر انگریز بستر گول کر کے راہی برطانیہ ہوئے اُدھر نوے سال بعد ان حضرات نے اپنے اکابر کی تاریخ کو بدلتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے رشید احمد گنگوہی اور محمد قاسم نانوتوی وغیرہ بزرگ تو انگریزوں کے مخالف اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے تاریخ کا اس طرح مذاق اڑا کر اُسے بلذیقہ اطفال بناتے اور حقیقت کا منہ چڑھاتے وقت اگر دیوبندی علماء و مورخین کو خوفِ خدا یاد نہیں رہتا تو ایسا کرتے وقت کیا ان حضرات کو بندگانِ خدا سے بھی کوئی شرم و عار محسوس نہیں ہوتی؛ کیا ان حضرات کی غلط بیانی سے حقیقت بدل جائے گی؛ کیا اس قسم کی حرکتیں ہی ان حضرات کا طرہٴ امتیاز ہیں؛

تذکرۃ الرشید کے مولد بالا حوالے کو موجودہ دیوبندی عالم، مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے

یوں بیان کیا ہے:

جب پلٹن (انگریزی فوج) مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے ایک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے ان حضرات کی... ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سنا علی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا ضلع سہارن پور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جاتے، چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا

شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔

گویا واقعہ سب کے نزدیک وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک  
 نوے سال تک یہ لڑائی حکومت کے مخالفین یعنی حریت پسندوں کے ساتھ بتائی جاتی رہی اور  
 انگریز چلے گئے تو یہی لڑائی انگریزوں کے خلاف بتانی شروع کر دی۔ اگر ہم موجودہ حضرات کے  
 موقف کو درست تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یہ فیصلہ غلط ہی رہے گا، کیونکہ بعد کے واقعات اس  
 موقف کی تائید کرنے سے یکسر محبور ہیں۔ جب لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہوئی، انگریز دوبارہ قابض دستا  
 ہو گئے تو دارو گیر کا دور شروع ہو گیا۔

اس دور میں، خصوصاً مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی گئی، اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔  
 اسی کتاب کے پہلے باب میں اس قیامت خیز منظر کی جھلک قارئین کرام دیکھ چکے ہیں۔ ذرا سا  
 شبہ سبولی پر لٹکانے کے لیے کافی تھا، کسی انگریز کی اگر مدد نہ کرنے کا الزام عائد ہوا تب بھی دار  
 پر کھینچ دینے سے کم سزا نہ تھی، کسی انگریز کی تعظیم نہ بجالائے یا کھڑے ہو کر عاجزانہ سلام نہ کیا  
 تو گولی کا نشانہ بناتے گئے۔ جن بستیوں کے چند افراد نے بھی انگریزوں سے لڑائی کی، اس  
 انتقامی دور میں ان بستیوں کو برے سے صاف ہی کر دیا گیا۔ اگر واقعی یہ علمائے دیوبند انگریزوں کے  
 لڑے تھے تو سبلی یا سزاتے موت سے کم کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات تو  
 یہی بتاتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کسی ایک کے سپر ہیں کا ناتا تک بھی نہیں چھو گیا۔ اگر انگریزوں  
 سے لڑے تھے تو انھیں کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ آئیے موصوف کے سوانح نگار مولوی عاشق الہی  
 میرٹھی سے مزید معلومات حاصل کرتے ہیں:

”شروع ۱۲۶۹ھ نبوی/۱۸۷۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولوی  
 رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا  
 الزام لگایا گیا۔“

۱۔ عزیز الرحمن بجنوری: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰

۲۔ عاشق الہی میرٹھی، مولوی: تذکرہ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۳۲

اسی بات کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سے موصوف نے یوں بیان کیا ہے :

جب بغاوت و فساد کا قلعہ فرو ہوا اور رم و ل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بڑوں مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبر ہی کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) پر بغاوت کا الزام لگایا۔ لے

مولوی رشید احمد گنگوہی کے رفیق جانی اور مدرسہ دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں مندرجہ ذیل پُر لطف حکایت کا پیش کرنا، شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یہ ہر عقلمند کو دعوتِ غور و فکر دے رہی ہے :

جب مجاہد علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو آپ (مولوی محمد قاسم نانوتوی) کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہوتے۔ خدام اور متوسلین کے بہت زیادہ اصرار پر آپ ایک مکان میں روپوش ہوتے اور تین دن کے بعد پھر کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے۔ لوگوں نے پھر روپوشی کے لیے بھنت عرض کیا تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں۔ لے

اتباعِ سنت کی حقیقت تو خالقِ کونہ سے لے کر انکارِ خاتمیت زمانی تک معلوم ہے۔ اُمتِ محمدیہ کے مسلمہ عقیدہ ختمِ نبوت کا انکار کر کے ایک ایسی خاتمیت گھڑنے والے بھی تو یہی نانوتوی صاحب ہیں، جس کا نام سننے سے بھی تیو سو سال کے مسلمانوں کے کان نا آشنا رہے۔ کیا یہ کارنامہ بھی اتباعِ سنت میں دکھایا تھا؟ بہر حال اس سے قطع نظر، مولوی محمد قاسم

لے عاشق الہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۶

لے مناظر احسن گیلانی، مولوی، سوانح قاسمی، جلد دوم، ص ۱۷۳



نانا تو می کی جو انردی ودلیری ہے کہ تین دن روپوش رہنے کے بعد وندنا تے پھرنے لگے اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز یہ ادا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی پر اپنی رحمدل سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ دیوبندی علماء و مورخین تو ان حضرات کو مجاہد بنا کر، الزام کا رونا رو کر، پھر قید و بند سے چھڑا کر مطمئن ہو گئے ہوں گے اور ان بانی مجاہدوں کے معرکوں پر ڈینگیں مارنے لگے ہوں گے لیکن ہم ان حضرات سے اتنا ضرور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جناب اللہ! آپ کے ان مجاہدوں نے، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شاملی کی لڑائی لڑی، انگریزی پلٹن سے توپ خانہ بھی پھین لیا پھیلے یونہی سہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرات پر بدخواہوں نے، ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تہمت لگا کر گرفتار کر دیا، بھلا اب مجاہد ہونے اور انگریز دشمن کہلانے میں، کون ہے جو ان حضرات کے متعلق شک کر سکے گا؟ لیکن اتنا تو ازراہِ کرم بتا دیجیے کہ آپ کے یہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، حریت پسند، جنگ آزادی کے ہیرو، ۱۸۵۷ء سے آخر وقت تک انگریزوں کی نگاہوں میں کیا بن کر رہے تھے؟ دوست سمجھے گئے یا دشمن، مخالف گردانا گیا یا آلا کار، سا لہا سال تک انگریزوں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ اسے شاملی کے مقام پر ہم سے لڑنے والو! اسے ہمارا توپ خانہ تک پھین لینے والو! ہم سے لڑے کیوں تھے؟ ہمارا توپ خانہ کیوں چھینا تھا؟ کیا برٹش گورنمنٹ ان چند علمائے دیوبند سے اتنی خائف و ہراساں اور لرزاں و ترساں تھی کہ سزا دینا تو بہت بڑی بات ہے، ان سے اپنا توپ خانہ واپس لینے کی اپیلی یا عرض بھی ان کی خدمت میں نہ کر سکی؟ آخر کاوٹ کیا تھی؟

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو

کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

ہزار چک پھیر یوں سے اپنے اکابر کو مجاہد اور انگریز دشمن ثابت کرنے کی کوششیں کرتے ہیں

لیکن تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتے ہیں پھرو ہیں آپہنچتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ بیٹھے ہیں کہ ساری کاوشوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ مولوی عزیز الرحمن بجنوری کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے:

”حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی)

اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔۔۔۔۔

آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال رام پور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر سانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارن پور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا، "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے"۔ سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کیا گیا۔ بالاخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا رہا کر دیا، لے

باقی باتوں سے قطع نظر جب برٹش گورنمنٹ کو سچی بیاد کے باوجود اس امر کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی مل سکا کہ مولوی رشید احمد گنگوہی حکومت کے بدخواہ ہیں یا ۱۸۵۵ء میں انھوں نے انگریزوں کے مفادات کے خلاف کوئی ادنیٰ سی حرکت بھی کی تھی، تو موجودہ حضرات کو کون سے دلائل یا حقائق و شواہد کا کھوج مل گیا ہے جن کی بنا پر بلند بانگ دعاوی کر کے اپنی سابقہ تاریخ کو بدلنے کی جسارت کرتے اور اسی کو حقیقت منوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان حضرات کو اپنے بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے اور اپنے اکابر کو اپنی رحم دل گورنمنٹ کے بانگیوں اور مفسدوں کی فہرست میں تو شامل کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو برٹش گورنمنٹ کیا تھی؟

"جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کھپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا، لے اپنے اکابر مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کی موصوف نے یوں صفائی پیش کی ہے:

"جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تازلیت خیر خواہ ہی ثابت رہے۔" لے

۱۔ عزیز الرحمن بجنوری، مولوی، تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۷

۲۔ عاشق الہی میرٹھی، مولوی، تذکرہ الرشید، جلد اول، ص ۷۳

۳۔ ایضاً، ص ۹

مصروف برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ تھے یا مفسدوں اور باغیوں میں شریک رہے تھے، اس امر کا فیصلہ تو قارئین کرام خود کریں گے۔ راقم الحروف تو اس سے آگے صرف یہی کہتا ہے کہ جملہ قبعین کے بیانات سے قطع نظر کر کے، خود علیجناب، معلی القاب، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کا ایک ذاتی بیان نقل کر دیتا ہے کہ مصروف کا خود اپنے بارے میں اپنا فیصلہ کیا ہے؛

”میں جب (مولوی رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کافرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکانہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مانگ ہے، اُسے اختیار ہے، جو چاہے کرے“۔

ضرر مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

ہو سکتا ہے کسی صاحب کو یہ شبہ لاحق ہو جاتے کہ ”تذکرۃ الرشید“ کتاب تاریخی لحاظ سے ناقابل اعتبار ہو یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک اُس کے مندرجات مسلمہ نہ ہوں یا اُسے تاریخی لحاظ سے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، لہذا ہم اس کتاب پر ان حضرات کے مایہ ناز مورتوں کی مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں، عبد الرشید ارشد فرماتے ہیں،

”میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کئے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ ”تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں غلام رسول مہر نے سالک صاحب (عبد المجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے اصحاب کو یہ کتاب پڑھائی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی عنکبت دلوں میں پیدا ہوتی ہے“۔

۱۔ عاشق الہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۸۰

۲۔ عبد الرشید ارشد، بیٹے بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۲ (حاشیہ)

## ۱۸۔ مولوی اشرف علی تھانوی

موصوف کی پیدائش ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء کو تھانہ بھون میں ہوئی۔ مولوی محمود الحسن دیوبندی کے خاص الخاص تلامذہ میں سے ہیں۔ مدرسہ دیوبند کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ اپنی جماعت کی گاندھیت میں ہمنوائی کرنے سے الگ رہے۔ دیوبندی حضرات انھیں حکیم الامت اور مجددت کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنی مشہور تصنیف ”بہشتی زیور“ کے پہلے حصے میں ان امور کی ایک فہرست پیش کی ہے جو ان کے نزدیک کفر و شرک ہیں۔ اگر موصوف کی اس فہرست کو سامنے رکھا جائے تو کسی متعصب کو بھی مسلمان ثابت نہ کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ تھانوی صاحب نے اپنی بعض تصانیف میں چند عبارتیں ایسی بھی درج کی ہیں جن کی ایک مسلمان کہلانے والا ہرگز جرات اور جسارت نہیں کر سکتا۔ سرور کون و مکاں، فخر و دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایسے گندے الفاظ لکھنے کی تو اس سرکار کے بدترین دشمنوں اور کھلے کافروں کو بھی جرات نہ ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ان عبارتوں کا تفصیلی ذکر اپنے موقع و محل پر آئے گا (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

موصوف نے ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

یکم محرم ۱۳۶۵ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسی اختلاف کو دفع کرنے موصوف کو اپنا ہم خیال بنانے کی غرض سے سات گاندھوی علماء تشریف فرما ہوئے۔

- ۱۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی صدر جمعیتہ العلماءتے ہند
- ۲۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی سابق صدر جمعیتہ العلماءتے ہند
- ۳۔ مولوی احمد حسین سابق ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماءتے ہند
- ۴۔ مولوی حفیظ الرحمن سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماءتے ہند
- ۵۔ مولوی عبدالحکیم صدیقی
- ۶۔ مولوی عبدالحنان
- ۷۔ مفتی عتیق الرحمن

سواتین گھنٹے تک ان حضرات کی حالات حاضرہ پر گفت گورہی۔ اپنا اپنا موقع، واضح کیا۔ بعض خفیہ

گوشے بھی سامنے آئے، جو مولوی طاہر احمد قاسمی کے قلم سے مولوی شبیر احمد عثمانی کی تصدیق کے ساتھ پیش خدمت ہیں۔ عثمانی صاحب نے فرمایا:

دیکھیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اور آپ کے مسلم بزرگ و پیشوا تھے، اُن کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اُن کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ اُن کو اس کا شائبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اُس کو یہ علم نہ ہو کہ استعمال کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں ناخوذ نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ مولوی اشرف علی تھانوی کے متعلق یہ بیان دینے والے مشہور دیوبندی عالم ہیں اور دوسری طرف سننے والے ایسے ساتھ دیوبندی علماء ہیں، جنہیں اُس جماعت کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے لیکن وہ اس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی اپنی زبانوں پر نہ لاسکے۔

مولوی حسین احمد ٹانڈوی ایک دفعہ حکومت کے زیرِ عتاب آئے، جیل خانے میں رہے، بعض لوگوں نے اِس دلتے میں تھانوی صاحب کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی اور سلسل کان بھرتے رہے تھے۔ ترقوں بعد موصوف نے اپنے ایک خط میں لکھا:

”مولانا مرحوم (مولوی اشرف علی تھانوی) کے بھائی محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی میں بڑے مدیدار اخیر تک رہے۔ اُن کا نام منظر علی ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ کیا ہو مستعجب نہیں بنائے۔“

یہ بیانات اگرچہ اپنی جگہ پر بالکل واضح ہیں لیکن ہم بیان مولوی اشرف علی تھانوی کا ذاتی بیان، خود اُن کے اپنوں کی مرتبہ کتاب سے پیش کر کے اس سلسلے میں اقدام حجت کرنا چاہتے ہیں،

۱۔ طاہر احمد قاسمی، مولوی، مکالمۃ الصدیقین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

۲۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، مکتوبات شیخ، جلد دوم، ص ۲۹،

بیان ملاحظہ ہو:

”ایک شخص نے مجھ (مولوی اشرف علی تھانوی) سے دریافت کیا تھا کہ اگر تمہاری حکومت ہو جائے تو انگریزوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرو گے؟ میں نے کہا محکوم بنا کر رکھیں گے کیونکہ جب خدا نے حکومت دی تو محکوم بنا کر ہی رکھیں گے، مگر ساتھ ہی اس کے نہایت راحت و آرام سے رکھا جائے گا، اس لیے کہ انہوں نے ہمیں آرام پہنچایا ہے“ لے

طر مدنی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

## ۱۹۔ مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی

مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی مجددی مولوی فضل الرحمن دیوبندی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ خود موصوف نے مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی اور کچھ عرصہ اس کے صدر بھی رہے۔ جمعیتہ العلماء ہند کے آپ بھی ایک رکن تھے لیکن کسی وجہ سے آپ اپنے اکابر اور رفقاء کے کار کی گاندھی روش کو برداشت نہ کر سکے، اس لیے جمعیتہ العلماء اسلام کے نام سے اپنی علیحدہ جماعت بنالی، جو دیوبندی طبقے میں بھی نسبتاً اقلیت میں ہی رہی۔ اکثریت میں وہی حضرات تھے جنہوں نے گاندھی کو اپنا بے تاج بادشاہ اور امام و پیشوا بنایا ہوا تھا۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں آپ نے وفات پائی۔

چونکہ آپ مطالبہ پاکستان کے حامی اور مسلم لیگ کے ہنوا تھے، اس لیے جملہ علماء دیوبند ماسوائے چند کے، آپ سے ناخوش تھے۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے گزشتہ بیان میں علماء دیوبند کے جس مذاکرے کا ابھی ذکر کیا تھا، اس میں جمعیتہ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ، مولوی حفص الرحمن سیوادی نے اپنے وفد کی طرف سے علامہ عثمانی کی جمعیتہ العلماء

لے اشرف علی تھانوی، مولوی: الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۶۹،

اسلام کے قیام اور اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیتہ العلماء نے اسلام حکومت کی مالی امداد اور اُس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبجانی جمعیتہ العلماء نے اسلام کے سلسلہ میں دہلی آتے اور حکیم ولبر حسن صاحب کے یہاں قیام کیا، جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبجانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار سے ملے، جن کا نام بھی قدر سے شہر کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیتہ العلماء نے ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے ایک علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد ملے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی۔ چنانچہ ایک پیش قرار رقم اس کے لیے منظور کر لی گئی اور اُس کی ایک قسط مولانا آزاد سبجانی صاحب کے حوالہ بھی کر دی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمن صاحب نے کہا کہ یہ اس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں! لے

مولوی حفظ الرحمن سیوہاروی کی اس تقریر کے جواب میں مولوی شبیر احمد عثمانی کا بیان

بھی قابل غور و فکر ہے،

پہلے میں (شبیر احمد عثمانی) اُس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع کرتا ہوں، جو آپ نے مولانا آزاد سبجانی کے متعلق بیان فرمایا ہے۔ جو روایت آپ نے بیان کی، میں نہ اُس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں مجھے اس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گننام خط کے (جو دہلی سے ڈالا گیا تھا) بھی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اُس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط،

بہر حال میرے علم میں آپ کی ہے۔ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری راستے کیا متاثر ہو سکتی ہے؟

میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ جمعیتہ العلماء نے اسلام میں آزاد سبجانی رہیں یا نہ رہیں، جمعیتہ العلماء نے اسلام خود قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے۔

اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اس روایت کو تسلیم بھی کر لوں کہ جمعیتہ العلماء اسلام گورنمنٹ کے ایما سے قائم ہوئی ہے، تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ کانگریس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی، آپ کو معلوم ہے کہ ابتداً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارے پر ہوا تھا؟

حقیقت کا حال تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ان کے جواب کی روشنی میں اگر موصوف کو انگریز دوستی سے برأت کا سرٹیفکیٹ نہ بھی مل سکے، لیکن برٹش گورنمنٹ کا آرڈر کار ثابت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ رہا صوفی آزاد سبجانی، رکن جمعیتہ العلماء نے اسلام کا معاملہ تو فریقین (جماعت و علمائے دیوبند) کے بیانات کی روشنی میں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کی انگریز دوستی بکرا ایجنٹی و آلہ کاری تنگ و مشد سے بالاتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## ۲۰۔ مولوی محمد الیاس کاندھلوی

موصوف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء) کی خدمت میں تحصیل علم و فیض کے لیے حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان کی وفات تک اپنے پیر گنگوہی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، اس وقت آپ عمر کی سنبل منزلیں طے کر چکے تھے۔ دیوبندی حضرات کی تبلیغی جماعتیں

لے طاہر احمد قاسمی، مولوی، مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴، ۱۵



جو آجکل بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اس تحریک کے بانی یہی مولوی محمد ایاز صاحب ہیں۔ یہ تبلیغی نظام کب اور کیوں قائم ہوا، اس کا تاریخی تذکرہ باب دوم میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے۔ علمائے دیوبند کی جس میٹنگ کا گزشتہ سطور میں تین دفعہ ذکر آچکا ہے، اسی میں مولوی حفیظ الرحمن سیوہا روی نے یہ بھی کہا تھا:

”اسی ضمن میں مولانا حفیظ الرحمن صاحب نے کہا کہ مولانا ایاز صاحب رحمہ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی طرف سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔“

حکومت نے امداد دینے کا وعدہ کر کے شروع کر کے مقابلے پر تبلیغ شروع کروا تو وہی لیکن جیسا کہ مذکور ہوا، کچھ عرصہ گزرنے پر وظیفہ دینا بند کر دیا۔ کاندھلوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) اس وقت شاید یہ شعر پڑھا کرتے ہوں گے:

صبراً اس پر اس ہماری حسرتِ دیوار کا  
بند جس نے کر دیا روزِ تری دیوار کا

## ۲۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی

دورِ حاضر کا مسیلمہ، امت کے تینوں دجالوں میں سے ایک دجال، مرزا غلام احمد قادیانی بھی ہے۔ موصوف نے مجدد اور مصلح کے دعاوی سے سلسلہ شروع کیا۔ دعویٰ نبوت کرنا تو عام مشہور ہے لیکن اس خوفِ خدا اور جہادِ روزِ جزا کو فراموش کر دینے والے اس شخص نے اپنے متعلق خدا ہونے تک کے متعدد دعاوی کیے ہوئے ہیں۔ موت سے پیشتر اپنے کئی مخالفوں کو چیلنج کیا تھا کہ فریقین سے جو جھوٹا اور کذاب ہے اُسے خدائے بزرگ و برتر دوسرے کی زندگی میں ہیخندہ یا طاعون وغیرہ متعدی مرض کے ساتھ ذلیل کر کے مارے۔ مخالفین تو سارے ہی زندہ رہے لیکن ان کی زندگی میں مرزا صاحب ہی بعارضہ ہیضہ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء بروز منگل ساڑھے دس بجے

لے طاہر احمد قاسمی، مولوی؛ مکالمات الصدورین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۳

دن کے راہی حکمِ عدم ہو گئے اور اپنے جھوٹا ہونے کا سب کے سامنے بین ثبوت پیش کر گئے۔  
 برٹش گورنمنٹ کے آلہ کاروں میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ترجمتقابل سرزمین پاک و ہند میں  
 تو کوئی نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد کو یہ صفت ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ اپنے والد کے بارے میں  
 خودیوں تصریح کی ہے:

تیرے والد مرحوم کی سوانح میں سے وہ خدمات کسی طرح الگ ہو نہیں سکتیں جو  
 وہ خلوصِ دل سے اس گورنمنٹ کی خیر خواہی میں بجالاتے۔ اُنہوں نے اپنی حیثیت  
 اور قدرت کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ کی خدمت گزاری میں اُس کی مختلف حالتوں  
 اور ضرورتوں کے وقت وہ صدق اور وفاداری دکھلائی کہ جب تک انسان سچے  
 دل اور تہِ دل سے کسی کا خیر خواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا۔ اے  
 اپنے والد کے بارے میں دوسری کتاب کے اندریوں لکھا ہے:

”والد صاحب مرحوم اس ملک کے میٹرز میں داروں میں شمار کیے جاتے تھے۔  
 گورنمنٹی دربار میں اُن کو گورنمنٹی ملٹی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے سچے شکر گزار اور  
 خیر خواہ تھے۔“

اُن کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فخریہ انداز میں ایک جگہ یوں بھی رقمطراز ہیں:  
 ”سی ستاون (یعنی ۱۸۵۷ء) کے فصدہ میں جبکہ بے تمیز لوگوں نے اپنی محسن  
 گورنمنٹ کا مقابلہ کر کے ملک میں شور ڈال دیا، تب میرے والد بزرگوار نے  
 پچاس گھوڑے اپنی گره سے خرید کر کے اور پچاس سوار پہنچا کر گورنمنٹ کی خدمت  
 میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ سوار سے خدمت گزاری کی اور اتنی مخلصانہ  
 خدمات کی وجہ سے وہ اس گورنمنٹ میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ چنانچہ جناب گورنمنٹ  
 کے دربار میں عزت کے ساتھ اُن کو گورنمنٹی ملٹی تھی اور ہر ایک درجہ کے حکام انگریزی

۱۔ غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۲۴

۲۔ غلام احمد قادیانی، مرزا: ازالہ اوہام، ص ۵۰

بڑی عزت اور دلجوئی سے پیش آتے تھے۔<sup>۱</sup>

اپنے بڑے بھائی، مرزا غلام قادر کی انگریز دوستی کے بارے میں موصوف نے یوں تصریح کی ہے:

”اس عاجز کا بڑا بھائی، مرزا غلام قادر، جس قدر مدت تک زندہ رہا، اُس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم مارا اور گورنمنٹ کی مخلصانہ خدمت میں بدل جان مصروف رہا۔“<sup>۲</sup>

خود مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) جہاد کے سخت مخالف اور برٹش گورنمنٹ کے غبر ایک آلہ کار تھے۔ اس امر کا اعتراف موصوف نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

”میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور اُن کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال، جہاد وغیرہ کے دُور کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔“<sup>۳</sup>

دوسری جگہ انگریزوں کی حمایت میں جہاد کی مخالفت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

”میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کے پتے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی (امام مہدی علیہ السلام) اور مسیح خونی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی بے اصل روایتیں (جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں) اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل (جو حکم خدا اور عمل و ارشادِ مصطفیٰ ہے) جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، اُن کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔“<sup>۴</sup>

<sup>۱</sup> غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۸۴

<sup>۲</sup> ایضاً، ص ۸۴

<sup>۳</sup> غلام احمد قادیانی مرزا، تبلیغ رسالت، جلد ۱، ص ۱۰

<sup>۴</sup> غلام احمد قادیانی، مرزا، تریاق القلوب، ص ۲۵

موصوف نے انگریزی حکومت کے استحکام کی خاطر اس کی حمایت میں جہاد کے خلاف بے شمار کتابیں لکھیں اور اشتہار شائع کرائے اور اپنے اس اسلام دشمنی کے کارنامے پر آپ یوں فخر کیا کرتے ہیں:

”میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔“

شاید پنجاب کے مشہور شاعر ظفر علی خاں نے یہ شعر اسی لیے کہا تھا:

طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلُو

اور گواہِ اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

انگریزی حکومت کی اطاعت و فرماں برداری کی ترغیب دینے اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو برٹش گورنمنٹ کے مفاد کی خاطر ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مرزا غلام احمد قادیانی نے تحریری طور پر جو کچھ کیا، اس کی تفصیل یوں بیان کی:

”مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں، مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا

۱۔ غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵

اشاعت کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دئے جو نا فہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا۔ لہ

جس طرح اپنے دور میں جعفر بنگال اور صادق دکن ممتاز تھے اور اپنے سیاہ کار ناموں کو سراہنے افتخار سمجھا کرتے تھے اس طرح اپنے پیش رو حضرات سے مرزا صاحب ملت فروشی یا دین فروشی میں کم تھوڑے ہی رہ گئے تھے جو یہ فخر نہ کرتے بلکہ معلوم قویوں ہوتا ہے کہ موصوف اپنے میدان کے سارے کھلاڑیوں کو مات دے کر، سب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ اسی اسلام دشمنی اور ملت فروشی کے باعث انھیں خود احساس تھا کہ کسی بھی اسلامی ملک میں، کوئی مسلمان حکمران، ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکے گا اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت اور اس کی سرپرستی میں جو یہ عظیم فتنہ پرورش پارہا ہے، اسلامی حکومت اسے جوڑے اٹھاڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس حقیقت کا سرسید احمد خاں علی گڑھی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کی طرح خود مرزا صاحب نے علی الاعلان اور بغیر کسی ہیر پھیر کے یوں اعتراف کیا ہے:

”خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اس سلطنت کے ذریعہ یہ ہیں حاصل ہے، نہ یہ امن مگر معتد میں مل سکتا ہے اور نہ مدینہ میں اور نہ سلطان روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں“ لہ

دوسری جگہ موصوف نے اور وضاحت سے انسی امر کا واضح کاف اعتراف یوں کیا ہے:

”اگرچہ اس محسن گورنمنٹ کا ہر ایک پر رعایا میں سے شکر واجب ہے، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ یہ میرے اعلیٰ

لہ غلام احمد قادیانی مرزا: ستارہ قبصرہ، ص ۷

لہ غلام احمد قادیانی مرزا، تریاق القلوب، ص ۲۶

مقاصد جو جناب قیصرہ ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ کسی اور گورنمنٹ کے زیر سایہ انجام پذیر ہو سکتے، اگرچہ وہ اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی ہے۔

مرزا صاحب اس امر کے بھی معترف ہیں کہ انھیں ملکہ و کٹوریہ کے حکم سے نبی بنایا گیا تھا۔ نبی بنانے والے گورنر جنرل یا وائسرائے کا نام چونکہ انھوں نے تحریر نہیں کیا، لہذا اس کے ذکر کو چھوڑ کر ملکہ برطانیہ کے متعلق بیان ملاحظہ ہو:

اُسے بابرکت قیصرہ ہند! تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا سایہ اُس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو ملکہ و کٹوریہ کے جس ماتحت حاکم نے نبی بنایا تھا، اس سے اُس کا مقصود کیا تھا اور مرزا صاحب کو کس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا، موصوف نے اس سوال کا جواب خود یوں دیا ہے:

”اُس نے اپنے قدیم وعدہ کے موافق، جو مسیح موعود کے آنے کی نسبت تھا، آسمان سے مجھے بھیجا، تا میں اُس مرد خدا کے رنگ میں ہو کر جو بیت اللہ میں پیدا ہوا اور ناصرہ میں پرورش پائی، حضور ملکہ معظمہ کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول رہوں۔“

موصوف کو اعتراف تھا کہ وہ انگریزی حکومت کا خود کا شتر پودا ہیں، اسی لیے اپنے نبی بنانے والوں کی خدمت میں اپنی خدمات یاد دلا کر، یوں دست بستہ عرض پڑا ہوا تھا، اکتھاس ہے کہ سرکار دولت مدار، ایسے خاندان کی نسبت، جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی

۱۔ غلام احمد قادیانی مرزا: تحفہ قیصریہ، ص ۴

۲۔ غلام احمد قادیانی مرزا: ستارہ قیصرہ، ص ۱۵

۳۔ ایضاً: ص ۱۰

نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیاں میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کا خیر خواہ اور خدمت گزار ہے، اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت عزم و احتیاط سے اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابتہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت و مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔" لے

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جبال کا  
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

## شیعہ حضرات

متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں بسنے والے مسلمانوں کا مذہب، اہلسنت و جماعت تھا، جن کو آجکل بریلوی مکتب فکر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے اور جلد جماعتیں جو آج کل نظر آرہی ہیں وہ انگریزی دور حکومت میں اسی جماعت سے، برٹش گورنمنٹ کے تخریبی منصوبے کے تحت، جدا ہو کر بنی تھیں، ماسوائے شیعہ حضرات کے جو سرزمین پاک و ہند میں مغلوں کے دور سے موجود تھے لیکن انتہائی اقلیت میں، یعنی آٹے میں نمک کے برابر۔ ان حضرات نے اپنے لیے ہی بہتر سمجھا کہ برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں، اسی لیے انگریزوں کے خلاف انہوں نے کبھی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ شیعہ صاحبان کی اس وفاداری کا ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے یوں اعتراف کیا ہے:

"لغات کے غیر ضروری ہونے پر ان کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آ گیا۔ اس دستاویز پر مستند اور قابل اعتماد شیعہ علماء کی مہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ

اس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاً وفادار ہیں! لے

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے بیان کے متعلق سر سید احمد خاں صاحب کے اپنے تاثرات یہ ہیں: اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شیعہ لوگوں کا کچھ ذکر لکھا ہے اور جو تعریف ان لوگوں کی کی ہے گو وہ بھی مشروط بشرائط ہیں، لیکن میں اس طرح سے بھی خوش ہوں، کیونکہ میری دانست میں یہی غنیمت ہے کہ اس عالم ڈاکٹر نے مسلمانوں کے ایک فرقہ کی تعریف کی۔ چنانچہ میں ان کی اس قدر مہربانی اور رحم کا شکر گزار ہوں، لے

قارئین کرام! جن حضرات کو برٹش گورنمنٹ نے سر زمین پاک و ہند سے اپنا آلہ کار بنا کر، ان سے تخریب دین کا کام لیا، ان سے مسلمانوں کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا، ایک اسلام کے متعدد جعلی اسلام بنوائے اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر کے ان کی طاقت کو منتشر اور دین و ایمان کو تباہ و برباد کر دیا، ایسی سیکڑوں ہستیوں میں سے چند نامور حضرات کی اس باب میں نشان دہی کی گئی ہے اور ان کے بارے میں جو بیانات پیش کیے ہیں، وہاں بھی مقصود ایسے جملہ بیانات کا حصر ہرگز نہیں تھا، بلکہ نمونے کے طور پر چند واضح اور غیر مبہم عبارتیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے کیونکہ پرکھنے والے تو ان کی روشنی میں بھی کھرے اور کھوٹے سکوں کو پہچان سکیں گے پھر طوالت کی کیا ضرورت؟

غیر مسلموں سے دوستی کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس بارے میں آگے مستقل عنوان کے تحت بقدر کفایت جواب موجود ہے۔ لیکن یہ تو زالا ہی ستم ہے کہ یہاں معاملہ دوستی پر بھی ختم نہ ہوا بلکہ ایجنٹ اور آلہ کار تک بن گئے۔ اگر کلام الہی کو سامنے رکھتے، اس پر یقین ہوتا، اپنے پیدا کرنے والے کی بات سنتے تو ہرگز بھی ان دشمنان دین کے پھندے میں نہ پھنستے جبکہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں بھی کلام الہی یوں خبردار کر رہا تھا:

لے ولیم ہنٹر ڈاکٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۰۹

لے سر سید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ص ۶۷



مَا يَوْمًا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ  
الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ  
عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِمَّنْ يَنْزِلُ لَكُمْ  
وَهُوَ كَافِرِينَ، كِتَابِي يَأْتِيكُمْ، هُوَ نَهَى  
چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے  
رب کے پاس سے۔

کیا ان حضرات نے اس حقیقت کو مد نظر رکھا؛ باری تعالیٰ شانہ فرمائے کہ اہل کتاب  
کبھی تمہاری بھلائی نہیں چاہتے، لیکن ان حضرات نے باری تعالیٰ شانہ کی نعمتوں کے خزانوں کی  
کنجیاں ہی شاید برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں سمجھ رکھی تھیں کہ خدا نے موڑ لیا اور حکومت سے رشتہ  
جوڑ لیا۔ کاش! وہ قرآن کریم سے یہ پوچھ لیتے کہ اہل کتاب بھی اگر ہماری بھلائی میں خوش نہیں تو اور  
کس بات میں خوش ہیں؟ اگر وہ اتنا پوچھنے کی زحمت برداشت کرتے تو اللہ تعالیٰ کا کلام سب سے  
اُنہیں واضح طور پر یہ بتاتا کہ:

وَدَكْشِيرٍ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ رَدُّوهُمُ  
مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كَفَارًا أَجْحَسَاءَ مِمَّنْ  
عِنْدَ أَنفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ  
الْحَقُّ لَئِنْ  
بہت کتابوں نے چاہا، کاش! تمہیں  
ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں، اپنے  
دلوں کی طین سے، بعد اس کے کہ حق ان  
پر خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

مسلمانوں! کلام الہی کی سنتوں کو اکثر اہل کتاب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلیں اٹھتی  
رہتی ہے اور اُسے بھاننے کی خاطر وہ یہی حربہ استعمال کرتے ہیں کہ مسلمان سے کافر بنادیں۔  
جاتے غور ہے کہ جو حضرات اُن حاسدوں کی جھولی میں جا گرے تھے کیا انگریزی ڈھنڈور چوں  
کے مطابق واقعی امیر المؤمنین، مصلح، رفیقار مر، نبی اور شمس العلماء بنایا تھا؛ قرآن کو سچا جانو  
کہ جہاں اُن کا بس چلے وہ مسلمان کو کفر کی طرف پھیرتے ہیں۔ اگر خدا نہ کرے اب بھی کوئی شک باقی  
رہ گیا ہے اور ارشادِ ربانی اور سن لو کہ اہل کتاب کسی مسلمان سے کس صورت میں اور کب راضی  
ہو سکتے ہیں؟ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں کلام الہی کی ایک روشن آیت کا حصہ ہے:

لَهُ الْبَقْرَةَ، آیت ۱۰۵

لَهُ الْبَقْرَةَ، آیت ۱۰۹

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَىٰ  
 حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ

اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ  
 ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی  
 نہ کرو۔

اب تو واضح ہو گیا کہ مسلمان کو مسلمان ہی دیکھتے ہوئے یہود اور نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ وہ  
 اگر خوش ہوں گے تو اسلام سے ہٹا کر اور اپنی ملت کا تابع بنا کر خوش ہوں گے۔ سوچے ذرا،  
 جن حضرات نے برٹش گورنمنٹ کو راضی کرنا ہی اپنی زندگیوں کا مقصد اور اپنا اولین نصب العین  
 بنا رکھا تھا، قرآن کریم کے آئینے میں دیکھیے کہ انگریزوں نے انھیں کیا بنایا ہوگا اور ان سے کب  
 جا کر راضی ہوئے ہوں گے؟ اور دیکھیے کلام الہی یوں بھی خبردار کر رہا تھا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فِرْيَقًا  
 مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمُ  
 بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرِينَ ۗ

اے ایمان والو! اگر تم کچھ تمہارے کب  
 پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں  
 کافر چھوڑیں گے۔

یہاں بھی صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ اہل کتاب تمہیں مصلح یا ریفارمر وغیرہ کچھ بھی نہیں  
 بنائیں گے اگرچہ دھوکے میں رکھنے کے لیے لیبیل تمہاری پیشانیوں پر ایسے ہی لگائیں گے، ورنہ  
 حقیقت میں وہ تمہیں مسلمان نہا کافر بنائیں گے۔ مصلح وغیرہ تو جب بنائیں کہ انھیں اسلام کی  
 خیر خواہی منظور ہو، ابھی ارشادِ بانی سنا کہ ان کے دلوں میں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف  
 حسد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے اور یہی بتا دیا کہ اس آگ کو اسی طرح بجھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر  
 بتاتے ہیں کہ اسلام سے پھر جائیں یا ان کی ملت کا ایک جزو بن جائیں، اَللّٰهُمَّ اَحْفِظْنَا مِنْهُمْ۔

قارئینِ کرام! آپ نے انگریز دوستوں کے اپنے یا ان کے متعلق ایک دوسرے کے بیانات  
 ملاحظہ فرمائے اور اب آخر میں ارشاداتِ خداوندی سنے۔ ان کی روشنی میں مذکورہ حضرات  
 دین کے خیر خواہ تھے یا بدخواہ، خدا ترس تھے یا خوفِ خدا سے عاری، ملت کے غمخوار تھے یا زرپرست،

۱۷۰ آیت، البقرہ،

۱۰۰ آیت، آل عمران،

مصلح اور ریفارمر تھے یا افتراق بین المسلمین کے ٹھیکیدار؛ اُس امر کا فیصلہ کرنا اور اُس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے برعکس، راقم الحروف کو تو علی الاعلان یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کی حقیقی اور قدیمی جماعت، سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت کے کسی ذمہ دار عالم کے متعلق اس قسم کا ایک بیان بھی نہیں دکھایا جاسکتا کہ اُنہوں نے برٹش گورنمنٹ کی حمایت کی ہو، یا انگریزوں کے اشارے پر یا کسی بھی وجہ سے اسلامی عقائد و نظریات میں اپنی طرف سے معمولی رو و بدل بھی کی ہو۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ احقر یہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہے کہ ہماری جماعت (جسے بتدعین نے بریلوی فرقہ کہنا شروع کیا ہوا ہے، وہی چودہ سو سال سے چلی آنے والی قدیمی جماعت ہے اور ہمارے عقاید و نظریات وہی ہیں جو شروع سے لے کر اب تک متواتر چلے آ رہے ہیں۔ باری تعالیٰ شانہ ہمیں اسی جماعت میں رکھے جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔ امین یا اللہ العظیم بحق سید المرسلین۔ ربنا لاتزعقلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمتہ لانک انت الوھاب ۵ وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد وعلیٰ آلہ و صحبہ اجمعین۔

باب پنجم

marfat.com

Marfat.com

عجم ہنوز نداند رموزِ دینِ حجاز  
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بواجب است  
سرود بر سرِ منبرِ کلمت از وطن است  
حیرتِ خیزد مقامِ محمد عربی ست  
بصطفیٰ برساں خویش را کہ وہی پر است  
اگر باوز رسیدی تمام بولہبی ست  
واقبال

## وہابیہ کی زُنا ر دوستی

قاریین کرام! یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کا مالک اور مطلق العنان نہیں بلکہ احکامِ الہی کا پابند ہے۔ اس کے تعلقاتِ رضائے الہی اور منشاٹے خداوندی کے تابع ہوتے ہیں۔ مسلمان کسی سے محبت کرے تو خدا کے لیے کرتا ہے اور کسی سے عداوت رکھے تو خدا کے لیے رکھتا ہے۔ اپنی مرضی سے یہ کسی سے بنانے اور بگاڑنے کا مجاز نہیں۔ باری تعالیٰ شانہ نے اس بارے میں جو حد بندی فرمائی ہے اُس سے تجاوز کرنا، گویا عملاً اسلام سے منحرف ہونا ہے۔

عالات کی ستم نظریں تو ملاحظہ فرمائیے کہ ان حضرات نے سرزمینِ پاک و ہند میں تیرھویں صدی کے اوائل سے پتے اور پتے مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا ناپاک مشغلہ اپنے ساختہ دین کا اولین کن اپنے ضابطہ حیات کا اہم ترین باب اور بہترین توشہ آخرت و زاوِ راہ قرار دے کر اپنا اور حنا بچھونا یا دائمی وظیفہ یا تکیہ کلام بنایا ہوا ہے اور سیکڑوں کتابیں بھی اسی منصوبے کے تحت بڑی آب و تاب سے شائع کروا چکے ہیں، جن میں آیاتِ الہیہ و فرامینِ مصطفویہ کے معانی و مطالب میں تحریف کرتے وقت قطعاً خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا کو مد نظر نہیں رکھا گیا اور اس طرح متواتر اُمتِ محمدیہ کو شرک کے سمندر میں دھکیل رہے ہیں گویا یہ اُمتِ محمدیہ ان کے نزدیک ٹھیک اُمتِ ملعونہ ہے ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ سے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گیارہ سو سال سے یہ اُمت توحید جیسے بنیادی اور اہم ترین عقیدے سے دست بردار ہو کر اسلام سے نا آشنا ہو گئی تھی اور گیارہ سو سال تک مسلمانانِ عالم اُس عقیدہ توحید سے تھی دست رہے تھے، جس پر اہلِ اسلام کو بجا طور پر ناز ہے۔

گویا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو توحید کا جو درس دیا تھا اور اُس سرکار کے جانشین یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، جس توحید کے علمبردار اور مبلغ بنائے گئے تھے، ان کرم فرماؤں کے نزدیک اُسی مایہ ناز عقیدہ توحید کو اہلسنت و جماعت کے علمائے کرام اور اولیائے عظام نے گیارہ سو سال سے شرک کی گھانی میں ملائے رکھا اور

ان بتدعین زمانہ کے نزدیک اصلی عقیدہ توحید اب وہی ہے جو محمد بن عبدالوہاب نجدی نے خارجیت کے مردہ جسم میں جان ڈال کر، بارہویں صدی کے آخر میں پیش کیا اور کتاب التوحید کے ذریعے پوری دنیا میں اس کی تبلیغ و اشاعت کا انتظام کیا گیا۔

پاک و ہند میں موصوف کی "کتاب التوحید" کے اسباق کو اردو کا لباس پہنا کر مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے "تقویۃ الایمان" کے نام سے پیش کر کے مسلمانوں پر شرک و کفر کی گولہ باری کا فریضہ انجام دیا۔

عقیدہ توحید کو غتر بود کرنے کی جسارت اور مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا مال تو ملاحظہ ہو کہ قدرت نے ان لوگوں کو اقوام عالم کے سامنے کس انداز میں سزا دی؟ کیا مسلمان جیسی غیور قوم کے لیے یہ باعث ننگ و عار نہیں کہ وہ کافروں اور مشرکوں کا آلہ کار یا نعلین بڑا بنے؟ مسلمانوں کو مشرک بتانے والوں کو قدرت نے یہ سزا دی کہ وہ برضا و رغبت مشرکین ہند کے نہ صرف غلام بنے بلکہ بت پرستوں کے بندہ بے دام بنے۔ باری تعالیٰ شانہ! سب سے اور ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

اب میں ان حضرات کی زنا دوستی کے چند واقعات و بیانات پیش کرتا ہوں۔ آئیے سب سے پہلے بڑی دکان پر چلتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سیکرٹری کون صاحب تھے؟

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (مولوی محمد اسماعیل دہلوی) کا خط بلفظ نقل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کاغذات منشی ہیرالال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں لے ہیں، وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہوئے ہیں مگر ہم بلفظ نقل کرنے کا فخر حاصل نہ کر سکے۔"

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے ساتھیوں نے صوبہ سرحد میں جو جنگیں لڑیں، جنہیں جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ ان بانکے مجاہدین میں سے ایک نامور مجاہد سے ہم

قارتین کرام کو مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہیں :

”ادھر اپنے مورچے سے بوقتِ شب سید صاحب نے اپنی فوج براہِ جلالہ واپس کئی شروع کر دی۔ ایک راجپوت ہندو، جو مولوی احمد اللہ کے ساتھ بیسواڑہ سے جا کر شریکِ لشکرِ اسلام تھا مورچے میں باقی رہ گیا، جو صبح تک تنہا دونوں توپوں کو چلاتا رہا۔ بوقتِ صبح راجہ رام بھی بمقابلہ جلالہ اپنے لشکر سے آٹلا۔ ادھر دُرّانی مارے خونِ سخنون کے اپنے مورچے چھوڑ کر رات کو بھاگ گئے اور دوپہر تک واپس نہ آئے۔“

جب سید احمد صاحب کی فوج دُرّانیوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھی تو سید صاحب کے محبوب مجاہد اور مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے چہیتے اور منظورِ نظر توجی یعنی راجہ رام صاحب کس بے جگری سے خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے:

”مولانا نے تلوار کا پھرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وہ دونوں توپیں دُرّانیوں کی طرف پھیر کے فیر کرنے شروع کیے۔ ایک وفادار ہندو جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام قوم راجپوت باشندہ بیسواڑہ) گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اُس نے اس قدر پھرتی سے گولہ اندازی کی کہ دُرّانیوں کے پیر اکھڑ گئے۔“

جناب غلام رسول تہر کی زبانی بھی راجہ رام کے اس جہاد کی مختصر سی کہانی ہدیہ قارتین ہے:

”یہ آٹھ دس آدمی تھے، جن میں سے شیخ امجد علی غازی پوری، حافظ رحیم بخش الہ آبادی، اور حافظ عبداللطیف نیوتنوی (برادر مولوی عبدالحق) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندو راجہ رام نامی بھی تھا، جو بیسواڑہ (نزد سلون) کا باشندہ تھا۔ اُس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا کہ میں مورچے

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۴۰

۲۔ مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۲۷



میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کسی کو نہ پایا۔ بستی میں جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ تمام غازی  
 اس فوج پر شبنون مارنے کے لیے گئے ہیں، جو دو آبہ کی طرف سے ملک کے طور  
 پر آرہی تھی۔ میں یہ سن کر توپوں کے پاس پہنچا۔ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا دشمن  
 (دُرانی) توپیں لے جائیں، اُن میں گولے بھر بھر کر چلانے لگا۔

راجہ رام کے ایسے ہی کارناموں پر سید صاحب نے اُسے قبولیت کی سند جن لفظوں میں عطا  
 فرمائی وہ بھی ملاحظہ ہوں، تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے:

”سید صاحب نے راجہ رام کی بہادری اور حُسنِ تدبیر کی ستائش فرمائی۔  
 حادثہ بالاکوٹ کے بعد شیر سنگھ نے سید احمد صاحب کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کیا  
 ملاحظہ ہو:

”یہ بھی ایک روایت ہے کہ آپ کی شہادت کے بعد راجہ شیر سنگھ خلیفہ ہمارا  
 رنجیت سنگھ نے جو سکھوں کی فوج کا جنرل تھا، آپ کی لاش پر دو شا لا ڈال کر  
 بہت عزت سے، آپ کو دفن کرا دیا۔“

بعض لوگوں نے اس روایت کو مولوی محمد انصاری دہلوی پر چسپاں کیا ہے (واللہ اعلم) اور  
 مولوی محمد جعفر تھانیسری کا خیال بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن دیگر وہابی مورخین اس  
 اعزاز کو سید صاحب کے ساتھ ہی مخصوص کرتے ہیں، جناب غلام رسول مہر کی وضاحت  
 ملاحظہ فرمائی جائے، وہ یوں رقمطراز ہیں:

”شیر سنگھ نے اُن گرفتاروں سے کہا کہ لاشوں میں سے ہم کو بتاؤ، خلیفہ صاحب  
 (یعنی سید احمد صاحب) کی لاش کون سی ہے، اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو  
 تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ پھر اُنھوں نے کھیت میں جا بجا پھر کر لاشوں کو دیکھا،

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، برسوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۵۵، ۲۵۶

۲۔ ایضاً: ص ۲۵۶

۳۔ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۳۱۶

ایک لاش بے سر کی تھی، اُنھوں نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب کی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا سر بھی ہو تو ہم بتا دیں، پھر شیر سنگھ نے اُس کا سر تلاش کروا کر منگایا اور اُس لاش میں ملوایا، تب اُنھوں نے کہا: ہاں خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے۔ پھر شیر سنگھ نے ایک دو ٹالا اُس لاش پر ڈلوایا، دو تھان خاصے کے اور پچیس روپے نقد دیے اور کہا: جل طرح تم مسلمانوں کا دستور ہے کفن دے کر اس کو دفن کر دو۔ پھر ادھر ادھر سے ملکی مسلمان بھی آکر جمع ہوئے اور کفن دے کر اُس لاش کو دفن کیا اور وہ روپے نقد خیرات کیے گئے۔

مہر صاحب نے دیوان امر ناتھ کے ظفر نامے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر بھی بنوائی تھی، یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ کیوں بنوائی، بہر حال بنوائی گئی۔ چنانچہ موصوف یوں لکھتے ہیں:

شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہوا اور ایک سحر کار مصور کو مقرر کیا تاکہ اُن کی تصویر ہو ہو کھینچے۔ جب اُس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا، رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ شیر سنگھ کو کلفی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیے اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب کی تصویر سے جو اندری کی بوسونگھ کر کہا: "آفرین"۔ اور منصفانہ تعریف کی۔ میں نے بھی وہ تصویر دیکھی، لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی ان جملہ جنگی سرگرمیوں کے بارے میں خود وہابی

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۸۰۳، ۸۰۴

۲۔ ایضاً، ص ۸۰۸، ۸۰۹

حضرات کی زبانی یہ اقرار ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں بھی ہندو مسلم اتحاد کار فرما تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

”ہم پہلے لکھ آتے ہیں کہ حضرت سید احمد شہید کی تحریک ۱۸۵۷ء اور جہادِ حریت

۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا۔“

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام الوہاب بیہ کی اس تحریکِ جہاد کے بارے میں دیوبندی نقطہ نظر کی پوری طرح وضاحت کر دی جاسکتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے یوں تصریح کی ہے:

”ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمان پنجاب کی

حد درجہ پامالی وزبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالعتاب

صفت آرا ہونا اور آخر معرکہ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا، ورنہ اصل

یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایٹھ اٹھیا

کھپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے

اور اس تحریک سے بڑے خوفزدہ تھے، اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ

سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور

جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔“

ٹانڈوی صاحب کا نظریہ معلوم ہو گیا کہ ان کے نزدیک سید صاحب نے انگریزوں سے وطن

آزاد کرانا تھا۔ سکھوں سے معرکہ آرائی مقصود نہ تھی، یہ ضمناً ہوئی جس سے انگریز خوش تھے

اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے بلکہ ٹانڈوی صاحب نے یہ کھل کر اعتراف کر لیا کہ

برٹش گورنمنٹ نے جنگی ضروریات کے سلسلے میں سید صاحب کی مدد کی تھی۔ اب یہ ملاحظہ

فرمایا جائے کہ سکھوں سے سید صاحب کو کیوں لڑنا پڑا تھا،

”اس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو کہ انگریزوں کے

۱۔ عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۸

۲۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۱۲

علیف تھے اور آپس میں (انگریزوں اور راجہ رنجیت سنگھ میں) زور دار معاہدے  
کیے ہوئے تھے مگر حقیقت میں سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصلی ان بدیشیوں  
(انگریزوں اور ان کے معاونین سے لڑ کر ملک کو اس مصیبت سے بچانا تھا اور  
رعایا پرستوں کے وحشیانہ مظالم کو اٹھا دینا اور بس؟

سید صاحب سکھوں سے کیوں لڑے؟ اس کی ٹانڈوی صاحب نے وضاحت کر دی۔ اب رہی  
یہ بات کہ انگریزوں کو متحدہ ہندوستان سے کیوں نکالنا چاہتے تھے؟ اس کا موصوف نے یوں  
جواب دیا ہے :

”سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع  
کرنا تھا، جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا  
پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف  
انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پر دہی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔  
اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت  
کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔  
چنانچہ اس سلسلے میں سرحد سے گوالیار کے مدارالہمام لوزمہار راجہ دولت رائے  
سیندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے،  
وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت  
کے متعلق آپ کے نقطہ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔“

ٹانڈوی صاحب نے اپنے اسی بیان کو آگے چل کر یوں مزید وضاحت کرتے ہوئے  
تحریر کیا ہے :

”کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس کا

۱۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقش حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۳

فیصلہ آپ طالبینِ مناصبِ ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں، مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو مقرر کرنا خود اس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے۔ بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلیٰ کلمۃ اللہ اور دینِ رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلیٰ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائلِ اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں۔ جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پرجوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و دیانت دار ہوگا، امامت اور لیڈرشپ اسی کے ہاتھ میں رہے گی، خواہ اقلیت کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔

سید احمد اینڈ کمپنی کی تحریکِ جہاد کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر محترم اور دیوبندی حضرات کے عالیجناب شیخ الاسلام صاحب کا نظریہ قارئینِ کرام نے ملاحظہ فرمایا۔ اگر موصوف کو سچا مان لیا جائے تو یقیناً ہر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں سید احمد صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شہید کس بنا پر کہا جاتا ہے؟ اس طرح یہ ایک ملک گیری کی جنگ تو کہلا سکتی ہے لیکن جہاد کیسا؟ ملکی جنگ بھی ایسی کہ اگر کامیابی

نصیب ہو جاتے تو انگریزوں کے ساتھ ہنود کی عکرائی بھی بسرو چشم قبول۔ مشرکین ہنود کو برابر کا شریک رکھا، ان سے وعدے کر لیے۔ خود وہابی حضرات وہ بات کہ بغیر نہیں رہ سکتے جو ہم مذکورہ سطور میں عرض کر چکے، پناچہ مولوی عامر عثمانی (المتوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) ٹانڈوی صاحب کی ان تصریحات کے بارے میں لکھتے ہیں:

کوئی شک نہیں، اگر استاد محترم حضرت مدنی کے ارشادِ گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسمعیل کی شہادت محض فسانہ بن جاتی ہے۔ مادہ پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں۔ اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا اجرِ آخرت کا موجب کیوں ہوگا؟“ لے

خیر اس بات کا فیصلہ تو وہابی حضرات خود کریں گی کیونکہ ٹانڈوی صاحب کو اگر سچا سمجھا جائے گا تو مولوی محمد اسمعیل دہلوی اور سید احمد صاحب وغیرہ کو شہید کہنے والوں کو جھوٹا ماننا لازم آئے گا اور سید احمد صاحب وغیرہ کو اگر شہید ہی قرار دینا ہے تو صدر دیوبند مولوی حسین احمد صاحب کو جھوٹا ماننا پڑے گا۔

ہمیں اب اس موضوع پر روشنی ڈالنی ہے کہ انگریز کی حکومت میں کانگریس اور مسلم لیگ دو ایسی سیاسی جماعتیں ملک کے اندر موجود تھیں جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی رہنمائی کا دم بھرتی تھیں۔ کانگریس کو ہندو اور مسلمان وغیرہ جملہ اقوام کی رہنمائی اور ان کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ تھا لیکن حقیقت میں وہ صرف ہنود کے مفادات کا تحفظ کر رہی تھی اور خصوصاً مسلمانوں کو جھانسا دیا ہوا تھا۔ ہندو لیڈروں نے اپنی قوم کو ہر لحاظ سے ترقی کی

راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ جب ہندو ہر لحاظ سے مضبوط اور حکومت کی مشینری کے نکل پڑنے بن گئے تو انہوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے اور مسلمانوں کو کچلنے کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کانگریس مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد پر آمادہ کرتی اور آزادی ہند کی خاطر اس کی اہمیت کو ذہن نشین کراتی۔ مہاسبھا اور جن سنگھ پارٹیوں کے ذریعے مسلم کشی کی مہم جاری رکھواتی اور اپنے زر خرید مسلمان لیڈروں اور علماء کے باعث مسلمانوں کو کانگریس سے دور بھی نہ ہونے دیتی۔ ہندو مسلم اتحاد کا آزادی کی خاطر واسطہ دے کر راضی رکھ لیتے بلکہ وہ تجویزوں کی جھنکار پر خود ہی مسحور و مسحور رہا کرتے تھے۔

ان دنوں مسلمانوں کی سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کے صدر حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی تھے۔ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اس جماعت کا دعویٰ تھا لیکن ان دنوں موصوف بھی گاندھی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامیان ہند کی قسمت کا سودا کر چکے تھے۔ دوسری جانب مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت شروع کی۔ مسلمانوں نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خلافت اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں نے اپنی بساط سے بھی زیادہ چندہ دیا، حتیٰ کہ عورتوں نے زیور تک اتار کر دے دیے۔ موصوف کے ساتھ مسلمانوں کا ایک سیلاب تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے ہندوستان میں دن گئے گئے ہیں اور انگریزی اقتدار اب چند روز کا لہمان ہے۔ مسلمان بے حد خوش تھے اور ہنود حیران و ششدر۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا تو صاف نظر آ گیا کہ خلافت سے مراد گاندھی کی امامت مطلقہ تھی اور مقامات مقدسہ کی بازیابی کا مقصد سوراخ یارام راج (اکھنڈ بھارت) کا حصول تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیسری جماعت بعض انگریزوں کے پروردہ علمائے بنائی اور اس کا نام جمعیتہ العلماء ہند رکھا۔ ان دین فروش علماء کا کام صرف یہی تھا کہ گاندھی کی اسلام دشمن تجاویز پر شریعت مطہرہ کی مہر لگاتے رہا کریں اور بس۔ بد قسمتی سے یہ رہنمائی کے دعویٰ دار قوم کا سب سے گمراہ ترین طبقہ نکلا کیونکہ مسلمان ان کے جیبہ و دستار پر اعتماد کر کے، ان کے فتوؤں کو شریعت کے مطابق گردانتے ہوئے گاندھویت کے چکر میں پھنس جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی احرار پارٹی

بھی پنجاب میں ہی کروا کر رہی تھی۔ فریقین کی اور بھی کئی جماعتیں تھیں لیکن وہ مذکورہ جماعتوں کی ذیلی شاخ ہی تھیں لہذا ان کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ اب مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیتہ العلماء اور احرار پارٹی کی گاندھویت کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح ہندو مفادات کا تحفظ کیا اور رہنمائی کے بھیس میں کس طرح مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضربیں لگائی گئیں۔

## گاتے کی قربانی اور گاندھوی ٹولہ

ایک وقت تھا کہ متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نمائندگی کانگریس کر رہی تھی۔ مسلم لیگ کا وجود ان دنوں قومی مفادات کے لحاظ سے برائے نام تھا۔ کانگریس میں ہندو لیڈروں کی اکثریت تھی۔ اس میں بھی جتنے مسلمان لیڈر شامل تھے وہ بھی کسی مرحلے پر اپنی قوم کو بحیثیت ایک رہنما کے فائدہ پہنچانے سے مجبور ہی بنے رہے یا ایسی صلاحیت ہی سے عاری تھے۔ غلامی کے اس دور میں ہندو لیڈروں نے اپنے بیدار مغز ہونے کا واضح ثبوت دیا اور اپنی قوم کو مادی لحاظ سے اُبھارنے کا جامع منصوبہ تیار کر کے اُسے عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) نے اس حقیقت کا تجزیہ یوں کیا ہے:

ہندوؤں نے جب مسلمانوں کی نہ صرف کنارہ کشی بلکہ کانگریس کے مقاصد و طرزِ عمل سے مخالفت و بیزاری دیکھی تو ان کی جانب سے انہیں مایوسی ہوئی تو انہوں نے نہایت ہی عزم و استقلال سے حکیمانہ انداز پر اپنی قوی رفتار کی حرکت تین سمتوں میں منقسم کر دی۔

ایک جماعت نے اقتصادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اکتسابِ دولت کے جس قدر ذرائع اور وسائل تھے انہیں اپنے ہاتھوں میں لے لینے میں ماسعی و کوشاں ہوئے، خصوصیت کے ساتھ ساہوکاری کو اس سلیقہ سے انجام دیا کہ پچاس برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی تقریباً ساری دولت سمٹ کر ہندوؤں



کی ملکیت ہوگئی الا ماشاء اللہ۔

دوسری جماعت نے تعلیم اور اس کے ثمرات کی طرف قدم بڑھایا اور اس راہ میں بھی انھیں بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی۔ خاص ہندوؤں کی تعلیم کا ہوں گا شمار جو کیا گیا ہے اور پھر اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی درس گاہیں رکھی گئیں تو ان کا وہی نقشہ سامنے آگیا ہے جو سماں دولت کا مقابلہ کرتے ہوئے پیش نظر ہو چکا ہے۔ تعلیم کے بعد ملازمت اور علمی پیشہ کا میدان سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی ہندوؤں کا مقابلہ مسلمانوں سے وہی نتیجہ دیتا ہے جو سابق کے دو مقابلوں میں حاصل ہو چکا ہے۔

تیسری جماعت نے عملاً سیاسیات کی طرف اپنا قدم بڑھایا اور نہایت عزم و استقلال سے اس حوصلہ شکن، صبر آزار راہ پر چلنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاست کی راہ بہت ہی پُر خطر تھی۔ اس کی سنگلاخ زمین قدم قدم پر پُر خار وادی سامنے لاتی تھی، جس پر چلنا اپنے تلووں کو زخموں سے چور چور اور پاؤں کو گھائل بنا دیتا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے عزم اور ہمت مروانہ کی داد دینی چاہیے جنہوں نے نہایت ذوق و شوق سے اس بیچ وریچ خارزار سے نہ صرف گزر جانے کا بلکہ اس راہ کو صاف کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ اُن کے لیے برونک خار لذت افزا اور ولولہ انگیز تھی۔ ہر ٹھوک سنگ راہ کی اُن کے سمند شوق کے لیے مہینز تھی، قید خانہ کی تنگ و تاریک کھڑکیاں قصر و ایران کے راحت و فضائے ہمسری کرتی تھیں۔ طوق و سلاسل کی جھنکار اور آہنی زنجیروں کی سیاہی مرتع زیوروں کی چمک دمک اور اُن کی آواز سے زیادہ گوش نواز اور نظر افروز تھی۔

جب ہندو لیڈروں نے برطانویوں سے اپنی قوم کو مضبوط اور منظم کر لیا حتیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ برٹش گورنمنٹ سے ٹکرا کر اس کی چولیں ہلا دیں اور آزادی کی منزل مقصود تک پہنچ

جائیں۔ مکرانے میں جانی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ وقت تھا لیڈروں کے امتحان کا کہ ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کو اپنے قومی مفاد کی خاطر قربانی کا بکرا بننے پر رضامند کر لیا لیکن مسلمانوں کے لیڈر اتنے نااہل اور پھسڈی ثابت ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں اس قربان گاہ پر سوراج کی خاطر بھینٹ چڑھانے کے لیے تحفظِ خلافت اور حصولِ آزادی وغیرہ کا جھانسہ دے کر لے جاتے تھے۔ یہ واقعات ہمارے ایک دیدہ وراور مردِ حق آگاہ کی زبانی سنئے اور فراسٹ مومن کی داد دیکھیے:

یہ سب کچھ تھا لیکن حکومت کی ہمنماری جس چڑھاوے اور قربانی کی خواہاں تھی اب تک ہندوؤں کے ہاتھوں نے وہ نذرانہ پیش نہیں کیا تھا، اسی لیے سلف گورنمنٹ اور ہوم رول کا خوشنما منظر قریب تو ہو گیا تھا لیکن حجابات کے پردے ہنوز اس پر پڑے ہوئے تھے۔ ضرورت تھی کہ بہت سی جانیں حکومت کی دیہی پر بھینٹ چڑھا دی جائیں۔ سیاست کے سارے منازل میں یہ منزل سخت ترین تھی۔ قرب شوق کی آگ بھڑکار ہاتھ اور جان کی اضاعت دامن پکڑتی تھی۔ مکھی اور رابنگاں جانوں کی تلاش تھی۔ بالآخر امانِ نظر اور تعمقِ فکر کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ تینوں جماعتیں اپنے سی سالہ کماٹے ہوتے سرمایہ کی اس طرزِ خاص سے ایک جھک مسلمانوں کو دکھلائیں کہ ان کی نگاہیں خیرہ اور عقول حیرت زدہ ہو جائیں۔ کچھ اپنا خیر و خیر انھیں نہ سمجھائی دے نہ سمجھ میں آئے، ہاں اس پر انگڑی تو اس میں اپنی رہی سہی ہستی کھو بیٹھیں۔ اس عمل سے قربانی کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی اور یہ پہلو کا کاٹنا وجودِ مسلم بھی نکل جائے گا، اٹ

جب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے ان ناخداؤں کو اپنی کماٹی کی جھک دکھائی تو ہمارے لیڈر بننے والے پک گئے، زنا رواروں پر ہزار جان سے قربان ہو گئے، جس کی وجوہات یہ ہیں:

اس سحر ساری کو مسلمانوں کی آنکھوں نے جب دیکھا تو انھیں صاف نظر آیا کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایہ دولت ایک جماعت کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر علوم مغربیہ جوق ورجوق ایک دوسری جماعت کے ساتھ ساتھ ہیں۔ تیسری جماعت ایک سلف گورنمنٹ کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے اور اشارہ قریب کر رہی ہے۔ وہ ساعت دور نہیں جبکہ یہ جماعتیں متحد ہو جائیں تو دولت، علم اور حکومت تینوں کا اجتماع قوم ہندو میں ہوا جانا ہے۔

مسلمانوں نے پچائی ہوئی نظر سے اس جماعت کو دیکھا اور تڑپ کر رہ گئے، اس لیے کہ اس دور فرصت میں جبکہ ہندو اپنی قوم میں زندگی کی روح چھونک رہے تھے اور جیسا کہ طرز پر ان اسباب کی فراہمی میں مصروف تھے، جن کے اجتماع کا نتیجہ قوم کا زندہ ہو جانا ہے۔ مسلمان نہایت اطمینان و سکون سے اس راہ پر برابر قدم بڑھا رہے تھے، جس کا نتیجہ نیستی اور مردہ قوم بن کر رہنا ہے۔

یہ دولت بگاڑتے تھے وہ ثروت بنا رہے تھے، یہ بیچتے تھے وہ خریدتے تھے، یہ قرض سودی لیتے تھے وہ سود و سود کے بیچ میں ان کی جائدادیں مہول کرتے تھے، وہ پڑھ رہے تھے پڑھا رہے تھے یہ تعلیم کے نام سے کانپ کانپ اٹھتے تھے، وہ محنت کرتے تھے، جفاکشی اٹھاتے تھے یہ کاہل اور تن آسانی کی لذتیں لے رہے تھے، وہ معاشرت میں کفایت شماری ملحوظ رکھتے تھے یہ اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر معاشرت میں رنگینی پیدا کرتے تھے، وہ باہمی مخالفت مذہبی پھر بھی ایک زبردست مرکز اتحاد رکھتے تھے یہ ٹیٹو ٹیٹو کر اختلاف کرتے تھے اور عداوت کی حد تک اسے پہنچا کر چھوڑتے تھے۔

آخر اس کا نتیجہ یہی تھا کہ دنیا میں باقی تو رہیں لیکن مفلس، جاہل اور بد اخلاق ہو کر نمونہ عبرت و بصارت ہوں۔ نہ ان میں حمیت ہو نہ غیرت، نہ صدق و صفا پایا جاتے نہ عہد و وفا۔ ایسی حالت میں حریصانہ نظر سے ہندوؤں کی طرف

دیکھنا بجز اس کے اور کیا ثمرہ دیتا کہ حسرت و ارمان دل میں خون ہو کر رہ جائیں۔  
موجودہ حالت میں یہ کس مرض کی دوا رہ گئے تھے جو انہیں ہنود اپنے میں  
شامل کر لیتے ہاں

یہ تھی اُس وقت صورتِ حالات۔ مسلم لیگ جو خالص مسلمانوں کی جماعت تھی اور مسلمان ہند  
کی خصوصیت سے واحد نمائندہ تھی اس موقع پر اس نے بھی ۱۹۱۶ء سے کانگریس کی ہمنوائی  
بلکہ زنا دوستی اور بت پرستی نوازی کا المناک ثبوت دینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی خلافت تو  
یورپ کے فرسے میں تھی اور مسلمانان ہند کو ہنود نے ختم کرنے کا پروگرام بنایا تھا، جس پر  
گاندھوی لیڈروں اور علمائے سو کے ذریعے عمل کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران ۱۹۱۷ء میں ہنود نے  
گائے کی قربانی کے بہانے مسلمانان کٹار پور کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اُس موقع پر مسلمانوں  
اور ہندوؤں کے لیڈر حضرات کا طرز عمل کس صورت میں سامنے آیا، یہ علامہ مرحوم کی زبانی سنئے:

انتہائے براہِ نوازی اور سچی ہمسائیگی کی تازہ ترین مثال واقعہ کٹار پور ہے۔  
ہندوؤں نے تو مسلمانوں کو بند مکان میں آگ لگا کر جلایا اور اُن کی جان و مال  
اور آبرو کو نہایت بے دریغی و بے رحمی سے تباہ کیا لیکن جب مقدمہ حکومت کے  
ہاتھوں میں پہنچا تو باوجود اس کے کہ عمائدین ہنود اُن خونریز ہندوؤں کی  
حمایت میں ہر طرف سے ہر طرح کی امداد پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے  
لیڈروں نے بجائے معاونت اور حقیقی غمگساری کے یہ یقین شروع کی کہ مسلمانان  
کٹار پور یہ درخواستیں دیں، عرضداشتیں بھیجیں کہ ہم اپنا دعویٰ واپس لیتے  
ہیں۔ گورنمنٹ ان مجرموں کو رہا کر دے۔ پھر جبکہ فیصلہ پھانسی کا سنا گیا،  
اُس وقت بھی مسلمانان کٹار پور کو دبا کر غمگساری میں انتہائی کوشش  
عمل میں لائی گئی اور آخر کار گورنمنٹ میں درخواست بھجوا ہی دی گئی۔ اس بذل  
و کرم کے اسباب رموز و اسرار ہیں۔ بجز لیڈروں کے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ

مسلمانانِ کٹار پور کا خون رائیگاں کیوں قرار دیا گیا؛ اُن کے درنا کو اس  
سنگدلی کے فیصلہ پر راضی ہو جانے کے لیے کیوں مجبور کیا گیا، ہندوؤں نے  
کیا عوض اس احسان کا پیش کیا؛ ان سوالوں کا جواب حضرات لیڈر ہی دے  
سکتے ہیں بشرطیکہ ان سوالوں کا قابل جواب ہونا خیال بھی فرمائیں۔ ۱۰

مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں نے مسلمانانِ کٹار پور کے ساتھ کیسی ہمدردی کا سلوک کیا یہ بھی  
مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے جو تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے۔  
”ہندو نوازی میں مبالغہ و غلو اس سے سمجھنا چاہیے کہ دورانِ مقدمہ میں مسلمانانِ  
کٹار پور کے پاس لیڈروں کے صحافت پھینچے گئے کہ گاتے کی قربانی موقوف کرو۔  
ان صحافت میں مستغنی عن الالقباب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی  
کے صحیفہ کو امتیاز خصوصی حاصل ہے۔ بعض حضرات خود تشریف لے گئے تاکہ  
مسلمانانِ کٹار پور کو گاتے کی قربانی سے بازرگھا جاتے۔“ ۱۱

دوستی اور محبت کا ثبوت دینا طرفین کے لیے ضروری ہے لیکن اس وقت مسلمانوں کے لیڈر  
کہلانے والے ہنود کے دوست نہیں بلکہ غلام اور بندہ بے وام تھے اور وہ ملتِ اسلامیہ  
کو گاندھی کے قدموں پر بٹھا کر اس ملتِ فریضی کے صلے کی سراج کے وقت قیمت  
وصول کرنے کی آس لگاتے بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ دوستی کا دم بھرتے تھے جس کے باعث  
ہر ذی ہوش کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ :

اگر قوم ہنود اور اس کے فدائیوں مسلم سے سوال کیا جاتے کہ کوئی واقعہ ایسا  
ہی مثل کٹار پور کے پیش کریں جس میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر اس طرح  
وحشیانہ ظلم کیا ہو، پھر ہندو لیڈروں نے اپنے عوام کو اس طرح درگزر کرنے  
پر مجبور کیا ہو اور ان سببہ طرز عمل کے بعد اپنی قوم سے اسی مذہبی عمل کے ترک

۱۱۔ سلیمان اشرف، مولانا، التوح، ہندو، ص ۵۲۔ ۶۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۔

کرنے کی اپیل بھی کی ہو، اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس پُرچیچ لیڈری اور ڈولیدہ خیر خواہی ملت و مذہب کے سمجھنے میں اگر کچھ الجھن پیدا ہو جائے تو اس پر عتاب و خفگی کیوں نازل کی جائے؟ اُس وقت صورتِ حال کیا تھی؟ عالمی حالات کس صورت میں رُونما ہو رہے تھے اور دولتِ عثمانیہ کے خلاف اسلام دشمن طاقتیں کیا کچھ کر چکی تھیں اور اُس کی تباہی کے لیے کیا کر رہی تھیں؟ یہ ہر پڑھے لکھے فرد پر واضح ہے، لیکن مسلمانوں کو اُس پریشان کن موڑ پر ہنود کی بے وفا قوم نے کس طرح اسلامیانِ ہند کو محبت کے جال میں پھنسا کر صفحہ ہستی سے مٹانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا، اُس کی ایک ابتدائی کڑی ملاحظہ ہو:

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے بعد مفاہمہ اتحاد کا آوازہ بلند کیا۔ اُس وقت مسلمانوں کی خلافتِ مقدسہ، دولتِ یورپ کے زغہ میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ مسلمان ہند مقامی اور وطنی نزاعات کو صلح اور آشتی کے ساتھ طے کر لیں اور یورپی توجہ سے خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت پر تدابیر سوچ کر عمل آرا ہوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے اس عالم پریشانی سے بغیر فائدہ حاصل کیے کیونکر رہ سکتے تھے۔ ایک دو بڑے ہندو لیڈروں نے تو سحر آمیز افسوں خوانی لیڈرانِ مسلم کے کانوں میں بھینچ کر راز شروع کی اور باقیہ نے مل کر ایک قیامت آ رہ اور شاہ آباد میں بپا کی۔ دوسرے سال گنار پور میں اپنی عداوت کا نہ ٹٹنے والا ثبوت پیش کیا۔

ہندوؤں نے آ رہ، شاہ آباد اور گنار پور میں اپنی بہیمیت کا اظہار محض اسلام دشمنی سے بدست ہو کر کیا تھا۔ چوٹی کے ہندو لیڈر تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے، مسلمان لیڈروں کو اس اتحاد کی تبلیغ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے اور باقی لیڈر مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی

۱۔ سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۷

۲۔ ایضاً، ص ۴

لگن میں اسلامیان ہند کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہندو لیڈر مسلمانوں پر قیامت کرواتے اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہندوؤں کے آگے سجدہ ریز ہونے میں کوشاں رہتے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی ناز برداری پر آمادہ کرنے میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کیے جوتے تھے۔ اس وقت اسلام کا حقیقی درور کھنے والے اور مسلمانوں کے خیر خواہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ:

”مذہب و ملت کے پتے ہمدرد اسی وقت کھٹک گئے تھے کہ یہ عنایت اور یہ باہمی آمیزش مسلمانوں کے کسی وطنی و مذہبی حق کو سلب کیے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ یہ نتیجہ آج اسی عنایت اور قرآن کا ہے جو گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے۔ موحدین کی پیشانی پر قشقہ جو شمارِ شرک ہے کھینچا جاتا ہے مساجد اہل ہنود کی تفریح گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدس معبد ہے۔ ہولی شمار اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وہ بھی خاص اہل ہنود کے ہاتھوں سے جبکہ وہ نشہ شراب میں بدمست ہوں عجب دلکش عبادت ہے۔ بتوں پر ریوڑیاں چڑھانا، ہار پھولوں سے انھیں آراستہ کرنا، پھولوں کا تاج اصنام کے محروں پر رکھنا، خالص توحید ہے یہی کے مسائل ان صورتوں میں اس لیے ڈھل گئے کہ ہندوؤں کی دلنوازی اور استرخنا سے زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت معاذ اللہ، لہذا بالذات ختم لہذا بالذات“ لے

اب مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت یعنی مسلم لیگ کی کارگزاری ملاحظہ ہو کہ مسٹر گاندھی اور لیڈران ہنود جو کچھ چاہتے تھے، مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے کس طرح اپنی بد نصیب قوم کو فریب میں مبتلا کر کے بت پرست نواز بنانے اور گاندھی کے قدموں میں جھکانے کے لیے کیسے کیسے جتن کرتے ہیں، بنیاد ملاحظہ ہو:

”۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا جلسہ بھی دہلی میں ہی منعقد ہوا تھا۔ مجلس استقبالیہ کے

صدر نے جو اپنا خطاب اس وقت پڑھا ہے اُس میں مسئلہ خلافت کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے ترکوں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ برسوں کا بھولا ہوا سبق جو آج یاد آیا ہے، یہی عامرِ مسلمین کے تالیفِ قلوب کا پہلا سنگِ بنیاد ہے جسے ڈاکٹر انصاری صاحب نے بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ مسلم لیگ اپنے ہاتھوں سے رکھا۔ اُس سال کی قومی و ملکی مجالس میں صرف اس قدر کارروائی ہوئی کہ مدن موہن مالویہ صاحب نے مسلمانوں کو دل آزاری ہنود سے منع فرمایا اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے حمایتِ خلافت کا علم بلند فرمایا۔ علمائے سیاسی نے بھی وقت شناسی سے کام لے کر اس موقع پر اپنے فتوے کا اعلان ضروری سمجھا۔ لے

اس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جانے والی تھی اُس کے مختلف اجزا کیا تھے؟ وہ کیا اغراض و مقاصد تھے جن کو حاصل کرنے کی خاطر یہ ہندو مسلم اتحاد کا ڈھونگ رچایا جا رہا تھا؟ چنانچہ اس سلسلے کا ابتدائی کام ملاحظہ ہو۔

انہیں ایام میں مسٹر گاندھی اپنے دورانِ سفر میں بعض ایسے لیڈروں سے ملاقات کرتے ہیں جو قومی اور ملکی مجالس میں اپنی معذوریوں سے شریک نہیں ہو سکے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ ستیہ گرو اور بھرتالی عام اور رفیع امتیاز مسجد و مندر، جس کے محرک گاندھی ہیں، اسے بھی منظم کر لیجئے۔ جب یہ متفرق اعمال جن میں بظاہر کوئی سلسلہ معلوم نہیں ہوتا، اپنے اپنے موقع و محل پر انجام پا چکے، تو اب ۱۹۱۹ء میں بتاریخ ۱۷ نومبر بمقام پہلی خلافت کمیٹی کا سنگ بنیاد پڑتا ہے۔ اُس موقع پر ہندو بھی ایک کافی تعداد میں بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے، جن میں خصوصیت کے ساتھ مسٹر گاندھی کا نام قابل ذکر ہے، جنہوں نے اس خالص مذہبی جلسہ کے ایک اجلاس میں صدارت بھی فرمائی تھی اور علمائے سیاسی نے آپ کے تشکر و



انتان میں وہ سب کچھ ارشاد فرمایا جس کا جذبہ عقیدت اور جوش اتباع و تقلید مقتضی تھا۔

اظہارِ تشکر کے ذیل میں مولانا صاحب (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) نے اس کا بیان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ مسٹر گاندھی صاحب کے اخلاق اور گفتگو سے میں یہاں تک متاثر ہو چکا ہوں کہ گائے کی قربانی میں سے ترک کر دی۔ جلسہ خلافت کے مقاصد اور اصول عمل اسلامی و دینی سے ترک قربانی کا ذکر تعلق کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہی جملہ جو بطور حکایت بیان ہوا اور جو الفاظ سرسری طور پر اثنائے تشکر و انتان میں آگئے فی الحقیقت یہ ایک زبردست دیباچہ اور مقدمہ تھا اس کتاب کا جو آئندہ ماہ دسمبر میں اسی سال عامہ مسلمان کے لیے تصنیف ہونے والی تھی۔ اسی کے ساتھ خلافت کے نام سے جو ایک ہڑتال ہوئی اُسے تمہید کتاب سمجھ لیجئے۔

جب دسمبر کا مہینہ آیا تو امرتسر میں تحریک خلافت کا جلسہ ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر محترم یعنی عالیجناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی صدارت فرماتے ہیں۔ اپنے خطبہ صدارت میں اظہار فرماتے کہ ہند کی محبت کا دم کیوں بھرا جا رہا ہے، تحفظ خلافت کا ڈھونگ کس مقصد کی خاطر چایا تھا، گاندھی صوبی علماء اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں نے گائے کی قربانی پر کس طرح ہاتھ صاف کیا، خوفِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا کو بلائے طاق رکھتے ہوئے کیونکر شریعتِ مطہرہ پر ظلم ڈھایا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی مذموم جسارت کی؟

اب دسمبر کا مہینہ آتا ہے اور قومی مجالس کا انعقاد امرتسر میں ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر مستغنی عن الالغاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی اپنا خطبہ صدارت پڑھتے ہیں جس کی بے شمار کاپیاں ملک میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ تقریباً چار صفحات میں صدر مسلم لیگ نے مسئلہ قربانی سے بحث فرمائی ہے۔ ابتدائی جملہ یہ ہے، گاندھی کا ڈھونگ ایک عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں کرتے رہے ہیں

لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے۔

ص ۳۳ میں نہایت سوز و گداز کے ساتھ ہندوؤں کی عنایت و کرم کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ص ۳۴ پر مذہبی نقطہ نظر سے اس مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے۔۔۔ ”ہندوستان کو چھوڑ کر تمام عرب، شام، مصر، طرابلس اور ایشیائے ترکی وغیرہ کے مسلمانوں کو دیکھیے جن میں سے کروڑوں کی تعداد نے زندگی بھر اس سنت کو بغیر گائے کی قربانی کے ادا کیا ہے۔۔۔ عوام بھارت کے اس پر بیچ تاریخی جملہ سے یہ سمجھے کہ گائے کو قربانی کے لیے تمام بلاد اسلامیہ کے مسلمان چھوٹے بھی نہیں، لیکن خفیہ سا یہ شبہ عوام کو رہ جاتا تھا کہ شاید اس دور سے پیشتر عہد رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں گائے قربانی ہوتی ہو۔ اس شبہ کو مٹا دینے کے لیے حکیم صاحب نہایت شد و مد سے ایک حدیث میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں۔۔۔ ”اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں علی العموم بکری کی قربانی کا رواج تھا۔“

مسلم لیگ میں جب یہ ریزولیشن پیش ہونے لگے تو ڈاکٹر انصاری صاحب نے ترک قربانی گاؤں کا ریزولیشن پیش فرمایا، جو تھوڑی خوش بیانیوں کے بعد منظور ہو گیا۔ مولانا عبدالباری صاحب قرنگی محل نے قومی و ملکی مجالس سے مراجعت فرماتے ہوئے سہارن پور میں ایک تقریر فرمائی جس میں مسئلہ قربانی کے متعلق، جو کارروائی مسلم لیگ نے انجام دی تھی اس کی تائید و تحسین میں کافی زور دار الفاظ ارشاد فرمائے۔

مستغنی عن الالتاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی کا مسلمان گنار پور کے پاس صحیفہ متعلقہ ترک قربانی گاؤں بھینجا، ڈاکٹر انصاری صاحب کا خلافت کی حمایت میں ایک سال قبل صدائے احتجاج بلند فرمانا، پھر نومبر

میں جلسہ خلافت کا انعقاد اور گاندھی صاحب کی ایک جلسہ میں صدارت اور مولانا عبدالباری صاحب کا اثنائے تشکر و امتنان میں ترک قربانی گاؤ کا سرسری تذکرہ، پھر دوسرے ہی مہینے میں چند ہفتوں بعد مسلم لیگ کا جلسہ اور اُس میں انھیں ارکانِ ثلاثہ کا یکے بعد دیگرے اس مسئلہ کو اس طرح طے کر ڈالنا کہ مستغنی عن الالقاب عالیجناب حکیم صاحب خطبہ صدارت میں ملکی، سیاسی اور مذہبی پہلو سے ترک قربانی گاؤ پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ریزولیشن کی شکل میں پیش فرماتے ہیں، جو منظور ہو جاتا ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب سہارن پور پہنچ کر تحسین و تائید فرماتے ہیں۔ اب وہ نذرانہ اور گراں بہا تحفہ جو سرکار ہندو میں پیش ہونے والا تھا، جس کے لیے سارے اہل دربار ہمتن چشم براہ تھے، جس کا ذکر مسٹر مانٹیگو کے سامنے پیش ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے وفد نے اپنے ایڈریس میں کیا تھا، نیز جس کے متعلق عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں ذکر ہوا تھا، اب وہ اس قابل ہو گیا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہاتھ اس نذر و ہدیہ میں شامل ہو۔

علامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے گاندھی جی علماء اور لیڈروں کی شرمناک روش، اسلام دشمنی اور بت پرست نوازی پر تاسف کا اظہار فرماتے ہوئے اس حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی کی ہے کہ مسلمان کہلاتے ہوئے ان حضرات نے ایسی گندی روش کیوں اختیار کی؟ وہ فرماتے ہیں:

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہندو ترک قربانی گاؤ کی تحریک کرنے تو عامہ مسلمین ہرگز اُس کو تسلیم نہ کرتے۔ لیڈر صاحبان بھی اگر اس کی اپیل سیاسی اور ملکی پہلو سے پیش فرماتے تو نا کامیاب رہنے کا ظن غالب تھا۔ اس جیسے

مسئلہ کے لیے اسی کی ضرورت تھی کہ شرعی اور مذہبی لباس میں اسے مسلمانوں کے سامنے لایا جاتے۔ یہ نیپولین کی پالیسی تھی کہ وہ مذہب کا نام نہایت گرم جوشی سے لیتا اور مذہبی بننے میں کمال مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ یہ تک کہ بعضوں کو اس کے اسلام و مسلمان ہونے کا دھوکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ "نابین قلوب کا یہی ایسا وجہ ذریعہ ہے جسے ہمہ گیری کا حق حاصل ہے۔" نیپولین کی اسی پالیسی کو مد نظر رکھ کر اس وقت لیڈروں نے بھی مقاصد کانگریس کی تکمیل کے لیے جو مجلس منعقد فرمائی ہے اسے دلکش و لکیر بنانے کے لیے خلافتِ محمدیؐ کا لقب دیا ہے تاکہ نہایت سہولت سے مسلمانانِ ہندوستان کی گردنیں ہندوؤں کی غلامی و اطاعت میں سر بسجود ہو جائیں۔

برعکس ہند نام زندگی کا فورہ لے

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس خلافتِ محمدیؐ نے جو تحفظِ خلافت و مقاماتِ مقدسہ کی خاطر وجود میں آئی تھی آیا اس نے خلافت کی باذیابانی اور حفاظت کے لیے ایک قدم بھی بڑھایا؟ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کا دم بھرنے والوں کے پاؤں میں یہ فریضہ ادا کرتے ہوتے کیا ایک کانٹا بھی لگا، اگرچہ خواب میں ہی سہی؟ مسلمانوں کو کیا خبر تھی کہ یہ حضرات سوراج یا رام راج کو خلافت قرار دے رہے ہیں۔ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت سے ان بانکے لیڈروں کی مراد یہ ہے کہ بتوں کا مسلمانوں سے احترام کروائیں گے اور اپنی زنا ر دوستی کا زندہ ثبوت پیش کرنے کی خاطر سب سے پہلے گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دکھائیں گے۔ تحریکِ خلافت کا کارنامہ ملاحظہ ہوا

خاص دہلی میں عشرہ ذی الحجہ کے موقع پر اُونٹوں کا گشت، جن پر جلی قلموں میں اس طرح کے فقرات تختوں پر چسپاں، جن سے ہر مومن کا دل کانپ کا نپ اٹھتا تھا، لکھ کر خوب خوب مشہر ہوئے۔ پھر نہایت سختی سے بعض مجبور کرنیوالی

تدابیر سے بھی انسداد کافی کیا گیا۔ بمبئی کے مسلمانوں پر بھی خلافت کمیٹی نے قربانی کا ڈپرستم کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ خلافت کمیٹیاں کیا جوئیں کہ گائے کی قربانی کرنے والوں پر ایک آفت و بلا ہوئی۔

اب سے قبل جو جتنہ ظلم کا ہندوؤں سے باقی رہ گیا تھا اُسے فدائیانِ ہندو نے اسلام کا نام لے کر مسلمانوں پر تمام کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے یا ارحم الراحمین! ہم مسلمانوں پر رحم فرما اور اس آتے ہونے فتنہ کو ہمارے سروں سے دور کر بخرمة النسبی واللہ الامجاد۔ طرفگی نہ کہ اگر کوئی برسبیل خیر خواہی و نصیحت دینی ان لیڈروں کے طرز میں کچھ اصلاح پیش کرے یا ترمیم کا خواستگار ہو تو اُسے کافر، بے دین، قوم فروش، غدار وغیرہ کہہ کر محبت و محفل میں فضیحت کر ڈالیں۔ عوام کی فوج ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اُنھیں جس پر چاہا بھڑکا دیا، بھکا دیا۔ اہل حق اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے ہیں اور اپنی مظلومیت کی مولیٰ تبار و تعالیٰ سے فریادیں کرتے ہیں۔ نجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ظلم اپنے نشہ ظلم میں سرشار و غافل امت کی تباہی میں سرگرم ہیں۔ وہ ساعتِ دور نہیں جبکہ رحمتِ الہی مظلوموں کی فریاد پر لبیک عہدی فرمائے۔

خلافت کمیٹیاں تو مسلمانوں پر یوں ظلم و ستم ڈھا رہی تھیں۔ بت پرستوں کی محبت بکند نشہ غلامی میں سرشار ہو کر مداخلت فی الدین اور تخریبِ دینِ متین کی مرتکب ہو رہی تھیں۔ اس موقع پر مسلم لیگ اور اُس کے صدرِ محترم یعنی عالیجناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی خلافت کمیٹی سے بھی سبقت لے جانا چاہتے تھے تاکہ سوراخ کی صورت میں اپنے گاندھی مہاراج سے دوسروں کی نسبت زیادہ انعام و اکرام کے مستحق قرار پائیں۔ موصوف کی ایک ہولناک اور لرزہ خیز جہارت ملاحظہ ہو:

”جلسہ خلافت کی بنیاد ۱۹۱۴ء کی ۱۷ نومبر کو بمقامِ دہلی جبکہ ہندو اور مسلمانوں

نے مل کر رکھی اور پھر اس کی کارروائیاں اخبار و جرائد میں مطبوع ہوئیں۔  
 حیرت ہوتی تھی کہ الہی! یہ مسلمانوں کی عقل کو ہو کیا گیا ہے، جو اب عالم لغیب،  
 قادر مطلق، سمیع و بصیر سے بھی پالیسی کرنے لگے، اسی حیرت میں تھا کہ لیگ  
 کا جلسہ ہوا اور حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کا خطبہ صدارت دیکھنے میں آیا۔  
 وہاں بھی وہی رنگ مغالطہ سرتاسر پایا گیا، بلکہ حکیم صاحب نے ایک قدم  
 بڑھ کر یہ جرات بھی فرمائی کہ حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کرتے ہوئے ایک  
 لفظ بڑھا دیا اور الخ لکھ کر ترجمہ اور نتیجہ بیان فرمایا۔ وہی لفظ جس کا اضافہ فرمایا گیا  
 دار و مدارِ دلیل، اسی کی وجہ سے چند سطور کی تحریر الخ لکھ کر ناقص چھوڑنے  
 سے یہ فائدہ کہ ناظرین کا ذہن اس بے ربط اضافہ سے متوحش نہ ہونے پائے۔  
 چند روز تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس طرح جعل اور تحریف سے کیا مدعا مقصود ہے؟  
 آخر ایک خط لکھا، جس میں نہایت نیاز مندانہ طور پر یہ سوال تھا کہ حضرت  
 ام سلمہ سے مروی روایت کس کتاب سے آنجناب نے نقل فرمائی، جو اب  
 میں سکوت رہا۔ شاید خط ضائع ہوا۔ فقیر خود دہلی گیا۔ یہ رجب کی اوائل تاریخوں  
 کا ذکر ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا وفد اس وقت دہلی گیا ہوا تھا۔ درِ دولت پر  
 جا کر معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے، پاؤں میں کچھ شکایت ہو گئی ہے۔ دوسرے  
 دن پھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ مذکورہ مالویہ صاحب سے کچھ مشورہ ہو رہا ہے۔  
 بعض حضرات اہل علم جن کی آمد و رفت جناب حکیم صاحب کے یہاں جاری ہے،  
 ان کی خدمت میں پیام بھیجا کہ حدیث شریف میں جو غلطی ہو گئی ہے اس کی  
 تصحیح کی طرف حکیم صاحب کو توجہ دلاتی ہے۔ الفوسس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے  
 کہ یہ کوشش بھی بے اثر ثابت ہوئی۔

چوتھی رجب کو سرکارِ اجیرا ستانہ غریب نواز پر حاضر ہوا۔ ایک دن  
 بعض علماء سیاسی سے ملاقات ہوئی۔ عرض کیا کہ یہ فتنہ عظیم ہے۔ ہنود کی  
 خاطر مسلمانوں کا گلہ نہ گھونٹئے۔ دیکھیے حدیث میں جعل و تحریف تک کی نوبت

آگئی۔ تین مہینے گزر گئے اور کوئی اعلان نہیں کرتا ہے کہ اصل حدیث میں لفظ شامہ نہیں ہے، غلطی سے لکھ گیا ہے۔

ہر ایک شخص جس کے پاس خطبہ صدارتِ مسلم لیگ ہو اس مقام خاص کی تصحیح کرے نیز علماء و مسیحین اتحادِ ہند و مسلم کا یہ فرض ہے کہ اتحاد کے حدود متعین فرمائیں۔ عوام کو قشقہ لگانے اور مندروں میں جا کر ریورٹیاں تئوں پر چڑھانے سے منع کریں اور ان الفاظ کی شاعت کھلے لفظوں میں بیان فرمائیں ورنہ ایمان کی بربادی کا خطرہ ہے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ فقیر کی اس التماس کی علمائے سیاسی کی خدمت میں ذرہ برابر بھی شنوائی نہ ہوئی۔ آج تک وہی سکوت ہے، وہی اعراسن ہے، وہی چشم پوشی ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رہے سے اعمالِ قبیحہ مسلمانوں نے تلک آنجھانی کی مصنوعی لاش کے موقع پر ادا کیے اور علمائے سیاسی نے پھر اپنے سکوت سے ان امور کے جواز و استحسان پر تازہ بھر ثبت فرمادی۔

اس سلسلے میں اظہارِ حق کی خاطر ان حضرات کو خوب سمجھایا گیا۔ خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا یاد دلایا گیا لیکن جس طرح بنی اسرائیل کسی وقت بچھڑے کی محبت میں سرشار ہو گئے تھے کچھ اسی طرح اس بد نصیب قوم کے وہ گمراہ لیڈر اور گمراہ علمائے سوگاندھی جیسے پراسرار دشمنِ اسلام و مسلمین کی محبت میں ایسے بدست ہو چکے تھے کہ کسی فمائش کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی سلسلے کی مزید کارگزاری ملاحظہ ہو:

”کان پور میں بہاہ رجب ایک بڑے پیمانے پر علماء کا جلسہ ہوتا ہے۔ وہاں کے بعض کارکن علماء سے یہ استدعا پیش کی گئی کہ مسلمانوں کو اعمالِ شرک و کفر میں شریک ہونے سے باز رکھیے اور قربانی گاؤں کے متعلق غلط تسلیم کر لیجئے۔ لیکن جواب وہاں سے بھی سکوت ہی میں ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر

انتہائی بے قراری میں فیرنے رسالہ الرشاد لکھا اور مسلمانوں کو امرِ حق سے آگاہ کیا۔ اس رسالے کی اشاعت اول عشرہ رمضان المبارک میں ہوئی۔ لیڈرانِ قوم کے پاس ٹکٹ چسپاں کر کے نسخے بھیجے گئے۔ تین ماہ کے عرصہ میں تقریباً تین ہزار نسخے مختلف اصناف و قصبات میں تقسیم ہوئے۔ اب آکر جبکہ خطبہ صدارت مسلم لیگ کو آٹھ مہینے اور الرشاد کی اشاعت کو کامل تین مہینے گزر چکے، حکیم صاحب اپنی غلطی کا اعتراف پیچ و پٹیج اعتراض و سوال واپیل کے پیٹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ حالانکہ مذہبی نقطہ نظر سے یہ ایسی خطائے فاحش تھی جس کا اعلان بلا جواز توقف حکیم صاحب کو بذریعہ تاریخ مختلف و متعدد اخبار و جرائد میں اب سے بہت قبل کرنا تھا۔ ساتویں ذی الحجہ کا اجاب البشیر جو بیرون جات میں عین بقرعید کے روز پہنچتا ہوگا، اس میں اس طرح اعتراف کرنے سے مقصد و مطلب ہے کہ مسلمانوں کو اقرار کا علم بھی اس وقت ہو جبکہ سب مراحل قربانی کے طے پا جائیں۔ اسی کے ساتھ حق پسندی کی داد مل جائے گی۔ خیر یہ تو اپنا اپنا ذوق مذہبی ہے۔

جس کے دل میں حدیثِ مصطفوی کی عظمت ہے وہی یہ بھی جان سکتا ہے کہ اس طرح کی خطا کا کفارہ کیونکر ادا ہوتا، مجھے تو حکیم صاحب کے ایک سوال کا جواب دینا ہے جسے موصوف نے اپنی غلطی کا اعتراف فرماتے ہوئے آخر میں پیش فرمایا ہے۔ حکیم صاحب تحریر فرماتے ہیں: "میرے اوپر ایک یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حدیث اذا اس ادا احدکم ان یسبحی بالثناء میں آخری لفظ شتہ کا کسی کتاب میں نہیں ہے۔ میں اس اعتراض کو قبول کرتا ہوں اور یہ بات ظاہر کرنی ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ لفظ محض غلطی کی وجہ سے لکھا گیا، دراصل یہ کسی حدیث کا جزو نہیں ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اعتراض کرنے والے بزرگ اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟"



فقیر نے حکیم صاحب پر اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ ایک حقیقی اور واقعی امر کا اظہار کیا تھا۔ رہا فائدہ، وہ حکیم صاحب ہی بیان فرمائیں کہ کون سا مقصد حاصل کرنا تھا جس کے لیے حدیث میں اضافہ کی حاجت ہوئی اور اب کہ غلطی کا اعتراف ہے، اُن پانچ سطروں کا خطبہ صدارت میں کیا فائدہ سنے فقیر کا اس کشفِ حقیقت سے صرف یہی مدعا تھا کہ عالیجناب حکیم صاحب اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائیں اور مسلمانوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک لفظ اپنی طرف سے بڑھانا اور اسی اضافہ کو مقامِ استشہاد میں لانا، اُس خطبہ صدارت میں صرف اسی ایک جگہ ہوا ہے جہاں حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے۔ بقیہ سارے حوالے اعیان و وزراء نے انگلستان کے صحیح ہیں، کسی طرح کے شک و شبہ کو اُن میں دخل نہ دینا چاہیے۔ اس کے سوا نہ کوئی مدعا نہ کچھ اور فائدہ۔ اربابِ بصیرت جن کی آنکھیں نورِ ایمان سے منور ہیں اُنہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آیا اسلام اور اسلامی خلافت کی حمایت کی جا رہی ہے یا کفر و شرک کا طغیان ہے جو مسلمانانِ ہند پر لایا جا رہا ہے۔“ ل

خواجہ حسن نظامی دہلوی کی روشِ زیمانے بھر سے زالی تھی۔ موصوف کبھی گنگا رام تھے تو کہیں جننا و اس۔ کسی معاملے میں اہلسنت و جماعت کے ساتھ تو کسی میں بد مذہبوں کی ہمنوائی۔ قربانی گاؤ ہی کا تذکرہ ہے تو خواجہ صاحب بھی بُت پرست نواز ثابت ہوئے۔ موصوف کے بارے میں مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

’خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک مضمون ۱۹ اگست (۱۹۲۹ء) کے اخبار حق لکھنؤ میں چھپا ہے، جس میں آپ نے مجالسِ عید میلاد کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں سے تحریک کی ہے کہ وہ ۱۲ ربیع الاول کو

ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح ترک کریں۔ خواجہ صاحب کی یہ پہلی ہی ہندو نوازی نہیں ہے بلکہ اس سے قبل وہ ترک گاؤ کشی نام کا ایک رسالہ بھی لکھ چکے ہیں اور اکثر اوقات ان کے خاموش ناطق رقم سے اس قسم کے مضامین نکلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوؤں کے سیلابِ تعصب و طوفانِ عناد کی شدت و تیزی کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی بھی خواہ اسلام مسلمانوں کو خوشامدی بن جانے کی اجازت دے۔

نہ ہم خواجہ صاحب کو اتنا نادان سمجھتے ہیں کہ وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوں کہ خوشامدی ہمیشہ ذلیل و خوار رہا کرتے ہیں اور ظالموں کی جرات اور دلیری خوشامدی سے اور بڑھتی ہے۔ نہ خواجہ صاحب اتنے بے خبر ہیں کہ ہندوؤں نے جو مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اس کی ان کو خبر نہ ہو۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو ضرور معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کی پاسداری اور دلجوئی کا تصور بھی کبھی ہندو دماغوں میں نہیں ہوتا، تو وہ کس طرح مستحق ہیں کہ ان کی دلجوئی کے لیے مسلمان اپنے خورد و نوش میں پابندیاں لازم کر لیں اور ایسی غذا جو انہیں مرغوب بھی ہے اور ان کی معاشرت و اقتصادی حالت کے مناسب بھی ہے، اس کو ترک کر دیں۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو خوب معلوم ہو گا کہ ہندو منت شناس اور سپاس گزار قوم نہیں ہے کہ وہ کسی کا احسان مانے یا کسی کے بہتر سلوک کو یاد رکھے بلکہ وہ احسان کا لفظ بھی اپنی طرف آنے دینا گوارا نہیں کرتے۔

ہلاکتِ کھیتی (خلافتِ کھیتی) کے بہد میں جب قربانی گاؤ ترک کرنے پر خواجہ صاحب جیسے لیڈر بہت زور دے رہے تھے، اس وقت بھی ہندو لیڈروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ مسلمان اگر قربانی گائے چھوڑیں گے تو اس کا ہندوؤں پر کچھ احسان نہ ہو گا۔ ان حالات میں ہم نہیں سمجھتے کہ ذبیحہ گاؤ کو روکنے کی تحریک خواجہ صاحب کے دل میں کس سبب سے پیدا ہوئی ہے؟

اس کا سبب و محرک کیا ہے، اور وہ اس میں اپنا کیا نفع مد نظر رکھتے ہیں، یہیں ان کی ذاتیات سے کچھ بحث نہیں لیکن مسلمانوں کو اس خطرناک مشورہ کی ناصحتوں سے مطلع کرنا ضرور تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کی خاطر دہلی اور شملہ میں کانفرنسیں ہوئیں۔ مسلمانوں کی جانب سے وہی لیڈر اور علماء ان مواقع پر بلا تے گئے جو ہندوؤں کے ہاتھوں پک چکے تھے۔ مسلمانوں کی قیادت اور نمائندگی کا دم بھرتے لیکن تگ و دو ہندو مفادات کے تحفظ میں کرتے اور ملت اسلامیہ کو خلافت کا نعرہ سنا کر گاندھی کے قدموں میں ڈالتے تھے۔ ایسے حضرات کے بارے میں قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

”دہلی و شملہ میں جو مجلسیں ہوئیں ان میں بیشتر وہ اصحاب شامل تھے جنہیں مسلمان ہندوؤں کا نفس ناطق سمجھتے اور جو مسلمانوں کے دینی و مذہبی حق قربانی اور ذبیحہ گاو کو روکنے کے لیے ماضی قریب میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں ہر امر میں ہندوؤں کی خوشنودی ان کا مصلح نظر اور نصب العین رہا ہے۔ ایسے اصحاب مسلمانوں کے حقوق کی کیا حفاظت کر سکیں گے، شملہ کی مجلس میں جھٹکے کے طریقے سے قتل حیوان اور اس کے گوشت کے عام فروخت کو ناقابل اعتراض تسلیم کر لیا۔ ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ ہندوؤں کی گوشت خور قومیں مسلمانوں کے ذبیحہ کو بے تلف کھا سکتی ہیں اور انہیں ان کا مذہب اس سے نہیں روکتا اور مسلمانوں کے مذہب میں جھٹکا حرام ہے۔ جب بازاروں میں جھٹکے کی دکانیں عام طور پر کھل جاتیں گی تو جاہل ناخاندہ دیہاتی مسلمان اس سے دھوکا کھائیں گے اور ایک مصیبت عام میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہندوؤں کی تجویزوں میں سور کے گوشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس پر ان صلح کے علمبرداروں کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔“

لے محمد نعیمی، مولانا: ماہنامہ السواد الاعظم، بابت ربیع الاول ۱۳۴۸ھ، ص ۲

ہندو تو یہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے رقبہ (علاقے) میں گائے ذبح نہ ہو سکے گی جہاں کافی مدت سے اُس کے ذبح کا رواج نہیں ہے۔ اس پر بھی ان خود ساختہ مصالحن سے یہ نہ کہا گیا کہ جب رواج کی یہ پابندی ہے تو سور کے گوشت اور جھٹکے کا کیوں نام لیا جاتا ہے، جس کا ذکر میں آنا بھی مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اگرچہ ان مصالحتی مجلسوں کا کچھ انجام نہ ہوا لیکن ان مصالحن کی کمزور روش نے ہندوؤں کو اور زیادہ جرأت دلا کر معاملہ کو پھینک دیا۔ مسلمان کسی ایسی قرارداد پر راضی نہیں ہو سکتے جو علمائے دین، پیشوایان اسلام اور ہمدردان ملت کے مشورہ کے بغیر تجویز کی گئی ہو۔ یہ حضرات جو قوم میں مطعون ہیں اور جنہیں مسلمان ہندو پرست جانتے ہیں، کرم کریں اور بے فائدہ تکلیف نہ اٹھائیں! لے

کاش! یہ گاندھی ٹولہ یعنی مسلمانوں کے لیڈر بننے والے اور وہ علماء جن کے فتوے گاندھی کی جنبش لب کے ساتھ گردش کرتے رہتے تھے، کبھی خوفِ خدا کو مد نظر رکھ کر اُس مردِ حق آگاہ کی بات ہی سن لیتے جو دہلی کی مسجد فتحپوری میں بیٹھا ہوا مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اُس مردِ مومن سے میری مراد حضرت مفتی اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) ہیں۔ ذیل میں ہم ایک استغناء پیش کر کے حضرت سیدی و مرشدی علیہ الرحمہ کا جواب نقل کرتے ہیں:

## سوال نمبر ۲۳۵

- ۱۔ اسلامی اعتبار سے گائے کی قربانی شریعتِ غزالیہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟
- ۲۔ اگر حکومت اپنی طاقت سے گائے کی قربانی پر پابندی لگائے تو مسلمانوں پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟
- ۳۔ کیا مسلمان اسلامی اخلاقی اعتبار سے دیگر اقوام کی خوشنودی کے لیے گائے

کی قربانی ترک کر سکتے ہیں، اگر نہیں تو جو مسلمان اس فعل کے ترکب میں یا آئندہ ہوں ان کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟

مستفتی: فضل احمد دہلی

## الجواب

۱۔ گائے کی قربانی دین الہی کی نشانیوں میں سے ہے لقولہ تعالیٰ:

والبدن جعلناھا لکم من شعائر  
یعنی اونٹ اور گائے کی قربانی کو تمہارے

لئے دین الہی کی نشانیوں میں سے

اللہ بکرمہا خیر۔

ایک نشانی بنایا ہے، جس میں تمہارے

لیے بھلائی ہے۔

درمختار میں ہے:

بدن اونٹ اور گائے ہے۔ ان کے

بدنہ ہی الابل والبقر سمیت

ذیل دار ہونے کے سبب ان کا یہ

بہا لضعافتہا۔

نام ہوا۔

۲۔ ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ ہر ممکن کوشش سے اس اسلامی نشان کی محافظت کریں۔

کہ اس سے غفلت ہے جبکہ عقاب الہی کا موجب اور عتاب الہی کا

خوف اس کی محافظت کا سبب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اور جو اللہ کے دین کی محترم نشانیوں

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا

کی محافظت کرے گا، تو یہ محافظت

من تقوی القلوب۔

کرنا دلوں کے خوف کا مقتضی ہے۔

۳۔ اس کا جواب تو بہت ظاہر ہے کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ دین الہی کی نشانیوں کو مٹانا اور اس کی بجائے کفری نشان قائم کرنا کس طرح غضب الہی کا موجب ہوگا،

جس طرح گائے کا ذبیحہ اسلامی نشان ہے یونہی اس کا بند کرنا کفری نشان ہے۔ پس اس کی بندش کا اقدام تو بڑی شے ہے، اس کی جانب قلب کا میلان بھی عذابِ نار کا موجب ہے۔ یہ خیال کہ اس سے ہیں حکومت ہند کی حمایت و خوشنودی میرا جاہلیگی محض ایک شیطانی دھوکا ہے۔ ایسی حالت میں حمایت درکنار ان لوگوں کا کوئی رفیق بھی نہیں ہو سکتا لقولہ تعالیٰ: وَلَا تَرَكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا: قَتَسْتُمْ النَّارَ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ۝

اس مقام پر حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے اصحاب کے واقعہ پر غور کیجیے کہ جب وہ یہودیت سے تائب ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ اونٹ کا گوشت شریعت موسوی میں حرام ہے اور اسلام میں محض مباح، تو کیا حرج ہے کہ ہم اونٹ کا گوشت نہ کھائیں۔ اس پر نہایت عتاب آمیز انداز میں ممانعت فرمائی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْعِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ یعنی ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو اور ایسے خیالات میں پڑ کر (شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ پھر اس کے بعد بھی کہ تمہیں واضح دلیلیں پہنچ چکیں اگر لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے (اس کے عذاب کا کوئی روکنے والا نہیں) حکمت والا ہے (کہ بمقتضائے حکمت جب اور جس قدر چاہے سزا دیتا ہے)

اس واقعہ میں اور تھنا زعفریہ واقعہ میں اصلاً فرق نہیں۔ جس طرح عبد اللہ بن سلام نے اونٹ کے گوشت کو مباح سمجھا اور اجتہاد غلطی کی کہ شعائر اسلام نہ سمجھنے ہوئے ترک کا ارادہ کر لیا۔ وہی قصہ یہاں ہے۔ پس جس طرح وہ مورد عتاب ہوئے جو لوگ اس کو ترک کریں گے وہ بھی یقیناً مورد عتاب ہوں گے بلکہ مستحق عذاب کہ یہاں اس سے بڑی ایک شے اور بھی موجود ہے اور وہ ہنود کے عقائد باطلہ کی ترویج ہے جو اشد معاصی ہے اور عصیاں میں کسی کا بھی حکم کیوں نہ ہو، اس کی پیروی موجب واستحقاق عذاب ہے کہ إِنَّ اللَّهَ كَرِيمٌ عَلِيمٌ ۝ اور تمام مخلوق اسی کی محکوم۔ مشرکین مکہ نے بعض جانوروں کو اپنی طرف سے حرام کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی اس تحریم کی بھی تردید فرماتا ہے،

چنانچہ ارشاد ہے: یا ایہا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً (الایۃ) یعنی لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال و پاکیزہ موجود ہیں ان سے کھاؤ (اور ان کی تحریم کا ارتکاب کر کے شیطان کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے) کہ ایسے وابہیات خیالات سے تم کو ہر طرح کا نقصان دے رہا ہے، وہ تمہیں ان ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو (میرے نزدیک) بُری اور بے حیائی کی ہیں اور یہ (کریگا) کہ اللہ کے نام سے وہ باتیں لگاؤ جس کی تم سند ہی نہیں رکھتے۔ (جیسے گائے کی حرمت کہ من جانب اللہ تمہارے پاس اس کی کوئی سند نہیں)۔

اس آیت کریمہ میں جس طرح مشرکین مکہ کو حکم ہے کہ تم حلال جانوروں کو حرام ٹھہرا کر شیطان کی پیروی نہ کرو اور اللہ پر بہتان نہ باندھو۔ یونہی ہندوؤں کو بھی حکم ہے کہ گائے کے باب میں ایسا معاملہ نہ کرو۔ پس جب خود ہنود کو یہ حکم ہے تو مسلمانوں کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے ان کے اس عقیدے کو قوت پہنچائیں اور شیطان کے اتباع اور خدا پر بہتان بندی میں ان کا ساتھ دیں۔ مانا کہ مسلمان اس کو حرام جان کر ترک نہ کریں گے لیکن اس ترک میں قرآنی حکم کے خلاف غیر قرآنی حکم کی تقویت تو ہے اور من پچھے کہ آسمانی کتاب کے حکم منسوخ پر بھی عمل حرام کر دیا گیا ہے تو پھر کسی انسان کا حکم اس کے آگے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام کے واقعہ پر پھر غور کی نظر ڈالیے کہ باوجودیکہ اُونٹ کی حرمت ایک آسمانی کتاب میں موجود تھی لیکن چونکہ اس کی حرمت منسوخ ہو چکی تھی اس لیے یہ اصحاب اسلامی حکم سے اس کو حلال ہی سمجھتے تھے۔ غلطی ہو گئی کہ اس کو شعائر اسلام نہ سمجھا اور ترک کا ارادہ کر لیا جس کو تہمیداً شیطان کا اتباع قرار دیا گیا اور اپنے غضب کا اظہار فرمایا گیا۔ اُونٹ کچھ یہودوں کے معبودوں سے نہ تھا۔ پس یہاں عتاب تو صرف اس پر ہے کہ حکم منسوخ پر عمل کا کہوں ارادہ کیا گیا اور گائے کا تو معاملہ ہی جداگانہ ہے کہ اس کی جلت تعلیم توحید اور ایک شرک جلی کے ابطال پر ہے تو اب مسلمان خود ہی غور کرے کہ اس کا ترک کیا معنی رکھتا ہے، یہی کہ اس میں توحید کا ابطال اور شرک کا اعلان ہے۔

یہ حکم تو صرف مطلقاً ذبیحہ گاؤ کے ترک کا ہے لیکن اس پر قربانی کا ترک حکم میں اس سے بھی  
 اشد ہے کہ وہ عبادت الہی ہے۔ پس اس کے ترک میں ایک مخصوص عبادت کا ترک ہے۔ تو  
 مسلمان کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ اس کو میں ترک کر سکتا ہوں یا نہیں، یقیناً اپنی  
 خوشی سے جو اس کو ترک کریں گے یا اس میں اعانت کریں گے وہ سخت گنہگار ہوں گے۔  
 اور یہ خیال کہ محض ہنود کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اس کی قربانی کا ترک مقصود ہے  
 اور کسی کی خوشی حاصل کرنا تو کوئی جرم نہیں۔ تو اول تو حق تعالیٰ کی ناراضگی کے مقابلہ میں کسی کی  
 رضا کی طلب خود ہی حرام ہے۔ دوسرے وہ محض اتنی بات سے کہ آپ ذبیحہ گاؤ کو ترک کر دیں  
 پوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکتے کہ حقیقت میں ان کو صرف گائے کی قربانی کا ترک مطلوب  
 نہیں بلکہ ایک بہت بڑی مہتم بالشان قربانی مطلوب ہے یعنی ایمان کی قربانی بقولہ تعالیٰ وَدُّوا  
 لَوْ تَكْفُرُ دُنْ لَئِنِ انْ كُنْتُمْ تَرْضَوْنَ لَئِنِ انْ كُنْتُمْ تَرْضَوْنَ لَئِنِ انْ كُنْتُمْ تَرْضَوْنَ لَئِنِ انْ كُنْتُمْ تَرْضَوْنَ  
 اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تو کیا مسلمان اس کو برداشت کر کے جہنم میں اپنا ٹھکانا  
 بنا سکتے ہیں؟

میرے دوستو! امور دنیوی میں آپ کو ان سے مدارات سے کوئی نہیں روکتا، کیجیے اور  
 ضرور کیجیے، لیکن ایسی مدارات جس سے کوئی شعار اسلامی چھوٹے اور امور مذہبی پامال ہوں،  
 ہرگز جائز نہیں۔ آپ کو ان کی خوشی اسی لیے تو درکار ہے کہ اتفاق میسر آجائے جس کی  
 آج سخت ضرورت ہے، لیکن کیا وہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں کہ یہ شے  
 تو اور اختلاف کی بنیاد مضبوط کرنے والی ہے۔ اتفاق حاصل کرنے کی تو صرف ایک ہی  
 صورت ہے اور وہ یہ کہ جس طرح تم ان کے مسلمات میں کوئی مداخلت نہیں کرتے اسی طرح  
 ان کو بھی چاہیے کہ اسلامی احکام کے بجالانے میں ہم سے کچھ تعرض نہ کریں۔

ان کو بتلانیے کہ فروعات ایک طرف رہے، اصول پر نظر ڈالیے کہ شرک کیسی بدترین  
 شے ہے، جس میں معبود برحق کے مقابلے کا اعلان ہے، لیکن جب مشرکین ہمسایہ ہو جاتے  
 ہیں تو کیا کوئی مسلمان ان سے تعرض کرتا ہے کہ اپنے بت خانے توڑو، شرک چھوڑو، ہم  
 معبود برحق کا مقابلہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پس جب مسلمانوں کی طرف سے اس قدر وہ آزاد ہیں



تو ان کے لیے کیا گنجائش کہ ہم سے مطالبہ کریں کہ گائے کی قربانی ترک کرو، حالانکہ اسی کے نام پر قربانی کی جاتی ہے جس کو وہ بھی معبود جانتے ہیں اور خود ان کے اکابر سے بھی یہ فعل ثابت ہے جو اپنے مقام پر بدلائل واضح ہو چکا ہے۔

الحاصل مسلمانوں کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ اپنی رضا سے گائے کی قربانی ترک کریں بلکہ ہنود کو سمجھائیں کہ وہ اس کے ترک پر اصرار کر کے ایک نیا فتنہ نہ کھڑا کریں کہ یہ ہمارے مذہب میں مداخلت ہے جو قانوناً بھی ممنوع ہے فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد منظر اللہ دہلوی عفر اللہ

امام مسجد جامع فتح پوری

دہلی

## گاندھوی شیخ الہند کے کارنامے

جن سکھوں سے سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی برسہا برس رہے اور پیش خویش تین چار سال تک جہاد فرماتے رہے، سید صاحب کے خلفاء بھی ان کی سنت پر غیبت کا شاخسانہ کھڑا کر کے دنیا کاتے رہے، جن میں علماتے صادق پور سرفہرست ہیں اور جن سکھوں نے، ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھاتے، جن کے تذکرے سے کلیجہ منہ کو آتے مسجدوں میں گھوڑے باندھے، قرآن کریم پھاڑے، جلاتے اور مسلمانوں کو زندہ نذر آتش کرنے اور اذیت ناک سزائیں دینے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی تھی۔ ان کے ان تمام کارناموں کو گھریلو بخش اور معمولی چپقلش قرار دیتے ہوئے زمانہ قریب کے شیخ الہند کہلانے والے جناب مولوی محمود الحسن دیوبندی ان سکھوں اور اپنے ہندو بھائیوں کے بارے میں یوں فہمائش کرتے ہیں:

لے محمد مسعود احمد، پروفیسر، فتاویٰ منظری، مطبوعہ کراچی، ص ۲۲۱ تا ۲۲۴

” اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم ( ہنود ) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں ( ہندو مسلم ) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اُس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حالات اگر اس کے مخالفت ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے نا ممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بد اعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکتھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی یا نہ

اسی پریس نہیں، موصوف نے بڑے ناصحانہ اور دروہرے لہجے میں دونوں اقوام کے خواص و عوام کی خدمت میں فہمائش کے پہلو پہ پہلو اپیل بھی ان غیرت مند ان الفاظ میں کی ہے:

” اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیتے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھانہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں، البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں،

لے محمود الحسن، مولوی: خطبہ صدارت، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند، ص ۱۸

” عبدالرشید ارشد، مولوی: بینا بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۹۱

اتفاق کے حق میں متم قائل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

موصوف انگریزوں کی غلامی سے تو واقعی چٹکارا حاصل کرنے کے لیے پوری طرح بیتاب تھے لیکن جتنے اس مقصد کی خاطر جدوجہد کرتے اُتنے ہی ہنود اور گاندھی کے قدموں سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ نہ سمجھ پاتے کہ ان تمام کاوشوں کا ثمرہ صرف اور صرف ہندوؤں کو ملے گا۔ انگریز واقعی دشمنِ اسلام تھا اور ہے لیکن کیا ہنود حلقہ بگوشِ اسلام ہیں؟ کیا یہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں؟ دریں حالات یہ کہاں کی دانشمندی ہوئی کہ ایک دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا پھندا اپنے گلے سے ہٹانے کی خواہش میں دوسری اُس سے بھی بڑھ کر دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا طوق بردار و رغبت زیب گلا کر لیا جاتے۔ موصوف نے ترکِ موالات کے سلسلے میں جو فتویٰ جاری کیا تھا وہ بھی شرعی فتویٰ ہونے کی بجائے اُن کی انگریز دشمنی اور ہندو نوازی کا آئینہ دار ہے جبکہ شرعی فتویٰ تو خدا اور رسول کے احکام کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرنا ہے، لیکن آنجناب کے فتوے میں یوں ہے:

” (۲) تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن

ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکر یہ ہیں۔ (۳) استخلاصِ وطن کیلئے

برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے، گویا بس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ

واقع نہ ہو۔“

ہندو لیڈراتنے کم عقل کہاں تھے کہ ان صاحبان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے یا ظاہری ہمدردی کا دم نہ بھرتے۔ کیا کوئی ہندو نواز بتا سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ملتِ اسلامیہ اور خلافت کے تحفظ سے ایک رائی بکے برابر بھی دلچسپی تھی یا ہے؟ وہی اُن کے یار اور مددگار اب تو اُن الفاظ کو جھوٹ مٹ بھی زبانوں پر نہیں لاتے۔ آخر کیوں؟ اب تو یقین آ گیا

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی، سب سے بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۱

۲۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۵۹

یا نہیں کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کو جھوٹی بہدردی کے جال میں پھنسا کر محض اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کر رہے تھے۔ باری تعالیٰ شانہ نے تو فرمایا تھا کہ لَا يَأْتِيكُمُ النَّجَسُ لَا - کہ کافر تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے لیکن مسلمانوں کے ان محسن اور لیڈر بننے والوں نے معلوم نہیں فرمان الہی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا یا اپنے ہندو بھائیوں کو کافروں میں شمار کرنا برداشت نہ کیا۔ چنانچہ مولوی محمود الحسن صاحب کا مذکورہ فتویٰ بھی شرعی ذمہ داری پوری کرنے کی بجائے اپنے برادرانِ یقینی کی رضا جوتی اور کانگریس کی تائید و حمایت میں جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

”یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اُس میں نان کو پرشپن کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور اُن کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی عددِ درجہ اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان، برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کے متعلق طلبہ یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا، جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبہ مسلم یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں؛ لہ

دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ العلماء ہند کے صدر ہونے کی حیثیت میں مولوی محمود الحسن کا یہ فتویٰ تمام گاندھیوں کی طرف سے کفایت کرتا تھا کیونکہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں“ لیکن کانگریس کی موافقت میں دوچار لفظ لکھ کر ان شہسواروں کی فہرست میں اپنا نام درج کروانے کو پرانہ نجاتِ اُخروی یا سعادتِ داین کا ذریعہ سمجھتے ہوئے مزید پانچ سو علماء کے قلم بھی حرکت میں آ کر ہی ہے:

لے عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۲۸۵

”اس کے بعد ہی فتویٰ جمعیتہ علمائے ہند کے متفقہ فیصلے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔“

مصوف کی ریشمی رومال والی تحریک کا اُن کے ۱۲ اربوں میں بڑا شہرہ ہے کہ اُنہوں نے انگریزوں کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لیے یہ بڑی پُراسرار اور منظم جدوجہد کی تھی۔ جہاں تک اُن کی انگریز دشمنی کا تعلق ہے وہ تسلیہ لیکن کیا یہ تحریک صرف مسلمانوں کے مفاد میں اور ہندو کی دوستی بلکہ غلامی سے آزاد ہو کر چلائی گئی تھی؛ تفصیلات کے چہرے سے نقاب اٹھا کر دیکھا تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ ہندو کا تھا اور یہ گاندھی جی کے علمایا لیڈر محض شطرنج کے چہرے تھے جنہیں مسلم ممالک اور مسلمانان ہند کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے گانتھا گیا تھا۔ اس بارے میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیرگراف نمبر ۱۶۴ کا ایک اقتباس، ان حضرات کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

”مولوی عبید اللہ (سندھی) اور اُس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقرہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق ہند پر تاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جو شیبلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جینیوا گیا اور وہاں بد نام زمانہ ہر دیال سے ملا۔ ہر دیال نے اُسے جرمن قونصل سے ملایا اور وہاں سے یہ برلن آیا۔ بطور اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اُسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنانا تھا۔ مولانا برکت اللہ کراچیا کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست جھوپال کے ایک ملازم کا لاکا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔“

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی: میں بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۷

ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلاک فریڈرٹھی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومتِ جاپان نے اس کو بند کر کے اُسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی خدر پارٹی سے جا ملا۔

۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومتِ موقتہ پر ویتزئل گورنمنٹ نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے، جن میں اُس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرناب کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔

زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ حکومتِ موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترک حکومت سے روابط قائم کیے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا، ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدرآباد سندھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی ذیل کے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔

مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں، ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زروریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام، جہاں گئے ہوئے طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا

ذکر تھا اور حکومتِ موقتہ اور ایک حزبِ اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنے کی تجویز ہوئی تھی اور اس کا کام، اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہاں سے واقعات سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچا دیں۔ مولانا عبید اللہ کے خط میں حزبِ اللہ کا مرتبہ مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود الحسن صاحب کو اس کا سالار بنانا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قیسطیظیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بنانا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف صریح طور پر واضح ہے کہ یہ برطانیہ کے خلاف جو بین حکومت کا ایک منصوبہ تھا۔ بعض منچلے، جہاں دیدہ اور ہر فن مولانا ہندو اس تحریک کے سرغنہ بنائے گئے تھے۔ ہندو نواز چند علماء کو اس لیے شامل کر لیا گیا تھا کہ ان کے باعث اسلامی ملکوں کا تعاون حاصل کرنا آسان ہو جائے، جبکہ سلطنتِ عثمانیہ خاص طور پر برطانیہ سے تازہ زخم کھائے ہوئے تھی اور عام طور پر مسلمانوں کے اکثر ملک حکومتِ برطانیہ سے متنفر ہو چکے تھے۔

حالات و واقعات سے ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ اس جرنی منصوبے میں ہندو کی اولین اور مسلمانوں کی حیثیت ثانوی تھی، لیکن ہالٹ کمیٹی نے بھی اپنی اسی رپورٹ میں ہندوؤں کو خوش کرنے اور اپنی اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہل تحریک کو پان اسلامک قرار دے دیا۔ کمیٹی کا یہ فیصلہ کسی طرح بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ جن علما نے اس تحریک میں حصہ لیا وہ خود اسے پان اسلامک تحریک تسلیم نہیں کرتے مثلاً،

”اگر فقط یہ مسلمانوں کے لیے منصوبہ ہوتا تو راجہ مندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی اور حکومتِ موقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی،

جیسا کہ آگے آئے گا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ تھا تو ہر دیال کی  
گوششیں اور مولانا بركت اللہ کی اعانتیں کیا گوہی دیتی ہیں، دیکھو رولٹ رپورٹ،  
فصل پنجاب۔ (۳) جبکہ مولانا بركت اللہ کو وزیر اعظم بنانا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا  
اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا، جس میں رام چندر جیسا  
مشہور و معروف بھی ممبر تھا، تو اس (رولٹ رپورٹ) میں فقط مسلمانوں کی شورش  
کیوں ذکر کی گئی، بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی، جس میں مسلم اور  
غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا، جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمارے  
میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔  
اس تحریک کے بارے میں مزید اس سے بھی واضح تبصرہ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے  
مسلمانوں کے بڑے کاموں پر خود ان کا بڑا واضح تبصرہ ان الفاظ میں موجود ہے:  
”مولانا عبید اللہ اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے  
کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ وہ اپنی  
ڈائری کے صفحہ ۷۰ میں لکھتے ہیں ”میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ  
اُس وقت سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن  
مطالعہ نچتہ ہوا تو مجھے ہندوستانییت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی  
ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔“ خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اس  
تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی  
تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اُس کا  
عقیدہ اس سے پہلے کا ہے۔۔۔ اور اسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار  
دیتا ہے مگر رولٹ کمیٹی افراق پھیلانے کے لیے اس کو پان اسلامک کہتی ہے۔“

۱۵۱ عبد الرشید ارشد، مولوی ایس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۶۶

۱۵۲ ایضاً، ص ۲۷۷



جناب صدر دیوبند، مولوی محمود حسن صاحب کی پوزیشن کو اس سلسلے میں اگر واضح کر دیا جائے کہ وہ اس تحریک کو اسلامی تحریک سمجھتے تھے یا ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی؟ تو میرا خیال ہے کہ یہ حوالہ بارِ خاطر نہ ہوگا بلکہ انصاف پسند قارئین کے ذہنوں کی ایک الجھن کو سلجھانے اور حقیقت کو اس کی اصلی شکل و صورت میں واضح کر دکھانے کا باعث بنے گا۔

الفاظ یہ ہیں:

ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے، حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے۔ ان کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرائے پر لے رکھا تھا۔ لے

## تحریکِ خلافت

اب ذرا تحریکِ خلافت کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس تحریک کو چلانے والے کون تھے؟ قیادت کس کے ہاتھوں میں تھی؟ تحریکِ خلافت کے نام پر ہو کیا رہا تھا؟ جو کچھ اس تحریک کے نام پر کیا گیا اس سے سلطنتِ عثمانیہ کو کہاں تک فائدہ پہنچا؟ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ تحریکِ خلافت کی روح رواں مولانا محمد علی جوہر تھے۔ موصوف کی تحریک نے اسلامیاتِ ہند میں ایک نئی روح بھونک دی تھی۔ مسلمانوں کے سینوں میں انگریزوں سے نفرت کا سیلاب اُمنڈنے لگا تھا۔ فعال قوم کے اس جوش و خروش کو دیکھ کر گاندھی صاحب لپچائے، محبت کا ڈول ڈالا اور ہندو کے اُس بیدار مغز و عیار لیڈر نے اپنی قوم کو مولانا کی ہمنوائی پر لگایا۔ مولانا کوئی احسان فراموش تھوڑے ہی تھے، جب ہندو مولانا کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگے تو شکر گزاری کے طور پر موصوف نے

لے عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۸

گاندھی جی کی ہر بات پر لیبیک کہنا شروع کر دیا بلکہ تحریکِ خلافت بھی اُن کے گھر کی لونڈی بنا دی۔  
مثلاً:

”جن دنوں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا، اُنہی دنوں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا اور اس میں بھی ترکِ موالات کا ریزولیشن منظور کر کے مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لیے گاندھی جی کو منتخب کیا۔“

مولانا محمد علی جوہر کی نظر میں گاندھی جی کا کیا مقام تھا اور ایک کھلے کافر و مشرک پر تحریکِ خلافت کے بانی اور مسلمانوں کے اس بیدار مغز لیڈر کو کہاں تک اعتماد ہو گیا تھا، حقیقت تو یہی کچھ نظر آتی ہے کہ اتحاد و دوستی کا رشتہ ذہنی غلامی پر جا کر قطع ہو گیا تھا۔ یہ مشرک نوازی کی پاداش میں قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر واقع ہوا ہو تو عجب نہیں۔ اب اس آگ اور پانی کے اجتماعِ ضدین کا بلاپ اور انتہائی افسوسناک بلاپ ملاحظہ ہو:

”مولانا محمد علی جوہر اُن دنوں پوری طرح مسٹر گاندھی کے ہمنوا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکسانیت اس قدر تھی کہ دیکھ کر خیران ہوتی ہے۔ ہر ایک کو دوسرے پر پُر خلوص اعتماد تھا۔ چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں تھی، اس لیے مولانا اپنے لیڈر پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ کراچی جیل سے مولانا بیجا پور منتقل کر دیے گئے۔ راستے میں کسی اسٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے متعلق اُن سے سوال کیا... محمد علی نے جواب میں کہا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ”میں اپنے لیے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں۔“

مولانا جوہر کے پیرو مشد یعنی مولوی عبدالباری فرنگی محلّی جو گاندھی جیسے سامری وقت کے سحر سے مسحور ہو کر اُس پر ہزار جان سے قربان ہو کر، ایک جید و قہر عالم دین ہونے کے باوجود ڈنکے کی چوٹیوں کتے تھے،

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۰۲

۲۔ ایضاً: ص ۸۰۰

عمرے کہ آیات و احادیث گزشت  
رفتے و شمار بست پرستے کردی

چنانچہ موصوف کے یہی پیرو مرشد اپنے مرید کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے "عذر  
گناہ بدتر از گناہ" سے بھی آگے بڑھ کر اُس پر ماشیہ آرائی کرتے ہیں،

"لکھنؤ سے اجیر باتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں خریدار اتفاقاً  
سے اُس میں ہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباری (مولانا جوہر کے مرشد) نے  
انہیں پڑھوا کر سنا۔ اُن کے ایک رفیق سفر و حضر، جو اُس وقت بھی اُن کے ہمراہ  
تھے، بول اُٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی؟  
مولانا نے جب تہ جواب دیا "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں، وہ تو رسول  
ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اُسی  
میں شامل ہو گئے، گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ مستقل حیثیت  
رکھتے ہیں۔ نام ان ہی کا لینا مناسب تھا۔"

شاید کوئی کہے کہ مولانا محمد علی جوہر تو سیاسی لیڈر تھے عالم دین تو نہ تھے اور اُن کے مرشد خود ہی  
گاندھی کے دامِ تزویر میں گرفتار تھے لہذا ہم ان بیانات پر دارالعلوم دیوبند سے تصدیق کی مہر  
لگا دینا ضروری سمجھتے ہیں،

"اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ  
جب کسی کو تحریک کا قائد بنایا جائے دخواہ وہ شیطان ہو،۔ اخترا تو پھر  
اُس پر پورا اعتماد کرنا چاہیے۔ مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اس قسم کے  
نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے تعدد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو  
دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطہ نظر سے  
غلط نہیں ہے۔"

مولانا عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۰ء، ص ۸۰، ص ۸۰،

مکملہ ایضاً: ص ۸۰،

جب تحریکِ خلافت پورے زور شور سے جاری تھی تو ان دنوں ہندو مسلم اتحاد بھی اپنے نقطہء عروج کو چھو رہا تھا۔ انگریزوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اگر صورتِ حالات یہی رہی تو ہندوستان سے ہمیں بڑیا بستر گول کھتے ہی بننے گی۔ انگریزوں نے شرعاً حاکم کے کان میں پتھری ماری کہ ملک ان کے راجپوتوں کو ہندو بنا ڈے اگر ایسا کرے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ رہا کر دیے گئے۔ دوسری طرف مولوی محمد ایساں کا ندھلوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء) کو پانچ سو روپیہ ماہوار پر راضی کیا کہ وہ میوات کے ہندو نما مسلمانوں میں تبلیغ کر کے انہیں اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور کریں۔ حکومت کو نہ ہندومت سے عقیدت تھی نہ اسلام سے پیار۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد جو ان کے اقتدار کے لیے مستقل خطرہ بنا جا رہا تھا اسے توڑ دیا جائے۔ شدھی پر مسلمان بھڑکیں گے اور ان کی تبلیغی مساعی سے ہندو بدکیں گے اس طرح اتحاد کے بجائے دونوں تو میں آپس میں ہی ٹکرانے لگیں گی اور ہم کو کسی اقتدار پر بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں گے۔ اس انگریزی منصوبے کی کہانی، دیوبندی حضرات کی ربانی نیچے:

انگریز بڑی شاطر قوم ہے۔ تحریکِ خلافت پر اس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو نظارہ دیکھا اس کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح متحد رہتے تو ہم چہند دنوں کے مہمان ہیں۔ لہذا حکومت نے سوائے شرعاً حاکم کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا، جنھوں نے باہر آ کر شدھی کی تحریک چلائی اور ملک ان کے راجپوتوں کو شدھ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیچارے نام سکے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہذا شرعاً حاکم کی شدھی تحریک کا ان پر جملہ اثر ہوا اور وہ ہندو مذہب میں داخل ہو گئے۔۔۔۔ اور انہی دنوں مالابار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ان سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دوسرے کے خلاف بدسرپیما ہو گئے اور دونوں قوموں کی پوری توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔۔۔۔

۱۔ عبدالرشید ارتھ، مولوی ایس بی بی بی بی، ملہور، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۸۰۸

جب انگریز کا یہ منصوبہ کامیاب ہونے لگا، جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں ٹھن گئی تو وہ بڑے بڑے ہندو لیڈر جنہیں تحریکِ خلافت کی گاڑی کو چلانے والے مسلمان لیڈر اور گاندھی جی نے اپنے یار و مددگار یا اہمیان انصار اور اپنی کشتی کے ناخدا اور جماعت کے امام و پیشوا بنائے بیٹھے تھے، انہوں نے اس موقع پر اپنا کیا رنگ دکھایا؟ ان مسلمانوں کے لیڈر اور علماء دکھلانے والوں کو انہوں نے واقعی جوائی سمجھ کر سینے سے چٹایا یا ان کے کسی بڑے سے بڑے کو بھی منہ نہ لگایا۔ صورتِ حال ملاحظہ ہو۔

”مولانا محمد علی جوہر جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و انتشار نے لے لی تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترکِ موالات اور عدمِ تعاون کا جو پروگرام رکھا گیا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ شدھی نے لے لی اور ادھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت میں تبلیغی مہم شروع کر دی۔ تقریباً تمام دینی جماعتیں اور علماء، شدھی کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ علماء کا موقف یہ تھا کہ سوامی شرعاً ہند کی تحریک کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اس کا بہت بڑا دینی نقصان ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیشتر ساتھی بھی اسی تبلیغی مہم میں لگ گئے۔“

موتی لال، نہرو اور دوسرے وزراء پر یکٹس شروع کر کے اپنی اپنی وکالت و میرٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے۔ لیکن ایک مولانا محمد علی تھے جنہیں یہی دُمن قضی کہ اسی پروگرام و نصب العین کو اپنا یا جائے جس کے لیے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس پچاس ہزار افراد نے فہمی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ مولانا جوہر اگر چاہتے تو اسی رو میں بہہ کر عوامی احساسات کا ساتھ دیتے مگر انہوں نے بلا خوف و ہمت لائٹ ان حالات میں بھی کانگریس سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور کانگریس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اس کی مقبولیت بحال کرنے میں بڑا

ایک کر دیا۔“ لے

شدھی کے ذریعے چونکہ ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کیا جا چکا تھا اور کامیابی سے اُن دشمنانِ اسلام کی یہ تحریک چل رہی تھی، اسی لیے ہندو لیڈروں نے چُپ کی سادھ لی، منہ سی لیے۔ اس کے برعکس مولانا محمد علی جوہر اپنے ساتھی ہندو لیڈروں سے اپیل کرتے پھر رہے تھے کہ وہ اپنی معنی خیز چُپ توڑیں اور حالات پر قابو پانے میں مدد دیں حالانکہ اینٹ پتھر کے اُن پجاریوں نے گرگٹ کی طرح اپنا رنگ ہی بدل لیا تھا، لیکن افسوس! یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہوئے بھی مولانا کی وفاداری کس کے ساتھ رہی اور کس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے میں معروف رہے، یہ قارئین نے ملاحظہ فرما ہی لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا کی کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا:

”مولانا محمد علی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کم ہوتا گیا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس کے لیے ایک ”یونٹی کانفرنس“ دہلی میں اور ایک شملہ میں منعقد ہوئی، جس میں اکثر ہندو مسلم زعماء شریک ہوئے کئی کئی دن اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ مولانا نے سجد کوشش کی کہ کسی طرح وہ فضا پیدا ہو جائے جو تحریکِ خلافت میں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں تلخی و کشیدگی بڑھتی رہی۔ گاندھی جیسا آدمی بھی یہ کہہ کر کہ ”اب میری بات کوئی نہیں سنتا“ اپنے آشرم میں چلے گئے۔“ آئیے! اب یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کی اس ہندو نواز پالیسی کو بتدعین زمانہ اور ہندو پریس نے کس نظر سے دیکھا؟ گاندھی کے سکوت سے کیا سبق حاصل کیا، سبق حاصل کرنے کے باعث کیا نتائج برآمد ہوئے؟

”مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابلِ تعریف و تحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پریس مولانا کے اس رویے کو بنظرِ استحسان دیکھتا اور خراجِ عقیدت ادا

لے عبد الرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۸۰۹

لے ایضاً، ص ۸۱۲

کرتا، مگر ہندو زعماء اور پریس ہمیشہ مصلحت آمیز سکوت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ  
 کہتے رہے کہ مولانا جو ہر پرگانہ صی جی کا سحر ہے اور وہاں اسی سر میں سُر ملا کر  
 ہندو پریس یہ ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ علی براہم ان سے گاندھی جی پر جا دو کر دیا ہے لیکن  
 مولانا اپنے اور پرائیوں کا یہ سلوک دیکھنے اور سننے کے باوجود ہمالہ کی طرح اپنے موقف  
 پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرنے میں بھی بخل نہیں کرنا چاہیے کہ گاندھی جی کا رویہ بھی  
 منصفانہ نہ رہا۔ انہوں نے تحریک خلافت میں جو خاص اسلامی تحریک تھی بھر پور ساتھ  
 دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا۔۔۔۔۔ بات مولانا جو ہر کی استقامت  
 اور اپنے موقف پر پختگی کی ہو رہی تھی، جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں  
 غیر مقبول ہو رہے تھے۔

ہندو جنہیں اپنا دینی یا قلمی بھائی سمجھا جاتا تھا، شدھی امد تبلیغ کی تحریکوں کے سامنے آتے ہی  
 بیکرا نکھیں بدل گئے، مولانا جو ہر جنہیں اپنا قائد و امام بنائے بیٹے تھے یا جو ہندو لیڈر یہ ظاہر  
 کرتے ہوئے نہیں چھوڑتے تھے کہ وہ مولانا کے ہی دست و بازو ہیں، انہوں نے مولانا کی التجاؤں  
 پر کان نہ دھریے، ہندو پریس بھی مخالف ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خدا نے  
 وعدہ لا شریک کو سچا نہ مانا تھا، گاندھی صی علماء و لیڈر نے اس سبوح و قدوس کے اس  
 فرمان کا صادق ہونا نہ جانتا تھا کہ لا یالہ الا اللہ لا شریک لہ غیر مسلم جنہیں نقصان پہنچانے میں  
 کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ کیا یہی کچھ ہو کر نہ رہا؟ مزید بتائیے:

شدھی کی تحریک اور اس کے خطاب میں مسلمانوں کی جانب سے تبلیغی مہم کی وجہ  
 سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے ہو گئے تھے کہ  
 گاندھی جی بھی اپنے اکشدم میں معتکف ہو گئے تھے۔ ہما سبھا کے لیڈر  
 شدھی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ کانگریس کے ہندو زعماء ان حالات  
 میں مہربلب تھے لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے مشن میں لگے ہوئے تھے اور برابر

ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دیے جا رہے تھے۔ یونٹی کا فرسبیں کیں، اپنوں کی مخالفت مول لی، ہندو لیڈروں سے اپنے درجہ سے گرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ مہر سکوت کو توڑ کر مہا سجا کے لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کریں، لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بنا پر یہ جرات نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے۔ ان حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جرات کی کہ وہ ڈاکٹر موبجے، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے ایسے لیڈروں کے اتفاق کا پردہ چاک کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا اور خوب انجام دیا۔ ہندو پریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پر ورکوششوں پر سکوت اختیار کیے ہوئے تھے اب صرف اس قصور پر کہ وہ ڈاکٹر موبجے اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرنے لگے تھے۔ مولانا کے خلاف زہر چکانی کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آگیا۔

ہندو خواص و حوام کے دلوں کا کھوٹ اور افسوسناک رویہ ظاہر ہو کر عالم آشکار ہو چکا تھا، اس کے باوجود مولانا ان بُت پرستوں کی ہمدردی کو تمام دکھوں کا علاج اور آزادی ہند کے لیے نسخہ کیمیا بنانے بیٹھے تھے۔ حالانکہ مسلمان کی نظر میں آزادی کو نہیں بلکہ اسلام کو اولیت ہے۔ مسلمان آزادی پر اسلام کو قربان نہیں کیا کرتا۔ اس مسئلے کی شرعی پوزیشن اسی کتاب کی جلد دوم میں "کھلا سے دوستی" کے تحت ملاحظہ فرمائی جائے۔ یہاں دکھانا یہ ہے کہ مولانا نے آزادی وطن کے ان پلتے پھرتے بتوں اور بُت پرستوں کی رضا جوئی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا لیکن "وائے آرزو کہ خاک شدہ"۔ مثلاً:

"اس پر مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کا فرسب کا پیشل اجلاس بلایا جو حکیم اجمل خاں

لے عبدالرشید ارشد، مولوی بی بی بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۱۵



کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا اور اس میں مسلم زعمائے بالاتفاق، اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور کہا گیا کہ آزادی کی خاطر ہم ہندو دوستوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں، اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو دوست کا ہاتھ سمجھیں جو مصافحہ کے لیے بڑھاتا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف کی طرف بڑھاتا ہے۔

اس کانفرنس کے بعد مولانا جوہر وفدِ حجاز میں شامل ہو کر وہاں سے عرب کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاء و آزمائش کا زمانہ ہے، نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہندو کو مشتعل ہونے کا موقعہ دیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وہ پھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو کلندر کی یہ بات  
تو جھکا جب غیر کے آگے زمین تیرا نہ تن

جس گاندھی کی امامت کو مولانا نے ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے دستِ فضیلت یا طرہٴ امتیاز بنائے رکھا، نہرو رپورٹ کے وقت اسی گاندھی نے اور دوسرے ہندو کانگریسی لیڈروں نے جنھیں مولانا اپنی فوج کے سپہ سالاروں اور اپنے یاروں اور پیاروں میں گنتے تھے، خود مولانا کے ساتھ کیسا سلوک کیا،

مولانا محمد علی جوہر سے واپس آنے تو انھوں نے بھی اختلاف کیا اور ہندوستان پھر ایک دفعہ معرکہ کارزار بن گیا۔ تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی مگر مسلمانوں میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ

کی حمایت میں کانگریس تھی، لبرل حضرات تھے، ہندو ہما سبما تھی، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ گاندھی جی جو اب تک خاموش تھے اس مرحلے پر نہرو رپورٹ کے منظور ہونے پر وہ اس کے حامی ہو گئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی جنہوں نے ہر مرحلے پر کانگریس کا ساتھ دیا اور اپنوں کی گالیاں سنی تھیں، اب ان کے اختلاف کو کانگریس نے پرکاش کی حیثیت بھی نزدیکی اور ان کی بات سُننے سے بھی انکار کر دیا۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے عرابِ مسجد پر  
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

### جمعیتہ العلماء ہند

جب ہندو نواز علما نے اپنی سیاسی جماعت "جمعیتہ العلماء ہند" کے نام سے بنائی جو حقیقت میں کانگریس ہی کی ذیلی شاخ تھی تو مولوی محمود الحسن صاحب اُس کے صدر اور مفتی کفایت اللہ دہلوی نائب صدر یا اپنے استاد کی جگہ عارضی صدر مقرر ہوئے جنہوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۸ء تک متواتر انیس سال تک اپنی اس سیاسی جماعت کی صدارت کے فرائض سرانجام دیے اور ہندو مسلم اختلافات بلکہ دونوں قوموں کی ہنگامہ آرائیوں اور کشت و خون کے دنوں میں بھی مفتی صاحب کی دلی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ وابستہ رہیں۔ مثلاً:

حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے خلاف جب ستیہ گره کی تحریک شروع ہوئی تھی تو آپ نے اُس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ اس مقدمے کے لیے حکمتِ عملی کے ساتھ پیشہ کام کرتے رہے۔ تحریکِ خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شرما حاند نے شدھی کی تحریک جاری کی اور نہرو رپورٹ کے مسلمان تھے، مرتد کر کے

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی، جیس بڑے مسلمان، ص ۸۱۸

۲۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

ہندو بنا لیا تو حضرت مفتی صاحب کانگریس اور ہندوؤں سے بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے؛ ل

مفتی کفایت اللہ دہلوی (المتوفی ۱۳۷۲ھ) کے علاوہ باقی سارے کانگریسی علماء، ہندوؤں کو خوش کرنے اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھنے کی خاطر، اپنے ہندو بھائیوں کے مطالبے پر، خود شارع بن کر، اسلام سے مرتد کی تبلیغ کو خارج کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے دیوبندی حضرات کا اپنا بیان ہے کہ،

”شدمی اور سنگھن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے، لہذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ستمبر ۱۹۲۲ء کو اکیس دن کا بربت شروع کیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں صدر جلسہ نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے مزائے مرتد اور تبلیغ کے احکام کو خارج کر دیں۔ اس موقع پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس تجویز کی حمایت کی، مگر ہزاروں کے اس مجمع میں صرف مفتی صاحب کی ذات تھی جس نے اس متفقہ تجویز کی پرزور مخالفت کی اور شہریت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوئے؛ ل

دیوبندی حضرات کے نزدیک مفتی صاحب کی زندگی کا ایک تابناک پہلو اور موصوف کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دم واپس لین تک اینٹ پتھروں کے پجاریوں سے دوستی کا رشتہ برقرار رکھا۔

”انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انہوں نے اس راستے سے قدم نہیں

۱۔ عبد الرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۲۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۲

مولوی حسین احمد ٹانڈوی صاحب سابق صدر مدرس دیوبند (المتوفی ۱۳۷۷ھ) اپنے استاد  
مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے خلیفہ مجاز اور ہائیشین تھے۔ موصوف  
کی سیاسی سرگرمیاں بھی اسی دگر پر ہیں:

”چنانچہ آپ نے صحیح صحیح ہائیشین ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی  
تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الحدیث  
رحمۃ اللہ علیہ کی طرح خلافت کھلیٹی اور جمعیتہ علماء کی راہنمائی کے فرائض سرانجام دینے  
لگے اور عدم تشدد کے راستے پر عمل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک و قوم کی  
سیاسی تحریکات میں جوش عمل کی روح پھونکنے لگے۔“

مولوی محمود الحسن صاحب کے مشن کو ان کے ہائیشین مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے جو ہندو نواز  
لوگوں کی نظر میں شیخ الاسلام تھے، کافی آگے دھکیلا، موصوف کانگریس کے باقاعدہ ممبر بنے اور  
آخری دم تک ممبر ہی رہے، چنانچہ خود قلمطراز ہیں:

”میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا، مگر مانا سے واپسی پر کانگریس کا  
ممبر باقاعدہ ہی گیا اور ہمیشہ جتنی جہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کے  
مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ جھیلتا رہا۔“

کانگریس نے جب ترک موالات کی تحریک چلائی تو موصوف نے بھی گاندھی کے ارشاد کو آمناد  
صدقنا کہہ کر نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر عمل کرنے اور کروانے میں ایڑھی چوٹی کا زور لگایا اور اپنے دینی  
بھائیوں کے ساتھ جیل بھی گئے۔ مثلاً:

”ترک موالات کے سلسلے میں آپ نے انتھک کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

لہ عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۵۴

لہ ایضاً: ص ۴۷

لہ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۷۳

زیر دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، ۵۰۵ آپ کو اور مولانا محمد علی صاحب مرحوم، مولانا شوکت علی صاحب، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد صاحب کان پوری اور جگت گرو سوامی کرشن تیرتیبہ (شکر اچاریہ) پیر غلام مجدد صاحب سندھی کو گرفتار کر لیا گیا، لے جب کانگریس نے ستیہ گری کی تحریک چلائی تو موصوف نے پوری وفاداری کے ساتھ اُس میں بھی بھرپور حصہ لیا، مثلاً:

۱۰۔ الحاصل جب ۱۹۳۲ء میں جمعیت اور کانگریس نے ستیہ گری کی تحریک پاس کی تو آپ اس تحریک میں بھی پیش پیش رہے۔ چنانچہ جب آپ وہلی تقریر کرنے کے لیے جا رہے تھے تو مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کو گرفتار کر لیا گیا، لے

ٹانڈوی صاحب نہ صرف خود کانگریس میں شامل ہوئے اور ساری عمر بت پرستوں کے وفادار رہے بلکہ اپنے ہم مشرب لوگوں کو بھی اسی غیر اسلامی روش پر چلنے کی ترغیب دیتے رہے اور موصوف اسی کو اپنے خلوص و اہمیت کی دلیل اور اسلام و مسلمین کی خیر خواہی سمجھتے رہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلاموں کو گاندھی کا غلام بنا کر چودھویں صدی میں خود کو ابو الفضل اور فیضی کا حقیقی جانشین منوانے کی سر توڑ کوششیں کرتے رہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”اس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی تھرتھی جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسر اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لیے کانگریس کی شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس امرہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگ آزادی کی خاطر کانگریس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اس بارے میں (حصول آزادی) تعاون کیا جائے“ لے

لے عویز الرحمن نہرودی، مفتی جتندر مشایخ دیوبند۔ مطبع سعیدی کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۷۵

لے ایضاً، ص ۲۷۷

لے عبد الرشید ارشد، مولوی، میں بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۸۲

موصوف کے ان نظریات کے بارے میں عالیجناب مودودی صاحب کی رائے بھی اگر ملاحظہ فرمائی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہماری ذاتی رائے ہے کہ اس بارے میں مودودی صاحب کا موقف یقیناً قابل توجہ ہے۔ ملاحظہ ہو،

آپ کو صرف (ٹانڈوی صاحب کو) برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے، عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو، اسی لیے آپ ایسی انجمن کے معاملہ میں صرف علت جواز ہی ڈھونڈتے ہیں اور علت حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علت حرمت کو دفع کیے بغیر علت جواز کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم کو برطانوی حکومت کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں، اس کا نام اگر برطانیہ پرستی رکھنا ہے تو رکھیے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔

ٹانڈوی صاحب اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سب کو گاندھی کے قدموں میں ڈال کر، کانگریسی اور گاندھی کی بنانا چاہتے تھے، جس کا نام موصوف نے ہندوستانی رکھا تھا۔ جس طرح اکبر بھی ہندو اور مسلمان کا فرق مٹا کر سب کو ایک قوم بنانا چاہتا تھا اور دین فروش علماء میں سے ابو الفضل اور فیضی وغیرہ اُسے جواز مہیا کر رہے تھے اسی طرح دور حاضر میں گاندھی نے بھی اکبری منصوبہ شروع کیا۔ مسلمانوں کو نزدیک بلایا تاکہ ہندومت میں مدغم کیا جائے، حتیٰ کہ اپنے قدموں میں جگہ دی، خود کہ محمد رسول اللہ کی مثل کئے والوں کا غرور اگر مشرکوں اور بت پرستوں کے جوتوں میں ڈال کر نہ توڑا جاتا تو کیا پروردگار عالم و عالیان اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخوں کا ان کی بد زبانوں پر کوئی نوٹس نہ لیتا؟ گاندھی کے غلام بننے، مسلمانوں کو مشرکین ہند سے محبت و اتحاد کا رشتہ قائم کرنے اور ہندوؤں میں مدغم ہونے کی تجویز پر مہر تصدیق ثبت فرماتے ہوئے ٹانڈوی صاحب

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۳

ایندھپنی نے ملا مبارک کے فرزندوں کی طرح آیات و عادیث سے جواز مینا کیا۔ دین میں یوں جسارت دکھانا، قرآن و حدیث میں دن و ہارے کھل کر تحریفیں کرنا اگر خدا کے عذاب اور رسول کی ناراضگی کا موجب ہوگا تو ہوتا پھرے، اپنے پیشوا گاندھی جی کو تو خوش کر لیا، اپنے ہندو بھائیوں کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ موصوف اپنی گاندھی قوم کے بارے میں یوں توہین رسالت کا ارتکاب کر کے غضبِ خداوندی کو عرش میں لاتے تھے؛

’اس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی بھینس ہوئیں مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم ہی کہتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادی وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔‘

’ٹانڈوی صاحب کے اس خلاف حقیقت بیان اور نظریہ پر مودودی صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں۔  
’مولانا (ٹانڈوی صاحب) آخر فرمائیں تو کہ جس متحدہ قومیت کو وہ رسول خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آنجمل کی متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی میں سے کون سا عنصر یا یا جاتا ہے، اگر وہ کسی ایک عنصر کا پتہ نہیں دے سکتے اور میں یقینی کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی باز پرس کا خوف نہیں؟‘

’آگے مودودی صاحب اسی گاندھی قومیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں،  
’مولانا (ٹانڈوی صاحب) اس متحدہ قومیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اموہ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملک و کوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغرب کی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جوڑنے

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۴۸،

۲۔ ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی، مسئلہ قومیت، ص ۶۰

کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے بس کی بات تو نہیں، ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زاوہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بختے جانے کی امید رکھتے ہیں انہیں اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔

مصوف نے اسی سلسلے میں ٹانڈوی صاحب کو تمہایش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں حقیقت پسندی کی دعوت دی اور دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے:

کم از کم اب وہ (ٹانڈوی صاحب) امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک قہقہہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ عالمِ افراد اور فاسی اہل سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علماء کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔

ٹانڈوی صاحب نے اپنی جو بڑا گروہ گاندھوی قومیت کو شریعتِ محمدیہ سے درست ثابت کرنے اور ابوالفضل دہلوی کا حقیقی جانشین بننے کی غرض سے متحدہ قومیت و اسلام کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اسی کتاب کے دلائل اور صفحہ ۵ کی ایک عبارت پر مولانا صاحب تفسیر کرتے ہوئے، ان کے غلط موقع کو یوں سمجھاتے ہیں:

جسارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا (ٹانڈوی صاحب) نہ قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ لاکرین کے مفہم اور مدعی کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انہوں نے غور کیا ہے، نہ ان کو خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں ان کے حدود و اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کن کن راہوں سے

۱۔ ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی، مسئلہ قومیت، ص ۶۸

۲۔ ایضاً: ص ۶۹



اس دائرے میں لغو ذکر تھے ہیں، جس کو تہذیب و تمدن اور عقاید و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بات بھی میں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ مولانا حسین احمد بایں ہمہ علم و فضل، کلچر، تہذیب، پرسنل لاء وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی اُن حضرات کو یقیناً بُری معلوم ہوگی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے شوگر ہیں۔ اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔

علامہ اقبال مرحوم بھی وطنیت کے اُسی معنی و مفہوم کے قائل تھے جس کا تصور اسلام دیتا ہے۔ مثلاً:

زلا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

علامہ نے یوں تو اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اُن کے کلام سے وطنیت کے بارے میں یہ چند نکات ملاحظہ ہوں:

اس دور میں نے اور ہے، جام اور ہے، جم اور

ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

سلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیبِ نومی ہے

غارت گر کا شانہ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے

اسلام ترا دیں ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے  
 اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے  
 اقوام میں مخلوقِ خدا بھتی ہے اسی سے  
 قومیتِ اسلام کی جڑ کٹی ہے اسی سے

اس اسلامی تصورِ وطنیت کے خلاف ٹانڈوی صاحب نے بلند کر رہے تھے کہ "ملتیں اوطان سے بنتی  
 ہیں"۔ جلاؤ اکثر اقبال جیسا فرد کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ جو اباً یہ اشعار سپردِ قلم کر دیے:۔

عجم ہنوز نماند رموزِ دیں ورنہ      ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست  
 سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن ست      چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست  
 بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں بہاوست      اگر باو ز رسیدی تمام بو لہنی ست

ڈاکٹر اقبال کے مذکورہ اشعار کا گاندھوی حضرات تک پہنچا کیا ہوا، گویا مجلس میں آگ لگ گئی، سارا  
 قبیلہ بھڑک اٹھا۔ ٹانڈوی صاحب اور ان کے معتقدین نے موصوف کے خلاف ایک ہنگامہ برپا  
 کر دیا، طول طویل بحثوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ اقبال مرحوم ان دنوں بسترِ علالت  
 پر دراز تھے۔ آپ نے ٹانڈوی صاحب کی ایک دو تحریروں کا جواب تو دیا لیکن چاروں طرف سے  
 ہنگامہ آرائی دیکھ کر اس شعر پر بحث کا خاتمہ کر دیا:۔

قلندرجز دوسرے لادالہ کچھ بھی نہیں رکھتا  
 فقیر شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اس موقع پر لاہور سے نکلنے والے اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خاں بھی خاموش  
 نہ رہ سکے۔ انہوں نے علامہ اقبال کی تائید اور ٹانڈوی صاحب کی تواضع میں مندرجہ ذیل اشعار  
 سپردِ قلم کر دیے:۔

۱۔ کلیاتِ اقبال، مطبوعہ دہلی، ص ۹۶، ۹۷

۲۔ محمد اقبال، ڈاکٹر: ارمغانِ حجاز، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷۸

## حسین احمد مدنی

وطن جس کی رو سے ہے بنیادِ ملت  
 میں اُس شرع کی کر رہا پیروی ہوں  
 آہنا کا فوارہ اچھلا ہے جس سے  
 میں اُس زندگانی کی شانِ نوری ہوں  
 سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا  
 میں اُس مدرسہ کا بڑا مولوی ہوں  
 کبھی میں بھی تھا عازمِ سوتے یثرب  
 اب اس عسزم کو کر چکا ملتوی ہوں  
 کوئی قادری ہے کوئی سُھروردی  
 مرا خزیہ ہے کہ میں گاندھوی ہوں  
 مجھے لیگ سے اس لیے دشمنی ہے  
 وہ عبدالنصاری، میں عبدالقوی ہوں  
 برستی ہیں جس سے ترنگی بلائیں  
 میں اُس عرش پر آجکل مستوی ہوں

بھدوں میں چینا کو کیونکر مسلمان

کوئی میں بھی اشرف علی تھانوی ہوں

خدا اور رسول کے احکام بیان کرانے میں ٹانڈوی صاحب کس وجہ قنطارتے اور فتویٰ نویسی کی  
 شرعی اور دلیلیوں کو نبھاتے وقت خود خدا اور مخلوق کو جس کا کو کہاں بہت نظر رکھتے تھے  
 اس کی حقیقت مرودوی صاحب کے نظموں میں ملاحظہ ہو:

”میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کوسلوں اور اسمیلیوں کی شرکت کو ایک

حرام اور دوسرے دنی حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے، اس لیے کہ ان کی تحلیل و

تحریم حقیقتِ نفسِ الادی کے ادراک پر تو مبنی نہیں محض گاندھی جی کی جنبش لب کے

ساتھ ان کا فتویٰ گردش کرتا ہے۔“

ٹانڈوی صاحب اینڈ کمپنی کی ہندو لٹریچر کے زندہ دوستی پر تبصرہ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرات کے

لے بیٹہ منورہ کو از روئے احادیث ”یثرب“ کہنا منع ہے، یہاں طیبہ لکھا جاسکتا تھا۔ (انتر)

اے مراد مسٹر محمد علی جناح۔ چونکہ ان کے مخالفین ”چینا“ کہا کرتے تھے، یہاں ٹانڈوی صاحب کی زبان میں چینا

کہا ہے۔ (چینستان ص ۱۴۴) لے ابوالاعلیٰ مرودوی، مولوی، مسئلہ قومیت، ص ۶۳

خانہ ساز حکیم الامت بلکہ ان کے مجدد و ملت بلکہ جامع الجہودین صاحب کہلانے والے مولوی اشرف علی  
تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) ان حضرات کی گاندھیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:  
”جو بات گاندھی کے منہ سے نکل جائے فوراً اس کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے  
کی کرتے ہیں۔ اس تحریک میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو کسی مسلمان لیڈر یا علما  
کی ہو۔ دیکھیے ہوم رول گاندھی کی تجویز، بائیکاٹ (ترک موالات)، گاندھی کی تجویز  
ہجرت کا مسئلہ اس کی تجویز، غرض کہ جملہ تجویزیں اس کی ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے  
کہ جو اس نے کہا بتیک کہہ کر ساتھ ہو گئے۔“

مشہور دیوبندی عالم علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء) کے جتنیے مولوی عامر  
عثمانی پر ماہنامہ ”تجلی“ اپنے اکابر دیوبند کی زتار دوستی پر یوں کھل کر تبصرہ کرتے ہیں:  
”پنڈت نہرو کی ہاں میں ہاں ملانے کا سعادت مندانہ فرض بڑے بڑے علما برائیسین  
دعوائے دیوبند کو بھی بتعاقباتے دینی“ اور اپنا پڑ رہا ہے۔ اگر پنڈت نہرو  
کہہ دیں کہ دین اور سیاست کو ایک سمجھنے والے نے گدھے میں تو علماء ربانی و  
حقانی کی لپک بڑی کھپ اس پر تصدیقی دستخط کر دے گی اور جو پڑانے خیال کے  
مولوی و ملا دستخط سے گریز کریں گے انہیں زندیق و کافر ٹھہرا کر جیل میں بھجوانے کی  
ترکیبیں کرے گی۔“

۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مدرسہ دیوبند کو اپنی تشریف آوری  
سے نوازا۔ جناب حسین احمد صاحب ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) ان دنوں دارالعلوم  
دیوبند کے صدر تھے۔ حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جن حضرات کے مذہب میں اہتمام و  
تذامی اور دن تاریخ کا تعین قطعاً ناقابل برداشت اور سراسر بدعت سیئہ بلکہ قابل لوم و حرام  
و فسق ہے، وہ اپنے ان جملہ نہیات کو ایک مشرک کی خاطر کس قدر سعادت مندی کے ساتھ

۱۔ اشرف علی تھانوی، مولوی، الافاضات ایومیہ، جلد اول، ص ۸۸، ۸۹

۲۔ ماہنامہ تجلی، بابت فروری و مارچ ۱۹۵۷ء، ص ۳۵

دو طرف جائز ٹھہراتے بلکہ ان سب باتوں پر عمل کر دکھاتے ہیں۔ میلاد شریف تو ان حضرات کی نظروں میں یوں ناجائز ہے کہ اس میں سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات و کمالات بیان کیے جاتے ہیں لیکن راجندر پرشاد کے ہر عملی الاعلان بہت پرست تھا، اوصاف بیان کرنا اور تعریفی دستاویز یعنی پاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کرنا معلوم نہیں ان حضرات کے دین کا پہلا رکن ہے یا دوسرا؟ نیز میلاد شریف میں قیامِ تعظیمی تو اس لیے ان حضرات کے نزدیک بدعت و حرام بلکہ شرک ہے کہ آٹھ گونے وہ جہاں، سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم کیوں کی جاتی ہے؟ آخر یہ بیچارے نبی کی تعظیم کو بھی شرک نہ کہیں تو گاندھویت میں اور کس چیز کو شرک ٹھہرایا جائے؟ رہا مشرکوں کی تعظیم کا سوال، بہت پرستوں کے لیے تعظیمی قیام کرنا، نہ صرف خود تعظیمی قیام کرنا بلکہ اپنی ساری علمی ذریت سے کروانا، ساوہ لباس میں نہیں بلکہ خوش پوش ہو کر، کسی مجمع میں نہیں بلکہ سڑک پر دو رویہ کھڑے ہو کر، سانسے میں نہیں بلکہ دھوپ میں، خالی ہاتھ نہیں بلکہ جھنڈیاں اور ماٹولے کر۔ بسلا اس طرح کسی بہت پرست کے لیے تعظیمی قیام کیا جاتے تو اس کے جواز میں دنیا کے کس مشرک یا زنا دوست کو کلام ہو سکتا ہے؟ باری تعالیٰ شانہ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گناہوں کو دنیا میں بھی کس طرح ذیل و خوار کر دکھاتا ہے۔

كذلك العذاب وللعذاب الاخرة اكبر لو كانوا يعلمون ۱۰ اب اس پر بھی کوئی شبہ سمجھے تو یہ اس کی عقل کا قصور ہے۔ آئیے اب راجندر پرشاد کے اس دورے کی کہانی خود علماء دیوبند کی زبانی سنیں۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کی تاریخ دارالعلوم دیوبند میں وہ تاریخِ نخی دن تھا، جب دارالعلوم میں عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقباب نے صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے قدم رنجہ فرمایا۔۔۔۔۔ پر وگرام کے مطابق صبح کے آٹھ بجے جب صدر جمہوریہ اپنے میبلون سے برآمد ہوئے تو حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا طیب صاحب جو میبلون کے دروازے کے قریب کھڑے تھے، آگے بڑھے۔

۱۰ (ترجمہ) اسی طرح عذاب دیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اس بات کو جانیں۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ان حضرات کا تعارف کرایا۔

اولاً مولانا مدنی سے پھر حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہ سے صدر محترم نے مصافحہ کیا۔ حضرت مہتمم صاحب (یعنی قاری محمد طیب صاحب) نے صدر کو بار پہنایا..... آٹھ بجکر دس منٹ پر صدر محترم دارالعلوم کے لیے اپنی کار میں روانہ ہوئے۔ اسٹیشن سے لے کر دارالعلوم تک راستہ خیر مقدم کے لیے بنائے ہوئے خوشنما دروازوں اور رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ تھا..... دیوبند اور قرب و جوار کے ہزاروں اشخاص سڑک پر دورویہ صدر کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ دارالعلوم سے تقریباً تین چار فرلانگ کے فاصلے تک طلبائے دارالعلوم کی دورویہ قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہند اور بیرون ہند کے طلبہ کے علیحدہ علیحدہ گروپ بنا دیے گئے تھے، جو متعدد ماٹولے ہوئے تھے۔ جب طلبہ کی ان دلکش قطاروں کے درمیان سے صدر محترم کی کار گزرنی شروع ہوئی تو دیوبند کی نضا استقبالیہ نعروں سے گونج اٹھی۔ کتب خانہ کے معائنہ کے بعد صدر جمہوریہ ٹھیک نونبجے استقبالیہ جلسہ میں شرکت کے لیے پنڈال میں تشریف لے گئے۔۔۔ عظیم الشان اور حسین پنڈال مختلف گیلریوں میں تقسیم تھا۔۔۔ صدر محترم نے جونہی ڈائس پر قدم رکھا، پورا مجمع صدر کے احتشام میں کھڑا ہو گیا۔ حضرت مولانا مدنی نے صدر محترم کو سنہرا پار پہنایا۔ دارالعلوم کی جانب سے اللہ اکبر، دارالعلوم زندہ باد، صدر جمہوریہ ہند زندہ باد اور جمہوری ہندوستان زندہ باد کے نعروں سے صدر محترم کا خیر مقدم کیا گیا اور ضلع کے حکام کی جانب سے سرکاری رسم کے مطابق قومی ترانہ پیش کیا گیا جسے انگریزی اسکول کے بچوں نے پڑھا۔ ترانہ ختم ہوتے ہی صدر محترم اور پورا مجمع بیٹھ گیا اور جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔

سب سے پہلے دارالعلوم کی جانب سے حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے صدر محترم کی قدم رنجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ "آج دارالعلوم

کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے..... صدر محترم ہندوستان کی صرف ایک عظیم شخصیت ہی نہیں بلکہ جنگ آزادی کے ایک جانباز سپاہی بھی ہیں۔ آج وہ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے یہاں رونق افروز ہیں۔ آپ کی قدم رنجہ فرمائی پر ہمیں مسرت ہے اور ہم اس کے لیے شکر گزار ہیں۔

اس کے بعد تلاوت قرآن سے جلسہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا..... نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا، جس میں دارالعلوم کی..... باطنی روحانیت اور توکل و انابت وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے دارالعلوم کی چند ضرورتوں پر صدر محترم کی توجیہ دلائی گئی۔ صدر جمہوریہ کو یہ سپاس نامہ ایک منقش صندوق میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ جلسہ کے اختتام پر صدر جمہوریہ ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ دارالعلوم کی جانب سے دوپہر کا کھانا صدر محترم کو ان کے سیلون ہی میں کھلایا گیا۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہ اور دوسرے متعدد حضرات کھانے میں شریک تھے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صدر بھارت ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اس دورہ دارالعلوم دیوبند کی کہانی ایک فاضل دیوبند یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء) کے بھتیجے عامر عثمانی صاحب کی زبانی بھی بیان کر دی جائے۔ چنانچہ موصوف اس واقعہ یا سانحہ کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

دنیا کی مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر ۱۳ جولائی کو جمہوری ہند کے صدر جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب تشریف لائے..... جناب صدر کی آمد سے قبل تقریباً دس روز تک دارالعلوم کے تمام اسٹاف نے جس ذوق و شوق، تن دہی اور دلچسپی سے اپنے معزز مہمان کے استقبال کی تیاریاں کیں ان کا تفصیلی بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ ہمیشہ عید قربان پر دس بارہ دن کی چھٹیاں

۱۰ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، بابت ماہ ستمبر، ۱۹۵۷ء

ہوا کرتی تھیں لیکن اس مرتبہ انھیں بھی ختم کرنا پڑا اور جاری ہوا کہ تمام اسٹاٹ  
استقبالی انتظام کی تکمیل میں پوری طرح مصروف رہے۔۔۔۔۔ میرے اپنے کئی  
اقرباء مدرس میں ملازم ہیں۔ ان میں سے ایک کے ذوق و شوق کا عالم تو میں نے  
اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ علی الصبح مدرسہ تشریف لے جاتے اور پھر ساری رات تک  
ان کا پتہ ہی نہ چلتا۔ جمعہ کے دن دوپہر کا کھانا کھانے بمشکل تین بجے گھر آ سکے۔ جی  
چاہا کہ پوچھوں، کیا نماز جمعہ کی بھی چھٹی نہیں ملی؟ مگر چپ ہو رہا کہ کہیں اس کے  
مقدس جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ آخر جمعے تو برساتوں روز آتے ہیں مگر صدر  
جمہوریہ روز روز نہیں آتے۔

جلسے کی شرکت کے لیے انگریزی زبان میں نہایت نفیس دعوت نامے چھاپے  
گئے تھے۔۔۔۔۔ جلسہ اس پنڈال میں ہوا جو ہزار سے زیادہ روپے خرچ کر کے  
وسیع دارالطلباء میں بنوایا گیا تھا، بہت شاندار، معزز مہمان کی شان کے مطابق۔  
سب سے پہلے وطنی ترانہ پڑھا گیا۔ اس وقت صدر جمہوریہ اور تمام اساتذہ و منتظمین اور  
پورا مجمع کھڑا تھا۔ ترانے کے آخر تک سب کھڑے تھے اور پھر صدر جمہوریہ کی تقلید  
کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔

اب تلاوت قرآن نے جلسہ شروع کیا گیا۔ تلاوت قرآن کے وقت کھڑے  
ہونے کا رواج ہمارے یہاں نہیں ہے، اس لیے اس کا مقابلہ ترانے کے  
آداب سے نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ تلاوت کے بعد نظمیں ہوئیں۔۔۔۔۔ گلزار صاحب  
نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بتلایا کہ اگر مولانا مدنی مدظلہ دین حجازی  
کے مہبط و مخزن ہیں تو صدر جمہوریہ دین غیر حجازی کے امام و شیخ۔ ایک ولی ہے تو  
دوسرا دھرماتما۔ دونوں ہی کے فیض و برکت سے جمہوری حکومت اپنے بیش بہا  
کام سرانجام دے رہی ہے۔

انور صابری صاحب قومی و ملی خیالات کو جامہ شعر پہنانے میں جس قدر  
مشاق ہیں، وہ مشاعرے سننے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ گاندھی جی کی



مظلومانہ موت پر غالباً "باپ شہید" کے عنوان سے جو نظم انہوں نے کہی تھی اس کا مقابلہ اس موضوع کی شاید کوئی نظم نہیں کر سکی۔ نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے سپاس نامہ پڑھا۔ سپاس نامے کے آخر میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ جناب صدر جمہوریہ کی قدم رنجہ فرمائی دارالعلوم کی تاریخ کا ایک تابناک نقش ہے جس پر دارالعلوم کو ہمیشہ فخر رہے گا۔۔۔۔۔ سپاس نامے کے بعد جناب صدر جمہوریہ نے تقریر فرمائی۔۔۔۔۔ اس کے بعد محترم علمائے رسم شکر یہ ادا فرمائی۔ شیخ نے اپنی معروف صاف گوئی کو پوری طرح قائم رکھا اور فرمایا، ہم غریب ہیں، فقیر ہیں، بے نوا ہیں۔ عالیجناب صدر جمہوریہ۔۔۔۔۔ نے اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرما کر ہمیں نہایت درجہ ممنون فرمایا ہے۔

صدر محترم جلسہ ختم ہونے پر دیوبند سے روانہ ہو گئے۔ میں نے دیکھا، اُن کی فرائٹے بھرتی ہوئی کار کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کے لیے سیکڑوں لوگ اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے قرون پہلے قیس ناقہ تیلی کی طرف بھاگا ہوگا۔ کیوں بھاگتے؟ آخر صدر جمہوریہ کی کار تھی۔ دارالعلوم نے اپنے محبوب صدر کی آمد پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا۔۔۔۔۔ جناب صدر نے اپنی جیب خاص سے نقد ایک ہزار روپیہ مدرسہ کو عنایت کیا۔ چنانچہ اگلے روز جناب مہتمم صاحب نے نہ صرف یکہ کامیابی کی سٹھائی تقسیم فرمائی بلکہ جلسہ عام میں جناب صدر کی خوش اخلاقی، فراخ نظری، روحانیت، شفقت، جود و سخا، انسانیت پروری، علم و رافت اور زندہ نوازی کو بڑے وزنی۔۔۔۔۔ الفاظ میں بہت مسرت اور دلی جوش کے ساتھ سراہا۔

مشہور دیوبندی شاعر، اخبار نویس، ادیب، مقرر، لیڈر اور روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر جناب ظفر علی ناں نے شاید اسی قسم کے ہندو نوازی اور زنا دوستی کے واقعات سے متاثر ہو کر یہ شونہ تھے کہ۔

کیا پوچھتے ہو ہند میں دین ہدی کا حال  
خود عالمانِ دین بھی چھنے اُس کے جال ہیں  
کافر بھی مومنوں کے اولوالامر بن گئے  
لذت تھی جن کے خوان کی عملِ حنیذ سے  
چھوڑا جہاد کو اور اہسا کیا تسبول  
اسلام کے چمن میں صنم ہر دوار کے  
قرآن کے ترجمان ہیں کیوں بت کی طرح چھپ  
کیا انقلاب ہے کہ اساطین شرع کو  
ویراں ہے خانقاہ تو مسجد ہے پائمال  
جن کا نہیں ہے تور، وہ ہے کانگریس کی چال  
کل تک جو تھا حرم، ہوا آج سے حلال  
ہے آجکل پسند انھیں کیوں کی ڈال  
جو شیر تھے پہننے لگے لومڑی کی کھال  
پھرتے ہیں پات پات پھدکتے ہیں ڈال ڈال  
حالانکہ ہے مدینہ کے ناموس کا سوال  
دم مارنے کی گاندھی کے آگے نہیں مجال

کچھ جانتے بھی ہو کہ ہیں کیوں آج ہم ذلیل

عسم پر ہمارے ان علماء کا پڑا وبال

ٹانڈوی صاحب کے سیاسی نظریات کا اسلام سے کہاں تک تعلق تھا؟ ہنود کی محبت  
میں دہ کس درجہ سرشار ہو چکے تھے، یہ حکیم محمود احمد برکاتی کی زبان سنیے:

”مولانا حسین احمد دہلی کی قوتِ فیصلہ کے متعلق ہم اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انھوں  
نے مدتِ العمر کسی بھی سیاسی مسئلے میں ایسا بت رائے کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ ان  
کا اندازِ فکر منطقی نہیں جذباتی تھا۔ انگریز کی دشمنی میں وہ حدودِ اعتدال سے  
تجاوز کر گئے تھے اور استخلاصِ وطن کے لیے وہ ہندو قوم سے غیر مشروط  
اتحاد کے قائل تھے اور اس سلسلے میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ اشتراکِ وطن  
کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک قوم فرمانے لگے تھے۔ وطنی قومیت  
متحدہ کی تبلیغ کو انھوں نے اپنے مشن کا ایک جز بنایا تھا اور شہر شہر اس کی  
تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ زبانِ و قلم کا پر زور اس متحدہ قومیت کی حمایت میں  
صرف فرماتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار دہلی میں انھوں نے یہ گمراہ کن اور نہایت

غلامت نہایت زور کے ساتھ فرمائی کہ: اقوامِ اوطان سے ہمتی ہیں! لے

مولانا معین الدین اجیری (المتوفی ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) کی آزادی ہند کے سلسلے میں سیاسی جدوجہد کے بارے میں علامہ سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے یوں تصریح فرمائی:

”تحریکِ خلافت میں مذہبی فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران (مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی جوہر) نے قدم چوم لیے۔ جس زمانہ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدرِ جمعیتہ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیتہ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اُس وقت تحریک کی رہنمائی کے لیے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیتہ العلماء کے اجلاسِ امر و ہدیٰ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلسِ خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلسِ اصرارِ اسلام کے ڈکٹیٹر رہے۔ مسلمانوں سے بڑا برادرانِ وطن (ہنود) بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔“ لے

گاندھی جی علماء ہند جس زمانے میں کھل کر متحدہ قومیت کے مبلغ بنے بھٹے تھے۔ اُن کے نزدیک مسلم اور کافر ایک ہی قوم کے افراد تھے اور اس طرح مسلمان ہند کو ہندو اکثریت میں مدغم کرنے پر اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لارہے تھے، اُن دنوں مولانا معین الدین اجیری مسلمانوں کو یوں تلقین فرما رہے تھے،

”مسلمانوں کے لیے یہی راہِ عمل ہو سکتی ہے کہ وہ آزادی کے لیے متفقہ طور پر میدان میں آئیں، گڈ کانگرس میں شامل ہو کر نہیں، ہندوؤں کا ضمیر بن کر نہیں بلکہ جمعیتہ العلماء نے ہند برطانیہ کے خلاف جنگ کا جو پروگرام تیار کرے، اس پر

لے محمود احمد برکاتی، حکیم: معین المنطق، مطبوعہ کراچی، ص ۹۲

لے سلیمان ندوی، مولوی: معین المنطق، ص ۴۷

عمل کریں۔ یعنی برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد تو نصب العین ہے، اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے مگر یہ جدوجہد گاندھی کی قیادت میں اور کانگریس کے جھنڈے تلے نہیں بلکہ خود اپنی تنظیم اور جمعیت کی نگرانی اور رہنمائی میں۔<sup>۱</sup>

اور مولانا اجیری کی بتائی ہوئی اپنی تنظیم یعنی جمعیت العلماء ہند کا حال بھی علیم محمود احمد برکاتی کی زبانی سن لیجیے کہ یہ مسلمانوں کی کیسی رہنمائی کر رہی تھی اور کس قسم کی آزادی اس جمعیت کا سطح نظر تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

علمائے دیوبند میں سے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی کردار کو ہم نے اس لیے موضوع گفتگو بنایا کہ جمعیت العلماء کی سہارن پور سے طویل عرصہ تک مولانا ہی نے فرمائی تھی اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے تو وہ اپنی وفات تک مستعلاً و بلا انقطاع صدر جمعیت رہے۔ اس لیے جمعیت کی پالیسی کی تبدیلی میں ان کا سب سے زیادہ دخل تھا اور یہ مولانا مرحوم کا کارنامہ تھا کہ رفتہ رفتہ جمعیت علماء ہند مسلمانوں میں اس قدر نامقبول ہو گیا کہ بالفاظِ صحیح تر معضوب ہو گئی تھی کہ ۱۹۴۶ء کے معرکہ آزاد اور فیصلہ کن انتخابات میں خاص سہارن پور کی سٹیٹ سے نیشنلسٹ مسلمانوں کا نمائندہ کامیاب نہ ہو سکا اور شہید ملت خان ریاست علی خاں نے اپنے قوم پرست حریف کو اس کے مرکز میں عبرت ناک شکست دی۔ حدیث ہے کہ تقسیم کے بعد اور مسلم لیگ کے راستے سے ہٹ جانے کے باوجود آج بھی جمعیت بھارت کے عوام و خواص کی قیادت کی اہل نہیں مانی جاتی۔<sup>۲</sup>

اب نانڈری صاحب کے دستِ راست مولوی حفیظ الرحمن سیوہاری کا حال مولوی محمد ریاض صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

مولانا حفیظ الرحمن صاحب قیام پاکستان کے دیانت داری سے مخالف تھے

<sup>۱</sup> لے محمود احمد برکاتی حکیم: معین المنطق، ص ۸۹

<sup>۲</sup> لے ایضاً: ص ۹۵، ۹۴

مگر ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو گرفتِ قدر خدمات انجام دیں، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان خدمات نے ان کو امتِ مسلمہ کے ان افراد کی صف میں لاکھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری امتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخِ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔

اگر یہاں موصوف کے ہی لفظوں میں اس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ مولوی حفیظ الرحمن نے جو مسلمان ہند کی آبِ زر سے لکھنے کے قابل گرفتِ قدر خدمات انجام دی تھیں، وہ کیا ہیں؟ نیز موصوف پر کونسی امتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ کون سے اکابر کی صف میں شامل ہونے تھے، تو میرا خیال ہے کہ قارئین کرام بھی اس امر کے متنی ہوں گے۔ وضاحت ملاحظہ ہو:

”مجاہد ملت (مولوی حفیظ الرحمن صاحب) کا حسن تدبیر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو از سر نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہوں اور کانگریس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد کر لیا تھے جتنا مولانا حفیظ الرحمن صاحب اور ان کے ساتھیوں پر۔ ۹ ستمبر، ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے ان کی اتنی مخالفت کی کہ انھیں اپنی پارٹنر کی مجلسوں میں ترمیم کرنا پڑی۔ مجاہد ملت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما تھے، گاندھی جی کے دستِ راست بن گئے۔

مجاہد ملت کو سہان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔ یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ گاندھی جی کے علماء کی پوری کھیب اسلام اور کفر کے فرقہ کو فرقہ پرستی کہتے تھے۔ ابوالفضل اویسی کی طرح اسی چودھویں صدی میں ان حضرات کے خلاف نبرد آزما رہے جو یہ کہتے تھے کہ اسلام اسلام ہے اور کفر کفر ہے، اسلام اور کفر کا ملاپ اجتماعِ سنی ہے۔ ان حضرات کا پیدا کر وہ گاندھی ٹولہ اکبری دین الہی ہی کا ترمیم شدہ اور جدید

لے عبدالرشید ارتد، مولوی: میں بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۹۲۱

لے ایضاً: ص ۹۲۸



”حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم، جمعیتہ العلماء ہند کے ایک بلند پایہ  
رکن تھے۔ ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے ان عزیز دوستوں  
میں سے تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ مختصاً  
بھارت کے وزیر اعظم، پنڈت جواہر لال نہرو نے موصوف کو اپنے تعزیتی پیغام میں یوں خراج عقیدت  
پیش کیا ہے:

”مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔۔۔ ہم لوگ شروع میں دونوں  
یو۔پی۔ کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے۔  
۔۔۔ اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے  
لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ بہادر  
نیا تھے۔ جو کہتے تھے اُس میں وزن ہوتا تھا۔ ان کی بات غور طلب ہوتی تھی۔  
ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔“  
مسٹر لال بہادر شاستری جو پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد بھارت کے وزیر اعظم بنے اور ۱۹۶۲  
میں موصوف کی وفات کے وقت ہوم مسٹر تھے۔ انہوں نے ناؤن ہال دہلی کے تعزیتی جلسے  
میں تقریر کرنے ہوئے کہا:

”ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاری صاحب، گاندھی جی  
کے اصولوں پر چلتے تھے۔ گاندھی جی اس ملک میں آئے۔ اُنہوں نے  
انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ اُن کے ساتھ مل کر، اُن کے بتائے ہوئے  
اصولوں کو اپنا کر، اُن پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے  
آدمی لیڈر بن گئے۔ اُن کا ڈھنگ، اُن کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ لیکن میں آپ سے  
ایک بات ماننا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا، بہت سا

۱۔ عبد الرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۹۵۷

۲۔ ایضاً: ص ۹۵۸

پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا (سیوہاروی صاحب) ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے، تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے بالخصوص

## گاندھوی امام الہند کے کارنامے

جناب ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) اس گاندھوی قبیلے کی ممتاز و منفرد ہستی تھے۔ موصوف کی گاندھویت کے بارے میں مولوی شریف الحسن ناظر لکھنوی نے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

”ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات ہاتما گاندھی سے ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسئلہ ترک و خلافت کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر آنجناب تک بھی موجود تھے اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قائم رہا۔“

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی مرتبہ ہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کر لیا گیا۔ البتہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت و شنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بیزار تھے اور اس لیے اس مجلس میں انہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا وائسرائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے اس

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۹۵۹



تاریخی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے ہنجیال تھے، حکیم اجمل خاں مرحوم تھے۔ طعنات گاندھیت کے علمبرداروں میں موصوف سب سے قداور ہیں۔ موصوف نے اکبری دور کے ابو الفضل کا حقیقی جانشین بن کر مسلمانان ہند کو مشرکوں اور بت پرستوں کا حقیقی بھائی بنا دینے، کفر و اسلام اور بت پرست و بت شکن کا فرق مٹا دینے کی غرض سے اور اس طرح دانستہ یا نادانستہ مجبورے بھالے مسلمانوں کو ہندوؤں میں مدغم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کی مساعی جلیلہ کو صرف غلطی کی طرح مٹانے اور ابو الفضل و فیضی وغیرہ کے ناپاک مشن کو از سر نو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا، اس نظریہ کی علمبرداری کرتے ہوئے یوں اسلامیان ہند کو تلقین کرتے ہیں :

”میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا، ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں جو اسلام کے خلاف ہو، اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کار بند رہیں۔“

یہ ایک بات ہے کہ ابراہیم صاحب ۸ جنوری ۱۹۲۰ء سے رجسٹرڈ گاندھی بنے تھے لیکن ماضی قریب کے ابو الفضل اپنے زمانہ ”الہلال“ ہی سے ہندو نواز اور زنا دوست تھے۔ موصوف کا یہ رجحان ان کے دل کی کوٹھری میں ہی بند نہیں تھا بلکہ ”الہلال“ کے ذریعے بھی وہ ہندو دوستی اور متحدہ قومیت کی زور شور سے تبلیغ کر رہے تھے اور علی گڑھ کے بٹش نوازوں

لے عبدالرشید ارشد، مولوی، پیر بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۷۲۹

لے ایضاً: ص ۷۲۲

پر بھی وار کئے رہتے تھے مولوی شریف الحسن ناظر لکھنوی اس امر کی وضاحت یوں کرتے ہیں،  
 ”الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی  
 قوم اور اپنے ہر وطنوں کو دے رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک  
 متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اس کی دعوت سے ہندوستان کا اسلامی ذہن اس  
 وقت تک بیگانہ تھا۔ مولانا نے قدامت پسندی کے مخالفت قومیت کے قلعہ  
 پر حملہ کیا لیکن بظہر استقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے جنہوں نے علی گڑھ  
 کی بنیاد کو ہلا دیا۔“

مصوف کے بارے میں زمانہ قریب کی نامور شخصیت یعنی خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم کے تاثرات  
 بھی ملاحظہ فرمائیے :

”۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انہوں نے حسن نظامی کے ایک  
 کاغذ پر یہ لکھا تھا ”سب باتیں منظور ہیں باستثنائے غنکرت مسلم لیگ“۔ گویا ۲۴  
 سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں۔۔۔۔۔  
 اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی  
 طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے۔۔۔۔۔ بہر حال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان  
 کے لیے سیاسی سوج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔“

مصوف کے سیاسی عزائم و زناں دوستی کے پیش نظر، ان سے ظفر علی خاں یوں گویا ہوئے تھے،  
 ابوالکلام آزاد سے یہ پوچھتے ہیں دل جلے  
 کیا خطا کوئی بھی سرزد تم سے ہو سکتی نہیں  
 نہ روگانہی کے دل کا حال تم جانو اگر  
 کٹ کے اپنوں سے ہو جا کے تم اغیار سے  
 آجکل تم پیشوائے امت مرحوم ہو  
 تم بھی کیا پاپائے روم کی طرح معصوم ہو  
 پھر ذرا تم کو بھی قدر عافیت معلوم ہو  
 پھر یہ کہتے ہو کہ ہم ظالم ہیں تم مظلوم ہو

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۷۲

۲۔ ایضاً: ص ۷۱

ہم مسلمان ہیں، جو ہیں اور ج سعادت کے ہما  
 تم یہ کہتے ہو کہ مسلم لیگ ہے رحمت پسند  
 کیا تماشا ہے کہ نہرو جو ہمارا ترجمان  
 کیا تماشا ہے کہ ہم گاندھی کے آگے سر جھکیں  
 آئیں اس کے سایہ میں ہم کس طرح جو بوم ہو  
 تم کہاں کے ہٹلر وقت اسے مرے مخدوم ہو  
 اور غلامی کفر کی اسلام کا مقسم ہو  
 کیا قیامت ہے کہ جو حاکم ہے وہ محکوم ہو

اسے خدا راہ ہدایت اس مسلمان کو دکھا

غیرت اسلام کی دولت سے جو محسروم ہو

جناب ابوالکلام آزاد اس گاندھی قبیلے میں اتنے قد آور، رکھ رکھاؤ کے اور قابل احترام تھے کہ  
 کانگریس کے بڑے سے بڑے رکن سے اختلاف بھی کر سکتے تھے۔ راج گوبال اچاریہ،

راجندر پرشاد، پنڈت من موہن مالوی اور پٹیل جیسے حضرات کی کیا گنتی جب کہ وہ پنڈت

جواہر لال نہرو کو بھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ دو بکنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ بارہا ان

کی رائے گاندھی کی رائے سے مختلف رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی دفعہ کانگریس کے

بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو گاندھی سمیت ان کی رائے کے آگے جھک جانا پڑا۔ اس سے

صاف واضح ہے کہ وہ گاندھی صتم خانہ میں گاندھی کی پوجا ہوتی تھی، وہاں ہندو ہوں یا مسلمان

کھلانے والے سب اسی بت کے آگے سجدہ ریز تھے اور "جی حضور" کی منزل سے آگے

بڑھنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے لیکن اس پورے جگمگے میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر

آتی ہیں، جن کی اپنی رائے ہوتی تھی اور جو ہر بڑی سے بڑی ہستی سے اختلاف کرنے کی پوزیشن

میں تھے اور ان کے اختلاف کو نظر انداز کر دینے کی اس قبیلے میں جرأت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان

دو ہستیوں سے میری مراد ایک کانگریس کے سابق صدر سبجاش چندر بوش اور دوسرے سابق

صدر کانگریس جناب ابوالکلام آزاد ہیں۔ چنانچہ موصوف کی اسی انفرادیت کے بارے میں

رئیس احمد جعفری ندوی یوں رقم طراز ہیں:

"ہر خطیب اور ایشاپرداز، مدبر اور سیاست دان "انا" کے مرض میں گرفتار

ہوتا ہے۔ لیکن مولانا کی امانیت سب سے مختلف تھی۔ دوسروں کا "انا" زیادہ تر  
 ریک اور بتزل ہوتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مولانا کے "انا"  
 میں ہمالہ کی رفعت تھی، انا موٹا اور چوڑا چکلہ "انا" صرف مولانا کا حصہ تھا۔ غالب  
 کے ہوا اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں اور غالب بھی اس لیے پیچھے  
 رو جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا حلقہ محدود تھا، اسی حلقہ میں وہ اپنے "انا" کا  
 ڈنکا بجاتے رہے۔ لیکن مولانا ادیب بھی تھے، انشا پرداز بھی تھے، صحافی بھی  
 تھے، خلیف بھی تھے، عالم دین بھی تھے، سیاست دان بھی تھے، نیشنلزم  
 کے حلقہ میں بھی موجود تھے جہاں ایک سے ایک گھاگھ موجود تھا۔ لیکن وہ ادیبوں  
 کی محفل ہو یا انشا پردازوں کا مجمع، صحافیوں کا جگمگٹ ہو یا خطیبوں کی مجلس،  
 سیاست کا پلیٹ فارم ہو یا نیشنلزم کا اسٹیج، علمائے کرام کی جمعیت ہو  
 یا صوفیائے عظام کا زاویر۔ اس شخص کا "انا" کہیں بھی امام الہند، رئیس التحریر  
 اور رب الارباب سے کم پر قناعت نہیں کرتا۔

جس طرح عشق چھپائے نہیں چھپتا اور ذرا سی بے احتیاطی میں معاہدہ  
 پابد تے دگرے دست بدست دگرے تک آجاتا ہے، اسی طرح "انا"  
 نے بھی زبانے کتنے یگانہ روزگار لوگوں کے بڑے ڈبوسے، جن کی قابلیت  
 ذہانت، فراست، علم، فضل، ہر چیز شک و شبہ سے بالاتر تھی، "انا" کے  
 کثرت استعمال نے اُنہیں کہیں کا نہ رکھا یا نقل محفل بنا دیا اور نہ پھر سامان تفریح  
 لیکن مولانا کے "انا" کا یہ وصف تھا کہ استعارہ اور کنایہ سے بے پروا وہ مجسم  
 "انا" بن گئے تھے لیکن ان کے اس "انا" میں وہ دلکشی، وہ جاذبیت، وہ  
 سحر ہے کہ طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ محسن الملک ہوں یا وقار الملک، حالی ہوں  
 یا شبلی، موتی لال نہرو ہوں یا گاندھی جی، محمد علی ہوں یا شوکت علی، عمر میں  
 سب سے چھوٹے، لیکن "انا" کے پیمانے سے ناپیے تو: صر  
 طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کانگریس جیسے ادارہ میں جہاں گاندھی جی کی پوجا ہوتی تھی، جہاں موتی لال، جواہر لال اور سردار پٹیل کا طوطی بولتا تھا، جہاں نیشنلزم کے دعوے کے باوجود مکمل طور پر کمیونزم (فرقہ پرستی) کی کار فرمائی تھی۔ جہاں محمد علی (جوہر) کا چراغ نہ جل سکا، جس نے گاندھی کو گاندھی بنایا تھا۔ جہاں شوکت علی کا بھرم قائم نہ رہ سکا جس کی قوت عمل نے کانگریس کو صحیح معنی میں ہندو مسلم اتحاد کا نشان (SYMBOL) بنا دیا تھا۔ جہاں سے اجمل خاں جیسے مردِ حکیم و حلیم کو دل برداشتہ ہو کر نکلنا پڑا، وہاں ابوالکلام نامی ایک شخص کا اپنے تھوڑے باندے بلند و بالا "انا" سمیت زندگی کی آخری سانس تک موجود رہنا کانگریس کا نہیں ابوالکلام کا کمال تھا۔

جناب رئیس احمد جعفری نے یوں تو اپنے امام الہند یعنی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے عجیب و غریب پہلو بھی ظاہر کر دیے، موصوف کی امانیت کو تفصیلاً بیان کرنے کی رحمت اٹھائی لیکن یہاں پورے طرز پر بیان نہ کر پائے تھے۔ اسی لیے اس کی کتاب کے اختتامی صفحات پر "حرفِ آخر" کے تحت یوں پورا کرتے ہیں:

"ان کا "انا" سلسلہ کی طرح گہرا، ہمالیہ کی طرح اونچا اور چاند کی طرح خوبصورت تھا۔ لوگ اپنے "انا" کو سات پر دوں میں چھپاتے ہیں لیکن پکڑے جاتے ہیں۔ وہ مر جھکتے ہیں، مند بنا سکتے ہیں، اپنے لیے غلام، خادم، ہیج ریز، خاکسار، ذرہ بے مقدار، تنگ سلاط، بندہ خاص اور اسی طرح کے بہت سے لاطوں کے ساتھ "انا" کی پروہ پوشی کرتے ہیں، لیکن وہ ایک جرم کی طرح ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی پوچھے یہ کیا ہے، تو چھپائے دینے۔ لیکن مولانا کا "انا" بے پروہ ہے، بے پروہ ہے، خود سر ہے، خود ہیں بے، محدود ہے، متکبر ہے، لیکن نہایت دکش۔ اُس میں جلال و جمال کی ایسی آمیزش ہے کہ اس کی "انا" کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی دل کا دامن اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

لے رئیس احمد جعفری ندوی، آزادی، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور، باب چہارم، ۱۹۶۵ء، ص ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸

جس کانگریس میں گاندھی جی اَنَاذَبْتُكُمْ اَلَاَعْلٰی کا نعرہ لگاتے ہیں اور سب سر بسجود ہو جاتے ہیں، جس میں جواہر لال کی زبان گاندھی جی کو "باپو" کہتے کہتے سُکھتی ہے، جس کے سامنے راجگوپال اچاری جیسا منجھا ہوا سیاستہ ان سر کے بل حاضر ہوتا ہے اور پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لوگوں کے سامنے اگر وہ دن کورات کتاب ہے تو یہ "ایک ماہ پروین" کا نعرہ لگانے لگتے ہیں، جس کے سامنے کانگریس کے بڑے بڑے نیتا، مہاسبھا کے لیڈر، جن سنگھ کے رہنما، گورنر جنرل اور وائسرائے ہند، برطانیہ کا مینہ کے وزراء، برطانیہ کا وزیر اعظم، جمعیت العلماء ہند کے علمائے کرام سر نیاز ختم کرتے ہیں، وہاں ابوالکلام کہتا ہے: "میں" اور اس "میں" کا بانگین سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اُس کا "میں" گاندھی جی کو مہاتما نہیں کہتا، جواہر لال کو پنڈت جی نہیں کہتا، راجندر پرشاد اور پٹیل کو ذرہ بے مقدار سمجھتا ہے۔ اُس کا "انا" بڑے سے بڑا اعزاز جو گاندھی سے ملے کہ جواہر لال تک کو دے سکا، وہ شریک کار (COLLEAGUE) کا لفظ تھا! لہ

جعفری صاحب سمندر کی تہ سے ہمالیہ کی چوٹی تک، جمعیت العلماء ہند کے علماؤں سے کانگریسی نیتاؤں تک، نجی مجلسوں سے سیاسی اکھاڑوں تک اور تنگ اسلاف سے گاندھیوں کے ماڈرن فرعون تک، وہ کونسی جگہ ہے جہاں نہیں گئے؟ وہ کونسا فرد ہے جس سے نہ ملے، وہ بھارت کی کونسی بستی ہے جس کا وزن نہ جانچا، وہ کونسی رائے ہے جس کا بانگین نہ دیکھا، وہ کونسی خوبصورتی ہے جس کی دکھتی نظر نہ آئی اور وہ کونسی گاندھی قبیلے کی کمزوری ہے جو اُن کے احاطہ نظر میں نہ آسکی ہو۔ لیکن اس سعی تبلیغ کے باوجود جس چیز کی وسعت کا، رفعت کا، گہرائی کا، طاقت کا، جسامت کا، جعفری صاحب احاطہ نہ کر سکے۔ وہ ہے جناب ابوالکلام آزاد کی "انا"۔ اسی لیے اتنی مغز کھپائی کرنے کے باوجود آگے سر اپا استفسار بن کر یوں رقمطراز ہیں:

"ساری کتاب (INDIA WINS FREEDOM) پڑھ جائیے، معلوم ہوگا

لہ رئیس احمد جعفری ندوی: آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۲، ۲۸۳

لہ مصنف ابوالکلام آزاد۔ آزادی ہند اسی کا ترجمہ و تفسیر ہے نیز جعفری صاحب نے تبویب بھی اپنے انداز پر کی ہے۔ اختر

کانگریس کے تمام اہم فیصلے "انا" کی طبع رسا کا نتیجہ ہیں۔ تمام اہم تجویزوں کا مسودہ "انا" کا لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اُس کا "انا" ایسا ڈکٹیٹر ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ دم زون نہیں۔ اس "انا" کی پشت پر اگر کوئی قوت ہوتی تو شاید اس کی دلکشی ختم ہو جاتی۔ کلفت تو یہ ہے کہ صاحبِ "انا" ایک ایسا شخص ہے جو اقلیت کا ایک فرد ہے۔ جس کی قوم نہ صرف یہ کہ اُس کی پشت نہیں بلکہ اُس سے بزار ہے۔ جو بہت بڑا ایڈ ہے لیکن جس کے قبضے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جو کوئی بات اپنی قوم سے نہیں منوا سکتا۔ جو ایک عرصہ دراز سے اپنی قوم کے اجتماعاتِ عام میں نہ شرکت کرتا ہے نہ تقریر۔ جو اگر کانگریس سے الگ ہو جائے تو پرگاہ کے برابر اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، شامل رہے تو چھپدیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی اپنی اس کمزوری سے واقف ہے اور اُس کے شرکاؤ کار (COLLEAGUE) بھی۔ لیکن پھر بھی دم خرم کا یہ عالم ہے کہ اُس کا "انا" ان لوگوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جو اپنی عظیم اکثریت رکھنے والی قوم کے ہاتھ میں، شاہِ بے تاج ہیں، جن کے ایک اشارہ پر خون کی ندیاں بہ سکتی ہیں، جن کے ایک نظرِ انقلاب آسکتا ہے، جن کا ایک بول بغاوت برپا کر سکتا ہے، جن کے پاس دولت بھی ہے، سرمایہ دار اور مالکانِ بل بھی ہیں، لیکن اس "انا" کی جیب خالی ہے۔ کسی سرمایہ دار سے اُس کو بارانہ نہیں، کسی بل مالک سے اُسے سروکار نہیں اور اگر ہو بھی تو اُس کی خودداری اُن سے استہزاء کو اپنی توہین کہتی ہے۔ اِن حالات میں اِس بے مثل و بے نظیر اور حسین و جمیل "انا" کی یہ جرات، پیداوار، بیوجانہ دیکھیے کہ سب سے اونچا بیٹھا ہے، سب سے اونچا رہتا ہے۔۔۔ ہر طرح کے فکری اور سیاسی اختلافات کے باوجود

... دیکھیں سو یا نہیں؟

لے رئیس۔ محمد جعفری، آزادی ہند، مطبوعہ ۱۱ ہور، بار چارم، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۲، ۲۸۵

جعفری صاحب نے ابوالکلام آزاد کی بیکسی اور گاندھی کی شہنشاہی کے تحت جو موصوف کی "انا" کے بارے میں رائے قائم کی ہے، کم از کم راقم الحروف اسے درست تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر صورت حال یہی ہوتی تو مولانا محمد علی جوہر کی طرح ابوالکلام آزاد کو بھی نظر انداز کیا جاسکتا تھا جیسا کہ پیشتر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب نہ صرف گاندھی نے بلکہ کانگریس کے جملہ ہندو لیڈروں نے مولانا جوہر کو پرکاش کے برابر ہی حیثیت نہ دی اور ان کی بات تک سننے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ ان دنوں ہندو نہ سہی مسلمانوں کا تو ان کے ساتھ ایک سیلاب تھا۔ علی برادران کو نظر انداز کر دینے کے بعد لیڈروں کا معاملہ تو صاف ہوا، باقی رہ گئے گاندھی و علماء۔ ان مسکینوں کی کانگریس کے اہم معاملات تک رسائی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی، خواہ یہ پیش خویش شیخ الہند و شیخ الاسلام بنتے پھرے یا مجاہد ملت و امیر شریعت۔ یہ صرف کانگریس کے فیصلوں پر انگوٹھا دستخط کرنے والے تھے اور گاندھی و نہرو کے ارشادات کو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنے والے اور بس۔ اہم مواقع پر ان بیچاروں کو کانگریس نے کبھی بلانے اور ان سے مشورہ تک لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

اب وسعت معلوم کرنی ہے ابوالکلام آزاد کے "انا" کی۔ یہ اُس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ گاندھی کے عزائم کیا تھے اور ابوالکلام آزاد نے اپنی ساری اور گونا گوں قابلیتیں کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ ان دونوں حضرات کے مدعا و مقصد کا پتہ لگتے ہی گاندھی امام الہند کا "انا" پورے طور پر واضح ہو جائے گا، جس سے رئیس احمد جعفری جیسے حضرات کی حیرانی خود ہی دور ہو جائیگی۔

گاندھی کو جب مولانا محمد علی جوہر جلیسوں نے گاندھی بنا کر ہندوستان کا سرکردہ لیڈر مان لیا اور تحریک آزادی کے ہر ٹولے نے اُسے اپنا قاید، رہنما، پیشوا اور امام بنا لیا، تو گاندھی کی منزل مقصود نزدیک سے نزدیک تر آتی جا رہی تھی۔ وہ منزل مقصود کیا تھی؟ یہی کہ ہندوستان کے مالک بلا شرکتِ غیر ہندو اور صرف ہندو رہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ ایسی پالیسی وضع کرتا تھا کہ جس سے اُس وقت کے حکمران یعنی انگریز ہندوستان سے بوریابستر گول کر کے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے بعد رہ جائیں گے سابق حکمران



یعنی مسلمان، اور ان کے مذہب میں شامل ہو جانے والے تو انہیں بہلا چھٹلا کر دوستی و ہمدردی کا جھانسا دیا جائے۔ نزدیک آنے پر اپنا مقصد حاصل۔ اس قرب و اتحاد سے جن باتوں کی گاندھی کو توقع تھی ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بت شکن اور بت پرست کا فرق ختم ہو جائے گا۔

۲۔ توحید کے پرستار جب بت پرستوں سے دوستی کرنے لگے تو جذبہ توحید خود ہی ان کے دلوں سے محو ہو جائے گا۔

۳۔ ہنود کے دوست بننے والے اگر ہندو نہ بھی بنے تو نہ سہی، لیکن مسلمان بھی نہ رہ سکیں گے۔

۴۔ انگریزوں سے ٹکراؤ کی صورت میں مسلمانوں کا دعویٰ کرنے والوں کو مقابلہ پر چھوڑ کر خود انہما کے پجاری اور امن کے دیوتا بن جایا کریں گے۔ اس سے حکومت کا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا جو ہر طرح ہندو کا فائدہ کہ مسلمان انگریزی اقتدار کی دہلیز پر ملکر ماریں گے تو دہلیز ٹوٹے یا مسلمان کا سر چھوٹے، دونوں صورتوں میں مشرکین ہند اور اینٹ پتھر کے پجاریوں کی پانچوں گھی میں اور سر کڑا ہی میں۔

۵۔ انگریزوں کے بیک بینی و دوگوش نکل جانے کے بعد ہندو اقتدار کو پہنچ کرنے والا کوئی نہیں رہے گا، کیونکہ جن مسلمانوں سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ خود ہی زنا ر دوست بکہ ہنود کے غلام اور گاندھی کے بندہ بے دام بنے ہوئے ہوں گے۔  
پھر خطرہ کیسا؟

۶۔ گاندھی نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی سرحد تاندک طرح اسی لیے تو کوئی تحریک کھلم کھلا شروع نہیں کی تھی کہ اس نے انقلاب، ۱۸۵۱ء سے سبق سیکھ لیا تھا۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے منصوبے پر جب عمل کرنا شروع کر دیا تھا تو نتیجہ مکمل بغاوت پر منتج ہوا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اس منصوبے کو ترک کر کے ایسی تعلیم و تہذیب کو رائج کرنا شروع کر دیا، جس نے پڑھے لکھے باشندگان ہند اور خصوصاً اسکولوں کالجوں میں

پڑھے ہوئے مسلمانوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اور اس طرح پُرانی قوم کی جگہ ایک نئی قوم نے ہی جنم لے لیا۔ گاندھی بھی اسی طرح اتحاد اور دوستی کے چکر میں پھنسا کر مسلم قوم کی نسل کو اپنے انداز پر بدلنا چاہتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ ہمارے گاندھی علماء بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اس شمع طواغیت پر، خود ہی برضا و رغبت اور اُس سامری وقت کے سحرے مسحور ہو کر یہ کہتے ہوئے پروانہ وار تار ہو رہے تھے اس

میں آپ ہی سر شوق سے مقتل میں جھکاؤں

لے جان اگر خنجرِ تسلیم تمہارا

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابوالکلام آزاد کیا چاہتے تھے؟ کیا وہ بھی گاندھی کی جادوگری کا شکار ہو گئے تھے؟ احقر کا جواب (قطع نظر اس کے کہ وہ کسی کی نظر میں صحیح ہے یا غلط) نفی میں ہے۔ ابوالکلام اور گاندھی کی پہلی ملاقات ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوتی ہے لیکن آزاد صاحب اس ملاقات سے پہلے متحدہ قومیت کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست مبلغ تھے۔ موصوف اپنے اس سیاسی و دینی نظریہ کی "الہلال" کے ذریعے کھل کر تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو دورِ حاضر کا ابوالفضل بن کر برابر اُغرب کر رہے تھے کہ وہ ہندوؤں کو بھی اپنا بھائی سمجھیں اور یہ خیال قطعاً دل میں نہ لائیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو الگ۔ نہیں، بلکہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہندوستان کے سارے باشندے ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور اُس قوم کا نام، ہندو یا مسلمان نہیں بلکہ "ہندوستانی" ہے۔ ابوالکلام آزاد اپنے مخصوص نظریات و عزائم کی بنا پر اپنے دور کے ابوالفضل بن کر اکبر اعظم کی تلاش میں تھے اور ادھر گاندھی جو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا، اُس نے اس مقام پر پہنچ کر ماڈرن اکبر اعظم بننے کی غرض سے اُس کے "دین الہی" کو گاندھویت کی شکل میں پورے ملک پر مسلط کرنے کی غرض سے اپنے دور کے ابوالفضل کی راہوں میں دیدہ و دل فرس رہا کیے ہوئے تھے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو گاندھی اور ابوالکلام ملے نہیں نہیں، اپنے دور کے اکبر اعظم اور ابوالفضل ملے۔ دونوں بامراد ہو گئے۔ اکبر اعظم کو اپنا ابوالفضل مل گیا اور ابوالفضل کو اپنا اکبر اعظم ہاتھ آ گیا۔ نہ گاندھی ابوالکلام کا مرید تھا

نہ ابوالکلام گاندھی کا۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کی مراد تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے عزائم کی تکمیل کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ اگر منگل اعظم اور ابوالفضل اکٹھے نہ ہوتے تو تاریخ کے اوراق میں ”ویں الہی“ کا نام تک نہ آتا، اسی طرح اگر گاندھی اور ابوالکلام بل جمل کر ایک ہی منزل پر گامزن نہ ہوتے تو ”گاندھویت“ کے نام سے بھی ابناٹے زمانہ کے کان نا آشنا رہتے۔ ظفر علی خاں نے اسی لیے تو کہا تھا:۔

کہرے یہ اُن سے بھول گئے کیوں حرم کو آپ  
آئیں ابوالکلام جو دروہا سے گھوم کر آئے

شاید پرنس احمد جعفری صاحب نے یہ محسوس کر ہی لیا ہوگا کہ ابوالکلام آزاد کے ”آنا“ میں اتنی وسعت کیوں تھی اور مصوف کی جملہ کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود کانگریس کا کوئی ہندو لیڈر تو کیا خود گاندھی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، بلکہ وہی گاندھی جس کی اس تھے صنم خانے میں منگل اعظم کی طرح پرستش ہو رہی تھی بعض اوقات اُسے بھی ابوالکلام آزاد کی رائے کے آگے جھک جانا پڑا۔ ابوالکلام کو رد کر کے گاندھی کی لیڈری میں تو واقعی کوئی فرق نہ آتا لیکن جس گاندھویت کی خاطر وہ مہاتمانی کا ڈھونگ پچائے پھر رہا تھا اُس کا شاید کہیں نام و نشان بھی نہ ملتا۔ یہ گاندھی ابوالکلام اتحاد کی حدیں محض دوستی و تعاون پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ دونوں میں جسم و روح اور لازم و ملزوم کا رشتہ تھا جس کے تحت دونوں ایک جان اور دو قالب ہو گئے تھے اور زبانِ حال سے ایک دوسرے کو مخاطب کر کے یوں کہا کرتے تھے:۔

من تُو شُدَم ، تُو من شُدی ، من تُو شُدَم ، تُو جاں شُدی

تا کس نہ گوید بعد ازاں ، من دیگر م ، تُو دیگر ی

موسوف کی وفات پر مشہور ہندو لیڈروں کی کیفیت کیا تھی، یہ شورش کشمیری ایڈیٹر چٹان کی زبانی سنئے:

پنڈت جواہر لال نہرو سراپا گرہ تھے۔ انھیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے، لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لیے دوڑے پھر رہے تھے۔ تمام کوٹھی کے وسیع باغات انسانوں سے اٹ چکے تھے لیکن لوگ اندر آنے کے لیے دروازہ پر ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضا کار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے اور جب جنازہ اٹھانے کے لیے اُن کو بلایا تو اُن کی نظریں ہمبرکاب سیکورٹی آفیسر پر رک گئیں۔ استفسار کیا، آپ کون؟ جواب بلا، سیکورٹی آفیسر، آپ کی حفاظت کے لیے۔ پنڈت نہرو نے کہا، کیسی حفاظت، موت تو اپنے وقت پر آتی ہے، بچا سکتے تو مولانا کو بچا لیتے۔ یہ کہہ کر پنڈت نہرو ہلک ہلک کر رونے لگے۔

پون بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کنڈھاء عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا جب کلہ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفر اُکا ندھادیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، خان محمد یونس خاں، مسٹر کرشنا مینن، مسٹر پرپودو چندر اور بخشی غلام محمد نے احاطہ سے باہر میت کو نوپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو دمہ کے مریض ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویر یا س بنے کھڑے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، "آج ۳۸ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا۔ مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔"

پنڈت نہرو کی بچی بندھ گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اٹھے۔ تمام فضا میں نالہ ہائے شیون تیرنے لگے۔ . . . جنازے کی گاڑی میں سرہانے کی سمت دائیں رخ پر پنڈت نہرو اور بائیں طرف پر صدر کانگرس دھیر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جنرل شاہ نواز، دھیر بھائی کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر ہمایوں کبیر موجود تھے۔

لے عبدالرشید ارشد، مولوی بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۶۔

موسوف کو کون سے مسنون طریقے کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ اس آخری جلوس میں زیادہ تر کونے عقیدت مند حضرات شامل ہوئے۔ یہ بیان بھی شورشِ کاشمیری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیں،

نیت پرکندر کا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپیٹی ہوئی تھی جس پر کشمیری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدرِ جمہوریہ اور نائب صدرِ کار میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزرائے عظمٰی اکثر صوبائی گورنر اور غیر ملکی سفارتی نمائندے چلے آ رہے تھے۔ جہ ساری افواج کے چیف آف اسٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے۔۔۔۔۔ پرڈیگراؤنڈ میں محاط سے محاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف علماء و حفاظِ قرآن مجید پڑھ رہے تھے، دوسری طرف اکابر و فضلاء سر جھکائے کھڑے تھے یہاں سب سے پہلے بڑی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں ہوائی فوج کے تین سو جانبازوں اور بڑی فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے عسکری بانگپن کے ساتھ میت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجکر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔

ادھر نمازِ جنازہ پڑھائی جا رہی تھی ادھر پنڈت نہرو قبر کے قریبے شہین پر بیٹے تک تک دیکھ رہے تھے۔ امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزار ہا ہندو و سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے تعزیتی بگل بجائے۔ تاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں پیرا شکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے لحد میں اتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا۔ ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سیل میں بھگو کر پھول پتھار کیے۔ پنڈت نہرو نے گلاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے، لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بلب بلب کر رہے تھے۔

لے عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۷۷

گاندھی نے تو ان حضرات کے بقول شہادت پائی تھی لیکن ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ گاندھی اور ابوالکلام آزاد میں سے کس کا مرتبہ اونچا رہا کیونکہ ابوالکلام آزاد یقیناً شہادت سے محروم رہے تھے۔ بہر حال اس تاریخ ساز ہستی کے متعلق گاندھی حضرات کا مندرجہ ذیل تبصرہ بھی نظر انداز کرنا ظلم ہوگا:

”گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا متزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حسرتناک موت سے ہوا۔ انھوں نے ۵۴ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کے پس کردار کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔“

مصوف کی وفات پر بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ: ”ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاستدان، ایک مسلم قوم پرست، ایک مایہ ناز محب وطن، جنگ آزادی کے ایک سپہ سالار اور ایک عظیم رہنما کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ جس کا مشورہ مشکل اوقات میں قوم کے لیے ہمیشہ ہی مشعلی راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی، جس سے انھیں بے حد پیار تھا، آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔“

بھارت کے دوسرے صدر ڈاکٹر ادھا کرشن نے مصوف کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں ان کی خدمات کا وزنی الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا ہے: ”مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے، مفکر اور اسکالر تھے، بچے مسلمان تھے اور پرجوش محب وطن۔ ان کی سیرت کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں سہی

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۷۷

۲۔ ایضاً، ص ۷۷

لیکن پڑانہ کی۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اُس نصب العین کو کلیجے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیے۔" لے

بھارت کے وزیر داخلہ پنڈت گو بند و لہچہ پنڈت نے اپنی تعزیتی پیغام میں یوں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں،

"ایک زندگی جو ایک مقصد کے لیے وقف تھی ختم ہو گئی۔ ایک عظیم انسان جو ہر لحاظ سے عظیم تھا ہم سے جدا ہو گیا۔ مولانا آزاد جیسی بستی میں پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملے گی۔ ہندوستان کی گزشتہ برسوں کی تاریخ بتائے گی کہ اس میں مولانا نے کتنا حصہ لیا تھا۔ انہوں نے تحریک آزادی کے وقت برسوں تک کانگریس کی رہنمائی کی۔ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم الشان انسان تھے۔" لے

پنڈت جواہر لال نہرو ایک بُت پرست تھے اور ابوالکلام آزاد مسلمان کہلانے والے بلکہ اپنے حلقے میں "امام الہند" تک مشہور تھے اور اپنے موحد ہونے پر بھی نازاں تھے۔ حالات نے یہ بتایا اور دکھایا کہ ایک توحید پرست کی موت پر ایک مشہور زمانہ بُت پرست اس طرح بک بک کر روتا اور بے قابو ہو جاتا ہے جیسے کوئی عاشق صادق اپنے معشوق کی لاش کو دیکھ کر۔ موحد اور بُت پرست کے عشق کی کہانی، مرنے والے کی زبانی سنیے،

"جواہر لال نہرو میرے (ابوالکلام آزاد کے) محبوب ترین دوست ہیں۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی دوسرے فرد سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کیا تھا، مصائب برداشت کیے تھے اور آزادی ہند کے بعد سے تو وہ ہماری قومی زندگی اور

لے عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۴۷،

لے ایضاً: ص ۴۷،

ارتقاء کا نشان بن گئے ہیں! لے

جناب ابوالکلام آزاد نے دوسری جگہ اسی تعلق خاطر اور دلی لگاؤ کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے، شروع ہی سے جب کانگریس میری سرگرمیوں کا مرکز بنی، میں اور جواہر لال بہترین دوست تھے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی تائید پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان رقابت یا حسد کا سوال کبھی نہیں پیدا ہوا اور میرا خیال تھا کہ ایسا کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔ حقیقت و آقا یہ ہے کہ نہرو خاندان سے میرے تعلقات کی تاریخ پندرہت موقی لال نہرو کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے بھی میں جواہر لال کو ایک بھائی کے بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور وہ بھی اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے میرا احترام کرتے رہے! لے

ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کے خیالات اور جذبات ایک ہی تھے۔ کانگریس کی صدارت کے لیے اسی لیے موصوف کو اپنے بعد جواہر لال سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

”دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو، میں (ابوالکلام) چاہتا تھا کہ ایسا آدمی منتخب ہو، جو میرے خیالات و جذبات کا حامل ہو اور میری قیام کی ہوئی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جواہر لال سے زیادہ موزوں آدمی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل کو میں نے اس مفہوم کا ایک بیان شائع کیا اور کانگریسی اصحاب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہر لال کو منتخب کر لیں۔ گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے لیکن جواہر لال کا نام جب میری طرف سے پیش ہو گیا تو انہوں نے سبک طور پر

لے رئیس احمد جعفری، آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۷

لے ایضاً: ص ۲۹۲



پھر اپنے خیالات اس سلسلہ میں ظاہر نہیں کیے : لے

لیکن دوسرے ہندو زعماء، کانگریسی لیڈر اور اراکین سلطنت بھی ان کی موت کو گاندھی کی موت کے بعد سب سے بڑا سانحہ شمار کر رہے تھے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندو لیڈر اپنی اکثریت کے گھمنڈ میں دوسری اقوام خصوصاً مسلمانوں کا سب کچھ چھین لینا چاہتے تھے۔ ان کے اس منصوبے کو جتنی مدد ابوالکلام آزاد سے ملی اتنی پورے ایک سو ہندو لیڈروں سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات پر کاری ضرب لگانے سے موصوف کبھی نہیں بچکھائے، اسی لیے ہندو قیادت ان کی قدردانی کی مالا پھینے لگ جاتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اندرون خانہ وہ بھی موصوف کو جسٹریٹنگال یا صادق دکن ہی سمجھتے ہوں۔ لیکن ہندوؤں کو چونکہ ان کی ذات اور ان کے مشن سے بڑی تطویر پہنچ رہی تھی اور آج تک پہنچ رہی ہے، اس لیے وہ لوگ ابوالکلام جیسے عین کی تعریف میں سبیل سے کیوں کام لیتے ؟

ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۹۴۵ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے ۱۷ کانگریس نے ۱۹ سیشن پنجاب سے حاصل کیں۔ بیعت العلماء ہند نے دو اور آزاد امیدوار نے ایک نشست حاصل کی، پانچ حلقے مشترک تھے۔ گریا کانگریس سے تو پنجاب میں پھر بھی مسلم لیگ ہی بازی لے گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی کوئی پیش نہ گئی۔ لیکن ابوالکلام آزاد کا تاریخی کارنامہ، جو اس موقع پر انجام دیا گیا، ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا، وہ یہ ہے۔

میں (ابوالکلام) نے پنجاب میں جو کچھ کیا تھا، وہ یہی تو تھا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ گورنر مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے پر تلا ہوا تھا، کانگریس کو بھی ایوان وزارت میں دھکیل کر پہنچا دیا۔ یہ میرے ہی مساعی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ نظر انداز کر دی گئی اور کانگریس اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عنصر بن گئی۔ لے

لے رئیس احمد جعفری، آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۰

لے ایضاً: ص ۲۹۴

موسوف اس مسلم دشمنی کے کارنامے پر نازاں اور اپنے ہندو بھائیوں کی واہ وا کے شور میں مست ہو کر فرماتے ہیں:

یہ پھلا سرق تھا کہ پنجاب میں کانگریس شریک حکومت بنی۔ یہ بات ایسی تھی جو اب تک ناممکن سمجھی جاتی رہی۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں نے اعتراض کیا کہ میں نے غیر معمولی صلاحیت اور تدبیر کا ثبوت دیتے ہوئے پنجاب میں وزارت سازی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملک کے مختلف اطراف و جوانب سے مبارکباد کے تاروں کی بھر پور بھر مار ہو گئی۔ نیشنل ہیرالڈ نے جو یو۔ پی۔ کانگریس کا ترجمان ہے، مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایسا طرز کار اختیار کیا جس سے پنجاب کا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ اس اخبار نے تو میرے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ پنجاب کے حالات کو اس طرح مسٹھی میں لے لینا میری صلاحیت اور تدبیر کی ایسی شاندار مثال ہے، جس کی نظیر اب تک کسی کانگریسی لیڈر کے ہاں نظر نہیں آئی۔

موسوف کے اس عظیم الشان کارنامے پر رئیس احمد جعفری کا تبصرو بھی پڑھنے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں:

”مولانا (ابراہیم کلام) کے اس کارنامے کی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں تقریباً ساری مسلم نشستوں پر اگرچہ لیگ نے قبضہ کر لیا تھا اور اردو نے اخلاق و ایمیں اسے تشکیل وزارت کا حق تھا، لیکن مولانا نے سرخضریات خاں اور ان کے تین چار ساتھیوں کو قربانیاں اور برقی وغیرہ کو مسلمانان پنجاب کا نمائندہ تسلیم کر لیا۔ کانگریس کو، سکھوں کو اور دوسرے غیر مسلم عناصر کو، خضریات کا پشت پناہ بنا دیا۔ مسلمانوں کی اکثریت چونکہ عددی تھی لہذا مبینہ غداروں کو اپنے ساتھ ملا لینے کے بعد مولانا نے درحقیقت کانگریسی بظاہر یونینسٹ حکومت

لے رئیس احمد جعفری: آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۸، ۳۱۹

قائم کراوی۔

مولانا ہندوؤں کے شورِ مبارک باد سے اتنے مسح ہوئے کہ انہوں نے  
 یہ نہ سوچا، اس طرح وہ پاکستان کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے سوچا اور  
 بجا طور پر سوچا کہ جب اس طرح ہماری اکثریت چال بازیوں کے باعث اب اقلیت  
 بنائی جاسکتی ہے تو سارے ہندوستان کی عنانِ اقتدار ہاتھ میں لے لینے کے  
 بعد مسلم اکثریت کے صوبے بالکل کانگریس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ وہاں وہی  
 حکومت بن سکے گی جو کانگریس کی منظور نظر ہو۔

موصوف نے اسی وزارت سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے اس طرح تجزیہ کیا ہے:  
 "واقعی مسلم لیگ عوامی جماعت تھی، اس سے اشتراک و تعاون کانگریس کے  
 شایانِ شان تھا لیکن یونینٹ جماعت، جس نے ہمیشہ کانگریس کے سر پر ڈونڈ  
 برساتے تھے، کانگریس کی برتھریک کو پوری بہیمیت سے کچلا، جس نے کانگریسی  
 لیڈروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیجا، جس نے انگریزوں کی حمایت اور جہاں نشاری  
 میں اپنے ملک، قوم اور وطن سے غداری کی، جو صرف جاگیرداروں اور بڑے  
 بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی۔ جس میں سرور، خان بہادر، رائے بہادر بھرے  
 ہوئے تھے۔ جس کے ارکان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی  
 بھولے سے بھی کسی عوامی تحریک میں حصہ لیا ہو۔ جس نے ہمیشہ انگریزوں کی  
 وفاداری پر قوم اور ملت کی وفاداری کو ترجیح دی۔ محض مسلم لیگ کو زک دینے  
 کے لیے ایسی جماعت سے ساز باز کرنا اور سازش سے کام لے کر اس کی  
 وزارت بنوا دینا، یقیناً مولانا کا ایسا کارنامہ تھا جس پر ہندوؤں کی مسترت  
 جماعتی، جس پر مولانا بھی فخر کرنے میں، لکھن ہے حق بجانب ہوں لیکن ملت  
 اسلامیہ کا جہان مک تعلق ہے، اس نے نفرت اور حقارت کے ساتھ اس

کارنامہ کو دیکھتا تھا۔ یہ کارنامہ اُس کی نظر میں بالکل ایسا ہی تھا جیسے جعفر و صادق کا<sup>۱</sup>۔ جب کانگریس نے مسلم لیگ اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تو خوش قسمتی سے مسلم لیگ کو وزارتِ مال کا عہدہ مل گیا۔ کانگریس نے یہ عہدہ اس غرض سے مسلم لیگ کے سپرد کرنے کی پیشکش کی تھی کہ اُن کے خیال میں اسے سنبھالنے والا آدمی مسلم لیگ کے پاس کوئی نہیں تھا لہذا انکار کر دے گی اور اس طرح مسلم لیگ اور مسلمانوں کو مرکز میں قابل ذکر عہدوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ مسلم لیگ نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ خاں لیاقت علی خاں اس پر فائز کیے گئے۔ لیاقت علی خاں نے اپنے رفقاء کے کار کی مدد سے اس ہوشمندی سے یہ کام چلایا کہ کانگریس کی ساری مشینری کو معطل کر کے رکھ دیا۔ ہٹے سے ہٹے بند و عہدیدار بھی بے بس ہو کر رہ گئے۔ اور آخر میں بجٹ وہ پیش کیا کہ ہندو لیٹروں یعنی صنعتکاروں اور مہاجنوں کے سارے پیسے و ختم نکال کر رکھ دیے اور بتا دیا کہ سارے مسلمان کھلانے والے ابوالکلام آزاد اینڈ کمپنی جیسے ملت فروش نہیں ہیں جنہیں ہندو آنکھ دکھا کر یا مینٹھی گولیاں کھلا کر بھگل سکتے ہیں بلکہ ان میں اکثریت اُن غیور مسلمانوں کی ہے جنہیں نگلنا انتہائی مشکل اور بڑی ہی ٹیڑھی کیر ہے۔ لیاقت علی خاں کی اس کارگزاری کو ابوالکلام آزاد کی زبانی سے سن لینا چاہیے:

”محکمہ مالیات کی باگ مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی، گویا نظم و انصرام کی کنجی اُس کے پاس تھی۔ محکمہ مالیات میں چند نہایت قابل اور سینئر مسلم حکام موجود تھے، انہوں نے لیاقت کو ہر ممکن امداد دی۔ اُن کے مشورے سے لیاقت علی ہر اُس تجویز کو مسترد یا مؤخر کر دیتے تھے جو ایگزیکٹو کونسل کے کانگریسی ممبران کی طرف سے پیش کی جاتی تھی۔ سسرار پٹیل نے خود ہی یہ انکشاف کیا کہ اگرچہ وہ وزیر داخلہ ہیں لیکن لیاقت علی کی مرضی کے بغیر وہ ایک چہرہ اسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ کانگریسی ممبروں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں۔“

۱۔ رئیس احمد جعفری، آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۵

لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا وہ انہی اصولوں پر مبنی تھا جو کانگریسی لیڈروں کے اعلانات اور اُن کی پالیسی سے بالکل ہم آہنگ تھے۔ موصوف کے اصولوں کی کانگریسی زعماء نے بھی تائید کی۔ لیکن وہ اعلانات منافقت پر مبنی تھے اور یہ بجٹ اُن کی عملی تصویر تھی۔ مثلاً ابوا کلام آزاد یوں وضاحت کرتے ہیں:

”ہم خود یہ چاہتے تھے کہ تقسیم دولت زیادہ سے زیادہ مساوی بنیاد پر ہو اور ٹیکس سے بچنے والے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کیا جائے، لہذا بنیادی طور پر ہمیں لیاقت علی کی تجویز سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب انہوں نے کاہنہ میں یہ مسئلہ پیش کیا تو کہا کہ اُن کی تجاویز اُن اعلانات پر مبنی ہیں جو مدار کانگریسی لیڈروں کی طرف سے ہوتے رہے تھے۔ انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ اعلانات زیادہ تر جواہر لال کے تھے لیکن انہوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ عام احساس پر ہم نے اُن سے اصولی طور پر اتفاق کر لیا۔“

رئیس احمد جعفری نے اس بجٹ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

”عوام کے ساتھ کانگریس کا یہ منافقانہ رویہ اور سرمایہ داروں کے ساتھ اس نیاز مندانہ برتاؤ پر اسی ہزار صفحے کی کتاب لکھی جاتی، ملک کے طول و عرض میں شعلہ نوا خطیب اور آتش نوا مقرر تہلکہ مچا دیتے تو بھی وہ اس طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے جس طرح لیاقت علی خاں کے چند ورق کے اس میزانیہ نے کر دیا۔۔۔۔۔ گویا لیاقت علی نے بجٹ اس لیے بنایا تھا کہ برلا، والیہا، سنگھانیہ کو لوٹ کر غریب مسلمانوں کی جھولیاں بھر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت پٹیل اور راجگوپال اچاری کے منہ سے وہ الفاظ نہیں نکلا سکتی تھی جو لیاقت علی کے بجٹ نے نکلا دیے۔“

لے رئیس احمد جعفری: آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۴

لے ایضاً: ص ۲۲۶-۲۲۸

یہ سطر یہاں جملہ معترضہ کے طور پر آگئیں۔ ذکر تھا جناب ابوالکلام کی ہندو نوازی اور ہر موقع پر مسلم منادات پر کاری ضرب لگانے کا۔ مسلمانوں نے ہندو لیڈروں کی عیاری اور مسلم دشمنی کے تحت تقسیم ملک کی تجویز اور مطالبہ پاکستان کو اپنے حقوق کے تحفظ کا واحد حل پا کر اپنی تمام تر ماسعی اس مقصد کو حاصل کرنے پر مرکوز کر دی تھیں تاکہ علیحدہ حصے میں مسلمان اپنی قسمت کے آپ مالک بن کر رہیں انہیں صاف نظر آنے لگا تھا کہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے بعد بھی مسلمان ہندو غلامی کے چکر سے نہیں نکل سکیں گے۔ آزادی ملک کے بعد ہندو اکثریت کی غلامی کا جو اگندھوں پر رکھا ہوا ہوگا۔ جو انگریزی اقتدار میں مسلمانوں کو پس رہے ہیں وہ بعد میں تو کچا ہی چبانے کی کوشش کیا کریں گے۔ ان متوقع خطرات سے بچاؤ کی صورت مطالبہ پاکستان کے سوا اور کیا تھی، مسلمانان ہند کے اس مطالبے نے جب انتہائی شدت اختیار کر لی تو بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو بھی تقسیم ہند کے علاوہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حالات کے آگے اُنہیں بھی جھکنا اور مطالبہ پاکستان کو درست تسلیم کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں پاکستان کو "پلیدیستان" یا "کنجری" بتا کر قبول کرنے والے نام نہاد علماء کا ذکر نہیں کرتا بلکہ مذکورہ ہے اس ادنیٰ چوٹی کی سرکار کا، جس کو گاندھی جی حضرات امام الہند کا لقب دیتے ہیں کہ موصوف کا اس وقت کیا خیال تھا؟

"اب کہ سردار پٹیل ہی نہیں جو اہر لال تک تقسیم ہند پر راضی ہو چکے تھے، میری (ابوالکلام کی) تنہا امید گاہ، گاندھی جی کی ذات تھی۔ وہ ۲۱ مارچ، ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دہلی آئے ہیں، فوراً ان سے ملنے روانہ ہو گیا۔ اُنہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، تقسیم ہند اب ایک خطرہ بن چکی ہے۔ دلجو بھائی (یعنی سردار پٹیل) اور صرف وہی نہیں جو اہر لال تک سپر انڈاز ہو چکے ہیں۔ بتائیے مولانا آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟

میں نے جواب دیا: میں تقسیم ہند کا مخالف پہلے ہی تھا، اب بھی ہوں، بلکہ اب سے زیادہ اس تسخیل کا مخالف کبھی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جو اہر لال اور سردار پٹیل نے شکست تسلیم کر لی ہے، بلکہ

آپ کے الفاظ میں سپر انداز ہو گئے ہیں۔ میری واحد امید گاہ آپ کی ذات ہے اگر آپ تقسیم کے خلاف آمادہ عمل ہوں تو ہم حالات کو اب بھی قابو میں لاسکتے ہیں لیکن اگر آپ بھی خاموشی اختیار کر لیں تو مجھے شبہ ہے کہ پھر ہندوستان ہاتھ سے گیا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اگر کانگریس تقسیم ہند قبول کر لینا چاہتی ہے تو یہ کارروائی میری لاش ہی پر ہو سکے گی۔ جب تک میں زندہ ہوں، میں کبھی بھی تقسیم ہند پر رضا مند نہیں ہو سکتا اور نہ میں کانگریس کو ایسا کرنے دوں گا۔“

عبادت کے تیور بتا رہے ہیں کہ تقسیم ہند کا جھگڑا گویا ہندوؤں اور مسلمانوں یا کانگریس اور مسلم لیگ کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ جھگڑا تھا ابوالکلام آزاد اور مسلمانوں کا۔ مسلمانان ہند کا مطالبہ تھا کہ ہندو ہمارے ساتھ اب بھی زیادتی کر رہے اور آزادی کے بعد تو ذرا بھی کسر باقی نہیں چھوڑیں گے۔ لہذا ہندوستان کو تقسیم کر کے ہمارا حق ہمیں علیحدہ دے دیا جائے تاکہ ہم انگریز کی غلامی کے ساتھ ہی ہندو کی غلامی سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ اس کے برعکس ابوالکلام وی گریٹ کا نظریہ یہ تھا کہ خواہ سارے ہندو لیڈر اور پوری ہندو قوم بھی اس بات پر رضا مند ہو جائے کہ ہم مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر رضہ نہیں اور تقسیم ہند کا منصوبہ تسلیم کر کے مسلمانوں کو ان کا حق دینے پر راضی ہیں لیکن میں پھر بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کروں گا۔ موصوف کے اُس وقت بھی تسلیم نہ کرنے کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ جس طرح ابوالفضل غلامی (دالتونی) نے اکبر بادشاہ کو سمجھایا تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم بنایا جائے۔ ہندو اور مسلمان وغیرہ کی علیحدہ قومیت کا تصور ہی ختم کر دیا جائے اسی طرح ماضی قریب میں اس ایک قوم (متحدہ قومیت) بنانے کے منصوبے کو پروان چڑھانے والے نہ ہندو لیڈر تھے، نہ گاندھی تھا، نہ اور کوئی، وہ امام الہند کہلوانے والا ابوالکلام آزاد تھا۔

۲۔ ہندو لیڈر اس متحدہ قومیت کے منصوبے میں ابوالکلام کے معاون و مددگار ضرور تھے لیکن اس منصوبے کی علمبرداری اور سارے قافلے کی سپہ سالاری کے جملہ حقوق تو بحق

ابن مولانا خیر الدین محفوظ تھے۔

۳۔ تقسیم ہند سے ہندو بھی کڑے ضرور، وہ اپنے لیے اسے نقصان دہ فیصلہ سمجھتے تھے، لیکن براہ راست ضرب تو ابوالکلام آزاد کے منصوبے پر پڑ رہی تھی۔ وہ ٹرپ کیوں نہ اٹھتے، آنکھوں دیکھتے ان کی پچیس تیس سالہ محنت پر پانی پھرنے لگا تھا۔ ہندو لیڈر تک تو میں، دو طاقتیں مان کر ملک کے دو حصے بنا دینے پر رضامند ہو رہے تھے مگر یہ کیسے ہوتے، ہر ملک کے دو حصے بنا متحدہ قومیت کی ضد ہے، اسی لیے متحدہ قومیت کا علمبردار تقسیم ہند کو کس طرح قبول کرنا جبکہ یہ اس کی شان ابوالفضل کے خلاف تھی۔

۵۔ ڈوبنے والا تنکے کا بھی سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ہندو اور مسلمان کو ایک قوم بنانے والے، توحید اور بہت پرستی کا فرق مٹانے والے اور کبھی میں بت خانہ سجانے والے امام الہند نے اپنے منصوبے کو بگڑتے دیکھا تو ہر ہندو لیڈر کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن انھیں نہ کامی و نامراد ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہاں تو ذکر تھا کہ ابوالکلام آزاد، تقسیم ہند کے خلاف گاندھی سے استمداد کر رہے تھے۔ گاندھی نے یقین دہانی کرائی، پُر زور الفاظ میں اپنی شایانہ طاقت کا اظہار کیا۔ چند روز بعد تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والا، ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہلانے والا گاندھی کون سی آندھی میں اڑا! یہ ابوالکلام آزاد سے منیے،

اُسی دن گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے، دوسرے دن دونوں کی پھر ملاقات ہوئی اور ۲ اپریل کو پھر، پہلی مرتبہ جب وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مل کر واپس آئے تو فوراً ہی سردار پٹیل ان کے پاس پہنچے اور دو گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں؟ میں نہیں جانتا۔ لیکن جب دوبارہ میں گاندھی جی سے ملا، تو میں نے ایسا جھٹکا محسوس کیا جو میری زندگی کا اہم ترین حادثہ ہے۔ میں نے دیکھا، گاندھی جی بھی بدل گئے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ صدمہ پہنچایا اور حیران کیا وہ یہ تھی کہ اب گاندھی جی بالکل سردار پٹیل کی زبان میں بول رہے تھے۔ دو گھنٹے تک میں انھیں ہوار



کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ آخر کار میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ نے بھی یہ خیالات قبول کر لیے ہیں تو پھر مجھے کوئی آس نہیں ہے کہ ہندوستان تباہی سے بچ سکے گا۔ گاندھی جی نے مجھے بتایا کہ پوزیشن ایسی ہے کہ اب تقسیم ہند کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

تقسیم ہند کے مسلمانوں کو اُن کا حق دینے اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی حاصل کر لینا ابوالکلام آزاد کی نظر میں کیا تھا، یہ مذکور ہوا، اسی سلسلے میں موصوف کی ایک وضاحت اور ملاحظہ ہو:

۱۳ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شریک ہو چکا ہوں، لیکن اس عجیب جلسے میں کاش! شریک نہ ہوا ہوتا۔ کانگریس جس نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور وحدت کے لیے لڑائی جاری رکھی تھی، آج تقسیم ہند کے ریذولیشن پر غور کر رہی تھی۔ پنڈت گوہند بلو پنت نے ریذولیشن پیش کیا، پھر سردار پٹیل اور جواہر لال بوسے، بعد میں گاندھی جی نے لب کشائی کی۔

کانگریس کی طرف سے اتنے ذلیل طریقے پر ہتھیار ڈال دینے کا منظر برداشت کر لینا میرے بس سے باہر تھا۔ اپنی تقریر میں، میں نے صاف طور پر کہا کہ جس فیصلے پر ورکنگ کمیٹی پہنچی ہے وہ نہایت افسوسناک حالات کا نتیجہ ہے۔ تقسیم ہندوستان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے اور اس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقدور بھر تقسیم سے بچنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ بہر حال ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے (یعنی کفر و اسلام ایک ہی بات ہے) اس کی تہذیبی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی، سیاسی طور پر ہم ناکام ہوئے اور اسی لیے تقسیم ملک پر مجبور ہو گئے، ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے،

لے ٹیس احمد جعفری: آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۹

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی کر لینا چاہیے کہ ہماری تہذیب تقسیم نہیں ہوئی۔  
 اگر ہم پانی کو ایک چھڑی سے ہلائیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ پانی تقسیم ہو گیا،  
 لیکن تقسیم نہیں ہوتا، چھڑی جیسے ہی ہٹائی جائے گی، تقسیم کے اثرات فوراً  
 زائل ہو جائیں گے۔“

اس تقریر پر کوئی تبصرہ کرنا ہمارے نزدیک لا حاصل ہے کیونکہ موصوف کے نظریات اُن کے الفاظ  
 سے خود ہی پورے طور پر واضح ہو رہے ہیں، ہاں اس کے متعلق سر دار پٹیل کے تاثرات پیش  
 کر کے فیصلہ قارئین کے سپرد کرتا ہوں :

”سر دار پٹیل کو میری تقریر پسند آئی۔ اُن کی ساری تقریر میری تقریر کا جواب تھی  
 انہوں نے کہا تقسیم ملک کا پوزیشن جبریا کمزوری کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہندوستان کے  
 موجودہ حالات کا بہترین حل ہی ہے۔“

پٹیل، جواہر لال اور گاندھی تک اگرچہ تقسیم ہند پر رضامند ہو گئے لیکن آخری سانس تک رضامند  
 نہ ہونے والے ابوالکلام کے نزدیک یہ ایک بدترین اندیشہ تھا جو کبھی کبھی ان کے دماغ کی  
 کھڑکیوں کو کھڑکھڑا کر ان کی غنیمتیں حرام کر دیا کرتا تھا، وہی اندیشہ اب موصوف کے سامنے  
 حقیقت بن کر آ گیا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں :

”لارڈ ڈاؤنٹ ہٹن برطانوی حکومت سے تقسیم ہند کی اسکیم منظور کرا کے ۲۰ مئی کو  
 واپس آئے۔ ۲ جون کو نمائندگان ایک کانگریس سے انہوں نے گفتگو کی۔  
 ۳ جون کو تقسیم ہند کی تفصیلات کے ساتھ قرطاس ابیض شائع ہو گیا۔ میں  
 صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بدترین اندیشے واقعہ بن گئے۔ آزادی ہند  
 کی قیمت دو حکومتوں میں ہندوستان کی تقسیم تھی۔“

۱۔ رئیس احمد جعفری : آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۲، ۲۳۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۳۔ ایضاً، ص ۲۴۱، ۲۴۲

مطالبہ پاکستان جو ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی آخری صورت تھی، اس کے بارے میں موصوف نے اپنی پوری سوجھ بوجھ اور ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر یوں فیصلہ صادر فرمایا تھا:

”ہر ممکن نقطہ نظر سے میں نے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان پر غور کیا۔ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تجویز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں:۔“

اس سلسلے میں موصوف نے ذرا اجاف بیانی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کے متعلق ارشاد فرمایا تھا،

”میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت مقبول نہیں کرتی:۔“

گویا مسلمانان ہند کے مفادات سے جتنے ابوالکلام آزاد نکراٹے وہ کسی بڑے سے بڑے ہندو لیڈر سے بھی نہ بن سکا۔ تقسیم ملک کے بعد موصوف کو تعلیمات کا محکمہ دیا گیا کیونکہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو اردو زبان اور عثمانیہ یونیورسٹی سے محروم کرنے نیز نئی نسل کے ذہنوں کو نئے انداز میں ڈھالنے کے لیے ابوالکلام آزاد سے موزوں شخصیت اور کون تھی؟ کوئی ہندو یہ کام کرنا تو ہنگامے ہوتے، شور مچتا، مسلمانوں کا بدخواہ ٹھہرایا جاتا لیکن اس طرح سانپ بھی مر گیا اور لاشی بھی محفوظ رہی۔ یہ کام نہ ابوالکلام وزیر اعظم ہی کر انجام دے سکتے تھے اور نہ بھارت کے صدر ہو کر۔ اسی لیے ہندو لیڈروں نے انہیں صدارت اور وزارت عظمیٰ کے ہر موقع پر نظر انداز کیا۔ مثلاً جعفری صاحب کہتے ہیں:

لے رئیس احمد جعفری، آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۳

لے ایضاً، ص ۱۶۳

” اگر کانگریس صحیح معنی میں قومی تنظیم تھی، تو مولانا نے بتایا ہوتا کہ جس عالی ظرفی کا مظاہرہ مسلم لیگ کی ضد میں، لارڈ ویول کو اپنے نمائندوں کی فہرست پیش کرتے وقت کانگریس نے کیا، آزاد ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کیا؛ لارڈ ویول کو جو فہرست پیش کی گئی اُس میں پہلا نام مولانا آزاد کا تھا لیکن جب (الف) ہندوستانی کابینہ میں نائب وزیر اعظم کا عہدہ پیش کیا گیا تو پہلا نام سردار پٹیل کا تھا حالانکہ مستحق مولانا آزاد تھے۔

(ب) پٹیل کے انتقال کے بعد بھی مولانا آزاد ”سیلٹر موٹ“ ممبر تھے، لیکن یہ عہدہ ختم کر دیا گیا مگر مولانا کو مستحق نہ سمجھا گیا، حالانکہ ان کا جرم سوا اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

(ج) ماؤنٹ بیٹن کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اب کوئی ہندوستانی گورنر جنرل بنایا جائے تو پہلا نام راج گوپال اچاری کا پیش ہوا اور منظور ہوا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے سزاوار مولانا تھے۔

(د) پھر جب صدر جمہوریہ ہند کا منصب تخلیق ہوا تو بھی مولانا نظر انداز کر دیے گئے اور راجندر پال کا پہلا اور آخری نام منظور کر لیا گیا حالانکہ خدمات کے لحاظ سے پٹیل، راج جی، راجن با بوسب مولانا کے سامنے طفلِ کرب تھے؛

## گاندھی مدینہ

بجنور سے نکلنے والا اخبار ”مدینہ“ کانگریس اور متحدہ قومیت کا حامی تھا۔ اُس کا حال ملاحظہ ہو: ”انہیں جوائڈ میں بجنور کا اخبار ”مدینہ“ بھی ہے جو کبھی اہم باسٹی تھا لیکن آج کل برعکس نہند نام زنگی کا فوراً چھٹا خاصا سونما بنا ہوا ہے۔ کانگریس اور گاندھی جی کو خوش کرنے کی دھن میں اس اخبار نے اپنی تمام گزشتہ روایات کو

سے رئیس احمد جعفری: آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۲، ۱۲۳

طلاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلام کے سوا دِ اعظمہ کو انگریزوں کا ٹوڈی کہنا اُن آزاد خیال مسلمانوں کو جن کا جرم صرف اس قدر ہے کہ وہ کانگریس میں جذب ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ ایک برابر کی جوڑ کی حیثیت سے اُس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر آمادہ ہیں، پانی پی پی کر کو سنا، ہندوؤں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے لیے مسلمان اکابر پر جھوٹے الزام لگانا "مدینہ" کا محبوب ترین شغل ہے۔" لے

گانڈھی کی پیشوائی کے بارے میں یہی ظفر علی خاں یوں "مدینہ" کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، "جہاں تک کانگریس کے اصولوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق ہے، مگر ہم اپنی وارڈھی گانڈھی جی کے ہاتھ میں دینا پسند نہیں کرتے۔ پرتاپ یا ملاپ ہی کر "مدینہ" اگر ان باتوں پر بگڑتا ہے تو بگڑا کرے، مسلمانوں کو اس کی کوئی پڑا نہیں وہ شوق سے اپنی وارڈھی گانڈھی جی کے ہاتھ میں تھما دے، جس کم جہاں پاک! لے موصوف نے "مدینہ" بجنور کی گانڈھویت پر اُس کی خدمت میں ایک سوغات پیش کی تھی، وہ بھی ملاحظہ ہو،

"مدینہ اب وہ مدینہ نہ رہا۔ آج کل وہ سوغات ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اسی مناسبت سے ایک نئی سوغات اُس کی خدمت میں پیش کی جائے۔" مہینے، جب مدینہ کے فتلکار یہودی ہو جائیں  
گیوں نہ پھر اُس کو بھی تابوتِ سینہ کیے  
کالی ماتا کی اسے کیے چیتی بیٹی  
یا ہادیو کی اولادِ زینہ کیے  
کانگریس جس سے مسلمان کو لیتی ہے خرید  
اپنے سینہ کو اسی زر کا خرید کیے

لے ظفر علی خاں، چغتیاں، مطبوعہ لاہور، ص ۷۹

لے ایضاً، ص ۷۷

اڑ رہا جس پہ نہرو کا ہوترا نکا جھنڈا  
اپنے اخبار کو اسی بام کا زینہ کیسے  
وہ دعا آپ کو دے، آپ اُسے گالی دیں  
آپ ہیں یا ہے "زمیندار" کہینہ کیسے

جب اسلامی عقائد و معمولات کو غیر اسلامی اور غیر اسلامی باتوں کو اسلامی کہا جانے لگے تو ایسے نامساعد حالات اور فتنہ پروردور میں اللہ تعالیٰ کا جو مقبول بندہ تائید ایزدی سے دلائل و براہین کے ذریعے فتنہ پردازوں کو ساکت و مبہوت کر کے حق و باطل کو واضح کر دکھائے، دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دے، اصطلاحِ شرع میں اُسے مجتہد کہا جاتا ہے۔ آج تک کوئی مجتہد ایسا نہیں ہوا، نہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیوبندیوں کے مولوی اشرف علی تھانوی کی طرح نصاریٰ کے ہاتھوں چھ سو روپیہ ماہوار پر پک کر خود تو ساری عمر کفر کے سمندر میں پڑا غوطے لگاتا رہے لیکن دوسروں کو سمجھانا بھجانا بھی ضروری سمجھے۔ چنانچہ موصوف نے بھی اپنی گاندھوی برادری کو یوں سمجھایا تھا، "مسلمانوں میں افسوس تو یہ ہے کہ دوست و دشمن کی بھی پہچان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ دن مصائب کا شکار بنے رہتے ہیں۔ خصوصاً ان پر زیادہ افسوس ہے کہ جو مسلمانوں کے رہبر اور مقتدا کہلاتے اور جن کے ہاتھ میں ان کی نکیل ہے۔ جو ان کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ جو ان کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں وہ ان کے لیڈر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کیا خاک رہ سزی کریں گے جو خود گم کردہ راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے؟"

راخوں نے کافروں کی چکنی چٹری باتوں میں آکر مسلمانوں کو پسوا دیا اور مسلمانوں ہی کو کیا، خود بھی ان چیزوں کا ارتکاب کیا جو ایمان اور دین کو خراب اور برباد کرنے والی تھیں۔ بچے کے نعرے لگاتے، پیشانیوں پر قشتے لگاتے، ہندوؤں کی ارتھیوں کو کندھا دیا، رام لیلہ وغیرہ کا انتظام مسلمان والٹیروں نے

لے ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۸

کیا، یہود اور کفر یہ کلمات بکے کہ اگر نہرت ختم نہ ہوتی تو فلاں ہندو نبی ہوتا،  
کیا خرافات و اہیات ہے۔

میں نے اُس ہی شبابِ تحریک کے زمانہ میں کہا تھا کہ جو شخص توحید  
اور رسالت کا منکر ہو اور وہ اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو، یہ معتمد  
سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر اُس وقت چڑھی ہوئی تھی، کون سُنتا تھا۔ اب دیکھ لی  
اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔ ادھر تو حکومت  
کے مقابلہ میں مسلمانوں کو آگے کر دیا، ادھر بعض بد فہم اور بے سمجھ مسلمانوں کے  
جو راہبر تھے اُن کو بہلا پھسلا کر ہجرت کا سبق پڑھایا، ادھر شدھی کا مسئلہ  
جاری کر دیا۔ غرضیکہ ہر طرح پر مسلمانوں کے جان، ایمان، جائیداد، مال، ذرا  
زمین، گھر، سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا تھا۔ یہ تھی اسلام اور مسلمانوں  
کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔

لیکن یہ لیڈر نہ سمجھے اور نہ اُن کے ہم خیال مولوی۔ ہندوؤں کو تو قوت  
ہوئی مسلمانوں کی شرکت سے اور مسلمانوں کی شرکت ہوئی مولویوں کی شرکت سے،  
ورنہ لیڈران قوم تو قریب قریب ڈیڑھ سال سے چیخ رہے تھے، عوام مسلمانوں  
نے شرکت نہ کی تھی۔ جن وقت مولویوں نے شرکت کی تب بیچارے عوام مسلمان  
بھی چھپس گئے۔ ساگر وہ ہندو دکاندھی (ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض براندیش سمجھے  
ہوئے تھے یا اب تک بعض سمجھے ہوئے ہیں، تو محمد علی تو پاس رہے ہیں،  
اُن کا فیصلہ دیکھ لو کہ کس طرح انک ہٹے تھے۔“

## احرار پارٹی

پنجاب میں کانگریس کے مفادات کا تحفظ "احرار پارٹی" کر رہی تھی۔ احرار پارٹی حقیقت

لے اشرف علی تھانوی، مولوی: الافاضات ایومیہ، جلد پنجم، ص ۸۸، ۸۹

میں جمعیت العلماء ہند کی ذیلی شاخ تھی جس طرح خود جمعیت العلماء ہند ہی کانگریس کی شاخ ہے۔  
 احراری حضرات پھر گاندھی پرستی اور زنازدوستی میں کسی دوسرے گاندھی سے پیچھے کس طرح  
 رہ سکتے تھے؟ کانگریس بھی ان کی دل و جان سے سرپرستی کا فریضہ ادا کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے  
 کہ ان حضرات نے مسلمانوں کا سرتاج بننے کے بجائے گاندھی، نہرو اور ٹیل کا نعلین بردار بننا  
 برضا و رغبت قبول کیا ہوا تھا۔ ظفر علی خاں لکھتے ہیں:

میں نے کل پوچھا یہ "صدر مجلس احرار سے

بندہ پرور آپ کیوں ہیں خاکساروں کے خلاف

گر عقائد کی بنا پر آپ کی ہے ان سے جنگ

کیوں نہیں ہیں آپ پھر زنازداروں کے خلاف

چار مشرک ہیں ٹیل و گاندھی و نہرو و بوس

کاش ہوتی آپ کی یلغار ان چاروں کے خلاف

ہنس کے فرمانے لگے ارشادِ عالی ہے بجا

ہو تو جائیں ہم بھی ان مردار خواروں کے خلاف

پل رہے ہیں ان کے چندوں پر مگر احرار ہند

پھر ہوں کیوں وہ اپنے ان پروردگاروں کے خلاف

کانگریس نے پال رکھے ہیں مدینہ کے کچھ اونٹ

عالمِ اسلام ہے ان بے ہماروں کے خلاف

احرار پارٹی کے کارنامے گناتے ہوئے مزید اس کا تعارف کرانے کی یوں کوشش کی گئی ہے:

بادا تھے مسلمان تو بیٹے تھے مجوسی

پوتے جو ہیں "احرار" وہ کہلائے فلوسی

مل جائے جہاں بندہ، وہی ہے وطن ان کا

ہندی ہیں نہ مصری ہیں نہ چینی ہیں نہ روسی

لے ظفر علی خاں، چنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۸



جو بوند مرے غلوں کی مہاجن سے بچی تھی  
 پنجاب کے احرار ستم پیشہ نے چوسی  
 نہر و جو ہے دولہا تو دلہن مجلس احرار  
 ہو پیر بخاری کو مبارک یہ عسروسی

مجلس احرار کے صدر مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ موصوف ایک شعلہ بیان مقرر اور دیوبندی  
 مکتب فکر سے متعلق تھے۔ مسلمانان ہند کی نمائندگی کرنے والی واحد جماعت مسلم لیگ سے  
 ان حضرات کو اٹنا ہی غارتھا جتنا مشرکین ہند کو اور شاید کانگریس کے کسی بڑے سے بڑے  
 لیڈر نے بھی مسلم لیگ اور اس کی ہمنوائی کرنے والوں کے حق میں اتنے گندے الفاظ استعمال  
 نہ کیے ہوں گے جیسے گاندھوی علمائے استعمال کیے تھے۔ مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری  
 اور مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی کے بارے میں یوں مرقوم ہے:

ایک دوسرے صاحب نے فرمایا کہ احرار کے متعلق ایک شعر ضرور ہونا چاہیے  
 کیا آپ کو معلوم نہیں کہ احرار کی شریعت کے امیر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری  
 نے امر و ہرم میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے  
 وہ سورہیں اور سور کھانے والے۔ اوکنا قال۔

پھر میرٹھ میں مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی صدر مجلس احرار اس قدر  
 جوش میں آئے کہ دانت پیتے جاتے تھے، غصہ میں آکر ہونٹ چباتے تھے  
 اور فرماتے جاتے تھے کہ دس ہزار جینا اور شوکت اور ظفر، جواہر لال نہرو کی  
 جوتی کی نوک پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔

لکھ ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۷

لکھ مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری: ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

لکھ مراد مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں ایڈیٹرز اینڈ پبلشرز اخبار ہیں۔

لکھ ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۳

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر اراکین مجلس احرار انڈیا زری خوبوں کے مالک تھے۔ دیوبندی  
مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مولوی ظفر علی خاں نے ان حضرات کا تعارف یوں کروایا ہے:

گالیاں دے، جھوٹ بول، احرار کی ٹولی میں مل

نکتہ یوں ہی ہو سکے گا حل سیاسیات کا

پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاری کے پٹم

مانگتے پھرتے ہیں کیوں کا حبل سیاسیات کا

خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر

کیوں نہ کیے اس کو "بابا مل" سیاسیات کا

کیا تماشہ ہے کہ زلفِ شرع کی مشاطگی

کر رہا ہے آج دستِ ثل سیاسیات کا

دیکھ لے مظہر علی اظہر کو افضل حق کے ساتھ

ایک پڑی دوسرا جھانپل سیاسیات کا

مجلس احرار کے نیفے کی رونق بن گیا

ایک پتو دوسرا کھٹل سیاسیات کا

دخل معقولات میں دیتا ہے کیوں "بڈ مولوی"

عقدہ کیا کھولے گا یہ ڈھیل سیاسیات کا

ڈاکٹر کچلو زبر میں اور حسام الدین ہیں زیر

یہ دمن اس عہد کی وہ نل سیاسیات کا

جل گئے مٹھ میں بٹھے مولوی داؤد کے

عدت سے بڑھ کر گرم تھا بھوبل سیاسیات کا

سنا ہے کہ مجلس احرار نے شہید گنج مسجد کے بارے میں سودا بازی کی تھی۔ اندرونِ حنا

سکھوں سے ساز باز تھی اور ذبانی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم کہ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ بہر حال اجاز "زمیندار" کے ایڈیٹر کی رائے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:

زالی وضع کا مومن ہے طبقہ احسدار

کہ سر جھکا ہوا مشرک کے آستان پر ہے

اس آرزو میں کہ نہر کسی طرح خوش ہو

نگاہ خشم سکندر حیات خاں پر ہے

خدا کے گھر کی تباہی میں حصہ دار ہونے

یہ ظلم انہوں نے کیا آپ اپنی جاں پر ہے

اشارہ پا کے ادھر سے شہید گنج کا شور

کئی دنوں سے اُن اشرار کی زباں پر ہے

سنا کیا جو کئی سال ویر کا تا تو کس

لگا ہوا وہی کان آجکل اذواں پر ہے

مولوی مظہر علی اظہر احراری نے کامریڈ محمد حسین مین ساز کو مخاطب کر کے یوں دھمکی دی تھی:

ہم ہیں احرار نہیں ہم سے ابھنا اچھا

تری اوقات ہی کیا ہے اے اوٹین فروش

کامریڈ محمد حسین نے مولوی مظہر علی اظہر احراری کی اس دھمکی کا جواب یوں دیا تھا:

میں نے مسجد نہیں بیچی کبھی تیری مانسند

ابے اوچندے کے مجھ کے ابے او دین فروش

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری کے سکھوں سے بھی اسی طرح کے نیاز مندانہ تعلقات تھے

۱۔ مظہر علی خاں: چغتستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۴

۲۔ ایضاً: ص ۶۲

جس طرح کے مشرکین ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو سے تھے۔ یکتوں کی طرف سے بھی موصوف  
پر نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

احرار کے بت خانہ سے منظر کو بلا لا

منظور بنانا ہو جو مسجد کو شوالا

سرکارِ مدینہ سے بلا مجھ کو بھی کیل

یکتوں نے بخاری کو جو بختا ہے دوشالا

اراکینِ مجلسِ احرار کی صفت و ثنا میں اسی سلسلے کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :

جاء نصرُ الله کی ہریانہ سے آئی صدا

رنگِ افضل حق کا سنتے ہی جسے فتی ہو گیا

گر پڑے غش کھا کے مولانا عطاء اللہ شاہ

اور کلیجہ مولوی داؤد کا شق ہو گیا

مولوی منظر علی اظہر کی رُسوائی کا داغ

اُن کی مجلس کے سپہ خانے کی رونق ہو گیا

اُس طرف مندر کا شور اور اس طرف مسجد کا زور

بیچ میں منظر علی اظہر معسوق ہو گیا

جاٹے کیا سوچ کر احرار سے ملانے غوث

ساروں میں کس لیے شامل یہ تعلق ہو گیا

صدرِ احرار آگے لے کر لغتوں کے پرے

لشکرِ اشرار سے جنگ آزما حق ہو گیا

۱۔ منظر علی خاں، چغتستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۶

۲۔ مراد، مولوی غلام غوث نہاروی جو آجکل پاکستان اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔

۳۔ منظر علی خاں، چغتستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۶، ۵۷

حلقہ بجنور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر عبدالسمیع کھڑے ہوئے تھے اور ان کے مقابلے پر کانگریس نے  
حافظ ابراہیم کو کھڑا کیا تھا۔ نام نہاد ابراہیم صاحب کی زنا دوستی پر دو شعر مزید ملاحظہ ہوں،  
کیا قیامت ہے کہ جس کا نام ہی ثابت شکنی

بُت کے آگے سر اسی ملت کا بھک جانے لگے  
نقہ توحید اب کس کی زباں پر آئے گا

جب خود ابراہیم بندے ماترم گانے لگے لے  
جراہ میں جب مسلم لیگ نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو گاندھیوں میں یوں صفت ماترم بچھ گئی  
جب جیت لیگ کی ہوئی اور کانگریس کی ہار

روٹی تھی سرپرٹ کے گورنمنٹ "خان" کی  
گاندھی بھی دور بستے یہ کہہ کر کہہ ہائے

سرحد میں ناک کٹ گئی ہندوستان کی  
میدان میں جم سکا نہ قدم سرخ پوش کا

جس وقت سر پہ آئی گھڑی امتحان کی لے  
علمائے حقانی اور دین متین کی مخالفت میں پوری جولانی دکھانے والے اور ابوالکلام آزاد  
وجہیۃ العلماء ہند سے احوار پارٹی اور ان کے مجلہ گاندھیوی افراد سے عقیدت رکھنے والے جناب  
شورش کش کاشمیری نے احوار پارٹی کی دیانت داری کے بارے میں ایک انکشاف شایع  
کیا تھا، وہ موصوف ہی کے نعتوں میں ملاحظہ ہو:

جب مولانا دستکار کربا لے لگے تو شاہ جی نے روک لیا۔ مولوی صاحب! آپ  
کہاں جا رہے ہیں؟ آپ تشریف رکھیں، آپ کے خلاف باجماعت (مجلس  
احرار) کے خلاف شہرتیں کچھ چارج لگا رہا ہے۔ مولوی صاحب رگ لگے رہیں

لے ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۸۵

لے ایضاً: ص ۱۲۱

نے ترتیب وار پارچ لگانے شروع کیے۔ کانگریس کارپوریشن ساٹھ ہزار، اوس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط اور تین سو بیسٹھ پارٹی ..... ابھی فخر پورا بھی نہ ہوا تھا کہ مولانا غلام غوث نے ایک ایک شیٹ پر زور دیا۔ کچھ دیر تو سناٹا چھایا پھر سکوت ٹوٹا۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اس وقت اُن کے ذہن میں صحیح یاد نہیں کہ یہ رقم کتنی ہے۔ بات صبح پر ملتوی ہو گئی۔

مجھے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، مولانا منظر علی انظر کے مکان پر لے گئے رات وہیں کاٹی۔ مولانا اس اشتاد کو برا خیال کرتے تھے اور مضطرب بھی تھے۔ لیکن وہ اخفا کے حق میں تھے۔ میں نے عرض کیا جب تمام لوگ آپ سے روپیہ لے چکے ہیں تو پھر وہ معصوم منظر کیوں بنتے ہیں، رات جو گزری سو گزری، صبح وہی حیثیت بخت صاحبزادہ صاحب نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کہیں یہ کہہ دیا کہ شورش اپنے الزام واپس لیتا ہے۔ میں موجود نہ تھا، جب پہنچا تو بھیرت ہوئی۔ خیر دوبارہ وہی قصہ چھڑ گیا۔

مولانا منظر علی نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے۔ لیکن اُس کے سزاوار وقتہ نہیں بلکہ باقاعدہ مشورے سے رقم لی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد خزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اُس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی انہی حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی۔ یعنی شیخ حسام الدین نے مولانا حبیب الرحمن کو لہجیانہ خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں کانگریس ہائی کمانڈ تک پہنچیں۔ یہ خط لے کر خاقان بابر مولانا منظر علی کے صاحبزادے لہجیانہ پہنچے۔ مولانا حبیب الرحمن کلکتہ گئے۔ مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے ٹک بھگ رقم دینے کو تیار ہو گئے مگر سردار پٹیل جو کانگریس کے خازن تھے، اس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ مجیم سین سپٹر کی تحویل میں دیا گیا، جو اُن کی معرفت دفتر احرار میں پہنچا، پھر اس رقم کی بندر باٹ کی گئی۔

وہ رقم جو یونینسٹ پارٹی سے وصول کی گئی اور جس کو بہ اختلاف مولانا نے تسلیم کیا کہ وہ رقم جو دو چار ہزار بطور چندہ فراہم کی گئی یہ تمام مل ملا کر پچانوے یا پچاسی ہزار بنتے تھے۔ حبیب مولانا منظر علی نے بتایا کہ نواب زادہ نصر اللہ کے سوا اور کنگ کمیٹی کے ہر امیدوار نے ان سے روپیہ لیا ہے، تو سب نے تسلیم کیا۔ شیخ حسام الدین بھی مان گئے، ماسٹر تاج الدین نے بھی سر ہلا دیا، مولانا حبیب الرحمن نے بھی صاف کیا۔ اس مجموعی رقم میں سے لے دے کہ صرف بیس ہزار بنتے تھے۔ مولانا منظر علی نے دس ہزار اپنے ایکشن کا صرفہ بتایا اور دس ہزار روپے کے متعلق کہا کہ وہ روزنامہ آزاد نکالنے کے لیے جمع رکھا گیا ہے۔ لے

وہ شیخہ کہ وہم تھی حضرت کے زہد کی  
میں کیا تاؤں راست مجھے کس کے گھر لے

تھا نوی صاحب کے خلیفہ عبدالجبار دیابادی نے در سند دیوبند سے گاندھوی فیض حاصل کرنے والے طلبہ اور متعلقین کی تبلیغی مساعی کے ساتھ ان کی تعداد شان کا ایک المناک منظر یوں پیش کیا ہے:

”آج چاروں دن سے اس قصبہ (دیاباد) پر کانگریسی خیالی کے مسلمانوں کا حاد آہا۔ دیوبند کے طلباء کا ایک دستہ آیا ہوا ہے اور اپنے مسلک کی تبلیغی کوشش تبلیغ میں مصروف ہے۔ اس میں مضائقہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر فریق یہی کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے لیکن ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ کام مسلمانوں کے اذ کرتا ہے لیکن تعلقات یہ تمام مسلمانوں سے توڑے ہوئے ہے اور قصبہ کی غیر مسلم آبادی سے جوڑے ہوئے ہیں۔ تیام ان کا دھرم سالہ میں ہے، سالانہ قصبہ میں ایک نہیں دوسرا میں مسلمانوں کی موجود ہیں۔ ان کا رہنا سہنا چلنا پھرنا، کھانا پینا تمام تر ہندوؤں کے ساتھ، انہیں کے درمیان اور

۱۷ شورش کشمیری، ہفت روزہ چٹان، بابت ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء

انہیں کا سا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان سطور کے راقم کو جب بھی اُنہوں نے سرفراز کیا تو ہمیشہ ہندوؤں ہی کے حلقے میں۔ یہاں تک کہ ایک دن مسلمان صاحب تو ایک تھے۔ اُن کے ہندو رفقاء تین کی تعداد میں، گویا توحید تبلیث کے نرغہ میں۔ اس سے قبل سنٹرل اسمبلی کے الیکشن کے وقت تو یہ منظر دیکھنے میں آیا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان امیدوار کے کارکن اور باقاعدہ پولنگ ایجنٹ تک ہندو ہسلک یا سیاسی نظریہ کے غلط یا صحیح ہونے کا یہاں ذکر نہیں، ذکر یہاں صرف اس ناقابل حل معرکہ کا ہے، اچھوت بنائے جاتے ہوئے سنا تھا، پڑھا تھا، اچھوت بنتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

یہ حضرات اچھوت کیوں نہ بنتے، جنہوں نے اپنے قلوب سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت نکال ڈالی تھی اور اُن کی شان میں نازیبا لفاظی جاری کرتے اور گستاخانہ نظریات کی نشر و اشاعت کرنا اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا تھا، اُن کے دلوں میں گاندھی جیسے دشمن اسلام و مسلمین اور ٹھیٹھ بت پرست کی الفت اس طرح جاگزیں ہوئی کہ گو سالہ، سامری کی طرح اُس کی پرستش ہونے لگی اور شب و روز اُس کی بارگاہ میں بڑے بڑے صاحبانِ مجتہد و دستار اور امام الہند و شیخ الاسلام بھی سجد و تعظیم کے نذرانے پیش کرنے لگے۔ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے والے اگر ہندو کے برلور دین دینی و یقینی نہ بنتے تو اوہ کس کے بنتے، ملتِ اسلامیہ سے کٹ جانے والے اگر دشمنانِ اسلام کے غلام نہ بنیں تو اور کس کے بنیں، یہ اُن حضرات کا اپنا ہی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کا بھائی بنانا پسند کیا اور بت پرستوں کا غلام بننا دل و جان سے پسند کیا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کے منکر اور اُن کی فاتحہ کو بدعت و حرام ٹھہرانے والے اپنے باپوشہید کی پوجا پاٹ اُس کی موت کے بعد بھی یوں کرتے رہے،

”ما فظ بعیت اللہ رکن جمعیۃ العلماء ہند اور حضرت بابا خضر محمد سابق سرپرست جمعیۃ العلماء ہند کان پور نے مہاتما گاندھی کی رُوح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے

لے اخبار صدق کھنڈ، بابت ۲۶ فروری ۱۹۴۶ء



کے لیے قرآن کریم کی آیتیں اُن (گاندھی) کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر  
پڑھیں اور اُن کی روح کو بخش دیں۔ اَللّٰهُ

سے صورت تو مومنانہ ہے بھیک حضور کی  
سیرت کا گوشہ گوشہ مگر ہندوانہ ہے

یہاں ایک تلخ حقیقت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چودھری حبیب احمد صاحب  
ایک ضخیم کتاب تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کے نام سے لکھی۔ اُس میں گاندھی کی  
کئی غیر اسلامی روش اور ہندو نوازی کا تذکرہ نیز تحریک پاکستان کے راستے میں اُن حضرات کی  
رکاوٹوں کا اخباری بیانات کی روشنی میں سیر حاصل ذکر کیا ہے لیکن مسٹر پرویز کے معتقد  
ہونے کے باعث نیشنلسٹ علماء کے مقابلے پر ہر جگہ مسٹر پرویز جیسے دشمن اسلام کو پیشتر  
کرتے رہے ہیں۔ موصوف کا ارشاد ہے کہ گاندھی کا جتنا مقابلہ ہمارے پرویز صاحب  
نے کیا اتنا کسی اور سے کب ہی پڑا، ستم بالائے متم تو یہ ہے کہ علمائے اہلسنت اُن کے  
زردیک کسی گنتی شمار میں نہیں۔

چودھری صاحب چونکہ بحال بقیہ حیات میں انہما ہم پر عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں  
کہ تحریک پاکستان کے وقت ہندوستان میں مدعیان اسلام کی تعداد دس کروڑ تھی، جن  
میں سے نو کروڑ سے زائد اہلسنت و جماعت کا وہ سواہ اعظم تھا جسے بتدین زمانہ نے بریلوی  
جماعت کے نام سے متعارف کیا تھا۔ باقی جملہ فرقوں کے افراد کی مجموعی تعداد ایک کروڑ سے  
بھی کم تھی۔ دیوبندی، اہلحدیث، جماعت اسلامی، پرویزی، گاندھی اور مرزائی وغیرہ  
سارے مل کر مسلمانان اہلسنت و جماعت کا عشرِ عشر بھی نہ تھے۔ سنی کانفرنس بنارس میں  
پانچ ہزار علماء و مشائخ نے شمولیت کی۔ سنیوں کے بیس ہزار رہنما یعنی علماء و مشائخ سنی  
کانفرنس کے رکن تھے۔ گویا اتنے رہنما تھے اور اتنی قوم تھی۔ کیا چودھری صاحب ہمیں یہ بتا  
سکتے ہیں کہ مسٹر پرویز کی قوم کتنی تھی؟ اُس قوم کے کتنے حضرات نے پاکستان کے حق میں

لے اخبار سیاست کانپور، بابت یکم فروری، ۱۹۵۷ء

وٹ دیے؟ پرویزی حضرات کے دوٹوں سے آیا مسلم لیگ کا ایک بھی مرکزی یا صوبائی اسمبلی کا ممبر کامیاب ہوا، اگر کوئی ایک بھی ایسا ہے تو اُس کا نام بتا دیا جائے ورنہ واضح کیا جائے کہ پرویز صاحب کا قیام پاکستان میں حتمی کیا ہے؟ اگر کوئی حتمی ہو بھی جو مسلمانوں کا ان کے بیانات سے کیا تعلق؟ اگر کوئی ہندو یا سکھ یا عیسائی بھی پاکستان کی حمایت کرتا تو کیا اتنی بات سے وہ مسلمانوں کا رہنما بن سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح مسٹر پرویز کے کاغذی بیانات کچھ بھی ہوں لیکن نہ مسلمان اُن کے ساتھ ہیں نہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ جب تک وہ دائرہ اسلام میں نہیں آتے اُس وقت تک مسلمانوں اور پرویزیوں کا معاملہ لَكُمْ دِينُكُمْ وَ لِي دِينِ الْاٰسَةِ ہو سکتا ہے کہ چودھری صاحب اور دوسرے پرویزی حضرات پر احقر کی بیوضاحت گراں گزرے لیکن حقیقت کو چھپانا دین و ملت کی بدخواہی اور غداری ہے جسے یہ ناچیز ہرگز پسند نہیں کرتا۔

## علمائے اہلسنت کی فہمائش

گاندھی علماء اور لیڈروں نے جب نوبتِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا ہی کو مجھلادیا تھا، ہندو کی خوشنودی پر سب کچھ قربان کر چکے تھے تو کسی رہنما کی فہمائش پر کب کان دھرنے لگے تھے۔ بت پرست نوازی کے منازل طے کرتے ہوئے چودھویں صدی میں ایک پراسرار اور نرالا جہاد بھی ایجاد فرمایا۔ بقائے خلافت اور تحفظِ مقاماتِ مقدسہ کے نام پر وہ جہاد جاری کیا کہ جب پر وہ اٹھا تو صاف نظر آ گیا کہ یہ مشرکین ہند کی حمایت میں سوراج کی خاطر تھرکیت ترک موالات یعنی نان کو آپریشن سکیم تھی۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

عوامِ مسیحی کا استعمال کریں یہ اُن کا جہاد ہے۔ اعزازی عہدے واپس کیے جائیں۔ یہ آنریری کام کرنے والوں کا جہاد ہے۔ کونسل کی ممبری چھوڑ دینا آنریل ہونے والوں کا جہاد ہے۔ سب سے بڑا جہاد طلباء و انگریزی خواہ کے لیے ہے۔ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو جب تک نہ چھوڑیں گے مجاہدین میں اُن کا شمار قطعاً نہ ہوگا۔ ساری وعیدیں جو تارکینِ جہاد کے لیے ہیں ایک وعید

بھی ان میں سے باقی نہ رہے گی جو طلباء پر صادق نہ آجائے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے ترک میں تاخیر و تدبیر بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ والدین و اساتذہ کے استشارہ و استرضاء کی بھی حاجت و فرصت نہیں۔

وہ جہاد جسے فرضِ عین کہا گیا تھا۔ وہ جہاد جس میں اولاد کو والدین اور زوجہ کو زوج کی اجازت کی حاجت نہ تھی۔ وہ جہاد جس کے لیے نفیر عام ثابت کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کے معنوں کا کسی وقت شمار کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کی صورت خاص آج تک غیر متعین تھی۔ وہ یہی مسئلہ نان کو آپریشن ہے۔۔۔ ہاں یہ ساری فتوے نویسی اور مجالس کی گرما گرمی صرف اسی لیے تھی کہ نوجوانوں کو والدین و اساتذہ سے سرکشی و تمرد پر اچھی طرح آمادہ کر دیا جائے تاکہ ملک میں ہنگامہ آرائی کے لیے ایک کافی تعداد پڑھے لکھے ناتجربہ کاروں کی ہاتھ آجائے۔

آجائے۔

اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کی سرکار سے ان حضرات کو ہجرت کا الہام ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا امتنا و صلتنا کہہ کر عمل پیرا ہو گئے۔ ملازمتیں اور کاروبار چھوڑ دیے۔ مسلمانوں کی جائیدادیں ہندوؤں کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگیں۔ مسلمانوں کو برباد کرنے کی یوں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مسلمانوں کی اس خانہ بربادی میں ہندوؤں کی خانہ آبادی تھی۔ یہ اُبڑ رہے تھے دُور رہے تھے۔ ہندو لیڈروں نے تو ایک تیر سے دو شکار کر لیے کہ اپنی قوم کو آباد اور مسلمانوں کو برباد کر دیا لیکن مسلمانوں کے لیڈروں کو خیر خواہ ملت کہا جائے یا بدخواہ؟ رہنما کہا جائے یا غدار ان قوم، جن علماء نے اس گاندھی جہاد (نان کو آپریشن) اور ہجرت برائے افادہ ہنود کو شرعی حکم کا لباس پہنایا، اسے آیات و احادیث سے مزین کر کے خدا اور رسول کا حکم بنا کر دکھایا انھیں خدا کے بندے کہا جائے یا گاندھی کے؟ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امتی کہلانے کے حقدار ہیں یا دشمنِ اسلام و

مسلمین، بت پرست گاندھی کے؛ اس صورت حال پر ایک خیر خواہ ملت کی نوحہ خوانی ملاحظہ ہو:

جہاد اور ہجرت ان دونوں اہم و اعظم مسئلوں کو جس طرح اس دور کے علمائے سیاسی نے تباہ کیا ہے تاریخ اسلام اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ مسلمانان ہند کا جو نقصان اس دس و کاؤب فتویٰ نویسی سے ہوا دیکھیے اس کی اصلاح کیونکر ہوتی ہے اور کتنا زمانہ چاہتی ہے؛ علی الخصوص لفظ جہاد میں کچھ وہ برقی قوت تھی کہ اس کے سننے سے غیر مسلموں کو ٹھنڈا پسینہ آتا تھا اور مسلمانوں کے مردہ افسردہ قلوب میں جیات و تازگی۔

اس موقع سے قبل جب کبھی اوجہاں کہیں بھی یہ لفظ کہا گیا تو مثل دیگر کلمات کے اس نے اپنے تلفظ کو وہ ہوائے عکیفت ثابت ہونے نہیں دیا جو ایک مرتبہ ٹکرا کر ہوا کی موجوں میں گم ہو جائے اور اس کڑے ارضی پر اس کا نام بھی غیر قازہ اشیاء کی فہرست میں منسلک ہو جائے بلکہ جب کبھی یہ لفظ کہا گیا اور مسلمانوں کے کانوں تک پہنچا یا گیا ہے تو کفر و شرک کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ مخلوق پرستوں اور خدا کے دشمنوں میں زلزلہ پڑ گیا ہے۔ تاریخ اقوام اور جغرافیہ ملکی میں ہمیشہ ایک عظیم تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس لفظ جہاد کے کہنے اور سننے کے ایام صفحات زمین پر ہمیشہ خون کی سُرخی اور نوکِ سنان و شمشیر سے لکھے گئے ہیں۔

لیکن آج تم نے مسلمانوں کی اس سینزدہ صد سالہ عظمت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا۔ آج تم نے سات کروڑ مسلمانوں کی دینی غیرت کو یوں ذلیل و خوار کیا۔ دیکھو غیر مسلم قومیں تم پر ہستی ہیں۔ نہ انگریزوں میں تمہاری ہلیت رہی نہ ہندوؤں میں تمہارا خوف رہا۔

تم اور تمہارا دین، تم اور تمہارا مذہب، تم اور تمہاری مذہبی تعلیم، تم اور تمہارے دینی احکام، سب کے سب نگاہِ غیر مسلم میں بیچ و فرومایہ ثابت ہوئے لیکن اس کی تمہیں کیا پروا؛ جبکہ تقریباً ایک لاکھ کا خراج تمہارے گھروں میں پہنچ گیا جبکہ ہزاروں انسان تمہیں اپنے دوشِ عقیدت پر لیے لیے پھرے۔

جبکہ ہر روز شاہد دسترخوان سے کام و زبان نئی نئی لذتیں لے رہی ہیں، تو پھر ان نعمتوں کے مقابلہ میں اسلام کیا ہے اور ایمان کیا؟

اسے سرستانِ بادۂ بیدریٰ اور ابوشش میں اگر ہمیں بتاؤ کہ تم سوراج کے لیے اٹھائے گئے تھے یا خلافت کے لیے تم نے ہندوؤں کو آمادہ کیا تھا؟ تم اسلام کی نشر و تبلیغ کا علم لے کر بڑے تھے یا کفر و شرک کی حکومت قائم کرنے کی غرض سے یہ لشکر آرائی کی گئی تھی؟ اسلام کی حقانیت اور ارکانِ اسلام کا غیر مسلم کو گرویدہ بنانا تمہارا نصب العین تھا یا خود کفر و شرک کے بال میں پھنس کر آزادیِ بند کا ترانہ سنانا مفسورہ و مطلوب تھا؟ لے

موصوف نے اس موقع پر اس بند و نواز اور زتار و دست ٹوٹے سے ایک سوال کیا جو ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے اور ان کی روشنی کے پیش نظر بے خیر خواہ دین و ملت کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اٹھتا اور اسے منظر پر کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ سوال حضرت علامہ ہی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

”پہلے اعمال جو وقوع پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں، ان سے ہندوؤں کے مطالب و مقاصد بھی ملکی کا تھکے ہو رہا ہے یا اسلام اور اسلامی خلافت کی خدمت انجام پا رہی ہے؟ جو جیسے کہ ہندوؤں کا قدم خلافتِ اسلامی کی طرف بڑھا یا سات کروڑ مسلمانوں نے بڑھ کر سوراج اور مراسم کفر و شرک کو لبیک کہا، مسلمان ہندوؤں کے ہو گئے یا ہندو مسلمانوں کے ہو رہے؟ مسلمانوں کے قلب آہنی تھے یا مقناطیسی؟ مسلمانوں نے مقناطیس بن کر ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا یا ہندوؤں نے اپنی مقناطیس سے انہیں اپنے میں جذب کر لیا؟ اس کا جواب واقعات سے ہونا چاہیے نہ خطیبانہ عبارت آرائی سے“ لے

موصوف نے ان حضرات کو کلہ گونی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا

لے سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۲۵، ۲۶

لے ایضاً: ص ۲۸

ثبوت دیتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں بالغ نظری سے ان کی کثرت کا مال سمجھایا اور یوں  
نمائش کی ہے:

علم پروانانِ نان کو آپریشن و سوراخِ اقیامت ایک دن ضرور قائم ہوگی، جہاں  
اولین و آخرین کا مجمع ہوگا اور پھر لَعْنَةُ الْمَلِكِ الْيَوْمِ۔ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ  
کی دل کپکا دینے والی آواز کے ساتھ تختِ ربِّ العالمین سامنے ہوگا۔۔۔۔  
اُس دن تمہارے سرائے و مخفیات کُل جائیں گے۔۔۔۔ اُس دن تمہیں اُس  
جلیل و جبار، قادر و قہار کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔۔۔۔  
تمہاری کیا حالت ہوگی اور تمہارے ان اعمال کا ترازو کس عمل پر کیا وزن ہوگا؟  
خلافت اور دین کا نام لے کر سوراخ اور تلقیناتِ گاندھی میں فنا ہو جانا کیا نتیجہ  
لائے گا۔۔۔۔ یقین کر لو کہ اُس روز تمہاری تلبیس کی چادر پارہ پارہ ہوگی اور  
تلبیس کا جمال ریزہ ریزہ۔ یہی لیڈری اُس دن تمہیں وبال ہوگی اور یہ ہر دلعزیزی  
تمہیں رُسوا و خوار بنائے گی۔ آج وہ بھیڑ و انبوه جس پر تمہیں ناز و تخرت ہے، آج  
وہ ہنگامہ و ہجوم جس پر تمہیں اعتماد و سہارا ہے، کل بروزِ اقیامت تم سے بیزاری  
کا اظہار کرتا ہوگا۔۔۔۔ یہ گرو و معتدین، یہ مجمعِ ارادت منداں جو آج تمہیں اس  
درجہ محبوب ہے کل بروزِ حشر تم اس سے خفا ہو گے اور دست بردار۔ شامت  
اعمال کا وبال سامنے ہوگا اور یہ ہیکڑی خاک سیاہ۔۔۔۔

اس گاندھی گردی کے دور میں مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں اور گاندھیوں کے علمائے کیسے کیسے  
افعال و اقوالِ شنیعہ و قبیحہ سرزد ہوئے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف یوں رقمطراز ہیں:  
”لا اله الا الله۔ گاندھی نے کس حُسنِ تدبیر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے  
مذہب کا غلام بنا لیا۔ ایک برس بھی گزرنے نہ پایا جو حمایتِ خلافت سے  
نہ صرف ہندو دست کش ہو گئے بلکہ اس عیارِ نہ چال سے خود مسلمانوں ہی کے

ہاتھوں نے مسئلہ خلافت کو دھتکے دے کر پس پشت ڈال دیا۔ خلیفۃ المسلیین اور امیر المؤمنین کی جگہ گاندھی کو دینی گئی۔ اب یہ مدعیانِ اسلام اسی کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے گاندھی کی محبت و عظمت سے کوئی قلبِ مومن خالی نہ رہنے پائے۔ کوئی امام مہدی علیہ السلام کا قیل کتا ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگی ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا، یعنی نبوت کے ماتحت جو سب سے بڑا رتبہ و منصب ہو سکتا ہے وہ گاندھی کا ہے۔ کوئی اپنے کو پس رو گاندھی کا کہتا ہے اور اسلام کی نجات کا اسی کے ہاتھوں سے یقین رکھتا ہے۔ مسلمان اپنے کانوں سے سنتے ہیں، آنکھوں سے اخبارات میں یہ مضامین دیکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، پھر بھی عالمِ وجد و تواجد میں اگر واہ ہمارے لیڈرو! شاباش ہمارے لیڈرو! کی رٹ لگاتے جاتے ہیں۔

فخر اہلسنت، خیر خواہ دین و ملت، علامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کی گمراہ گری اور اقوالِ شنیعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بارگاہِ مجیب الدعوات میں یوں وسیع و عا دراز کیے تھے:

”انتہائی بد نصیبی یہ ہے کہ آج اُس دینِ حنیف اور قلبِ بیٹا کے نہ صرف پیرو بلکہ اس مذہب کے عالم و علامہ ہونے کے مدعی اور علم کے ساتھ کسی سلسلہ طریقت کے شیخ ہونے کا جو ادعا رکھتے ہیں، جن کے ہاتھوں پر سیکڑوں مسلمان بیعتِ طریقت کر کے وصول الی اللہ کی راہ پاتا چاہتے ہیں، آج وہ ہیں کہ منافقوں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ: — گاندھی مذکور ہے — پس رو گاندھی کا ہونا — گاندھی کو اپنا رہنا بنا لیا ہے — اسلام کی نجات گاندھی کے ہاتھوں سے ہوگی — لا الہ الا اللہ۔ ان مدعیانِ علم نے لقد کان لکرم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ کی جو تفسیر کہ اس وقت اپنے اقوال و افعال سے

کی ہے، اُس سے اسلام اور اسلام کی تعلیم بیزار ہے۔ حق سبحانہ انہیں ہدایت فرمائے اور ان کا کھویا ہوا ایمان پھر انہیں مرحمت فرمائے بجزتہ النبی والہ الامجاد! لے حضرت علامہ مولانا سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دیدہ ور کی طرح ان حضرات کی کثرت اور اقوال شنیعہ کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے مزید فہمائش کی اور خیر خواہی کا حق ادا کرتے ہوئے مال سمجھایا ہے۔ آپ کے یہ ایمان افروز الفاظ گاندھی صومی حضرات کے لیے صورِ اسرافیل اور منصف مزاج کے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ موصوف رقمطراز ہیں:

”میرزا نجار بجنور ۱۲ فروری ۱۹۲۰ء میں مسٹر شوکت علی کی تقریر شایع ہوئی تھی اُس کے دو فقرے نقل کرتا ہوں: ”زبان بچے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے تو خدا کو راضی کر دو گے۔“ — بھائیو! خدا کی رستی کو مضبوط پکڑو۔ اگر ہم اس رستی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو پتا ہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی!“

یہ فقرات جہاں یہ بتا رہے ہیں کہ مطلع نظر ان حضرات کا کیا ہے، مذہب کی حقیقت اور وقت ان کے نزدیک کس قدر ہے، دین و مذہب کا نام کیوں لیا جاتا ہے، وہاں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہندو کے ساتھ انہیں کیسی عقیدت و ارادت ہے۔

چنانچہ جلسہ جمعیتہ العلماء میں جس کا انعقاد بہار نومبر دہلی میں ہوا، مسٹر شوکت علی نے صاف الفاظ میں یہ کہا: — ”اے اللہ! ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے کہ میں اور ہاتھ ماگاندھی یعنی بھائی ہو گئے ہیں۔“ (فتح دہلی، نومبر ۱۹۲۰ء) پھر ایک عالم نے یہ کہا: — ”خدا نے اُن (گاندھی) کو ہمارے واسطے نڈر بنا کر بھیجا ہے، قدرت نے اُن کو مدد بنا کر بھیجا ہے۔“ (فتح دہلی، ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء)۔



ایمان سے کیے، یہ جمعیت العلماء ہے یا امتِ گاندھی کا حلقہ؟ یہ اسلام اور شارعِ علیہ السلام کی طرف اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہی ہے یا گاندھی کی نبوت تسلیم کر رہی ہے؟ یہ حضرات اسلام کی بھدروی میں انگریزوں سے لڑنا چاہتے ہیں یا دینِ گاندھی کی حمایت میں؟ پھر اگر کسی نے ان کی بات نہ سنی تو کافر، منافق، زیدی، ملعون اور جہنمی کیونکر ہوا؟

یہ ذرا ان قوم! آج اخبار و جرائد تمہارے ہاتھوں میں ہیں، جسے چاہو گایاں دو، کافر کہو، حق کو باطل اور باطل کو حق کہو اور چھاپ کر شائع کرو اس وقت تو تمہاری بات بن آئی ہے، مخلوق اندھی ہو گئی ہے لیکن ایک وقت آئیگا اور ساری حقیقت عیاں ہو جائے گی۔

میدانِ کربلا میں زیدیوں نے بعد شہادتِ شہزادہ کو نین سیدنا امام حسین علیہ السلام فتح کے تقاریرے بجائے، دو دمانِ نبوت کو جس طرح چاہا، اسیر کیا۔ لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ زیدیوں پر خدا نے ایسی لعنت بھیجی کہ آج تک اُس کا سلسلہ منقطع ہوا نہ قیامت تک منقطع ہو۔ اس وقت اہل حق کے مقابلہ میں تمہیں اپنے انہو پرناز ہے، جسے چاہتے ہو حرام سے نفییت و رسوا کر اتے ہو، اہل حق قصبرِ جمیل کہہ کر ضبط کر جاتے ہیں۔

اہل حق کے مقابلہ میں مثل زید دعویٰ اجماع پیش کرتے ہو؟ صریح نصِ قرآن اور نصِ حدیث کی مخالفت اور پھر اجماع کا دعویٰ! کیا احکامِ قرآن کا نسخ اجماع سے جائز ہے؟ اور پھر اجماع بھی ایسے علماء کا جن کے پاس خدا نے گاندھی کو مذکر بنا کر بھیجا ہے، جو علماء پسِ نود گاندھی ہیں۔ جس طرح قرآن مجید تورات و انجیل کا نسخ ہے اسی طرح گاندھی کا فرمان آیاتِ الہیہ کا نسخ ان مدعیانِ علم و اجتہاد کے عقیدہ میں ہے۔ ایسے نجس و ناپاک عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے کچھ تو شرمائے الحیاء شعبۂ من الایمان۔

زیدیوں نے جب زید کی امامت و خلافت کا علم بلند کیا تو اہل حق کے

مقابل میں اُنہوں نے یہی دلیل پیش کی تھی کہ سارے ملک نے یزید کی امامت تسلیم کر لی، اجماع ہو گیا، صرف چار شخص ہیں جو اُس کی امامت تسلیم نہیں کرتے یعنی عبدالرحمن بن ابوبکر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہم۔ دیکھتے ہو وہ اجماع یزید کی امامت پر ہوا تھا، کیسا خائب و خاسر ہوا؟ عبرت پکڑو اور اہل حق کو گالیاں دینے سے باز آؤ۔ اُن کی تکلیف اور اذیت رسائی سے اپنے ہاتھ اور زبان کو منع کرو۔ تمہارے دشنام دہی کی یہ ہم گیری ہے کہ جہاں تم نے ایک رکن دین، عامی شریعتین، امام اہلسنت، مجدد مائتہ حاضرہ مؤید ملتِ طاہرہ پر سب و شتم کیا وہاں اس فقیر بے نما کو بھی بار بار متعدد جرائم میں تم نے گالیاں سنائیں۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ بیشک یہ قصور ہوا کہ جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ گنگار کی زبان کلمہ حق کہہ رہی تھی، جس وقت سارے اقلام خشک تھے مجھ بے بضاعت کا قلم مصروف تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں مفلوج تھے مجھ ضعیف کا پاؤں منزل رساں راستہ پر تھا۔ انصاف کرو اس میں میری کیا خطا ہوئی؟

یہ تو اللہ کا فضل تھا۔ تم ہلالِ احمر کے نام سے چنہ وصول کرتے تھے اور داؤد عیش و نشاط دیتے تھے۔ زرکشی کے لیے جس طرح کے مضامین ضروری تھے تم اُنہیں کو لکھتے، اُنہیں کوکتے تھے لیکن اس فقیر کو خلافت کی لوگی تھی، اس لیے ترکوں کی مختصر تاریخ پھر اُن کی خلافت، اُن کی اطاعت اور اُن کے حقوق و دلیل و برہان کے ساتھ لکھ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیے۔ دیکھو فقیر کا رسالہ البلاغ۔ تمہیں مسئلہ خلافت کی اب اگر جو دھن بھی بندھی تو ایک کافر کے تذکرہ و تلقین سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی جگہ سوراج نے خلیفۃ المسلمین سے کہیں ارفع و اعلیٰ مقام گاندھی نے اور شیخ الاسلام کا لقب شیخ الہند نے لے لیا۔

لے سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۲۲۶ تا ۲۲۹

اُسی زمانے میں گاندھوی حضرات کے غیر اسلامی نعروں سے متعلق دہلی کے مروحق نگاہ سے  
اُن کا شرعی حکم دریافت کیا گیا۔ وہ سوال اور حضرت مفتی اعظم دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایمان انہ روز  
جواب ملاحظہ ہو:

## سوال نمبر ۲۳۸

ایک شخص مسلمان جو پہلے انجمن اسلام کا ممبر تھا اب کانگریس میں شامل ہو کر نعرہ ہائے  
مندرجہ ذیل لگایا کرتا ہے: — ہما تہا گاندھی کی بجے — بھارت ماتا کی بجے —  
بندے ماترم وغیرہ۔ آیا ایسے شخص سے میل جول رکھنا اور اُس کے پیچھے نماز پڑھنا اور سوشل  
تعلقات رکھنا درست ہیں یا نہیں؟ بینوا تو چروا۔

مستفتی: — احمد رضا خاں

ایس۔ پی۔ ڈبلیو۔ آئی ریٹائرڈ

## ہو الموفق

گاندھی کو ہما تہا کہنا اور اُس کی فتح کے نعرے لگانا شرعاً ناجائز و حرام ہے کہ ہما تہا کے معنی  
ہیں رُوح اعظم اور رُوح کا اطلاق قرآن پاک میں جان پر بھی آیا ہے اور وحی پر بھی اور حضرت  
عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کو بھی یہ لقب عطا ہوا ہے اور حضرت جبریل علی نبینا وعلیہ السلام  
کو بھی۔ پس ان معانی و القاب پر نظر کرتے ہوئے اس کے یہ معانی ہوں گے کہ تمام  
جانوں میں بڑی جان یا حق تبارک و تعالیٰ کی حیثوں میں بڑی وحی یا حضرت عیسیٰ و حضرت  
جبریل علی نبینا وعلیہم السلام سے بلند مرتبہ۔

اب مسلمان خود ہی غور کر لیں کہ جس لفظ کے یہ معانی ہوں اُس کو ایسے شخص کے لیے  
جس کو نصوص قطعیہ میں ذلیل سے ذلیل بتایا گیا ہو کیونکہ استعمال کیا جا سکتا ہے؛ اسی طرح  
کفار کی شان میں ارشاد ہوا:

ان یتفقو کہ یكونوا لکم اعداء یعنی اگر کفار تم پر قابو پالیں گے تو تمہارے

و یبسطوا الیکم ایدیہم دشمن ہو جائیں گے اور تم پر دست درازی  
والسنتہم بالسوء و دوا اہذبان ندوزی کریں گے اور وہ چاہتے  
لو تکفرون ہ ہیں کہ (ان کی مانند کسی طرح) تم بھی  
کافر ہو جاؤ۔

چنانچہ اس کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی بھی ان کو قوت میسر آئی مسلمانوں کا تباہ  
کرنا ان کا پہلا فرض رہا۔ اسی تحریک میں ملاحظہ کریں کہ باوجودیکہ ابھی کامیابی کی جھلک بھی  
نہیں دکھلائی دی ہے لیکن ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ، گاندھی جی کی بجے کے مقابل  
اللہ اکبر کے نعرے نہ لگاؤ۔ وہ زمانہ گزر گیا جس میں ہم خاموشی کے ساتھ یہ نعرے سنتے رہے،  
اب ایسا نہیں لگا سکتے۔ دو روز ہوئے کہ جمعیتہ افاغنیہ چرموں دیباست بے پور، کا ایک خط  
موصول ہوا جس میں انہوں نے گلہ کیسیاں بنانے کی استدعا کی ہے اور تحریر کیا ہے کہ:  
”یہاں کے مشرکین عام طور پر فقارہ کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان اب تو گلہ  
ہمارے رو برو نہیں پڑ سکتے۔ وہ دن دور ہوئے جب وہ ایسے نادان اور  
بودے تھے کہ اس گلے کے سننے کی تاب لاسکتے تھے۔ اب ان کو سمجھ آگئی۔  
یہ گلہ تو ہندو دیوتاؤں کی شان میں گستاخی ہے۔ اس کو پکارنا ہے تو مکتہ،  
مدینہ چلے جاؤ، ہمارے دس میں اس کا کیا کام؟ (انتہی بلفظہ)

اب شاید یہ کہا جائے کہ یہ تمام ہنود کے اقوال نہیں، ان کا کیا اعتبار؟ تو پھر ذمہ دار کا قول  
لیجیے، رسالہ شدھی سماچار مورخہ ۱۵ جون ۱۹۳۰ء میں تجارت شدھی سبھا (دہلی) کے  
جنرل سیکریٹری نے شدھی اور سوراچ کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کا ترجمہ بعض اخبارات  
نے چھاپا ہے، جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

”ہیں تو جہاں حصول سوراچہ کے میدان میں لڑائی کرنا منظور ہے وہاں ہم  
ان کو دھوکا دے کر قتل کرنے والوں اور پڑوسی لٹیروں سے بھی اپنے گھر کی  
حفاظت کریں گے جو سر ڈال کر، چھپ کر ہمارے گھر میں نقب لگانے کی  
تاک میں بیٹھے ہیں۔“

غرض اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس تحریک کی فتح یا بی (کہ وہی گاندھی کی فتح ہے) کے لیے نعرے لگانا اپنی بربادی پر نعرے لگانے کے معنی میں ہوگا اور یہ یقیناً حرام ہے۔ بھارت ماتا کی بچے اور بندے ماترم کے معنی اگر صرف مادر ہند کی فتح ہی کے ہیں، تب بھی چونکہ یہ مشرکین کے خاص قومی نعرے ہیں اور ان کے شعائر سے ہیں اس لیے مسلمانوں کو ان نعروں میں بھی شرکت کرنا شرعاً جائز نہیں لہذا فیہ التثبیہ الکفار وھو ممنوع۔ فقط

محرمظہر اللہ غفر اللہ لہ

امام مسجد فتحپوری دہلی (۱۹۳۰ء)

اس فتوے کا ہر لفظ کتنا ایمان افروز اور رہنمائی کے جذبات سے بھرپور ہے لیکن افسوس! گاندھی جی حضرات مشرکین ہمد کی محبت میں کچھ ایسے سرشار ہو گئے تھے کہ کسی کی آواز پر کان دھرتا اپنی توہین سمجھنے لگے۔ اس کے برعکس ان کی تمام تر یاقین اور صلاحیتیں ہندو مسلم اتحاد کی خاطر وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے صدر محترم عالی جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نے ترک موالات پر زور دیتے ہوئے اپنی دیانت و ادنیٰ کائیوں مظاہرہ کیا:

حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نہایت خیطہ غضب اور پرجوش لبوں میں نام تمام عبارت ابن جریر کی نقل فرما کر یہ نتیجہ استخراج فرماتے ہیں کہ: "اگر اس کے بعد بھی یہ کہا جائے کہ نہیں مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ بھی ترک موالات کرنی چاہیے تو اب کھنے والوں کو خدا ہی بہتر سمجھا سکتا ہے۔" خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ جمعیت العلماء ص ۱۵) طرفی یہ کہ بڑا اقساط کا صحیح ترجمہ خود بالائی سطروں میں حکیم صاحب نے احسان و انصاف تو فرمایا ہے لیکن استخراج نتیجہ میں موالات کو بڑا اقساط کا مراد قرار دے کر عوام کو نہایت شرمناک دھوکا دینے کی کوشش کی ہے؛ لہٰذا

موصوف کی اس کتب بیونت کا یعنی کلام الہی میں معنوی تعریف کا علامہ سلیمان اشرف بہاری

۱۔ محمد سعید احمد پروفیسر: فتویٰ مظہری مطبوعہ کراچی، ص ۳۲۹، ۳۲۸  
۲۔ سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۹۴، ۹۵

رحمۃ اللہ علیہ نے تعاقب کرتے ہوئے تفسیر ابن جریر کی عبارت کو مد نظر رکھ کر، یوں گاندھویت کا کھوٹ سمجھایا تھا:

”جن چیزوں کو ابن جریر نے آیت کریمہ لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء کی تفسیر میں موالات کہا تھا ان میں سے کسی ایک کی بھی اجازت و رغبت آیت لا ینہاکم اللہ الخ سے نہ بھی نہ لکھی، بلکہ ان کی ممانعت کی۔ اس مقام پر مرکز تصریح فرما کر ہر کافر کے ساتھ ہر حال میں ترک موالات پر مؤثر فرمادی۔ کیا اب بھی حکیم صاحب یہی ارشاد فرمائیں گے کہ بڑا قساط مراد وہ موالات ہیں؛ ان تصریحات کے بعد بھی اگر حکیم صاحب یا ان کے حواریین علمائے سیاسی اپنے اس قول پر کہ ہندوؤں سے موالات یا وادیا محبت منطوق کلام الہی اور موافق تعلیم نبوی ہے، متعصبا نہ اصرار فرمائیں تو بجز گاندھی صاحب کے اور کوئی انہیں سمجھا نہیں سکتا!“

حضرت بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے حضرات کی بے پرست نوازی اور زناہ دوستی پر افسوس کرتے ہوئے انہیں شاہراہ اسلام و ایمان سمجھانے کی، ایک حقیقی خیر خواہ بن کر بڑے درد بھر سے دل سے کوشش کی اور اپنے قلبی جذبات کو صفحہ قرطاس پر سما کر یوں گاندھوی حضرات کے سامنے پیش کیا:

”اے پرستارِ ان ہنود! کبھی ایمان کی قوت اور اسلامی اخلاق کی کشش بھی تم نے نہ لکھی ہے؛ کبھی تم نے کلمہ توحید جس دل پر نقش ہو اس کے نعرہ بکیر کے زور و طاقت کا خیال بھی کیا ہے؛ تمہاری مادی آنکھیں کفار کی جمعیت دیکھ کر پتھر اگئیں۔ تمہارے مادی دماغ کفار کی قوتِ فکریہ سے لرزاں و ترستاں ہو گئے۔ لیکن کیا تمہارے پاس بچی کھچی کچھ ایمان کی بھی پونجی ہے؛ میری دلی دعا ہے کہ اس کا جواب تم اثبات میں دے سکو، پھر میں تم سے یہ کہوں کہ ایمان

کے نور سے توحید و خدا پرستی کے زور و قوت کا نظارہ کرو تو تمہیں اصل شاہراہ  
عمل معلوم ہو جائے۔ میری درد مندانہ گزارش تھتب اور ہٹ دھرمی سے  
یکسو ہو کر سنو۔ اس وقت سیاسی مفقیوں نے الہاماتِ گاندھی سے متاثر  
و مستفیض ہو کر موالات کی جو تعریف بیان کی ہے اور جن چیزوں کو مصداقِ موالات  
قرار دیا ہے وہ محض القائے گاندھی کی تعبیل ہے، اس کا نتیجہ حقیقی اسلامی  
خدمت سے تغافل و بے پروائی ہے۔

ایک مقام پر آپ نے مسلمانوں کے لیڈر کھلانے والوں اور گاندھی صوبی علماء کو زور دار لفظوں  
میں غیرت دلاتے ہوئے ان کی لیڈری اور علاقگی کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

اے گدو ناخدا ترس! اسے جماعتِ علمائے صوبائیوں کہو کہ یہ احادیث اور  
یہ حکم الہی تو آج تک تمہیں نسبتاً تمہیں اس لیے کہ تمہارا رہبر اور تمہارا  
ذکر تو گاندھی ہے۔ آج تک اس نے تمہیں زیادہ دلایا تو پھر تمہیں یاد کیونکر  
آتے؟ اگر قرآن شریف یا کتبِ احادیث و سیر تمہارے رہبر و ذکر ہوتے تو  
تمہیں سب کچھ یاد آجاتا۔ فی الحقیقت تم منحدر ہو، تمہارا امر تہ عوام کا ہے،  
تمہارے دماغِ علوم سے خالی، تمہارے سینے جذبات سے کورے، تمہارے  
قلوبِ دولتِ ایمانی سے مفلس، تمہاری زبانیں گنگ اور تمہارے اقلام  
خشک۔ تم تو ایک قالبِ بے جان ہو۔ جو تمہارے لیڈر کہتے ہیں تم اسی کی  
محاکات کر دیتے ہو اور ان لیڈروں کا بیخِ فیض سرکارِ گاندھی اور ان کی ہنود پارٹی  
ہے۔ سلسلہ یوں ہے کہ ایک تحریک سرکارِ گاندھی پیش کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ  
مسلمان اُسے ایک کہتے ہیں، علماء سیاسی کاچہ و عمامہ اُسے شرعی جامہ  
پہنتا ہے۔ ان علماء کی یہ مجال نہیں کہ وہ بطور خود کوئی تحریک پیش کر سکیں  
یا کسی تحریک کے سامنے امتنا و صدقنا کے سوا کوئی آواز بلند کرنے کی جرات

بھی کریں۔

۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں بنارس کے مسلمانوں پر رمضان المبارک میں جمعیتہ العلماء ہند کے خداوندانِ نعمت یعنی مشرکین ہند نے ایک قیامت برپا کر دی۔ سفاکی کے تمام مرحلے طے کر دیے گئے لیکن ہندو مسلم اتحاد کاراگ الاپنے والے گاندھی جی سے آنا بھی نہ ہو سکا کہ ان کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالتے۔ اپنے پروردگاروں کی بارگاہ میں تو اپیل کرتے کہ سرکار! ہم تو آپ کے بندے بے دام ہیں، ذرا ظلم و ستم ڈھاتے وقت ہماری حوصلہ شکنی کا کچھ تو لحاظ فرمایا کیجیے۔ ہندو لیڈروں حتیٰ کہ گاندھی تک مسلمانوں کی ہمدردی یا ہنر بے بہبود کو سمجھانے پر ایک منٹ بھی صرف کرنا تفسیحِ اوقات شمار کیا، بلکہ اس گاندھی جی کو لے کر پاسِ خاطر سے بھوٹ موٹ بھی ایک لفظ تک ہمدردی کا منہ نہ نکالا۔ ان حالات میں تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ درود بھر سے دل سے جمعیتہ العلماء ہند کے سنگدل اور ملت فروش صاحبانِ جبر و دستار سے سوال کرتے ہیں،

”ہندوؤں کا کلہ پڑھنے والی جمعیتہ العلماء کو کچھ خبر ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ میں بنارس کی سبزیوں کے خون سے لالہ زار بنا ڈالی۔ ماہ مبارک ان کے لیے محرم بن گیا۔ ورنہ صفت ہندوؤں نے بے گناہ مسلمانوں کو اس بے رحمی سے شہید کیا جس کے تصور سے دل کانپتا ہے۔ گھر کے گھر صاف کر دیے۔ پتے تک قتل کر ڈالے۔ مسجدیں مسمار کر دیں۔ گڑکانیں ٹوٹ لیں۔ ظلم و ستم کا سیلاب اُمنڈتا پھلا آتا ہے۔ جو روحنا کے سمندر میں طغیانی تھی۔ مسلح ہندو گنڈاسوں اور بجالوں سے بے خبر نیت مسلمانوں پر بلائے ناگہانی یں کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ دھوکے دے دے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے محلے میں لے جا کر شہید کرتے تھے۔ جمعیتہ الوداع کی نماز تک مسلمان اس مصیبت کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔“

لے سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۱۵۰، ۱۵۱



مسلمانوں کی اس مصیبت کا جمعیت العلماء کو کچھ رزد ہوا، حمیت کچھ حرکت میں آئی؟ ہندو پرستانہ جذبات کچھ بھی سر ہوئے؛ ہندوؤں کے فدائی اپنی بے جا فداکاری پر کچھ بھی تا دم و شرمندہ ہوئے؛ آئندہ کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے ہوشیار رہنے اور اپنا تحفظ کرنے کا کوئی مشورہ دیا؛ یا اپنے ہندو خداوندانِ لغت سے کوئی اپیل کی؛ جن کے قدموں پر سر جھکاتے ہیں ان سے ہندوؤں کے ان مظالم کی کچھ شکایت کی؛ اپنے قبیلہ و گھرانے کی گالیوں کو لیا کر بنارس کے قتل کی سیر کرائی؛ ہندو لیڈروں سے جن کی غلامی کیا کرتے ہیں ان ہولناک مظالم کو روکنے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کرنے کی کوئی تحریک کی؛ یا ہندو لیڈر اس جمعیت العلماء کی فداکاری کی قدر کر کے مسلمانوں کی دلجوئی کرنے بنارس گئے؛ یا انھوں نے ہندوؤں کی ان امن سوز خوشخواریوں پر اظہارِ نفرت و ملامت کیا؛ عدیمِ تشدد کا وظیفہ پڑھنے والے گاندھی نے ہندوؤں کے اس ہولناک تشدد پر کوئی مؤثر کارروائی کی؛ تمہاری ہمدردی میں ہندوؤں نے کچھ کیا ہوتا تھا؛ یا انھوں نے تمہاری عنیامانہ اطاعت شعاری کو بے التفاتی سے ٹھکرایا؛ مسلمانوں کے خون کی قیمت ان کی نظر میں کچھ بھی نہ ٹھہری؛ پھر بھی تمہاری غیرت تمہیں ہندو پرستی کی اجازت دے گی؛ اب بھی تم ہندوؤں کے ظلم بنے رہو گے؛ اب بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے گی؛ اب بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کی اطاعت و فرمانبرداری کی دعوت دیا کرو گے؛ کہو اب بھی تمہارا تشدد اترا یا ہندوستان میں ہر جگہ ایسی ہی بربادی دیکھنا چاہتے ہو؟“ لے

بنارس کے بعد ہندوؤں نے مرزا پور، آگرہ اور دیگر کتنے ہی مقامات پر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ لیکن کسی ہندو لیڈر نے افسوس کا ایک لفظ نہ کہا، نہ اپنی قوم کو سمجھانے کا کوئی وعدہ

لے محمد عمر نعیمی، مولانا، السواد الاعظم، بابت شوال ۱۳۲۹ھ، ص ۲

ہی کیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں اور گاندھیوں کی ذنار دوستی اور بت پرست نوازی میں سب سے بڑا فرق نہ آیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر مولانا قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی جذبات لفظوں کی صورت میں یوں صفحہ قرطاس پر بکھر گئے:

”بنارس کے دلہ وز واقعات اور مسلمانوں پر ہندوؤں کے خونخوار حملوں نے جو طوفان برپا کیا تھا ابھی وہ پورے طور پر ساکن نہ ہونے پایا تھا کہ لوارج بنارس و مرزا پورہ آگرہ سے خونیں ہنگاموں کی اطلاع ملی۔ ہندوؤں کے نیزے تیر و منان مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہندوستان کی جیو ہتیانہ کرنے والی قوم مسلمانوں کے خون بہانے پر تلی ہوئی ہے اور اس کی آتش خلیط کے تند و تیز شعلے بڑے زور سے بھڑک رہے ہیں۔ ہندو لیڈر اور چند ہندو پرست مسلم نما مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کا سبز باغ دکھا کر مغالطہ میں ڈال رہے ہیں مسلمانوں کی جان پر بنی ہوئی ہے، ان کے زن و فرزند قتل کیے جاتے ہیں، مال لوٹے جاتے ہیں، گھر بار برباد کیے جاتے ہیں، مسجدیں مسمار ہوتی ہیں، مگر کوئی لیڈر صاحب پلیٹ فارم چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں کے قتل میں نہیں پہنچتے اور ہندوؤں کو باکس و زندہ و ش سفاکی، جفا جوئی سے نہیں روکتے۔ اگر درحقیقت یہ قوم مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی ارادہ اتفاق رکھتی تو اپنے ہم قوموں کی ان ہنگامہ آرائیوں و جفا شعاروں کو روکنے کے لیے میدان عمل میں آتی۔ گاندھی صاحب مزے مزے کی تقریروں میں مصروف ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جیسی باتیں بتیوں نے ہمیشہ بنا بنا کر مسلمانوں کا دیوا لیکر دیا۔۔۔۔۔ ہمیں اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار گاندھی ہندوؤں کے ان مظالم کو دیکھ کر کیوں نہیں گھبرا اٹھا اور اس نے اپنی قوم کو جا کر عدم تشدد اور شانتی کا درس کیوں نہیں دیا؟ آج وہ اپنے اس رٹے ہوئے سبق کو کیوں بھول رہا ہے اور ہندو قوم کو خونخواری سے روکنے کے لیے میدان عمل میں پہنچنے کے واسطے اس کا

قدم کیوں نہیں جنبش کرتا؟ کیا ایسے ہی شخص کو مسلمانوں کا بھروسہ، ملک کا خیر خواہ، امن  
کا حامی کہا جاسکتا ہے؟ لے

ہندو کی بے وفائی، محسن کشی، خود غرضی اور عیاری ایک ایسی مسلح حقیقت ہے جس کا ہمیشہ مظاہرہ  
ہوتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود جو حضرات ہندوؤں کے بندہ بے دام اور ہاتھ جوڑ کر غلام بنے ان  
کی قلت فروشی میں کون سے انصاف پسند اور صاحب عقل و دانش کو شبہ ہو سکتا ہے؟ حضرت  
صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے ہندو بے بہنو  
اور گاندھیوں کی ذہنیت کا یوں تجزیہ کیا ہے :

”ہندوؤں کی بے وفائی کا ایک دو مرتبہ نہیں، دس مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ نہیں،  
روزمرہ ہر کہیں تجربہ ہوتا ہے۔ ان کا بچہ بچہ مسلمانوں کی عداوت و ایذا رسانی  
کے بخار میں مست و سرشار ہے۔ سلطنتِ اسلام کے عہد میں شاہانِ اسلام کے  
مراجمِ خسروانہ اس قوم کے مجال پر بندوبست رہے، انہیں تعلیم دی، علم سکھایا،  
شاہتہ بنایا، وزارتیں دیں، عہدے اور منصب دیے، جاگیریں دیں، انعام  
و اکرام کیے، جن کے اثر آج تک باقی ہیں۔ لیکن اس قوم کی محسن کشی و غداری  
اُس زمانے میں ہی نہ شرمانی اور عنایات و اکرام کے سامنے ممنون احسان ہو کر  
خمیدہ سر نہ ہونی۔ پروپیگنڈے، ریشہ دو اتیاں، بداندیشی و بدخواہی ان کی  
طرف سے ہمیشہ جاری رہی۔ اچھے سلوکوں کا انہوں نے ہمیشہ بُرا بدلہ کیا اور اُس  
محسن سلطنت کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہمیشہ لگے ہی رہے مگر غلامانہ  
ذہنیت کے ساتھ دشمنی پر دوستی کا اور بدخواہی پر خیر خواہی کا، غداری پر وفاداری  
کا پردہ ڈالے رکھا۔ سلطنتِ اسلام کے بعد سے آج تک بھی ان کا یہی طریق  
عمل ہے۔“

وہ مسلمانوں کو نجس و ناپاک سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کی چھوٹی ہوئی چیز

لے قاضی احسان الحق نعیمی، مولانا، السواد الاعظم، بابت شوال ۱۳۴۹ھ، ص ۴، ۵

پیدہ جانتے ہیں۔ جب نفرت کا یہ عالم ہے تو ایذا رسانی سے وہ کس طرح صبر کر سکتے؟ آدمی جس چیز کو ناپاک سمجھتا ہے اس کو دفع کرنے پر اس کی طبیعت مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے ہر قرن اور ہر زمانہ میں ہندو طرح طرح کے حیلوں اور تدبیروں سے مسلمانوں کو مٹانے میں کوشاں رہے۔ اب سے دس سال قبل جب ہندو مسلم اتحاد کے علم بلند کیے گئے اور مسلمان جاہل خود رائے لیڈروں کے اغواء سے ہندوؤں پر فدا ہو رہے تھے۔ جوشنِ محبت میں بہت سی ناکردنی حرکات کے مرتکب ہوئے، ہندوؤں کو مسجدوں میں بلایا، منبروں پر بٹھایا، پیشانیوں پر قشتے لگائے، چہروں پر گلاب لگوائے، ہولیوں میں خاک اڑائی، ہندو مردوں کی مکٹھیاں اٹھائیں، بچے کے نعرے لگائے، قربانی کی گائیں گوشالوں میں پہنچائیں، کشتگانِ امرتسر کی بڑیا لیں کیں۔ انہیں شہید بنایا، سب کو چھوڑ دیا، مگر ہندوؤں نے ستر رانی کی خصلت نہ چھوڑی، ان کی جنا کاریوں میں فرق نہ آیا۔ آره، شاہ پور اور کٹار پور کے مظالم سے بھی سیرتہ ہوئے۔ ملک بھر میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں، مسجدوں کی بے حرمتی کی، نمازوں کے وقت مسجدوں کے سامنے باجا بجا کر مسلمانوں کو تنگ اور آزرہ کیا۔ اس حد سے مار دھاڑ شروع کی، ہزار ہا بگیناہ مسلمانوں کو قتل کر ڈالا، لوٹ لیا، گھروں کو آگ لگادی، جلتی آگ میں مسلمانوں کو ڈال کر پھونک دیا۔

تلخ تجربے ہونے کے بعد کون مسلمان تھا جو ہندوؤں سے اُمید و فاکرہ؟ اُمید خیر خواہی رکھتا؟ تمام ملک کے مسلمان ان کے دستِ تم سے نالاں تھے، ان کی حکومت پر کیسے راضی ہوتے؟ اس لیے موجودہ زمانے کی تحریکات کانگریس میں مسلمان بالکل علیحدہ رہے۔ ان کا کوئی طبقہ شریک نہ ہوا۔ یہ روش مسلمانوں کے لیے بہت بہتر تھی۔ اس فرصت کو بہت غنیمت سمجھتے اور اپنی بگڑی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ مگر ہندوؤں نے محسوس کیا کہ یہ علیحدگی مسلمانوں کو لفع پہنچائے گی اور اس فرصت میں وہ کچھ نہ کچھ کمزوری رفع کرنے

میں کامیاب ہو جائیں گے اور گورنمنٹ کا مقابلہ تنہا ہندوؤں سے رہ جائے گا۔  
 اُس کا جو غیازہ بھگتنا ہو گا وہ تنہا ہندو قومیت کے سر پڑے گا۔ اگر مسلمان  
 شریک ہوئے ہوتے تو مرنے، پٹنے، قید ہونے کے موقعوں پر انہیں پیش کیا جاتا  
 اور یار لوگ کتنی کاٹ جاتے۔ اس خیال سے انہیں بہت فکر تھی کہ مسلمانوں کو  
 اس تحریک میں کس طرح شامل کیا جائے؛ مگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ ان کے ہاتھ  
 نہ آیا، البتہ چند خود غرض لوگ ان کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کو  
 مقدم رکھ کر قوم کے ساتھ غداری کی اور مسلمانوں کو شرکتِ کانگریس کی دعوت دی  
 اور ہندوؤں کے روپیہ سے مدد لے کر اغوائے اہل اسلام کا کام جاری رکھا۔  
 اس قلیل، طماع، خود غرض جماعت نے اپنا نام جمعیت العلماء رکھا  
 مسلمانوں کو مغالطہ دیا کہ یہ ہندوستان کے تمام علماء کی جمعیت ہے باوجودیکہ  
 تمام علمائے ہند اس کے سخت مخالف ہیں اور اس نام نہاد جمعیت کو جمعیت  
 السنوہ جانتے ہیں۔ جو چند ذی وقار علماء اس میں پہلے کسی وجہ سے شریک  
 ہو گئے تھے اس وقت وہ بھی علیحدہ ہو گئے۔ گلتی کے اٹھ دس نام کے مولوی  
 رہ گئے جنہوں نے اپنا ضمیر ہندوؤں کے ہاتھ کھوٹے داموں کو فروخت کر دیا  
 اور کانگریسی پروپیگنڈا کے ایجنٹ ہو گئے اور کسی نہ کسی قدر مسلمانوں کو مغالطہ  
 دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خطرناک جماعت ہندوؤں کی کٹھ پتلی ہے، ان  
 کے اشاروں پر رقص کیا کرتی ہے۔ مسلمان اس سے متفق نہیں، نہ ملک کا کوئی  
 معتمد شخص ان کے ساتھ شریک عمل ہے۔ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ  
 رہنا چاہیے کہ نام نہاد جمعیت العلماء ہندوستان کے علماء یا عام اہل اسلام  
 کی نائب و ترجمان نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں سے ساز باز  
 کرنے کی مجرم ہے۔ اس نے اپنے نفع کی خاطر بہت سے مسلمانوں کو غلطی  
 میں ڈالا اور نقصان میں مبتلا کیا۔ غلط فتوے دیتے رہنے، بے فائدہ ہندو  
 تحریک پر مرنے والوں کو شہید بتا کر مسلمانوں کو جانیں کھونے پر آمادہ کیا۔ مسلمان

اس غدار، مسلم کش، ہندو پرست جماعت کے دامِ تزویر سے بچیں۔ لے

۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء میں حضرت مفتی اعظم دہلی، سیدی و مرشدی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ہنود کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت اور مسٹر گاندھی کے احکامات کی پیروی کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ کا جواب خلوص و ولہیت اور تقویٰ و طہارت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کی وسیع النظری اور اعلیٰ کلمۃ الحق میں کوشاں رہنے کا زندہ ثبوت ہے۔ دہلی جیسے شہر میں جو دہلیہ سے بھر پور اور گاندھیوی حضرات کا ہیڈ کوارٹر ہو وہاں آپ کا لومہ لائٹ سے بے خوف ہو کر علی الاعلان حق بات کہنا اور کسی بڑی سے بڑی طاقت کو خطرے میں نہ لانا حق پرستی کی عظیم الشان مثال ہے۔ اب وہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے اور حق و صداقت کی داد دیجئے۔

## سوال نمبر ۲۳۹

۱۔ آج کل قوم ہنود آزادی حاصل کرنے میں بڑی سرگرم نظر آتی ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا، کہ حکومت کی قانون شکنی کر کے اس کو مجبور کیا جائے تاکہ وہ ہم کو آزاد تسلیم کرے۔ اگر اس مقابلہ میں حکومت کی جانب سے نقصان برداشت کرنے پڑیں تو ان کو بھی بلا مدافعت برداشت کیا جائے، یہاں تک کہ ان کی گولیاں اپنے سینے پر لی جائیں لیکن قدم پیچھے نہ ہٹے۔ پس اس صورت میں ہنود کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت جائز ہے یا نہیں اور اس امر میں جمعیت العلماء کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے حق بجانب ہے یا اس سے غلطی ہوئی؟

۲۔ اگر اس مقابلہ میں کوئی مسلمان گولی گننے کی وجہ سے مرتد ہو گیا یا نہیں؟

۳۔ محض اس لیے کھڑے ہونا کہ ہنود اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں اور شرک کا بول بالا رہے اور اس کو اپنے لیے بمنزلہ فرض کے سمجھنا اور جو لوگ کھڑے نہ پہنتے ہوں ان کو

لے نعیم الدین، مراد آبادی، مولانا، السواد الاعظم، بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ، ص ۳ تا ۵

بہ نظرِ حقارت دیکھنا، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اُن کی نمازوں میں قصور بتلانا، یہ سب امور جائز ہیں یا نہیں؟

۴۔ مشرک قانونِ نمک کے توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ اس پر کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، لہذا اُس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ پس یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ بیذا بالہ لائل۔

## الجواب

۱۔ مسلمانوں کا آزاد ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ احکامِ کفریک قلم نابود ہو جائیں اور اہل اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے جو مطلوب شارع ہے اور ہندوؤں کی آزادی یہ ہے کہ مسلمانوں کو نیت کر دیں اور کسی مسلم کو یہ قوت نہ رہے کہ وہ مشرک اور کفر کی برائی بھی کر سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دونوں آزادیوں میں تضاد ہے۔ ایک ملک میں دونوں آزادیوں کا اجتماع محالاتِ تشبیہ سے ہے۔

پس صورتِ مذکورہ میں اگر آزادی ہو سکتی ہے تو ان دونوں قوموں میں سے صرف ایک قوم آزاد ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں غیر آزاد قوم یقیناً آزاد قوم سے مغلوب رہے گی۔ اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی آزادی چاہتے ہیں؛ ہرگز نہیں۔ اخبارِ بین حضرات پر اچھی طرح روشن ہے کہ ہندو کا اصلی نشانہ اپنی بھی کامل آزادی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو وہ قوت میسر آجائے جس سے مسلمانوں کی مالی قوت تو برباد کر ہی چکے ہیں، دینی قوت بھی مٹا دالیں کہ آج اس کی کوشش کی جاتی ہے تو گورنمنٹ اڑے آتی ہے، جب ہم خود مختار ہو جائیں گے تو اپنے تئیں ممبروں میں مسلمانوں کے دس ممبروں کو جذب کر لینا کون سی بڑی بات ہوگی کہ اول تو وہ ممبر خود بھی ایسے ہوں گے جو ہماری آواز پر لیک کہنے والے ہوں گے، لہذا اگر کبھی انھوں نے کسمانا چاہا بھی تو پھر کثرتِ رائے کے بھاری پہاڑ سے بچ کر اُن کے لیے بھاگنے کی راہ بھی کہاں ہوگی، غرض پھر جس طرح نچائیں گے اُن کو

ناچنا پڑے گا۔ کیا ساروا ایکٹ کے مسئلہ سے تجربہ نہ ہو چکا جو ہندو مسلم ممبروں کی کھٹی ٹیٹے پاس کر دیا، وہ آجکل اٹل ہے۔ اس کے منسوخ کرانے میں کیا دقیقہ اٹھا رکھا گیا؛ لیکن بائینہ آج تک اس کو جنبش نہیں ہوئی اور گورنمنٹ کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کیا کریں؛ یہ سب تمہارے نمائندوں کی روشنی و ماخ کا نتیجہ ہے۔

پھر ہم نے تو احتیاطاً تمہارے بعض معتد علیہ علما سے بھی دریافت کر لیا تھا۔ لیکن جب ہم ان سے بھی اجازت مل جائے تو پھر ہمارا کیا تصور؛ دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب کسی ملک میں مختلف مذاہب موجود ہوں اور کوئی اصلاحی اسکیم جاری کی جائے تو اُس وقت اصلاح معاشرت عام ہوتی ہے، کسی خاص قوم کا اُس میں استثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی قسم کے اور بھی جواب دیے جاتے ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب چینیے چلاتے رہو، جو ہونا تھا ہو چکا۔ غرض یہی قعد آئے دن اُس وقت ہوگا جب یہ دنیا کے ولداہ منصب حکومت پر فائز ہوں گے اور ذہر کفر و غسلِ اسلام کی مہون تیار کر کے اُس کے ساتھ قوم کا علاج شروع کریں گے۔

مسلمانو! جوش میں آؤ۔ اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد نہ کرو۔ اس مسئلے میں جمعیت العلماء ہریا کوئی دوسری جماعت، جو بھی تم کو شکر ت مشرکین کی رائے دے وہ سخت غلطی میں ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، بیسیوں آیات میں اس کی حرمت ظاہر و باہر ہے۔ تبرکاً صرف دو آیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے، یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا بطلانہ (الایہ) مسلمانو! خیروں کو اپنا سمیعی نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی میں مگی د کریں گے۔ اُنھیں تمہارا تکلیف میں پڑنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی زبانوں سے دشمنی ظاہر ہو رہی ہے اور جو امور اُن کے سینوں میں پوشیدہ ہیں وہ اور بھی زیادہ سخت ہیں۔ اگر تم کو عقل ہے تو ہم نے کھلی نشانیاں بیان کر دیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے، یا ایھا الذین امنوا ان تطیعوا الذین صعدوا (الایہ) مسلمانو! اگر تم نے کافروں کا کہتا مان لیا تو یاد رکھنا وہ تم کو الٹا پھیر دیں گے (اور تمہاری پھلی پستی کا تم کو نظارہ پھر تم کو دکھلا دیں گے) پھر تم نقصان



میں جا پڑو گے (یہ تمہاری کیا مدد کریں گے تم اپنے پاؤں پر کھڑے تو ہو) افسہ تمہاری مدد  
 کرے گا اور اس کی مدد سب سے بہتر ہے۔ ہم عنقریب تمہارا رعب کافروں کے دلوں  
 میں ڈالے دیتے ہیں۔

بعض مسلمانوں کو جو بات ہندو کی ہمراہی پر ابھار رہی ہے، یہ ہے کہ اب یہ  
 اُن کے ذہن نشین ہو چکا ہے کہ جس روش پر اس قوم کی اس وقت جدوجہد ہے اگر کچھ  
 زمانہ یوں ہی رہی تو ضرور بازی لے جائیں گے۔ پھر ہمیں سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہ  
 آنے گا اور جب اُنھوں نے حقوق حاصل کر لیے تو یہ گورنمنٹ اور نیرودہ سری سلطنتوں  
 کی نگاہ میں معزز ہو جائیں گے اور ہم ذلت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ سو اس کا  
 جواب یہ ہے کہ اول تو جن حقوق کا مطالبہ ہے وہ خالص ہندو کے حقوق نہیں ہیں، بلکہ  
 مشترکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے ہیں۔ تو اگر حاصل ہو بھی گئے تو مسلمان محروم نہ  
 رہیں گے۔ پھر خواہ مخواہ اُن کا اس بُری صورت کے ساتھ دخل انداز ہونا کیا معنی خصوصاً  
 جبکہ ہندو بھی کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کی شرکت کی حاجت نہیں اور اگر کہتے ہیں کہ ہمارے  
 حقوق برائے نام ہیں اصل میں وہ حقوق زیادہ تر اُنھیں کے حق میں مفید ہوں گے۔ تو  
 اس کا جواب یہ ہے کہ پھر اُن کے حاصل کرنے کے لیے آپ کیوں کوشاں ہیں؟ آپ کو  
 چاہیے کہ گورنمنٹ کی خدمت میں ایسے حقوق پیش کریں جو آپ کے لیے مفید ہوں مگر  
 قانونی حدود میں رہتے ہوئے اور تہذیب کے ساتھ تاکہ بلا کسی نقصان کے آپ کو  
 حقیقی کامیابی میسر آجائے، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ درخواست کنندگان میں سے گورنمنٹ  
 ایسے اشخاص کو محروم رکھے جو اس کے قواعد کے ساتھ درخواست کرتے ہیں اور اُن کو  
 کامیاب بنا دے جو اس کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ رہا عزت کا سوال۔ ان کے  
 ساتھ تو شرکت ممنوع ہے لقولہ تعالیٰ:

أَيُّتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ

فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا۔

کیا تم اُن کی شرکت میں عزت ڈھونڈ

رہے ہو؟ عزت تو تمام کی تمام محض اللہ

ہی کے لیے ہے۔

پس عزت اگر ہے تو صرف اس میں کہ حاکم حقیقی کے حکم کے آگے کسی کے حکم کی پروا نہ کی جائے اور تمام مسلمان اتفاق کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ عامل ہو جائیں، پھر ہو نہیں سکتا کہ کامیابی ہمارے قدم نہ چوم لے۔ اگر یہی تفریق اور بددینی رہی تو ذلت کی شکایت بے جا ہے کہ اس کا ارشاد ہو چکا:

واطيعوا الله واطيعوا الرسول  
ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب  
سريركم۔  
اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری  
کو اور آپس میں تنازعہ نہ ڈالو ورنہ  
تم کم ہمت اور سست پڑ جاؤ گے  
اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

سچ فرمایا باری تعالیٰ جل مجدہ نے۔ انگریزوں نے آج سے دو سو سال پہلے (۱۷۳۹ء میں) اگرچہ  
مالت بہت تباہ ہو چکی تھی مگر پھر بھی کسی ہوا بندھی ہوئی تھی؛ لیکن جب تم نے اسی اللہ تعالیٰ  
کے حکم کی مخالفت کی اور ہنود سے دوستی گانٹھی اور جو کچھ اسلام کے خلاف نہ کرنا تھا، وہ کیا،  
جس کے بیان کے لیے مفاترہ بھی گنجائش نہیں رکھتے، یہاں تک کہ مخالفین کو سارے گھر کے  
بھید دیے اور ان کی دلی مراد پوری کر دی کہ آپس میں اچھی طرح مخالفت پیدا کر لی اور آج وہ  
مالت ہو گئی کہ وہ تم کو کسی شہر میں نہیں لاتے۔ لیکن تمہاری شرابِ محبت کا شمار اب بھی نہیں اترتا  
اسی کوشش میں لگ رہے ہو کہ کسی طرح رہی سہی یہ اسلامی شان بھی ہندوستان سے مٹ  
جائے۔ ہنود کے روزمرہ کے سلوک دیکھو کہ وہ کبھی نہیں آتے۔ لیکن انہیں ایسی پیٹ ہو گئی ہیں کہ کچھ سوچتا  
ہی نہیں۔

مسلمانوں! خدارا خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور بہت جلد ان وسائل سے کام لو جن سے  
آپس کا اتفاق نصیب ہوتا ہے کہ اجتماعی قوت سے آنے والی مشکلات کی وادعت کر سکو کہ  
آج ایک قوت کے کشمکش کا رونا رو رہے ہو، کل دوسری قوت کے مظالم کا سامنا پڑنا ہے۔  
لیکن تمہاری ہر کوشش اور ہر نفل و حرکت مجلسِ اعلیٰ کے لئے کلمہ اللہ کے لیے اور پابندیِ دین کے لیے  
ساتھ ہو، ورنہ کامیابی کی امید نہ رکھنا۔

اس مسئلے میں نصوص صریحہ قطعیہ کی مخالفت کی جا رہی ہے، لہذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ

(جس) جلسہ میں اُس کے سامنے اس نام نہاد جنگِ آزادی میں شرکت کا مسئلہ پیش ہو وہ صاف بلند آواز سے کہہ دے کہ ہم شرکت سے ہرگز راضی نہیں۔ اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں ورنہ زیادہ کہیں کہ قیامت میں اُس سے سخت باز پرس ہوگی۔

بعض لوگ شرکتِ مشرکین پر یہ بیان کر کے اُجھا رہے ہیں کہ غیر مسلم قومِ حیبِ مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے ملک کو اُس سے آزاد کرانے۔ سو یاد رہے کہ مسئلہ تو یوں ہی ہے مگر اول تو یہ ہر مسلمان پر فرض نہیں بلکہ اُن مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو آزاد کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے مسلمان اس پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ دوسرے جو آزادی شائع کو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ خالص مسلمانوں کی قوت و شوکت کے حصول کی امید ہو اور یہاں ایسی آزادی کی ہرگز امید نہیں بلکہ اور نقصان کا اندیشہ ہے۔ عالمگیری میں دشمن کے مقابلے کی اباحت کے شرائط کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

والشافی ان یرجوا الشوكة والقوة لاهل الاسلام باجتهادہ او باجتهادین  
من یعتقد فی اجتهادہ وراہہ وان کان ارجوا القوة والشوكة للمسلمین فی القتال  
فانہ لا یحل لہ القتال لہما فیہ من القاء نفسه فی التملکة۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہم اس حکومت کی وجہ سے طرح طرح کے نقصانات کے شکار ہو رہے ہیں۔ سو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ:

اسمعوا واطیعوا فاننا علیہم	تم تو سنے جاؤ، اطاعت کرتے رہو کہ جو
ما حملوا وعلیکم ما	حقوق حکام پر ڈالے گئے ہیں وہ اُن پر
حملتم۔	لازم ہیں اور جو تم پر ڈالے گئے ہیں وہ

تم پر لازم ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا نفسِ شرکت کے متعلق تھا کہ اس وقت کی شرکت کا کیا حکم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس راہ کے دوسرے اور بھی صدہا منہیات کا ارتکاب کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے یہ شرکت اشد حرام کا حکم پیدا کر لیتی ہے۔ چونکہ اُن تمام کا ذکر موجب طوالت تھا، دوسرے اُن کے متعلق سوال میں استفسار بھی نہیں تھا، اس لیے ان کو ترک کیا گیا۔

۲۔ اس مقابلے میں اگر قوم کی جانب سے ایسا تشدد وقوع میں نہ آئے جس میں پولیس یا فوج کے افراد میں سے بعض کے تلف ہو جانے کا خوف ہو اور ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے گولی چلا دی جاتے اور کوئی مسلمان گولی کے صدمہ سے مر جائے تو شہید کہلائے گا اور اُس کے تلف ہونے کا سبب ایسے وقت ظلم ٹھہرے گا اور ظلماً مارا جانا شہادت ہے۔ لیکن ایسے وقت میں بھی اگر کسی مسلمان کا اس پر گمان غالب ہو جائے کہ اگرچہ میزاکوئی ایسا سنگین گناہ نہیں ہے لیکن حکومت اس پر بھی گولی چلا دے گی، تو ایسی صورت میں اُس پر فرض ہوگا کہ وہ اُس مقام سے ہٹ جائے۔ اگر نہ ہٹے گا اور مارا جائے تو شہید نہ کہلائے گا۔

اگر قوم کی جانب سے ہی ایسے تشدد کی ابتداء کی گئی جس میں گورنمنٹی ملازمین سے بعض افراد مارے گئے یا اُن کے مارے جانے کا قومی اندیشہ تھا کہ وہ آلاتِ جارحہ کے استعمال کا ارتکاب کر رہے تھے اور ایسی صورت میں مجمع کے منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی گئی اور اُس میں کوئی مسلمان بھی مارا گیا تو اُس کو بھی شہید نہ کہا جائے گا کہ اُس موقع پر وہ یقیناً جانتا ہے کہ گولی چلنا لابدی ہے، پس ایسے وقت میں اُس کا ٹھہر جانا اپنے اُوپر موت کا پیش کرنا ہے، جو حرام ہے۔ پھر جن صورتوں میں شہادت کا حکم نہیں کیا گیا، اگر وہ جانتا تھا کہ شرعاً مجھے یہاں ٹھہرنا ممنوع ہے، تب تو خودکشی کا ترکیب ٹھہرے گا اور وہ امید ہے کہ ماخوذ نہ ہو۔ حکومت کے خلاف جن امور پر امر کیا جاتا ہے وہ تو مکروہات سے بھی نہیں۔ علمائے حفاظتِ جان کے لیے بعض محرکات کے ارتکاب کو بھی فرض فرمایا ہے۔ عالمگیری میں ہے:

السلطان اذا اخذ رجلاً وقال لاقتلتك اولتشرين هذا الخمر كان في غالب دايه وانہ لو لم يتناول يقتل فان لم يتناول حتى قتل كان اثماً في ظاهر الرواية عن اصحابه وذكر شيمة الاسلام انه اثم ماخوذ بدمه الا ان يكون جاهلاً بالاباحة حالة الضرورة اذا كان عالماً بالاباحة كان ماخوذاً كذا قال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۳۔ مکدر کا استعمال فی نفسہ مباح ہے لیکن اس نیت سے پہننا جو سوال میں مذکور ہے ممنوع ہے کہ مباح اشیاء کا استعمال اچھی نیت سے مستحسن ہے اور بُری نیت سے مکروہ۔

۳۷۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی نیت سے نہ قانون نمک کے توڑنے کا حکم دیا گیا نہ یہ ارشادِ مبارک کا مقصود ہے کہ اگر کوئی حکومت نمک پر محصول لے تو اس کی مخالفت کر کے ایسے قانون کو توڑ دیا جاتے۔ غرض بہر حال مذکورہ محض کذب ہے۔ فقط ل

محمد مظهر اللہ غفر اللہ لہ

مسجد جامع فتحپوری

اب ہم قارئین کرام کے سامنے ایک فتویٰ اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مستفتی نے باخلافِ الفاظ یہی چار سوال جمعیتہ العلماء نے ہند کے قائم مقام صدر یعنی مفتی کفایت اللہ دہلوی سے اُن کا جواب مانگا۔ ہم مفتی صاحب موصوف کے جواب کو حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ معنی خزان العرفان لولہ لکڑی العلیا کی تنقید سمیت پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ قارئین کے سامنے تصویر کے دونوں رخ آجائیں اور فریقین کا موقف سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو کیونکہ دونوں حضرات ہی اپنی اپنی جماعت کے معتد علیہ اور چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ لیجئے وہ استفتاء مع جواب و تنقید پیش خدمت ہے:

## استفتاء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی علی س رسولہ الکریم والہ واصحابہ اجمعین۔ اتابعد۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مقتیانِ شرع متین اموراتِ ذیل میں۔ جواب مع اولہ شرعیہ بیان فرمائیں۔  
اولاً: ایک شخص غیر مسلم وغیر معاہدہ حکم کرتا ہے کہ قوانین مروجہ حکومتِ حاضرہ کی خلاف ورزی اُس کی قوم اور اُس کے ہم وطن کریں، جس سے رام راج حاصل ہوگا۔ بصورتِ قانون شکنی بغیر استطاعتِ اندفاع و بغیر کوششِ اندفاع برداشت کرنے کی حتیٰ کہ گولی چلنے کے وقت گولی کو اپنے سینے پر لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اُس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے

لے مسعود احمد، پروفیسر، فتاویٰ منہری، ص ۳۲۹ تا ۳۳۲

تو شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

ثانیاً: اگر اُس غیر مسلم کے حکم کی تعمیل میں کوئی مسلمان اس خطرہ میں یہ جانتے ہوئے کہ گولی لگنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، اپنے آپ کو مبتلا کرے اور گولی لگنے سے مر جائے تو اُس کی موت کیسی موت ہوگی؟ آیا اُس کو شہادت کہیں گے یا خودکشی کہہ سکتے ہیں؟

ثالثاً: ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اُس کی تعمیل میں کوئی مسلمان کھدر پہنتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی اور اُس حکم کو فرض قرار دے کر دوسرے مسلمانوں کو اُس غیر مسلم کے حکم پر آمادہ کرتا ہے اور جو شخص کھدر نہ پہنے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا کھدر پہننا، حکم غیر مسلم کی تعمیل کو فرض سمجھنا، کھدر نہ پہننے والے مسلمان سے نفرت کرنا کیسا ہے؟

والجواب: حکومتِ حاضرہ کی طرف سے نمک بنانے پر عرصہ سے محصول لیا جاتا ہے۔ ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ یہ محصول ویسے بغیر نمک بناؤ اور گرفتار ہو جاؤ۔ اس پر ایک مسلمان کہتا ہے کہ اس نے باوجود غیر مسلم ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، اس لیے غیر مسلم کے حکم کی تعمیل ہر مسلم پر فرض ہے۔ مسلم کا یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناجائز ہے تو کیا حکم رکھتا ہے۔ بیوا تو جروا۔

## الجواب

غالباً یہ سوالات تحریکِ حاضرہ سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو تحریر سوالات میں کسی قدر تبلیس سے کام لیا گیا ہے جو مناسب نہ تھا، بلکہ چاہیے یہ تھا کہ واقعہ صاف صاف ذکر کر کے اُس کا حکم ذکر کیا جاتا۔ مثلاً سوال اول یوں لکھنا چاہیے تھا کہ ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ ہے، جس کو ہندوستان کے رہنے والے کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ ہندوستان کی خواہش ہے کہ پر دیسی قوم جو ہزاروں میل دور سے آکر ہمارے وطن و ملک پر جبراً قابض اور مسلط ہے اور ہمارے تمام خزانوں اور منافع کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے جا رہی ہے اور جس کی بدولت اہل ملک مجھ کے اور محتاج ہو گئے ہیں، جلد سے جلد ہمارا ملک خالی کر دے

اس ملک خود اپنی مرضی کے موافق حکومت قائم کریں اور اپنے ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں، لیکن وہ پر ویسی حکومت کسی طرح ہندوستانیوں کی خواہش کا احترام کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اپنی مادی طاقت کے بل پر جبراً حکومت کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس مادی قوت اور طاقت نہیں ہے، کیونکہ تمام مادی طاقتیں اور قوتیں اُس پر ویسی قوم نے اپنے قبضہ میں کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ ہندوستانیوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے بھی ہتھیار رکھ سکیں۔ اس لیے ہندوستان کی ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، یہ طے کیا کہ اس غیر ملکی حکومت تسلطِ جاہرہ سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے جبرِ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور اس سلسلے میں جو تکالیف اور مصائب برداشت کرنے پڑیں اُن کو برداشت کیا جائے گا اور اپنی طرف سے تشدد پر ہرگز اقدام نہ کیا جائے تاکہ تحریکِ آزادی کی کامیابی کی امید ہو، ورنہ بصورتِ تشدد حکومت کو تشدد کا بہانہ مل جائیگا اور پھر وہ اپنی مادی قوت سے قوم کو تباہ کر دے گی۔ خلاف ورزی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ملک میں سے ایک شخص تیار ہوا جو غیر مسلم تھا۔ اس مجلسِ مشترک نے اُس کو اس مظلومانہ جنگ کی انجام دہی کے لائق سمجھ کر اس جنگ کی تکمیل کے اختیارات دے دیے۔ اب وہ غیر مسلم تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے آداب بتا رہا ہے اور قوم کو لڑا رہا ہے، تو آیا اس کے حکم کی تعمیل جائز ہے یا نہیں اور اس مظلومی کی جنگ میں اگر مطالبہٴ حقِ آزادی کی وجہ سے کسی کی جان تلف ہو جائے تو وہ شہید ہو گیا یا نہیں اور آیا بحالاتِ مذکورہ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے آپ کو ایسے خطرات میں مُستلا کرنا، جس میں جان تلف ہو جائے گا خطرہ ہے، جائز ہے یا نہیں؟ سوال کی صحیح شکل یہ ہے۔

اب اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قومیں آباد ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی اصول سے مسلمانوں پر ایک غیر مسلم حکومت جاہرہ تسلط سے اپنے ملک کو آزاد کرانا اولین فریضہ ہے۔ مسلمان جو اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ اور لَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَسٰى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے اگر وہ اطاعت کرتے ہیں تو مجبوری اور اضطراری طور پر کرتے ہیں اور

اس مجبوری اور اضطرار کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس جبری حکومت کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ وجہ تو ایسی ہے کہ اس میں غیر مسلم شریک نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے (جس میں تمام ہندوستانی اقوام برابر کی شریک ہیں) کہ ایک اجنبی قوم کو جو ہزاروں میل پرے کی رہنے والی ہے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے۔ ہم اس کی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی طوعاً برداشت کرنے کو تیار نہیں اور یہ ہمارا فطری، عقلی، سرفی، بین الاقوامی حق ہے اور جس تدبیر اور جس طریقہ سے ہم اپنا یہ حق حاصل کر سکیں اختیار کرنے اور عمل میں لانے میں حق بجانب ہوں گے۔ چونکہ ہمارے پاس مادی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے معذور و مجبور ہیں۔ مگر عدم تشدد کے ساتھ رسول نافرمانی کی مظلومانہ جنگ یقیناً لڑ سکتے ہیں اور اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ لاشیاں کھائیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھڑے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً ان کو اپنے حق آزادی کے مطالبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کیونکہ ان کا فعل فی حد ذاتہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر حکومت لاشیاں برسائے یا سنگینیں بھونکے یا چھڑے اور گولیاں مارے تو یہ بربریت اور ظلم حکومت کا فعل ہے، اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے، نہ ان مظلوموں پر جو اپنا حق مانگتے ہیں اور کسی ایسے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس کو وہ پہلے سے ناپسند کرتے تھے مگر مجبوراً اس کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

یہی بات کہ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت بسا اوقات اپنی بربریت کے مظاہرہ کے لیے لاشیاں چلاتی ہے، گولیاں برساتی ہے، کسی کو ایسے خطرہ میں پڑنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مطالبہ حقوق ہمیشہ خطرات سے پڑھتا ہے۔ مذہب و وطن کی آزادی کا مقصد چونکہ اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ اس لیے اس کے راستہ کے خطرات بھی بہت بڑے اور ہیبت ناک ہیں مگر بغیر خطرہ کے تو کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو اور اگر بغیر اس کے کہ ہماری طرف سے کوئی تشدد آمیز حرکت ہو، حکومت بلاوجہ تشدد پرا تراٹے اور ہمیں مار مار کر زخمی یا شہید کر دے تو اس کی



ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ مثلاً یہ مقصد ہو کہ دفعہ سوم کی خلاف ورزی کریں اور پانچ سو اشخاص ایسے مہیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کر دیا کہ یہ پانچ سو اشخاص تھے اور یہ سب عدم تشدد کے پابند تھے۔ اب حکام آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ منتشر ہو جاؤ۔ انہوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا مگر کوئی حرکت نہیں کی۔ تو اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ ان سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاسٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کراتی ہے اور کبھی گولیاں چلا کر بہیمیت اور بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے۔ اس ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فعل ناجائز ہو جائے گا جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بہیمیت و بربریت کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان کو خودکشی کا مرتکب بتانا سختہ حالت اور ناواقفیت احکام شرعیہ کی دلیل ہے۔

سول نا فرمانی کی اس مظلومانہ جنگ میں جو اپنے وطن اور مذہب کو ایک غیر ملکی حکومت کے برابر ان قوانین سے آزاد کرانے کے لیے اپنی وطنی مشترک مجلس کی جانب سے جاری کی گئی ہے شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کرنا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی مذہبی رہنمائی اور دینی ہدایت نہیں ہے محض جنگی رہنمائی ہے۔ جو لوگ اسے ناجائز کلمے کی جرأت کرتے ہیں اور جنگ میں زخمی ہونے والے کو ملامت کرتے ہیں اور مرجانے والوں کو شہادت سے محروم کرتے ہیں وہ پہلے ان مسلمانوں کا حکم بتائیں جو کسی غیر مسلم جابر دشمن اسلام حکومت کی حمایت اور اسس کی حرمیں تک گیری کی خاطر اس کے مقرری کے ہوئے غیر مسلم افسروں کی کمان میں رہ کر ان غیر مسلموں کے فوجی احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور بسا اوقات غیر مسلم حکومت کی طرف سے اپنے مسلمان بھائیوں کو نشانہ بندوق بناتے ہیں یا خود گولی کھا کر مر جاتے ہیں، ان مسلمانوں کا کیا حکم ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ حکومت کے غیر مسلم افسروں کی ماتحتی میں کام کریں اور مسلمانوں پر گولیاں چلائیں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ غیر مسلم ججوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جائیں اور ان سے خلاف شرع فیصلے صادر کرائیں اور ان پر

عمل کریں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ شرعی معاملات نکاح، طلاق، آئین بالجہر، رفع یدین وغیرہ وغیرہ نزاعات کے مقدمات غیر مسلم حکام کی عدالتوں میں فیصلے کے لیے جائیں؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب منفی میں ہے تو ان حضرات کا پہلا فرض یہ تھا، وہ قوتِ ایمانی کا ثبوت دینے کے لیے پہلے ان امور کے متعلق فتوے شایع کرتے اور مسلمانوں کو ان مہلکات سے بچانے کی کوشش کرتے، جنہوں نے ان کے اسلام اور قومیت دونوں کو فنا کر دیا ہے۔

کھڈر پہننے کا جو حکم اُس غیر مسلم نے دیا ہے، وہ اُس نے اپنے مذہب کی بنا پر نہیں دیا ہے بلکہ ملک و وطن کی بھلائی اور دشمن کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر سمجھ کر دیا ہے اور مسلمان کے لیے کھڈر پہننا مذہبی احکام کے بموجب ناجائز نہیں ہے، اس لیے کھڈر پہننا ناجائز نہیں ہے۔ یہ حکم ان احکام سے بدرجہا زیادہ قابلِ تعمیل ہے جو انگریزی عدالتوں کے غیر مسلم حکام سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کھڈر ہی بہترین لباس ہے اور جبکہ پہننے والوں کی نیت اپنے بھائیوں کی فائدہ رسانی بھی ہو تو ایک پختہ دوکاج، دوپرا ثواب ملے گا۔ اس کو گاندھی پرست فرقہ کا شعار بتانا میری سمجھ سے باہر ہے۔ اول تو کھڈر پہننے والے مسلمانوں کو گاندھی پرست کہنا ہی ظلمِ عظیم ہے کیونکہ وہ مسلمان ہیں اور خدا پرستی کے سوا کسی کی پرستش ان کے دہم و گمان میں بھی نہیں آتی۔ وہ تو رسول پرست بننے سے بھی توبہ کرتے ہیں، پھر ان کو گاندھی پرست کہنا کتنی بڑی جرأت و جسارت ہے؛ دوسرے یہ کہ وکیلوں کے گون اور اسی طرح بعض اداروں کے مخصوص لباسوں کے متعلق ان حضرات نے کبھی کوئی فتویٰ شایع کیا ہے یا نہیں؛ اور اس کو حکومت پرستی یا ادارہ پرستی کی بنا پر ناجائز فرمایا ہے یا نہیں؛ نہیں تو کیوں نہیں؟

قانونِ نمک کی خلاف ورزی اُس کی سہولت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اختیار کی گئی ہوگی۔ اصل مقصود تو قانون شکنی تھی۔ ابتداءً ایسا قانون اختیار کیا گیا جس کی خلاف ورزی ہر مقام، ہر صوبہ میں ہو سکے اور ہر شخص انفرادی طور پر کر سکے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قانون کو منتخب کرنے میں یہ فائدہ بھی ظاہر ہوا کہ شریعتِ اسلامیہ میں نمک کو اپنے فطری معاون میں آزاد رکھا گیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے یہ کہہ دیا کہ اس قانون کی خلاف ورزی فی نفسہ بھی شریعت

اسلامیہ کے موافق ہے تو اُس نے کیا گناہ کیا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ گاندھی جی نے اس قانون کی خلاف ورزی کا حکم شرعی احکام کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ گاندھی جی غیر مسلم ہیں۔ وہ اسلامی حکم کی تعمیل کی نیت سے کوئی حکم دیں یہ بظاہر مستبعد ہے۔ مگر یہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلامی حکم کے خلاف نہیں ہے۔ جیسے گاندھی جی شراب چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں تو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گاندھی جی نے یہ حکم شریعت اسلامیہ کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے۔ مگر ہر مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلام کے حکم کے موافق ہے۔ اسلام بھی شراب کو حرام قرار دیتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ

عرضِ مصنف  
جمعیتہ العلما نے ہند کے قائم مقام صدر یعنی جناب مفتی کفایت اللہ شاہ پوری  
ثم دہلوی کی خدمت میں مذکورہ استفتاء جناب سید ممتاز احمد صاحب (سجادہ نشین  
خاتواہ اخوند صاحب فرانس خانہ دہلی) نے پیش کیا تھا۔ مفتی صاحب موصوف کا جواب قارئین کی  
خدمت میں بلقلم پیش کر دیا گیا ہے۔ جناب محمد ظہور سوداگر چچہ عقب لال مسجد مراد آباد نے مذکورہ  
فتویٰ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر کے اس  
اقدام کی غرض و غایت یوں بیان کی،

یہ فتویٰ حاضر کر کے دریافت کیا جاتا ہے کہ جواب مجیب کا صحیح ہے یا نہیں؟  
اس کی پوری حقیقت سے آگاہ فرمایا جائے۔ بیوا تو جبروا۔

حضرت صدر الافاضل نے اس فتوے پر جو تبصرہ فرمایا اس کا ایک ایک لفظ اہلسنت و جماعت  
کے موقف کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہم موصوف کے تبصرے یا تنقید کو بلقلم پیش کرنا ضروری  
مجھے میں تاکہ قارئین کے سامنے وضاحت کے ساتھ تصویر کے دونوں رخ آجائیں؛

الجواب بعون الملک الوہاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔

سید ممتاز احمد صاحب مستفتی کے سوالات و واقعات کے نہایت مطابقت سے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب کا انھیں تلبیس بتانا غلط اور تلبیس ہے۔ مستفتی کا کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس کا انکار کیا جاسکے اور خود مفتی صاحب سے ممکن نہ ہو کہ وہ دوچار اغلاط پیش کر کے بتا سکتے کہ مستفتی نے ان میں یہ تلبیس کی ہے اور واقعات سے سوال کے فلاں لفظ میں یہ مطابقت میں ہے۔ اس طرح تو ہر ایک کلام کو تلبیس کہا جاسکتا ہے، مگر جو چیز بے ثبوت ہو، جو بات بے سند ہو، اصحاب عقل و خرد کے نزدیک لایق التفات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سوالات نے مفتی صاحب کے چھٹے پھر ادیے اور انھیں اپنے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے جواب کی کوئی راہ نہ ملی، اس لیے آپ نے ان سوالوں کے جواب کی بجائے اپنی طرف سے اپنے حسبِ مشاغل طویل طویل سوال بنانے کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے ہی سوال کا جواب تحریر فرمایا۔ یہ طریقہ رائج ہو جائے تو ہر شخص مفتی بن سکتا ہے۔ جب مفتی کے سوال کا لحاظ ہی نہ ہو تو اپنا من مانا سوال گھڑنا اور اس کا جواب دے لینا کیا مشکل ہے۔ مفتی صاحب نے جو سوال بنایا ہے اس میں تلبیس ہیں اور اس کی چند قابلِ لحاظ باتیں یہ ہیں:

- ۱۔ ہندوستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا جبر یہ قبضہ۔
- ۲۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پر دیسی قوم ہمارے خزانہ و منافع چھین کر لے جا رہی ہے اور اس کی بدولت ہم محتاج ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارا ملک خالی کر دے۔
- ۳۔ اہل ملک اپنی مرضی کے موافق حکومت قائم کریں اور ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں۔
- ۴۔ ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، طے کیا کہ آزادی حاصل کی جائے۔

۵۔ آزادی کا طریقہ جبر یہ قوانین کی خلاف ورزی ہے۔

۶۔ اس سلسلہ میں جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، کی جائیں۔

۷۔ مشترک مجلس نے ایک غیر مسلم کو جنگ کے اختیارات دے دیے۔ وہ تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے طریقے بتا کر لڑا رہا ہے۔ ان نمبروں میں مفتی صاحب نے جو عیاریاں اور تلبیسات کی ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

مفتی جمعیتہ کے تلبیسات (۱) کی نسبت یہ دریافت طلب ہے کہ جبری قبضہ سے کیا مراد ہے؟

یہی کہ اگر اُس ملک کے بعض لوگ اس قبضہ کو پسند نہ کرتے ہوں تو ہندو قوت اُن پر حکومت قائم رکھی جائے یا کچھ اور معنی ہوں تو مفتی صاحب بیان کریں اور اگر یہی معنی ہیں تو دنیا کی ایسی کون سی حکومت ہے اور جہاں میں ایسی کون سی سلطنت قائم ہوئی جس کا کوئی مخالف ہی نہ ہوا ہو اور جس نے اپنے قیام حکومت کے لیے قوت جمع نہ کی ہو؟

۲۔ ہندوستانیوں سے کون مراد ہے؟ تنہا ہندو یا ہندو اور مسلمان سب؟

دوسری صورت میں کیا مفتی صاحب کے علم میں نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کو پر دہی بتاتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو ہندوستان کے منافع کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس لیے اُن کی خواہش فقط انگریزوں کو نکال دینے سے پوری نہیں ہو سکتی جب تک وہ مسلمانوں کو بھی ہندوستان سے باہر نہ کر دیں اور ایسا وہ بارہا کہہ چکے ہیں اور بہت سے ہندوؤں کے قلم سے ایسے مضامین نکل چکے ہیں اور ملک میں اس کا غلغلہ مچایا گیا ہے۔ اس کو چھپانا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہندوؤں کی طرف یہ خواہش ہے کہ حکومت موجودہ کو نکال دیں، اس کے بعد ہندوستان کی دولتوں میں مسلمانوں کو برابر شریک بنالیں گے، یہ سخت تبلیغ ہے، محض دھوکا ہے ایسے ہی دھوکے دینے کے لیے سوال دوبارہ گھرا گیا ہے۔

۳۔ اہل ملک سے کیا مراد ہے؟ صرف ہندو یا مسلمان بھی؟ دلیل کے ساتھ بیان کیجئے۔ ہندوؤں نے کب مسلمانوں کو اہل ملک قرار دیا ہے؟ یہ بھی تبلیغ ہے۔

۴۔ یہ بہت بڑی تبلیغ ہے کہ ملکی مجلس جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں۔ ایسی مجلس کونسی ہے؟ آپ کانگریس کو ایسی مجلس بتانا چاہتے ہیں مگر یہ اتنا درجے کی تبلیغ اور غایت درجے کا فریب ہے۔ کانگریس میں تمام اقوام کے نمائندے کب شامل ہیں؟ کیا ہندوؤں کے زرخیز اشخاص کسی قوم کے نمائندے قرار دیے جاسکتے ہیں؟ یا آپ کی مٹھی بھر جمعیت جو جمہور اہل اسلام کے مخالف ہو کر کانگریس کا کلمہ پڑھنے لگی ہے اور تمام عالم اسلام اُس پر ملامت کر رہا ہے یہ اُن کی نمائندہ ہو سکتی ہے؟ جو قوم کسی جماعت سے ناراض ہو، اُس کو غدار سمجھے، وہی جماعت اُس کی نمائندہ قرار دی جاسکتی ہے، مسلمانوں نے کب کانگریس مدعیان اسلام کو اپنا نمائندہ بنایا، کہاں اپنا

قائم مقام مقرر کیا، کس مجلس میں شرکت کانگریس کی اجازت دی، خود نمائندہ بن بیٹھنے سے کوئی شخص کسی کا وکیل ہو سکتا ہے، ایسی وکالت آپ نے کس کتاب میں پڑھی ہے، اور یہ طریق نمائندگی کون سے دارالافتاء کے حکم سے جائز سمجھا ہے، اسے کیسے جبری نمائندگی اور یہ تے تلبیس۔ آپ کے مستفتی نے تو تلبیس نہیں کی مگر جناب کا جواب مجموعہ تلبیسات ہے۔

۵۔ جبر یہ قوانین کے معنی بھی بتائیے۔ کیا اگر باذنہ تعالیٰ ہندوستان میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہو تو آپ کے اہل ملک اور آپ کی ہلکی مجلس ان قوانین کو برضا و رغبت قبول کرنے کے لیے تیار ہوگی اور جبر یہ قوانین نہ بتائے گی، بتائے گی اور ضرور بتائے گی اور بنا چکے ہیں اور جبر یہ سے زیادہ سخت الفاظ کہہ چکے ہیں اور شرعی قوانین کی نہایت توہین کر چکے ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔

اگر آپ کے علم میں نہ ہو تو مجھ سے دریافت کیجیے گا۔ آپ کو بتاؤں گا اور ذخیرے کے ذخیرے آپ کو دکھاؤں گا، جو اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کی مخالفت و امانت ہیں پڑ ہیں۔ تو آپ کی ہلکی مجلس اور آپ کے اہل ملک سوائے رام راج کے یعنی سوائے اپنے مذہبی قوانین کے دنیا کے ہر ایک قانون کو جبری قانون اور ظالمانہ قانون کہتے ہیں۔ جب اہل ملک کے نزدیک اسلامی قانون بھی جبری اور ظالمانہ ٹھہرا اور جبری قانون سے آزادی مطلوب، تو آپ کے اہل ملک کے نزدیک آزادی رام راج میں منحصر ہوئی۔ آپ نے اس پر پردہ ڈالا، یہ ہے آپ کی تلبیس۔

۶۔ اہل ملک کی کافر عوام کی آزادی یعنی رام راج کے سلسلہ میں تمام مصائب برداشت کی جائیں۔ اس میں لگنا پٹنا، مارا جانا، تباہ ہونا، سب ہی کچھ آگیا۔ آپ ہی انصاف سے کیجیے کہ جو ہندوؤں کی محبت میں اس قدر فتنہ ہو گیا ہو کہ وہ مسلمانوں کو رام راج قائم کرنے کے لیے مرجانے اور ہلاک ہو جانے کی رائے دیتا ہو، اس کو اگر ہندو پرست کہا جائے تو کیا بیجا ہے، رام راج قائم کرنے کے لیے مدعا کو آپ نے لفظ آزادی کے پردہ میں چھپایا۔ اس کو کہتے ہیں تلبیس۔

۷۔ کیا آپ اپنے اعتقاد میں یہ سچ جانتے ہیں کہ بحالت موجودہ مسلمانان ہند سب کے سب

یا ان کا سوا دِ اعظم گاندھی کو جنگ کے مکمل اختیارات دینے اور اپنا سپلائی اعظم بنانے پر راضی ہیں اور یہ جائز سمجھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اس کی اجازت دی گئی ہے؛ شاید ایسا آپ بھی نہ کہہ سکیں اور اتنا موٹا جھوٹ بولنے کی آپ کو جرأت نہ ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ جس جماعتِ ذلیلہ نے عامۃ المسلمین کی مرضی اور ان کے عقیدے کے خلاف ایک مشرک کو سپلائی اعظم بنایا ہو اور جنگ کے تمام اختیارات تفویض کر دیے ہوں اور اپنے آپ اس کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی ہو، وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہو سکتی ہے؛ اور اس کو مسلمانوں کا نمائندہ بتانا کیسی بڑی تلبیس ہے؛ اور مجلسِ مشترک کا لفظ اسی تلبیس کے لیے لایا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس مغالطہ میں ڈالا جائے کہ کانگریس میں ہندو مسلمان ایک حیثیت سے شامل ہیں اور جس طرح کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ ہے اسی طرح تمام مسلمانوں کی بھی نمائندہ ہے۔ یہ ہیں آپ کے طبیعات۔

سوالات کی شکل اس تنقید کے بعد مولوی کفایت اللہ صاحب کی تقریر سے سوالات کی مسطورہ ذیل شکل قائم ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۱: ہندو قطع ہندوؤں کو ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی ہندوستان میں عیش و آرام کرنے، یہاں کی سرزمین سے فائدہ اٹھانے، یہاں حکومت کرنے کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی جانتے ہیں۔ وہ آزادی ملک کے لیے جو جدوجہد کریں آیا وہ مسلمانوں کے لیے نافع و جائز ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۲: جمعیتہ العلماء نے عامۃ المسلمین کی رائے کے خلاف کانگریس کی اطاعت منظور کی۔ ایسی حالت میں جمعیتہ العلماء کو مسلمانوں کا نمائندہ کہنا اور محض اس جماعتِ ذلیلہ کی شرکت سے کانگریس کو مشترک مجلس ظاہر کرنا فریب ہے یا نہیں؛ اور جو شخص ایسا کہتا ہے وہ دین و ملت کا غدار ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۳: جس حالت میں عام ہندو اور بالخصوص کانگریسی اسلامی قانون کو انگریزی قانون سے سخت اور قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں، تو یہ باور کرنے کی کیا وجہ ہے کہ وہ قانونِ شریعت کی بے حرمتی نہ کریں گے؛ اور اس کو اپنے ملک کے لیے خوش دلی سے منظور

کر لیں گے۔ اگر ہندو قانون شریعت کو منظور نہ کریں تو کیا آپ کے نزدیک ہندو دھرم شاستر انگریزی قانون سے بہتر ہے، اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ مع دلائل بیان کیجیے؛

سوال نمبر ۴، رام راج یعنی وہ حکومت جو ہندو دھرم شاستر کو اپنا قانون بناٹے یا اور کسی غیر اسلامی قانون کو رائج کرے اور قانون اسلامی کو ناقابل نفاذ اور جرم جانے، ایسی حکومت قائم کرنے کے لیے ملک کے امن کو برباد کرنا، اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا، بگڑنا، قید ہونا، مرجانا، آیا یہ شرعاً جائز ہے، اور یہ موت وین تک کے لیے ہوگی، اور اس موت کو شہادت کہا جائے گا؛ دلائل کے ساتھ بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۵، جو کافر رام راج قائم کرنے کے لیے اٹھا ہو اور اس کی سعی کا انجام جو اس کے پیش نظر ہے یہ ہوگا کہ ہندوستان کو انگریزوں اور مسلمانوں سے آزاد کرایا جائے اور ہندو قانون رائج کیا جائے، اس کو جو جماعت اختیارات جنگ تفویض کرے اور اس کے اشارہ اشارہ کا اتباع اپنے اوپر لازم کرے اور مسلمانوں کو ان کی فرمانبرداری کی اجازت دے اور مسلمانوں کو یہ مناظر دے کہ جس طرح یہ کافر ہندوؤں کا نمائندہ ہے ایسے ہی مسلمانوں کا بھی نمائندہ ہے۔ ایسی جماعت اسلام کی دشمن اور غدار ہے یا نہیں؟ اور اس جماعت میں شامل ہونا اور اس کے حکموں کا ماتا درست ہے یا نہیں؟ شریعت میں ایسی جماعت کا کیا حکم ہے؟ دلائل سے بیان کیجیے۔

یہ تو مولوی کفایت اللہ صاحب کی تحریر سوالات پر تنقید کرنے سے جو شکل سوالات پیدا ہوتی وہ تھی اور اصل مستفتی کے سوالات بدستور لا جواب ہیں۔ معنی صاحب پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں کے جواب تحریر کریں اور دیانت و انصاف کے ساتھ تحریر کریں۔ اب مولوی کفایت اللہ صاحب کے جواب پر ایک نظر کی جائے اور دیکھا جائے کہ ان کے جواب میں کہاں تک شرع محفوظ ہے۔

مولوی کفایت اللہ کے کلام سے انگریزی حکومت جائز اور سوراہی حکومت اور اس کے لیے کوشش ناجائز ثابت ہوتی ہے

۱۱، مولوی کفایت اللہ صاحب نے غیر مسلم حکومت سے ملک کو آزاد کرانا اولین فریضہ بتایا



اور اس کی دلیل میں دو آیتیں إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ اور لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا پیش کیں اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ ان آیات پر ایمان رکھنے والے طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے اگر کرتے ہیں تو مجبوری و اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اس مجبوری کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو اس سے آزادی حاصل کرنا ان پر لازم ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون ہے مفتی کفایت اللہ صاحب کے جواب کا جو انہوں نے وجہ اول میں بیان کیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریزی حکومت کا اتباع تو جائز ہے کیونکہ وہ مجبوری و اضطرار کیا جاتا ہے اور کانگریس کی مجوزہ حکومت ناجائز ہے کیونکہ اس میں ہندو اکثریت حکمران ہوگی اور خداوندی احکام کی اطاعت کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے گا اور ایسی حکومت بقصد اختیار طلب کی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے تسلط سے مجبوراً ان کے احکام ماننے پڑے ہوں۔ لہذا مفتی صاحب کی پیش کی ہوئی آیات کے حکم اور مولوی صاحب کی تصریح سے ثابت ہوا کہ کانگریس کی مطلوبہ حکومت ناجائز، اس کی اطاعت مسلمانوں کو حرام۔ تو اس ناجائز حکومت کیلئے سعی و امداد ناجائز و حرام اور حکم قرآنی کے خلاف ہے۔

(۲) جواب میں دوسری وجہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ اجنبی قوم کو حق نہیں کہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے، ہم اس کی حکومت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، یہ ہمارا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہے۔ ان لفظوں کے معنی مفتی صاحب بیان کر دیں تو بہت بہتر ہو کیونکہ اس سے تڑو ہو رہا ہے کہ ہمارا ملک کسے کا حقدار کون ہے اور اس استحقاق کی بنا کس چیز پر ہے؟ اگر کیسے قبضہ پر، تو قبضہ انگریزوں کا موجود ہے۔ اور اگر کیسے پیدائش پر، تو کیا وہ ہندو یا مسلمان اجنبی سمجھے جائیں گے جو ولایت یا عرب یا اور کسی ملک میں پیدا ہوئے اور ان کے آبا و اجداد ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، وہ خود بھی ہندوستان میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور کیا وہ انگریز جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اجنبی ہوں گے اور ہندوستان کی حکومت بقول آپ کے ان کا فطری عقل عرفی بین الاقوامی حق ہوگی اور آپ کے نزدیک انہیں جائز ہو گا کہ وہ ہندوستان کو اپنا ملک بنائیں۔ اسی طرح بہت سے افغانیوں، چلیوں، جاپانیوں کے ہندوستان میں اولاد ہوتی ہے، کیا ان سب کو حق ہے کہ ہندوستان کو

اپنا ملک کہیں۔ یا ہمارا ملک کئے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو ہندوستان میں قدیم سے بودو باش رکھتے ہیں۔ اس تقدیر پر مسلمان تو مسلمان، ہندو بھی ہندوستان کو اپنا ملک نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں۔

ذرا اپنے خداوندانِ نعمت (ہنود) سے پوچھ دیکھیے کہ وہ ملک کا اقتدار کس کو سمجھتے ہیں اور ملک والا کس کو بتاتے ہیں؟ اجنبی کس کو ٹھہراتے ہیں؟ مسلمانوں سے کتنی مرتبہ کہا گیا ہے کہ تم ہندوستان سے چلے جاؤ، تمہارا اس ملک میں کوئی حق نہیں ہے۔ جن کے آپ ہمنوا ہیں اور جن کی محبت میں آپ نے دین تک کو خیر باد کہہ دیا ہے، وہ ہندوستان کو خالص اپنا بتاتے ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی پر دلیسی کہتے ہیں۔ جب کانگریس یہ مطالبہ کرے کہ ہندوستان ہمارا ہے، اجنبی چلے جائیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انگریز اور مسلمان دونوں بے دینا بھنا اٹھا کر چلتے ہوں۔ اگر جمعیت یا مفتی جمعیت کانگریس کو اس معاملہ میں حق پر سمجھتی ہے تو وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے اخراج کی مساعی ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے فطری حق کے کیا معنی لیے ہیں؟ یہی کہ جہاں جو پیدا ہو جائے وہ جگہ اسی کے لیے ہے، دوسرے کو اس سے کچھ سروکار نہیں یا کچھ اور؟ اگر یہی معنی ہیں تو کڑی کو دیکھ سے، کتاب کو کیڑے سے، چار پائی کو کھٹل سے اگر آپ صاف کرنا چاہیں تو یہ ظلم ہو گا کیونکہ بقول آپ کے سر جوں کا فطری حق ہے، چار پائی کھٹل کا فطری حق ہے، کتاب کیڑے کا فطری حق ہے اور اس کے علاوہ یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینے کا حکم پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیا، تو کیا آپ کے نزدیک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فطری حق سلب کیا تھا؟ اور اس ہندوستان میں جو مسلمان دوسرے ملک سے سلطنت کرنے کے لیے آئے، وہ بھی اجنبی تھے، پر دلیسی تھے، ہزاروں میل دور کے رہنے والے تھے، ہندوستانی ان کی سلطنت سے راضی نہ تھے تو کیا آپ کا یہی فتویٰ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر جبری حکومت کی اور ہندوؤں کا فطری حق چھینا اور وہ سلطنتِ فطرۃ، عقلاً، عرفاً اور بین الاقوامی طریقہ سے ناجائز تھی؟ اور جس قدر تصرفات انہوں نے ملک میں کیے وہ سب ظلم تھے؟

کھل کر کہیے اور اگر آپ یہ کہنے کے لیے تیار ہوں تو آپ کو اعلان کر دینا چاہیے کہ سلطنت

اسلام کی مٹا کی ہوئی اٹلاک و معافیات و اوقات پر جو مسلمان قابض ہیں، یہ قبضہ ناجائز ہے، یہ سب ہندوؤں کو واپس کر دینا چاہیے۔ اور جس سلطنت کا ہندوستان میں قبضہ ہی ناجائز تھا اور اُس کو فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی طور پر کوئی حق ہی حاصل نہ تھا، اُس نے جتنی مسجدیں بنائیں، وہ بھی سب غصب کی زمین تھیں، اُن کے لیے کیا حکم ہے؟ اگر ہندوؤں کو واپس دینے کا فتویٰ دے دیجیے تو آپ کا کام بن جائے اور جو مصلح نظر ہے وہ پورا ہو جائے اور آپ کے ہندو آقا یا بنی امت خوب خوش ہوں۔ آپ ہندوؤں کی محبت میں اس قدر محو ہیں کہ اسلام و حکومت کا اسلام پر درپردہ حملے کر رہے ہیں۔ اس کو ہندو پرستی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ جس کے مقابل نہ شریعت کی پروا ہے نہ دین کی، نہ مسلمانوں کے طریق و آئین کی۔ انگریزوں کی مخالفت تو ایک بہانہ ہے، اصل مقصود تو ہندوؤں کو راضی رکھنا اور مسلمانوں کو کٹوانا اور مردانا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلاک کر دو، پھر ہندوستان صرف تمہارے دوستوں ہی کے لیے رہ جائے گا۔ سوراچ ہی سوراچ ہے۔ عامی سوراچ ہو تو ایسا ہو، قوم مٹ جاتے، مذہب برباد ہو جائے، مگر ہندو راضی رہیں۔ خوب حق تمک ادا کیا۔ واہ مفتی! (اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے)

(۳) مفتی کفایت اللہ صاحب نے لکھا ہے:

”چونکہ ہمارے پاس مادی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے مجبور ہیں۔“

یہاں تو انگریزوں سے جگہ آزما ہونے سے انکار اور مجبوریوں کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ:

”اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ لاطیباں کھاتیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھڑے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً انھیں اپنے حق آزادی کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے۔“

مفتی صاحب کی یہ دونوں قلمیں باہم مخالفت و متضاد ہیں۔ ایک میں مادی طاقت نہ ہونے سے جنگی مجبوری کا اظہار ہے۔ دوسرے میں لاطیباں، سنگینیں، برچھیاں، چھڑے، گولیاں کھانے کے لیے مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے۔

جب تمہارے پاس مادی طاقت نہیں ہے، دق دشمن کو مار سکتے ہو، نہ اُن کی مار کو روک سکتے ہو، تو چھڑے، گویاں اور سنگینیں کھانے سے کیا نتیجہ؟ مسلمان گویاں کھا کر مر گئے تو آزادی کون لے گا؟ کہو چارے یا ر ہندو، جن کے اوپر ہم مسلمانوں کو صینٹ پوٹھانا چاہتے ہیں۔ کیا ستم ہے، ہندوؤں کے لیے مک خالی کرانے کے واسطے مسلمانوں کو مرنے اور جان کھونے کے لیے تیار کیا جانا ہے۔

جب آپ کا یہ فتویٰ ہے اور مسلمانوں کو نشانہ بندوق بننے کا آپ مشورہ دیتے ہیں تو خود کیوں ایسے موقع پر آگے نہیں بڑھتے؟ جناب کی ساری بہادری اُسی وقت تک ہے جب تک بندوق کا رخ دوسرے مسلمانوں کی طرف ہو اور جو جناب مفتی صاحب کی طرف بندوق کا رخ ہو تو ابھی معافی مانگ لیں اور فتویٰ یاد نہ آتے۔ یہ فتویٰ اپنے گھر چھوڑ کر سارے جہان کے لیے ہے۔ اپنے گھر پر آفت آئی دیکھیں تو ہندوؤں کی دوستی سے بھی دست بردار ہو جائیں مفتی صاحب کی طرف سے بہت سے بلند آہنگیاں کرنے والے بہادر جو مسلمانوں کو بڑھاوے دے کر گنہوں میں دھکیلا کرتے تھے، معافی مانگ بیٹھے اور تحریک کے مخالف ہو گئے۔

اب رہی یہ بات کہ جب کفار سے مقابلہ کی قوت نہ ہو، اُس وقت اُن کے مطابق ہو جانا اور اُن کی تیغ و سنان سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنا جو مفتی صاحب نے جائز لکھا ہے، اس جواز سے کونسا جواز مراد ہے؟ جواز موراجی یا فطری یا عقلی یا بین الاقوامی کون سا جواز؟ جواز فطری اگر ہوتا تو اس پر آپ کوئی شرعی دلیل تحریر فرماتے تو کہاں سے فرماتے؟ شریعت کے تو خلاف کہہ رہے ہیں۔ شریعت نے تو مسلمانوں کو اپنی جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے، کسی مباح کام کے کرنے یا ترک کرنے پر اگر اُس کو جان کا اندیشہ ہو اور دشمن قتل کرنے یا کم سے کم کسی عضو کے تلف کرنے پر آمادہ ہو، تو مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ اپنی بات پر اڑا رہے اور اور یہ کہے کہ میں تو مباح کام کرتا ہوں، جائز کام کرتا ہوں، ہرگز اس سے باز نہ آؤں گا۔ اگر اُس نے ایسا کیا اور دشمن نے اُس کو مار ڈالا، تو وہ گنہگار ہو گا اور اُس پر الزام ہو گا کہ اُس نے اپنی جان ہلاک کر لے میں دشمن کو دہنچائی، بلکہ اگر کسی حرام کام پر بھی مجبور کیا جائے، تو شریعت مسلمان کی جان کی حفاظت مقدم رکھتی ہے اور یہ حکم دیتی ہے کہ جان بچانے کے لیے

حرام کا ارتکاب کرے۔ اس ارتکاب پر اللہ تعالیٰ اُس کو نہ پکڑے گا۔

زیادہ بسط تو کیا کیا جاتے، آپ کو ہدایہ کی صرف ایک عبارت دکھادی جاتی ہے۔ متداول کتاب ہے، ملاحظہ کیجیے!

ان اصرہ علی ان یاکل المیتة اولی شرب الخمر فاکرہ علی ذلک بحسب اولی ضرب اوقید لم یحل لہ الا ان یکرہ بما یخاف منه علی نفسه او علی خصوص اعضائه فاذا خاف علی ذلک ان یتدمر علی ما اکرہ علیہ وکذا علی للذالدم ولحم الخنزیر لان تناول هذه المحرمات انما یجاء عند الضرورة کما فی حالة المخصصة لقیام المحرم فیما ودارها ولا ضرورة الا اذا خاف علی النفس او علی العضو حتی لو ضیف علی ذلک بالضرب الشدید وغلب علی ظنہ ذلک یمسح لہ ذلک ولا یسعه ان یتصبر علی ما توجہ فان صبر حتی ارقعوا بیه ولم یراکل فهو اثم لانه لما بیع کان بلا متناع معاوننا لغيره علی حلاک نفسه فیاثم کما فی حالة المخصصة۔

مردار کھانا اور شراب پینا شرعاً حرام ہے اور اس سے باز رہنا مسلمان کا دینی و شرعی فرض ہے۔ جو مسلمان مردار کھانے یا شراب پینے سے انکار کرتا ہے، وہ نہ فقط امر جائز کا مرتکب ہے بلکہ اپنے فرض کو ادا کر رہا ہے، لیکن جس حالت میں کوئی شخص اُس کو ان چیزوں کے کھانے پینے پر مجبور کرے اور قتل یا قطع عضو پر آمادہ ہو جائے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان چیزوں کو نہ کھاٹے پئے اور قتل ہو جائے۔ اگر مسلمان نے ایسا نہ کیا اور مارا گیا تو گنہگار ہوگا اور اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت میں یہ مضمون صاف و صریح موجود ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کی یہ طبع زاود دلیل کہ حق آزادی کا طلب کرنے والا ایک امر جائز کا مرتکب تھا، حکومت نے اگر گویاں برسائیں تو یہ اُس کا فعل ہے اور اس کی ذمہ داری مزبورے پر کچھ نہیں۔ یہ اُن کی اپنی ذاتی رائے ہے اور رائے بھی ایسی جو شریعت کے خلاف۔ شریعت اُس

شخص کو گنہگار بتاتی ہے، اپنے دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیتی ہے، مگر مولوی کفایت اللہ صاحب خلاف شرع اُس کو بری اور بے گناہ کر رہے ہیں۔ آپ کی دلیل نہ قرآن سے مقتبس، نہ حدیث سے، نہ فقہ سے معلوم نہیں ہندوؤں کے دھرم شاستر سے آپ فتویٰ دیتے ہیں یا کانگریسی قانون سے؛ غرض جو کچھ بھی یہ فتویٰ شریعتِ حقہ کے خلاف ہے۔

آپ نے اس کی مثال میں لکھا ہے کہ:

”دفعہ ۴۴۱ کی خلاف ورزی کریں اور پانچسواں شخص ایسے مہتیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کرو کہ صرف یہی پانچسواں شخص تھے کہ سب عدم تشدد کے پابند تھے۔ حکام آئے اور انہوں نے حکم دیا، منتشر ہو جاؤ۔ انہوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ ان سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے۔ مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاطھیوں سے پٹو کر منتشر کرتی ہے اور کبھی گولیاں چلو کر بھیبت و بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے اور ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فعل ناجائز نہ ہو جائے گا، جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بربریت اور بھیبت کا شکار ہو کر شہید ہونگے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان کو خودکشی کا مرکب بتانا سخت جہالت اور ناواقفیتِ احکامِ شرعیہ کی دلیل ہے۔“

مذکورہ بالا خط کشیدہ عبارتِ معنی کفایت اللہ صاحب کی ہے۔ اس میں آپ نے خودکشی کا مرکب بتانے والوں کو سخت جاہل اور ناواقفِ احکامِ شرعیہ تو فرمایا مگر احکامِ شرع نقل نہ فرمائے، جو دفعہ ۴۴۱ کو توڑنے پر اپنی جانیں ہلاکت میں ڈالنے والوں کو مظلوم اور شہید قرار دیتے اور آپ وہ احکام بیان کہاں سے کرتے، شریعت میں تھے کہاں، شریعت کے خلاف تو آپ نے خود فتویٰ دیا ہے، احکامِ شرعیہ کے تمام پر عوام کو مناظرہ دیا ہے۔ دفعہ ۴۴۱ کی خلاف ورزی شرعاً فرض نہیں، نہ اس کی موافقت مردار اور شراب کی طرح حرام۔ غایت یہ ہوگی کہ ایک امر جائز ہو،

اُس کے لیے جان کا ہلاک کرنا کس طرح مظلومیت اور شہادت ہو گا جبکہ شریعت نے مردار اور حرام شراب جیسی چیزوں سے محترز رہنے پر جان کا ہلاکت میں ڈانبا نزنہیں رکھا اور ایسے شخص کو اپنے قتل کا معین اور گناہگار قرار دیا، جیسا کہ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ شریعت اُس شخص کو ظالم کا معین قرار دیتی ہے اور آپ مظلوم۔ شریعت اُس کو گناہگار بتاتی ہے۔ شریعت کے حکم کی آپ مراعت مخالفت کر رہے ہیں اور جہالت و ناواقفیت کا الزام دوسروں پر۔

جہالت تو یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فتوے میں لکھا کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ: "ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو" اور خود ہی اس کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ دفعہ ۴۴ کی مخالفت میں اڑسے رہنا اور جان دے دینا شہادت ہے۔ ایک ہی صفحے میں اتنا بڑا تعارض! اسی صفحے میں آپ نے قانونی شکنی کو جائز قرار دیا اور اسی صفحے میں حکومت سے قانونی کارروائی کرنے اور دفعہ ۴۴ کا خلاف کرنے والوں کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا جس قانون کی آپ مخالفت کرتے ہیں اسی قانون کے تراؤ کرنے کی گورنمنٹ سے استدعا کرتے ہیں، مفتی صاحب یہ فتویٰ کس نماز میں بیٹھے لکھ رہے تھے، جو اپنی ہی بات خود بار بار کاٹتے تھے اور ملاحظہ فرمائیں کہ مضمون پیش آتا رہتا تھا۔ آپ کے اس فتوے سے بہت سے مسلمانوں کی جانیں کھوئیں، جنہوں نے شہادت سمجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور خدا جانے اہل کفر آپ کی تیغِ ستم کے قیل ہوں گے اور آپ کے اس خنجرِ خونخوار کی دھار سے موت کے گھاٹ اتریں گے، مسلمانوں کو تو یہ غلط فتویٰ دے کر مروا ڈالو اور ہندوؤں کے لیے ملک خالی کر دو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز دے۔

مولوی کفایت اللہ نے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز کر دی  
 اس فتویٰ میں بہادر مفتی نے لکھ دیا کہ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت ناجائز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو آپ رسولِ نافرمانی اور قانون شکنی کا حکم کس طرح دے سکتے ہیں، آپ کی جو بات ہے متنازعہ۔ اس سے بھی درگزر کیجیے تو یہ بتائیے کہ غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کا جواز جناب نے کس دلیل شرعی سے لکھا ہے؟

آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ اپنے فتوے کے اول میں لکھ چکے تھے: "مسلمان جو ان الحکمہ"

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ — اور — وَكُنْ يَجْعَلُ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَيِّئًا ۖ يَرَىٰ كَيْفَ يَكْتُمُونَ  
 وہ طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ یہ آپ ہی کا مقولہ تھا اور  
 آپ ہی غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز بنا رہے ہیں۔ اُس میں تو یہ تعمیم تھی کہ کسی وقت کسی  
 طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت جائز نہیں۔ اب کون سی طرح جواز کی نکل آئی، یا گاندھی جی  
 کے احکام کو خداوندی احکام سمجھ لیا، معاذ اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

وہ آیتیں جو آپ نے خود نعل کی تختیوں کی ان پر اب عمل کیوں نہیں ہے، اب ان کے خلاف  
 کیوں گاندھی کی اطاعت جائز کی جا رہی ہے، غرض مفتی صاحب کے فتوے کا بطلان خود ان کے  
 کلام سے بھی ثابت ہوا۔ گاندھی کی اطاعت اور اسے رہنا بتانا، اُس کا ماتحت اور لشکر بننا  
 کسی طرح بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی اطاعت کے جواز کی وجہ تو مفتی صاحب نے مجبوری بتائی  
 تھی، یہاں تو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ پھر يَجْعَلُ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كَيْفَ يَكْتُمُونَ  
 کر کے گاندھی کی اطاعت کس طرح جائز کی جاتی ہے، یہ چند باتیں نمونہ کے طور پر لکھ دی گئیں، فتویٰ  
 بہت اغالیط پر مشتمل ہے۔ اگر مفتی صاحب نے قلم اٹھایا اور چاہا تو ان کے باقی ماندہ اغالیط بھی  
 پیش کیے جاسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو راہ ہدایت نصیب فرمائے، کجروی و گمراہی سے  
 بچائے۔ آمین وصلى الله تعالى على سيد المرسلين محمد وآله واصحابه اجمعين۔

کتبہ العبد المقتضم بعباد المتین  
 محمد نعیم الدین حفا عنہ المعین

مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مفتی اعظم دہلی شاہ محمد منظر اللہ دہلوی، مولانا سلیمان اشرف  
 بہاری، مولانا قاضی احسان الحق نعیمی اور مولانا مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات جینی کی  
 گاندھوی فرقے کے خلاف چند نگارشات پیش کی ہیں، یہ اور دیگر تمام علمائے اہلسنت جو ہر قدم پر  
 مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، یہ بریلی کے اُس مردِ حق آگاہ کی فوج کے  
 جرنیل اور سپاہی وغیرہ تھے جس کو اللہ رب العزت نے چودھویں صدی کی تجدید کا منصب مرحمت

۱۸ تا ۱۷



فرمایا تھا، جو مسلمانوں کی ہر بڑے اور چھوٹے معاملے میں رہنمائی کر رہا تھا، جو ہر گمراہ اور گمراہ گمراہ کا ناطقہ بند کرنے میں پیش پیش تھا، محمدی کچھار کے جس شیر خزاں کے رُو برو ہونے کی نہ کسی شیخ الہند کو ملانے والے کو جرات ہوئی نہ کسی شیخ الاسلام کو، جس کے سامنے نہ کوئی امام الہند زبان کھول سکا اور نہ شیخ الکل، جس کے بالمقابل نہ کسی برطانوی قطب الاقطاب کا پراخ جہل سکا نہ تخریب دین کے سلسلے میں برٹش گورنمنٹ سے چھ سو روپیہ ماہوار معاوضہ لینے والے حکیم الامت کا۔ وہ امام محمد غزالی، امام فخر الدین رازی اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم جیسے سابقہ مجددین کی طرح دین و ملت کی تجدید کا فریضہ ادا کر رہا تھا، گمراہ گروں کے جلد شہرات کو مشاکرہ دلائل و براہین کے ذریعے مطلع صاف کر رہا تھا۔ چنانچہ وینلے اسلام کے اسی فقیہ اعظم، مرکز دائرہ تحقیق اور مرجع ہر خاص و عام کے سامنے اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر حاکم علی نقشبندی مجددی اور اسلامیہ ماڈرن اسکول لاہور کے سابق ہیڈ ماسٹر چوہدری عزیز الرحمن نے یکے بعد دیگرے دو استفتاء ۱۹۲۰ء میں اُس وقت پیش کیے جب گاندھی کی آگہمی پورھی ہوئی تھی۔ نام نہاد تحریک خلافت اور ترک موالات کے فتنے کی صدائے بازگشت سے ملک کا ہر گوشہ گونج رہا تھا آپ نے دلائل و براہین سے مزین ایسا جواب دیا، جس کی نظیر اس موضوع پر لکھے ہوئے سارے اسلامی لٹریچر میں پائی نہیں جاتی۔ وہ جواب الجواب المؤمنہ کتاب کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اُس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، اسکولوں اور کالجوں میں اُسے رائج کیا جائے کیونکہ اس لحاظ سے یہ کتاب وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ یہی دو قومی نظریے کا وہ نمٹ سبتی ہے جو آخر کار ہندو کے چوکے کھانے کے بعد علامہ اقبال مرحوم اور محمد علی جناح جیسے بیدار مغز لیڈروں کو بھی اپنا ناپڑا اور جو قیام پاکستان کا باعث ہوا۔ آپ نے دلائل و براہین سے جواب دیتے ہوئے ترک موالات کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں کی حالت پر اظہارِ تاثر کیا اور فرمایا:

”فسوس اور حسرت انہوں نے کہ آج آپ کو جتنے لیڈر دکھائی دیں گے، وہ اور اُن کے بازو اور اُن کے ہم زبان عام طور پر اُنہیں اسکولوں کالجوں کے کاسے لیس ملیں گے۔ اُنہیں سے بڑی بڑی ڈگریاں ایم۔ اے، بی۔ اے کی پاس ہوئے ہوں گے۔“

کیا اُس وقت اُن میں یہ خباثیں نہ تھیں؛ ضرور تھیں مگر ان صاحبوں کو مقبول اور منظور تھیں۔ اور اب جو آنکھ کھلی، تو صرف ایک گوشہ انگریزوں کی طرف کی اور وہ بھی شریعت پر زیادت کے ساتھ کہ اُن سے مجرم معاملات بھی حرام قطعی بلکہ کفر اور مشرکوں کی طرف کی پہلے سے بھی زیادہ پٹ ہو گئی کہ اُن سے واداد و اتحاد واجب، بلکہ اُن کی غلامی و انقیاد فرض، اُنھیں راضی کر لیا تو خدا کو راضی کر لیا۔ تو ثابت ہوا کہ اسلام ان حضرات کو نہ جب بد نظر تھا، ورنہ ایسی محرت دین تعلیموں سے بھاگتے، ناب بد نظر ہے، ورنہ مشرکوں کے اتحاد و انقیاد کے فتنے نہ جاگتے۔

قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کفار سے ترک موالات کا حکم دیا ہے کہ گاندھوی علماء کی جرأت کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے جنہوں نے قرآن و سنت کے صریح احکام کو پس پشت ڈال کر افراط و تفریط کا اس ایک ہی مسئلے میں وہ المناک منظر دکھا دیا جو تاریخ کا ایک شرمناک باب ہو کر رہ گیا ہے۔ ترک موالات کے فتوے جاری کر کے انگریزوں سے محض معاملات بھی حرام ٹھہرانے لگے اور دوسری جانب مشرکین ہند سے دصرف موالات جائز رکھے بلکہ اُن کی غلامی کو اپنے اُپر فرض قرار دے لیا اور اُن کی تبلیغ کا مرکزی نقطہ بھی ہو کر رہ گیا۔ اعلیٰ حضرت و مجدداتہ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے گاندھوی علماء کے اس طرز عمل پر یوں تنبیہ فرمائی تھی:

”ترکِ معاملات کو ترکِ موالات بنا کر قرآنِ عظیم کی آیتیں کہ ترکِ موالات میں ہیں سوچیں، مگر فتویٰ مسٹر گاندھی سے، اُن سب میں استثنائے مشرکین کی پچھ لگالی، کہ آیتیں اگرچہ عام ہیں مگر ہندوؤں کے بارے میں نہیں۔ ہندو تو با دیانِ اسلام ہیں۔ آیتیں صرف نصاریٰ کے بارے میں ہیں اور نہ کل نصاریٰ فقط انگریز اور انگریز بھی کل تک ان کے موزون تھے، حالاتِ حاضرہ سے ہوئے۔ ایسی ترمیم شریعت و تغیر احکام و تبدیلِ اسلام کا نام خیر خواہی اسلام رکھا ہے۔ ترکِ موالات کفار میں قرآنِ عظیم ایک دو دس بیس جگہ تاکید شدید پر اکتفا نہ

امام احمد رضا خاں بریلوی، امام الحجۃ المومنین، مطبوعہ بریلی، ص ۱۶

فرمانی بلکہ کثرت، جا بجا کان کھول کر تعلیم حق سنائی اور اس پر بھی تنبیہ منادی کہ:  
 قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ آيَاتِنَا إِنَّ كُنْتُمْ لَتَفْقَهُونَ ۝ ہم نے تمہارے لیے آیتیں  
 صاف کھول دی ہیں اگر تمہیں عقل ہو۔

مگر تو بہ! کہاں عقل اور کہاں کان؛ یہ سب تو دوا دہنود پر قربان۔ لاجرم  
 اُن سب ہندوؤں کا استثناء کرنے کے لیے بڑے بڑے آزاد لیڈروں نے قرآنِ عظیم  
 میں تحریریں کیں۔ آیات میں پیوند جوڑے، پیش خویش واحد قہار کو اصلاحیں دیں۔  
 ان کی تفصیل گوارش ہو تو دفتر طویل نگارش ہو۔

گاندھوی علماء جو رام راج (سوراج) کی خاطر ہندوؤں پر نثار تھے، اُن کے بندوبست دام ہو کر  
 اللہ جل شانہ سے منہ پھیر بیٹھے، خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا سے عاری ہو کر ترکِ موالاتِ کفار کی آیتوں  
 میں ہنود کا استثناء کرتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی خاطر سوراج کا نام آزادی  
 اور ہنود کی غلامی کو ہندو مسلم اتحاد بتا کر ہلکا ٹھہراتے تاکہ عام مسلمان ان کی اسلام دشمنی اور ملت فروری  
 پر مطلع نہ ہو جائیں۔ اس پر فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا،

”مقصود سیلف گورنمنٹ ہے، جس کی صاف تصریح بڑے بڑے لیڈران نے کر دی،  
 بلکہ بجز ویکہ کر مشرکوں کا دامن پکڑا، انہیں اپنا پار و انصار بنایا، اوروں کو چھوڑیے،  
 مولویوں میں گئے جانے والے لیڈر فرماتے ہیں، ہم ہندوستان کی آزادی کو ایک  
 فرضِ اسلامی سمجھتے ہیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ عام اتحاد ہو اور پوری کوشش  
 سے مقصد حاصل کیا جائے۔“ حالانکہ مشرکوں سے ایسی استعانت نصِ قرآنی کے  
 خلاف اور قطعاً حرام بلکہ مراءجہ قرآن کریم کی تکذیب ہے۔“

قرآن کریم نے جملہ کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے۔ گاندھوی علمائے ہنود کی محبت سے سرشار  
 ہو کر مشرکین ہند کا سورہ ممتحنہ کی آیت کریمہ لَا يَتَّخِذُ اللَّهُ... سے استثناء نکالنا شروع

۱۔ امام احمد رضا خاں بریلوی، امام، الحجۃ المومنین، مطبوعہ بریلی، ص ۱۶، ۱۷

۲۔ لیضاً، ص ۵۶

کر دیا۔ مجددانہ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد کتب معتبرہ یعنی تفاسیر و احادیث، فقہ و فتاویٰ کے حوالوں سے اس کی پانچ تفاسیر پیش کیں کہ:

- ۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بنو خزاعہ کے متعلق ہے۔
- ۲۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے اس آیت کے نزول تک مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت نہیں کی تھی۔
- ۳۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے کفار کی عورتیں اور نیچے مراد ہیں۔
- ۴۔ اکثر مفسرین و محدثین کے نزدیک یہ حکم والدہ اسماء بنت ابوبکر کے متعلق ہے۔
- ۵۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ مطلقاً ان کافروں کے بارے میں ہے جو مسلمانوں سے نہ لڑے اور اس معنی کے لحاظ سے یہ آیت منسوخ ہے۔ حضرت امام اہلسنت نے وضاحت فرمائی کہ ہمارے اکابر احناف کے نزدیک یہ آیت دربارہ اہل بیت ہے اور اس لحاظ سے احناف کے نزدیک یہ آیت کریمہ منکومہ ہے۔ اس وضاحت کے بعد آپ نے ہندو کے بے شمار مظالم شمار کر کے ہندو نواز لڑے کو یوں مخاطب کیا:

اب کوئی تم رسیدہ مسلمان این لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اسے اسٹیجوں پر مسلمان بننے والا ہندوی اسلام کا ظاہری تانا تیفنے والو! کچھ جیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مرو۔ اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر یہ ظلم توڑنے والے، کیا یہی تمہارے بھاتی، تمہارے چیتے، تمہارے پیارے، تمہارے سردار، تمہارے پشوا، تمہارے مددگار، تمہارے غمگسار، مشرکین ہند نہیں؟ جن کے ہاتھ آج تم بیکے جاتے ہو، جن کی جے مناتے، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو، لے

گاندھوی علماء کہتے تھے کہ تمام ہندو تو مسلمانوں سے نہیں لڑتے بلکہ وہ بعض ہیں جنہوں نے مسلمانوں پر بعض جگہ مظالم ڈھائے، لہذا سب کو محارب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حالانکہ ان کی یہ پھر اسلام دشمنی

اور بت پرست نوازی کی آئینہ دار ہے کیونکہ قرآن کریم نے محارب یا غیر محارب کی تقسیم و تفریق نہیں فرمائی بلکہ کفار و مشرکین سے موالات رکھنا حرام قرار دیا ہے۔ گاندھوی حضرات کی راہ و فسارہ بند کرتے ہوئے فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اب جس شہر، جس قصبہ، جس گاؤں میں چاہو آزاد کیجو۔ اپنی مذہبی قربانی کے لیے گائے پھاڑو۔ اُس وقت یہی تمہاری باتیں پسلی کے نکلے، یہی تمہارے گے بجائی، یہی تمہارے منہ بولے بزرگ، یہی تمہارے آقا، یہی تمہارے پیشوا، تمہاری ہڈی پسلی توڑنے کو تیار ہوتے ہیں یا نہیں، ان متفرقات کا جمع کرنا بھی جہنم میں ڈالیے۔ وہ جو آج تمام ہندوؤں کے سب ہندو پرستوں کا امام ظاہر و باہر شاہ باطن ہے یعنی گاندھی، صاف نہ کہ چکا کہ مسلمان اگر قربانی گاؤں نہ چھوڑیں گے تو ہم تلوار کے زور سے چھڑا دیں گے۔ اب بھی کوئی شک رہا کہ تمام مشرکین ہندوین میں ہم سے محارب ہیں۔ پھر انھیں تَدْنِقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ میں داخل کرنا نرمی بے حیائی ہے یا صریح بے ایمانی بھی؟“ ل

مجدد مآثر حاضر امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے موالات کے بارے میں انتہائی تنزل اختیار کر کے گاندھوی حضرات کی حرکاتِ شنیعہ و اعمال و اقوالِ قبیحہ لکھائے اور انھیں یوں شرمسار کیا ہے:

”ان صاحبوں سے یہ پوچھ دیکھیے کہ سب جانے دو، کریمہ لائٹنگ کو ہر مشرک غیر محارب کو عام ہو کر محکم ہی سہی اور مشرکین ہند میں کوئی بھی محارب نہ سہی۔ اب دیکھو تمہارے ہاتھ میں قرآن سے کیا ہے؟ خالی ہوا۔ افسدہ تمہم صواہ کریمہ لائٹنگ کو کچھ نیک برتاؤ، مالی مواسات ہی کی رخصت دی یا یہ فرمایا کہ انھیں اپنا انصار بناؤ؟ ان کے گھرے یار ہو جاؤ؟ ان کے طاغوت کو اپنے دین کا امام ٹھہراؤ؟ ان کی جے پکارو، ان کی حمد کے نعرے مارو، انھیں مساجد

لہ احمد رضا خاں، امام، الحجۃ الموثقہ، ص ۲۸

مسلمین میں بادب تعظیم پہنچا کر، منبر مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر لے جا کر، مسلمانوں سے اُونچا اٹھا کر، واعظ و ہادئ مسلمین بناؤ، اُن کا مردار جیفہ اٹھاؤ، کندھے پر کھنکی زبان پر بچے یوں مرگھٹ پر پہنچاؤ، مساجد کو اُن کا ماتم گاہ بناؤ، اُن کے لیے دعائے مغفرت و نماز جنازہ کے اعلان سراؤ، اُن کی موت پر بازار بند کرو، سوگ مناؤ، اُن سے اپنے ماتھے پر قشتے لگواؤ، اُن کی خوشی کو شعائر اسلام بند کراؤ، گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ، کھانے والے کو کینہ بتاؤ، اُسے مثل سور کے گناؤ، خدا کی قسم کی جگہ رام دلائی گاؤ، واحد قہار کے اسماء میں الحاد چھاؤ، اُسے معاذ اللہ رام یعنی ہر چیز میں رہا ہوا، ہر چیز میں حلول کیسے ہوا ٹھہراؤ، قرآن مجید کے ساتھ رامائیں کو ایک ٹولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ، دونوں کی پوجا کراؤ۔

اُن کے سر غنہ کو کہو، خدا نے ان کو تمہارے پاس مذکر بنا کر بھیجا ہے، یوں معنی نبوت جھاؤ، اللہ عزوجل نے سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہی تو فرمایا اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكَّرٌ تَمَّ تُوْنِهِيْ مَكْرٌ مَّذَكَّرٌ اَوْ خَدَا نِيْ مَذَكَّرٌ بِنَا كَرٌ بِيْجَا هِيْ اِس نے معنی رسالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا، ہاں لفظ بچایا، اُسے یوں دکھایا:۔

نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے اور امام و پیشوا و بچائے مہدی موعود تو صاف کہہ دیا، بلکہ اُس کی حمد میں یہاں تک اونچے اُڑے کہ خاموشی از شنائے تو حدِ شنائے تست، صاف کہہ دیا کہ آج اگر تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کر لیا تو اپنے خدا کو راضی کر لیا، صاف کہہ دیا کہ ہم ایسا مذہب بنا سنے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دے گا۔ صاف کہہ دیا کہ ایسا مذہب چاہتے ہیں جو سنگم پر یاگ کو مقدس علامت ٹھہرائے گا، صاف کہہ دیا کہ ہم نے قرآن و حدیث کی تمام عمریت پرستی پر نثار کر دی۔ کیا کریمہ لَا يَنْهَكُكُمْ فِيْ اِنْ طَعُوْنَ اَتِ و کفریات کی اجازت دی تھی؟“ لے

لے احمد رضا خاں بریلوی، امام: الحجۃ المومنینہ، ص ۲۲، ۲۳

marfat.com

Marfat.com

حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ نے دادِ تحقیق دیتے ہوئے فرمایا کہ کفار سے مدد لینے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) التجا (۲) اعتماد (۳) استخدام

پہلی دونوں صورتوں کی وضاحت کرنے کے بعد حکم یوں واضح فرمایا: یہ دونوں صورتیں (التجا و اعتماد) کفار کے ساتھ یقیناً قطعاً نصوص قطعیہ قرآنیہ سے حرام قطعی ہیں، جن کی تحریم کو پہلی اور دوسری دو ہی آیتیں کافی و روانی ہیں ہرگز کوئی مسلمان انہیں حلال نہیں کہہ سکتا۔ استخدام: وہ کہ کافر ہم سے دبا ہوا ہے۔ اُس کی چوٹیا ہمارے ہاتھ میں ہو، کسی طرح ہمارے خلاف پر قادر نہ ہو۔ وہ اگرچہ اپنے کفر کے باعث یقیناً ہمارا بدخواہ ہوگا مگر بے دست و پا ہے۔ ہم سے خوف و طمع رکھتا ہے۔ خوف شدید کے باعث انہما بدخواہی نہ کر سکے یا طمع کے سبب مسلمان کے بارے میں نیک رائے ہوگا۔

حضرت امام عظیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی: ۱۰۵۰ھ) نے اس استعانت کی صورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ: كَانَ لِاسْتِعَانَةِ بِالْكَافِرِ مَجْدُومَاتٌ حَاضِرَةٌ رَحْمَةً لِّلَّهِ عَلَيْهِ نَزَلَتْ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

”دو باتیں افادہ فرمائیں۔ ایک یہ کہ انہیں کُتھا بنا کر اُن سے مدد لے سکتے ہیں، جیسے شکار میں گتوں سے مدد لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں گتوں کی طرح مسخر ہوں کہ اُن کا فعل ہمارے ہی لیے ہو، ہمارے ہی دین کے اعزاز کے واسطے ہو۔ گتے سے شکار میں استعانت کب جائز ہوتی ہے، جبکہ وہ وقت شکار سارا کام ہمارے ہی لیے کرے، اُس میں سے اپنے واسطے کچھ نہ کرے، اگر شکار مارا اور ماشہ ہمارا اس کا گوشت کھالیا، شکار حرام ہے۔ تو استخدام بتایا اور وہ بھی سب سے ذلیل تر یعنی جیسے گتے سے خدمت لیتے ہیں اور شرط

لے احمد رضا خاں بریلوی، امام الحجۃ المؤمنہ، ص ۱۷

فرمادی کہ وہ خود سری سے یکسر نکل کر محض ہمارے ہی آلہ کار بن گئے ہوں! لے  
مجدد مآتہ عافزہ قدس سوسنے بتایا کہ استخدام کی صورت میں بھی شرع مطہر نے کفار سے استعانت  
کی عام اجازت نہیں دی ہے بلکہ اس کی چار صورتیں ہیں:

- ۱۔ اگر استخدام کی صورت میں اُسے رازدار اور ذخیل بنانا پڑے تو یہ استعانت بھی حرام۔
- ۲۔ اگر کوئی منصب یا عہدہ دینا پڑے تو یہ مسلمان پر اُس کا استعلا ہونے کے باعث حرام ہے۔
- ۳۔ بغیر ضرورت بھی کفار سے استعانت جائز نہیں۔
- ۴۔ ضرورت ہو اور اُس میں کافر کو رازدار یا ذخیل نہ بنایا جائے اور کوئی منصب نہ دینا پڑے  
تو استعانت جائز ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

ان شروط و قیود سے مشروط استعانت نہ ان کو رازدار و ذخیل کار بنانا ہے کہ  
آیت اولیٰ کا خلاف ہو، نہ ان سے عزت چاہنا کہ آیت دوم کے مخالفت ہو، ذیل  
و قلیل سے کون عزت چاہے گا؟ نہ اُسے کوئی ولی و نصیر بنانا کہ باقی آیات  
کے خلاف ہو۔ یہ استعانت اگر ایسی نہیں جیسے کَعَبْتٌ بِالْقَلَمِ میں تو ایسی ضرور ہے  
جیسے لوگ چاروں کو پکڑ کر بیگار لیتے ہیں بلکہ جب اُنھیں کچھ مال دیا جاتا ہے تو ایسے  
جیسے چار کو پیسہ دے کر جتا گنٹھوا لینا۔ کیا اسے کوئی کہے گا کہ چار کو ولی و ناصر  
بنایا، لاجرم کلمات علماء مخالفت آیات نہ ہوئے۔۔۔۔۔ یہ تھا حکم شرعی  
جس کی تحقیق و تصحیح بجز اللہ تعالیٰ اُس وسیلہ جلیل پر ہوئی کہ ان سطور کے بغیر میں  
نہ ملے گی! لے

آپ نے خلافت کمیٹی کے سبق یعنی ترک موالات کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ جائزہ  
لیتے ہوئے اس کے مبلغ لیڈروں اور گاندھیوں کے ضمیروں کو یوں جھنجھوڑا تھا:  
"عقل باور نہیں کرتی کہ ان کی چیخ پکار سے تمام ہندو سندھ و بنگال و برہما و

طہ احمد رضا خاں بریلوی، امام: الحجۃ المومنین، ص ۷۲

لے ایضاً: ص ۷۷



افریقہ و ہما داحتی کہ عدق تک کے مسلمان سب نوکریاں، ملازمتیں، زمینداریاں، تجارتیں یک لخت چھوڑ دیں۔ یہ شورشیں تو دودن سے ہیں۔ صد ہا حرام نوکریاں پہلے ہی سے کر رہے ہیں، وہ تو چھوڑیں نہیں، مباح نوکریاں اور حلال تجارتیں، زمینداریاں کس طرح چھوڑیں گے؟

ان جلسوں، ہنگاموں، تبلیغوں، کراموں سے اگر سو دو سو نوکریاں یا دس بیس نے تجارتیں یا دو ایک نے زمینداریاں چھوڑ بھی دیں تو اس سے ترکوں کا کیا فائدہ یا انگیزوں کا کیا نقصان؟ غریب نادار مسلمانوں کی کمائی کا ہزار ہا روپیہ ان تبلیغوں میں برباد جا رہا ہے اور جائے گا اور محض بیکار و نامراد جا رہا ہے اور جائے گا، ہاں لیڈروں، مبلغوں کی سیرو سیاحت کے سفر خرچ اور جلسہ و اقامت کے پلاؤ قورے سید سے ہو گئے اور ہوں گے اگر یہ فائدہ ہے تو ضرور نقد وقت ہے اور سیر یورپ کا حساب تو روز حساب ہی کھلے گا۔

جو سکتا ہے کہ بعض حضرات جو شش تعصب میں یا ان لیڈروں کی محبت میں محض بدگمانی قرار دیں لہذا ہم تحریک خلافت کے سرگرم حامی و کارکن اور گاندھی پیرے کے امیر البحر یعنی عالیجناب ابراہیم آزاد کے اس بارے میں تاثرات پیش کر دیتے ہیں، کیونکہ موصوف کا بیان ایک عینی شاہد کے بیان کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ موصوف کے تجربات و مشاہدات کو عبدالرزاق صاحب مدظلہ نے یوں نقل کیا ہے:

”خلافت تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے غریب مسلمانوں نے قابل غنہ جذبہ ایشار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بے شمار روپیہ خلافت فنڈ میں دیا۔ پردہ نشین خواتین نے زیور تک اُتار کے دے دیے۔ خود لیڈروں کا اعتراف تھا کہ چھپن لاکھ روپیہ جمع ہوا ہے لیکن اس مال فنڈ کا حشر کیا ہوا، ایک قلیل رقم تو ترکوں کو پہنچی باقی روپیہ کو مُردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اُس زمانے میں خود میں اپنی آنکھوں سے

لے احمد رضا خاں بریلوی، امام: الحجۃ الموثقہ، ص ۸۸

دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بیداری سے قومی روپیہ اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں؟  
 اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترک تعاون کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں سے  
 براہ راست بھی استفسار کیا کہ ان میں سے کتنے حضرات نے اپنے فتووں اور ارشادات کے  
 مطابق برٹش گورنمنٹ سے تعلق ترک کیا ہے؟ نان کو آپریشن کو ان کی زندگیوں میں کہاں تک عمل دخل  
 ہے؟ چنانچہ آپ نے پوچھا:

”کیا لیڈر صاحبان فہرست دکھائیں گے کہ ان برسوں کی مدت اور لاکھوں روپے  
 کی اخلاعت میں اتنا فائدہ مرتب ہوا؟ اتنوں نے نوکریاں چھوڑیں، اتنوں  
 نے تجارتیں، اتنوں نے زمینداریاں؟ ظفر یہ کہ ان کے خون گرم حالی ہمد مہرم  
 اخبارات اس ترک تعاون پر بڑے بڑے زور لگا رہے ہیں، خود اپنے اخبارات  
 مطابیع کیوں نہیں بند کرتے؟ ان صیغوں کو تو انگریزوں سے جو گہرے تعلقات ہیں  
 دوسرے صیغوں کو کم ہوں گے۔ کیا اوروں کے لیے شور و فغاں اور اپنے لیے  
 نوش جاں؟ اور ایک اخباری و مطابعی کیا کریں، بڑے بڑے لیڈر بننے والے  
 اسی مرض میں گرفتار ہیں۔ دیگر ان رانصیحت و خود رانصیحت..... ہجرت کا  
 غل بچایا اور اپنے آپ ایک نہ سکا۔ جو اُجھارنے میں آگئے ان مصیبت زدوں  
 پر جو گزری گزری۔ یہ سب اپنے جوڑ و پتوں میں چین سے رہے، ہڑالگانہ پھٹکری۔  
 اور ترک تعاون میں بھی کیا کسی لیڈر کے پاس زمینداری یا کسی قسم کی تجارت نہیں؟  
 نہ ان کا کوئی انگریزی یا ریاست میں ملازم ہے؟ پھر انھیں کیوں نہیں چھوڑتے؟  
 لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

مجدد مآثر حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترک تعاون کی تبلیغ کرنے والے  
 گاندھوی علماء اور مسلمانوں کو بے دست و پا بنانے کی گاندھوی اسکیم کو کامیاب بنانے والے  
 لیڈروں سے یہ سوال بھی کیا کہ گاندھی کے بہکانے اور ہنود کی دوستی کے نشہ سے سرشار ہو کر

سے عبدالرزاق طبع آبادی: ذکر آزاد، ص ۳۸۸

سے احمد رضا خاں بریلوی، امام و الحجۃ المؤمنہ، ص ۸۸، ۸۹

آپ ترکِ تعاون کا ڈھول تو پیٹتے پھر رہے ہیں لیکن کبھی ہندوؤں کی طرف بھی دیکھا ہے کہ خود انہوں نے اس ترکِ تعاون کی تحریک پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اگر آپ حضرات کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو صاف نظر آجاتا کہ یہ اسکیم صرف مسلمانوں کو بے دست و پا اور انگریزوں کا موردِ عتاب بنانے کے لیے چلائی گئی ہے۔ چنانچہ آپ نے ان حضرات کو یوں مخاطب کیا:

”بغرض غلط و بغرض باطل اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں، تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگہری خیر خواہ، جملہ ہندو بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری طرح بھوکے تنگے رہ جائیں گے؟ حاشا ہرگز نہیں، زہنا رہیں اور جو دعویٰ کرے اس سے بڑھ کر کاذب نہیں، مکار نہیں۔ اتحاد و واد کے جھوٹے سمجروں پر بھولے ہو، منافقانہ میل پر پھولے ہو، سچے ہو تو موازنہ دکھاؤ کہ اگر ایک مسلمان نے ترک کی ہو تو اور کچھ کچھ اس ہندوؤں نے نوکری، تجارت، زمینداری چھوڑی ہو کہ یہاں مالی نسبت یہی یا اس سے بھی کم ہے۔۔۔ لاجرم نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تمام اموال، گل رویتیں، دنیاوی جمیع اعمرا، جملہ جائزہیں صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ جائیں اور مسلمان دانے دانے کو بھیک مانگیں اور نہ پائیں۔ ہندو کہ اب انہیں پکاتے ڈالتے ہیں جب بے خوف و خطر کیا ہی چاہیں۔ یہ ہے لیڈر صاحبوں کی خیر خواہی یہ ہے حمایتِ اسلام میں ہانکا ہی۔“

قرآن کریم نے مسلمانوں کو بتایا ہے لَایَا تُؤْتُکُمْ خَبْرًا کافر تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ گاندھی جی اور لیڈروں نے اقدربِ العزت کو سچا نہ جانا، اُس کے فرمان پر یقین نہ آیا۔ ایک مشرک ٹھیٹ بڑے پرست گاندھی نے اپنی حمایت کا یقین دلایا تو اُسے نہ صرف اپنا خیر خواہ بلکہ پیشوا مان لیا۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیتہ العلماء ہند، احرار پارٹی وغیرہ تمام جماعتوں نے گاندھی جیسے دشمنِ اسلام و مسلمین کو اپنا طباء و ماویٰ اور ماویٰ مطلق و امام علی الاطلاق بنا لیا۔ اُس کی ہر اسکیم پر عمل کرنا یہ اپنی سعادت سمجھتے اور قرآن و حدیث کی نصوص کو اُس پر اس طرح

لے احمد رضا خاں بریلوی، امام: الحجۃ المومنین، ص ۹۱

منطبق کرنے میں کوشاں رہتے جیسے اصل ارشاداتِ گاندھی ہیں اور قرآن و حدیث تو محض اُس کا  
 ماشیہ اور شرح ہیں۔ یہ حق پرستی نہیں بلکہ زنا و دوستی کی بدستی تھی۔ حضرت امام اہلسنت نے گاندھی کی  
 جملہ ایکسپوں کا راز فاش کرتے ہوئے گاندھی صوفی علماء اور لیڈروں کی بے پھری کو واضح کیا اور انتہائی  
 وسیع النظری سے اُس ہجرت، جہاد اور ترکِ معاشرت کے مضمرات کو یوں الم نشرح کیا تھا،  
 "اؤ تمہیں قرآنِ عظیم کی تصدیق دکھائیں اور ان (ہنود) کی طرف سے میل اور میل کا  
 راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن کے لیے یمن باتیں چاہتا ہے،  
 اولے اُس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

حوم یہ نہ ہو تو اُس کی جلا وطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔  
 صوم یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اس کی بے پری کہ عاجز بن کر رہے۔  
 مخالفتِ غیرِ تینوں درجے ان پر ملے کر دیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، نیز وہی  
 سمجھے جاتے ہیں۔

اولاً جہاد کے اشارے ہوئے۔ اُس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا  
 ہونا تھا۔

ثانیاً صاحبِ یہ نہ بنی، ہجرت کا بجز اولیٰ کہ کسی طرح یہ دفع ہوں۔ مکہ ہجرت کی بٹیل  
 کھینچ کر وہ جا سکے۔ سیر اپنی جائیدادیں کو ڈھیلوں کے مول بچیں یا یونہی چھوڑ جائیں۔  
 بہر حال جہاد سے ناواقف آئیں۔ ان کی مساجد و مزارات اولیاء ہجرتی پامالی کو  
 رہ جائیں۔

ثالثاً صاحبِ یہ بھی نہ نیچے تو ترکِ موالات کا جھوٹا جیلو کر کے ترکِ معاشرت پر ابھارا ہے  
 کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کو نسل کہیں میں داخل نہ ہو، ماگزاراں ٹیکس کچھ دے دو، خطابات  
 واپس کر دو۔ امرِ غیر تو صرف اس لیے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی  
 مسلمان کے لیے نہ رہے اور پچھلے تین اس لیے کہ ہر صیغہ و ہر حکم میں صرف ہنود رہ  
 جائیں تو اُس وقت کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے؛ ماگزاراں وغیرہ دیکھنے پر کیا انگیزہ  
 چپ بیٹھے رہیں گے؛ ہرگز نہیں۔ قرقیاں ہوگی، تعلیقے ہوں گے، جہاد میں نیلام

ہوں گی اور ہندو خریدیں گے۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان صراحتاً فلی بن کر رہ جائیں۔ یہ تیسرا اور چہرہ  
 دیکھا تم نے قرآنِ عظیم کا ارشاد کہ وہ تمہاری بدخواہی میں گئی نہ کریں گے۔ اُن کی دلی تمنا ہے  
 کہ تم مشقت میں پڑو، والیعاذ باللہ تعالیٰ

یہ تو پھر ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کی باتیں ہیں حالانکہ اُس وقت ہمارے عظیم لیڈر اور پاکستان کے بانی مبانی  
 یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال اور محمد علی جناح جیسے بھی ہندو مسلم اتحاد کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ اقبال  
 مرحوم کبھی کہہ رہے تھے،

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

لیکن جب اُن کی آنکھیں کھلیں ہندو کی اسلام دشمنی اور اسلامی تعلیمات پر گہری نظر پڑی تو مجذبات ثانی  
 اور احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہما واسلے دو قومی نظریے کو اپنانا پڑا، جس کی این دونوں بزرگوں نے  
 اپنے اپنے وقت میں علمبرداری کا فریضہ ادا کیا تھا اور اس کے پیش نظر علامہ موصوف کو یہ نظریہ قائم  
 کرنا پڑا،

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جناب محمد علی جناح کی آنکھیں نہرورپورٹ کے وقت جا کر کھلیں اور انہیں صاف نظر آ گیا کہ حقیقت  
 میں فرانس گوش بنانے کے قابل وہی پہلی کسٹروئلنڈ کی انداز تھی، جس پر کوئی لیڈر اس لیے  
 کان دھنا پسند نہیں کرتا تھا کہ بارہ سبھی گاندھی کی اندھی میں مست ہو کر تنکوں کی طرح اڑتے  
 پھر رہے تھے۔ گاندھی صاحب نے اُن کی حرکت قبیلہ و اقوالِ شنیعہ پر شریعت کی ٹہریں ثبت کر کے  
 جہاں لیڈروں کو شتر بے مہار بنا رہے تھے، وہاں اپنے علماء، سودا اور ملت فروشن ہونے کا زندہ  
 ثبوت بھی پیش کر دیا تھا۔ اگر لوہے جیسے کی طرف دیکھیں تو اس سے آٹھ سال پہلے ۱۳۳۱ھ/

۱۹۱۲ء میں پہلی جنگِ عظیم کے وقت آپ مسلمانانِ ہند کو یوں نہالیش کر رہے تھے،

”ہندی مسلمانوں میں یہ طاقت کہاں کہ وطن و مال و اہل و عیال چھوڑ کر ہزاروں کوس  
 درنگوں کے پاس، جائیں اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ مگر مال تو  
 دے سکتے ہیں۔ اس کی حالت بھی سب آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔ وہاں مسلمانوں  
 پر بوجھ گزر رہی ہے یہاں وہی جلسے ہیں، وہی رنگ، وہی تھیٹر، وہی سنگ“

وہی تماشے، وہی بازیوں، وہی غفلتیں، وہی فضول خرچیاں، ایک بات کی بھی کمی نہیں۔ ابھی ایک شخص نے ایک دنیاوی خوشی کے نام سے پچاس ہزار روپے لیکھتے ہوئے نے ایک چینی وچناں جگر کو پچاس ہزار روپے۔ ایک زمین نے ایک کالج کو ڈیڑھ لاکھ روپے اور یونیورسٹی کے لیے تو تیس لاکھ سے زیادہ جمع ہو گیا۔ ایک رات میں ہمارے اس مغلس شہر سے اُس کے لیے چھبیس ہزار کا چندہ ہوا۔ مجبئی میں ایک کم درجے کے شخص نے صرف ایک کوٹھری چھبیس ہزار روپے کو خریدی۔ فقط اس لیے کہ اُس کے وسیع مکان سکونت سے طمّ تھی، جسے میں بھی دیکھ آیا ہوں۔ اور مظلوم اسلام کی مدد کے لیے جو کچھ جوش دکھائے جا رہے ہیں، آسمان سے بھی اُونچے ہیں اور جو عملی کارروائی ہو رہی ہے زمین کی تہ میں ہے۔ پھر کس بات کی اُمید کی جائے؟

بڑی بھاری یہ نکالی ہے کہ یورپ کے مال کا بائیکاٹ ہو۔ میں اسے پسند نہیں کرتا، نہ ہرگز مسلمانوں کے حق میں کچھ نافع پاتا ہوں۔ اول تو یہ بھی کہنے ہی کے الفاظ ہیں، نہ اس پر اتفاق کریں گے، نہ ہرگز اس کو نبائیں گے۔ اس عہد کے پہلے توڑنے والے جنگلیں حضرات ہی ہوں گے، جن کی گزر بغیر یورپین اشیاء کے نہیں۔ یہ تو سارا یورپ ہے پہلے صرف اٹلی کا بائیکاٹ ہوا تھا۔ اُس پر کتنوں نے عمل کیا اور کتنے دن نبایا، پھر اس سے یورپ کو ضرر بھی کتنا اور ہو سکی تو کیا فائدہ کہ وہ سوتیر کیوں سے اُس سے دُگنا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ لہذا ضرر رسانی کا ارادہ صرف وہی مثل ہے کہ کمزور اور پٹنکی نشانی۔

بہتر ہے کہ مسلمان اپنی سلامت دوی پر قائم رہیں۔ کسی شریہ قوم کی چال نہ سیکھیں۔ اپنے اوپر مغت کی بدگمانی کا موقع نہ دیں۔ ہاں اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو ان لڑائیوں ہی پر کیا موقوف تھا، ویسے ہی چاہیے تھا کہ

اولاً باستثناء اُن محدود باتوں کے جن میں حکومت کی دہمت اندازی ہو، اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصلہ کرتے یہ کروڑوں روپے جو اسٹامپ و کالت میں گئے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ

ہو گئے اور ہوسے جاتے ہیں محفوظ رہتے۔

ثانیاً اپنی قوم کے ہر کسی سے کچھ نہ خریدتے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی وقت و تہمت کو ترقی دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہ رہتے۔ یہ نہ ہوتا کہ یورپ و امریکہ و اسیلینا ملک بھرتا نیا کچھ صنایعی کی گزرت کر کے، گھڑی وغیرہ نام رکھ کر آپ کو دے جائیں اور اُس کے بدلے پاؤ بھر پاندی آپ سے لے جائیں۔

ثالثاً بھتی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تو گھر مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لیے بنک کھولتے۔ سو دشریح نے حرام قلعی فرمایا ہے مگر اور سہ طریقے نفع لینے کے حلال قرار دئے ہیں، جن کا بیان تب فقہ میں مفصل ہے اور اس کا ایک نہایت آسان طریقہ کفیل الفقیر القایم میں صحیح چکا ہے۔ ان پانچ طریقوں پر قطع بھی لیتے کہ انہیں بھی فائدہ پہنچتا اور اسی کے بھائیوں کی بھی حاجت بر آتی اور آتے دن جو مسلمانوں کی جائدادیں بیوں کی ہزار ٹہنی چلی جاتی ہیں ان سے بھی محفوظ رہتے۔ ان بیوں کی طرح جائداد بھی لی جاتی، مسلمان ہی کے پاس رہتی، یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان لنگے اور بیٹے چنگے۔

رابعاً سب سے زیادہ اہم، سب کی جان، سب کی اصل علم و دین میں تھا جس کی روشی مضبوط تھا جس نے انھوں کو ان مادی عالم پر پہنچایا، چارواں ملک عالم میں ان کی نسبت کا سگہ بٹھایا، تالی شجینہ کے مرتابوں کو بلند تاجوں کا ٹھکانہ بنایا اور اسی کے چھوٹے نے پھلوں کو یوں چادہ ذات میں گرایا فان اللہ فانا لہ الحیہ ما جعونہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

وہی میں، علم دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ علم دین سیکھنا، پھر اس پر عمل کرنا اپنی دونوں جہاں کی زندگی چاہتے، وہ انہیں بتا دیتا، اندھوا جسے ترقی کچھ رہے ہو، سخت تنزل ہے۔ جسے عزت جانتے ہو، اشد ذات ہے۔ مسلمان اگر یہ چار باتیں کر لیں کہ اللہ العزیز آج ان کی حالت سنبھل جاتی ہے۔

لے احمد رضا خان بریلوی، امام، تدبیرِ علاج، مطبوعہ لاہور، ص ۴۰ تا ۴۱

جہاد، ہجرت اور ترکِ معاملات (نان کو آپریشن) وغیرہ امور پر گاندھی نے مسلمانوں کو کیوں ابھارا؛ ان کی وجوہات و مضمرات آپ مجددِ مائتہ ماضیہ قدس سؤ کے لغظوں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب یہ ملاحظہ ہو کہ اُس دشمنِ اسلام و مسلمین گاندھی نے کھنڈ کی تحریک کیوں شروع کی تھی؛ ایک جانب وہ برٹش گورنمنٹ کو خوش کرنا چاہتا تھا تاکہ مسلمانوں کی صنعت پانچہ بانی کا مقابلہ کرنے سے برطانوی عاجز رہے اور حکمران ہونے کے باوجود اس صنعت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے نہ تباہ کر سکے، گاندھی نے اپنی حکمتِ عملی سے پانچہ بافوں کو بیکار بنادیا جو اہل ملک سے خاطر خواہ دولت کماتے تھے۔ چونکہ اکثر روپیہ ہندو گاہکوں کے ذریعے مسلمان پانچہ بافوں کی جیب میں پہنچتا تھا، لہذا ہندو سرمایہ محفوظ اور مسلمان منطوق بھکر رہ گئے۔ اس حقیقت کی قدر سے تفصیل اور قربانی گاڈ کو روکنے کا اصلی راز مانتا امیر حسین مراد آبادی مرحوم کی زبانی ملاحظہ ہو۔

ہندوؤں نے دیکھا کہ اگرچہ مسلمانوں کا زمیندار طبقہ تباہ ہو گیا لیکن تجارت کے ذریعے یہ دو قومیں عروج کو پہنچ گئیں۔ اب انہیں تباہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ قریش (قصاب) کے لیے تو ذبیحہ گاڈ کے روکنے کی ہمت دین کوششیں کی جا رہی ہیں، جس سے اس قوم کی مالی حالت کمزور ہو اور مومن قوم (پانچہ بافوں) کے لیے کھنڈ کی تحریک جا رہی کی گئی، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ مسلمان پانچہ بافوں کی نفیس صنعتوں نے ولایت کو شکست دے دی ہے۔ ڈھاکہ کی چکن، جالپس کی جامدانی، مومبارک پور کے ڈوبے، سنگی مشروخ، غلطہ بجا گلپور کی سلک، فتوحا کے عمامے، بنارس کے دوپٹے، ساڑھیوں، کڑا، زربفت، زرری وغیرہ کپڑے ہیں جن سے ولایت کے جو لاپسے کبھی مقابلہ نہیں کر سکے اور ولایتی پانچہ بافستان کی قدر و قیمت کم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوئی شخص ان کے مقابلہ میں ولایتی کپڑے پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ شایدیں میں عام طور پر بنارس اور مومبارک پور کے کپڑے کا ہزار ہا روپے کا خرچہ ہوتا ہے۔ ایک اور تکلیف وہ بات ہندوؤں کے لیے یہ تھی کہ بنارس کی نفیس اور قیمتی ساڑھیاں جو سات سات سو روپے قیمت تک کی ہوتی ہیں بکثرت ہندو خریدتے ہیں، یہ تجارتیں ہندوؤں سے نہ دیکھی گئیں اور اس کام کو



برباد کرنے کے لیے انہوں نے کھڑکی تحریک جاری کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی کروڑوں روپے کی تجارتیں خراب ہو گئیں اور بڑے بڑے کارخانوں کو زبردست نقصان پہنچے۔

مسلمانان اہلسنت وجماعت اسلامی تعلیمات کے مطابق برٹش گورنمنٹ اور ہنود سے معاملت کرتے رہے۔ نہ گاندھی کی اُن تحریکوں میں شامل ہوئے جو مسلمانوں کی بربادی کے لیے جاری کی جا رہی تھیں اور نہ حکومت یا ہنود کسی کے یار و انصار اور آلہ کار بنے۔ بفضلہ تعالیٰ سوادِ اعظم کا یہ کارواں سلامت کے ساتھ قرآنی تعلیمات کے مطابق رواں دواں رہا لیکن سیاسی تنظیم کا فقدان ہونے کے باعث دوسری منظم جماعتوں کے مقابلے میں خاطر خواہ کام نہ دکھاسکے جبکہ بدخواہانِ دین و ملت اپنی تنظیم کے باعث روز بروز آگے ہی بڑھتے رہے جو ہمارے کوتاہ اندیش لیڈروں کی بے تدبیری اور یارانِ تیزگام کی عیاری کا زندہ ثبوت ہے۔

علمائے اہلسنت کی رفتار بے محسوس رہی اور انہیں کوئی واضح العقیدہ لیڈر میسر نہ آسکا لیکن بفضلہ تعالیٰ ان کے قرآنی موقف میں کوئی فرق نہیں آیا نہ ذرا بھر لچک پیدا ہوئی بلکہ آج تک اسی موقف پر قائم ہیں، پاکستان کی تحریک اسی نتیجے کے طور پر ابھری جس کی آواز حقیقت میں سب سے پہلے سستی کانفرنس کے بانی حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا۔ آپ ہی کی آواز کو ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے الہ آباد میں پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے لیڈر ہونے کے باعث یہ نظریہ موصوف ہی کی جانب منسوب ہو کر مشہور ہو گیا۔ دھر پاکستان کا نام مسلمانوں کی زبانوں پر آنا شروع ہوا اور دھر علمائے اہلسنت نے پشاور سے لشکا تک طوفانی دورے کرنے شروع کر دیے تاکہ مسلمانوں کو اس کے نیلے آمادہ کریں۔ بحمد اللہ تعالیٰ اہلسنت وجماعت نے اپنے علمائے کرام کے پیغامات کو بغور سنا اور حصولِ پاکستان کے لیے سرکف ہو گئے۔ ان دنوں علمائے کرام و مشایخِ عظام نے بنارس میں سستی کانفرنس کے اجلاس کیے۔ یہ کانفرنس ۲۴ تا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء

لے امیر حسین مراد آبادی، مولانا، السواد الاعظم، بابت، ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ

ہوتی رہی۔ اس میں پانچ ہزار علمائے کرام و مشایخ عظام نے شرکت کی اور حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ صدارت کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے عظیم الشان تاریخی اجتماع نے سنا۔ اسی عظیم الشان تاریخی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا:

”حجاز مقدس جو ہم سنیوں کے ایمانیات کا گوارہ ہے اور جس کے ذرہ ذرہ سے سنیوں کی دینی روایات وابستہ ہیں اُس پر نجدی فتن و زلازل کو مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ ارض مقدس اب تک اُن فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ فلسطین کے سنی بھائیوں پر بے رحم یہودیت ستم آرائیوں کی مشق کرنے کے لیے مسلط کی جا رہی ہے۔ ہمارے جاوا اور انڈونیشیا کے سنی بھائیوں پر توپ اور بم کی بارش ہو رہی ہے اور اُن بے گناہوں کی خلاصت اتنی ہے کہ وہ سنی ہیں اور اپنے مقدس دین کی آزادی کو کسی قدر پرچھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں صرف اہلسنت و جماعت کو پامال کرنے کے لیے (ہندو اکثریت کا سائڈ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اہل باطل کی ٹولیوں کو سنیوں پر بھونکنے کے لیے پالا جا رہا ہے اور قیامت یہ ہے کہ سنیوں کو ختم کرنے کے لیے جن دزدوں کو راشن دیا جاتا ہے اُن کا نام بھی سنی رکھا گیا ہے“

اہلسنت و جماعت کو مٹانے اور مغلوب کرنے کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے فرتے قائم کیے اُن کی غرض و غایت اور کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اسی خطبے میں آپ نے یوں ارشاد فرمایا تھا:

آج کا دہائی کل سنی تھا، آج کا قادیانی کل سنی تھا، آج کا خارجی کل سنی تھا۔ اس طرح سنیوں کے گھر میں آگ لگا دی گئی ہے اور ایک ایک کاشتکار کھیل کر سنیوں کے خلاف شکار یوں نے مستقل سازش کر رکھی ہے اور انہی پالتو اور شکار کیے ہوئے افراد کے بل بوتے پر آگ مار کر لیڈر سنیوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں، ببول جنگ کی دھمکی دیتے ہیں۔ کس قدر ہوش ربا واقعہ ہے کہ ہندوستان سنی مسلمانوں کا ملک تھا۔ سنیوں نے سیکڑوں برس اس پر حکمرانی کی اور تہذیب کی بنیاد

۱۰ ص ۱۰ مولانا، خطبہ صدارت، ص ۱۰

رکھی لیکن اب ان کا وجود نہ راجھی کی نظر میں ہے نہ دنیا کی نگاہ میں۔ ہم جہانگیر و عالمگیر کے وارث کچھ نہ رہے اور برطانوی پالیسی کی پیداوار تین تین نافر کی ٹولیاں سب کچھ ہو رہی ہیں۔ امام الہند بننے کی ترکیبیں نکالی جاتی ہیں۔ امیر شریعت اپنے کو کہلایا جاتا ہے۔ ہمارا وہ مقدس و برگزیدہ نام جو ہمارے آقا حضور پر نور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ہمارا یہی کھمبل پتہ بتایا تھا مَا آتَانَا عَلَيْنَا وَ أَصْحَابِي یعنی اہلسنت و جماعت، اس کا بھرانہ استعمال اپنے لیے ہو کر رہا ہے جو سنیوں کو ہلاک کر دینے پر طعن اٹھا چکا ہے۔ سنیوں کے پیسے سے مدرسہ چلایا جاتا ہے اور اس میں ایسے دل و دماغ تیار کیے جا رہے ہیں جو سنیوں کو ستائیں، جمہوریت اسلامیہ سے ٹکرائیں، اسلامی اتحاد میں انتشار پیدا کریں، اسلامی ہم آہنگی کو صدر میں چھائیں۔ ہمارے سلاطین و اہل و عوام کی بناٹی ہوئی مسجدوں پر قبضہ ہمارے دشمنوں کا، ہماری تعلیم گاہوں پر جھنڈا ہمارے مخالفوں کا، ہماری خانقاہوں میں رسائی خانقاہ شکنوں کی... خطبہ یہ ہے کہ ہمارے منظم قتلے اور تمام ملک خطرے آپ (علماء و مشائخ) کے سامنے ہیں۔ آپ کے دیکھتے ہوئے سنیوں کا جینا و شوار ہو رہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے سنیوں پر گھیرا ڈال دیا گیا ہے اور آپ کی موجودگی میں آپ کے رسول کی آمت سے دن و ہمارے لوٹی جاتی ہے۔

اسی خطبے میں حضرت محدث کچھ چھوی رحمتہ اللہ علیہ نے لفظ پاکستان کا مطلب واضح کیا جو مختلف جماعتوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے علی رؤس الاشہاد فرمایا، میرے دینی رہنماؤ! میں نے عرضداشت میں اسی اسی پاکستان کا لفظ استعمال کیا ہے اور پہلے بھی کئی جگہ پاکستان کا لفظ آچکا ہے۔ ملک میں اس لفظ کا استعمال روز مژہ بن گیا ہے۔ در دیوار پر پاکستان زندہ باد، تجاویز کی زبان میں پاکستان ہمارا حق ہے، نعروں کی گونج میں پاکستان لے کے رہیں گے، مسجدوں میں، خانقاہوں

۱۔ سید محمد کچھ چھوی، مولانا، خطبہ صدارت، ص ۱۰ تا ۱۲

میں، بازاروں میں، ویرانوں میں لفظ پاکستان لہرا رہا ہے۔ اس لفظ کو پاکستان کا یونینٹ لیڈر ہی استعمال کرتا ہے اور ملک بھر میں ہر جگہ بھی برتا ہے اور ہم سٹیوں کا بھی یہی معاہدہ ہو گیا اور جو لفظ مختلف ذہنوں کے استعمال میں ہو اس کے معنی مشکوک ہو جاتے ہیں، جب تک بولنے والا اس کو واضح طور پر نہ بتا دے۔

یونینٹ کا پاکستان ہو گا جس کی مشینری سردار جو گند سنگھ کے ہاتھ میں ہوگی ریگ کے پاکستان کے متعلق دوسری قومیں جیتی ہیں کہ اب تک اس نے پاکستان کے معنی نہ بتائے اور جو بتائے وہ اٹلے پٹلے ایک دوسرے سے لڑتے بتائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ریگ کا بائی کا ڈر اس کا ذمہ دار ہے لیکن ہی سٹیوں نے ریگ کے اس پیغام کو قبول کیا ہے اور جس قضیہ پر اس مسئلے میں ریگ کی تائید کرتے پھرتے ہیں، وہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے ایک محترم اسلام کی قرآن کی آزاد حکومت ہو۔ جس میں غیر مسلم ذمیوں کے جان و مال، عزت و آبرو کو حسب حکم شرع امن دی جائے۔ ان کو، ان کے معاملات کو، ان کے دین پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ جائیں ان کا حرم جائے۔ ان کو ایتھو الینیم عہدہ ہم سنا دیا جائے اور بجائے جگہ و بدل کے صلح و امن کا اعلان کر دیا جائے۔ ہر انسان اپنے پُر امن ہونے پر مطمئن ہو جائے۔ اگر سٹیوں کی اس بھی ٹھوٹی تعریف کے سوا ریگ نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو کوئی سٹی قبول نہیں کرے گا۔

مسلم لیگ اور آل انڈیا سٹی کانفرنس کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ قیام پاکستان کے سلسلے میں سٹی مسلمان مسلم لیگ کی بھرپور تائید و حمایت کریں گے لیکن دینی معاملات میں مسلم لیگ ہر موقع پر سٹی کانفرنس کی رہنمائی اور ہدایات کو ملحوظ رکھے گی۔ چنانچہ اس خطبے میں اس کا ذکر یوں کیا گیا، ہم سے مسلم لیگ کو اسی کی امید رکھنی چاہیے کہ اس کا جو قدم سٹیوں کے سببے ہوئے پاکستان کے حق میں ہو گا اور اس کے جس پیغام میں اسلام و مسلمین کا نفع ہو گا آل انڈیا

سستی کا نفرنس کی تائید اس کو بے دریغ حاصل ہوگی اور دینی امور میں ہاتھ لگانے سے پہلے آل انڈیا سستی کا نفرنس کی رہنمائی اس کو قبول کرنی پڑے گی اور ضرور کرنی پڑے گی۔ اگر ہماری حق گوئی کسی کے نزدیک جرم ہے اور کسی لیگی کے نزدیک یہ لیگ کی دشمنی ہے تو ہمیں ڈیفینس میں ایک لفظ نہیں کہنا ہے اور اگر لیگ کے دشمنوں کے نزدیک یہ ہمارا لیگی ہو جانا ہے تو ہم اس خوش فہمی کو بھی قابل مضحکہ سمجھتے ہیں! لے

اسی طرح ۶۔۵ رجب المرجب ۱۳۶۵ھ / جون ۶ ۱۹۴۶ء کو بنارس کا نفرنس کے تقریباً سوا مہینہ بعد مسجد ثنا جہانی واقع درگاہ معلیٰ اجیر شریف میں آل انڈیا سستی کا نفرنس کے اسپیشل اجلاس ہونے ایک نشست کی صدارت حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

حضرات! میں نے بار بار پاکستان کا نام لیا ہے اور آخر میں صاف کہہ دیا ہے کہ پاکستان بنانا صرف سستیوں کا کام ہے اور پاکستان کی تعمیر آل انڈیا سستی کا نفرنس ہی کرے گی۔ اس میں کوئی بات بھی نہ مبالغہ ہے، نہ شاعری ہے اور نہ سستی کا نفرنس سے غلو کی بنا پر ہے۔ پاکستان کا نام بار بار لینے سے جس قدر ناپاکوں کو چڑھے اسی قدر ناپاکوں کا وظیفہ ہے اور اپنا وظیفہ کون سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے پورا نہیں کرتا، اب رہا پاکستان کا رہنمائی است۔ یہ ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تصادم کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے، جس کا انہار بلاحت لومز لائیکر دیا ہے۔ اول تو مسلم لیگ کے سوا کوئی ٹولی ایسی نہیں جو پاکستان کے ساتھ فغلی موافقت بھی رکھتی ہو انکھر ملد و احدہ۔ سارے ناپاکوں نے اپنے اندر بے شمار اختلافات رکھتے ہوئے پاکستان کے خلاف صف آرائی کر لی ہے اور مسلم لیگ میں پاکستان کا پیغام کس سے پہنچا اور لوگوں نے مسلم لیگ کا عقیدہ اہل کو بنایا، اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو وہ صرف سستی ہیں۔ پاکستان کے معنی اسلام قرآنی آزاد حکومت ہے۔ مسلم لیگ سے خارج

لے سید محمد کچھوچھوی، مولانا: خطبہ صدارت بنارس ص ۲۷۰، ۲۶

سُنی کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے رکن حضرت سید شاہ زین العسوات صاحب سجادہ نشین  
مانکی شریف (سرحد) نے کہہ دیا ہے کہ اگر ایک دم سارے سُنی مسلم لیگ سے  
نکل جائیں تو کوئی مجھے بتا دے کہ مسلم لیگ کس کو کھانا مائے گا؟ اُس کا دفتر کہاں  
رہے گا؟ اور اُس کا جھنڈا سارے ملک میں کون اٹھائے گا؟

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ مسلم لیگ کی وکالت اور اہلسنت و جماعت کے دوٹوں سے ۱۲ اگست  
۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہو گیا۔ ہندوستان کا ایک حصہ پیچھے ہو کر اسلامی نظریاتی مملکت کے  
بطور دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوا۔ یہ موقع اور یہ شاندار کاروباری ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی  
اور پاکستان کا قیام عالم اسلام کے لیے انتہائی مسرت و شادمانی کا پیغام تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے  
حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سہ قے اسے دائم قائم رکھے، آمین۔

پاکستان قائم ہو جانے پر سُنی کانفرنس کا نام جمعیت علماء پاکستان رکھ لیا گیا لیکن مسلمانان اہلسنت و  
جماعت کی بدقسمتی کہ آل انڈیا سُنی کانفرنس کے بانی اور سُنیوں کی فعال شخصیت حضرت صدر  
الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ۸ مارچ ۱۹۶۷ء مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو  
بروز جمعہ المبارک اپنے پروردگار کو پیادے ہو گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ حضرت  
محدث کچھ چھوٹی اور مولانا سلیمان اشرف جیسی بستیاں ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ راجہ قائد اعظم  
محمد علی جناح جی ۱۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کو اس جہان فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب سدھار گئے۔  
نہ مسلم لیگ ہی قیام پاکستان کے بعد اپنے اسلامی و قرآنی وعدوں کو پورا کر سکی اور نہ جمعیت علماء پاکستان  
یعنی سابق سُنی کانفرنس ہی سے کوئی ایسا دمیدار نکل سکا جو مسلم لیگ کو مجبور کر دیتا کہ اپنے  
وعدوں کو پورا کرے۔

بحالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جس طرح برٹش گورنمنٹ نے مسلمانان اہلسنت و جماعت  
کی جمعیت کو منتشر کرنے کی غرض سے مختلف فرقے کھڑے کر دیئے تھے، پاکستان بن جانے کے  
بعد اُسی سوادِ اعظم کو جس کے دوٹوں سے یہ نظریاتی مملکت معرضِ وجود میں آئی تھی اُسی جماعت  
کو دبانا کرنا اور مذہبوں کو ابھارنا شروع کیا گیا، حتیٰ کہ پاکستان کے مخالفوں تک کی  
ناز برداری کو نا ضروری سمجھا گیا، جس کا خیا زہ پوری قوم بھگت رہی ہے کہ قیام پاکستان کا مقصد  
حاصل کرنا، اس میں قرآن و سنت کا آئین نافذ ہونا تو دور کی بات، دینی اور اسلامی فضائنا گفہ بہ

ہوتی جا رہی ہے۔ خدا سے ذوالنہن ہماری حالت پر کرم فرمائے اور ہمیں اپنی انفرادی و اجتماعی حالتوں کو درست کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

## نجدی وہابیہ کی بٹ پست نوازی

خارج کے متعلق جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ وہ مختلف ناموں کے ساتھ قیامت تک رہیں گے اور ان کا آخری گروہ دجال علی اللہ کے ساتھ ہوگا۔ اسی کے مطابق ملا عمر ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے در مختار کے حاشیہ ردالمحتار میں تصریح فرمائی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس قبیلین زمانہ حال کے خارج ہیں۔ مصروف کے اس بیان کی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۵۷ء) نے اپنی تصنیف الشباب الثاقب میں اور مولوی خلیل احمد انبٹوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء) نے المہندی تصدیق و تائید کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تمام علمائے دیوبند کی مستر اور مورخ الذکر اکثر اکابر دیوبند کی مصدقہ ہے۔

ہندوستان میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مذہب کی ترویج و اشاعت کی تھی۔ مصروف کے جہر قبیلین میں خارج ہی کی ماڈرن آفس کاپیاں ہیں۔ احادیث میں خارجیوں کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور کافروں شرکوں سے بنا کر رکھیں گے چنانچہ نجدی مذکور نے اور اُس کے اتباع و خلفاء نے جزیرہ عرب کے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہانے اور ان کے احوال کو غنیمت کا مال سمجھ کر چھیننے میں کون سا دقیقہ فرودگذاشت کیا تھا، ظالموں نے حرمین کا وہاب بھی قطعاً طوطا درکھا۔ مگر اور دینہ متورہ کے مسلمانوں پر وہ قیامت ڈھائی جس کے سُنے سے مسلمانوں کا خون گھول اٹھا ہے، یہاں تک کہ اصحاب رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو ان کی آخری آرام گاہوں میں تنگ کیا، مزارات شہید کروا دیے اور جنت البقیع میں ہل چلوا دیے نیز کتنی ہی مقدس یادگاروں کا اس طرح سے نام و نشان مٹا دیا کہ صرف کتابوں میں تذکرے ہی رہ گئے۔

اگر نجدی خارجوں نے یہ کچھ کیا تو ہندی خارجی کون سے پیکر رہ گئے۔ انہوں نے

انگریزوں کی مدد سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کی آڑ میں دل کھول کر پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ خادی خاں سوار ہنڈ، یار محمد خاں حاکم یا خستمان اور اُس کے بھائی سلطان محمد خاں سے یکے بعد دیگرے لڑائیاں کیں۔ اول الذکر دونوں کو شہید کیا۔ ان لڑائیوں میں جو مال چھینا اُسے مالِ غنیمت شمار کیا۔ اسی طرح کھلابٹ، مرغز، کوا، ٹھنڈ کوئی، پنج پیر، ہنڈ، شیبو، پارگلٹی، مسوم، گھڑیالی، نوکلٹی، شیخ جانا، اسماعیلہ، امان زئی، کاٹ لنگا، لوند خور، مردان، ہوتی، مایار، تورو وغیرہ دیہات کو بند و شمشیر مسلمانوں سے چھینا گیا۔ مایار کی لڑائی میں سیکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا اور پشاور پر پیش قدمی کی لیکن سلطان محمد خاں کی دانشمندی سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون رنگ لایا اور ظالموں کو مظلوموں کا خون بگل گیا و ذلک جزاء الظالمین۔

جب ہندو اور نجدی خارجی مسلمانوں کو قتل کرنے میں قدم سے قدم ہلا کر چل رہے تھے اور ایک دوسرے پر ہمت لے جاتے ہیں پوری طرح کوشاں تھے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندی خارجی تو گاندھی اور نہرو کی پوجا کریں اور نجدی خارجی صرف دُور بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہیں۔ ان حضرات کی مذہبی غیرت سننے بھی انہیں شرمین ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو کی تعظیم بلکہ پوجا پاٹ کرنے پر ابھارا۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۵ء میں شام ابن سعود کے ہمراہ ان کے بھائی شاہ امیر فیصل بھی ہندوستان آئے۔ مونا لڈو کرنے اپنا مذہبی فریضہ یوں ادا کیا،

امیر فیصل نے جارت میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر دادو گلگشن اور پنڈت تھرو بسے ملاقاتیں کیں اور راج گھٹ پر ہاتھ لگانے کی سادہ پرچھول چڑھانے لگے نیز ایک گائڈ رتن گڑھی تشریف لے گئے جہاں دیہات سدھار کا کام دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہیں دس ہزار روپے کا عطیہ عنایت فرمایا۔

بہر حال یہ اُس وقت پھر بھی چوٹے میاں تھے۔ بڑے میاں کی سینے جنہیں مہافیلو حرم کا خطاب

لے نواسے وقت لاہور، ۱۱ مئی ۱۹۵۵ء



اُن کے معتقد حضرات بڑی عقیدت سے دیتے ہیں جو بُت شکن کے بجائے بت شکن تھے۔ مسلمانوں کو مشرک سمجھ کر اُن سے دشمنی رکھنے پر مجبور تھے لیکن مشرکوں بُت پرستوں سے اتحاد اور دوستی کی یوں بھیک مانگتے پھرتے تھے،

”شملہ سے آٹھ میل دور آپ (شاہ ابن سعود نجدی) نے ہماچل پر دیش کے لوگوں کا پیش کیا ہوا لوک ناچ کا ایک پروگرام دیکھا اور جناب صدر، معزز وزراء اور خواتین اور راجندر پرشاہ کے جواب میں شاہ سعود نے تقریر فرمائی۔ مدرسہ دیوبند کو پچیس ہزار روپیہ دیا اور یہی فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور سعودی عرب کے اتحاد اور دوستی کے رشتے ہمیشہ مضبوط رہیں گے۔“

اپنے اس دورے کے موقع پر شاہ ابن سعود نے پنڈت جوہر لال نہرو کو ارض مقدس کا دورہ کرنے کی دعوت دی جسے اُس بُت پرست نے قبول کر کے ستمبر ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب کا دورہ کیا۔ اُس وقت ان مسلمانوں کو مشرک بنانے والے لیکن حقیقت میں مشرک پرستوں نے کیسے کیسے قیامت خیز طریقوں سے پنڈت نہرو کا استقبال کیا، ان ایمان سوز حرکتوں پر پورا عالم اسلام ہلکا اٹھا اور ہر طرف سے ضلالتے احتجاج بلند ہوئی کہ معتقد ہونے کے دعویٰ دار ارض مقدس میں مشرک پرستی کا عالمی ریکارڈ کیوں قائم کر رہے ہیں؟ نہرو کے وعدے کا حال پاکستان کے سارے اخباروں میں شایع ہوا۔ ایک اخبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”سعودی عرب میں نہرو کا ”سرخیا رسول السلام“ اور چھ ہند کے نعروں نے استقبال۔ شاہ سعود نہرو کی پنج مشیلا پر ایمان لے آئے۔ سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نہرو کے استقبال کے لیے عرب عورتیں بھی موجود تھیں..... ریاض پہنچنے پر شاہ سعود نے نہرو کو گلے سے لگایا۔“

سز زمین حجاز پر پہلی مرتبہ بھارتی ترانہ ”جانا مانا گانا“ بجایا گیا۔ پنڈت نہرو جب سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض پہنچے تو ہزاروں افراد نے جن میں

شاہ سعود، سعودی شہزادے، وزراء اور سعودی فوج کے اعلیٰ افسر شامل تھے نہرو کا استقبال کیا اور ایک فوجی دستے نے نہرو کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد نہرو ایک کھلی کار میں شاہ سعود کے محل روانہ ہو گئے۔ راستے میں سڑک پر دونوں طرف ہزاروں افراد نے نہرو کو دیکھ کر ذبحہ باد کے نعرے لگائے۔ چوبیس ستمبر کی رات کو شاہی محل "الحرام" میں شاہ سعود نے نہرو کے اعزاز میں شاہی یقیافت دی۔ اُس کمرے کو رنگارنگ روٹنیوں سے سجایا گیا تھا۔ جب نہرو کمرے میں داخل ہوا تو شاہ سعود نے آگے بڑھ کر اُن کی شیروانی کے کالج میں سُرخ رنگ کا ایک کلاب ٹائٹ دیار لے

مشترک نہرو کا استقبال "یا سُوْلُ الْمَسْلَمِ" کے نعرے سے کرنے پر پورے عالم اسلام سے احتجاج کی صدا اُٹیں بند ہوئیں۔ توحید کے پردے ہیں یہ مشترک پرستی کا نظارہ مسلمانانِ عالم کے لیے ناقابلِ برداشت ہو کر رہ گیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ واقعی ان نام نہاد متحدوں کی خاندانیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور یہ حضرات سیدھی مصالح کی خاطر اپنی ظاہری مسلمانی کو بھی داؤ پر لگانے میں نہ کوئی ہلک محسوس کرتے آئے ہیں اور نہ آج کل کر رہے ہیں۔ اب پاکستانی اخبارات کا احتجاج ملاحظہ ہو:

"یہ نہرو رسولِ المسّلام" کا نعرہ ضرور کھٹکتا ہے۔ کاش معزز عرب میزبان اپنے مہمان کو امن کا رسول پکارتے وقت اپنے اُن کلمہ گو بھائیوں کا بھی تصور کر لیتے جن پر تجارت میں دین و دنوں امن و عافیت کے سب دروازے بند کر دیے گئے ہیں اور جن کا خون محض اس جرم کی پاداش میں پانی سے زیادہ اودھا کر دیا گیا ہے کہ انہوں نے رسولِ عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دلخراش توہین پر احتجاج کیوں کیا تھا؟ افسوس بھائی مسلمانوں... کی قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آہیں بھی عربوں کو اس وزیرِ اعظم کو "امن کا رسول" قرار دے کر

لے روزنامہ جنگ کراچی، ۲۷ ستمبر ۱۹۵۶ء

مرحباکنے سے باز نہ رکھیں، جس کی سرکاری اٹھلیوں سے بھارتی مسلمانوں کا گرم  
خون ابھی ٹپک ہی رہا تھا۔

دوسرے اخبار نے "جے ہند" کے نعرے لگانا اہل ارض مقدس میں مشرک کو بلا کر اُس کا اعزاز  
کرنے پر شاہ سعود کو متنبہ کیا اور اس خاندان کی قبۃ شکیفی کا ذکر کرتے ہوئے یوں سعودی حکمرانوں  
کی سیاسی مصلحت پر تبصرہ کیا ہے:

آل سعود نے پہلے خالص سیاسی مصلحتوں کے تحت ایک بُت پرست قوم کے  
نمائندے کو یا من بلا یا بعد اُس کے استقبال کے لیے خواہی اور بچوں کو ساتھ  
لے گئے اور اُن سے "جے ہند" کے نعرے گوائے۔ سعودی عرب کا یہ فعل برابر  
بہت ہے جس کی کوئی مسلمان بھی حمایت نہیں کر سکتا۔ عجیب بات ہے کہ جن حکمرانوں  
نے صحابہ کی پختہ قبریں اور حجے مکہ اس لیے مٹا دیے ہوں کہ وہ اُن کی نظروں میں  
اسلام کی تعلیمات کے منافی تھے وہی حکمران آج اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے ایک  
ایسے شخص کو جلازمینِ حرم کے استقبال کرتے ہیں جو بُت پرستوں کا نمائندہ ہے۔  
اور اسلام کے ہر کتبہ خیال کے علماء کا معتقد فتویٰ ہے کہ کوئی بُت پرست اسلام  
کے اسی گوارے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

لیکن یہ کیا کہ لغتہ توحید کی بجائے

اُن کی نماز پر برہمنوں کا ترانہ ہے

سعودی حکومت کے دعویٰ اسلام کے بارے میں نعرہ "وَسُوْلُ السَّلَام" کے پیش نظر یہ  
اقتباس بھی قابلِ غور ہے:

"شاہ سعود پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس روایت کو توڑا اور منہ غانہ کے ایک  
پاسبان کو ارضِ کعبہ پر بلایا اور صرف بلایا ہی نہیں بلکہ خلاف روایات انداز سے

۱۰ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ء

۱۱ روزنامہ کوہستان لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

اُس برہمن بچے کا استقبال کیا۔ استقبال کے وقت جو نعرے بلند کیے گئے اُن میں سے ایک نعرہ دنیا کے اسلامی مملکتوں میں خاص طور پر قابلِ اعتراض سمجھا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پنڈت جی کو "رسول السلام" کہا گیا جس کے معنی پیغمبر اسلام کے ہیں۔ پنڈت نہرو کے حالیہ دورہ سے یہ تاثر بھی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ سعودی مملکت جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی، محض نام کی اسلامی حکومت ہے اور اس کا طرز عمل ازمنہ وسطیٰ کی عیسائی تھیوکریٹک حکومتوں سے قطعاً مختلف نہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کا ناجائز استحصال کرتی ہیں! لے

اس دورے کے وقت سعودی حکومت نے "گیتا نجلی" پڑھوائی۔ کعبہ بیت خانہ، کافر و مومن، موجد و مشرک اور بیت شکن و بیت پرست کا فرق مٹانے کی جو کوشش کی اُس پر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

"کعبے اور بیت خانے کو ہمدوش کرنے کے لیے شاہ سعود اور پنڈت نہرو جو کوششیں کر رہے ہیں اُس میں برہمن کا تو کچھ بھی نہیں جانے گا البتہ موخر الذکر جو بت شکنی (قبہ شکنی) میں سبکدست ہوتا ہے اُس میں مصیبت شناسی اور رُوبا ہی آجائے گی۔"

اشد اکبر۔ ایک دورہ تھا علامہ (ابن) عبدالوہاب نجدی کے نام لیوا.....

یہ نعرہ لگاتے تھے کہ ہمارے لیے قرآن اور حدیث کافی ہیں (فقہ کی ضرورت نہیں) اب وہ گیتا نجلی پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر پنڈت نہرو کو کتنی مسرت ہوئی ہوگی، وہ کیوں نہ خوش ہوں، وہ کہتے ہوں گے، بھارت کے مسلمانوں کو ہندو نہر ارسال سے اپنا مذہب پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ پڑھ کے نہیں دیتے اور میرے سعودی عرب کے ایک دورے نے عربوں کی نئی نسل میں گیتا نجلی پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ سعودی عرب کے اس تجربہ کے بعد عجب نہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کو حکم ہو جائے کہ تم اپنی مسجدوں میں اشوک جی سنایا کرو! لے

لے روزنامہ کوہستان لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

لے ایضاً، ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء

دیوبندی علماء جو اپنے کابر کے کفریہ کلمات، کفریہ عباراتیں حتیٰ کہ کفریہ عقیدے تک ایمان کا جو ہر سبھ کو قبول کر لیتے ہیں، مسلمانوں کے ٹوٹنے پر ان کی دوزخ کا تاویل کر کے خود بھی ان کفریات میں برابر کے حصے دار بن جاتے اور انہیں اسلامی عقیدے اور عبارات میں ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اگرچہ بات بنی ایک دفعہ بھی نہیں لیکن اس طرح اپنے قبعین اور جہلاء کو مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہم نے دندان شکن جواب دے دیا اور ثابت کر دکھایا ہے کہ ہمارے یہ عقیدے اور عباراتیں ہرگز کفریہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ان حضرات کا اسلام کے ساتھ مذاق اور اپنی جانوں پر ظلم ہے۔ آخر عاقبت تو اپنی ہی خراب کرتے ہیں اور اپنے ساتھ قبعین کو بھی گھرے میں لے کر ڈوبتے ہیں اس کے باوجود نجدیوں کا نعرہ "رسول السلام" مولوی احتشام الحق تھانوی (کراچی) کیلے ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس شناعیت و قباحیت کو موصوف بھی برداشت نہ کر سکے۔ ان کا ایک بیان یوں اخبارات و رسائل میں شائع ہوا:

"مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج رات ایک بیان میں کہا ہے کہ سرزمین حجاز کے دار الخلافہ ریاض میں بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کے استقبال پر "مرحبا نہرو رسول السلام" سے جو ننگ اسلام اور اسلام سوز نغمہ کے نعرے لگائے گئے ان سے نہ صرف یہ کہ مسلمانان عالم کے دینی و ملی جذبات غیرت کو ناقابل برداشت سمجھ رہے ہیں بلکہ متولی حرمین شریفین کی اس موقدانہ دینداری کا پول بھی کھل گیا ہے، جس کا سارے عالم میں ڈھنگا مٹا جا رہا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ سرزمین توحید اور گوارا اسلام میں ایک صنم پرست بلکہ منکر خدا اور اللہ کے باغی کو دعوتِ حکیم دینا اور جو اہل رسول میں جلتے والے موقدین مردوں اور عورتوں سے خیر مقدم و استقبال کرانا پاسبانِ حرم کے لیے کھانا تک زیب دیتا ہے یا اس احساسِ ذمہ داری کو کھانا تک پورا کرتا ہے جو حرمین شریفین کی تولیت پر مسلمانان عالم کی طرف سے عاید ہوتی ہے، خود یہ بات بھی اپنی جگہ انتہائی شرمناک اور غیر اسلامی ہے کہ پنڈت نہرو کے لیے "رسول السلام" جیسے اصطلاحی الفاظ استعمال کیے جائیں۔

سودی عرب کے سفارت خانے سے جو مضامین بیان دیا گیا ہے، نامزد کردہ  
 عربی کی اجماع سے بھی واقف نہیں ہے کہ رسول سے قاصد کے معنی مراد ہیں نبی کے معنی تراویح  
 میرے نزدیک علی گناہ بدتر از گناہ کا مقصد اسی ہے اور ممکن ہے کہ ہمارے شمار عربی کی اجماع  
 سے حقیقت میں واقف نہ ہو، لیکن سودی عرب کے سفارتی ترجمان سے زیادہ  
 واقف اسلام ضرور ہوتا ہے اور الزام کی تردید کرنے والے ترجمان ممکن ہے کہ  
 عربی کی بہارت نامہ رکھتے ہوں مگر اسلام اور تعلیمات اسلام کی اجماع سے بھی  
 نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

مگر جبار رسول السلام کے نعرہ سے ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والے کو  
 یہ غلط فہمی نہیں ہوتی ہے کہ پختہ ستر کو بھی یا پختہ پٹا دیا یا اس لفظ سے نبی کے  
 معنی مراد لیے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ رسول سے قاصد ہی کے معنی مراد لیے  
 گئے ہیں، یہ اعتراض ہے کہ لفظ رسول، اسلام اور قرآن کریم کی مخصوص اصطلاح  
 ہے، جس کی حیثیت شعائر اور شعائر اسلام کی ہے۔ جیسے قرآن، مسجد حرام،  
 مسجد اقصیٰ وغیرہ قسم کے بے شمار الفاظ اسلامی شعائر ہیں، جو اپنے لغوی معنی سے  
 نکل کر اصطلاحی معنی میں داخل ہو گئے۔ اب ان الفاظ کو لغوی معنی میں استعمال  
 کرنا، بالخصوص ان لوگوں کی طرف سے جن کو عربی زبان کے استعمال کرنے میں  
 حدود دین کا پاس رکھنا ہے، قطعاً ناجائز و حرام ہے، بلکہ شعائر اللہ کی کھلی ہوئی  
 بے حرمتی اور توہین ہے۔

چون کفر ہذا کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان

کیا کسی مسلمان کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا نام کتاب اللہ، اپنے  
 گھر کا نام بیت اللہ اور اپنی مسجد کو مسجد حرام، اپنے باغ کو جنت، اپنے تالاب کا  
 نام کوثر اور تنور کا نام مجیم اور اپنے پوست میں کا نام رسول رکھ لے؟ حالانکہ  
 لغوی اعتبار سے یہ سب صحیح ہیں۔ کیا قرآن کریم میں یا ایہا الذین امنوا  
 تقولوا راعنا و قولوا انظرنا میں الفاظ کا ادب مسلمانوں کو نہیں سکھایا

گیا ہے؟ کیا حدیث کے اندر مسلمانوں کو خبیث نفسی کی ممانعت سے یہی ادبِ الفاظ نہیں بتلایا گیا ہے؟

سعودی عرب کے سفارتی ترجمان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی عربی زبان بھی وہ زبان ہے جس میں اصطلاحاتِ قرآن کی حرمت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر اللہ کے باغی کے احترام میں آج ناموسِ رسول کو یہ کہہ کر بھینٹ چڑھایا گیا کہ رسول کے معنی قاصد کے ہیں تو آئندہ تمام شعائرِ اسلام کی حرمت کبھی باقی نہ رہ سکے گی۔ پھر سلامتی و امن کا استعمال بھی کس قدر جیسا سوز اور عزت کش ہے کہ جس کے ملک میں آئے دن خونِ مسلم سے ہولی کھیلی جاتی رہی ہو وہ قاصدِ امن تو کیا ہوتا اُس میں امن و سلامتی کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ خدا کی شان ہے کہ مردمِ خور و زیدوں کو قاصدِ امن کے لقب سے یاد کیا جائے۔

جنوں کا نام غرور رکھنا خود کا جنوں!

جو چاہے آپ کا جھنڈا کرشمہ ساز کرے

ہم آخر میں باسببانِ حرم سے صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حرمینِ شریفین مسلمانانِ عالم کی امانت ہے اور ان پاسبانوں کی طرف سے..... ناموسِ رسول کی جہے حرمتی کبھی برداشت نہیں کی جاسکتی۔

قارئینِ کرام حیران ہوں گے کہ جب دوسرے دیوبندی حضرات خاموشی یا تاویلات کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے تو اس غیر اسلامی نعرے پر دیوبندی ہونے کے باوجود مولوی احتشام الحق تھانوی نے تنقید کیوں کی تھی؟ ہم قارئینِ بطور کی واقفیت کے لیے عرض کرتے ہیں کہ موصوف کا تعلق اُس جماعت سے ہے، جس کے سرگروہ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) بقول علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۸ھ) چھ سو روپیہ ماہوار انگریزی حکومت سے وظیفہ پاتے تھے، اسی وجہ سے تھانوی صاحب اور ان کے تابعین

زنار دوست ہونے کی بجائے برٹش نواز تھے اور ہندو نواز علماء پر تنقید بھی کرتے رہتے تھے جیسا کہ  
اسی باب میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کا ایک طویل بیان پیش کیا جا چکا ہے۔ مولوی  
احتشام الحق صاحب کا تعلق بھی چونکہ اسی تھانوی گروپ سے ہے لہذا موصوف کا اس  
زنار دوستی پر تنقید کرنا چنداں محلِ تعجب نہیں۔ اب اس بُتِ فریاد حرکت پر ماہنامہ "نقاد" کراچی  
کے ایڈیٹر کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

" قاطع بدعت و منافی، مقلد (ابن) عبدالوہاب نجدی، محافظِ حرمین الشریفین

جلالۃ الملک شاہِ سعود کے نام

خدا یانِ رسول و عالمیانِ اسلام کا پیغام

جلالۃ اللہ! اللہ آپ کو محبتِ رسول دے۔ خدا معلوم آپ کو معلوم ہے یا  
نہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں نے، ۱۹۴۷ء میں "پاکستان" کے  
نام سے ایک ملک بنا لیا تھا۔ اس نوزائیدہ ملک کے بنتے ہی دشمنانِ اسلام  
و مسلمین نے مسلمانانِ ہند کو اپنے زخے میں لے لیا تھا اور پھر اُن کا قتلِ عام  
شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں نے اپنے آبائی وطن کو  
گھروں سے بھاگ بھاگ کر، مرتے گرتے نہ جاننے کیا کیا مصائب برداشت  
کرنے کے بعد پاکستان میں حکومت اختیار کر لی۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی  
ہندوستان میں ساڑھے چار یا پانچ کروڑ مسلمان موجود ہیں، جہاں نہ اُن کی  
جانیں محفوظ ہیں نہ اُن کی عورتوں کی عصمتیں۔

لیکن اسے کلیدِ بردارِ حرم! جب آپ پچھلے دنوں ہندوستان کے  
سرکاری دورے پر آئے تو ان حالات کے باوجود آپ نے ہندوستانی حکومت  
کو یہ سند شاہی عطا فرمادی کہ "ہیں بحیثیتِ محافظِ حرمین الشریفین اس بات  
سے مطمئن ہوں کہ ہندوستان میں مسلمان امن و سکون سے ہیں اور اُن کی  
جانیں محفوظ ہیں وغیرہ وغیرہ"

یقین کیجیے شاہ! آپ کی اس سند شاہی کی تشہیر کے بعد میں محمد شاہ



جنگیلے کے فرامین بے ساختہ یاد آگئے تھے اور ہم یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ ترک کی مسلمان قوم آپ اور آپ کی حکومت سے کیوں غیر مطمئن رہی ہے۔

اس واقعہ کے بعد آپ نے ایک غیر مسلم سربراہ کو سرزمینِ حجاز مقدس کے سرکاری دورے کی دعوت دی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جب آپ کے دار الخلافہ ریاض پہنچے تو آپ کی حکومت کے اکٹھے کیے ہوئے عوام نے "یا رسول السلام نہرو" کے شرمناک نعروں سے اُن کا استقبال کیا تھا۔ اس استقبال کرنے والوں میں عرب کے وہ قبائلی بدو اور عورتیں بھی شریک کیے گئے تھے جو کسی دشمن اسلام فرد یا قوم کے لیے اپنے دلوں میں جذباتِ احترام نہیں رکھتے۔ پھر سب سے بڑا اجتہاد جو آپ جیسے قاطع بدعات سے کیا تھا وہ یہ تھا کہ عرب کی خواتین کو غیر محرموں کے انبوا کثیر میں لاکر اُن سے یکے غیر محرم و غیر مسلم شخص کا استقبال سرزمینِ حجاز پر "رسول" جیسے مبارک مقدس خطاب سے کرایا۔

شاہِ قبرستانِ اہل بیت جواہر لال نہرو کو "رسول" کے نام سے آپ نے یا آپ کی قوم سے یاد کر کے پاکستان کے نو کھڑے مسلمانوں کی جو دلآزاری کی وہ ناگفتہ بہ ہے۔ آپ کو کسی نے یہ بات غلط بتادی ہے کہ پاکستان میں ایسی قوم آباد ہے جو عربی زبان سے بنا واقع ہے اور عربی زبان کے معانی و مطالب سے آگاہ نہیں ہے۔ آپ کے سفارت خانے لفظ "رسول" کے لیے جو تاویلات وضع کر رہے ہیں اُس سے اُن کی بیجا پرگی اور نہاد امتِ حرم ترشح ہو رہی ہے۔

جلالۃ الملک اہم مسلمانانِ عالم حیران ہیں کہ آپ اور آپ جیسے عقائد مذہبی رکھنے والے لوگ ایک ایسے شخص کو تو "یا رسول" جیسے عظیم لقب سے خوش آمدید کہتے ہیں جو بطناً و نسللاً بت پرست اور مسلماً لاذہب ہے، لیکن کوئی مسلمان حیاتِ النبی، خاتم الرسل، حضور رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فوراً جذبات و عقیدت، لوازمِ احترام اور واجباتِ استغاثہ میں یا رسول

یا محمد، یا مصلقی کہہ کر یاد کرے تو اسے کافر و مشرک قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ کونسی منلق ہے؟ یہ کون سا عقیدہ ہے؟ یہ کون سا مذہب ہے۔ استغفر اللہ بی۔

آپ لوگوں نے جنت البقیع کے تمام آثار مقدسہ کو شہید کر دیا۔ صد ہا اصحاب کبار کے قبوں کو مسمار کر دیا۔ گنبد خضریٰ، آرام گاہ رسول، سرچشمہ نور الہی کے معاد سے زمین بوسی کو حرام اور جرم قرار دیا گیا اور آپ اور آپ کے ہم مسکن عقیدہ مولویوں نے یہ حکم ہی لگا دیا کہ ختم المرسلین، نبی آخر الزمان، حیات النبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو شخص کھڑے ہو کر یا رسول سلام علیک پڑھے مشرک و کافر ہے اور اس عقیدے پر اصرار کرے تو مرتد اور واجب القتل! لیکن آج یہ کیا ہوا کہ احترام رسول کو بدعت و شرک و کفر کہنے والے مقلدین ابن عبدالوہاب نجدی ایک ایسی قوم کے سربراہ کا استقبال "یا رسول السلام" کے نعروں سے کرتے ہیں جو دشمن رسول و اسلام ہے اور لاکھوں دیوبندی و تہاؤں کا پجاری ہے اللہ اکبر۔

اے شاہ اہم آج مجھے کہ بڑے بڑے جنادریوں کے عقاید و مسلک کے آئینی نعلوں کو سیاسی تعاضفے ایک ہی جھگے میں مسمار کر ڈالتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج سعودی عرب میں کسی ڈائیکریٹ یا پوسٹ مین یا کسی بھی پیغام رساں کو اہل زبان یاد دہانی لوگ "یا رسول" کہہ کر پکارتے ہیں؟ ہم پوچھتے ہیں کہ عرب کے کسی بھی گوشے میں کیا کوئی ایسا بد نصیب مسلمان ہے جو رسول کا لفظ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے علاوہ عام آدمیوں علی الخصوص کسی مشرک و بت پرست یا لاد مذہب شخص کے لیے بولتا یا لکھتا ہو؟

ہمارے سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے اور ہم تمہا بہت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور پر نور (روحی فداہ) کی شان میں گستاخانہ خیالات رکھنے اور بارگاہ رسالت میں اپنے معاطلات صاف نہ رکھنے کی پاداش میں عرب عاکوں سے یہ حماقت اور دیوانگی سرزد ہوئی ہے۔ تو اضع و میزبانی عربوں کا طرہ امتیاز ہے

لیکن اسے کلید بردارِ حرم! آپ نے یہ بھی غور کیا کہ سیاسی استحکام اور ذاتی حُجّتِ جاہ کے لیے آج آپ کی میزبانی اپنی حدود سے بڑھ کر دشمنی دین اور شہادتِ رسالت کے تعزیرات اور ظہورِ ضلالت کی سرحدوں پر آپہنچی ہے۔ آپ تمام حضرات غیر مشروط طور پر اقرارِ گناہ کر لیں۔ اس نازک مرحلے پر تاویلات اور استدلال کے سہارے بڑے شرمناک ہیں۔ اس راستہ میں 'باند اویوانہ باش و با محمد ہوشیار' کا عقیدہ واجب و لازم ہے اور تاویلات، "عذر گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف ہیں۔ خدو نذیرِ کریم آپ کو محبتِ رسول دے اور یہ توفیق بھی ارزاں فرمائے کہ آپ یا آپ کی حکومت مسلمانانِ عالم کی اس دلازاری کے سلسلے میں نام ہو۔ اَسْلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔

۴۔ خدا ہی جانتا ہے حشر اس ٹولی کا کیا ہو گا؟

حرم سے جس کی بدبختی نے رُخِ قلت کا پھیرا ہے

مولوی احمد مسلم الحق تقانوی صاحب کچھ تو بولتے، یہ بھی عنایت ہے کہ وہ ہندو نوازی سے اتفاق نہیں رکھتے ورنہ یہ کونسی نئی بات تھی یا زلاخیر اسلامی نقاد و باہیوں کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اپنے دوسرے ہم مسک علماء کی طرح موصوف بھی ٹھپ سا دھ لیتے یا تاویلات کی بھول بھلیاں میں پھرنے لگ جاتے مگر ہندو نوازی پر اپنے گروپ کی لاج رکھنے کے لیے بولنا پڑا لیکن اس طرح کہ دوسرے غیر اسلامی عقاید و نظریات اور نجدیوں کے کارناموں کو ٹھیس تک نہ لگنے دی۔

قارئینِ کرام نے ایڈیٹر ماہنامہ 'نقاد' کراچی، جناب ظفر نیازی صاحب کا تبصرہ اچھی ملاحظہ فرمایا۔ موصوف نے وہی کچھ کہا جو ایک مسلمان کو کہنا چاہیے اور جو کچھ کہا جراتِ رندانہ سے کہا۔

۵۔ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو بہا ہی

قارئینِ کرام! نجدیوں کی اس غیر اسلامی روش نے غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کیسا

ہتھیار تھما دیا۔ ”رسول“ کے اصطلاحی اور لغوی معنوں کے بارے میں کسی کسی موٹنگائیوں کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ تجارت کا وہلی سے نکلنے والا اخبار ”پیج“ اپنے ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کے ادارے میں نمبروں کے اسی نعرے پر اظہار خیال کرتا ہے۔ اُس ادارے کا ایک اقباس نواسے وقت لاہور نے یوں نقل کیا تھا:

۱۔ پر دھان منتری شری جواہر لال نہرو پیغمبر اسلام کی دنیا میں پہنچنے تو اُن کا استقبال پیغمبر امن کے نعروں سے کیا گیا۔

۲۔ اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو اسلام کے معنی امن کے ہیں، سلامتی کے ہیں پیغمبر اسلام کے معنی بھی امن و سلامتی کے پیغامبر کے ہیں۔ (گویا پیغمبر امن اور پیغمبر اسلام ایک ہی بات ہے)

۳۔ پیغمبر اسلام کے ملک باسیوں نے پنڈت جی کی عزت افزائی کے لیے وہی لفظ منتخب کیا جس پر اُسے نازیب۔ جس کی وجہ سے دنیا سے اسلام میں عرب و لیس کی عزت ہے۔

۴۔ پنڈت جی کے اُس دورہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ — یہ تو وقت بتائے گا، مگر اُس سے کفر اور کافر کے فلسفے میں تبدیلی ہوگئی تو یہ دورہ کی بہت بڑی فتح ہوگی۔

۵۔ یہ بسندگی خدائی، وہ بسندگی گدائی

یا بسندۃ خدا بن یا بسندۃ زمانہ

اس اسلام سوز نعرے کی بنا پر مرزائی حضرات ان نام نہاد موتھروں کے مُنہ پر یوں لگام لگاتے ہیں:

”ایک مذہبی سوال لفظ ”رسول“ کے استعمال سے متعلق ہے۔ آج تراجمیوں کو یہ تاویل سمجھ آرہی ہے کہ رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں۔ مگر جب حضرت بانی سلسلہ احمدیہ (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) نے رسول کے معنی

لے روزنامہ نواسے وقت لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

ماہر اور تابع شریعت اُمتی نبی کے پیش کیے تھے تو یہی مولوی (نذیر حسین دہلوی) شہداء اللہ امرتسری اور محمد حسین بنا لوی وغیرہ) شور مچاتے تھے کہ "رسول" شرعی اصطلاح ہے، اس لفظ کے اطلاق کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نئی شریعت لانے کا مدعی ہے۔ اگر اس موقع پر اہلحدیثوں کو ہی لفظ "رسول" کے استعمال کی وسعت کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کو مان جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ لیلِ نجد کی غلطی مفید ہی ثابت ہوئی۔

قارئین کرام نے نجدی دہابیوں کی زنازدوستی اور مشرک نوازی کا کرشمہ دیکھ لیا۔ یہ ہے ان حضرات کی توحید پرستی کا عالم۔ مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے کس طرح کے مشرک دوست اور بُت پرست نواز نکلتے ہیں۔ نجدی اور ہندی سارسے ہی وہابی قبروں اور خصوصاً مزاروں سے بہت جلتے ہیں، اسی لیے مسلمانوں کو قبر پرست اور پیر پرست کہے بغیر تو ان حضرات کا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ غضب تو یہ ہے کہ زوقِ رسول پر بھی غلاموں کو نہیں جانے دیتے کہ کہیں اُس بارگاہِ بے کس پناہ میں حاضر ہو کر یہ مشرک نہ بھی جائیں، کافر نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں کو اپنے اصطلاحی کفر و شرک سے بچانے والے خود کن لوگوں کی قبروں سے اپنی ساختہ توحید کی بھیک مانگ کر لاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

دانشگاہِ بکرم فروری۔ آج صبح شاہ سعود پور ٹونک دریا کو عبور کر کے ارنگٹن قبرستان گئے اور گنام سپاہی کی قبر، چھول چڑھا ہے۔ یہ قبر گزشتہ جنگ میں ہلاک ہونے والے تمام امریکی سپاہیوں کی یادگار بھی جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا شاہ سعود نے ٹائپ صدر نمکس کے ہمراہ کھلایا۔

سعودی عرب کی نجدی حکومت کے اُس وقت کے وزیر دفاع نے اپنے شہنشاہِ معظم کے ہمراہ امریکہ میں محافظین اور خیر خواہ اسلام ہونے کا ایلا منظر ہوا کرتے ہوئے یوں

۱۵ ماہنامہ الفرقان، ریوہ، فروری، ۱۹۵۵ء، ص ۱۵

۱۶ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲ فروری، ۱۹۵۵ء

اپنے فرضی موجد ہونے کا بین الاقوامی ثبوت پیش کیا:

”سعودی عرب کے وزیر دفاع، امیر فہد بن سعود نے جو شاہ سعود کے ہمراہ امریکہ گئے ہیں، کل امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی قیام گاہ کی سیر کی۔ بارش کے باوجود انہوں نے مکان کے پائیں باغ کی بھی سیر کی اور جارج واشنگٹن کی قبر پر پھول چڑھائے“ لے

مسلمان اگر اللہ جل شانہ کے دوستوں یعنی حضرات اولیاء اللہ کے مزارات پر پھول چڑھائیں تو وہابی حضرات کو یہ فعل خالص مشرکانه نظر آتا ہے لیکن یہی حضرات خدا کے دشمنوں یعنی کافروں اور مشرکوں کی قبور پر پھول چڑھائیں تو کیا مجال کہ ان کی توحید میں ذرا بھی فرق آجائے بلکہ اس قطعاً غیر اسلامی اور سراسر ابلطیسی توحید میں اور جارج چاندنگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو ایسی نام نہاد توحید سے محفوظ و مامون رکھے اور ان حضرات کو خوش فہمی کی بھول بھلیاں سے نکال کر راہِ ہدایت پر گامزن فرمائے۔ آمین

کاشیں اور خارجی حکمران بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمایا کریں کہ جس دین و مذہب کے نام پر انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے وہ مذہب انہیں کھلے کافروں، ٹھیٹھ مشرکوں سے محبت کہہ سکیں پڑھانے سے کیوں نہیں روکتا؟ عالم اسلام کی وہ قربانیاں جو راہِ خدا میں حج کے موقع پر پیش کی جاتی ہیں، ان کے متعلق سنا ہے کہ نجدی وہابی ہرگز ان کا گوشت نہیں کھاتے، مشرکین کا ذمیہ قرار دے کر اجتناب کرتے ہیں لیکن غیر مالک کے دورے پر جاتیں تو سب کچھ ضیافتوں کے بہانے پر منہمک کر جائیں۔ کچھ نہ سہی تو کچھ خزانے کو جس طرح اپنی ملکیت قرار دیا ہوا ہے اور بے دریغ شاہی خاندان پر لٹا دیتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟ کیا مسلمانوں کی وہ قربانیاں حرام ہیں؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ وہاں کا حکمران طبقہ مسلمانوں اور کافروں سے جس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے ہے اس پر نظر ثانی کرے، کیونکہ ان حکمرانوں کی اور پورے عالم اسلام کی بھلائی

لے روزنامہ کوہستان لاہور، بابت ۲ فروری، ۱۹۵۷ء

اور بہتری اسی میں ہے کہ کافروں کو کافر سمجھ کر ان سے اسی طرح سلوک کریں جیسا کہ مسلمانوں کو ان سے کرنا چاہیے اور مدعیانِ اسلام کے مابین جو اختلافات ہیں انہیں افہام و تفہیم کے ذریعے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ حق کو قبول کرنا اور باطل سے پھیا پھڑانا جہادِ اکبر ہے۔

## بُت پرستوں کی سُختہ زُناری

قارئینِ کرام! آپ نے اس باب میں ہندو نوازوں، زناہ دوستوں اور گاندھی پرستوں کے کارنامے تو ملاحظہ فرمائے کہ علم و فضل کے تمام تر دعاوی کے باوجود ان کی کوششوں کی منزل مقصود یہی تھی کہ ہندوستان کے سارے مسلمان گاندھی کے قدموں میں ٹھکتے، اسلامی غیرت و حیثیت کو کھوتے اور ہندومت میں مدغم ہوتے چلے جائیں۔ گویا ان حضرات کی کوششوں کا ماحصل یہی تھا کہ اُمتِ محمدیہ کا رخ حرم سے سومات کی جانب پھیر دیا جائے خدا پرستی کے بجائے مسلمانوں کو ایسے راستے پر گامزن کیا جائے جس سے یہ ان لوگوں کے پرستار بن جائیں جو خود بُت پرست ہیں۔ ان کی ملتِ اسلامیہ سے خیر خواہی کی ابتداء انگریز کی غلامی کے نعرے سے شروع ہوتی تھی اور گاندھی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جانے پر سارے پروگرام کی انتہا ہو جاتی ہے، یہ تھی ان حضرات کی ستم ظریفی، جس کا انتہائی فخریہ انداز میں آج تک ڈھول بجایا جا رہا ہے کہ باعثِ رونق چین اگر کوئی تھا تو ہم ہیں اور مسلمانانِ پاک و ہند کے چہروں پر اگر رونق کے کواڑی دھندلے سے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں تو وہ ہماری ہی مسابلی غلبہ کے مرہونِ منت ہیں۔ اسی غرض سے ہم نے پورے انصاف کے ساتھ ان حضرات کے حقیقی خدو خال تاریخ اور حقائق کی روشنی میں سب کے سامنے اُجاگر کر دیے ہیں۔ اب دوسری جانب لڑا یہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے کہ جن ہنود بے بہود پر یہ کرم فرمائے جا رہے تھے اور جن کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں کو ان کے قدموں میں جھکانے کا فریضہ پوری ہمت اور جانفشانی سے ادا کرتے آ رہے تھے، خود ان ہندو لیڈروں یعنی ہندو نوازوں کے ہاتھ اور ان وانا حضرات کس وجہ مسلمانوں کی جانب بیکے، کیا ان کی سُختہ زُناری میں کوئی فرق آیا، کیا اپنے پجاریوں کے پاس خاطر یا تسکینِ قلوب کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے دھرم میں کوئی لچک پیدا کی، کاششِ راستوں نے

گوش ہوش سے سنا ہوتا کہ ان کے گاندھی مہاراج علی الاعلان یوں فرما رہے تھے،  
 میں اپنے آپ کو سنانتی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں،  
 پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں اور اوتاروں کا قائل ہوں  
 اور تنائیخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گنور کھٹا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور  
 بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُوں رُوں ہندو ہے۔  
 کاش! مسلمانوں کی خیر خواہی کا دعویٰ کرنے والے ان زنا دوستوں کو یہ توفیق مل جاتی  
 کہ ہم مسلمان ہیں، کتاب و سنت ہمارے دین کے ماخذ ہیں اور ان کے اندر واضح لفظوں  
 میں غیر مسلموں سے دوستی رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے، بلکہ قرآن کریم میں تو یہاں تک فرما دیا گیا ہے  
 کہ جو غیر مسلموں سے دوستی کرے گا وہ ان میں ہی شمار کیا جائے گا۔ لہذا یہ اسلامی غیرت  
 کے سراسر خلاف ہے کہ ہم بت پرستوں کے آلہ کار اور مشرکین ہند کے فعلین بردار بن جائیں  
 لیکن ایسا تو کوئی اسی وقت کہہ سکتا ہے جب اسلام کی نورانیت سے اُس کے دل و دماغ  
 منور ہوں۔ گاندھی کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے،

”مختلف طبقات و مذہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو روح  
 پیدا ہو رہی ہے، اُس کے پیش نظر میں اس بات کو سخت ہنسک سمجھتا ہوں کہ  
 ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس  
 مذہب کے وہ قائل ہیں، ان کے نزدیک بس وہی سچا مذہب ہے۔“  
 کیا گاندھی حضرات نے سن کر دریں چہ ہنسک نہ کہا ہوگا۔ اگر کچھ بھی نہیں کہا، تب  
 بھی خاموشی نیم رضا مندی ہوتی ہے۔ خیر جس گاندھی کو یہ عزم فرما مسلمانوں کا اس دور میں  
 سب سے بڑا خیر خواہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے اور اعلان کرتے تھے کہ اگر  
 نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے، وہی ان حضرات کا مذہبی پیشوا، نبوت کی اہلیت

۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء

۱۶ جولائی ۱۹۳۸ء



رکھنے والا ان کا دینی رہنما کسی گلی لپٹی کے بغیر اپنوں اور بیگانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈنکے کی چوٹ یوں علی الاعلان ستا رہا تھا۔

تیسری رُوح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔

کیا اس اعلان کوشن کر گاندھی کی پیشانیوں پر بل آئے تھے؟ اگر بل آئے ہوتے تو اس کے بعد تو کم از کم گاندھی کی آندھی میں تنگے بن کر فضا میں اڑنے سے توبہ کر لیتے۔ لیکن فضا میں اڑنے کے لیے جو بلند مقام مل رہا تھا وہ توبہ کب کرنے دیتا تھا۔ مزید چینیے کہ گاندھی نے متحدہ قومیت کی تبلیغ کا زہر کس مزے سے شربت اتحاد و اتفاق کے نام سے اعلان فرمایا اور وہ ان شرک و مشرکین کو بلایا اور انہوں نے بڑے مزے سے لے لے کر اس جان فرمایا تھا۔ چنانچہ گاندھی صاحب نے کہا تھا۔

اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک بیچ کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے، جو چھوڑ کر یں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترکہ ہو۔ مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے نہیں ہیں، وہ انہیں ایک رشتہ میں پروانے کے لیے ہیں۔

۱۹۴۴ء میں گاندھی صاحب کا ایک بیان اجازت میں محمد علی جناح کے نام کھلا خط کے نام سے شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اُس میں قومیت کا جو تصور پیش کیا اور جملہ گاندھی حضرات

۱۔ ہندوستان ٹائمز، ۳۰ اپریل ۱۹۴۰ء

۲۔ ہندوستان ٹائمز، ۹ جون ۱۹۴۰ء

ذمہ داریوں کے قائل بلکہ مبلغ تھے، وہ اسلامی غیرت کیلئے کھلا چیلنج ہے۔ انہوں نے کہا تھا:  
 "میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد  
 کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعوائے  
 کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان انگریزوں  
 کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد اُسے ایک ہی قوم رہنا چاہیے،  
 خواہ اُس کے سپوتوں میں سے کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"

وہابی حضرات کے سہ ماہی "المسئلہ" یعنی پنڈت جواہر لال نہرو جو مسلمانانِ پاک و ہند  
 کے اذلی دشمن اور کھلے کافر، ٹھیٹھ بت پرست تھے، ان کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل  
 کنونشن مارچ ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوا۔ پنڈت جی نے صدارتی خطبے میں قومیت کا تصور یوں  
 بکھیرا تھا:

"ایسے لوگ بھی ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں  
 گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس  
 دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کی حضرات کو اسلام کا ظاہری طور پر نام لینے اور  
 خود کو مسلمان بنانے سے ہٹانے کی خاطر مذہب کی مخالفت جن لفظوں میں کی وہ دیدنی ہے۔  
 موصوف نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:

"جس چیز کو مذہب یا متعلم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری  
 جگہ دیکھ کر میرا دل بیت زورہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے  
 اور اسے مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔"

۱۵ ستمبر ۱۹۳۶ء

۱۹۳۶ء روماد آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۶ء

۱۱ ص ۶۱

مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے لفظوں سے بھی واضح تر الفاظ میں، ہندو سماجی  
کے صدر یعنی مسٹر سادگر سے ہندو کی تعریف سن لیجیے۔ موصوف نے کہا تھا:

”لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شخص جو ہندوستان کی ہو مثلاً کچر، نسل اور  
روایات اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔“

اسی ہندو سماجی کے نائب صدر یعنی ڈاکٹر رادھا کر جی نے آل انڈیا ہندو ویدک  
یوتھ کانفرنس منعقدہ لاہور کے صدارتی خطبے میں علی الاعلان کہا تھا کہ:

”ہندوستان کو فطری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ جس کا کچر  
ہندو اور جس کا مذہب ہندو لازم ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ  
میں ہو۔“

دیوبندی حضرات کے شیخ الہند یعنی مولوی محمود الحسن صاحب جس شخص کی سرکردگی میں  
ریشمی رومال کی تحریک میں حصہ لیا تھا اور جو اُس تحریک میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا، اسی  
لالہ ہریال کا بیان ہے کہ:

”پس اگر ہندوستان کو کبھی آزادی ملی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا۔ نہ صرف  
ہندو راج قائم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شدھی، اخصائیتان کی فتح وغیرہ باقی  
آدرش بھی پورے ہو جائیں گے۔“

اب کون پوچھے گا نہ دعویٰ حضرات اور اُن کے علماء و مشائخ کہلانے والوں سے کہ:  
حضرات! آپ کے قومی رہنماؤں، مذہبی پیشواؤں، اخلاقی یاروں، پیاروں، مددگاروں  
اور اقتصادی پروردگاروں کے بیانات تو ایسے تھے، لہذا مسلمانوں نے تو اُن بت پرستوں  
ملتِ اسلامیہ کے ازلی دشمنوں کو اسی نظر سے دیکھا، جس کے وہ قابل تھے لیکن گاندھی  
حضرات کا رشتہ تبسبح اُن پختہ زناروں کے حضور میں کیوں ٹوٹ گیا؟ دینی غیرت کیوں

۱۔ ہندوستان ٹائمز، ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء

۲۔ روڈیاد آل انڈیا ویدک یوتھ کانفرنس، منعقدہ لاہور

۳۔ روزنامہ ملاپ، ۱۳ جنوری ۱۹۲۵ء

مرگنی، دلوں اور دماغوں پر جو متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا مجتہ سوار ہوا تھا، اُس نے اسلامی حیثیت کی رتی بھی باقی رہنے دی، ہستم نظریں تو یہ کہ اپنے موقف کی انتہائی کمزوری کا احساس ہو جانے کے باوجود پاکستان میں بھی وہ حضرات اہل حق کے خلاف ہر میدان میں صفت آرا دیں۔ حالات کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اور مدعیان اسلام کی ہمدردی سے مجبور ہو کر راقم الحروف کو یہ روشن دستاویز ایک مصفا آئینے کی صورت میں پیش کرنی پڑی، تاکہ انصاف پسند حضرات اور متلاشیان حق اس کی روشنی میں حق و باطل کو پرکھ سکیں اور اُس راستے پر گامزن ہو سکیں جس میں دایرین کی کامیابی ہے، جو ملت اسلامیہ اور سواد اعظم کا راستہ ہے۔ صراطِ مستقیم اسی کو کہتے ہیں۔ اس راستے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اللہ کے سارے مقبول بندے اسی راستے پر چلتے آئے ہیں یعنی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ وَاللّٰہُ اَرْحَمُ الرَّاحِمِینَ۔ اس سے پھرنے والے کو اللہ جل شانہ نے نُوَلِّیْہِ مَا تُوَلِّیْ وَنُصَلِّیْہِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا کی وعید سنائی ہے۔ اگر ان پرانگہ سطور میں کوئی غمخیز نظر آئے تو اُسے اس سیاہ کار و عصیان شعار کے

ولی نعمت، مُرشدِ برحق، مفتی اعظمِ دہلی، حضرت شاہ محمد منظر اللہ فاروقی نقشبندی مجددی دہلوی اور مجدداتہ حاضرہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری برکاتی بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی نظرِ کرم اور فیضانِ کاکر شہہ شمار کیا جائے۔ جتنی غلطیاں، فرغزاشتیں اور کوتاہیاں نظر آئیں وہ میری نااہلی کا نتیجہ ہیں۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ غلطیوں اور مفید مشوروں سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا خیال رکھا جاسکے۔ خدائے ذوالمنن اپنے حقیر بندے کی اس ناچیز کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے ہوئے اسے میرے لیے کفارہِ سینئات، باعثِ حُسنِ خاتمہ، توشہٴ آخرت اور سرمایہٴ نجات بنائے۔ آمین یا اَللّٰہُ الْعَلِیْمُ ۝ مَا تَنْتَظِرُ نَقَبَلْ مِمَّا اَنْتَ الْعَلِیْمُ وَتُبَّ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ وَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ صَحْبِہٖ اَجْمَعِیْن ۝

خاکپائے علماء، محمد عبد الحکیم خاں مجددی منٹھری

المعروف بہ اختصار شاہجہانپوری

دارالمصنفین - لاہور

۱۵۔ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

۲۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء

## ماخذ و مراجع

- |   |  |
|---|--|
| سیرت سید احمد شہید، مطبوعہ مکتبہ ۱۹۳۹ء                  | ۱۔ ابوالحسن علی ندوی، مولوی                  |
| برہان المتعہ، مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور             | ۲۔ سید ابوالقاسم شیعہ مجتہد                  |
| آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق طبع آباد | ۳۔ ابوالکلام آزاد، مولوی                     |
| انکوکتہ الشہاہدہ فی کفریات ابی الوہاب، مطبوعہ           | ۴۔ احمد رضا خاں بریلوی، امام                 |
| الامان پرنٹنگ پریس لاہور                                |  |
| الحجۃ المومنین، مطبوعہ بریلی شریف ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء           | ۵۔ " "                                       |
| تمہیر فلاح و نجات و اصلاح، مطبوعہ آفتاب عالم            | ۶۔ " "                                       |
| تمہید ایمان بآیات القرآن، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ          | ۷۔ " "                                       |
| پریس لاہور  |  |
| حدائق بخشش، دونوں حصے، مطبوعہ مشہور پریس کراچی          | ۸۔ " "                                       |
| کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، مطبوعہ لاہور مع            | ۹۔ " "                                       |
| نور العرفان، ۱۳۹۵ھ                                      |  |
| القول الجمیل مترجم، مطبوعہ عربی پریس کراچی ۱۹۴۲ء        | ۱۰۔ احمد بن عبدالرحیم بن عبدالشہاب اولی اللہ |
|   | دہلوی، مولانا                                |
| فتاویٰ حدیثیہ   | ۱۱۔ احمد شہاب الدین ابن حجر مکی، محدث        |
| مرآة شرح مشکوٰۃ، جلد ہشتم، مطبوعہ لاہور                 | ۱۲۔ احمد یار خاں، مفتی                       |
| تبلیغی جماعت، حقائق و معجزات کے سبب سے ہیں              | مولانا                                       |
| مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء                                      |  |
| جماعت اسلامی اپنے آئینے میں                             |  |



- ۳۸ - مرزا حیرت دہلوی، ادیب  
 ۳۹ - احمد حسین ٹانڈوی دیوبندی، مولوی  
 ۴۰ - " " "  
 ۴۱ - " " "  
 ۴۲ - حسین علی بھیراوی دیوبندی، مولوی  
 ۴۳ - حسین رضا خان بریلوی، مولانا  
 ۴۴ - خلیل احمد انبٹھوی دیوبندی، مولوی  
 ۴۵ - " " "  
 ۴۶ - ملا خلیل قرزوی، شیعہ مجدد  
 ۴۷ - ذکا اللہ دہلوی، مولوی  
 ۴۸ - رحمن علی، مولانا  
 ۴۹ - رشید احمد گنگوہی دیوبندی، مولوی  
 ۵۰ - رئیس احمد جعفری، ادیب  
 ۵۱ - سخاوت مرزا، ادیب  
 ۵۲ - سلطان خان، مولوی  
 ۵۳ - سلیمان اشرف بہاری، مولانا  
 ۵۴ - سید سلیمان ندوی، مولوی  
 ۵۵ - " " "  
 ۵۶ - سر سید احمد خان  
 ۵۷ - " " "  
 ۵۸ - نواب صدیق حسن خان جوہالی  
 غم مقلد، مولوی۔
- حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء  
 الشہاب الثاقب، مطبوعہ وسیم پرنٹنگ پریس دیوبند  
 مکتوبات شیخ، جلد دوم  
 نقش حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی  
 مبشرات بلغۃ الحیران  
 وصایا شریعت، مطبوعہ مقبول عام پریس لاہور  
 المہند علی المنفرد اردو، مطبوعہ لاہور  
 برابین قاطعہ، مطبوعہ نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند  
 صافی شرح اصول کافی، مطبوعہ نو کشور کھنڈ  
 عروج عہد انگلشیہ  
 تذکرہ علماء ہند، مطبوعہ نو کشور کھنڈ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء  
 فتاویٰ سعید بہ کمال بوتہ، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی  
 آزادی ہند، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور ۱۹۶۵ء  
 ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء  
 تذکیر الانوان، اردو، مطبوعہ اتحاد پریس لاہور ۱۹۵۶ء  
 التور، مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۱۹ء  
 حیاتِ شبلی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء  
 تعارف، مصنف معین المنطق، مطبوعہ کراچی، بار اول  
 ۱۹۶۷ء  
 آثار الصنادید، مطبوعہ نو کشور پریس کھنڈ ۱۸۷۹ء  
 ہنٹر پرنٹرز، مطبوعہ کیپٹل کوآپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور  
 بار اول ۱۹۴۹ء

۵۸ - نواب صدیق حسن خان جوہالی  
 غم مقلد، مولوی۔







۹۸ -	مرزا غلام احمد قادیانی، کذاب و مجال	تبلیغ رسالت جلد ہفتم
۹۹ -	" "	تبلیغ رسالت جلد ہشتم
۱۰۰ -	" "	تتمہ حقیقۃ الوحی
۱۰۱ -	" "	تحفہ قیصریہ
۱۰۲ -	" "	تربیقاۃ الود
۱۰۳ -	" "	تحفۃ الہ ام جلد اول
۱۰۴ -	" "	تحفہ گولڑویہ
۱۰۵ -	" "	حاشیہ چشمہ معرفت - مطبوعہ انوار احمدیہ قادیان، بار اول
		۱۹۰۸ء
۱۰۶ -	" "	حقیقۃ الوحی، مطبوعہ میگزین قادیان، بار اول، ۱۹۰۷ء
۱۰۷ -	" "	حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم
۱۰۸ -	" "	خطبہ الہامیہ - مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اول
		۱۳۱۹ھ
۱۰۹ -	" "	دافع البلاء ٹائٹل بیچ - " " " " " "
		۱۹۰۲ء
۱۱۰ -	" "	در شمیم
۱۱۱ -	" "	رسالہ تشخید الاذیان
۱۱۲ -	" "	ستارہ قیصرہ
۱۱۳ -	" "	شہادت القرآن - مطبوعہ پنجاب پریس سیالکوٹ
		۱۹۶۸ء
۱۱۴ -	" "	کشتی نوح، مطبوعہ خورشید عالم پریس لاہور، ۱۹۰۲ء
۱۱۵ -	" "	نور الحق
۱۱۶ -	" "	نزول المسیح، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اول، ۱۹۰۹ء



- ۱۳۸- محمد اسمعیل غزنوی غیر مقلد، مولوی
- ۱۳۹- محمد اسمعیل سابق امیر الحدیث،
- ۱۴۰- محمد اسمعیل پانی پتی، مولوی
- ۱۴۱- علامہ سر محمد اقبال، شاعر مشرق
- ۱۴۲- " " "
- ۱۴۳- محمد امین ابن عابدین شامی، فقیہ
- ۱۴۴- محمد ایوب قادری، پروفیسر
- ۱۴۵- " " "
- ۱۴۶- شیخ محمد اکرام، مسٹر
- ۱۴۷- " " "
- ۱۴۸- محمد ایوب کس برنی، پروفیسر
- ۱۴۹- محمد جعفر تھانیسری، مولوی
- ۱۵۰- محمد سعید، مولوی
- ۱۵۱- محمد سرور، مولوی
- ۱۵۲- میاں محمد شفیع، ڈپٹی کمشنر
- ۱۵۳- محمد صابر قادری نسیم بستوی، مولانا
- ۱۵۴- محمد عمر اچھروی، مولانا
- ۱۵۵- " " "

تصفیہ و باہیہ

- مقدمہ حسن البیان، مطبوعہ لاہور، بار سوم
- مقالات سر سید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور
- ارمغانِ حجاز، مطبوعہ لاہور، طبع پنجم ۱۹۵۱ء
- کلیاتِ اقبال، مطبوعہ دہلی
- رد المحتار، جلد سوم
- ویجاہت تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ پاکستان
- ہسٹریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء
- مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۹ء
- شہیلی نامہ
- موجِ کوثر، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۵۹ء
- قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، مطبوعہ اشرف پریس
- لاہور
- حیاتِ سید احمد شہید (سوانح احمدی) مطبوعہ کراچی
- ۱۹۶۸ء
- ہدایتِ قلوب قاسیہ
- اخادات و طغولاتِ سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اول
- ۱۹۷۲ء
- ۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اول ۱۹۵۷ء
- حجۃ الاسلام، مطبوعہ کلان پور بھارت ۱۹۵۹ء
- مقیاسِ حنفیت، مطبوعہ فیاض پریس لاہور، بار ہشتم
- ۱۹۶۶ء
- مقیاسِ دہابیت





- ۱۹۵ - وکیل احمد سکندر پوری، مولانا  
 ۱۹۶ - ونانک ساورکر، ہندو  
 ۱۹۷ - ولیم ہنٹر، انگریز  
 ۱۹۸ - ولی الدین احمد، محدث
- وسیلہ جلید، مطبع مصطفائی ۱۳۰۱ھ  
 ساورکر، طبع اول  
 ہمارے ہندوستانی مسلمان  
 مشکوٰۃ المصابیح

## رسائل و جرائد

- |                          |  |
|--------------------------|--|
| بابت ۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء      | ۱ - ہفت روزہ، الاعتصام، لاہور          |
| بابت ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء     | ۲ - " " " "                            |
| بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۰ء     | ۳ - " " " "                            |
| شیخ الاسلام نمبر         | ۴ - ماہنامہ، الجمعیت، دہلی             |
| بابت مارچ تا مئی ۱۹۵۸ء   | ۵ - سہ ماہی، العلم، کراچی              |
| شہید نمبر                | ۶ - ماہنامہ، الفرقان، لکھنؤ            |
| بابت رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ | ۷ - " " " "                            |
| بابت فروری ۱۹۵۷ء         | ۸ - " " " " ربوہ                       |
| بابت ربیع الاول ۱۳۴۸ھ    | ۹ - ماہنامہ، ال مواد الاعظم، مراد آباد |
| بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ | ۱۰ - " " " "                           |
| بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ | ۱۱ - " " " "                           |
| بابت شعبان ۱۳۴۹ھ         | ۱۲ - " " " "                           |
| بابت شوال ۱۳۴۹ھ          | ۱۳ - " " " "                           |
| بابت ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ   | ۱۴ - " " " "                           |
| بابت فروری، مارچ ۱۹۵۷ء   | ۱۵ - ماہنامہ، تخیلی                    |
| بابت ۱۶ اپریل، ۱۹۵۱ء     | ۱۶ - ہفت روزہ، چٹان، لاہور             |
| بابت ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء      | ۱۷ - ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور       |

بابت ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء	۱۸ - ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور
بابت ۱۳ اپریل ۱۹۶۳ء	۱۹ - " " " "
بابت ستمبر ۱۹۵۷ء	۲۰ - ماہنامہ، دارالعلوم، دیوبند
بابت نومبر ۱۹۵۶ء	۲۱ - ماہنامہ، نقاد، کراچی
بابت ۱۵ دسمبر ۱۹۳۱ء	۲۲ - اخبار، الفضل، قادیان
بابت ۲۷ دسمبر ۱۹۲۶ء	۲۳ - روزنامہ، جنگ، کراچی
بابت	۲۴ - " " " "
بابت ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء	۲۵ - روزنامہ، سیاست، کانپور
بابت یکم فروری ۱۹۵۷ء	۲۶ - " " " "
بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء	۲۷ - روزنامہ، صدق، لکھنؤ
بابت یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء	۲۸ - روزنامہ، کوہستان، لاہور
بابت ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء	۲۹ - " " " "
بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء	۳۰ - " " " "
بابت ۱۳ جنوری ۱۹۲۵ء	۳۱ - روزنامہ، ملاپ، لاہور
بابت ارمی ۱۹۵۵ء	۳۲ - روزنامہ، نوائے وقت، لاہور
بابت ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء	۳۳ - " " " "
بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء	۳۴ - " " " "
بابت ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء	۳۵ - ہندوستان ٹائمز
بابت ۹ جون ۱۹۴۰ء	۳۶ - " " " "
بابت ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء	۳۷ - روزنامہ، یگانہ انڈیا
بابت ۲۹ ستمبر ۱۹۵۶ء	۳۸ - روزنامہ جنگ، کراچی
بابت ۷ اگست ۱۹۳۸ء	۳۹ - روزنامہ اسٹیٹسین



# قطعة تاریخ کتابت

(از حضرت مولانا اختر الحامدی الرضوی مدظلہ - حیدرآباد)

زندہ پائندہ باد اسے اختر  
 جس میں عریاں ہیں دیو کے بندے  
 اُن کے مکروہ چہروں سے تُو نے  
 اُن کی اک اک فریب کاری کا  
 وہ کیا ہے محاسب تُو نے  
 اللہ اللہ تیری نوبِ قسَم  
 مار جس کی اسے معاذ اللہ  
 منگھری فیض ہے یہ سب لاریب  
 پاسباں مسلکِ رضا کا تُو  
 تیری تحریر سے یہ ہے ظاہر  
 سنت و دین کے تحفظ کا  
 عمد نام ہے تیری ہر تحریر  
 جس کا ہر حرف ساغیر عرفان  
 اللہ اللہ یہ فیضِ شاہِ رضا  
 راہِ واحد عمد نامہ اختہ

آئینہ ہے، کتاب یہ کیا ہے  
 برسرِ عام ہر سدا پاپ ہے  
 ہر نقاب آج نوح پھینکا ہے  
 تار تار مسد و نیز پرہ ہے  
 سیر بازار مگر ننگا ہے  
 شاہ احمد رضا کا نیزہ ہے  
 قہر حق جس کا وار، توبہ ہے  
 تجھ پہ بے شک کرمِ رضا کا ہے  
 رہبر راہِ شاہِ بطحا ہے  
 عمد تُو نے رضا سے بانڈھا ہے  
 کام تجھ کو رضائے سو نپا ہے  
 حشمتِ فیض ہر رسالہ ہے  
 ہر سطر جس کی بادہ خانہ ہے  
 جس نے دیکھا پکار اُٹھا ہے  
 آج نمنانہ مطالعے

۹۵  
 ۱۳

# قطعہ تاریخ ترمیب

(از حضرت مولانا اختر محمد علی رضوی مدظلہ العالی حیدرآباد)

دیکھ کر جس کو نظر پُر نور ہے روشن نگاہ  
سب کی ٹھوکر میں ہے مصنوعی فضیلت کی کلاہ  
ہر دلیل اُن کی ہوا کے ہے پروں پر شلِ گاہ  
ہے ہر اک عریاں سر بازار با عالی تباہ  
آج ہے پیشِ نظر اک ایک کاروئے سیاہ  
حاشیہ بردارِ گاندھی، کانگرس کے خیر خواہ  
ہے یقیناً آپ پر طلعِ رضا شام و پگاہ  
ہو زمانے میں فزوں سے بھی فزوں تر عز و جاہ  
اس کا اک اک حرف ہے علمی فنیت پر گواہ  
اک مورخ کے لیے مشعلِ بکف، مینارِ راہ

اللہ اللہ حضرت اختر کی کیا تصنیف ہے  
مل گیا ہے خاک میں نجدی کا تاریخی غرور  
مگر کی اُن کے فضا میں اڑ رہی ہیں وجتیاں  
اس طرح فرمایا ہے بوجہلیوں کا احتساب  
نوپ چھینکی نونج سے ہر تخریب کاری کی نقاب  
یعنی سب انگریز کی شطرنج کے فہرے ہیں یہ  
بیش قیمت ہے یہ علمی کارنامہ آپ کا  
روز و شب علم و عمل میں ہو ترقی آپ کے  
مرحبا تحقیق، یہ روزِ قلم حسد آفریں  
ایک سرا یہ ہے یہ اہل قلم کے واسطے

جس نے دیکھا اس کو اختر کہہ اٹھا بیساختہ

واہ رضوی شان ہے، کیا یہ، رضا کی شان واہ

۱۳ ۹۴ ۱۳ ۹۴

# قطعة تاریخ طباعت

(از حضرت اختر المامدی الرضوی مدظلہ العالی - حیدرآباد)

اختر تیرے شانہ ہے کیا سیرتِ رضا  
 احمد رضا کا والا و شیرانہ تو ہو کیوں  
 تجھ پر نگاہِ نعلتِ مہتاب کی ہے رات و دن  
 سر پر امامِ اہلِ قلم کا جب ہے تاج  
 طرزِ بیاں میں کلکِ رضا کا ہے بانگِ پی  
 جگ آزاد ہو سہ پہلے رات و دن  
 عورت دراز باد، دُعا یہ خدا سے ہے  
 جب اُن کو عشق سرور ہر دہرا سے ہے  
 یہ اوجِ علم و فضل اُنہیں کی عطا سے ہے  
 کیا شانِ فضلِ حضرتِ غوثِ الوری سے ہے  
 ظاہر یہ حسن، تیسرے قلم کی ادا سے ہے  
 تو دشمنانِ ذاتِ مشہد انبیاء سے ہے

تاریخ طبع میں ہے یہ اختر کا فیصلہ

تو فیضیابِ چشمہ فیضِ رضا سے ہے

۱۹ ۶ ۴۹

